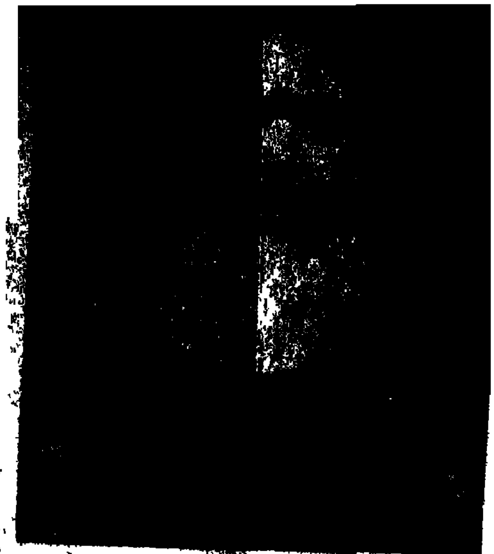


# امیر مینائی لکھنوی

۔۔۔فروری ۱۸۲۹ء

رئیسِ شعر و سخن اے امیر مینائی
ہے اب بھی نغمہ زن ہند تیری شہنائی
جگر، جلیل و دل اب تک ہیں یادگار تری
ہے جن سے طورِ سخن کو فروغِ مینائی

# فکرِ امروز



"..... غزل ضرور کہیے اور ضرور پڑھیے، میں بھی آپ کی ہمنوائی کروں گا، لیکن شعر پڑھنے سے پہلے یہ غور کر لیجئے، اس کا اثر اہلِ فن اور اہلِ علم پر کیا ہوگا، اس کے بعد نوجوانوں پر کیا ہوگا؟ اور عام سوسائٹی پر کیا ہوگا؟ اگر آپ کے خیال میں یہ سرگوشیاں خوش گوار ہوں تو شعر ضرور پڑھیے ایسے ہی اشعار پڑھنے اور سننے کے قابل ہوتے ہیں خواہ ان سے سوسائٹی کے جذبۂ تفریح میں حرکت پیدا ہو یا نہ ہو لیکن ان کے دل اس شعر سے متاثر ضرور ہوں گے۔ ایک شاعر کے لیے صاحبِ علم ہونا بھی لازمی ہے اور فنِ شعر سے واقف ہونا بھی ضروری ہے۔ فنِ شعر بھی دوسرے فنون کی طرح اکتسابی اور علمِ عروض بھی دوسرے علوم کی طرح سہل الحصول ہے۔ علم و فن سے روگردانی ہی تخریبِ شاعری اور امتناعِ تعمیر کا سبب ہے۔ اس کے بعد بعض احتیاطیں ایسی بھی ہیں جن کا تعلق صرف ذوقِ سلیم اور مشقِ طویل سے ہے۔ شاعر کو اپنی قادر الکلامی کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب وہ ان احتیاطوں کے ساتھ لطائفِ شاعرانہ کے دوش بدوش شاہراہِ سخن طے کرتا ہے ....."

[خطبۂ صدارت مشاعرۂ جھانسی، ۳۰ اپریل ۱۹۴۰ء]

ماہنامہ علمیہ ادبیہ و تنقیدیہ

# شاعر

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بانیٔ علامہ سیماب اکبر آبادی مرحوم

بہ یادگار اعجاز صدیقی مرحوم

اشاعت کا ۶۰ واں سال

جلد ــــ ۶۰

شمارہ ــــ ۲

نوٹ: ۳۵۹۹۰۳



**مدیر**

افتخار امام صدیقی

●

**معاون**

ناظر نعمان صدیقی

قیمت :- ۴ روپے

زرِ سالانہ ◆ ۵۰ روپے

لائبریریوں سے ◆ ۶۰ روپے

تاعمر خریداری ◆ ۱۰۰۰ روپے

معاونین سے ◆ ۱۰۰ روپے

ممالکِ غیر سے ◆ ۳۵۰ روپے

نامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب، بمبئی سینٹرل پوسٹ آفس پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ ، بمبئی ۴۰۰۰۰۸

شمارہ ۲

# اپنے خطوں پر پتے اردو میں لکھیے مگر

گزشتہ سال لکھنؤ میں منعقدہ بعض عالمی سمینار کے موقع پر بیشتر ادبا و شعراء سے اس موضوع پر گفتگو کا موقع ملا، میں نے اپنی تجاویز پیش کیں کچھ لوگوں نے اسے پسند کیا، کچھ نے عادتِ ذہنی کے تحت اسے فضول جانا لیکن اکثریت نے پسند کیا اور زور دیا کہ اسے ایک عملی تحریک کے طور پر اپنایا جائے۔ ہم نے اردو میں پتے لکھنے کے متعلق بہت غور کیا۔ ہے اور اب اپنی تجاویز ذیل میں درج کر رہے ہیں۔ تمام ہندوستان کی پوری اردو برادری سے درخواست کرتے ہیں کہ ان تجاویز پر عمل پیرا ہوں، دوسروں کو اس تحریک میں شامل کریں اور اس تحریک کو پوری قوت کے ساتھ ملکی سطح پر عام کر دیں۔

خطوں پر اردو میں پتے لکھنے کی عملی تحریک میں شامل ہونے کے لیے آپ کے کرنے کا کام بس یہ ہے کہ:

روزانہ ایک پوسٹ کارڈ جس کی قیمت بہت معمولی یعنی ۱۵ پیسے ہے، لکھنا ہے۔ اس طرح مہینے کے ۳۰ پوسٹ کارڈس جن کی قیمت ساڑھے چار روپے ہوگی۔ اگر آپ میں اتنی ہی استطاعت ہے تو روزانہ ایک پوسٹ کارڈ اپنے کسی بھی دوست کو، عزیز کو یا پھر اپنے ہی نام اپنے پتے پر لکھئے، کوئی جملہ، کوئی فقرہ یا شعر جو مزاج میں آئے۔ پھر پتہ اردو میں لکھئے۔ اس خیال کے ساتھ کہ اس پوسٹ کارڈ یا ان خطوں کا جواب نہیں آنا ہے بلکہ یہ کام بطور ایک تحریک کے کیا جا رہا ہے۔ آپ ایک دو، ایک کشمکش سے آزاد ہو جائیں گے کہ ہمارے خطوط ضائع ہو جائیں۔ اگر استطاعت ہو تو روزانہ ایک سے زائد، دو، تین، چار پوسٹ کارڈس بھی لکھے جا سکتے ہیں۔ اگر ہم اس کام کو روزمرہ میں شامل کر لیں تو یومیہ ۱۵ سے ۴۵ پیسے کا خرچ اپنی زبان کے لیے غالباً ہمارے کسی بھی بجٹ کو متاثر نہیں کر سکے گا۔ کسی اہم تحریک کو جنم دینے کے لیے یہ عمل بہت کافی ہوگا۔

اردو میں پتے لکھنے کے لیے اصولوں کی کوئی قید نہیں ہونی چاہیے۔ اس تحریک کے لیے کسی ضابطے کی ضرورت نہیں۔ کسی فرد، جماعت، ادارے یا نام نہاد لیڈروں اور اردو کے ٹھیکیداروں کی ضرورت نہیں۔ اسے کسی تحریک میں تبدیل کرنے کیلئے فی الحال تمام اردو والوں کی شمولیت شرط ہے جس کے لیے ہمیں خود بھی آمادہ ہونا ہے اور اپنے اطراف بھی ایک رضا بندی کرنی ہے۔ اردو کے نام پر قائم تمام بڑے چھوٹے سرکاری غیر سرکاری ادارے اور اکاڈمیاں بڑے پیمانے پر یہ کام بخوبی انجام دے سکتی ہیں۔ روزانہ ۱۰۰ پوسٹ کارڈس یا پچاس لفافے ان کے لاکھوں کے سالانہ بجٹ کو متاثر نہیں کر سکیں گے۔ یہ کوئی فضول کام نہیں ہے بلکہ یہ ٹھوس عملی قدم ہے جس کے دور رس نتائج ادب تخلیق کرنے، انہیں شائع کرنے یا ایسے ہی دیگر میکانیکی کاموں سے کہیں زیادہ تعمیری ہوں گے۔ اردو زبان کے لیے آج ایسے ہی کاموں کی ضرورت بھی ہے۔

غور کیجیے کہ: ______________

جب ہم اپنے خطوں پر اردو میں پتے لکھنے لگیں گے۔ جب ہم خطوں کے ضائع جانے کے خوف سے آزاد ہو جائیں گے۔ جب ملکی سطح پر تمام چھوٹے بڑے شہروں اور گاؤں، دیہاتوں کے ڈاک گھروں میں خطوں کا ڈھیر لگنا شروع ہو گا، جب ان خطوں کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہو گا، تمام اردو والے ایک تحریک کے زیر اثر آ جائیں گے۔

تب یہ ہوگا کہ: ______________

ابتدا میں یہ خطوط ضائع ہوں گے اگر ہوتے تو بعد میں ان خطوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر ان کی نکاسی کا انتظام کیا جائے گا اور اس کی ایک ہی صورت ہوگی، اردو جاننے والوں کا تقرر۔ ہندوستان کے تمام چھوٹے بڑے ڈاک گھروں میں ایک یا ایک سے زائد اردو جاننے والوں کی تقرری کا مطلب واضح ہے۔ ہم اپنے نمبر سٹ کے پوسٹ ماسٹر سے رجوع کر سکتے ہیں۔ اپنے ان خطوں کے متعلق استفسار کر سکتے ہیں جن پر پتے اردو میں لکھے گئے تھے۔ اگر خطوط کی نکاسی میں تاخیر ہو رہی ہو اور ہمیں معلوم ہو جائے کہ خطوط خاصی تعداد میں جمع ہو گئے ہیں تو ہم مطالبہ کر سکتے ہیں کہ ایسے خطوں کی جلد از جلد ڈلیوری دی جائے۔ ہم مزید اور بھی مطالبات کر سکتے ہیں۔

لہٰذا ــــــ ! ______________

تمام اردو والے اس تحریک میں شامل ہو کر اسے کامیاب بنائیں، اخبارات و رسائل وغیرہ اپنے اداریوں اور کالموں کے ذریعے اپنے قارئین کو تحریک میں شامل ہونے کی دعوت دیں، ادارے، انجمنیں اپنے طور پر اس تحریک کی کامیابی کے لیے اپنے حلقوں میں کام کریں، خود بھی خطوں پر پتے اردو میں لکھیں اور دوسروں کو بھی ترغیب دیں، ہینڈ بل اور پمفلٹ وغیرہ تقسیم کریں، لوگوں کو اس تحریک کے بارے میں زیادہ سے زیادہ باخبر کریں۔ جب تک چاروں طرف سے یہ سلسلہ شروع نہیں ہوگا تحریک میں جان نہیں پڑ سکے گی۔ ہم نے آغاز کر دیا ہے، اب آپ بھی تیار ہیں نا ؟ ؟!

شمارہ نمبر ۲ جلد ۶۰

۱۹۸۹

معروض بارگاه حضرت شیخ محمد مکی مولانا [illegible]

حقیر کبیر فقیر از تسلیم مسنون و سلام و نیاز [illegible] عرض پرداز [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] بھیجوں گا ۔ امیر ۔ کیونکہ [illegible] زیادہ کیا تکلیف دوں فقط

امیر [illegible] مینائی

[illegible] مراد آباد بازار [illegible] مکان نواب [illegible] علی خاں [illegible] صاحب [illegible]

[illegible]

امیر مینائیؔ بنام مولوی بیدلؔ رامپوری

مولوی عبدالسمیع بیدل رامپوری کا پورا نام شیخ عبدالسمیع انصاری تھا ۔ پیدائش ۱۸۳۵ء (قیاساً) رامپور کے ایک قصبے بہاراں میں ہوئی ۔ ۶۰-۱۸۵۵ء کے [illegible] مرزا غالب کے شاگرد ہوئے ۔ عمر کے آخری ۴۲ سال میرٹھ میں بسر کیے اور وہیں ۱۹۰۰ء میں انتقال ہوا ۔ بیشتر مذہبی موضوعات پر تقریباً ۱۲ کتابیں تصنیف کیں ۔ ایک شاگرد شیخ بشیرالدین تسخیر نے (جو بہاں تھا) ان کا کلام جمع کر کے ۸۴ صفحے کا ایک مختصر کتابچہ "طرازِ سخن" کے عنوان سے مرتب کر کے ۱۸۹۶ء میں میرٹھ سے شائع کیا ۔

مولوی عبدالسمیع بیدل کے نام امیر مینائیؔ کا یہ خط پروفیسر نثار احمد فاروقی نے ارسال کیا ہے ۔

# ग्राम-सुधार

## सुबह की दुआ किसान का भजन

ऐ ! सुबह के चमकाने वाले 'भगवान' मुझे भी चमका दे ।
दे जोत मुझे भी सूरज की और सारे बन में फैला दे ॥
तू दाता है दोनों जग का मुख्तार है तू, दाता है तू ।
मैं अपने घर खुश खुश जाऊं, ऐ ! देने वाले इतना दे ॥
धरती तेरी, आकाश तेरा, यह खेत तेरे मैदान तेरा ।
गर हुक्म न हो दाता तेरा यह मिट्टी मुझको फल क्या दे ॥
मैं बेबस हूं, मैं बेकस हूं, मैं कुछ भी नहीं तू सब कुछ है ।
रख लाज मेरी लाचारी की, बादल माया के बरसा दे ॥
तू मोर चकोर को देता है, पंछी और ढोर को देता है ।
तू हर कमज़ोर को देता है, मुझको भी दया में हिस्सा दे ॥



# گرام سُدھار

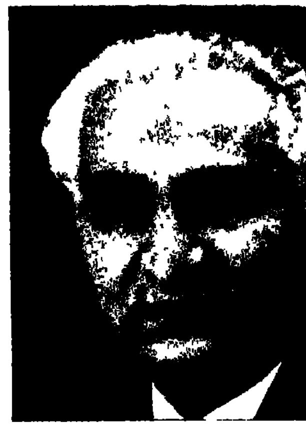
بن بنسی

## کسان کا بھجن

## صبح کی دعا

اے صبح کی چمکانے والے بھگوان مجھے بھی چمکا دے
دے جوت مجھے بھی سورج کی اور سارے بن میں پھیلا دے
تو داتا ہے دونوں جگ کا مختار ہے تو داتا ہے تو
میں اپنے گھر خوش خوش جاؤں اے دینے والے اتنا دے
دھرتی تیری آکاش ترا یہ کھیت ترے میدان ترا
گر حکم نہ ہو داتا تیرا یہ مٹی مجھکو پھل کیا دے
میں بے بس ہوں میں بیکس ہوں میں کچھ بھی نہیں تو سب کچھ ہے
رکھ لاج مری لاچاری کی بادل مایا کے برسا دے
تو مور چکور کو دیتا ہے پنچھی اور ڈھور کو دیتا ہے
تو ہر کمزور کو دیتا ہے مجھکو بھی دیا میں حصہ دے

✲ علامہ سیماب اکبرآبادی کی ایک [illegible] کتاب "بن بنسی" [illegible] علامہ کی تقریباً تین سو مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصانیف [illegible] عظیم شاعر [illegible] ڈسٹرکٹ گزٹ پریس ایٹہ سے شائع ہوئی [illegible]



اختر سعید خاں

# قصیدہ در مدح غالبؔ

رات جب فکر و نظر کا در کھلا
ہر نظر میں اک نیا منظر کھلا

مستیٔ اندیشہ کی پرواز کو
سامنے تھا گنبدِ بے در کھلا

گرد بن کر اڑ رہی تھی کہکشاں
تو کہے جبریل کا شہپر کھلا

آئینہ تھیں حسن کی رعنائیاں
ہو صحیفہ جیسے سینے پر کھلا

جب کھلی دل پر کتابِ زندگی
سب سے پہلے عشق کا دفتر کھلا

لفظ ہستی کی سخن میں دھوم تھی
عقدۂ ہستی مگر کیونکر کھلا

دفترِ معنی کا جب کھولا ورق
نام غالبؔ کا سرِ دفتر کھلا

وہ کہ جس کی رفعتِ تخیل سے
عرش سے بھی آگے اک منظر کھلا

وہ کہ جس کی روشنیٔ طبع سے
رازِ تابانیٔ ہفت اختر کھلا

وہ کہ جس کے اک سفالیں جام سے
جامِ جم کا راز عالم پر کھلا

وہ کہ جس کی مستیٔ کردار سے
فقر کا اعجاز شاہوں پر کھلا

وہ کہ جس کی گرمیٔ رفتار سے
پردۂ خوش فہمیٔ رہبر کھلا

وہ کہ جس کی شوخیٔ گفتار سے
ماجرائے دیدہ ہائے تر کھلا

وہ کہ جس نے زندگی کے نام پر
رکھ لیا تھا دل میں اک خنجر کھلا

وہ طلوعِ فکرِ آدم کا نقیب
جس کے نغموں سے رخِ نیر کھلا

وہ نوا سنجانِ گلشن کا سفیر
جس کے شیون سے چمن کا در کھلا

آبلہ پائی کا جس کی مرتبہ
پیاس سے بیتاب کانٹوں پر کھلا

جس سے آئینِ غزل تازہ ہوا
جس کے دم سے شعر کا محور کھلا

شعرِ غالبؔ زندہ و پائندہ باد
فکر و معنی کا ہے جب تک در کھلا

اندرون اتوارہ، بھوپال (مدھیہ پردیش)





گوپی چند نارنگ

ڈی - ۲۵۲، سروودیا انکلیو، نئی دہلی - ۱۱۰۰۱۷

# اُردو اِملا اور لسانیات

## (روایت اور اجتہاد کی روشنی میں)

**(۲)**

### لسانیات اور اضافت

ہمزہ سے جڑا ہوا مسئلہ اضافت کا ہے۔ اضافت زیر سے بھی ظاہر کی جاتی ہے یائے سے بھی اور ہمزہ سے بھی۔ کہاں کس کا مقام ہے اس بارے میں روایت میں طرح طرح کی بحث کی گئی ہے۔ ان مباحث سے بار بار حوالہ دینا کوئی اچھی بات نہیں۔ لیکن بعض حقائق ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا اعادہ ضروری ہوتا ہے۔ خاکسار نے اسی مضمون (نمبر ۶) کا اوپر حوالہ دیا جا چکا ہے اضافت کے بارے میں سادہ سا فارمولا پیش کیا تھا۔ اضافت کے استعمال کی کوئی شکل اس سادہ سے فارمولے سے باہر نہیں، نیز اس اصول کا سمجھنا اور سمجھانا بھی نہایت آسان ہے :

| | | |
|---|---|---|
| اضافت | ہمزہ (ء) | ہائے مختفی کے بعد |
| | ـے | الف یا واؤ کے بعد |
| | کسرہ | دیگر تمام صورتوں میں |

**وضاحت :۔**

(۱) اضافت ظاہر کی جائے گی ہمزہ سے اگر وہ ہائے مختفی کے بعد آئے (مثلاً جذبۂ دل، نالۂ بلبل)

(۲) اضافت ظاہر کی جائے گی 'ے' سے اگر وہ الف یا واؤ کے بعد آئے (مثلاً نوائے وقت، صدائے دل)

(۳) اضافت ظاہر کی جائے گی کسرے سے دیگر تمام صورتوں میں (مثلاً دردِ دل، ماہِ نو، شمعِ انجمن، وادیِ گل، گلِ نغمہ)

اس میں 'ی' پر ختم ہونے والے مضاف کا ذکر نہیں ہے اس لیے کہ 'ے' خود اضافت کی شکل ہے، اور اضافت کی آواز اس میں ضم ہو جاتی ہے۔ مثلاً رائے، میں 'ے' پہلے سے موجود ہے، مضاف لکھا جائے گا 'رائے صائب'، 'رائے عالی' وغیرہ۔

یہاں الف اور واؤ پر ختم ہونے والے الفاظ کے بارے میں میں نے اپنے سابقہ اصول میں ذرا سی ترمیم کی ہے گویا نوائے وقت، اردوئے معلّٰی وغیرہ بلکہ ہمزہ کے ساتھ لکھے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے لکھا تھا کہ گوپی چند نارنگ کے اصول کی رو سے ان شکلوں میں دو مصوتے ساتھ ساتھ آتے ہیں تو پھر ہمزہ کیوں نہ لکھا جائے۔ مجھے ان سے اتفاق ہے۔ گویا ۱۹۶۶ء والے مضمون "ہمزہ کیوں؟" میں جو فارمولا پیش کیا تھا، اور جسے املا نامہ (دہلی ۱۹۷۴ء) میں دہرایا تھا (صفحہ ۶۸ تا ۶۹) اس میں اب قدرے ترمیم ہو گئی۔ لیکن خاطر نشان رہے کہ ترمیم شدہ فارمولے میں جو اوپر پیش کیا گیا یہ ہمزہ قوسین میں ہے، جس سے مراد ہے 'اختیاری'؛ یعنی اس کا لکھنا نہ لکھنا اختیاری ہے۔ ہمزہ کے ساتھ /نوائے وقت، صدائے دل/ تو چلن میں ہے ہی

ڑ کوئی فرمودۂ غالب کی پیروی میں ہمزہ کے بغیر نوائے وقت، صدائے دل لکھنا چاہے تو اس کو بھی غلط قرار نہیں دیا جا سکتا۔

## لسانیات اور حروف تہجی

اردو کے حروف تہجی میں ۲۹ حروف اصلاً عربی کے ہیں۔ چار کا اضافہ فارسی میں ہوا۔ تین حروف ہند آریائی کی معکوسی آوازوں کے لیے بعد
ھائے گئے۔ یہ کل ہوئے چھتیس[۳۶]۔ بشمول ہمزہ کے جس سے اوپر بحث کی گئی یہ تعداد سینتیس[۳۷] ہو جاتی ہے۔ ہکارت کے لیے ہائے دوچشمی کا
استعمال میرٹھی سے لیکر ہمعصر ماہرین تک سب تسلیم کرتے ہیں۔ اس طرح اردو کے حروف تہجی اڑتیس[۳۸] ہوئے۔ راقم الحروف کا معروضہ ہے کہ جس صوتی
کے تحت ہائے دوچشمی کا اضافہ جائز ہے، اسی اصول کے تحت نون کے بعد نون غنہ کا اضافہ بھی ضروری ہے کیونکہ ہکاریت کی طرح غنیت بھی اردو
ہاری صوتی وصف ہے۔ اور جس طرح ہکاریت دس گیارہ بنیادی آوازوں کے ساتھ وارد ہوتی ہے اسی طرح غنیت بھی دس مصوتی آوازوں کے
وارد ہوتی ہے اور ہکاریت کی طرح پوری زبان میں معنی کی تفریق میں ناگزیر کردار ادا کرتی ہے۔ چنانچہ نون غنہ کے اضافے کے ساتھ اردو کے
وف تہجی انتالیس[۳۹] ہوئے۔ ان کی ترتیب حسب ذیل ہے:

ا

ب پ ت ٹ ث

ج چ ح خ

د ڈ ذ ر ڑ ز ژ

س ش ص ض ط ظ ع غ

ف ق ک گ ل م ن ں

و ہ ھ ء ی ے (کل تعداد ۳۹)

جب ہائے دوچشمی کو حروف تہجی میں شامل کر دیا گیا ہے تو دوحسمی ہے کی مختلف طوال شکلوں یعنی بھ پھ تھ وغیرہ کا اندراج تہجی میں ضروری
اگرچہ اسمٰعیل میرٹھی نے اس کو روا رکھا تھا۔ البتہ حروف تہجی کے اندراج کے بعد الگ سے بھ پھ تھ دھ ٹھ ڈھ جھ چھ کھ گھ ڑھ وغیرہ
ج کر دیا جائے۔ تاکہ طالب علم مفرد آوازوں کے طور پر ان کی مشق کر سکے۔

## لسانیات اور اعراب

اس آخر میں لیجیے اعراب کا مسئلہ۔ اردو میں اس میں بھی بڑے بڑے اختلافات ہیں۔ خدا بھلا کرے بابائے اردو مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر عبدالستار
ما کا کہ اردو اعراب کی بعض صورتوں میں قاعدہ بندی کی کچھ صورت پیدا ہو گئی۔ ان میں کم از کم یائے معروف کے لیے کھڑا زیر اور واؤ معروف
ے الٹا پیش اب ابتدائی کتابوں میں عام طور سے دکھائی دینے لگا ہے۔ لیکن ابومحمد سحر کی لسانی بصیرت کو یہ بھی گوارا نہیں، فرماتے ہیں:

"یائے معروف کی طرح واؤ معروف کے لیے جو علامت ( ؤ ) اختیار کی گئی وہ بھی قباحت سے
خالی نہیں۔ یہاں بھی اعراب حرف ماقبل پر ہونا چاہیے تھا نہ کہ واؤ پر۔ واؤ سے پہلے حرف پر دیگر اعراب
یعنی زیر زبر پیش کی طرح الٹا پیش بھی لگایا جا سکتا تھا۔ کسرۂ معروف اور ضمۂ معروف دونوں کی اپنی
دو دو آوازیں ہیں، ایک کھینچی ہوئی دوسری مختصر کھنچی ہوئی۔ کھڑا زیر یائے معروف کے نیچے اور الٹا
پیش واؤ معروف پر لگانے کے بجائے اگر حرف ماقبل یعنی اس حرف پر لگائے جائیں جس پر وہ پڑھے
جاتے ہیں تو دوسرے حروف کے ساتھ بھی کسرۂ معروف و ضمۂ معروف کی کھنچی ہوئی کم کھنچی ہوئی
دونوں آوازوں کی نمائندگی کر سکتے ہیں۔" (صفحہ ۱۲، نیا دور لکھنؤ، جون، جولائی ۱۹۸۵ء)

اگر یہ بیان انتشار پھیلانے کی بدترین مثال نہیں تو پھر یہ کیا ہے۔ ڈاکٹر ابومحمد سحر کے پاس کوئی سسٹم نہیں اور اگر کوئی سسٹم ہے تو اس کی بنیاد
ہ نہیں ہے۔ کاش وہ صرف روایتی نظام ہی سے مدد لیتے تب بھی وہ چیزوں کو سہل بنا کر پیش کر سکتے تھے۔ کیونکہ روایتی نظام میں بھی جیسا کہ

ت کیا جا چکا ہے ' اعراب کا صوتی جواز موجود ہے۔ جس منطق سے انھوں نے ہجی میں لام الف کو رد کیا تھا اسی منطق کی رو سے کھڑے زبر اور کھڑے یر کا رد بھی لازم آتا ہے۔ لیکن وہ کھڑے زیر اور کھڑے زبر کو یائے معروف کے کھڑے زیر سے ملا کر نہ صرف غلط مبحث پیدا کرتے ہیں بلکہ گمراہی پھیلاتے ہیں۔ وہ چونکہ صوتیات نہیں جانتے انھیں معلوم نہیں کہ طوالتِ نون کے لیے اتنا جزم بھی ناگزیر نہیں۔ غور فرمائیے کہ وہی شخص جو حروف ہی کی تعداد میں تیس اضافے کا قائل ہیں' وہ اُسے ہر قیمت پر اڑتیس[(٢٦)] رکھنا چاہتا ہے (اگرچہ اڑتیس[(٢٦)] جیسا کہ ہم بتا آئے ہیں کوئی مقدس ہندسہ ہیں، اسماعیل میرٹھی کے یہاں یہ تعداد اکتالیس[(١١)] ہے) وہی شخص اردو کے اعرابوں کو جو چلن میں اکثر و بیشتر استعمال نہیں ہوتے، نو[(١٩)] سے بڑھا کر [(١١)] تک پہنچا دیتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان گیارہ[(١٢)] اعرابوں میں واؤ معدولہ کے نیچے چھوٹا خط شامل ہیں۔ گویا اس کو شامل کرلیں تو تعداد تیرہ[(١٣)] ہو جائے گی۔ فرماتے ہیں :

" واؤ معدولہ ہمیشہ خ کے بعد آتا ہے۔ مدرسے میں ایسے چند الفاظ آتے ہیں جنھیں طالب علم آسانی سے پہچان سکتا ہے' اور اسے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ان الفاظ میں واؤ لکھا تو جاتا ہے لیکن پڑھا نہیں جاتا۔ پوری زبان میں بھی واؤ معدولہ کے الفاظ کی تعداد بہت کم ہے۔ ان کو صحیح پڑھ لینا کوئی خاص مسئلہ نہیں " (ماہنامہ لکھنؤ صفحہ ١٢ جون جولائی ١٩٨٥ء)

ڈاکٹر اومحمد سحر جب صوتی حروف سے کام لیتے ہیں جو ان کا میدان نہیں تو وہ خطرناک طور پر پھسلتے ہیں۔ بیشک واؤ معدولہ خ کے بعد آتی ہے' خواب، خود، خورشید لیکن خ کے بعد اعلانی واؤ بھی تو آتا ہے۔ جیسے خون، خوب، خوف، خول وغیرہ۔ اعلان کے واؤ سے واؤ معدولہ کا فرق ابتدائی کتابوں میں کس طرح دکھایا جائے گا' اس کا کوئی جواب سحر صاحب کے پاس نہیں' اس لیے کہ کوئی سسٹم ان کے پاس نہیں۔

یہ سامنے کی بات ہے کہ اردو میں زیادہ تر اعراب کی ضرورت مصوتوں کو ظاہر کرنے کے لیے پیش آتی ہے۔ مثلاً زیر، زبر، پیش کا فرق یا یائے معروف اور یائے مجہول کا فرق جس سے لفظوں کے معنی بدل جاتے ہیں (مثلاً مِل، مَل، مُل یا میل میل) افسوس صد افسوس کہ اصلاح کی تجویزوں میں ماہروں نے مصوتوں کے اعراب کو بُری طرح الجھا دیا ہے۔ لسانیات کا بنیادی اصول کفایت اور سادگی ہے۔ یعنی جس اصول کے بیان میں جتنی زیادہ کفایت برتی جائے گی یا جتنی سادگی ہوگی اتنا اچھا وہ اصول ہوگا۔ مصوتوں کے اعراب میں ابھی تک سادگی کے نقطۂ نظر سے غور نہیں کیا گیا۔ یعنی جتنی ہم اعراب کی تعداد بڑھاتے جائیں گے کیا اردو پڑھنے والوں کی مشکلوں میں ہم اتنا اضافہ نہیں کریں گے۔ سوچنا چاہیے کہ اگر ہم اعراب کی تعداد کو گھٹا سکیں' تو کیا اردو پڑھنے اور لکھنے والوں کے لیے اتنی آسانی نہیں ہوگی۔ خاطر نشان رہے کہ اردو کا عام مزاج اعراب کے عدم استعمال کا ہے۔ اعراب کی ضرورت ابتدائی کتابوں میں' لغت میں' یا متن میں اجنبی الفاظ کے تلفظ کو ظاہر کرنے کے لیے پیش آتی ہے۔ یہ بات غور طلب ہے کہ لسانیات میں ایک چیز ہے صفر کا تصور' یعنی عدم نشان۔ بہت سی زبانوں میں اس تصور سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ تو ہم بھی کفایت اور سادگی کے پیش نظر کیوں نہ اس پر غور کریں' اس سے روایتی ڈھانچے پر کوئی ضرب نہیں پڑتی اور نہ کوئی انقلابی تبدیلی لازم آتی ہے۔ البتہ نظام ہجا ضرور متاثر ہوتا ہے۔ لیکن اگر سادگی اور آسانی کو ترجیح حاصل ہے تو تھوڑی سی تبدیلی گوارا کرنا ہی ہوگی۔ اردو میں مصوتوں کی بنیادی آوازیں دس ہیں۔ لیکن صحیح معنوں میں حرف صرف ایک ہے یعنی الف۔ یوں تو واؤ، چھوٹی ی اور بڑی ے بھی ہیں لیکن ہمیں معلوم ہے کہ ان کا صوتی کردار دہرا ہے۔ یعنی لفظ کے شروع میں ان کی حیثیت مصوتوں کی نہیں ہوتی۔ بہر حال چار حروف علت بھی مان لیں یعنی 'الف، واؤ، ی، اور ے' تو بھی ان سے دس مصوتوں کی آوازوں کا کام لینے کے لیے اعرابوں یعنی نشانات کی مدد لینے کی ضرورت ہے۔ اعراب کے بغیر دس آوازیں ظاہر ہی نہیں کی جا سکتیں۔ بیشک اردو کا عام رجحان اعراب کے استعمال کا نہیں۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ نئے تاریخی حالات میں ہندوستان اور پاکستان میں اہل زبان سے زیادہ غیر اہل زبان اردو پڑھتے ہیں۔ ان کے لیے کم از کم ابتدائی کتابوں میں اعراب کا استعمال ناگزیر ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ اعراب کا سادہ اور آسان ترین نظام وضع کیا جائے، جو روایت سے بھی دور نہ ہو اور صوتیات پر بھی مبنی ہو۔ یعنی جس کی صحت تجزیاتی اور سائنسی اعتبار سے ثابت ہو۔ خاکسار نے اس سلسلے بارے میں جو نظام پیش کیا ہے' اس میں دس مصوتی آوازوں کو تین سٹ میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جنھیں نہایت آسانی سے یاد رکھا جاتا ہے۔ پہلا سٹ الف کا ہے' دوسرا سٹ واؤ کا' اور تیسرا سٹ یائے کا۔ آئیے پہلے الف کے سٹ کو دیکھیں۔ اردو میں تین چھوٹی آوازیں یا حرکات تو سب کو معلوم

ں، یعنی زیر، زبر، پیش اور اس کے ساتھ بڑی آواز الف یا الف مد کو شامل کیجیے۔ یہ پہلا سیٹ ہوگا، جس کو یوں لکھا جاسکتا ہے:

| | | |
|---|---|---|
| اِ | (زیر) | (اِن، جِن) |
| اَ | (زبر) | (اَس، بَس) |
| اُ | (پیش) | (اُن، بُن) |
| آ | (الف/الف مد) | (آن، جان) |

دوسرا سیٹ واؤ کی تین آوازوں کا ہے۔ واؤ مجہول (مثلاً ڈھول، گول) واؤ معروف (اُون، خُون) اور واؤ ماقبل مفتوح (مثلاً اَور، غَور)۔ واؤ معروف کے لیے الٹے پیش کی سفارش ہے اور چلن میں بھی آچکی ہے۔ اسی طرح واؤ ماقبل مفتوح کے لیے زبر کی سفارش بھی روایت کا حصہ ہے۔ ان دو آوازوں کی پہچان الگ سے ہوگئی، یعنی واؤ معروف اور واؤ ماقبل مفتوح کی، تو کیا واؤ مجہول کے لیے الگ سے کسی نشان کی ضرورت ہے؟ یعنی جب سونا، پیتل، اور چاندی میں سے سونے اور پیتل کی پہچان ہوگئی تو کیا تیسری کی ہوئی چیز چاندی نہیں ہوگی؟ یہ اعراب کے عدم استعمال کا وہ تصور ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا۔ (اسے املا نامہ، دہلی ۲ ۷ ۹ ۱ء میں صفحہ ۷۵-۷۶ پر پیش کیا تھا) اردو اعراب میں سادگی لانے کے لیے اس تصور سے کام لینے کی شدید ضرورت ہے۔ یعنی وہ واؤ جو بغیر کسی نشان کے ہے وہ واؤ مجہول ہے۔ اس طرح واؤ کے سیٹ کی سادہ ترین شکل یہ ہوگی:

| | | |
|---|---|---|
| وٗ | (اُون، خُون) | واؤ معروف |
| وَ | (اَور، غَور) | واؤ ماقبل مفتوح |
| و | (ڈھول، گول) | واؤ مجہول |

تیسرا اور آخری سیٹ یائے کی آوازوں کا ہے۔ یہ سیٹ بالکل واؤ کی آوازوں کی طرح ہے۔ یعنی یائے معروف، یائے مجہول اور یائے ماقبل مفتوح۔ یائے معروف (مثلاً نیلا، پیلا) میں کھڑے زیر کا استعمال اور یائے ماقبل مفتوح (مثلاً سَیر، بَیر) میں زبر کا استعمال روایت اور چلن کا حصہ ہے۔ رہ گئی یائے مجہول کی پہچان تو اس میں واؤ مجہول کی طرح حذف اعراب سے کام لے سکتے ہیں، یعنی جو یائے معروف یا یائے ماقبل مفتوح نہیں، وہ یائے مجہول ہے۔ اس سیٹ کی سادہ ترین شکل یہ ہوگی:

| | | |
|---|---|---|
| یٖ | (نیلا، پیلا) | یائے معروف |
| یَے | (سَیر، بَیر) | یائے ماقبل مفتوح |
| یے | (سیر، بیر) | یائے مجہول |

مقتدرہ قومی زبان پاکستان نے املا کے مسائل پر جو کتاب شائع کی ہے، اس کے آخر میں ۱۴ سفارشات درج ہیں (اردو سمینار۔ املا، رموز اوقاف کے مسائل، مرتبہ اعجاز راہی، اسلام آباد ۱۹۸۵ء ص ۲۴۲-۲۴۶) نیز اخبار اردو، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، جنوری ۱۹۸۶ء کے شمارے میں بنیادی چودہ (۱۴) سفارشات کو بڑھا کر جو پچیس سفارشات شائع کی گئی ہیں۔ (ص ۱۵-۲۲) ان میں اعراب کے تحت زبر، زیر، پیش، مد، جزم اور تشدید یعنی صرف چھے اعراب درج کیے گئے ہیں۔ غالباً اردو کے تمام مصوتوں پر غور کرنے اور ان کے الگ الگ اعراب طے کرنے کا کام ابھی باقی ہے۔ انھیں طے نہ کیا گیا تو واؤ مجہول اور واؤ معروف کا باہمی فرق کس طرح ممکن ہوگا۔ ابتدائی کتابوں، لغت اور متن میں غریب الفاظ کے تلفظ کو ظاہر کرنے کے لیے تو اعراب کے بغیر چارہ نہیں۔ واؤ معروف کے لیے الٹا پیش اور یائے معروف کے لیے کھڑا زیر، بابائے اردو مولوی عبدالحق کے زمانے سے اب تک چلن میں آچکا ہے، اس کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ نیز چونکہ اردو کا مزاج اعراب کے عدم استعمال کا ہے، واؤ مجہول اور یائے مجہول کے بے صفر نشان یعنی اعراب کے عدم استعمال کے تصور کو بھی اپنا لینا چاہیے۔ یہ طریقہ نہ صرف نہایت آسان اور سادہ ہے بلکہ سائنٹفک بھی ہے، اور چلن اور مزاج کا بھی ساتھ دیتا ہے۔

## لسانیات اور ہجا

اہلِ روایت کے نزدیک ہجا کے بغیر اردو تدریس کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اس کا چلن روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے۔ اہلِ روایت کو گمان ہے کہ ایسا لسانیات کے عمل دخل کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ لسانیات / صوتیات ایسا کوئی حکم نہیں لگاتی کوئی آوازوں سے پڑھانا چاہے تو، اور کوئی ہجا سے پڑھانا چاہے تو لسانیات کسی طرح کا اعتراض نہیں کرتی۔ البتہ حروف کی آوازوں کا تصور استاد کے ذہن میں صاف ہونا ضروری ہے۔ صرف ایک مثال سے بات واضح ہو جائے گی، مثلاً اردو میں لفظوں کا آخری حرف ہمیشہ ساکن ہوتا ہے۔ اب یہ متحرک ہو ہی نہیں سکتا تو ہر بار اس کو ساکن یا موقوف کہلوانا کیا معنی رکھتا ہے۔ نیز 'رب' کے ہجے رے بے زبر رب بتائے جاتے ہیں۔ غور فرمائیے زبر یعنی مصوتہ 'رے' کے بعد وارد ہوتا ہے لیکن 'بے' کے بعد بتایا جاتا ہے۔ اسی طرح جب مان لیا گیا کہ 'کھ'، 'پھ'، 'تھ' ہکاری آوازیں ہیں اور ان کا درجہ مفرد آوازوں کا ہے تو ان کو بے زبر دو چشمی ہے بھ کہنا کس حد تک صحیح ہے۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر لکھتے ہیں: "ان کے ہجے کا طریقہ بے دو چشمی ہے زبر بھ... بتانا چاہیے۔ ان سے بننے والے لفظوں کے ہجے بھی اسی طرح بتانا چاہیے مثلاً گاف دو چشمی ہے رے زبر گھر" (اردو کے قاعدے ص ۱۶) گھر کے ہجے میں خود اپنے اصول کی رو سے جو دوسرا زبر بنانا چاہیے تھا اس کو سحر صاحب گول کر گئے، یعنی اگر گھ کے ہجے "گاف دو چشمی ہے زبر" ہیں، تو گھر کے ہجے "گاف دو چشمی ہے زبر، رے زبر گھر" ہوئے۔ غور فرمائیے۔ CVC ساخت (C = مصمتہ اور V = مصوتہ) کے چھوٹے سے لفظ کے لیے ہم نے ہجوں کے لیے پانچ نام استعمال کیے۔ کفایت کے خلاف تو ہے ہی، مضحکہ خیز بھی ہے۔ اسی طرح 'پھول' کے ہجے ہوئے "پے دو چشمی ہے، واؤ الٹا پیش لام موقوف" یا 'ٹھنک' کے ہجے ہوئے "ٹے دو چشمی ہے زبر یائے نون غنہ کاف موقوف"۔ یہ الفاظ صرف ایک صوتیہ رکن کے ہیں، یعنی CVC (مصمتہ + مصوتہ + مصمتہ)۔ تعلیم و تدریس کے تمام جدید نظریے آوازوں کی مدد سے لفظوں کو پڑھانے کی تائید کرتے ہیں۔ حروف کے نام اور ترتیب جاننا تو ضروری ہے لیکن لفظوں کے جوڑ آوازوں سے بنتے ہیں حروف کے ناموں سے نہیں۔ پھر اس میں آسانی، محنت و کوشش کی کفایت اور وقت کی بچت بھی ہے۔ لیکن اگر اہلِ روایت کو ہجوں کے قدیم طریقے پر اصرار ہے تو لسانیات اس میں مانع نہیں آتی۔

## لسانیات اور املا کی متبادل شکلیں

لسانیات کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ واقعے سے بحث کرتی ہے، قدر سے نہیں، یعنی اس کا کام تجزیہ کرنا / وضاحت کرنا ہے۔ تجویز کرنا یا سفارش کرنا نہیں۔ لسانیات سائنسی طور پر یہ بتا سکتی ہے کہ صوتی اعتبار سے کیا صحیح ہے اور کیا غلط، لیکن اگر کوئی چیز چلن میں آ چکی ہے تو سماجی لسانیات اس کو رد نہیں کر سکتی یعنی اس کو غلط قرار نہیں دے سکتی۔ چلن میں ایک لفظ کو لکھنے کی ایک سے زیادہ شکلیں ہو سکتی ہیں، سماجی لسانیات ان میں سے کسی کو غلط قرار نہیں دیتی۔ بلکہ یہ کہتی ہے کہ فلاں لفظ کے املا کی فلاں فلاں شکلیں FREE VARIATION (آزادانہ تبادل) میں ہیں۔ یعنی ایک کے بجائے دوسری شکل استعمال ہو سکتی ہے کیونکہ اس سے معنی کا فرق لازم نہیں آتا مثلاً 'کیا جائے گا'، 'دیکھیے' اور 'دیکھئے' اردو املا میں آزادانہ تبادل میں ہیں۔ لیکن ہم نے ہمزہ کے سادہ سے اصول کی مدد سے مرجح شکل یعنی 'دیکھیے' کا تعین کر دیا، لیکن ہر جگہ حل اتنا آسان نہیں۔ مثلاً آزمایش، نمائش، ستایش، پایندہ، قایم، کو بعض لوگ ازروئے اصل یائے سے لکھتے ہیں۔ ازروئے صوت یہ لفظ ہمزہ سے ہیں۔ اور ہمزہ سے بھی لکھے جاتے ہیں۔ گویا اردو میں 'آزمایش' اور 'آزمائش' اور اس قبیل کے تمام الفاظ کا دہرا املا یعنی آزمائش یائے سے یا ہمزہ سے آزادانہ تبادل میں ہے۔ گویا لسانیات میں متبادل املا کی صورتوں کو جائز مان لینے کی گنجائش ہے۔ معیار بندی کے لیے ترجیحات اور اصول طے کرنا اگرچہ ضروری ہے، اس کے باوجود چلن میں بعض دوسری شکلیں بھی رہیں گی۔ ان پر چیں بہ جبیں ہونے کی ضرورت نہیں، زبان میں تبدیلی حکم لگانے سے نہیں ہوتی۔ ہمارا کام اصولوں کو واضح کر دینا ہے۔ جیسے جیسے ان کا عرفان عام ہوتا جائے گا یہ چلن میں آتے جائیں گے۔

خاکسار نے ہمزہ اور اضافت کے تحت 'اردوئے معلی' 'نوائے ادب' وغیرہ ترکیبوں میں ہمزہ کی تائید کی ہے۔ لیکن اگر کوئی غالب کے تتبع میں ایرانی روایت کے تتبع میں 'اردوے معلی' 'نواے ادب' لکھتا ہے تو آزادانہ تبادل کے اصول کے تحت اس کو بھی غلط نہیں کہا جا سکتا۔" املا نامہ میں (۱) 'آزمایش' کے ساتھ 'آزمائش'، (۲) 'یہ' کے ساتھ 'یہ' لکھنے اور (۳) 'بلکہ'، 'چونکہ'، 'چنانچہ' کی مروجہ ملی ہوئی شکلوں کو بھی صحیح قرار دینے کے لیے راقم الحروف نے جو رائے پیش کی تھی، وہ آزادانہ تبادل کے اسی اصول کے تحت تھی۔ (ملاحظہ ہو 'املا نامہ' دہلی ۱۹۷۴ء

۶۸، ۵۹ اور ۷۷)۔

تلفظ اور املا کے تنوع کے بارے میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا یہ قول ہمیشہ سامنے رہنا چاہیے ۔

"املا کے قاعدے کیسے ہی ہمہ گیر اور مکمل (کیوں نہ) بنائے جائیں، زبان کی پوری اور سچی ترجمانی اس سے مشکل ہی سے ہو سکتی ہے۔ ایک 'کوئی' کا لفظ ہم کئی طرح ادا کرتے ہیں"

اس سے بحث کرتے ہوئے منظفر علی سید نے اپنے مقالے "حرف و صوت کا رشتہ" میں صحیح لکھا ہے :

"کوئی کا لفظ ایک مصمتہ اور دو یا تین مصوتوں پر مشتمل ہے، جن کا اشباع اور تخفیف LENGTHENING AND SHORTENING دونوں ممکن ہیں ۔ غالب نے ایک مشہور غزل میں اس کو ردیف بنا کر 'فعلن' کے وزن پر باندھا ہے ۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی

جبکہ فیض نے ایک ہی مصرعے میں اس ایک لفظ کو دو مختلف طریقوں سے برتا ہے :

دے کوئی سکھ دہائی، کوئی پائل بولے

ان میں پہلا کوئی وتد مجموع ہے، 'فعل' کے وزن پر اور دوسرا سببِ ثقیل ہے' دو متحرک حروف کے برابر۔

غالب ہی نے ایک اور جگہ اسے 'فاع' کے وزن پر نظم کیا ہے :

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار

جب کہ یہی "کوئی" میر و سودا کے دور میں ایک سببِ خفیف' یعنی 'فع' کے وزن پر بھی استعمال ہوا کرتا تھا' خواجہ میر درد کا شعر ہے :

انداز وہ ہی سمجھے مرے دل کی آہ کا

زخمی جو کوئی ہوا ہو کسی کی نگاہ کا

(مشمولہ روداد سمینار - املا و رموزِ اوقاف کے مسائل مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۸۵ ص ۱۰۱)

گو یا شعری اوزان اور اس کی ضرورت کی خاطر "کوئی" لفظ "فعلن" کے وزن پر بھی باندھا جاتا ہے۔ اور "فعل" "فاع" اور "فع" کے وزن پر بھی۔ لیکن ایک ہی طرح سے جاتا ہے۔ جس طرح تلفظ میں بعض لفظوں میں "آزادانہ تبادل" جائز ہے' اس طرح املا میں بھی اس کو ناجائز نہیں سمجھنا چاہیے اور کچھ نیش رہنے دینی چاہئیں۔

## لسانیات اور سیاست

اردو املا کی معیار بندی کے سلسلے میں بابائے اردو مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سے لے کر اب تک یعنی معاصر ادیبوں کی کوششوں میں، جو بھی کام ہوا ہے' اس کا کسی سیاسی جذبے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہندوستان کے اہل قلم کی کوششوں کی خواہ وہ اہل روایت کی ہوں یا اہل لسانیات کی، اس نوع کی تاویل کرنا ان کے خلوص نیت پر شبہ کرنا ہے جو کسی طرح مناسب نہیں۔ اس نوع کی کوششیں آزادی سے پہلے بھی ہوتی رہی ہیں اور ہندوستان اور پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد بھی جاری ہیں۔ جس طرح اس حقیقت میں کلام نہیں کہ اردو رسم خط اصلاً سامی خاندان سے ماخوذ ہے' اسی طرح اس حقیقت میں بھی کلام نہیں کہ اردو آریائی خاندان کی زبان ہے۔ چنانچہ اردو کے ضمن میں جہاں عربی فارسی اثرات کی بحث ناگزیر ہے' وہاں ہند آریائی یعنی دیسی تقاضوں کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ چنانچہ اگر ان مباحث میں کسی نے دیو ناگری یا ہندی کا حوالہ دیا' تو اس کو کسی طرح کی سیاست سے جوڑنا حق و انصاف کا خون کرنا ہے۔ جس طرح عربی فارسی اثرات کی بحث غیر علمی نہیں ہو سکتی'

اسی طرح ناگری کا حوالہ بھی غیر علمی نہیں ہے۔ البتہ ان باتوں کو شک و شبہہ کی نظر سے دیکھنا غیر علمی رویہ ہے۔

اردو ایک زندہ زبان ہے۔ زندہ زبانوں میں STANDARDISATION یعنی معیار بندی ایک نامیاتی عمل ہے۔ املا کی معیار بندی ہندوستان میں اور پاکستان میں دونوں جگہ اردو کی ترقی و ترویج کے اسی نامیاتی عمل کا حصّہ ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد کے املا سیمینار میں پڑھے گئے مقالات میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور مظفر علی سیّد نے چلن اور صوت دونوں کو اہمیت دی ہے۔ اس بارے میں راقم الحروف کا مسلک کم و بیش وہی ہے جس کو مظفر علی سیّد نے یوں بیان کیا ہے:

"املا کو اگر روایت کا ایک مظہر قرار دیا جائے اور صوتیات کو اجتہاد کا، تب بھی روایت اور اجتہاد میں ایک متوازن مطابقت کو ممکن بنانا اہلِ علم کے تہذیبی کردار کا تقاضا ہوگا۔" (بحوالہ مذکورہ ص ۱۰۴) مجھے اس رائے سے اتفاق ہے۔ یہ علمی رائے ہے۔ جو حضرات غیر علمی توجیہات کرتے ہیں وہ مناسب ہیں۔

---

## ● اختتامیہ

خاکسار نے ۱۹۶۶ء میں عرض کیا تھا اور اب بیس برس بعد ۱۹۸۶ء میں پھر اسی کے اعادے کی ضرورت ہے کہ معیار بندی کے اصولوں کو سادہ اور آسان بنانے کی ضرورت ہے۔ زندہ زبانوں میں اصلاح اور توسیع کا عمل ناگزیر ہے۔ اردو زندہ زبان ہے۔ اردو املا کے اصولوں کو آسان، سادہ اور سہل بنانا وقت کی ضرورت ہے۔ مادری زبان کے طالب علموں، دوسری زبانوں کے طالب علموں، غیر ملکی طالب علموں سب کے لیے املا کی معیار بندی اور قاعدہ بندی وقت کی آواز ہے۔ کاتب، ٹائپسٹ، ٹیلی پرنٹر، کمپوزر اور کمپیوٹر پروگرام کی ضرورتوں کو بھی نظر میں رکھیے۔ بیس برس پہلے خاکسار نے ہمزہ والا اصول، اور اضافہ والا فارمولا مستقبل کی ضرورتوں کو نظر میں رکھ کر پیش کیا تھا۔ ان بیس برسوں میں کمپیوٹر ہندوستان اور پاکستان میں آ پہنچا ہے۔ مزید پچیس تیس برسوں میں اطلاعات رسانی اور طباعت میں اس کا چلن بڑھے گا۔ چنانچہ املا کے کھاتے پر سبھی سادہ اصول اور قاعدہ بندکرنے ہی ہوں گے۔ خاکسار کا معروضہ یہی ہے کہ آپ اور ہم ایسا نہیں کریں گے تو آنے والے لوگ کریں گے۔ روایت اور لسانیات کی آگہی کو ملانے سے نہایت سادہ اور صحیح اصول وضع کیے جا سکتے ہیں اور آسانیاں پیدا کی جا سکتی ہیں۔ اس میں نہیں کہ ہر اصلاح اور ہر تجویز چلن اور رواج کے تابع ہے۔ ثقافتی اثرات اور تقاضوں کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لسانی معاملو حکم لگانا اپنے حمق کا اشتہار دینا ہے۔ روایت کے علمبرداروں میں حکم اور رعونت کا انداز ہم نے اکثر دیکھا ہے جو ناسمجھی کی دلیل ہے۔ لیکن لسانیات سے واقفیت رکھنے والا کوئی شخص اگر حکم لگانے کی کوشش کرتا ہے تو میں عرض کروں گا کہ وہ لسانیات کا مزاج شناس نہیں ہے اور اس کو لسانیات کی نمائندگی کا حق نہیں۔ لسانیات کا کام روشنی فراہم کرنا ہے۔ اس روشنی کا صحیح یا غلط استعمال ہمارا کام ہے۔ تاہم اگر کوئی کسی علم کی روشنی پر بند کرتا ہے تو اس سے علم کا تو نقصان نہیں ہوتا۔ ہم خود ہی تاریکی میں گھر جاتے ہیں اور ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ آفتابِ تازہ تو بطنِ گیتی سے پیدا ہو ڈوبے ہوئے تاروں کے ماتم میں مصروف رہنا مستحسن نہیں روشنی دریچوں تک آ پہنچی ہے، البتہ روشنی سے استفادے کے لیے دریچے کھولنا ضروری





اکرم نجمی

نئی بارش کا پانی چاہتا ہوں
میں دریا ہوں روانی چاہتا ہوں

بلندی ڈھونڈتا ہوں پستیوں میں
زمینیں آسمانی چاہتا ہوں

نئے روشن دنوں کی آرزو ہے
نئی صبحیں سہانی چاہتا ہوں

بسنتی آسمانوں کی ہے خواہش
زمینیں زعفرانی چاہتا ہوں

جو تیرے قرب کے لمحے سے پاؤں
وہ عہدِ جاودانی چاہتا ہوں

کرسمس کی تر و تازہ سحر میں
تری کافر جوانی چاہتا ہوں

نئے احباب کا عاشق ہوں لیکن
وہی رسمیں پرانی چاہتا ہوں

جو ہیں محروم اکبرؔ زندگی سے
میں ان کی زندگانی چاہتا ہوں

شعبۂ اردو، اسلام آباد کالج برائے طلبہ جی۔ ۶/۱ اسلام آباد پاکستان



اویس احمد دوراں

## آخری کروٹ

مرے لبوں سے اگر چھن گئی ہنسی تو کیا
نظامِ جبر لئے فوج اتر گئی تو کیا
لہو میں ڈوب گئی میری ہر گلی تو کیا
مرا وجود مٹا دے کوئی یہ ناممکن
اجل کی نیند سلا دے کوئی یہ ناممکن

لہو لہان ہوں پھر بھی سپر نہ ڈالوں گا
گراس روٹ کی سطحوں سے پھر میں ابھروں گا
میں زندگی کا نیا پھول بن کے مہکوں گا
جلے چراغ ہواؤں کی زد پہ روشن ہیں
ابھی چمن میں کروڑوں مرے نشیمن ہیں

یہ رات آخری ہچکی ہے ظلم و ظلمت کی
یہ رات آخری کروٹ ہے بربریت کی
یہ رات آخری تاریخ ہے نحوست کی
اب اس کے بعد یقیناً مری سحر ہوگی
یہیں پہ ختم مرے غم کی رہگذر ہوگی

محمد فیض اللہ خان، دربھنگہ (بہار)



يوسف ناظم

۱۹ ر نیو دیپ پلاٹ نمبر ۱۳، باندرہ ریکلیمیشن، بمبئی - ۴۰۰۰۵۰

# شکوہ کاتبوں کا

دنیا میں سب کے دن کبھی نہ کبھی ضرور پھرتے ہیں لیکن نہیں پھرے ہیں تو کاتبوں کے دن اب تک نہیں پھرے ہیں۔ ایک زمانے سے یہ لوگ آسمان کی طرف نظریں جمائے منتظرِ کرم ہیں لیکن جب کبھی آنہیں جھکا کر ان لوگوں کی نظریں آسمان پر لگی ہوتی ہیں اس لیے کتابت میں کچھ نہ کچھ ہیر پھیر تو ہو ہی جاتا ہے۔ کتابت کے بارے میں ہماری رائے ہے کہ یہ بڑی محنت کا فن ہے اور ناقدری سے یہ ہماری روایت رہی ہے کہ ہمارے یہاں جتنے بھی محنت کرنے والے اصحابِ شغف ہیں ہمیشہ زیرِ اعتراض رہے ہیں۔ مزدور طبقے پر ہر شخص کلیم الدین احمد کی طرح بار بار تنقید ہی کرتا رہتا ہے۔ (گو اس کے کچھ معنے نہیں ہوتے) انھی تنقیدی اقوال اور تہدیدی کلمات سے یہ سہم کر رہ جاتے ہیں (دھوبی بیچارے گھاٹ رہتے ہیں، درزی دستِ درازی چیز ہی نہیں دیتا۔ دودھ والا روزانہ دیر سے آتا ہے ان کے علاوہ اور بھی بہت سے کام کرنے والے لوگ ہیں جو اس قسم کے طعن و تشنیع کے زیرِ سایہ اپنے روز و شب گذارتے ہیں۔ ان میں سے بعضوں کو ہم نے اپنی شان میں ہدیہ کلام سن کر مسکراتے اور ہنستے بھی دیکھا ہے (یہ لوگ بنیادی طور پر خوش مزاج ہوتے ہیں) کاتبوں کے بارے میں بھی کئی باتیں مشہور ہیں۔ زبانی بھی اور تحریری طور پر بھی۔ ان باتوں میں سچائی کم اور الزام زیادہ۔ یہی وجہ ہے ہمارے یہاں کتنا جر اس زمانے میں سیدھی بات الٹی بہنے لگی ہے کہ گنگا نے اپنی کروٹ [illegible] کرنے سے زیادہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ اسے از سرِ نو صحیح سمت میں بہایا جائے۔ کاتبوں کے بارے میں کیا کچھ کہا جا رہا ہے سب جانتے ہیں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ان کے بارے میں کیا کچھ نہیں کہا گیا ہے۔ خود ان لوگوں نے کبھی سوال اور دعا منصفانہ میں کوئی نہیں سوچتا۔ ادیبوں، شاعروں اور مدیرانِ جرائد نے کاتبوں کو اتنا بدنام کر دیا ہے کہ [illegible] ان کی آبرو ہی نہیں رہ گئی ہے۔ (قصیدے اور ہجویات اب اس لیے بھی نہیں لکھی جاتیں

ہیں کہ کوئی نئے مضامین ہی نہیں ہیں جو ان میں پیش کیے جائیں) کاتب مطعون بہت ہیں لیکن کتابیں برابر چھپ رہی ہیں بلکہ بعض وقت تو سوچنا پڑتا ہے کہ آخر اتنی کتابوں کی ضرورت کیا ہے۔ رسالے برابر شائع ہو رہے ہیں۔ اخباروں کی ریل پیل ہے۔ دیواری اشتہاروں، پوسٹروں اور بینرز کی تو بات ہی مت پوچھیے۔ آخر یہ سارا سامانِ عیش و طرب کس کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ سب چیزیں خواہ لائقِ دید ہوں یا قابلِ ذکر کاتب ہی تو بناتے ہیں۔ الیکشن کے امیدوار تو اپنے پوسٹر لکھنے سے رہے (انھیں کوئی فن آتا تو الیکشن میں کھڑے ہی کیوں ہوتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انھیں جو کچھ آتا ہے وہ بھی فن ہی ہے لیکن یہاں فن سے ہماری مراد کوئی ایسا فن ہے جو محنت طلب ہو)۔

ادیب اور شاعر اپنی تخلیق کو "نتیجۂ فکر" کا نام دیتے ہیں حالانکہ فکر تو کاتب کو ہوتی ہے جس نے اس تخلیق کو مسطر پر منتقل کرنا ہے۔ ادیب اور شاعر (یعنی ہمارے ادیب اور شاعر) یہ کہتے ہیں وہ تخلیق کے کرب سے گذرتے ہیں لیکن انھیں اس کرب کا اندازہ نہیں ہے جس سے کاتبوں کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ فنی کرب یہ آج کا قلم سا اٹ ہو جاتا ہے۔ صحیح معنوں میں اگر پرورشِ لوح و قلم کوئی کرتا ہے تو کاتب ہی کرتے ہیں۔ ان کی انگلیاں فن کی نگار ہوتی ہیں۔ خون جیسا ہوتے دیا لوگ ہیں ان کے پاس اس لیے نہیں ہوتا کہ ہر قسم کی تحریریں [illegible] کرتے کرتے ان کا خون خشک ہو چکا ہوتا ہے۔

کاتبوں کی نظر سے کیا کیا نادر گذرتے ہیں یہ ابھی کہا ہے۔ خوش خطی کے جو نمونے انھیں بالجبر و اکراہ دیکھنے پڑتے ہیں کے ماہرین نے کبھی نہیں دیکھے ہوں گے۔ ماہرینِ کتابت خطوں کے اقسام سے واقف ہوتے ہیں۔ خطِ نسخ، خطِ نستعلیق، خطِ [illegible] خطِ رقاع اور اس طرح کے کئی خط لیکن ادیب اور شاعر کس

خط میں لکھتے ہیں یہ انھیں آج تک نہیں معلوم ہو سکا۔ (شاعر صرف خط بدن سے واقف ہوتے ہیں اور نثر نگار تو یہ بھی نہیں جانتے)۔

مدیران جرائد اور ناشرانِ کتب نے جب یہ دستورِ قلم بندی نافذ کیا ہے کہ کاغذ کے دونوں طرف قلم نہ دوڑایا جائے مصنّفین نے عالمِ طیش میں اپنا خط اور بگاڑ لیا (حالاں کہ گنجائش کم تھی) اور اب تو وہ انتقاماً اسٹیشنری بھی ایسی استعمال کرنے لگے ہیں جو اجناس کی طرح تُل کر بکتی ہے۔ مضمون نگار کی جولانیِ طبع جب شدّت اختیار کرتی ہے تو اس کی نوکِ قلم سے اس اسٹیشنری میں جگہ جگہ شگاف پڑ جاتے ہیں (یہ کاغذی مین ہول ہوتے ہیں)۔ روشنائی کے قطرات ان شگافوں سے گذر کر دوسرے کاغذ پر بھی گُہر انداز ہوتے ہیں لیکن مصنّف اس کاغذ کو بھی اپنے رشحاتِ قلم سے مزیّن کرنے میں فرحت محسوس کرتا ہے۔ کاتب کے دل کے پھپھولوں کو جلا دینے کے لیے کاغذ پر پھیلے ہوئے یہ داغ بھی بہت کافی ہوتے ہیں۔

مضمون نگار اور شاعر اب اجلے کاغذوں پر نہیں لکھا کرتے۔ اس عادت کو ترک کیے ہوئے انھیں کئی دن ہو گئے۔ یہ لوگ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسا کاغذ لاتے ہیں جس کے رنگ کو گندمی اس لیے نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے گندم جیسی بہشتی چیز کی تضحیک ہوگی۔ اس رنگ کو مٹیالا کہنے میں بھی تھوڑا بہت تامّل ہی ہوتا ہے۔ اس نادر و نایاب کاغذ پر وہ لکھتے بھی ایسی سیاہی سے ہیں جو صرف رو سیاہی کے لیے موزوں ہو سکتی ہے (اشارہ رقیب کے چہرے کی طرف ہے)۔ جیسے جیسے یہ لکھتے ہیں تحریر کا رنگ اڑتا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ کاتبوں کے مقدر میں لکھا ہوتا ہے۔

اسٹیشنری اور روشنائی تو ضمنی چیزیں ہیں۔ اصل چیز ہے مصنّف کی تحریر نویسی۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا کے مہذب ہو جانے کی وجہ سے حشرات الارض کی بھی عادات و اطوار میں کافی تبدیلیاں عمل میں آئی ہیں اور آج اگر ان میں سے چیدہ چیدہ حشرات الارض کو روشنائی میں غسل دے کر سفحۂ قرطاس پر چلنے کے لیے چھوڑ دیا جائے تو یہ کیڑے بھی کاغذ پر چلتے وقت راہِ مستقیم پر چلنے کی کوشش کریں۔ بالکل ایک سیدھ میں چلیں گے اور ان کے نقوشِ قدم میں بھی کچھ نہ کچھ تناسب ضرور پایا جائے گا لیکن آج تک ادب کی تاریخ میں ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا کہ مصنف کی لکھی ہوئی ایک سطر بھی سیدھی راہ پر چلی ہو اور اس کی لکھی ہوئی پہلی سطر دوسری سطر کی ہم شکل ہو سکی ہو۔ سطروں کو قابو میں رکھنا کسی بھی مصنّف سے ممکن نہیں ہو سکا ہے۔ جو مصنف اسکول جانے والے بچّوں کی طرح لکیر دار کاغذ استعمال کرتے ہیں وہ بھی ان لکیروں پر اپنے قلم کے توازن کو برقرار نہیں رکھ سکے ہیں۔ لکھنے کے جوش میں وہ سطروں کے درمیان آ جاتے ہیں، اپنی دانست میں شاید یہ سمجھتے ہوں کہ سطروں کے درمیان لکھنے کی بنا پر وہ بین السطور لکھ رہے ہیں۔ اصل میں اہلِ قلم کے قلم بھی ڈسکو ڈانس کرنے لگے ہیں۔

ان کا خط بعض وقت اتنا شکستہ ہوتا ہے کہ شکستِ ناروا کا شاہکار نظر آتا ہے اور جب سے اردو املا اصلاح خانے میں داخل ہوا ہے ہر ادیب کا املا، دوسرے ادیب کے املے سے مختلف ہو گیا ہے۔ [جہاں تک تحریر اور کلام کا تعلق ہے ان میں البتہ یہ غضب کی یکسانیت ہوتی ہے]۔ املے کے معاملے میں ایسی معاملہ بندی اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ یہ سب کچھ کاتبوں کو سہنا پڑتا ہے اور املے کی ساری غلطیاں انھیں ہی درست کرنی پڑتی ہیں۔ رسالوں کے مدیر اور کتابوں کے ناشر صاحبان یہ سمجھتے ہیں کہ پروف ریڈنگ کی ضرورت کتابت کے ختم ہونے پر ہوا کرتی ہے۔ یہی وہ بنیادی غلطی ہے جو برسوں سے منعقد ہوتی چلی آ رہی ہے۔ پروف ریڈنگ کتابت شروع ہونے سے پہلے ہونی چاہیے۔ بعد میں بھی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ دیواروں پر بھی رنگ و روغن کیا جاتا ہے تو فائدہ ڈبل کوٹنگ ہی سے پہنچتا ہے لیکن کسی بھی دیوار پر رنگ اس وقت تک نہیں کیا جاتا جب تک دیوار کو اچھی طرح صاف نہ کر لیا جائے [صحیح لفظ کھرچنا ہے]۔ کاتبوں کا کام یہ نہیں ہے لیکن انھیں کرنا پڑتا ہے۔ بعض تحریروں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کبھی کبھی دو دو تین تین کاتبوں کو آپس میں تبادلۂ خیال کرنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر صحیح لفظ برآمد ہوتا ہے۔ ایک پروف ریڈنگ کتابت سے پہلے اور ایک کتابت کے بعد، اس لیے بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اردو میں ریڈر شپ بس اتنی ہی رہ گئی ہے۔

کچھ اہلِ قلم، جو مخلوط سوسائٹی کی پیداوار ہوتے ہیں دو دو تین تین الفاظ کو ایک دوسرے سے مخلوط کر کے لکھتے ہیں۔ ان الفاظ کو ایک دوسرے سے چھڑانا دشوار تو نہیں ہوتا لیکن یہ پہلی نظر میں گرفت ہی میں نہیں آتے۔ کاتبوں کو نظرِ ثانی استعمال کرنی پڑتی ہے اور اس طرح ایک ہی مضمون کی کتابت میں نظرِ ثانی کی کئی منزلیں آتی ہیں۔ ان کے برے کچھ اہلِ قلم بے حد علاحدگی پسند ہوتے ہیں۔ پرانے سے پرانے الفا لکھیں گے لیکن نئی شکل میں۔ درآنحالیکہ کو درآں حالے کہ، لکھ کہاں تک جائز ہے۔ ایک مصنّف نے تو دفورِ تحریر میں حقیقت کے ا بھی دو ٹکڑے کر دیے۔ [آپ کا جی چاہے تو اسے لطیفہ سمجھ لیجیے کیا واقعات لطیفہ نہیں ہوتے]۔

یہ بھی سُنا گیا ہے کہ کاتبوں کی کل رائے یہ ہے کہ نثر نگاروں۔

مقابلے میں شاعروں کا خط اچھا ہوتا ہے۔ شاعروں کو لکھنا ہی کتنا پڑتا ہے۔ جملہ ۱۴ مصرعے بلکہ بعض وقت تو اس سے بھی کم۔ مختصر تحریریں لکھنے والے شاعروں کو تو اور بھی سہولت ہے۔ [ ویسے شاعری میں اب نئی نئی مراعات کی وجہ سے شاعروں کو شاعری بھی نہیں کرنی پڑ رہی ہے ] ایک غزل لکھنے میں صرف چند منٹ صرف ہوتے ہیں اور اگر شاعر دل پر جبر کرے تو اچھا لکھ سکتا ہے۔ نثر نگار کی مشکل یہ ہوتی ہے کہ اُسے کئی صفحے لکھنے پڑتے ہیں۔ خیالات محدود بھی ہوں تو انھیں پھیلانا پڑتا ہے۔ اپنے قلم کی روانی کو روکنا ان کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ عجلت نویسی کی وجہ سے کچھ الفاظ ہی چھوٹ جاتے ہیں۔ نقطوں کا تو ذکر ہی مت کیجئے۔ وہ حرف قاف لکھتے ہیں تو اس پر صرف ایک نقطہ لگاتے ہیں اور ف کو یونہی بے نقطہ چھوڑ دیتے ہیں۔ برہنہ سر۔ اس لیے اگر کاتب صاحبان کی رائے میں شاعر زیادہ خوش خط ہوتے ہیں تو نثر نگاروں کو اپنا دل چھوٹا نہیں کرنا چاہیئے۔ [ یوں بھی صرف خوش خط ہونا کوئی خوبی نہیں ہے ] لیکن ہم نے چند ایسے نثر نگار بھی دیکھے ہیں جن کی خوش خطی کی داد دینے کو جی چاہتا ہے [ کاش وہ اپنی تحریر کو بھی اتنا ہی دل پذیر بنا سکتے ] ایسے خوش خط نثر نگاروں کے مسودے اپنی صوری خوبیوں کی پیروی الصور کانٹ کے حوالے کر دیے جاتے ہیں۔ یہ نکتہ کئی مصنفوں کی سمجھ میں آ گیا ہے اور اب وہ خوش خطی پر زیادہ محنت کرنے لگے ہیں۔ ان کے زیادہ چھپنے کی وجہ ان کی خوش نویسی ہے۔

کاتبوں کی یہ بھی رائے ہے کہ بدخط ہونا کوئی لاعلاج مرض نہیں ہے۔ اس مرض میں قباحت بس یہ ہے کہ اس کے ڈاکٹر نہیں ہوتے مریض کو خود ہی اپنا علاج کرنا پڑتا ہے اور اگر مریض تن دہی سے کوشش کرے تو صحت شفا یاب ہو سکتا ہے۔ پوری طرح وہ شفا نہ بھی پائے تو مرض میں افاقہ بہرحال ہو سکتا ہے۔

قدما نے خوش نویسی کے کچھ گُر مقرر کیے ہیں اور سہولت کی خاطر اپنی کچھ تصویریں بھی پیچھے چھوڑی ہیں جن کے عکس شائع ہو چکے ہیں۔ ان تصویروں کا بغور مطالعہ خوش نویسی کے بہت کام آتا ہے۔ اس ضمن میں جو قاعدے مقرر ہیں ان میں پہلا قاعدہ یہ ہے کہ لکھتے وقت محرّر کی نشست کا انداز صحیح ہونا چاہیئے [ محرّر سے مراد منشی نہیں ہے بلکہ ہر وہ شخص جو لکھنے کی کوشش کرے ] نشست میں مستقل مزاجی بھی ضروری ہے کسی تصویر کا ماڈل بن کر بیٹھنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن بار بار پہلو نہیں بدلنا چاہیئے۔ اس طرح تحریر میں الفاظ، جنگل کے خودرو پودوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور کبھی کبھی خس و خاشاک نظر آتے ہیں۔ روشنی کا رخ بھی اصولِ طب کے مطابق ہونا چاہیئے۔ روشنی بائیں سمت سے آئے تو مفید رہتی ہے کبھی کبھی اخبار یا رسالے کے دفتر میں روشنی ہی کا انتظام نہیں ہوتا تو بائیں سمت اور دائیں سمت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ ایسی جگہوں پر فن کتابت رو بہ زوال نہیں ہو گا اور کیا ہو گا۔ یہ مقامات روزناموں یا ماہناموں کے نہیں، اغلاط ناموں کے مرکز ہوتے ہیں۔

ہمیشہ ایک زانو بیٹھ کر لکھنا چاہیئے۔ صحیح نمونہ کسی تصویر سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ دو زانو ہو کر بیٹھنا قطعی نا مناسب ہے اس طرح صرف اس وقت بیٹھنا چاہیئے جب زانوئے تلمذ تہہ کرنا مقصود ہو۔ دیوار سے ٹیک لگا کر لکھنا زیادہ سہولت بخش ہوتا ہے۔ کلپ والا بورڈ گھٹنے پر اس طرح رکھنا چاہیئے کہ وہ لرزنے نہ پائے [ گھٹنا بھی اپنا ہی ہونا چاہیئے ] نیچے نرم گدا اور پیچھے ایک تکیہ ہو تو کیا کہنے۔ کوئی طویل مضمون لکھنا ہو تو چھوٹے تکیے کی بجائے گاؤ تکیہ بہتر ثابت ہو گا۔ ادب میں یوں بھی تکیہ بہت ضروری چیز ہے۔

ایک اور طریقہ جھک کر لکھنے کا بھی ہے۔ اس طریقے میں کاغذ فرش پر رکھے جاتے ہیں اور محرّر یا تو اس طرح بیٹھتا ہے کہ پاؤں کے پنجے کاسۂ دار لگوں بن جاتے ہیں اور محرّر اپنی ایک کہنی پر اپنا وزن ڈال کر تقریباً زمین بوس ہو جاتا ہے۔ اس آسن میں خط تو خراب ہوتا ہی ہے بھی متاثر ہوتی ہے۔ کہنی کی مدد سے لکھنے کے مقابلے گھٹنے کی مدد زیادہ مہذب طریقہ ہے۔ کچھ لوگ قلم دان سامنے رکھ کر لکھتے ہیں دانوں کی جگہ اب چوکیاں یا سینٹر ٹیبیں استعمال ہونے لگے ہیں طریقے پر عمل کرنے میں تحریر میں تو کوئی نقص نہیں پیدا ہوتا لیکن خود منیلو خمیدہ LEANING TOWER ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ نہیں جھکنا چاہیئے۔

میز کرسی سے مستفید ہونے کا طریقہ بہت زیادہ عام تو نہیں رائج ضرور ہے البتہ میز پر کاغذ رکھ کر لکھنے کے ناز و انداز الگ کچھ اہل قلم، کاغذات کو عمودی حالت میں رکھتے ہیں لیکن کچھ اہلِ قلم کا افقی یا نیم افقی حالت میں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ لکھنے کے اس اسٹائل آف اسپن بولر گیند اندازی سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ فاسٹ بولر کی سیدھ میں بھاگتا ہے۔ آف اسپنر کی ہر حرکت میں ٹیڑھ ہوتی تنقید نگار بالعموم یہی اسٹائل استعمال کرتے ہیں۔ کاغذ کو زاویہ دے نہ رکھنے کی وجہ سے الفاظ بھی گرتے پڑتے نظر آتے ہیں۔ کہنہ مشق تو جن کی عمر اس دشت کی سیاحی میں صرف ہوئی ہے، مسوّدہ



## جگن ناتھ آزاد

ے زمانے' ترے کردار سے تنگ آئے ہوئے
ہیں وہ لوگ کہ ہیں زیست سے اکتائے ہوئے

م نے تو فن کے لیے جان کی پروا بھی نہ کی
ک ہیں ذلتِ کردار پہ اِترائے ہوئے

ہ کسی جلوۂ پیہم کے طلب گار ہوں کیا
فقط ایک جھلک کو بھی ہوں ترسائے ہوئے

ے گلی والو! نہ یوں بند کرو دروازے
اس گلی میں ہیں بہت دور سے ہم آئے ہوئے

ون مانے کہ ہم اک ہستیٔ پنہاں کا ہیں عکس
م کہ ہیں ایک زمانے سے نظر آئے ہوئے

ک مہتاب زمیں پر بھی جو گہنایا تو کیا
سمانوں پہ کئی چاند ہیں گہنائے ہوئے

پسند آئی نہ بندے کی خدائی اور لوٹ آئے
بس اتنی بات ہی دل میں سمائی اور لوٹ آئے

بزعمِ خویش ہم نکلے تھے جنسِ بے بہا لے کر
کسی بازار میں قیمت نہ پائی اور لوٹ آئے

پڑا احباب سے پھر کام پھر ان سے ملے جا کر
مگر اس بار بھی خفت اٹھائی اور لوٹ آئے

جسے کہتے بزمِ علم و فن اس کا یہ قصہ ہے
وہاں بھی آبرو ہم نے گنوائی اور لوٹ آئے

جہاں تشکیک نے صورت دکھائی راہِ منزل کی
وہیں شمعِ یقیں ہم نے بجھائی اور لوٹ آئے

## غالب عرفان

خوابوں میں اپنے اپنے سر کو تاجدار دیکھنا
بیدار ہو کے آئینہ بے اختیار دیکھنا
اس کی ندائے حسن پر کرنا یقین کا سفر
اپنی نگاہِ عشق کو بے اعتبار دیکھنا
بکھرا کے دل کی روشنی حاصل اثر ہوا آگہی
شیشے کی طرح زندگی کے آر پار دیکھنا
بے ابر آسمان پر بارش کی اس میں نظر
صحرا میں اک سراب کو دیوانہ وار دیکھنا
امید کی صلیب کیا دار و رسن کے ماسوا
اپنے لہو کے عکس میں اپنا حصار دیکھنا
تحریرِ جاں ورق ورق فیضِ جنوں پہ منطبق
پیکرِ لالہ زار کو سینہ فگار دیکھنا
جذبۂ دل کی راہ میں سلسلۂ نگاہ کو
عرفانِ ذات کے لئے ترتیب وار دیکھنا

ایل ۵۱۱، سیکٹر سی/۵-۱ے، نارتھ کراچی (پاکستان)

رفعت نواز
محلہ گھاٹی، اورنگ آباد۔ ۴۳۱۰۰۱

# ٹیڑھا سوال

آدمیوں کی بھیڑ میں کوئی ایسا بھی نظر آجاتا ہے جس سے باتیں کرنے کے لیے دل مچل جاتا ہے، یونس خان ایسا ہی آدمی ہے، یوں تو ریل یا بس کے سفر میں کسی سے بات کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا کہ سفر کے دوران ایک تناؤ کی سی کیفیت رہتی ہے۔ اس دن تو بہت تھکا ہوا تھا۔ دن بھر آفس میں معاملات اُٹھا کرنے کے لیے اس میز سے اس میز تک چکر لگاتا رہا تھا۔ جب کام نمٹا کر باہر نکلا تو دن ڈوب چکا تھا۔ تھکن اور بھوک سے برا حال تھا اور واپسی کی ٹرین چالیس منٹ بعد آنے والی تھی۔ صبح حمید بھائی سے ملاقات تو ہوئی تھی مگر سرسری سی، ان سے ملنا ضروری تھا۔ رات کا کھانا ساتھ کھانے کا وعدہ کیا تھا۔ اگر حمید بھائی سے ملنے جاتا تو ٹرین چھوٹ جاتی۔ اسٹیشن کے قریب کی ہوٹل سے حمید بھائی سے فون پہ معذرت چاہی، اور جلدی جلدی کھانا کھا کر ریلوے اسٹیشن میں گھس گیا۔ ٹکٹ گھر کے آگے لمبی قطار دیکھ کر دل ڈوبنے لگا لیکن جادھو کو ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے پاس دیکھا تو گھبراہٹ دور ہوگئی۔ اس کے نزدیک جا کر اشاروں میں ٹکٹ لینے کے لیے کہا۔ قطار میں کھڑے تین چار آدمیوں نے شور مچایا بھی لیکن ٹکٹ مجھے مل گیا۔ ٹکٹ لے کر پلیٹ فارم پر پہنچا ہی تھا کہ ٹرین آگئی۔ لپک کر سلیپر کوچ میں گھس گیا۔ کنڈکٹر سے سلیپر کی درخواست کی تو اس نے بے اعتنائی سے کہہ دیا "نہیں ہے فوراً نیچے اتر جاؤ۔" سبکی کا احساس ہوا۔ دوڑ کر جنرل کمپارٹمنٹ میں گھس گیا۔ اندر بیٹھے کھڑے مسافروں نے خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔ بہت بھیڑ تھی اور ڈبے میں عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ سر چکرا رہا تھا اور متلی بھی ہو رہی تھی۔ بے بسی کی تصویر بنا کھڑا ادھر ادھر نظریں گھما رہا تھا کہ مجھے یونس خان نظر آگیا۔ بدن میں سرور کی روسی دوڑ گئی۔ ڈبے کے دوسرے دروازے میں وہ آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا، دھکے کھاتا گھسٹتا اس کے قریب پہنچا اور سلام ٹھوک دیا۔ وہ چونک پڑا اور ٹانگیں سمیٹ کر میرے لیے جگہ بنا کر خجالت سے بولا "فی الحال تو یہیں ٹک جائیے، شاید اگلے اسٹیشن پر آپ کو بنچ پر جگہ مل جائے۔"

جن دنوں لکشمن پور میں میری تعیناتی تھی، یونس خان کے محلّہ میں چار سال رہا تھا۔ آتے جاتے سلام اور بات چیت ہوا کرتی تھی۔ کبھی کبھی اس کی دوکان پر بیٹھک لیتا تھا۔ چوک میں اس کی ہارڈویر کی دوکان تھی دوکان کے عقبی حصّے میں کباڑ خانہ تھا جہاں اتوار کو پرانا فرنیچر ہراج کیا جاتا تھا، یونس خان ہنرمند آدمی ہے، استعمال شدہ سامان کو رنگ و روغن لگا کر دیدہ زیب بنا دیتا ہے۔

یونس خان عجیب موڈی آدمی ہے۔ کبھی ملے گا تو اتنی تفصیل سے باتیں کرے گا کہ سننے والا اکتا جائے گا۔ اصل بات بتانے سے پہلے لمبی تمہید باندھے گا۔ اجنبیوں کے حوالے دے گا اس وثوق سے جیسے ان سب سے آپ کی شناسائی ہے۔ کبھی خاموشی کا دورہ پڑے گا تو آپ کی باتوں کا جواب ہوں ہاں میں دے گا یا ایسا انجان بنا رہے گا کہ آپ جھلا اٹھیں گے۔ پھر بھی اس کی شخصیت میں کچھ ایسی بات ضرور ہے کہ اس سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔

چادر صاف کر کے اس نے مجھے اپنے قریب بٹھا لیا، بنڈی کی اندرونی جیب سے پان کا بٹوا نکالا اہتمام سے پان بنا کر دیا، ایک خود کھایا اور پان کی پیک منہ میں گھولتے ہوئے پوچھا "آپ شاید عالمگیر نگر جا رہے ہیں، مدّت کے بعد ادھر پھیرا لگایا آپ نے۔"

"ادھر آتا رہتا ہوں، مگر تم سے ملاقات مدّت کے بعد ہو رہی ہے۔ تم کہاں جا رہے ہو۔"؟

یونس خان نے سر جھکا کر آنکھیں بند کرلیں اور گہری سوچ میں ڈوب گیا، لگا کہ اس نے میری بات سنی ہی نہیں، کچھ دیر بعد میں نے ذرا اونچی آواز میں پوچھا "تم شاید بمبئی جا رہے ہو مال خریدنے" یونس نے جھٹکے سے سر اٹھایا، ادھر ادھر چوکنا ہو کر دیکھا، دروازے کی طرف جھک کر

کی پچکاری اڑائی اور غمگین لہجہ میں کہا "بمبئی جانا اب کہاں ہوتا ہے ایک سال سے تو رضاپور کے پھیرے لگا رہا ہوں تنگ آگیا ہوں جانے آنے سے"۔

"رضاپور میں دوکان کھولی ہے کیا"؟

"نئی دوکان کیا کھولوں گا، پرانی والی ہی سنبھال لوں تو غنیمت ہے۔ اپنے حکیم فرید صاحب الگ ناراض ہو گئے مجھ سے۔ پرہیز نہیں کرو ں گا، دوا پابندی سے نہیں کھاؤں گا تو ناراض ہوں گے نا"

یونس خان کی اکھڑی اکھڑی باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ "کب سے بیمار ہو، کونسا عارضہ لاحق ہو گیا تمھیں" میں نے تشویش سے پوچھا۔

"ایک بیماری ہو تو نام لوں، ہول ہوتی رہتی ہے، دل بیٹھا جاتا ہے، نیند اڑ گئی ہے، سر چکراتا ہے، کمر اور گھٹنوں میں مستقل درد رہتا ہے۔ بیماریوں کا مجموعہ ہو گیا ہوں"

"پھر بیماری میں رضاپور کے پھیرے کیوں لگاتے ہو، آرام کرو، اچھے ڈاکٹر سے علاج کرواؤ" "آرام میرے نصیب میں کہا، عدالت میں پیشی کے دن حاضری نہ دوں تو پولس ہتھکڑیاں لگا کر لے جائے گی۔ دیکھنے والے تھو تھو کریں گے۔ دشمن چوری کا مال بیچنے کی تہمت لگائیں گے"۔ یونس خان نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"رضاپور کی عدالت میں حاضری؟ بات سمجھ میں نہیں آئی"

"وہی زن اور زمین کا پرانا جھگڑا ہے۔ رضاپور سے پانچ میل آگے میرا آبائی گاؤں ہے۔ دادا کی چھیالیس ایکڑ زرعی آراضی تھی۔ بادا اور چچا مل جُل کر اس زمین پر کاشت کرتے تھے۔ میں تو بچپن ہی میں اپنی پھوپھی کے ساتھ گلشن پور آگیا تھا لاولد تھیں بے چاری، پھوپھی پھوپھا بہت لاڈ کرتے تھے مجھ سے ان کی آرزو تھی کہ پڑھ لکھ کر وکیل بن جاؤں اور خاندان کا نام روشن کر دوں لیکن میٹرک میں تین بار ناکام رہا تو پھوپھا نے اپنی دوکان پر بٹھا دیا، شادی بھی کروادی اور میں گلشن پور ہی میں بس گیا۔ گاؤں سے ناطہ ٹوٹ سا گیا۔ سال میں ایک بار اماں بادا سے ملنے جاتا تھا چار سال پہلے بادا کا انتقال ہو گیا۔ چھے مہینے کے اندر اماں اور چچا بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ دادا کی زمین کا بٹوارہ ہوا۔ چچازاد بھائی نے بہلا پھسلا کر، رو دھو کر چھبیس ایکڑ زمین اور بڑا مکان حاصل کر لیا۔ میرے حصے میں بیس ایکڑ زمین اور دو کمروں والا مکان آیا۔ زمین بٹائی پر اٹھا دیتا اور فصل کی کٹائی کے وقت بیوی کو گاؤں چھوڑ آتا تھا"

"عدالت میں حاضری کا کیا قضیہ ہے" میں نے اکتا کر پوچھا۔

"وہی بات تو کہنے والا ہوں، جب تک پورا پس منظر نہ بتاؤں آپ مقدمہ کی اصل وجہ کیسے جان پائیں گے"۔ یونس خاں نے مسکرا کر کہا۔

"پہلے پان کھلاؤ، جماہیاں آرہی ہیں" میں نے بے تکلفی سے کہا۔

یونس خان نے بڑے اطمینان سے پان بنائے۔ مجھے بھی دیا۔ خود بھی کھایا اور پھر شروع ہو گیا۔

پالتو جانور سے محبت کسے نہیں ہوتی اور نیک بخت گھر والی کو تو اپنی بلی سے بے حد لگاؤ ہے۔ پہلے اسے کھلائے گی پھر خود کھائے گی، بوٹیاں اسے دے گی شوربہ خود لے گی، اس کے لیے پلنگڑی بنوائی۔ نرم گرم بستر تیار کیا۔ اولاد کی طرح پیار کرتی ہے بلی سے، کیا کرے بے چاری کوکھ جلی تین بیٹے جنے سچا ایک بھی نہیں۔ بس بلی ہی اس کی رفیق ہے، غم خوار ہے۔ پچھلے سال گاؤں گئی تو بلی کو بھی ساتھ لیتی گئی میری بھاوج کا پالتو طوطا صبح سے شام تک ٹیں ٹیں کرتا رہے۔ وہ جو سکھائے وہی کہے، بلی کو للکارے، بیوی کو چھیڑے، بلی اس پر جھپٹے اور وہ پنجرے میں شور مچائے۔ بھاوج بلی کو کوسے دے، گھر والی طوطے کو ڈانٹ پلائے۔ سارا دن یہی ہنگامہ ہوتا رہے۔ ایک دن بھاوج طوطے کو پنجرے سے نکال کر کھیل کھلا رہی تھی کہ بلی نے لپک کر اسے دبوچ لیا، بھاوج نے سامنے لگی لاٹھی بلی کی طرف اچھال دی۔ بلی کی کمر ٹوٹ گئی اور طوطا مر گیا اور دیورانی جٹھانی میں زبانی جنگ شروع ہو گئی پھر ہاتھا پائی، نوچا نوچی ہونے لگی۔ پڑوسنوں نے جنگ بندی کروائی۔ بھائی گھر آیا تو جورو نے رو رو کر نمک مرچ لگا کر واقعہ سنایا۔ بھائی نے میری بیوی کو گالیاں دیں، اور مارنے دوڑا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ نتو چچا آگئے ورنہ جانے کیا ہو جاتا اس دن۔ "تھرماس میں چائے ہے، پئیں گے آپ"، یونس خاں نے اچانک قصہ کا تسلسل توڑ کر پوچھا۔

"ضرور پیوں گا۔ اس وقت تو چائے نعمت ہے"

ہم دونوں نے چائے پی۔ پان کھائے اور یونس خان نے بیان کو آگے بڑھایا "اس جھگڑے کی اطلاع تیسرے دن مجھے ملی گاؤں پہنچا بیوی نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔ بھائی کے تیور ہی بدلے ہوئے تھے۔ بھاوج منہ پھلائے بیٹھی تھی۔ دو دن اسی تناتنی میں گذر گئے۔ بھاوج پالتو طوطے کو بین کر کے یاد کرتی اور ہمیں کوسنے دیتی۔ بھائی چھیڑ خانی کیا کرتا۔ رات کے پچھلے پہر اس نے جوار کے کھیت میں چار بیل چھوڑ دئے۔ تین چار گھنٹوں میں بیلوں نے فصل کا ایک حصہ تباہ کر دیا۔ ہم بیلوں کو مار کر کھیت سے باہر نکل رہے تھے کہ بھائی چار حمایتیوں کے ساتھ آگیا اور گالیاں بکنے لگا مجھ پر اور بیوی پر تہمتیں لگانے لگا۔ سمجھانے کے لیے اس کے قریب گیا تو بپھر کے میری طرف لپکا، میں نے لاٹھی گھمائی، لاٹھی اس کے ماتھے

پر لگی اور خون کی دھار لگ گئی۔ اس کے حمایتی موٹر سائیکل پر رضا پور گئے اور پولس سب انسپکٹر کو لے آئے۔ تین سنگین دفعات لگا کر مجھ پر فوجداری مقدمہ قائم کیا گیا۔ رات بھر حوالات میں رکھا گیا۔ دوسرے دن عدالت سے ضمانت پر رہا کیا گیا۔ ایک سال سے ہر مہینہ پیشی ہوتی اور تاریخ پیشی بڑھا دی جاتی ہے۔ اس مقدمہ کی وجہ سے کاروبار چوپٹ ہو گیا ہے۔"

یونس خاں کی آپ بیتی سن کر برسوں پہلے والد اور سوتیلے چچا کے بیچ ہوئی مقدمہ بازی کی یاد آ گئی۔ وہ بھی جائیداد کی تقسیم کا مقدمہ تھا، اور برسوں چلتا رہا تھا۔ اس زمانے کی پریشان حالی کے تصور ہی سے کپکپی چھوٹ جاتی ہے۔

"تمہارے بھائی کا کیا حال ہے" میں نے رندھی آواز میں پوچھا۔

"بھلا چنگا ہے۔ پانچ ٹانکے لگے تھے کب کے کھل گئے۔ زخم بھی بھر گیا ہے، لیکن مجھے جو گھاؤ لگا ہے وہ بھرنے والا نہیں"۔

"آپس میں صلح صفائی کر لو خاں صاحب"۔ میں نے کربناک یاد کے زیر اثر بن مانگا مشورہ دے دیا۔

"وہ چھوٹا ہے غلطی اس کی تھی، وہ تو پہل نہیں کرتا، اکڑ دکھاتا ہے۔ میں کیوں جھکوں پھر"۔ یونس خان نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"تم تو بڑے ہو، سمجھدار ہو، سوچو کتنا روپیہ صرف کر رہے ہو اور پریشان ہو رہے ہو، خاندان کے بزرگوں کو بیچ بنا کر گھر کا جھگڑا گھر ہی میں نمٹا لو"۔

"صاحب میں بھی اونچ نیچ سمجھتا ہوں اور اس پریشانی سے چھٹکارا چاہتا ہوں، مگر گھر والی نہیں مانتی، وہ میری غیرت کو، مردانگی کو للکارتی ہے تو طیش آ جاتا ہے۔ ناری ہٹ کے آگے بے بس ہو جاتا ہوں"۔

"ٹھنڈے دل سے میری بات پر غور کرو اور صلح کر لو۔ اسی میں دونوں کی بھلائی ہے"۔ میں نہ جانے کیوں چاہتا تھا کہ یونس خان اس مقدمہ بازی کے چکر سے نکل آئے۔

"اچھا صاحب کہئے میری جگہ پر آپ ہوتے اور ایسے ہی حالات سے دوچار ہوتے تو کیا کرتے۔ کیا چھوٹے بھائی کے آگے ناک رگڑ کر معافی مانگ لیتے۔ گڑگڑا کر اس سے صلح کی درخواست کرتے۔ کہئے آپ کیا کرتے"۔ یونس خاں نے قدرے چڑ کر کہا۔

یونس خان سے یہ سوال کیا تو پرانا زخم جیسے پھر سے ہرا ہو گیا۔ اس پرانے مقدمے اور اس سے وابستہ تکالیف کی یاد تازہ ہو گئی۔ دل کی دھڑکن بڑھ گئی، دماغ کی رگیں تن گئیں، اور مجھ پر اختلاجی کیفیت طاری ہو گئی۔

کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو لگا کہ قوتِ گویائی جیسے چھن گئی ہے، اور میں یونس خان کے سوال کا جواب نہ دے سکا۔

## بقیہ : شکوہ کاتبوں کا صفحہ ۱۸

سمجھ جاتے ہیں کہ یہ فرش پر بیٹھ کر لکھا گیا ہے یا میز کرسی کی دین ہے۔

ادیب اور شاعر اپنے اپنے حلقے میں مقبول ہوتے ہی ہوں گے لیکن انھیں کاتبوں کا دل جیتنے کی بھی کوشش کرنی چاہیئے اور کاتبوں میں مقبول ہونا کچھ مشکل نہیں ہے۔ کاتب نہ تو اچھا کلام چاہتے ہیں نہ کوئی دانشمندی کی تحریر۔ یہ لوگ دلِ مدعا رکھتے ہیں اور صرف یہ چاہتے ہیں کہ مصنف خوش خط بنیں، مصنفوں کو بھی تھوڑا بہت ریاض کرنا چاہیئے۔ کاتبوں کو ان کا ذرا سا تعاون حاصل ہو جائے تو کتابوں سے اغلاط نامے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائیں۔ اکیسویں صدی قریب آ رہی ہے۔ کیوں نہ مصنفین بھی اس کے استقبال کی تیاری کریں اور اپنا ہاتھ صاف کر لیں۔

## بقیہ : نقد و نظر صفحہ ۴۲

راستے میں کل سراپا چین مجھے تنہا ملا
ہاتھ میں تھا صرف بستہ، دور تک کوئی نہ تھا

---

ساحلوں پہ کچھ گھروندے تھے لہروں کے سامنے
جب تک بچے رہے تھے، انھیں گھر کہا گیا

---

اور کیا کمال کا شعر ہے!

روٹی کا روگ گاؤں کو شہروں میں لے گیا
لیکن علاج شہر نے گاؤں میں رکھ دیا

---

صرف سچائی کا لکھنا بھی ہے اعلانِ جہاد
تجھ سے یہ کس نے کہا، ہاتھ میں تلوار بھی رکھ

---

◆ ضخامت ۱۱۲ صفحات ◆ قیمت : ۲۵ روپے ◆ ملنے کا پتہ : مکتبہ قصر الادب، پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ بمبئی سینٹرل پوسٹ آفس، بمبئی ۴۰۰۰۰۸

ظ۔ انصاری

## محسن بھوپالی

◆

ویہ کوئی مقرر نہیں ہونے پاتا
ائمی ایک بھی منظر نہیں ہونے پاتا

مصروف کوئی لمحۂ فرصت ہو عطا
ں کبھی خود کو میسر نہیں ہونے پاتا

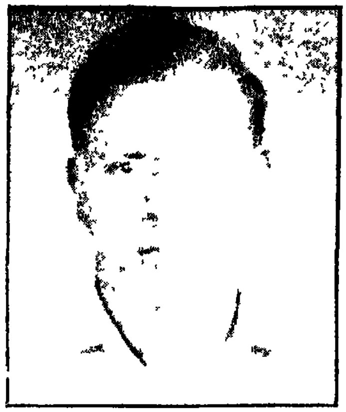
ے دن آتش و آہن سے گزرتا ہے مگر
ل وہ کافر ہے کہ پتھر نہیں ہونے پاتا

یا اے جبر مشیت کی عنایت سمجھوں
د عمل میرا مقدر نہیں ہونے پاتا!

ا در عجز گھٹا دیتی ہے قامت میرا
ں بھی اپنے برابر نہیں ہونے پاتا

تم پہ اب سمو لیتی ہے آلام کی گرد
یہ دل کا مکدر نہیں ہونے پاتا

ن کے کچھ اور بھی ہوتے ہیں تقاضے محسن
سخن گو تو سخنور نہیں ہونے پاتا



◆

لب اگر یوں سئے نہیں ہوتے
اس نے دعوے کئے نہیں ہوتے

گر ندامت سے تم کو بچنا تھا
فیصلے خود کئے نہیں ہوتے

خوب ہے خوب تر سے خوب ترین
اس طرح تجربے نہیں ہوتے

بات بین السطور ہوتی ہے
شعر میں حاشیے نہیں ہوتے

تیرگی سے نہ کیجئے اندازہ
کچھ گھروں میں دئے نہیں ہوتے

ظرف ہے شرط اولیں محسن
جام سب کے لئے نہیں ہوتے

● محسن منزل ۲ الف۔ ۳/۱۳ اے ناظم آباد کراچی ۲

## منظّر وارثی

◆

کوئی لمحہ تو مری خیر خبر لے آتا
مری دستار نہ لاتا مرا سر لے آتا

ناخداؤں کے تدبر نے ڈبویا ہے مجھے
ورنہ کشتی مری ساحل پہ بھنور لے آتا

پختہ ہوتی جو نہ دیوار عدالت اس کی
میں گواہی کے لئے دیدۂ تر لے آتا

کتنے سفراء سماعت مری باتیں سنتے
زہر سچائی کا ہونٹوں پہ اگر لے آتا

کیا خبر تھی کہ وہ بیچے گا ادائیں اپنی
میں کسی عشق کے تاجر کی نظر لے آتا

میری آوارگیوں پر جو نہ بندش ہوتی
راستہ ہاتھ پکڑ کر مجھے گھر لے آتا

روشنی کی کسی موسم نے تمنا ہی نہ کی
ورنہ ٹوٹا ہوا تارہ بھی سحر لے آتا

لوگ دو گام مظفر کو نہ چلنے دیتے
اپنے ہمراہ اگر زادِ سفر لے آتا

● ۲۵ ۲ سیلم بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور۔ ۱۸



ڈاکٹر سید محمد عقیل
محمود منزل، دریاباد، الہ آباد - ۲۱۱۰۰۳

# اکیسویں صدی کی غزل - ایک اندازہ

**[ ۲ ]**

پھر اگر غزل پابند ہے تو کہاں بحر بدل گئی، کہاں ایک بحر میں حروف صحیح کی آوازیں دب گئیں جہاں انھیں نہیں دبنا چاہئے، یہ پابند غزل کے وہ مبادٗ ہیں، جن سے بے خبری، اچھی غزل کے فن اور اس کی پیش کش میں مانع آسکتی ہے۔ ان میں سے کچھ تو بہت باریک باتیں ہیں اور کچھ بالکل سامنے کی ہیں۔ نیا غزل گو، کیا ان صورتوں پر دھیان دے سکے گا۔ خصوصاً، اس وقت، جب اس کے سامنے خود اردو زبان کی بقا کا مسئلہ درپیش ہو حال ہی میں اردو کے ایک رسالے میں دو شعر ملے جو یوں ہیں

لوگ پھر سنگ اٹھائے پھرتے ہیں   کس کی قسمت بدلنے والی ہے   [ اکبر کاظمی، نقوش
گنج ہم بھی ایک رکھتے ہیں قارون صفت تبیرؔ   لیکن علی کی طرح لٹانے کے واسطے   [ بشیر تمالکو

کلاسکی انداز کی غزل میں "سنگ" اور "گنج" کی آوازیں جو، غزل کے ان اشعار میں استعمال ہوتی ہیں، "سُقمِ شعری" میں شمار ہوں گی "سنگ" میں گ کی دھمک والی آواز ہونی چاہئے۔ اسی طرح 'گنج' میں 'ج' کی واضح آواز۔ مگر جدید غزل کے شاعر، ان باریکیوں سے بے خبر ہیں۔ خیال کو پس پشت ڈال کر صرف 'اسلوب شاعری' کی باتیں کرنے والوں کو تو کم از کم، ان کا لحاظ رکھنا ہی چاہئے۔ لیکن ایسی بے خبری پہ اصرار کرنا اور ان نکات کو بے مصرف اصول سمجھنا، اسلوبیات میں نہ کوئی تنوع ہے اور نہ غزل کے جہات میں کسی طرح کی وسعت۔ پھر اگر یہ سارے لوازم بے مصرف ہیں تو بہت سے جدید ناقد بھی، عروض، آہنگ اور بیان کی تیغ کیوں کرتے ہیں۔ تاہم نئے غزل گویوں کی عام تعداد، ان باریکیوں سے بے خبر ہوتی جائے گی کہ ان کی اس سلسلے میں باقاعدہ کوئی ٹریننگ بھی نہیں ہے۔ انھیں اچھی غزل کے صرف دو معیار معلوم ہیں۔ (۱) مشاعرے میں جو غزل پسند کی جائے، وہ اچھی غزل ہے [ یہ الگ بات ہے کہ وہ کن حالات میں اور کن لوگوں کے درمیان پسند کی گئی ] (۲) جو غزل نئے رسالے یا کسی مشہور رسالے میں چھپ جائے وہ اچھی غزل ہے۔ اب جب نئے شاعر کو یہ دونوں باتیں حاصل ہو جائیں، تو پھر اسے کم مزید سند کی ضرورت نہیں اور نہ کسی ٹریننگ کی۔ پھر اصول توڑنے کو ہر شاعر باعث فخر سمجھتا ہے۔ کچھ ایسے بھی متشاعر ملے کہ سرکشی ہی کو شعری بلن سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انھیں میں سے اسی طرح ع

گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنیٰ نہ سہی

کہہ کر کوئی میرؔ، غالبؔ نہ سہی تو کم از کم "سُریلے بول" والا عظمت اللہ خاں ہی بن جائے گا۔ ورنہ بائیسویں صدی میں تو یقیناً، اسے لوگ پسند کریں گے۔ اس لیے کسی طرح کے لوازم شاعری کی پرواہ کیے بغیر، غزل گوئی میں اور شاعروں میں مصروف رہنا چاہیے اور "مدیرانِ ادب" کی حرف گیریوں پہ کان نہیں دھرنا چاہیے کہ یہ سب کلاسکیت کی طرف لے جائیں گے اور آج کمپیوٹر ایج میں "ایجاد بندہ" کا زمانہ ہے۔ معیار کی ضرورت ہے کہ معیار، اساتذۂ فن نہیں بلکہ عوامی مشاعروں میں مقبولیت، معیار مقرر کرتی ہے اور میزان آنے والے وقت کے ہاتھ میں ہے، معترضین کے ہاتھ میں نہیں۔ کیا معلوم زمانے کو نئی شاعری کی کون سی ادا بھا جائے اور نیا سماج یہی سب کچھ پسند کرنے لگے۔ اس لیے کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ اُن کی پشت پناہی کے لیے چند بر خود ہشیار نقادانِ ادب بھی انھیں مل جاتے ہیں۔ ایک زمانہ جب عادل منصوری، احمد ہمیش، کفیل آزر، محمد علوی اور اسی قبیل کے شعراء، پر بڑے بڑے تنقیدی مضامین، ہندی کے

سالے "ذِنمان" میں اور امریکہ سے انگریزی اخباروں اور رسالوں میں نکلوائے جاتے تھے۔ لیکن آج اُن تمام شعراء کی اردو شاعری میں باحیثیت ہے، اس سے اردو کے تمام طالبانِ علم واقف ہیں۔

نئی غزل، پابندیوں اور خصوصاً کلاسکی پابندیوں کی بہت سی از کار رفتہ صورتوں کو چھوڑ دے گی تو یہ اچھی بات ہوگی مگر شعری محاسن زبان کے رموز و نکات، اور ان کی پرکھ کا بھی نیا معیار بنے اور آج کے تمام محاسن و معائب، یک قلم، مسترد کر دیے جائیں اور نئی نسل، نئی شاعری اور غزل گوئی کی بالکل ایک نئی بوطیقا بنا لے تو الگ بات ہے۔ تاہم موضوعِ سخن مجموعی طور پر "حکایت بایار گفتن" ہی اگر غزل بن باقی رہا تو بہت سے نکات کی پابندی کرنا ہی پڑے گی۔ ہاں، اگر نئے مسائل، انداز، وسائل اور فکر، نئی غزل کو ملتے گئے تو پھر غزل کی نئی بوطیقا بھی بن سکتی ہے اور پھر نیا اسلوب بھی اور اس کے ساتھ اظہار کے نئے طریقے بھی۔ پھر انھیں طریقوں سے نئے محاسن اور معائبِ سخن کے اصول و ضوابط ہوں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ غزل اور پوری اردو شاعری بالکل مجرّد ہو جائے۔

یہ بھی غور طلب ہے کہ نئی غزل کی نئی میٹافزکس METAPHYSICS اکیسویں صدی میں کیا ہوگی۔ نئی میٹافزکس سے مراد میٹافزکس کا ابھرنا کیا ہوگا۔ عالمی ادب اور اردو میں بھی صوفیانہ خیالات کی واپسی، اس کے امکانات پیدا کر رہی ہے۔ ایک دل چسپ صورت یہ پیدا ہوئی کہ اٹھارویں، انیسویں صدی کے مغرب میں مادّی ترقیاں، خصوصاً بھاپ کی طاقت کا اندازہ، ڈاروِن، بنتھم اور مِل MILL کی تھیوریوں اور صنعتی انقلاب نے مادہ پرستی کو فروغ دیا۔ سائنسی معلومات اور مغرب کی نوآبادیاتی فتوحات نے میٹافزکس کے نظریات میں تزلزل پیدا کیا مگر ایٹم کے ٹوٹنے کی دریافت اور خلائی پرواز اور چھان بین نے مادہ پرستی کے اس نظریے کو شاید مشکوک کر دیا جس میں روحانیت اور مابعد الطبیعات کا انکار تھا یا کم از کم ان دونوں سے بے اعتقادی تھی۔ عقل کی فتوحات کا تو ان نئی دریافتوں سے یقین ہوتا ہے کہ انسانی ارتقا کی ایک نئی داستان بن رہی ہے مگر نئے سماج میں میٹافزکس کا یہ دباؤ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ع "مجھکو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو"

یہ کیفیت بھی اپنا دخل رکھتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مادّے کی طاقت کی اور دھاک بیٹھتی اور مادّی ترقیوں اور اس کے امکانات پر یقین مزید پختہ ہوتا مگر نئے ادب میں جیسے، اس یقین میں وہی غالب کے مصرعے والی کیفیت ہے جو اوپر پیش کیا گیا۔ بلکہ مادی ارتقا کے اظہار پر جیسے قدغن سی معلوم ہوتی ہے CATHOLIC IN RELIGION والے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ سے لے کر ان کے نئے مظاہر تک کی میٹافزکس، تحیّر، تشکیک اور انکار کے بجائے، ڈری ڈری ایجابی صورتوں سے متاثر ہے۔ کیا مادّے کی تلاش و جستجو، اپنا دائرہ عمل مکمل کر کے پھر اپنے مستقر کی طرف لوٹ رہی ہے؟ کیا اب مادّی طاقتیں اپنا سفر ختم کر چکی ہیں؟ یہ سوال ہر وقت آج عالمی ادب کے سامنے ہے اور اردو شاعری بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ اب غزل یہ سوال نہیں کرتی کہ ؎

لالہ و گل کہاں سے آئے ہیں   ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے
جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود   پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

ع جلوہ از بس کہ تقاضائے نگہ کرتا ہے

بلکہ جیسے غزل، ان سوالات کا جواب دینے کی فکر میں ہے مگر یہ "ہمت" اور "جستجو" ہی سے ممکن ہے جو "سہل الحصول" مضامین کی تلاش والے نہ دے سکیں گے اور اسلوبیات کی دنیا میں حرف کی آوازیں گننے والوں سے تو اس کی توقع ہی نہیں رکھنا چاہیے۔ یہ کام نئے غزل گو کی ذہنی مطالعے اور ایقان ہی سے ہو سکے گا۔ سارتر اور پال والیری، کے نام گنوانے سے نہیں۔ اسی "مطالعے اور ایقان" میں کہیں زندگی کی گتھیوں کا حل منعکس ہو سکتا ہے، کہیں صرف گھبراہٹوں کی گرفت ہوگی اور کہیں غزل کی صرف اوپری سطح کہ جو کچھ سامنے ہے یا محسوساتی ہے، اس میں نیا غزل گو ڈوب سکتا ہے۔ اس "مطالعے، اور ایقان" میں سب کچھ ہے۔ سیاست بھی، گھبراہٹ بھی، تنہائی کا احساس بھی، اقرار اور کبھی انکار۔ ایسی صورتیں بھی کہ جیسے ہی شاعر کو اظہاریت، موضوعات کی طرف مڑتی نظر آتی ہے، وہ گھبرا کر صرف اسلوب میں رہتا ہے۔ اب SENSE OF WONDER تعبیرات میں تحلیل ہو رہا ہے۔ REASONING کی وراثت بھی چلے گی، کچھ ابہام سے دل چسپی بھی۔ تخیّل IMAGINATION اور سنسبلٹی SENSIBILITY میں تخیل، کمزور

ہو سکتا ہے کہ نئی حسیت، پرانی قدروں پر منتج تخیل کے ساتھ نہیں چل سکے گی۔ ایک بات اور۔ غزل اب تفہیم کے قریب رہے گی۔ شاعرہ ہو یا رسالے، سب ہی غیر تفہیم کے غزل کا۔ ارا طلسم بیکار ہو جاتا ہے۔ اس طرح جدیدیوں کے ساتھ غزل کی جو فضا چلی تھی، اس کا ختم ہو جانا قطعی اور لازمی معلوم ہوتا ہے۔ ہاں جدیدیوں کی لفظیات سے، نئی معنوی صورتیں وجود میں آئیں گی۔ نئے الفاظ جو نئی زندگی سے آ رہے ہیں، ان کی تعداد بڑھے گی۔ انداز بیان روز بروز ترسیلی COMMUNICATIVE ہو گا۔ حسن مطلق، حسن مجرد، ارسطو کا "اصل کی نقل" سب پیچھے، سے کیا کچھ رہ جائے گا، کہا نہیں جا سکتا۔ کم از کم اردو شاعری اور بالخصوص غزل کے لیے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ افلاطون لوگ بھی خواہ مخواہ بحث میں پڑیں گے کہ سوسائٹی پر تاجرانہ تہذیب کا غلبہ ہو رہا ہے۔ کارخانے، کمپیوٹر، کمپنیاں سب آج کے سماج اور تہذیب میں اپنی افادیت اور لین دین کے ساتھ داخل ہو رہے ہیں۔ جاگیردارانہ تہذیب نے جس حسن و عشق اور ان کے لوازم کو ایک خاص ڈھنگ سے تہذیب کیا تھا، سب اب تاجرانہ تہذیب کے درمیان سے اٹھ گئے اور ہیلی کاپٹر، خلائی تیز رفتاری کے ساتھ "ضبط غم تحمل، رکھ رکھاؤ، کردار، اور وضع داری، آج کی زندگی اور تعشق کی دنیا کے بھی، کھوٹے سکے ہو چکے ہیں۔ دیکھنا ہے کہ سجن، موہن، جان جاناں قضائے مبرم، سے ہوتے ہوئے "چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا"، "میں سمندر دیکھتی ہوں تم کنارہ دیکھنا"، تک پہنچنے والی غزل، نئی صدی میں کیا صورتیں اور رنگ روپ اختیار کرتی ہے کہ اس کا مبہم خاصہ امتحان کے دور میں داخل ہو گیا ہے۔ غزل، اب رسوا کی زبان سے گویا یہ اعلان کر رہی ہے کہ ؎

وضع کے پابند ہم، دیوانگی جدت طلب — پھر گلایا جائے لوہا قیس کی زنجیر کا

## ۲

تمام فکر و فن اپنے تہذیبی ڈھانچے سے وجود میں آتے ہیں۔ غزل ایک طرح کی جذباتی EMOTIONAL شاعری ہے یہ اور بات ہے کہ یہ کبھی کبھی SENTIMENTAL بھی ہو جاتی ہے اور EMOTION اور SENTIMENTAL میں جو باریک فرق ہے اسے ملحوظ رکھ کر سوچا جائے تو اکیسویں صدی میں غزل، اس ڈھنگ سے اپنی تہذیبی سطح میں اور اپنے فکر و فن میں قدیم کلاسیکی فکر و نظر اور اپنے فن سے کتنی مختلف ہوتی جائے گی۔ غزل کی کلاسیکی فکر اور طریق اظہار اور جذبات اور COGNITION سب کے طرح کا بدلنا لازمی سی بات ہے کیوں کہ کلاسیکی تہذیبی ڈھانچہ، روایت اور ادراک عشق کے ساتھ ساتھ، سارے علائم اور پورا ماحول بدل رہا ہے۔ ذرا انھیں دو ایک مثالوں سے پہلے سمجھ لیا جائے ؎

| | | |
|---|---|---|
| غیروں سے تو ملتے ہو نظروں سے ملا نظریں | ادھر کو نگہ کوئی پھینکی بھی تو دزدیدہ | ] درد |
| محفل میں ہم تھے اس طرف، وہ شوخ چنچل اس طرف | تھی سادہ لوحی اس طرف، مکر و فسوں چھل اس طرف | ] نظر |
| پارسائی کا یقین غیر کو دلواتے ہیں | کہیں بھولے سے نہ آ جائے تبسم مجھ کو | ] داغ |

ان مثالوں میں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ان اشعار میں تہذیبی جہت کیا ہے۔ ان کی اظہاریت کس طبقے سے کس طبقے تک ذہن اور تفہیم کو لے جاتی ہے اور ان کے COGNITION اور CONATION کے ادراک کے لیے EMOTIONS کو بھی کن تجربوں کی دنیا سے گذرنا پڑے گا یا کم از کم ان کا انھیں علم حاصل کرنا ہو گا۔ اس فضا کے اشارے کنائے اور تجربے، آج کے بدلتے ہوئے تہذیبی ڈھانچے میں سمجھنے بھی مشکل ہوں گے اور اکیسویں صدی میں، ان کی جگہ تاریخ یا قاموس اور لغات میں ہو گی۔ صرف EMOTION یقیناً رہ جائے گا لیکن اس کے لیے نئی بدلتی ہوئی زندگی سے تجربے شامل ہوں گے۔

تمام جذباتی شاعری میں، تجربوں کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ خصوصاً ماضی کے گذرے ہوئے لمحات اور سابقے جو یونیورسل تجذیب ASSIMILATION سے ہم تک پہنچے ہوں۔ یہ یونیورسل تجذیب بہت اہم ہے۔ یہی جذباتی شاعری کو ہر دور میں زندہ اور متحرک رکھتی ہے، چاہے تجربہ کرنے والے کی دل چسپیاں مزید تجربوں میں آگے بڑھ گئی ہوں یا اس کا لگاؤ ان سے ختم ہو چکا ہو۔ لیکن تمام تر اپنی سوسائٹی، فیشن معتقدات اور اظہار کے طریقوں کے ساتھ ہی وجود میں آتے ہیں۔ صرف محسوسات کو ابدیت ETERNITY حاصل

ہوتی ہے ۔غزل میں جذبۂ محبت کو چھوڑ کر تمام لوازم اسی وجہ سے بدلتے جاتے ہیں۔ نظروں سے نظریں ملا کر ہنسنے پھر دزدیدہ نگاہی اور مکر و فسوں، چھل سے پارسائی کا یقین دلانے تک جو تہذیبی اتار چڑھاؤ ہے، طبقاتیت، اور کھلا پن ہے وہ سے

کوئی ناامید نہ کرتے سنہ نگاہ سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے [میر]

کی تہذیبی سطح، تحریم اور احتیاطی تجربے سے کس قدر مختلف ہے؟ اور دونوں تجربوں کی جذباتیت EMOTIONALITY اور SENTIMENTALITY کو ایک دوسرے سے فنکارانہ طور پر کس قدر الگ کرتے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ اکیسویں صدی میں غزل ان تہہ داریوں کو چھوڑ دے گی۔ فنکارانہ تجربوں کی سطح، روز بروز گھٹتی جائے گی، کچھ تو اس کا سبب وہ سہل انگاری ہوگی جو نئی شاعری نے سے سکھائی ہے اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ تہہ داری اور تعمق سے اردو کی نئی تہذیب بیگانہ ہوتی جائے گی۔ سنجیدگی SENSUOUSNESS اور چھچھلے پن SUPERFICIALITY کا معیار بدل رہا ہے اور شعری اسلوبیات بھی سہل پسندی کا راستہ اختیار کر رہی ہیں۔ پھر غزل کی طرف اپروچ بھی بدل رہا ہے۔ کیسیٹ کی غزل گوئی اور غزل پسندی والی تہذیب، تعمق اور سنجیدہ فن سے گھبراتی ہے کہ اس کا رشتہ تجارتی مفاد سے وابستہ ہوجاتا ہے۔ پٹے پٹے الفاظ، اشارے، موسیقی کی آواز کا جادو سب غزل کی کلاسیکی ن تک کہ تفہیمی دنیا، چھوڑ کر صرف لطف اور وقت گذاری کی دنیا میں جا رہے ہیں، جس کے لیے کسی تحریم اور احتیاط کی ضرورت غزل گو کو یا۔ غزل کے لیے صرف COGNATIVE الفاظ کی ضرورت پڑے گی جو ہر سطح کے سننے والے [بلکہ پست اور تجارتی ذہن کی سطح] طف کی منزل سے ہم کنار کردیں۔ ادھر غزل کے کچھ تجزیے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ غزل کے کلاسیکی مزاج میں جو الفاظ کو خاص معنویت لیے استعمال کیا جاتا تھا اور جو اس میں مختلف الجہاتی تھے، جو حسب موقع، صرف اور اس سے معانی لینے کی عادت تھی، اردو کی نئی نسل کی اس کیفیت اور طرح داریوں سے ناواقف ہوتی جاتی ہے۔ آتش کے اس شعر سے

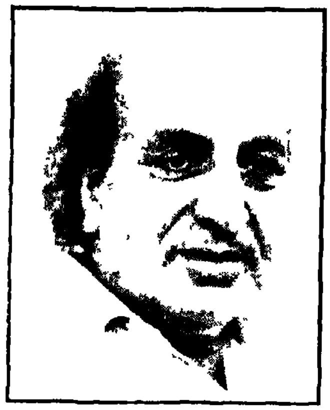
ذہن پر ہیں ان کے گماں کیسے کیسے کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

نئے شارحین "گماں" اور "کلام" کی کلاسیکی معنویت یا آتش کے دور میں ان الفاظ کے صرف اور محل استعمال سے بے خبر ہیں۔ "گماں" کی "غرور"، "گھمنڈ"، "تجتر"، اور "ادعا"۔ اور "کلام" بمعنی "بدکلامی"، "شکایت" جو اس شعر میں معنی کا صحیح رخ ہے، اس کا شارحین ندازہ نہیں۔ اسی طرح تشبیہات، استعارے، علائم، تلمیحات، اور ان کے تمام علاقوں سے اردو کی نئی نسل بیگانہ ہوجائے گی۔ میرا ل ہے کہ نئی شاعری، نادانستہ طور پر ایک عبوری دور کا تجربہ ہے۔ اس میں آنے والے مزاج، تفہیم اور کلاسیکی انداز سے بے گانگی ساتھ ساتھ اردو کی تہذیبی سطح ہر لحاظ سے پست ہوتی جاتی ہے۔ یہ اتنا اہم نہیں بلکہ اسے نوشتۂ دیوار سمجھنا چاہیے۔ کوئی چاہے تو اسے یوں کہہ سکتا ہے کہ عشق کی دنیا میں جاگیرداری اور بورژوازی کار تجربوں سے جو کچھ داخل ہوا تھا، جدید تجارتی سوسائٹی سے اس قدر الگ ہے زل کی اس دنیا سے بے گانگی کا اور تجربوں، تفہیم، لذتیات اور طریق عشق کے ساتھ اظہار عشق میں فرق کا آنا فطری اور منطقی بات ہے۔ پھر SUBDU اور COLONIZED سماج اور آزاد سوسائٹی کی نفسیات کے اندار، تجربوں اور RECEPTIVITY تو فرق پڑنا ہی چاہیے کہ یہ SOCIAL CHANGE کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ میر، غالب، آتش، ناسخ، ظفر اور ب سے راشوق کیا ستمال کی تقریباً تمام شاعری کے تجربے جو اٹھارویں اور انیسویں صدی میں کیے گئے سب SUBDEO اور COLONIZED سوسائٹی کے تجربے ہیں اور اکیسویں صدی ایک آزاد ہوا میں سانس لے رہی ہے اور جیسا کہ میں نے اوپر ہے کہ یہ روبٹ اور کمپیوٹر کی بھی دنیا ہے، ساتھ ہی ساتھ MULTI-RACIAL فکر اور من کے تجربے بھی غزل میں داخل ہو رہے ہیں، روحانی شناخت SPIRITUAL IDENTITY بکھر رہی ہے اور جس میں ایک طرف بکھرنے کا خوف حاوی ہے تو دوسری ف اپنی جڑیں ڈھونڈھنے اور ان سے وابستہ رہنے کی تمنا۔ یہاں بیرونی تہذیب کا حملہ بھی ہے اور یہاں نیشنلزم، انٹرنیشنلزم میں ضم ہوجاتی ہے سے بکھر جانے کا خوف بھی، تقسیم، بے گھری اور دربدری نے اردو دنیا کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ آج غزل، نیوجرسی، کینیڈا، لندن، نیویارک، اور بئی میں بھی لکھی جا رہی ہے اور پاکستان و ہندوستان میں بھی۔ اس میں محدود تہذیبی، نظریاتی پناہ گاہیں بھی ہیں اور تہذیبی پناہ گاہوں کے چھپٹ

جانے کا خوف بھی PAST NATIVE قد بتاجاتا ہے اور نئی بے چیدہ زندگی کے تجربوں کی چک پھیریاں ذہن اور زندگی پہ حاوی ہوتی جا
ہیں ۔ اجارہ دارانہ، سرمایہ پسند نیشنلزم، انٹرنیشنلزم میں داخل ہوتی جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جدت MODERNISM
کے تمام مزخرفات، ارتقار کا ماسک پہن کر ادب کی نئی تاریخ بنانے میں کوشاں ہیں جسے انٹرنیشنلزم کی سند ملتی جاری ہے ۔ تو غزل کا ارتقا
اب انھیں سمتوں میں ہو رہا ہے یہ خراب ارتقاء ہی مگر یہی کلاسکیت کی EBBING غزل کی نئی تاریخ بنا رہی ہے ۔ ایک صورت ہندستا
میں اور قدرے الگ ہوگی، اگرچہ اسے ادبی صف میں شامل نہیں کیا جا سکتا مگر عوامی مزاج میں اس کی شمولیت تو رہے گی ۔ قومی یک جہتی
اثر سے حکومت کو خوش کرنے والی غزلوں اور نظموں میں وطن پرستی کی علامتیں، استعارے اور موضوعات ۔ مگر چونکہ یہ صرف
ONE WAY TRAFFIC ہے اس لیے اس میں گہرائی اور سنجیدگی نہیں پیدا ہو سکتی ۔ یعنی صرف اردو ہی سے اس رنگ و مزاج
تقاضا ہے، اس لیے یہ صورت ملک گیر نہیں ہو سکتی ۔ تو حکومت کی خوشامد کرتے کرتے یکایک بغاوت کی فضا بھی پیدا ہو سکتی ہے ۔
SUBDUED بھی ہو سکتی ہے اور شوٹنگ SHOOTING بھی ۔ اور اگر ایسا ہوا تو، اس میں خارجیت اور عوامی تفہیم کا مزاج
بڑھتا جائے گا ۔ اس طرح ترقی پسندانہ ارتقائی کیفیت غزل میں پھر پیدا ہو سکتی ہے جو جدیدیت کی مریضانہ نفسیات اور بے مقصد شاعر
کی لپیٹ میں آگئی اور جس میں لوگوں کو GLOBAL GUATANTEE اردو کے لیے نظر آنے لگی تھی ۔ غزل کے کچھ
POSITIVE تجربے، زبان و بیان کے کچھ نمونے جو جدیدیت کے تحت ہوئے، وہ تو غزل میں یقیناً اس وقت تک رہ جائیں گے جب تک لبرل اور
فضا، نئی اشاریت، نیا موضوع اور نیا آہنگ نہیں پیدا کرتی ۔ لیکن جو بہت سے لوگ یہ امید لگائے بیٹھے ہیں کہ جدیدیت ہی اکیسویں صدی
کا مزاج ہوگی، اس کی حقیقت بہت جلد ان پر عیاں ہو جائے گی کہ ایسا نہیں ہو سکتا ۔ دراصل یہ مزاج ٹیری ایگلٹن کے الفاظ میں، سرمایہ دار
نظام کا A SECRET NEGATIVE TRUTH OF THE HEGEMONY WHICH
پوشیدہ منفی ردیہ تھا جس نے ذہنوں کو اسی میں اسیر رکھنا چاہا تھا ۔ یہ جو انتظار حسین اور ہندی کی جدید شاعری میں اپنی جڑوں کی تلاش
یہ بھی اسی کا شاخسانہ ہے ۔ دقیانوسیت اور مصنوعی روحانیت کا ڈھونگ چولے بدل کر جو جدت MODERNITY میں دا
ہو رہا ہے ۔ اس سے نئی نسل کے شعرا اور ادیبوں کو ہشیار رہنا چاہئے کہ یہ سب CAPITALISM کے ملمع کیے ہوئے حربے ہیں
جدید انسانی ارتقا اور اس کی باخبری "انٹرنیشنلزم" کے لیے خطرے کا سبب بنتے جاتے ہیں اور "جڑوں کی تلاش" کا جذبہ، انسانی ارتقا
اور اس کی باخبری کو دھندلا سکتا ہے ۔ کیا اکیسویں صدی کی غزل، ان زیریں مخفی پینتروں سے خود کو بچالے گی یا ان کا شکار ہو جائے گی، ابھی
کچھ کہنا مشکل ہے ۔ اگر اردو غزل کا متغزلانہ مزاج اور اس کی آگہی، ہشیار رہی تو خود کو بچا لے گی لیکن اگر مخفی زیریں پینتروں سے بے خبر ہو کر
CONSUMERISM کے فیشن میں بہہ گئی تو اس کے بنیادی تقاضوں، معنویت اور احساس کے مجروح ہو جانے کے امکانات خاصے
قوی ہیں ۔ ✱

بقیہ : سنک صفحہ ۳۸

تھوک دینے کے لئے گھوڑے پر چابک چلا دیا ۔ اور مجھ سے مخاطب ہوا
"یہ سالے بابو لوگ، سب ایک جیسے ہوتے ہیں ۔"
میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا ۔ "سور سالے، بن ٹھن کر گھومتے
ہیں ۔ کھانے پینے اور موج مزے پر من مانا خرچ کر سکتے ۔ مگر کسی
محنت کش کو دینا ہو تو حرام زادوں کی نانی مرتی ہے ۔"
اس کا نفرت انگیز جملہ سن کر میں نے منھ پھیر لیا ۔ کچھ پل وہ خاموشی
سے تانگا چلاتا رہا پھر بڑے ہمدردانہ لہجے میں بولا ۔
"بیٹا !"
لفظ بیٹا اور اس کے پیار بھرے لہجے نے مجھے اس کی طرف دیکھنے
پر مجبور کر دیا ۔ اس نے میری آنکھوں میں دم توڑتے ہوئے پرندے
کی طرح دیکھتے ہوئے پوچھا ۔
"بیٹا ! ـــــ اس نے تمہیں تو پورے پیسے دیئے ہیں نا !"
✱



## اندر سروپ دت ناداں

# سانجھی چیخ

جانتا ہوں
آپ ہیں اس شہر کے آقا مرے مخدوم بھی ہیں
آپ کے جذبات کی توہین کر کے
میں کسی مشکل میں پڑ سکتا ہوں' لیکن
اپنے دل کی بات ہونٹوں پر نہ لانا بھی مرے بس میں نہیں ہے
آپ واقف ہیں مرے حالِ زبوں سے
اور یہ بھی جانتے ہیں
میں ہوں جس بستی کا باسی
اس کے باشندوں کو فرصت ہی نہیں یہ سوچنے کی
رام کب اور کس جگہ پیدا ہوا تھا
ور کیا ہے بابری مسجد کا قصہ
ن کے روز و شب کو کھائے جا رہا ہے
سئلہ دو روٹیوں کا
روکھی سوکھی روٹیوں کا
ن کی خاطر
نتوں کی سولیوں پر جھولتے ہیں رام سیوک اور عبداللہ برابر
وراس دوزخ کی سانجھی چیخ سے بیزار ہو کر
پ لاتے ہیں بروئے کار مذہب کی سیاست
ر پھر چلتا ہے دورِ قتل و غارت..............
ہی کہئے کہ کیا لینا ہے مجھ کو
ہوائی مسئلوں سے
کے حق میں
ہب کی دُہائی دے رہے ہیں
سے مانگنے آئے ہیں میرے خون کے وہ چند قطرے
تک بھوک نے چاٹے نہیں ہیں!

بی۔۲/۲۶۹' پچھم وہار نئی دہلی ۔۱۱۰۰۶۳

## وسیم بریلوی

لہو نہ ہو تو قلم ترجماں نہیں ہوتا
ہمارے دور میں آنسو زباں نہیں ہوتا

جہاں رہے گا وہیں روشنی لٹائے گا
کسی چراغ کا اپنا مکاں نہیں ہوتا

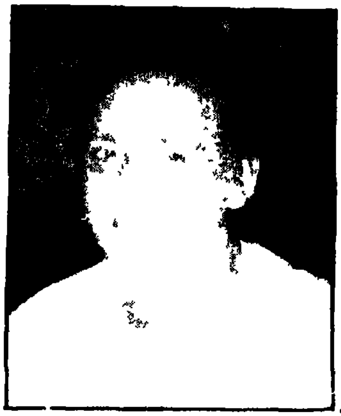
یہ کس مقام پہ لائی ہے میری تنہائی
کہ مجھ سے آج کوئی بدگماں نہیں ہوتا

بس اک نگاہ مری راہ دیکھتی ہوتی
یہ سارا شہر مرا میزباں نہیں ہوتا

ترا خیال نہ ہوتا تو کون سمجھاتا
زمیں نہ ہو تو کوئی آسماں نہیں ہوتا

وسیمؔ صدیوں کی آنکھوں سے دیکھیے مجھ کو
وہ لفظ ہوں جو کبھی داستاں نہیں ہوتا

● شعبۂ اردو بریلی کالج' بریلی (یوپی)



ندا فاضلی

۱۰۳ - امرا پارٹمینٹ، ڈانڈا پاڑہ - ۱، کھار (ویسٹ)، بمبئی ۵۲ ۰۰۰ ۴

# دیواروں کے بیچ

(قسط نمبر ۲)

اکھاڑے کے استاد سے بدن سازی کے لئے تجرّد کی نصیحت کی ہے۔ ماں بہن کے پیہم اصرار پر بھی شادی کے لئے راضی نہیں ہوئے۔ لنگوٹ کے اس غیر فطری ضبط نے ان کے مزاج کو جلالی اور جھکّی بنا دیا ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی بات کو بحث میں الجھانا اور غیر ضروری سوال و جواب سے ہر بات کو معمّہ بنانا ان کی عادت ہے۔ غصّہ سیلاب کی طرح چڑھتا ہے۔ سارے رشتے ناطے ٹوٹ جاتے ہیں۔ ماں دشمن بن جاتی ہے بہنیں ڈائنیں ہو جاتی ہیں . . . .

ہوائی کا یہ جنوں کچھ دن کے بعد انہیں پاگل خانے تک لے پہنچا ہے۔

دہلی میں سب کے بچوں کی دیکھ بھال انہیں کی ذمہ داری ہے۔ وہ بچوں کی اصلاح کے لئے ہر بار نئی سزائیں سوچتے ہیں۔ جہاں کسی بچّے کی شرارت سے تنگ آکر انہیں آواز دی جاتی ہے وہ فوراً آتے ہیں اور بچّے کو اٹھا کر کچھ دیر کو باہر چلے جاتے ہیں۔

ان کی ایک سزا بہت تکلیف دہ ہے۔ اس میں بچّے کو پاؤں سے پکڑ کر مسجد کے کنویں میں سر کے بل الٹا لٹکایا جاتا ہے۔ اس عمل کے دوران جو کافی دیر چلتا ہے وہ شرارت کے پورے واقعہ کو اپنی زبان میں دہراتے رہتے ہیں۔ جب بچّہ حال سے بے حال ہونے لگتا ہے تو باہر نکال کر پھر سے آدمی کی طرح زمین پر کھڑا کرتے ہیں۔ اور کانپتے ہاتھوں اور روتی آنکھوں سے معافی منگواتے ہیں۔

اسی مکان کے پاس بنگالی بابو کا مکتب ہے۔ یہاں ٹاٹ کی پٹی پر بیٹھ کر ملتانی مٹّی سے پُتی ہوئی لکڑی کی تختی پر سرکنڈے کے قلم سے بڑے حروف میں لکھائی کی مشق کی جاتی ہے۔ ذرا سی بھول چوک پر ڈنڈے سے ہتھیلیاں لال ہوتی ہیں کبھی مرغا بھی بنایا جاتا ہے۔ اس میں فرش پر پنجوں کے بل بیٹھ کر گھٹنوں کے بیچ سے دونوں ہاتھ نکال کر کانوں کو پکڑا جاتا ہے۔ اس جانور نما حالت میں خون کا دوران الٹا ہو کر اس تیزی سے گھومتا ہے کہ پوری دھرتی نٹ راج کی طرح رقص کرتی محسوس ہوتی ہے۔ مکتب کے بنگالی بابو کو ہر بچّے کے گھر سے باری باری کھانا جاتا ہے۔ کبھی وہ خود بھی لینے آجاتے ہیں کبھی کوئی بچّہ ان تک پہنچا دیتا ہے۔ بنگالی بابو اکیلے ہیں۔ بنگال کے قحط کے دوران لڑکپن ہی سے یہاں آکر بس گئے ہیں۔ عمر کچھ زیادہ نہیں ہے لیکن ٹھوڑی کی داڑھی اور سر پر بالوں کے دو رنگوں نے وقت سے پہلے بزرگ بنا دیا ہے۔ ہر سال وہ بنگال میں اپنے گھر جانے کا پلان بناتے ہیں جو لگاتار ٹلتا رہتا ہے۔ وہ دوپہر کو اکثر گھر آجاتے ہیں اور جو بھی جاگا ہوا ملتا ہے اس سے دیر تک اپنے گاؤں، ماں، باپ اور بہن بھائیوں کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔ بار بار دہرائے جانے سے سننے والوں کو ان کی ہر بات یاد ہوچکی ہے لیکن وہ ہر دفعہ ایسے سناتے ہیں جیسے وہ پہلی بار سنا رہے ہوں۔

ندی کنارے گاؤں تھا۔ گرمی ایسی تھی کہ سارا پانی خشک ہو گیا تھا۔ پورا گاؤں روٹی روزی کی تلاش میں نکل پڑا تھا۔ ہمارے گھر والے بھی اسی قافلے میں شامل تھے۔ جنگل کے دن سویرے ہی ہم روانہ ہوئے تھے۔ بھوک پیاس سے برا حال تھا۔ راستے میں ایک پیڑ پر کچھ پھل سے دکھائی دئے۔ میں فوراً گلہری کی طرح اوپر چڑھ گیا۔ پھل تھے بہت میٹھے۔ ایک کے بعد ایک کئی کھائے۔ لیکن نیچے اترتے ہی سر چکرانے لگا۔ جب ہوش آیا تو پیڑ تلے میں ہی اکیلا تھا۔ دور تک جنگل ہی جنگل۔ گھر والے کہیں نہیں تھے۔ انہیں کی تلاش کرتے ہوئے دہلی کے اس محلّے تک چلا آیا لیکن اتنے سال ہو گئے وہ کہیں نہیں ملے۔

بنگالی بابو کو پھر دق ہو جاتی ہے۔ کھانسی میں خون آنے لگتا ہے۔ سانس پھولتی ہے۔ مائیں اپنے بچّوں کو ان کے مکتب سے اٹھا لیتی ہیں۔ گھروں سے دور ایک ٹوٹے پھوٹے میدان میں ان کے لئے چھپّر ڈال دیا جاتا ہے جہاں ایک ٹوٹی چارپائی پر وہ دن بھر کھانستے ہیں۔ گھروں میں ان کے آنے کی ممانعت ہے۔ کھانا انہیں وہیں بھیج دیا جاتا ہے۔

ایک دن وہ چھپر سے ندا کو آواز دیتے ہیں۔ وہ پیاسے ہیں۔ ہلنے جلنے کی طاقت نہیں ہے۔ ندا صراحی سے پانی نکال کر انھیں دیتا ہے۔ وہ خفیف آواز میں کئی دعائیں دیتے ہیں۔ پڑھائی کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ دوسرے بچوں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ خلیل احمد ادھر سے گزرتے ہوئے دیکھ لیتے ہیں ایک دو طمانچے رسید کرکے باہر کھینچ لاتے ہیں۔ والدہ فوراً گرم پانی کرکے نہلاتی ہیں اور نہ جانے کی تاکید کرتی ہیں۔

بنگالی بابو کے انتقال کے بعد اس چھپر میں تیل چھڑک کر آگ لگا دی جاتی ہے۔ اس کے بعد دو تین لفافے جو انھوں نے کسی کے پتے پر بھیجے تھے خلیل احمد کے پتے پر واپس آجاتے ہیں۔ یہ خط بنگالی رسم الخط میں ہیں۔۔۔۔ ان خطوں میں انھوں نے کیا لکھا تھا یہ کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔

وہ مر چکے ہیں لیکن آتے ہی وہ اب بھی پڑھائی کے بارے میں پوچھنے چلے آتے ہیں۔ یہ سلسلہ کئی دن تک چلتا رہتا ہے۔ جمیل فاطمہ کو جب اس کا پتہ لگتا ہے تو وہ کسی سے تعویذ بنوا کر ندا کے گلے میں ٹانگ دیتی ہیں۔

جمیل فاطمہ کی طبیعت اب پہلے سے بہتر ہے۔ شوہر کو سدھارنے کا جنون متوازن ہو چکا ہے۔ بچے بڑے ہو رہے ہیں وہ انھیں کے بارے میں اب زیادہ سوچتی ہیں۔ ہر بچے کے مستقبل کا پلان ان کے ذہن میں تیار ہے۔ مصطفیٰ احسن پروفیسر بنے گا۔ ندا ڈاکٹر، چھوٹا انجینئر۔۔۔ اور کچھ دنوں کی بات ہے لڑکے سامنے ہو جائیں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہر روز سردی ہو یا گرمی صبح اندھیرے اٹھتی ہیں اور نماز اور وظیفے سے فارغ ہو کر (جو دیر تک چلتا ہے) بچوں کو لے کر بیٹھتی ہیں اور خود پڑھاتی ہیں۔ جب کوئی بچہ پڑھائی سے آنا کانی کرتا ہے تو اس وقت کچھ نہیں کہتیں۔ صرف خاموش ہو جاتی ہیں۔ اس خاموشی کا مطلب ہے صبح کا ناشتہ اس کے لئے بند ہو چکا ہے۔ لیکن جب ناشتے کا وقت ہوتا ہے تو دوسروں کو کھلا پلا کر دانستہ باورچی خانے کا دروازہ کھلا چھوڑ کر کہیں دور جا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ باورچی خانے میں سزا یافتہ ناشتہ کرتا رہتا ہے اور وہ خود روتی رہتی ہیں۔ انھیں لگتا ہے جیسے ان کا سوچا ہوا پلان بکھرتا جا رہا ہے۔ محلے کے بچوں کے ساتھ کھیلنا، اسکول سے دیر سے لوٹنا اور آپس میں لڑنا جھگڑنا بھی اس پلان کے دشمن ہیں۔ اسکول کے ٹیچروں کے یہاں ہفتے دو ہفتے میں ایک بار ضرور چکر کاٹتی ہیں اور پڑھائی کے بارے میں تشفی کرتی ہیں۔

گوالبار میں اسکول کے وقت سے پہلے محلے ہی کی ایک خاتون قرآن پڑھاتی ہیں۔ یہ خاتون ایک کھاتے پیتے خاندان کی اکیلی بیٹی ہیں۔ دالان میں رکھے پنجرے میں قید طوطے اور ندا کو وہ ایک ساتھ پڑھاتی ہیں۔ ان کے طوطے کو کئی آیتیں ازبر ہیں۔ وہ طوطے اور ندا کے بیچ میں بیٹھی ہوئی کبھی طوطے کو سبق دیتی ہیں کبھی ندا کو کسی غلطی پر ٹوکتی ہیں۔ پہلے وہ پچھلے دن کا آموختہ سنتی ہیں اس کے بعد سبق دیتی ہیں۔ سبق کو بھی کئی دفعہ سنتی ہیں ان کے یہاں سے لوٹنے کے بعد سر چکرانے لگتا ہے۔

اسکول کے وقت کی پابندی کی وجہ سے ندا کو صرف ایک ڈیڑھ گھنٹے میں چھٹکارا مل جاتا ہے لیکن وہ بے چارہ طوطا دن بھر ان کے علم و فضل سے مستفیض ہوتا رہتا ہے۔ اس کے ساتھ ہر آنے جانے والے کے سامنے اس علم و فضل کی نمائش بھی اس غریب کی جان کا فرض ہے۔ استانی صاحبہ اسے باشرعیت مسلمان سمجھ کر ثواب کماتی ہیں۔ اور وہ بے زبان جنگل کا پرندہ اپنی عمر قید پر آنسو بہاتا ہے۔ علم و فضل کا مسلسل بوجھ اور کھلے آکاش کے جنگل سے دوری کا غم۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے ڈھیر ہو جاتا ہے۔ استانی صاحبہ بہت افسوس کرتی ہیں۔ انھیں اس بے چارے کی موت سے زیادہ اپنی محنت کے اکارت جانے کا غم ہے کتنی محنت کی تھی اسے آیتیں یاد کرانے میں۔ فرفر بڑی بڑی آیتیں سنا دیتا تھا۔۔۔ لیکن یہ سوچ کر وہ مطمئن بھی ہیں کہ دوسرے جنگلی پرندوں کی طرح یہ دوزخ کی آگ میں جلنے کے بجائے کلمہ سیکھنے کی وجہ سے سیدھا جنت میں جائے گا۔۔۔ وہ اس طوطے کو نہلا دھلا کر، ایک نئے سفید کپڑے میں لپیٹ کر اپنے آنگن کے ایک کونے میں دفن کرتی ہیں۔ اور فاتحہ پڑھ کر اسے جنت میں آرام کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیتی ہیں۔

ان کے والد پولیس میں داروغہ تھے۔ رشوتوں کو اینٹ پتھر میں چھپا کر کئی عمارتیں کھڑی کی تھیں۔ محلے بھر میں ان کی وردی اور دولت کی دھاک تھی۔ ان کی حیات تک پورے گھر میں استانی صاحبہ کی حکمرانی تھی۔ کوئی کام ان سے پوچھے بغیر ممکن نہیں تھا۔ لیکن اب بڑے بھائی شادی شدہ ہیں۔ ان کی بیوی نے گھر کا سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لے کر نند کو اس ذمہ داری سے آزاد کر دیا۔

شکل و صورت سے معقول ہیں۔ گھر کی شان و شوکت دیکھ کر کئی رشتے آئے بھی لیکن بھائی کی نظر میں کوئی رشتہ کے لئے موزوں نہیں ہوتا۔ کسی کو کالے رنگ کی وجہ سے ناپسند کیا جاتا۔ کوئی چھوٹے قد کی وجہ سے ناکام ہوتا۔ اگر کوئی خوش قسمت رنگ و قد کی کسوٹی پر کھرا اترتا بھی تو اس کی چھان بین چار نسلوں تک معلوم کی گئی اور اس کی پشت کے کسی نہ کسی بزرگ کے کسی عیب (جیسے اس نے اپنی بیوی کو ایک بار ڈانٹا تھا یا اس کے بھائی نے بیوی کے ہوتے

دوسری شادی کی بھول کی تھی۔) کو اس سے جوڑ دیا جاتا۔

استانی صاحبہ ایک دن مایوسی سے کہتی ہیں۔ بھائی صاحب نے جائداد کی لالچ میں ان کی شادی نہیں کی۔ اسی جائداد کے جھگڑے میں چھوٹا بھائی گھر چھوڑ کر کہیں اور بس گیا ہے۔

وقت گزرتا جاتا ہے۔ کالے بالوں میں چاندی کے تار چمکنے لگتے ہیں۔ آئینہ آنکھوں کے ارد گرد کالے حلقے ابھار دیتا ہے اور وہ چپ چاپ کسی آنے والے کے انتظار میں آسمان کی نیلاہٹوں کو تکتی رہتی ہیں۔ بھائی کی اولاد بڑی ہونے لگتی ہے تو بہن کی حیثیت اپنے ہی گھر میں مہمان کی سی ہو جاتی ہے۔ کئی کمروں، دالان اور چاروں طرف پھیلے ہوئے باغ کا گھر سمٹ کر ایک چھوٹی سی نیم تاریک کوٹھری میں محدود ہو گیا ہے۔ زیادہ وقت نماز اور ورد وظیفوں میں گزرتا ہے۔ جب دیکھو تسبیح ہاتھ میں ہے اور ہونٹ ہل رہے ہیں۔ اور ضرورت سے زیادہ صفائی پسند ہو گئی ہیں۔ دن میں کئی بار غسل کرتی ہیں۔ ہر نماز سے پہلے ایک ایک گھنٹہ وضو کرتی رہتی ہیں۔ ان کے کھانے پینے کے برتن الگ ہیں۔ بستر پر کسی کو بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے... ایک دن اچانک خبر پھیلتی ہے کہ میم (ان کے گھر کا نام) نے شادی کر لی ہے۔ دولہا انہیں کے بھائی کا کوئی بزرگ دوست ہے۔ بھائی اس شادی کے خلاف ہیں لیکن کر کیا سکتے ہیں بہن بغاوت پر آمادہ ہیں۔ دونوں کی عمر شادی کی منزلوں سے کوسوں آگے گذر چکی ہے ... کچھ ہی دن شادی شدہ رہ کر پہلے شوہر رخصت ہوتے ہیں بعد میں استانی صاحبہ اپنی وفاداری کا ثبوت دیتی ہیں... بہن کی وفات کے بعد بھی جائداد سالم ہے۔

ندا نے پانچویں تک گوابار میں مادھو گنج میں واقع حضورات اسکول میں تعلیم پائی ہے۔ اسکول میں ہر صبح پہلے پرارتھنا ہوتی ہے۔ اس میں اسکول کے سارے طلبا اور اساتذہ شریک ہوتے ہیں۔ یہ پرارتھنا ایک اردو نظم کی صورت میں ہے۔ جس کو سدھیا سرکار کے لئے ماسٹر ریاض الدین نے نظم کیا ہے۔ اس نظم میں گوالیار کے موجودہ حکمران جیواجی راؤ سدھیا کی تندرستی اور اقبال کی دعائیں دی گئی ہیں۔ اختتام میں ان کی حکومت میں شیر اور بکری کے ایک گھاٹ پر پانی پینے اور ان کے راج کی نعمتوں کا ذکر ہے۔ دو خوش الحان لڑکے بینڈ کے نیچے اسٹیج پر کھڑے ہو کر اسے ترنم میں گاتے ہیں اور تمام اساتذہ اور طالب علم سر جھکائے ہاتھ باندھے احترام سے سنتے ہیں: تاخیر سے آنے والے طلبا پرارتھنا کے دوران پھاٹک کے باہر ہی کھڑے ہو جاتے ہیں اور گھنٹی بجنے کے بعد ہی اندر داخل ہوتے ہیں۔

اس اسکول میں اردو اور انگریزی ماسٹر نظام الدین پڑھاتے ہیں۔ ہٹلر اسٹائل مونچھیں، بیٹے دار بال، ہر وقت منہ میں پان دبا رہتا ہے گرمیوں میں کالی سرخ گرمیوں میں سفید سلک کی شیروانی کے ساتھ علی گڑھ پائجامہ اور کالا لمبہ لگا جوتا پہنتے ہیں۔ پاسنگ شو کا پورا ڈبہ ہاتھ میں رہتا ہے۔ سگریٹ سے سگریٹ سلگا کر ماچس کی بچت کرتے ہیں۔ اسکول کی نوکری ان کی ضرورت نہیں شوق ہے۔ اسکول کی ساری تنخواہ اسکول کے طلبا پر ہی خرچ کر دیتے ہیں۔ کسی کی فیس نہیں بھری اس کی فیس جمع کر رہے ہیں۔ کسی کو کتاب خرید کر دے رہے ہیں۔ کبھی کسی سے خوش ہوتے ہیں تو خوشی کا اظہار پیسے دے کر کرتے ہیں۔ کلاس میں آتے ہی پہلے بٹوے سے تازہ پان نکالتے ہیں۔ اس میں چھالیہ، تمباکو وغیرہ ڈال کر پہلا پان کلے میں دبانے کے بعد ہی دوسرا گال میں اڑس لیتے ہیں۔ دو پانوں سے اٹھتی ہوئی آواز ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آتی۔ اسی نہ سمجھنے والی آواز میں سر جھکائے حاضری لیتے ہیں۔ کسی کے نام پر کوئی بھی لڑکا کھڑا ہو کر حاضر جناب کہہ دیتا ہے۔ اور یہ بنا کسی رد عمل کے ناموں پر نشان لگاتے رہتے ہیں۔ حاضری لینے کے بعد باہر جا کر پیک تھوکتے ہیں۔ پھر پڑھائی شروع ہوتی ہے۔ ان کی پڑھائی عام طور سے طلبا کے والدین کی خیریت معلوم کرنے سے شروع ہوتی ہے اور پھر کسی کے ذریعے سلام پہنچواتے ہیں۔ کبھی دعا کہلواتے ہیں اور اسی میں سارا وقت ختم ہو جاتا ہے۔ نصاب کی کتاب مہینے میں ایک آدھ بار ہی کھلتی ہے لیکن جس دن وہ پڑھانے کے موڈ میں ہوتے ہیں تو اتنا انہماک ہوتا ہے کہ آدھے سے زیادہ لڑکوں کے چپ چاپ کھسک جانے کی بھی انہیں خبر نہیں ہوتی...

ماسٹر صاحب نے شادی نہیں کی ہے۔ پچھلی تین پشتوں سے ان کے خاندان میں دو لڑکے ہوتے رہے ہیں۔ ان دونوں میں کسی ایک کی شادی ہوتی ہے دوسرا برہمچاری کی زندگی گزارتا ہے۔ حسب روایت یہی گزار رہے ہیں۔ اپنے بڑے بھائی کے بچوں کو ہی اپنا سمجھتے ہیں۔

بزرگوں کا چھوڑا ہوا کافی اثاثہ ہے۔ گوالیار کے تجارتی مرکز میں کئی دکانیں ہیں۔ ایک بہت بڑا باڑا ہے جس میں ہر شام چھڑکاؤ کر کے کرسیاں بچھا دی جاتی ہیں اور شہر کے بیشتر شعرا ہر شام یہاں آ کر شاعری، فلسفہ اور سیاست پر دیر دیر تک بحث کرتے ہیں۔

ندا فاضلی دوپہر کے وقت ان کی حویلی میں پڑھنے جاتا ہے۔ ان کے احاطے میں ایک بڑا سا باغ ہے۔ باغ سے جُڑا ہوا کشادہ میدان ہے۔ اس میدان کے دونوں اطراف دو لمبے دالان ہیں۔ جس کمرہ میں ماسٹر صاحب رہتے ہیں اس پر گلابی ریشم کا پردہ پڑا رہتا ہے۔ پڑھائی وہ چلتے پھرتے دالان ہی میں کراتے ہیں۔ دوپہر کو ہر روز ندا کے ہونے ہی وہاں ایک خوبصورت، بھاری جسم کی عورت آتی ہے اور خاموشی سے مسکراتی ہوئی سیدھے پردہ کے پیچھے چلی جاتی ہے۔ ان کی آمد اور ندا کی چھٹی کا وقت ایک ہی ہوتا ہے۔ اس عورت کے دو بچے اسکول میں ندا کے ساتھ ہیں۔ ان کا سارا خرچہ ماسٹر صاحب ہی اٹھاتے ہیں۔ اسکول کے لڑکے انہیں ماسٹر صاحب کی اولاد کہتے ہیں۔ بچوں کے منہ سے ان کے والد کے لفظ ہی بولتے ہیں۔ حالانکہ اسکول میں ان کے باپ کا نام کچھ اور درج ہے۔ گھر میں والد سے سُنا ہے۔

یہ عورت ماسٹر صاحب کے والد کی زندگی میں گھر میں کام کرتی تھی۔ وہیں بچپن سے سیانی ہوئی۔ اس گھر کے علاوہ اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ جوان لڑکوں کے گھر میں جوان لڑکی کا کنوارہ رہنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ اور ایک دن اس کی مرضی کے خلاف اس کا نکاح گھر کے ہی ایک ادھیڑ عمر کے نوکر سے پڑھا دیا گیا۔۔۔۔! ماسٹر صاحب وضع دار آدمی ہیں۔ پرانی ناانصافی کو رشتے کی وضعداری کی طرح نبھا رہے ہیں۔

چھٹی کلاس سے وی سی ہائی اسکول میں داخلہ ہوتا ہے۔ اس اسکول میں سیکنڈ ہیڈ ماسٹر ریاض الدین ہیں۔ وہی ہیں جن کی نظم پر ارتھنا کے روپ میں ہر پیریڈ اسکول میں ہر روز دہرائی جاتی ہے۔ ماسٹر ریاض الدین ان کے والد کے دوستوں میں ہیں۔ شاعر بھی ہیں۔ اور ریاض حیوری کے نام سے شعر کہتے ہیں۔ مشاعروں میں اپنا کلام سُنانے سے پہلے "تبرکاً" اپنے استاد نوح ناروی کے دو تین شعر ضرور پڑھتے ہیں۔ نوح صاحب کے شعروں کا ملا... اور محاوروں کی بندش کا مزا... باندھ دیتا ہے۔ بعد میں ان کا کلام اکثر ساٹ جاتا لیکن مجموعی تاثر اچھا ہوتا ہے۔ ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں۔

سن تیس کے ایم اے بی ایڈ ہیں۔ لیکن رہن سہن کچھ ایسا ہے کہ ہر کسی سے ذہین آدمی بھی غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ... کی ... ٹوپی، موٹے کپڑے کی قمیض، چوڑی موہری کا ٹخنوں سے اونچا پائجامہ اور ربڑ سول کی چپل جس کی وجہ سے ایڑھی میں کالی کھائیاں پڑ گئی ہیں۔ ان کی ... پر پردہ ڈالے رہتی ہیں۔

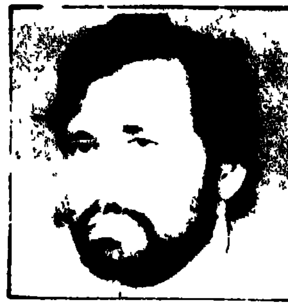
صبح سے شام تک شہر کا پیدل چکر کاٹتے ہیں۔ جہاں کہیں نظر آتے ہیں ہونٹ سمیٹے سکڑتے رہتے ہیں اور ہاتھ کا ارادہ اٹھتے بیٹھتے رہتے ہیں ... ہوتی ہیں۔ ایک گھر سے دوسرے گھر کا فاصلہ وہ شعر گوئی سے طے کرتے ہیں۔ ان کی اپنی کوئی اولاد نہیں ہے۔ اپنی عمر سے بڑے ایک بھانجے کو اپنا لڑکا مانتے ہیں۔ ریاض صاحب کے ساتھ ہی وہ ورانڈے میں رہتے ہیں اور دن بھر لکڑی کے ایک تخت پر لیٹے فارسی زبان میں شعر کہتے ہیں۔ ماسٹر صاحب کی آمدنی سے ان کا حقہ الگ نکالا جاتا ہے۔ شعری نشستوں میں یہ ماسٹر صاحب کے ساتھ آتے ہیں اور فارسی میں غزل سُناتے ہیں۔ بس اتنا ہی چلنے پھرنے کا کام ان کے ذمہ ہے۔ شاعری نے کبھی کسی شادی کی مہلت نہیں دی۔ عمر ساٹھ سال ہے۔

ریاض صاحب ترنم سے پڑھتے ہیں۔ یہ ترنم لحن سے زیادہ تحت کے قریب ہے۔ ہر لفظ ربڑ کی طرح کھینچا ہوا دوسرے لفظ سے ملتا ہے اور ... طرح مصرع اپنی لمبائی سے دوگنا ہو کر اختتام کو پہنچتا ہے۔ گھر میں بیوی ہیں جو ذرا اونچا سنتی ہیں جب کوئی مہمان آتا ہے تو یہ اندر جا کر بلند آواز ... چائے بنانے کو کہتے ہیں لیکن گھر میں کبھی دودھ نہیں ہوتا کبھی چائے کی پتی نہیں ہوتی۔ مہمان کو اندر کی خبر ریاض صاحب کے باہر آنے سے پہلے مل ... ہے اور وہ خود ہی چائے کے لئے انکار کر کے ماسٹر صاحب کی مشکل ان کے بنا بولے ہی آسان کر دیتا ہے۔

شعری نشستیں منعقد کرنا اور ہر ایک کے گھر جا کر اس کی اطلاع دینا ان کے شوق ہیں۔ ان کی وجہ سے اچھی خاصی ادبی چہل پہل ہے۔ ... کے شعر یوں ہیں۔ ؂

شب ماہ میں یوں نہ نکلا کرو تم اور سویرے سویرے اکیلے دو کیلے!
کہیں ہو نہ جائیں تصدق ستارے کہیں چاند رُخ کی بلائیں نہ لے لے
عشق کرنا نہیں آسان بہت مشکل ہے دیکھ، سن، سوچ، کہا مان بہت مشکل ہے

(باقی آئندہ)



## عبدالاحد ساز

خراب درد ہوئے، غم پرستیوں میں رہے
خوشی کی کھوج بہانہ تھی مستیوں میں رہے
ہوا حصولِ زرِ فن بڑی کشاکش سے
ہم ایک عمر جب تنگ دستیوں میں رہے
مسافتیں تھیں شبِ فکر کن زمانوں کی
کہاں کہاں گئے ہم کیسی ہستیوں میں رہے
ہر اک سے جھک کے ملے یوں کہ سرفراز ہوئے
چٹان جیسے خمیدہ سی پستیوں میں رہے
بدن کی ناؤ میں پُر پیچ رشتوں کی
عجب مذاق سے ہم گھر گرہستیوں میں رہے
خلوصِ فکر کی گلیوں میں گھومتے تنہا
ہم اپنے شعر کی سرشار بستیوں میں رہے

● دفتر محمد حاجی آدم اینڈ کمپنی ۸ جیکلا اسٹریٹ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

جانے قلم کی آنکھ میں کس کا ظہور تھا
کل رات میرے گیت کے مکھڑے پہ نور تھا
نغمہ سا چھیڑتی تھیں تجلّی کی انگلیاں
"توریت" کا نزول بہ لحنِ "زبور" تھا
وہ ساتھ ساتھ اور پہنچنا تھا اس تلک
ہر آن ایک مرحلہ نزدیک و دور تھا
میں ... کے پار پرتھی بلاوے کی روشنی
تھی وسوسوں کی شام، پہ جانا ضرور تھا
ہر پیچ کوئی واقعہ، ہر موڑ کوئی یاد
اس کے بدن کے ساتھ مرا لاشعور تھا
اک بعید مجھ سے منتظرِ انکشاف تھی
میں تھا مراقبے میں، مگر بے حضور تھا
کوئے ادب میں جلسۂ تحسین و تہنیت
ہنگامۂ زیارتِ اہلِ قبور تھا



## حامد اقبال صدیقی

سبھی گردشیں کردے مجھ پر تمام
اسے بخش معبود محور تمام
زمیں خاک ... زادوں کی حد، انتہا
فلک پر مزاج اور تیور تمام
صحیفوں سے طور اور معراج تک
خدا پر تکلّم کے جوہر تمام
پریشان موسم سے عالم پناہ
ہراساں ہواؤں سے لشکر تمام
گزشتہ رواجوں کے، تہذیب کے
بسے ہیں نگاہوں میں منظر تمام

گماں سے بالاتر کچھ بھی نہیں ہے
ہمیں ہو کس کا ڈر، کچھ بھی نہیں ہے
جہاں میں ہوں وہاں آنکھیں سبھی کی
جدھر تو ہے اُدھر کچھ بھی نہیں ہے
کنارِ آب بیٹھا سوچتا ہوں
سمندر میں گہر کچھ بھی نہیں ہے
غنیمت ہے ہمارا سانس لینا
بجز اس کے ہنر کچھ بھی نہیں ہے
کرید و یا بکھیرو خاک میری
دھواں، شعلہ، شرر، کچھ بھی نہیں ہے
اسی سے رازِ ہستی پوچھ حامد
خدا سے معتبر کچھ بھی نہیں ہے

● ۲-۲-۲۲۸، دینا قہ بلڈنگ، تیسرا منزلہ، روم نمبر ۱۲، فاکلنڈ روڈ، بمبئی۔ ۴۰۰۰۰۴



انل ٹھکر
۸ - اشوک نگر، ہبلی - ۵۸۰۰۳۲

# سنک

نہیں۔
کیوں؟
میں بے وقوف ہوں، اس لیے۔
ایسا نہیں.....
جیسا بھی ۔ مگر یہ نہیں ہوگا۔
میں بُک کرا کے آیا ہوں۔
کینسل کرا دیجیے،
مگر کیوں؟
خدارا بحث مت کیجیے۔

اتنا کہتے ہوئے میری بیوی کا گلا بھر آیا۔ آواز تھرانے لگی۔ آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ جنہیں وہ پلّو سے پونچھتے ہوئے باورچی خانے میں چلی گئی اور میں اپنے غصّے کی لاش کو مجبوری کے کفن میں پیٹے اپاہج کی طرح اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

میری بیوی سنکی ہے۔ جب جب بھی اس پر دورہ پڑتا ہے تو میں اپاہج ہو جاتا ہوں اور جب اُس کی مرضی کی بات پوری ہو جاتی ہے تو وہ سنک کا طوفان آکر گزر جاتا ہے مگر میری اپاہج انا کی رگوں میں جرأت کے خون کی گردش شروع ہونے میں کچھ دن لگ جاتے ہیں اور میں تب تک کراہتا رہتا ہوں۔

ویسے وہ بری نہیں ہے۔ آجکل کی بیویوں کی طرح وہ بھی بعد خدا کے شوہر کو درجہ دوم کے تخت پر عزت و پیار سے بٹھا کر رکھتی ہے مگر جب جب بھی اُس کو دورہ پڑتا ہے تو وہ تختِ دوم ببول کے کانٹوں کے مانند میری نس نس میں چبھ کر میری چاہت کو چھلنی چھلنی کر دیتا ہے۔

ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں۔ ان بیس برسوں میں ہماری چاہت میں کبھی زوال نہیں آیا۔ ہماری محبت کی لہریں ہمیشہ آگے ہی آگے بڑھتی رہی ہیں۔ اور نتیجتاً چاہت کے سمندر سے ہمیں دو موتی ملے ہیں پہلے لڑکی ۔ شبنم۔ پھر لڑکا ۔ جاوید۔

کئی بار چاہا اُسے کسی طرح PSYCHIATRIST کے پاس لے جاؤں۔ اس کا علاج کراؤں تاکہ میری انا کوفت بلجہ نہ ہو جائے۔ مگر وہ ہے کہ سنتی ہی نہیں۔ اُسے کسی غیر مرد کے سامنے بے پردہ جانا منظور نہیں۔ غیر تو غیر میرے دوست احباب میں سے بھی کسی نے اُس کی صورت نہیں دیکھی ہے۔ کبھی شہر پارٹی یا جلسے میں جانے کی بات کروں تو ایک ہی جواب دے کر ٹال جاتی ہے "میں اور میری ہر چیز آپ کے لیے ہے۔ نمائش کے لیے نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔" اور اگر میں غلطی سے بھی اصرار کروں تو اُسے دورہ پڑ جاتا ہے ۔ نہیں وہ ان پڑھ یا گنوار نہیں ہے۔ کالج میں دو سال تعلیم حاصل کر چکی ہے اور ایسا بھی نہیں کہ وہ نقاب و پردے کے ساتھ ہی پیدا ہوئی ہے۔ کالج کے زمانے میں وہ بے پردہ رہی ہے۔ بعد نکاح کے ریسپشن میں بھی وہ بے پردہ تھی۔ یہاں تک کہ شادی کے چار چھ مہینوں تک اُس کے پاس پہننے کے لیے برقع بھی نہیں تھا۔

ہماری شادی کو چار یا پانچ مہینے ہوئے تھے۔ ابھی ہمارے دل کی دھڑکنوں نے ایک دوسرے کے لمس کو ٹھیک سے پہچانا بھی نہیں تھا کہ ایک دن اس کے والد آکر اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ وہ ایک مہینہ میکے میں رہی اور اس ایک مہینے میں اس نے میرے نام جو خطوط لکھے وہ شبنم جاں نثار اختر کے خطوط سے کسی طرح کم نہ تھے۔ دراصل اُن خطوط کے سہارے ہی میں اُس کے بغیر ایک مہینہ جی سکا اور ایک دن بغیر کسی اطلاع کے میں اسے واپس لانے کے لیے اپنی سسرال جا پہنچا۔ میرے یکایک پہنچنے سے میری بیوی کی طرح میری سسرال کے گھرانے کے دو کمرے بھی خوشی سے چھلکنے لگے۔ گھر کی آبادی پھیلانے میں میرے خسر صاحب نے کوئی کنجوسی نہیں برتی تھی۔ لہٰذا میری بیوی کے بعد تین سالیاں اور چار سالے ہیں۔ جو مجھے گھیر کر باتیں

کرنے بیٹھے سسر سالے۔ قبلہ اقتائی اور گوشت لانے بازار کیطرف لپکے۔ ساس میری بیوی کو لے کر پکوان میں لگ گئی۔ مگر وہ باورچی خانے کی مصروفیت سے بچتے بچاتے کسی نہ کسی بہانے جہاں ہم بیٹھے تھے اس کمرے کا چکر لگا کر میری پلکوں میں بکھرا ... کے موتی چرا جاتی۔ سسرال کی مہمان نوازی کے خمار میں میں نے دوپہر ڈھلتے ڈھلتے تہیہ کر لیا کہ کم از کم ایک ہفتہ تو یہاں ڈیرہ ڈال ہی دوں گا۔ مگر میرے سامنے ایک بڑا مسئلہ تھا۔ رات کو سونے کا۔ دو کمرے۔ اتنے سارے افراد ان افراد سے کئی گنا زیادہ بیجاپور کے شاہی مچھر۔ ان سب میں لمس کی جس پیاس کو لے کر میں یہاں آیا تھا اُس کا کیا حشر ہوگا!! بہرحال، رات کی رات پر چھوڑ کر میں بیوی کو لے کر تاریخی مقامات دیکھنے کے بہانے گول گنبد کے باغ میں پہنچ گیا۔ وہ باغ میں چہکتی رہی اور میں اُس کی آواز کی موسیقی سے مدہوش ہوتا رہا۔

گول گنبد سے متصل درگاہ کے دودھیا گنبد کے پیچھے زرد آفتاب اپنی دکان بڑھانے کی تیاری میں تھا۔ میری بیوی نے باغ کے سبزے پر پھیلے ہوئے اپنے آنچل کو سمیٹا اور ہم ٹہلتے ہوئے گھر کی طرف لوٹنے لگے۔ راہ چلتے باتیں کرتے ہوئے اس کا شانہ بار بار میرے جسم کو چھونے لگا۔ یا یوں کہوں کہ وہ قصداً اپنا جسم میرے جسم سے مس کرنے لگی۔ جیسے شیرنی اپنا جسم شیر کے بدن سے رگڑ رگڑ کر اُسے اکساتی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ آگ دونوں ہی طرف تیزی سے روشن ہو رہی ہے۔

راہ چلتے ہوئے اتفاقاً میری نظر ایک بڑے بورڈ پر ٹک گئی۔ میرے ذہن میں برق سی لہرائی۔ میں نے محسوس کیا — لمس کی پیاس کے مسئلے کا حل مجھے مل گیا ہے۔ میں نے فوراً اپنی بیوی کو سمجھانا شروع کیا کہ وہ اگر اپنی امی کو راضی کرے تو دونوں کے اندر اندر سلگتی ہوئی آگ پر لمس کی بارش ہو سکتی ہے۔ پہلے تو وہ میری بات سن کر سٹپٹا گئی مگر میرے بار بار اصرار کرنے پر کچھ تو یہ سوچ کر میں خفا نہ ہو جاؤں اور کچھ اس کے جلتے ہوئے بدن کو بھی ٹھنڈک کی ضرورت تھی۔ چنانچہ وہ اپنی امی کو منانے کے لئے راضی ہو گئی۔ میں جانتا تھا اُس کی امی کتنی ہی دقیانوسی کیوں نہ ہوں انکار نہیں کر سکیں گی۔ کیوں کہ خسر چاہے داماد سے ڈرے نہ ڈرے مگر ساس تو نئے داماد سے سہمی سہمی رہتی ہے۔ اور اگر ساس مان جائے تو بے چارہ خسر کلین بولڈ ہی سمجھئے۔

کچھ اس طرح بے پناہ لذتوں سے بھرپور رات، ہم کچھ جاگتے ہوئے کچھ جھپکیاں لیتے ہوئے ہوٹل میں گزاری۔ علی الصباح پرندوں نے چہکتے ہوئے پر تولے تو میری بیوی نے گھر جانے کی تیاری شروع کی۔ وہ گھر جلد پہنچنا چاہتی تھی تاکہ میرے وہاں پہنچنے تک ناشتہ تیار کر سکے۔ رات جس تانگے میں ہم دونوں آئے تھے اُسی تانگے والے کو میں نے صبح آنے کو کہہ رکھا تھا۔ بیوی کے تیار ہوتے ہی میں نے باہر جا کر دیکھا تانگے والا آچکا تھا۔ میں نے تانگے میں بیوی کو گھر بھیج دیا۔

بیوی کے رخصت ہونے کے تقریباً دو گھنٹوں کے بعد میں چلتا ہوا اپنی سسرال پہنچا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی مجھے شبہ ہوا کہ شاید میں اپنی سسرال میں نہیں غلطی سے کسی تاریخی کھنڈر میں چلا آیا ہوں۔ گھر میں چاروں طرف سناٹا طاری تھا۔ میرے سالے، سالیاں کونے کونے ایسے دبکے پڑے تھے جیسے کبوتر کے بچوں نے چیل کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سن لی ہو۔ خسر صاحب جو ایک طرف کرسی پر منہ لٹکائے بیڑی پی رہے تھے مجھے یوں دیکھا گویا کسی کے مرنے کی خبر سنانے کے لئے انہیں میرا ہی انتظار تھا۔ ساس باورچی خانہ کے دروازے سے لگ کر سر پہ ہاتھ رکھے سسکیاں لے رہی تھی۔ بس میری بیوی ہی کہیں نظر نہ آئی۔ خوف سے میرا دل دہل گیا۔ حوصلہ نہیں ہوا کہ کسی سے پوچھوں کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ اتنے میں میری بیوی پچھواڑے سے داخل ہو کر باورچی خانے سے ہوتی ہوئی سامنے کے کمرے میں آئی۔ وہ مجھے دیکھ کر رکی اور بولی۔

"آج ہمیں جانا ہے"

کہاں؟

اپنے گھر۔

کیوں؟

بس۔

آخر.....

میرے چہرے پر پھیلی ہوئی حیرت کی پروا کئے بغیر وہ کپڑے سوٹ کیس میں بھرنے لگی۔ میں نے اپنے خسر کی طرف دیکھا انہوں نے کرسی کے پاؤں سے رگڑ کر بیڑی بجھائی۔ اور کہا۔ "بہت سمجھایا۔ نہیں مان رہی ہے۔" اُدھر ساس نے روتے ہوئے کہا۔ "ہوٹل سے لوٹی ہے تب سے ایک ہی رٹ لگائے ہوئے ہے۔"

"ہوٹل سے؟" میں نے پوچھا۔

ہاں ہم نے سوچا تم دونوں میں کوئی جھگڑا.....

نہیں۔ نہیں۔ بالکل نہیں۔ میں نے اپنی صفائی میں ساس کی بات کاٹنی ہی تھی کہ دوسری طرف سے میری بیوی چلائی۔

"میں نے کہا نا، کچھ نہیں ہوا۔ تیار ہو جائیے۔ ہمیں جانا ہے"

آج ہی؟

ابھی!۔

مگر.....

مگر وگر کچھ نہیں۔

گھر میں تم سے کسی نے کچھ کہا؟

نہیں۔

تو؟۔

خدارا بحث مت کیجئے۔

اتنا کہہ کر وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ گھبرائی ہوئی ہرنی کی طرح اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ ہم سب نے بہت سمجھایا۔ بہت پوچھا مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ وہ سسرال واپس جانے پر بضد ہے۔

یہ اس کی تنک کا پہلا دورہ تھا، اور پہلی بار مجھے محسوس ہوا تھا کہ میں اپاہج ہو رہا ہوں۔ اس لیے میں نے جلدی سے اپنے خیمے کے کھونٹے نکالے اور بیٹیا اور بیوی کو لے کر گھر سے نکل رہا تھا کہ وہ جیسے پلٹی اور اپنی ماں سے بولی۔ "امی، مجھے آپ کا برقع چاہیئے۔" —— "برقع؟؟" "ہاں!" —— "میرے پاس تو پرانا برقع ہے" —— "چلے گا۔"

یہ ضد بھی اس نے پوری کی اور اس روز پہلی بار اس نے برقعہ پہنا جو آج بائیس برسوں کے بعد بھی اس کے جسم سے چپکا ہوا ہے۔ اور شاید اس کے مرنے تک اس کے وجود سے جڑا رہے گا۔ زندگی باوجود اس کے تنکی دوروں کے بھی بڑی خوش گوار گزری ہے۔ مگر آج کا دورہ بالکل اس دورۂ اوّل جیسا شدید ہے۔ وہی رونے کا انداز ہے، ویسے ہی جسم کا کانپنا، ویسی ہی طرزِ گفتگو — خدا کا شکر ہے بچے گھر میں نہیں ہیں ورنہ آج میں کہیں کا نہ رہتا۔ داماد آج ہی بمبئی سے آیا ہے۔ شبنم اور جاوید اس کے ساتھ ہی فلم دیکھنے گئے ہیں۔

ویسے تو صبح ہی سے اس کا موڈ کچھ اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ جب شبنم اپنے شوہر کے ساتھ بے پردہ بازار جانے لگی تو وہ اسے ٹوکتے ٹوکتے خاموش ہو گئی۔ مگر جب وہ بغیر برقع کے فلم دیکھنے جانے لگی تو اس نے ٹوک ہی دیا۔ مگر داماد نے اس دقیانوسیت پر ہنستے ہوئے فقرہ کسا اور شبنم اور جاوید کو لے کر چل دیا۔ ان کے جاتے ہی وہ زخمی شیرنی کی طرح بپھر گئی۔ اس نے شروع ہی سے بچوں کو اپنی پوری ممتا سے پالا پوسا ہے تو نہایت سخت گیری کے ساتھ ان کے اخلاق کی نگرانی بھی کی ہے۔ اس کو بپھرا دیکھ کر میں نے اپنی سلامتی اسی میں جانی کہ گھر سے نکل جاؤں

اور میں بازار کی طرف چل نکلا۔ اور لوٹتے ہوئے داماد اور بیٹی کے لئے ایک شاندار ہوٹل میں کمرا بک کرا کے آیا۔ کیوں کہ میرے پاس کل ڈیڑھ کمرے کا گھر ہے۔ داماد بمبئی کا ہے۔ پھر وہ پہلی بار سسرال آیا ہے۔ خاطر داری میں کوئی کمی نہ رہ جائے ورنہ آج کل کے لونڈوں کی طرح کہیں اکھڑ گیا تو مشکل ہو جائے گی یہ سوچ کر میں نے ہوٹل کا کمرہ بک کرایا مگر میری بیوی پر یہ سنتے ہی دورہ پڑ گیا اور میں اپاہج ہو گیا۔

میں اپنے اپاہج جسم و جاں کو گھسیٹتا ہوا باورچی خانے تک پہنچا تو دیکھا کہ وہ سسکیاں لے رہی تھیں۔ جسم اب بھی کانپ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں، کیا کہوں۔ میں نے پاس ہی پڑے اسٹول کو کھینچا اور اس پر بیٹھ کر سگریٹ جلائی اور پینے لگا۔ سگریٹ پیتے پیتے کتنا وقت گزر گیا اس کا کچھ خیال نہ رہا۔ سگریٹ کا پیکٹ خالی ہوا تو خیال آیا کہ اسٹول پر بیٹھے بیٹھے میرا جسم اکڑ سا گیا ہے۔ میں یہ سوچتے ہوئے اٹھا کہ اب تو کسی نہ کسی طرح خاموشی کی یہ دیوار گرانی چاہئے۔

میں نے اپنے حواس کو مجتمع کر کے کچھ کہنا چاہا تھا کہ میرے قدموں کے پاس سے گزرتی ہوئی ایک چوہیا بس دبا کر رکی جہاں میری بیوی مسالہ پیس رہی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا میرے پیچھے شبنم کھڑی ہوئی تھی وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ میں نے ہٹ کر اسے راستہ دیا۔ وہ لپک کر اپنی ماں سے بولی۔

"امی آپ رہنے دیجئے۔ میں مسالہ پیس دیتی ہوں۔"

"نہیں - پہلے کپڑے بدل کر ہاتھ منھ دھو کے پھر انور میاں کے لئے چائے بنا دے۔"

میں نے بھی بیوی کی طرزِ گفتگو سے اندازہ لگا لیا کہ طوفان ابھی گزرا نہیں ہے —— بلکہ اس ڈیڑھ کمرے کے گھر میں تھم گیا ہے اور کسی بھی وقت مچل سکتا ہے۔

رات کے آٹھ بجنے کو تھے۔ شبنم اور اس کی امی آدھے کمرے میں شام ہی سے انور میاں کے لئے بریانی پکانے میں لگی ہوئی تھیں۔ پورے کمرے میں یعنی ہمارے دیوانِ عام جیسی میری خواب گاہ میں انور میاں کسی علمی رسالے کا مطالعہ کر رہے تھے۔ جاوید پڑھائی میں مشغول تھا اور میں کرسی پر سکڑا ہوا مچھر مارتے ہوئے بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ میں جب بھی پہلو بدلتا تو میری جیب میں رکھی ہوئی ہوٹل کے کمرے کی چابی بج اٹھتی چابی کی آواز سن کر انور میاں رسالے میں چھپی ہوئی کسی فلمی اداکارہ کی تصویر سے نظریں ہٹا کر میری جیب کی طرف دیکھنے لگتے۔ اور میں اس چابی

کی موسیقی سن کر۔ ...جد اکو یاد کرتا اور رکھتا۔ ...کے بعد گلی کے نکڑ پر پان کی دکان کے پاس سگریٹ پیتے ہوئے۔ میں سوچنے لگا کہ کسی شاعر نے پائل کو کم بخت اور ... ستم گر کہا ہے۔ کیوں کہ اس کے بجنے اٹھنے سے اس کی معشوقہ کا راز کھل جاتا ہے۔ مگر میری جیب میں شام سے بجنے والی چابی کی آواز کسی نے توجہ تک نہیں دی۔ جب کہ میں خود چاہتا تھا کہ چابی کا راز کھل جائے۔

یہ سب سوچتے ہوئے میرے چہرے پر درد بھری مسکراہٹ آ کر رہ گئی۔ میں نے سگریٹ کا آخری کش لیا اور ٹکڑا ہوا میں اچھال دیا کہ سامنے سے جاوید کو آتا دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں کتابیں تھیں۔ میں نے اسے روکا اور پوچھا

"کہاں جارہے ہو؟"

دوست کے گھر۔ پڑھائی کے لئے۔

اپنی امی سے پوچھا؟

جی!

کب لوٹو گے؟

صبح!

اتنا کہہ کر جاوید چلا گیا

میں سوچنے لگا کہ یہ سنک کا اونٹ آج نہ جانے کس کروٹ بیٹھے گا یعنی کہ جس عورت نے کبھی اپنے بچوں کو وقت بے وقت گھر سے باہر قدم رکھنے نہیں دیا۔ آج اس نے جاوید کو دوست کے گھر جانے کی اجازت کیسے دے دی!! میں تیز قدموں سے گھر لوٹا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ میری دیوان عام جیسی خواب گاہ مکمل طور سجائی خوابگاہ بن گئی ہے۔ میں یہ سب منظر دیکھ کر کچھ سوچنے اور بولنے کے درمیان ہی تھا کہ میری بیوی نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔ "کہاں چلے گئے تھے آپ؟"

"جی نکڑ پر..... سگریٹ..... "میں نے ہکلاتے ہوئے جواب دینا چاہا۔

اب چلئے دیر..... دیر ہورہی ہے"، اتنا کہتے ہوئے اس نے برقعے کا نقاب چہرے پر ڈالا اور گھر سے باہر نکل گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے ہولیا۔ گلی سے گزرتے ہوئے تیز تیز قدموں سے میں اس کے قریب پہنچا اور پوچھا۔ "ہم کہاں جارہے ہیں؟"

"آپ نے کمرہ بک کرایا ہے نا؟" اس نے چلتے ہوئے جواب دیا یہ سنتے ہی میرا دماغ سن ہوگیا۔ میرے سوچنے کی قوت ختم ہوگئی۔ اس نے سامنے سے آتے ہوئے آٹو کو روکا اور اس میں سوار ہوگئی۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ آٹو ڈرائیور نے پوچھا کہاں جانا ہے؟"

میری بیوی نے مجھے کہنی مار کر جواب دینے کا اشارہ کیا۔ میں نے ڈرائیور کو ہوٹل کا نام اور پتہ بتادیا۔

میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ مگر میں سسک نہیں سکتی۔ کیونکہ کی چار دیواری نہیں ہے۔ بلبل بھی تو رونے کے لئے قفس ہی پسند کرتی ہے آج سے کئی سال پہلے ایسی ہی ایک رات میں اور میرے شوہر بیجاپور میں تانگے پر سوار ہوکر ہوٹل گئے تھے۔ اس رات میں ایک انجان سی خوشی میں ڈوب رہی تھی اور آج ڈر سے کانپ رہی ہوں۔ اس رات میں میرا پورا وجود ... رہا تھا۔ آج میرا روا‌ں رواں ماتم کناں ہے۔ اس رات میں مسرتوں کا اپنے شوہر پر لٹانے جارہی تھی۔ آج میرے پاس مجبوریوں کے سوا کچھ ... اس رات میں اپنا سب کچھ اپنے شوہر پر نچھاور کرنے ہوٹل گئی تھی ... اور ہوٹل چھوڑ تو میں طے نہیں کرپارہی تھی کہ سب کچھ لٹا کے آئی ہوں یا مالا مال ہوکر لوٹ رہی ہوں۔ مجھ پر کچھ ایسا نشہ طاری تھا کہ مجھے لگا کہ ہو... کے کمرے سے تانگے تک چل کر جابھی سکوں گی یا نہیں۔ ہر چیز لبریز ہوئی ... ہوئی ... بھاری ا لچکدار محسوس ہورہی تھی۔ دل، ذہن، جسم یہ سب کچھ شاخ گل کی طرح جھکے جارہے تھے۔

میرے شوہر مجھے تانگے تک چھوڑنے آئے میں تانگے پر سوار ہو انہوں نے تانگے والے کو پچھلی رات ہمیں لے آنے اور اب چھوڑنے کا کرایہ کیا تو اس بوڑھے تانگے والے اور ان کے بیچ کچھ تو تو میں میں ہوگئی۔

"یہ کیا صرف پانچ روپے!!"

"کیوں پانچ روپے کم ہیں کیا؟"

"دس روپے دیجئے جناب دس؟ پانچ آنے کے پانچ جانے کے"

"یہ لو، ایک روپیہ اور....."

"میں خیرات نہیں مانگ رہا میاں..."

میرے سمجھانے کے باوجود بھی انہوں نے چھ روپے سے ایک پیسہ زیادہ نہیں دیا تھا۔ مجھے لگا جیسے دودھ سے بھری بوتل میں کسی نے نمک کی ڈلی ڈال دی ہو۔ تانگے والے نے بڑبڑاتے ہوئے روپے جیب میں ڈالے اور اپنے بمزاد کا غصہ بے چارے بے زباں گھوڑے پر نکالا۔ اچانک چابک کی مار سے گھوڑا بدک کر تیزی سے آگے بڑھا اور پھر اپنی اصلی رفتار پر آگیا۔

تانگہ چرمراتا ہوا گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں اپنے وجود میں نمک کی ڈلی کی جگالی کرتے ہوئے راستے کی بھیڑ سے بے خبر ادا‌س بیٹھی تھی۔ اتنے میں تانگے والے نے اپنے منہ سے نمک کے خدائی ...

(باقی صفحہ ۲۷ پر دیکھئے)

# نقد و نظر

قاضی فراز احمد

۔۱۱ صفحے کے اس شعری مجموعے کا نام ہے زخمہ۔ فارسی لفظ زخم سے زخمہ، ...لانی کرنے والوں کے انگشتانے کی طرح کا وہ نوکدار حصہ جو تار والے ساز کو چھیڑنے ...کے کام آتا ہے۔ جب یہ زخمہ تار کو زخم لگاتا ہے، کچوکے دیتا ہے تو وہ سرگم جنم دیتے ...ں حن کے سننے پر ہمیں اپنے ہرے اور سوکھے زخم یاد آجاتے ہیں۔

مولانا روم نے بنسری کے تعارف میں بلکہ اپنی عظیم مثنوی کے آغاز میں ...ر" کے بارے میں کہا تھا کہ

از نیستاں تا مرا ببریدہ اند
از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

میری نفیر سے مرد و زن چیخ پڑے ہیں۔ نفیر سوراخ والے سازکی ...آواز ہے اور تار والے ساز سے آواز پیدا کرنے والی ننھی سی چیز زخمہ۔ لیکن اس ...مہارت "مضراب" زیادہ پاپولر ہے۔ ہمارے سازندے اور سنگیت کار ...مضراب" ہی کہتے ہیں۔ مراٹھی اور چند ہمسایہ زبانوں میں زخمہ یا مضراب کو نکھی ...کہتے ہیں۔ ناخون: نکھ کی مناسبت سے۔

بہر حال نکھی، مضراب یا زخمہ۔ جو بھی ہیں، عمل اور ردعمل دونوں ایک ...قاضی فراز احمد ایک تو قاضی اور دوسرے راجپوت ہیں۔ میٹھے گداز اور جاں نواز پیغام ...دینے والی مٹی کا خمیر۔ انھیں "زخمے" کی کیوں سوجھی؟ اس سے وہ اپنی فریاد ...سنانا چاہتے ہیں یا مرد و زن کو فریاد کرنے پر آمادہ ہیں؟ کچھ ایسی ہی بات ...لگی تھی ان کے اس کلام میں رفتہ رفتہ لفظ "غم" کی تکرار بڑھتی گئی ہے۔

میں نے زخمہ کی پچیسی غزلوں کو الٹی طرف سے پڑھنا شروع کیا۔ الٹی ...طرف سے اس لئے کہ بعد کا کلام زیادہ پختہ، زیادہ نمائندہ ہوتا ہے شاعر کا۔ ...پھر شاعری سے

یہ وہ جام ہے جس کا نہیں سیدھا الٹا

...صفحہ ۱۰۱ سے جب میں صفحہ ۱ کی طرف تھم تھم کر بڑھا تو مجھ پر یہ رمز آشکار ...ہوا کہ شاعر کے ہاں رفتہ رفتہ شہر اور غم دو الفاظ مختلف تراکیب اور ان کے ...زمرے بڑھتے گئے ہیں۔ شروع میں وہ ضرورتاً آتے ہیں، پھر عموماً اور آخر ...میں تو عادتاً اس حد تک کہ مسلسل چونسٹھ شعر ایسے نہیں جہاں لفظ "غم" کسی ...نہ کسی صورت میں آ کر نہ پڑا ہو۔ شاید خود شاعر کو خبر نہ ہو کہ رفتہ رفتہ (غم) کے ...تھم نہ جھلکیاں پورے منظر پر کہیں نہ کہیں نمایاں ہیں۔ اسے ہم یوں کہہ ...سکتے ہیں کہ:

"زخمہ" کا کلیدی لفظ غم ہے اور ثانوی لفظ شہر۔ نفسیات میں اور

ادب میں تحت الشعور اور لاشعوری طور پر پرورش پانے والے ARCHI TYPES PATTERN یعنی چھپا نے والے ان دو لفظوں کی تراکیب اور تلازموں سے شاعر کے باطن کا اور زخمے کی غرض و غایت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ان کا استحصال کیا گیا ہے کیونکہ شاعر ان کا منکر نہیں ہو گا۔

دوسری بات جو مجھے یہاں نمایاں نظر آئی۔ شاعر یا تو عہد یا زمانے کا حبیب ہے۔ قاضی فراز کا نام پہلے، برسوں پہلے بہت سے آیا ہو گا لیکن کھویا نہیں۔ اب جو اس مجموعے میں شامل کلام ان کے دیوان غزل میں جو دیکھا تو شاعر اپنی دنیا کے آئینے میں زمانے کا INDICATOR یا مرغِ باد نما لیے ہوئے نظر آیا۔ یہ کلام تلمیحوں، استعاروں، اشاروں اور دوشن کے لحاظ سے ۱۹۶۵ء اور ۱۹۸۵ء کے درمیان کی خبر دیتا ہے۔ ان میں ان بیس برسوں کے دوران غزل کے پیرائے اور ڈکشن میں جو جدید نمایاں رنگ ابھرے ہیں۔ وہ یہاں بھی حاوی ہیں۔ مگر جو شے حاوی ہیں، وہ ہے خود شاعر کا احوال اور وہ حالات، وہ مشاہدات اور تجربات، کھلے یا ڈھکے روپ میں جو شاعر کی شاعری اور زندگی کے لیے مخصوص ہیں۔ میں نے پہلے نہیں لکھا یا کہا ہے کہ یوں تو شاعر بڑا حرافہ ہے، بڑے بڑے ہوشیاروں اور ہوشمندوں کا دل باتوں باتوں میں اڑا لے جاتی ہے اس کے افسانے ہیں، مگر یہ حرافہ ہر جائی ہے، کہ جب سے لگاؤ ہو اس کے ہاتھ بھی آ جائے۔

اس کے پیچھے ہی تو نظریں رکھ کر اپنے عہد کا اور شاعری کے برتاؤ کا فیصلہ کر لیا ہے۔

دستگیری سے ہی اردو کو کئی اہلِ قلم اور شاعر ملے ہیں اب تک مدیح الزماں خاور، نور پرکار، یعقوب راہی، وغیرہ۔ ہمارے قاضی فراز احمد ان کے بعد کی صورت سے تعلق رکھتے ہیں۔ "صنف کا تنظیم" ایسے بھی مناسب سا ہے کہ وہ صورت سے نمایاں پر ہر بار نظر آتے ہیں۔

لیکن غزلوں کی زمینیں انھوں نے نئی زمین دار دل سے مہیا کی ہیں ۔ وہ اکثر زمینیں پہلے ہی اختیار کی جا چکی تھیں۔ بحر، زمین، بعض اوقات ترنم، قافیہ ردیف۔ لفظیات کا انتخاب شاعر جیسے چاہے کرے، زمین میں جو بیا ہے بوئے لیکن بونے سے پہلے مٹی کو گوڑھ لے۔ اگر آپ شاہ نصیر اور شاہ ظفر کے دور کی لمبی ردیفوں، سنگلاخ زمینوں میں اپنا ہنر دکھاتے چلیے تو مجھے کوئی نام نہ جائے گا، یہاں ایسی زمینیں ملتی ہیں۔ جاذبہ، ترک، شکر، چھڑک ۔

اوّل تو محلِّ نظر ہے دوسرے ایک خطا نمونہ "دل کی خلش، چراغِ دل" کا، ہماشما میں مری پہچان ہیں کے ساتھ یہ ردیف جس طرح کھپتی ہے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں قاضی صاحب کی ایک اور منفرد کی مثال صفحہ ۱۸-۱۹ کی غزل ہے

حالات کی ٹوٹی کھپریں

بحر ترنم ہو اور ردیف طویل ہو تو قافیہ کو جگہ کہاں رہ جاتی ہے۔ ردیف کا اونٹ شاعر کے خیمے میں گھس پڑا تو خیال غریب کہاں ٹھہرتا۔ لوگ کہتے کہ وہ کیا ہوتی جس نے قاضی صاحب سے کیلا گرانا منوا لیا، یہ غزل ہے:

صفحہ ۳

غزال آنکھیں

وہ مہم نگار آنکھیں

یہی معاملہ چند اشعار تک رہا، ہے ردیف جن کی گردن پر سوار ہو گئی ورنہ خاصے دل کش شعر نکل آئے تھے۔

زندگی ہے عذاب تقریباً
ہر تمنا سراب تقریباً

اسی میں آتا ہے

دل میں اب کوئی اضطراب نہیں
دل ہے خود اضطراب تقریباً

یہی صورت "میلا جھیلا" والی ردیف میں پیش آئی۔ غزل اچھی ہے۔ قافیہ اور ردیف نے شاعر کو باندھ رکھا ہے پھر بھی وہ ہاتھ پاؤں ان کی گرفت سے نکل آیا۔ جہاں وہ نکل نہ سکا یا ردیف کی ڈور چھوٹ گئی ایسے کبھی کبھی حادثے پیش آئے ہیں۔ مثلاً صفحہ ۹۸ کی غزل ہے

آپ ہیں بے خبر آپ کو کیا کہئے

جسے پڑھ کر روایت کے وہ زمانے یاد آ گئے۔

"..... سر پہ طرّہ ہار گلے میں"

"یا ..... تابوت میں انگلی"

ذرا تنہائی میں سوچیئے گا کہ یہ لمبی ردیفیں خاص غزل گوئی کے ایسے دور کو یا ان شعراء کو کیوں نصیب ہوئی ہیں جن کے ہاں کہنے کو ہمت کم اور مشاق زیادہ ہوتی ہے۔

دنیا کی بھلا کونسی اعلیٰ درجے کی شاعری ہے جسے ردیفوں نے سجایا یا اکسایا ہو؟ کیا دوسری زبانوں — فارسی، عربی، ترکستانی سمیت ہی عرب اگر کوئی شعر کہتا نہیں ہے زیادہ ردیفوں کی موسیقی سے نابلد ہیں؟ ذرا سوچ کر اپنے دل کو جواب دیجئے گا۔

جن اشعار میں شاعر کے باطن کی، اس کے قدرتِ کلام، اس شعری صلاحیت اور امنگ کی شناخت ہوتی ہے اور جن پر بے اختیار رہنے کو جی چاہتا ہے، وہ ایسے کہ خود شاعر نے بھی بے اختیار ہی کہے ہوں۔ جیسے، مثلاً!

قفس میں رکھنا اسے یا کسی چمن رکھنا
جہاں بھی رکھنا سلیقے سے یہ بدن رکھنا

---

فراز کونسے رشتے کا نام دیں اس کو
ہر ایک درد ملا، دل سے آشنا کی طرح

---

کہا تھا کہ: دیکھو ہمارے زخموں کو
تمہاری آنکھ بھی پُرنم ہے، دیکھنے والو

---

خطوں کی شکل میں، کاغذ کے آئینے میں ہے
جو دیکھنا ہو تم روزگار کا چہرہ

---

اداسیوں کا یہ درپن دکھا رہا ہے ہمیں
ہمارے چہرے پہ لکھی ہوئی گھٹن کی کتاب

---

ایک چھوٹی سی مملکت ہے، پیار سے مہکی ہوئی
چاہتا ہے جی فراز اب اپنے گاؤں پہ لکھوں

---

ہم بھی شاداب غزلوں سے قائل رہے
ہم بھی حسن و محبت پہ مائل رہے!
زندگی کے ہزاروں وسائل رہے
دل میں لیکن بڑی وحشتیں رہ گئیں

---

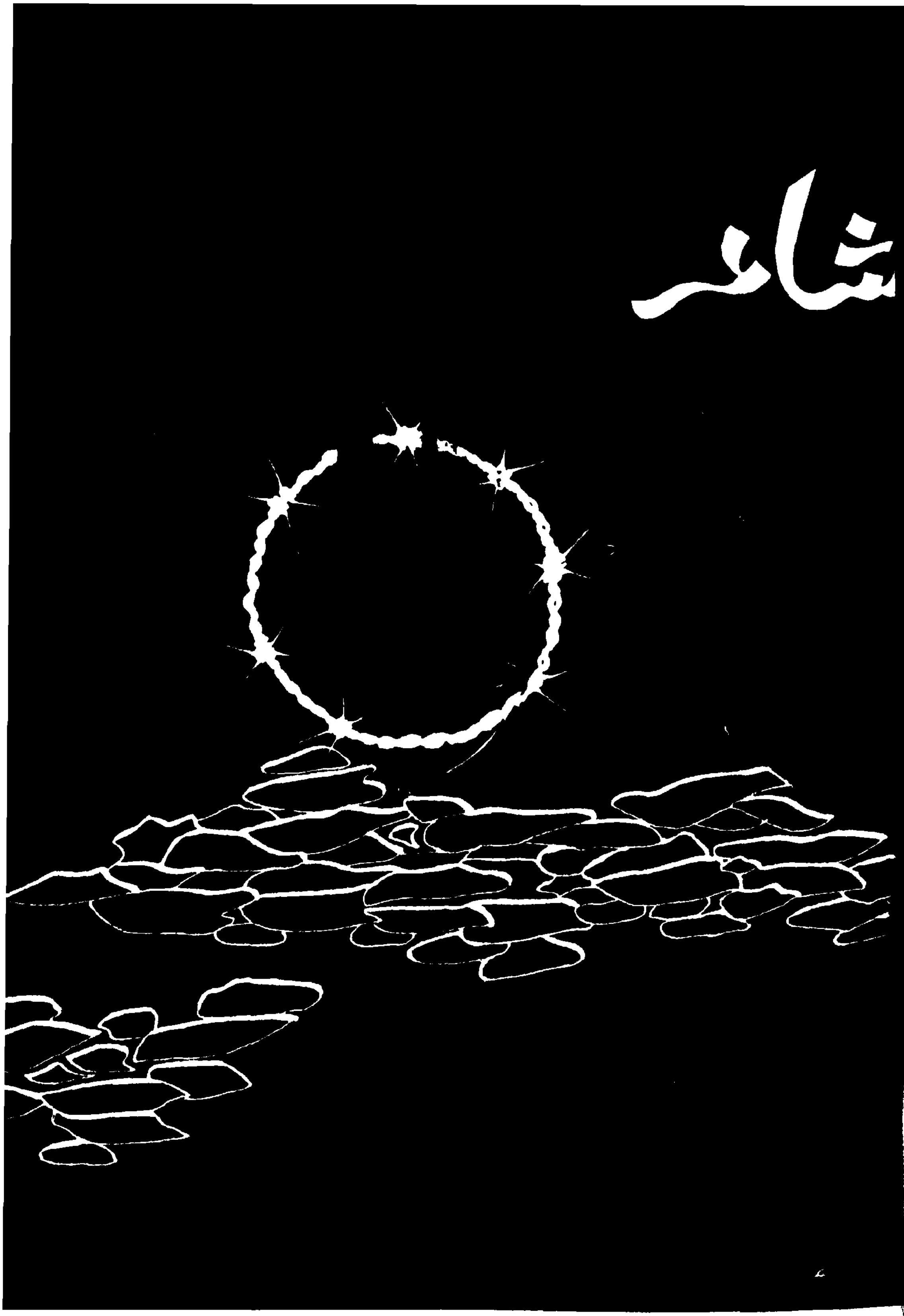
مرے دفتر کی وہ بیچاری بھولی لڑکی
صبح کی نکلی ہوئی، شام کو گھر جاتی ہے

(باقی صفحہ ۴۲ پر دیکھیے)

No. MH/BY/W. 341
THE "SHAIR" (MONTHLY) BOMBAY-400 008.
Years of Publication ✱ (Publishing Date 27-28) ✱ Issue No 2 1989✱ Telephone No 359904
Registered with the Registrar of Newspapers at R N No 14482/57



پرنٹر، پبلشر، مالک، ناظر فدا، مدیر نے ۱۴۳ ، ۲۴۲ بلاسس روڈ بمبئی ۸ میں چھپوا کر وہاں سے شائع کیا۔



شاعر

بساطِ سخن

جدید




# عمیق حنفی

- ابتدائی نام: عبدالقادر، عبدالعزیز
- قلمی نام: عمیق حنفی
- والد کا نام: محمد عبدالبصیر [ ف ۲۸ جنوری ۱۹۶۳ء ]
- پیدائش: شنبہ ۲۴ جمادی الاوّل ۱۳۴۷ھ
  مطابق ۳ نومبر ۱۹۲۸ء
- وطن: مہوکینٹ ضلع اندور (ایم۔پی)
- تعلیم: ایم۔اے [ علم سیاسیات اور تاریخ ]
  نشریاتی امور میں ٹریننگ
- ذریعۂ معاش: ۱۹۵۶ء میں آل انڈیا ریڈیو سے وابستگی۔
  ۱۹۸۷ء میں ڈائرکٹر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے
- شاعری کی ابتدا: ۱۹۵۲ء کے اواخر۔ اردو ہندی میں
  تقریباً ایک ساتھ شائع ہوئے۔
- تصانیف: سانسوں کا سنگیت [ ہندی ] ۱۹۵۵ء
  سنگ پیرہن ۱۹۵۸ء
  انتخابِ عمیق حنفی [ انجمن ترقی اردو ] ۱۹۶۵ء
  سندباد (طویل نظم) ۱۹۶۵ء
  شب گشت ۱۹۶۹ء
  صلصلۃ الجرس ۱۹۷۱ء
  سحر صدا ۱۹۷۴ء
  آئینے کا کورس [ ہندی ناٹک ] ۱۹۸۱ء
  شعر چیزِ دیگر است ۱۹۸۳ء
  استاد رحمت علی خاں [ ہندی ] ۱۹۸۶ء
  شعلے کی شناخت [ مضامین ] ۱۹۸۸ء
- وفات: ۱۳ اگست ۱۹۸۸ء [ دہلی ]

عمل
جینت پرمار

تحریر و تدوین
افتخار امام صدیقی

چہروں اور آوازوں کی بھیڑ سے اُبھرنے والی ایک منفرد شعری شخصیت، وقت کا ایک نیا استعارہ۔ ادب، فلسفہ، تاریخ، جمالیات، موسیقی، مصوری، رقص، ڈرامہ اور علم نجوم۔ زندگی کی تہوں میں اُترجانے والے ان راستوں اور سمتوں سے ہوتے ہوئے زمین اور زندگی کے حوالے سے ایک نئی کائنات کو نظم و نثر میں خلق کرنے والا فن کار۔ جمالیاتی ادراک اور عرفانی وجدانی تجربوں سے مملو طویل و مختصر نظمیں، غزلیں، دوہے، گیت، رباعیاں، اظہار کے تمام اصنافی اسلوب میں تازہ کار۔ اپنے من کی موج میں دل کے اکتارے پر اپنی ہی آواز کو گھٹانے بڑھانے کے عمل میں مصروف، صرف اپنے مزاج میں روشن۔ نہ ترقی پسند نہ جدیدیا۔ وقت کے مدار سے باہر ایک نیا تخلیقی ستارہ۔

اپنی بے پناہ ذہانتوں میں کھو جانے والے فن کار کا نام ہے ——— عمیق حنفی

بانی: علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بہ یادگار اعجاز صدیقی مرحوم

# شاعر

اشاعت کا ۶۰ واں سال

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

جلد ـــــ ۶۰
شمارہ ـــــ ۳

فون: ۳۵۹۹۰۴

مدیر
افتخار امام صدیقی

●

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت :- ۵ روپے

زرِ سالانہ ◆ لائبریریوں سے
۵۰ روپے ◆ ۶۰ روپے

تاعمر خریداری ◆ معاونین سے ◆ ممالک غیر سے
۱۰۰۰ روپے ◆ ۱۰۰ روپے ◆ ۳۵۰ روپے

معرفت شاعر، مکتبہ قصر الادب، ممبئی سینٹرل پوسٹ آفس پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶، بمبئی ۴۰۰۰۰۸

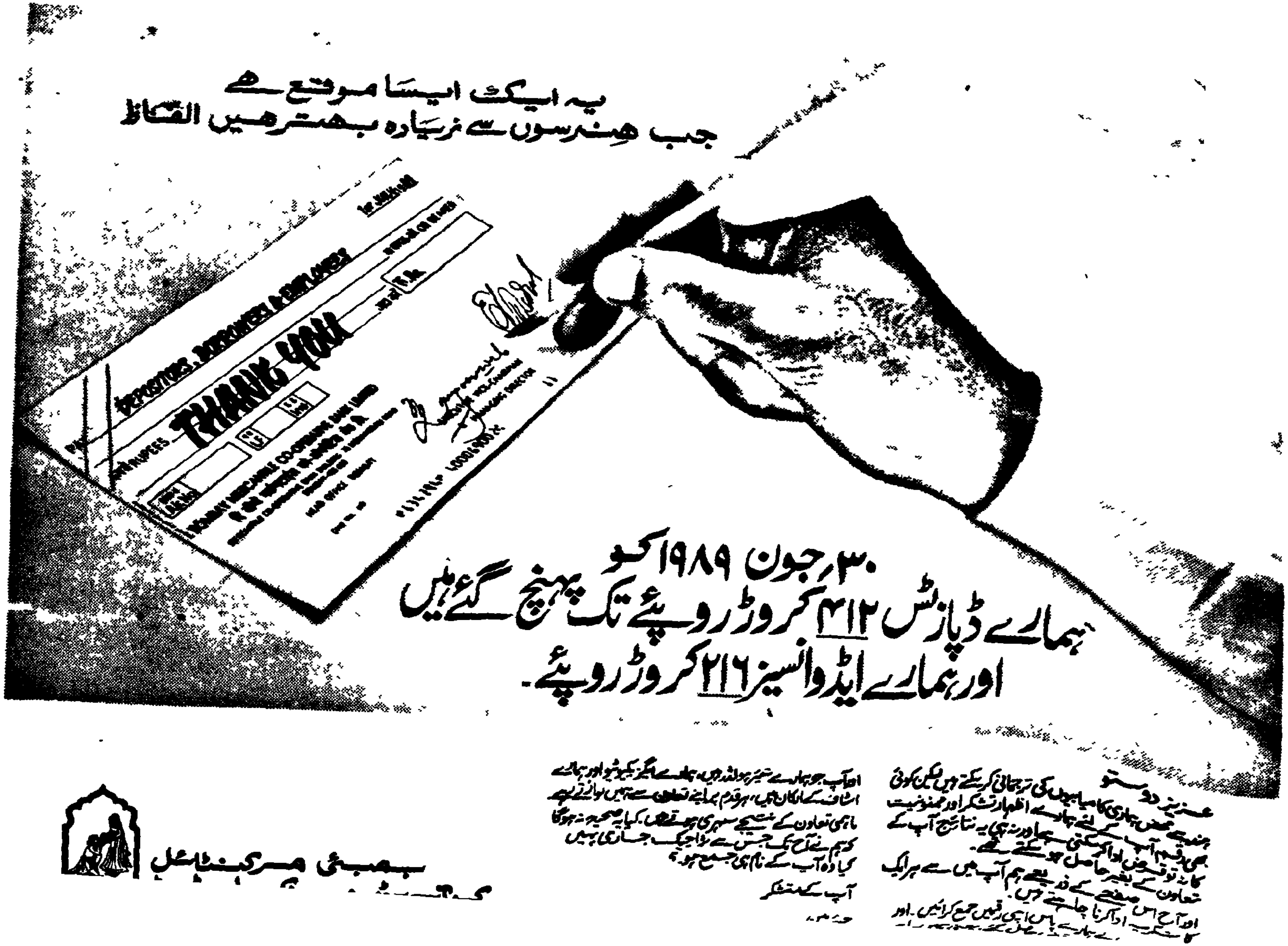
## فکرِ امروز



"... اصلاح بجائے خود ایک نوع کا خاموش درس ہے۔ شاعری ایک فن ہے۔ جس طرح دوسرے فنونِ لطیفہ، موسیقی، مصوری، صناعی اور اداکاری وغیرہ کے لیے معلم کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح فنِ شعر کے اکتساب کے لیے بھی ایک قادر الکلام کہنہ مشق و کہنہ سال ادیب کو رہنما بنا لینا ضروری ہے۔ بعض لوگ فنِ شعر میں کسی کی رہنمائی تسلیم نہیں کرتے۔ میرے خیال میں یہ طریقہ کار غلط ہے۔ اس میدان میں خود روی، گمرہی کے معنی رکھتی ہے۔ اصلاح سے لسانی، فنی اور علمی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ کسی استاد کا شاگرد ہونے سے ایک خاص ادارۂ خیال (اسکول) سے نسبت ہو جاتی ہے اور ایک ہموار راستہ چلنے کے لیے مل جاتا ہے۔ جو شاعر کسی کا شاگرد نہیں ہے وہ زبان اور محاورے کے اختلافات میں ہمیشہ بھٹکتا رہتا ہے۔ اسالیب و تراکیب کے استعمال کے لیے اس کے پاس کوئی سند نہیں ہوتی اور متروکات و مختارات کی عہد بہ عہد تبدیلیوں سے وہ آگاہ نہیں ہو سکتا۔"

[دستور الاصلاح "بار اوّل" جولائی ۱۹۴۰ء]

**سیماب اکبرآبادی**



یہ ایک ایسا موقع ہے
جب ہنر سوں سے زیادہ بہتر ہیں الفاظ
DEPOSITORS, BORROWERS & EMPLOYEES
THANK YOU
۳۰ جون ۱۹۸۹ کو
ہمارے ڈپازٹس ۴۱۲ کروڑ روپئے تک پہنچ گئے ہیں
اور ہمارے ایڈوانسیز ۲۱۶ کروڑ روپئے۔
عزیز دوستو
آپ کے متشکر
بمبئی مرکنٹائل

سرورق
ادبی تخلیقی عمل اور نمود
عمل
سلطان سبحانی

شمارہ نمبر ۳ — جلد ۶۰
۱۹۸۹ء

### مقالات



### نظمیں



### کہانیاں



### غزلیں



### خودنوشت



### بساطِ سخن



### آثار لفظ لفظ



### بازیافت



### مکتوبات

GHAYAS AHMAD GADDI
ATESHPUR LANE, JHARIA - 828 111

# غیاث احمد گدی مرحوم بنام ڈاکٹر نیّر مسعود

برادرم تسلیمات

میں نے رکھا ہے تماشے لکھی ہے۔ ناول، مختصر ناول، جیسے لوگ خراب لکھا رہے
تھے بہت مبگیتے ہیں۔ ——— تعجب میں نے رس کنا سکے تخلیق کار کا ابھا لطف اٹھایا
اور ایسی الی حالتیں لذتوں سے دوچار ہوا ہوں کہ بیان نہیں کر سکتا۔ کہہ نہیں سکتا کہ آپ جو نثر
تنقیدی ادب کے علاوہ تخلیقی فالعین تخلیقی منزلوں سے گزر چکے ہیں اور جو بہت نادر جسم کی کیا
اردو ادب کو دی ہیں، وہ رسالہ نقوش سے خدا شکر رسید کر سکتے ہیں۔

اب ؟

اب میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ رس کنا سے کو بیزچھپی محمد کر رہیں، اور وہ
کتاب کب چھپے گی تو آپ کو بڑی تیزی سے [illegible] اچھا سا معروف کلیہ کے بارے میں [illegible]
یہ گزارش نہیں ہے۔ حکم بھی نہیں۔ دو صرف درخشاں مشورہ ہے۔
درخشاں مشورہ — جو بہت سے ادبی حقیقتوں پر مشتمل ہے
تھا ستارہ مرتبہ براہ" ——— فلاں رسید [illegible] کتاب ارسال کروں

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔
درخشاں [illegible] رخصت [illegible] سلام

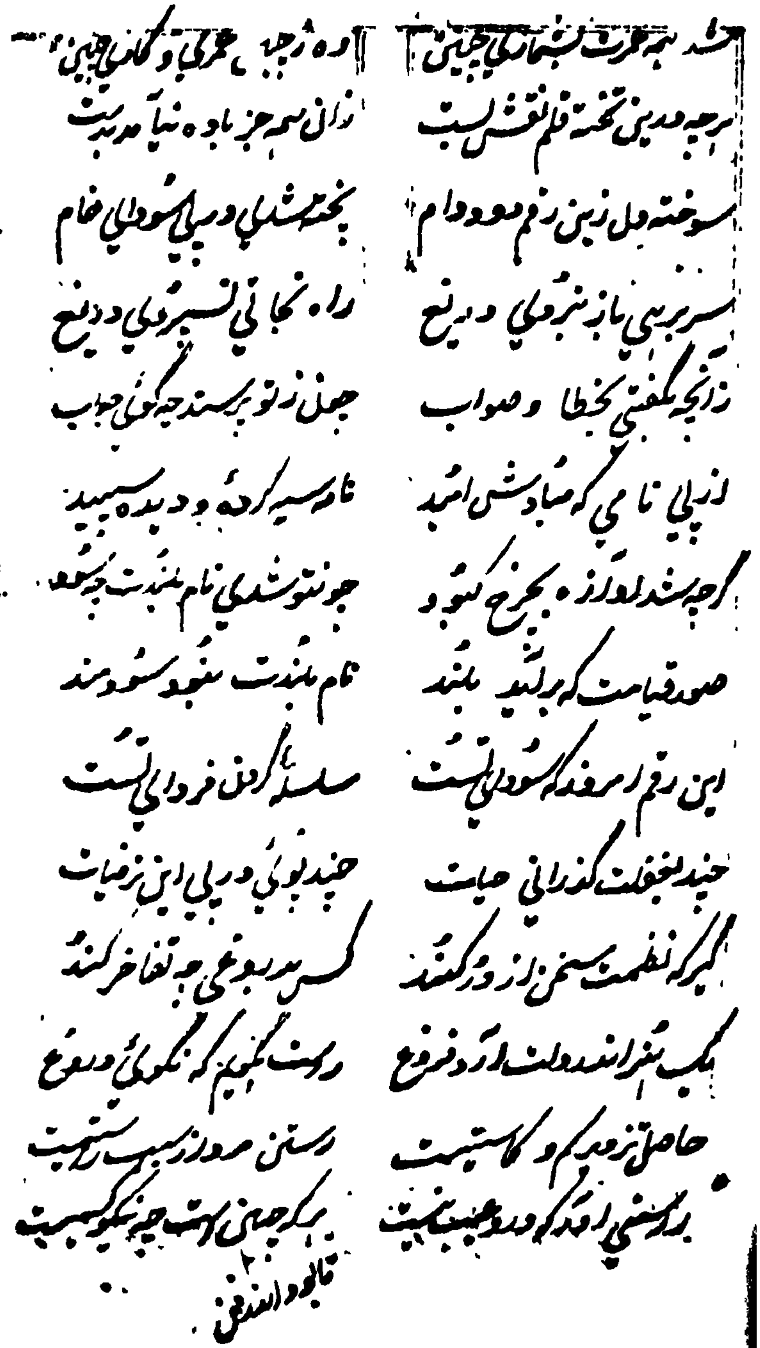
والسلام
غیاث احمد گدی

جناب نیّر مسعود صاحب
[illegible]

بشکریہ ڈاکٹر نیّر مسعود

# بازیافت

## امیر خسرو کی تصنیف مثنوی "قرآن السعدین"


شد به حضرت سبحانی چنین | داده ز جهان عمری و کامی چنین
هر چه درین تخته قلم نقش بست | زان همه جز باده نیامد بدست
سوخته دل زین رقم معه و دام | پخته مثلی و بسی سودای خام
سر برهی باز نبردی دریغ | راه بجائی نسپردی دریغ
زانچه بگفتی بخطا و صواب | چون ز تو پرسند چه گوئی جواب
زیبی نامی که مبادش امید | نامه سیه کرده و دیده سپید
گرچه شد امروز بچرخ کبود | چون تو نشدی نام بلندت چه سود
صور قیامت که برآید بلند | نام بلندت نبود سودمند
این رقم از بهر که سودای تست | سلسله کردن فردای تست
چند بغفلت گذرانی حیات | چند بوی در پی این زخرفات
گیر که نظمت سخن از زر کند | کس بهر بیتی چه تفاخر کند
یک شتر ار هست دولت آرد فروغ | راست بگویم که نگوئی دروغ
حاصل از من دم و کاستیست | رستن صد در ز سبب راستیست
بار سخن راست که در عجب نیست | بکه جهان راست چه نیکو کسیست
تا بود اندیش

حضرت امیر خسرو [پ : ۳ر مارچ ۱۲۵۳ء م : ۸ر دسمبر ۱۳۲۵ء] کی اولین طویل مثنوی "قرآن السعدین" کے ایک صفحہ کا عکس۔ یہ تاریخی مثنوی رمضان ۶۸۸ھ [۱۲۸۹ء] تین مہینے کی کاوش کے بعد مکمل ہوئی۔

جن کی وفات کے بعد معزالدین کیقباد ۱۲۸۷ء میں تخت نشین ہوا اور اس نے عیش و عشرت اور لہو و لعب کے دروازے کھول دیئے، نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طبقہ میں عیش و عشرت نے گھر کر لیا۔ خود بادشاہ اور سلطنت اور فریضۂ سلطنت سے غافل ہوگیا۔ اس کے والد بغرا خان [ابن بلبن] کو لکھنؤ میں جب دہلی کے ان حالات کی خبریں پہنچیں تو وہ دہلی آیا اور اپنے بیٹے کو آگاہ کیا کہ اس طرح ملک تباہی و بربادی کی طرف چلا جائے گا۔ امیر خسرو نے اس مثنوی میں کیقباد اور بغرا خان کی خط و کتابت اور صلاح و ملاقات کا حال نہایت ہی شاعرانہ چابکدستی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس مثنوی کی تصنیف کے وقت امیر خسرو کی عمر ۳۸ سال تھی۔

[بشکریہ مختار شمیم، اندور]

[انتخاب]

بساطِ سخن جدید کے لیے عمیق حنفی مرحوم نے اپنی غزلیں اور سوانح ارسال کی تھیں یہ چیزیں مرحوم کے فن پر ایک بھرپور مقالے کے ساتھ شائع ہونا تھیں لیکن ایک معیاری مقالے کے انتظار میں یہ کام بروقت نہیں ہو سکا۔ ماضی میں شاعر میں "گوشہ عمیق حنفی" شائع ہو چکا ہے۔ قبلہ اعجاز صدیقی مرحوم اور شاعر سے عمیق صاحب کی دیرینہ وابستگی کا سلسلہ ان کے انتقال تک اسی طرح بنا رہا۔ عمیق حنفی کا انتقال اردو شعر و ادب کیلئے رسماً نہیں بلکہ واقعتاً ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔



پت جھڑ کا موسم کیا آیا پتے اڑنے لگے
اندر اور باہر کے رشتے پھر سے جڑنے لگے

چھوٹے وعدوں کی مانند گھٹائیں چھانے لگیں
سپنے سے سائے پھر سے اور بادل اڑنے لگے

بن برسے یہ گھٹائیں واپس لوٹ کے جانے لگیں
انجانی سمتوں کی طرف یہ پنچھی اڑنے لگے

بیتے ہوئے موسم کی یاد ہو پھر سے لوٹ کے آئیں
بھولے ہوئے سمبندھوں کے پھر دھاگے جڑنے لگے

موسم کے سنگ آنے والے پنچھی جانے والے ہیں
سب کے ساتھ ہی رک رک کر کے دکھ سے بچھڑنے لگے

☆

یہ موسم گل ملال ہے دل کی سمت
بہو بہاں ہے گل مہر کا درخت

خلوص کی سو اگر آنچ تو پگھل جائے
یہ اور بات کہ سمجھے ہے اس کا سخت بہت

وہ رشک شاہ و گدا اپنے عقیدے شہ
سو خاک سے بھی ہے بلند بخت بہت

وہ دشت و صحرا میں سمتیں پاؤں کو دیتا ہے
اسے زوال سے سو اپنے جو سار و رخت بہت

وہ اپنے حال میں خوش ہے وہ اپنی کھال میں مست
اسے اکھڑتے ہیں دنیا کے تاج و تخت بہت

☆

یا ہم جھگڑنا بھی بولتے ہیں جبکہ (اردو ہندی) میں لڑنا ہے۔ اسی طرح بچھڑنا ٹھیٹ ہندی کا لفظ ہے



جوشش اشک سے ہیں آٹھ پہر پانی میں
گرچہ ہوتے ہیں بہت خوف و خطر پانی میں
میر تقی میر

...ت پانی پہ نظر آئے، سحر پانی میں
...کے ساتھ کبھی تو بھی اتر پانی میں

...موج بلا شور تلاطم گرداب
...ختنوں نے بنا رکھے ہیں گھر پانی میں

...ں کی سے ہے تو سر اٹھے ہے ٹہنی کی طرح
...ہے شاداب ہواؤں کا سفر پانی میں

...سے آنکھیں ہوتی ہیں اشک تھما سا میری
...ری رہتی ہے ہر وقت نظر پانی میں

...م کھائے ہوئے پرندے کی طرح تھا مسرور
...~~[illegible]~~ آگ کے پر پانی میں

...ندگی چھیڑ سے پانی کا اچھلنا گرنا
...ب گوارا رہتی ہے جب تا بہ کمر پانی میں

...ڑنا جانوں نہ جانوں میں ندی میں کود س
...ف تو کس بدن کا ہو مگر پانی میں

...ں لگی ہیں شعلوں کو سمجھ کر مسرور
...پھرتا ہے بلا خوف و خطر پانی میں

...انی کا ہے ہر آگ کو ٹھنڈا کرنا
...ے ٹکڑے سے ہیں شمس و قمر پانی میں

19
۸۳

دنیا میں ہو تو ملنے کی گنتی اب نہیں ر
کہتے تھے ایسا ہو لیا تو عالم بہت ہے :
— میر تقی

ہر لمحہ جل جلا کو سکا کام بہت ہے یاں
ہم تم جو مل گئے کوئی دم بہت ہے یاں

ملنے کی چند ساعتیں جن ہوس کے لیے ہیں کم
گر عشق ہو تو ہجر کا موسم بہت ہے یاں

دونوں میں سانس بھر کی بھی دوری نہیں ملی
جسم اور دل میں رابطہ باہم بہت ہے یاں

کس کو طلب ہے سات سمندر کی دہر میں
مل جائے برگ گل کو جو شبنم بہت ہے یار

کس کو پڑی ہے مدح طلوع قمر کرے
قندیل شام بجھنے کا ماتم بہت ہے یار

اک قطرہ آب کھیت کو ترتا نہیں نصیب
بنجر زمیں کی نکات میں کیوں نم بہت ہے یا

سا ہر لب وفا کہ ذکر سے آراستہ تو ہے
داد وفا کی رسم روا کم بہت ہے یار

19
۸۳



خورشید سمیع
ایم آئی جی، مظفرپور ۲۰۰۲ ۱۲ (بہار)

# نئی شاعری کے پیچ و خم

"آج کل جو شاعری ہو رہی ہے، اُس کا مجموعی نقشہ ہی نہیں سا ہے۔ اس شاعری کی ترتیب دریافت کرنا ہی ممکن نہیں۔
ادب مطالعے اور مشاہدے سے پیدا ہوتا ہے لیکن جدیدیت کے حامیوں کے یہاں یہ دونوں عنقا ہیں۔"

[فیض احمد فیض۔ ہفتہ وار حیات۔ نئی دلّی ص۹/۵ جولائی ۱۹۸۰ء]

محولہ بالا اقتباس کی روشنی میں نئے شعرا کا ایک معتد بہ حصہ قابلِ گرفت ہو جاتا ہے۔ لیکن مجھے یہ تسلیم کرنے میں تامّل ہے کہ جدیدیت کے تمام حامیوں کے یہاں مطالعہ اور مشاہدہ نہیں کہ فیض نے "شاعری برائے موضوع" کو شاید اتنی اہمیت دے دی ہے کہ یہ بات ان کے گلے سے نہ اتر سکی کہ کسی خاص موضوع کی تشہیر کے لیے شاعری نہ کی جائے جب بھی "موضوع برائے شاعری" ضروری ہے کہ اگر شاعری کی جائے گی تو موضوع کوئی نہ کوئی ہوگا ہی۔ اور یہ موضوع خواہ ترقی پسندی ہو، مذہبی ہو یا غیر مذہبی ہو۔ کچھ بھی ہو۔ مگر یہ طے ہے کہ ہر قسم کی ذہنیت رکھنے والے شعرا گرد و پیش کے ماحول سے متاثر تھے۔ ایسے شعرا بھی بلکہ بہت متاثر ہوئے ہیں۔ جن کا اپنا کوئی نظریہ نہ تھا کہ ان سب نے حتی المقدور، حالات اور ماحول کی تبدیلی کی آرزو کی ہے۔ اُن میں سے کئی ایک نے تو انقلاب کی دعائیں تک بر ملا کی ہیں۔ لیکن چونکہ کسی قسم کے انقلاب کی نہ تو کوئی امید ہی تھی اور نہ انہیں اس کا علم تھا کہ ان کے گرد و پیش کے ماحول کو کن تبدیلیوں کی ضرورت ہے؟ لہٰذا یہ سب کے سب رفتہ رفتہ یکے بعد دیگرے ہر انقلابی اور اجتماعی تحریک سے الگ ہوتے گئے۔ اور رفتہ رفتہ ایک عجیب سی بے حسی وجود میں آگئی۔

افراط و تفریط، نقلِ سکونت، فسادات، عصبیت، انتشار اور شکست خوردگی کے احساس سے زخم خوردہ معاشرہ اگر مکمل طور پر ترقی پسندی کو قبول نہ کر سکا تو یہ بھی سچ ہے کہ کسی دوسرے نظریے سے بھی وابستگی نہ تھی کہ نئی نسل نے نظریاتی وابستگی اور تمام ادبا اور شعرا کو ایک ہی نظریاتی رستے میں پرو دیا کوئی مستحسن قدم نہیں مانا اور جماعتی وفاداری کی زنجیر اپنے پاؤں میں ڈال لینا انہیں منظور نہ ہوا۔ اور پھر ترقی پسند ادب کا ایک بڑا حصہ بہت حد تک نارسیدہ اور ناتراشیدہ بھی تھا۔ دوسرا مسئلہ یہ بھی تھا کہ اگرچہ ترقی پسندی یہاں قدم جمائے ہوئے تھی تاہم! یہاں کسی مارکسی نظام کی نہ تو آمد تھی اور نہ کوئی واضح شکل دوئم یہ کہ خود کمیونسٹ اکائی ٹوٹ چکی تھی دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ خود ترقی پسندوں کے حصے سمٹ چکے تھے اور یہ اعتبار نتیجہ اُن کے سمت سے آوارہ ہو گئے تھے۔ لازمی نتیجہ اس کا یہی تھا کہ جو سامنے آیا — ایک افراط اور تفریط کی صورتِ حال — جو نہ تو اقرار کی صورتِ حال تھی اور نہ انکار کی — بس ایک دوراہا سمجھ لیجئے کہ زندگی کے فریبِ پیہم نے یاروں کے ایقان کو اس درجہ متزلزل کر دیا تھا کہ چاروں طرف بس سرابوں کے سلسلے تھے اور انجام کار نئی نسل نے تنگ آکر — کسی بھی نظریے سے انکار کر دیا۔ یہاں تک ہفت افلاک سیر کا تصور نہ رہا، فلسفۂ خودی سے بھی بے تعلقی عام ہو گئی، تسخیرِ کائنات کی جستجو خرام بن گئی اور بہ قول سلیم الرحمٰن صورتِ حال کچھ یوں ہو گئی کہ

میں، اُن میں نہیں ہوں، جو ہو سکتے / میں اپنے سوالوں کی زنجیر میں قید ہوں، اور انکار کے رات دن سے گزرتا ہوں / میرے لیے معبدوں اور سرائے میں لکھی ہوئی ساری سچائیاں مردہ نسلوں کی تاریک قبروں پر سجی ہوئی تختیاں ہیں / مجھے اپنے اجداد کی ہڈیوں میں کبھی زندہ ہونے کی خواہش نہ۔

[ایک کتبہ — سلیم الرحمٰن]

یہاں انکار کی شدّت صاف محسوس کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رُخ ہے اور تصویر کا دوسرا رُخ یہ بھی ہے کہ نیا شاعر یکا یک

نے لگتا ہے اور بیگانگی ( ALIENATION ) کے پہلو پر زور دینے کے لیے انتشار اور پیچیدگی کو اپنی روحانی آبرو کہتا ہے کہ "قول
غالب" مکمل انتشار سے خوف زدگی بجا" پھر بھی تھوڑا بہت انتشار تو ضرور ہونا چاہیئے۔ انتشار کا مکمل فقدان، گہما گہمی اور رنگا رنگی کی نفی ہے۔
بدسے طبیعت گھبراتی ہے۔ صدیوں سے مخصوص رابطوں میں بندھی ہوئی زندگی سخت قید ہے، مجھے آزادی چاہیئے۔ تھوڑی سی بہرحال آزادی
. . . اس الٹ پلٹ، انتشار، پیچیدگی اور پھیلاؤ میں میری روحانی آبرو ہے۔ میں یہ کام کیے جاؤں گا، اپنی پریشان اور مضطرب دنیا کچھ
بنتی ہے"۔ [افتخار جالب]

اور اب افتخار جالب کے احساسِ بیگانگی ( ALIENATION ) کی ایک مثال یہ دیکھیے کہ — میں نے زہد و تقویٰ کا ملبوس اتار دیا
در پراگندہ مٹی میں دفن گنبہ سے صدہا صد سالوں پوشیدہ تن / کو میلا کر کے عریاں کر ڈالا ہے / لیکن اب تو بش کا نور نکھر آیا ہے / سورج جاگ
/سارے سائے خاک ہوئے ہیں / اور بدن آلائش سے آلودہ نہیں / دیواریں ہیں / دیواریں جو تنہائی کا چہرہ ہیں /
[تنہائی کا چہرہ —— افتخار جالب]

اور اسی طرح کی دو مختصر نظموں کے اقتباسات اور دیکھ لیجیئے تو کچھ باتیں کی جائیں۔ ظاہر ہے ایسی ہی دو نظمیں جن کا انداز نرالا ہے — عذاب
نہ تھا / کسی سراب میں نہ تھا / لکھا گیا تھا میں، مگر کسی بھی باب میں نہ تھا / پڑھا گیا تھا میں، مگر کسی کتاب میں۔ ہمارا جو ... / ...
گی تہوں میں تھی / جو تیرگی صفوں میں تھی / وہ میرے دائروں میں تھی / وہ مجھ میں تھی / [خواب تماشہ —— کماریاشی]

اور اب یہ اقتباس بھی دیکھیے کہ — قلم اٹھا لیے گئے / صحیفے خشک کر دیئے گئے / سفیدیوں میں تم / سیاہیوں کے اب نشان ڈھونڈتے رہو / ورق
یان ڈھونڈتے رہو / [قلم اٹھا لیے گئے۔ عادل منصوری]

یہ اور ایسے ہی کتنے اقتباسات پیش کیے جا سکتے ہیں جن سے یہ بات دکھائی جا سکتی ہے کہ نئے شاعروں کے یہاں کبھی کبھی مختلف اور کبھی کبھی متضاد
ت موضوعِ سخن بن جاتے ہیں کہ کہیں انتشار سے خوف زدگی ہے تو کہیں انتشار، روحانی آبرو ہے۔ پھر کہیں مذہب سے گہری وابستگی ہے تو کہیں
نظریات سے مکمل ناوابستگی۔ کچھ ایسا ہی معاملہ جدیدیت سے وابستہ تنقید کا بھی ہے۔ جہاں مختلف اور متضاد اور رجحانات کے لیے جدیدیت
یہاں طور پر گنجائش اور اہمیت نکل آتی ہے۔ اسی لیے جدیدیت سے وابستہ نقادوں کے یہاں دوری کئی فرسنگ کی ہوتی ہے جو بڑھتے بڑھتے
کی دوری بن سکتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ میں نے کہیں لکھا ہے کہ جدیدیت متضاد، دھاروں کے امتزاج سے عبارت ہے۔

ایسی صورتِ حال میں جدیدیت سے وابستہ شاعری کے بابت فیض کا یہ قول کہ "مجموعی نقشہ ہی نہیں بنتا ہے" اور مزید یہ کہ "اس شاعری کی ترتیب دریافت
نہیں" —— بہت حد تک حقیقت پر مبنی ہے کہ متضاد اور مختلف نظریات کی روشنی میں تخلیق کیے جانے والے ادب میں ترتیب دینے اور مجموعی نقشہ بنانے
لاحاصل ہے۔ اور یہاں کسی بھی جز کو اہمیت دینا اس لئے غلط ہے کہ جزو کو کل سے کسی عنوان مطابقت نہیں۔ اور تمام اجزا مل کر کل کی تشکیل نہیں
تے ہیں۔

اور مشکل تو یہ بھی ہے کہ خود شاعر کے ذہن میں متضاد معانی ایک ہی ساتھ آتے ہیں مثلاً تشنگی اور سیرابی یہ شعر دیکھیے —
مری سیرابیوں میں تشنگی ہے — کہ میں دریا ہوں لیکن ریت کا ہوں [سلیم احمد]

یہاں ہر چند کہ خود اپنی ذات کے لیے "ریت کا دریا" کی ترکیب لائی گئی ہے تاہم! یہ سچ ہے کہ سیرابیوں میں تشنگی کا ہونا ابہام کی صورت تو پیدا
دیتا ہے ممکن ہے خود شاعر کی ذہنی حالت اتنی پیچیدہ ہو اور ایسی پراگندہ دماغی وجود میں آگئی ہو کہ مختلف بلکہ متضاد قسم کے تاثرات ایک ہی
وزا اور مرتکز ہوتے ہوئے محسوس ہوئے ہوں یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود شاعر کا ذہن دو ایسے تجربوں سے گزر رہا ہو جو آپس میں تصادم برپا کیے
ہوں اور ایک تجربہ دوسرے تجربے کی تردید کر رہا ہو۔

بہرحال! ایسی حالت میں قارئین اور سامعین طرح طرح کی تشریحیں پیش کریں گے اور ان تشریحات میں بھی اختلاف ہوگا اور تضادات بھی، مہ
یں —— بہ اعتبارِ نتیجہ ابہام وجود میں آئے گا —— اور جدیدیت مستحکم ہوگی اس لیے کہ جدیدیت میں ابہام کی عظمت کا احساس شدید ہے۔
فنی اور ہیئتی اعتبار سے میری رائے میں کسی بھی نظم کی جملہ خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ نظم مربوط اور مسلسل ہوتی ہے اور

تخلیقی تحرک آخر تک برقرار رہتا ہے اور جس منظر کی منظر نگاری شاعر کرنا چاہتا ہے، وہ منظر نظم کے پورے پورے ابھرتا ہوا محسوس ہونے لگتا۔ اُسے منہا کر دیجئے، نظم برباد ہو جائے گی کہ منظر کشی کی تعریف یہی ہے کہ منظر آنکھوں کے سامنے چلتا پھرتا نظر آئے گا۔ میں ایک مثال پیش کرتا ہوں فیض کی مشہور نظم ہے "آہستہ" سے رہ گزر، سایۂ شجر، منزل و در حلقۂ بام / بام پر سینۂ مہتاب کھلا آہستہ / جس طرح کھولے کوئی بند قبا حلقۂ بام تلے سایوں کا ٹھہرا ہوا نیل / نیلی کی جھیل / جھیل میں چپکے سے تیرا کسی پتے کا حباب / ایک پل تیرا، چلا، ڈوب گیا آہستہ / بہت آہستہ، ہلکا، خنک رنگ شراب / جس طرح دور کسی خواب کا نقش / آپ ہی آپ بنا اور مٹا آہستہ / دل نے دہرایا کوئی حرف وفا آہستہ / تم نے کہا آہستہ / سنے جھک کے کہا / اور ذرا آہستہ [ "آہستہ فیض ]

اس نظم کا حُسن یہ ہے کہ "آہستہ" کی تکرار تو ہے لیکن نظم کا تحرک برقرار رہتا ہے۔ دھیمے پن کی آواز تو محسوس ہوتی ہے مگر سارا منظر بھی نظر کے سامنے پھرنے لگتا ہے ـــــ اسے کہتے ہیں VIRTUAL-IMAGERY اب کیا ہے کہ الفاظ پر خیال کا دباؤ نہیں اور جذبہ خود الفاظ کو دباتا ہو ـــــ ایسا بھی نہیں کہ ہر لفظ اپنے سے پہلے اور بعد کے لفظ کی آواز اور اس کے مفہوم سے متعین ہے مگر اس کے باوجود مکمل طور پر دا بہ بھی جذبہ اور خیال، الفاظ کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ بڑھ رہے ہیں اور ہر حرکت یا بعد کے بعد نمودار ہو رہی ہے۔ پھر یہ کہ نظم کا کوئی لفظ تسلسل سے الگ نہیں نظم میں اس انداز سے تسلسل کا ہونا کہ اس کا خلاصہ ممکن نہ ہو ـــ اصل حُسن یہی ہے اور ہئیت کا راز بھی یہی ہے کہ وہ شئے وجود آئے جس کا خلاصہ ممکن نہ ہو ـــ شاعرانہ کیفیت بڑی بے قاعدہ، بے اعتبار، اضطراری اور زود شکن ہوتی ہے۔ یہ کیفیت جس طرح اتفاق سے ہوتی ہے، اسی طرح فوراً غائب بھی ہو جاتی ہے کہ بقول والیری صرف اُس کیفیت کا پیدا ہونا شاعری کے لیے کافی نہیں۔ جس طرح کوئی شخص اگر خواب میں خزانہ دیکھے، تو یہ بجائے خود اس امر کی ضمانت نہیں کہ وہ آنکھ کھلنے پر اسے کسی جگہ دفن پڑا پائے گا۔ ایک شاعر کا کام یہ نہیں کہ وہ شاعرانہ کیفیت کا تجربہ کرے۔ اُس کا کام یہ ہے کہ دوسروں کے اندر ایک شاعرانہ کیفیت پیدا کر دے۔ شاعری چاہے کتنی ہی حسیات اور جذبات سے مالا مال کیوں نہ ہو اور اس میں چاہے کتنی ہی وارفتگی کیوں نہ ہو، پھر بھی یہ ثابت کر دینا آسان ہے کہ اس کا تعلق عقل کی قوتوں سے ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ اصولی طور پر ایک جذبہ ہوتا ہے جو اپنے آپ کو الفاظ میں ظاہر کرنے کے لیے بے تاب ہوتا ہے۔ معنوی اور حسی، ممکن ہے سکوت پر ختم ہو جائے۔ بہ لحاظ شاعر کی فکر محض خارجی دنیا میں کسی نئی چیز کے اعلان کی متقاضی ہوتی ہے۔ اس نئی چیز کے اعلان کرنے کے لیے جو قوتیں استعمال کی جاتی ہیں وہ عقل سے تعلق رکھتی ہیں۔

بہر حال! جدیدیت کے منفی رجحانات سے بیزار ہو کر، نئے شعرا اپنا رشتہ معاشرے سے پھر جوڑنے لگے ہیں اور بعد کو جیسی نظمیں سامنے آئی ہیں، ان کا افق اتنا محدود اور تنگ نہ تھا اور داخلی کیفیت اور روح کے کرب کو پیش کرنے کے باوجود یہاں ڈائنیں، چڑیلیں، پرانے مندر، پُراسرار جنگل، شہزادیاں، شبنمی ٹھنڈک اور دستکیں نہیں ابھرتی ہیں اور نہ تو نئے شعرا کے انتہا پسندانہ مزاج کی طرح شاعری کو محض اور صرف اپنی ذات کے غیر ارضی اور مبہم کیفیات کی عکاسی کا وسیلہ بنایا گیا ہے کہ یہ شعرا ابہام اور دراک تھے اور یہ بات انھوں نے محسوس کر لی تھی کہ نئی شاعری میں اکثر جگہوں پر ابہام اور مشکل پسندی اصل میں زندگی سے گریز یا فرار کی علامت بن گئی ہے ـــــ اور اس بات پر ان کی تخلیقات شاہد ہیں۔ تمثیلی طور پر باقر مہدی کے مجموعے "ٹوٹے شیشے کی آخری نظمیں" میں تیجے کی آواز کا ایک بند ملاحظہ کیجئے جہاں ارضی مسائل ہیں اور ذات کی نسبت سے زندگی کا عکس پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے سے امیر شاعر / پرانے نعروں، ہزار چالوں سے / انقلاب کو قید کرنے کی فکر میں ہیں / انہیں بتا دو کہ سرکشوں کو تمہاری ہر چال کی خبر ہے / ہماری آواز بازار کے شور میں گم کبھی نہ ہوگی / گم کبھی نہ ہوگی۔ [ باقر مہدی

اسی طرح ندا فاضلی کی ایک کامیاب نظم "جنگ" دیکھئے کہ سے سرحدوں پر فتح کا اعلان ہو جانے کے بعد / جنگ / بے گھر / بے سہارا / سرد خاموش آندھی میں بکھر کے / ذرہ ذرہ پھیلتی ہے / تیل گھی آٹا / کھنکتی چوڑیوں کا روپ بھر کے / بستی بستی ڈولتی ہے / دن دھاڑے / ہر گلی کوچے میں گھس کر دروازوں کی سانکل کھولتی ہے / مدتوں تک / جنگ گھر گھر بولتی ہے / سرحدوں پر فتح کا اعلان ہو جانے کے بعد ندا فاضلی

یہ نظم اپنے تمام ترقی محاسن کے باوجود، ترقی پسندی سے کچھ الگ ہیں۔ ذرا سا ماضی میں دیکھئے، ساحر کی نظم "اے شریف انسانو" گویا اس مسئلے کو ساحر نے کچھ اس انداز سے سمیٹا ہے۔ یہ بند دیکھئے سے

بم گھروں پر گریں کہ سرحد پر روحِ تعمیر زخم کھاتی ہے

کھیت اپنے جلیں کہ اوروں کے　　زیست فاقوں سے تلملاتی ہے　　[ساحر لدھیانوی]

آزاد تکنیک اور پابند تکنیک کے فرق سے قطع نظر، دونوں ہی نظموں کا مرکزی خیال کم و بیش ایک ہی جیسا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ خوش گوار تبدیلی ہیں شعرا کے یہاں آئی جو شعوری طور پر معاشرے سے رشتہ جوڑے رکھنا چاہتے تھے کہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ فن کے سوتے بہرحال زندگی سے پھوٹتے در یہ بات کہ زندگی کے سوتے صرف یادوں سے تخلیق نہیں پاتے بلکہ فراموشی بھی ان میں برابر حصے دار ہوتی ہے۔

ایک بات اور یہ ہے کہ جن شعرا کا رنگ منفرد ہے، وہ اپنے طرزِ اظہار ہی کی وجہ سے نہیں پہچانے جاتے بلکہ طرزِ فکر کی وجہ سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔ س کا مفہوم یہ نہیں کہ طرزِ اظہار اہم نہیں کہ یہ بھی احساسِ حال اور اندازِ فکر کا ایک پہلو ہے اور منطقی، علامتی، تمثیلی یا سانیہ ہو سکتا ہے۔ مبہم اور ادھورے ، دھندلے خیالات، نامکمل تجربے اور منتشر حالات کے اندر سے شاعر کا حسِ اظہار اپنے کام کی بات ڈھونڈ نکالتا ہے اور اسے منظم یا نیم منظم شکل عطا ا ہے۔ یہ ایک تخلیقی عمل ہے اور اس مرحلے میں اس کا ذہن مستقل مصروفِ عمل رہتا ہے اور زندگی سے خام مواد حاصل کرتا رہتا ہے —— ہر لفظ خود علامت ہے۔ لیکن یہ کہ لفظ اسی وقت بامعنیٰ ہوگا جب اس لفظ کے پس پشت کوئی ذہنی یا جذباتی کیفیت کارفرما ہو اور زندگی کے مختلف پہلوؤں ، کوئی پہلو اس کے اندر دل کی طرح دھڑکتا ہو۔

اب آئیے کچھ "گیت نما نظم" کی باتیں کریں ـــــ نیبو کی پھانکوں سے نینا رسیلے / نینا رسیلے / بیلا چمیلی سی چڑھتی عمریا / جھانکے کنویں تال / تاکے ہریا/ م سے رک جائے چلتی بھریا / چکنی ڈھلانیں چمک دار ٹیلے / نیبو کی پھانکوں سے نینا رسیلے / گورا بدن جیسے کتارو پیا / سوتے میں اٹھ اٹھ کے تڑائے میّا / رٹھیا کو ٹکرائے بھیا / کتھ میٹھی سی امیا سی کوئی رے ٹی لے / نیبو کی پھانکوں سے نینا رسیلے　　[ندا فاضلی]

واضح رہے ندا فاضلی فلمی نغمہ نگار بھی ہیں اس لیے یہ گیت نما نظم کسی فلم کی کسی خاص سیچویشن پر چسپاں ہو جائے تو کچھ عجب نہیں اور اگر مقبول بھی ے تو کچھ حیرت نہیں۔ مگر یہاں ندا فاضلی کا انداز عامیانہ ہے کہ "گورا بدن" "کتارو پیا" ہے اور پھر اس کی حفاظت کے لیے بھیا "لٹھیا ٹکراتا ہے" ، "گورا بدن" کے لیے "کتھ میٹھی سی امیا سی" کی تشبیہ ہے۔ جسے "کوئی رے ٹی لے" کا خطرہ ہر دم سر پر منڈلاتا رہتا ہے۔ بہرحال اگیت کی اس ہیئت میں ـ ہے انسوانی لب و لہجہ ہے اور بول چال کی زبان کا آہنگ بھی۔ اس لیے یہ گیت نما نظم ہے۔

پھر ندا فاضلی کی ایک اور نظم دیکھئے اور یہ ذہن میں رکھ کر چلیے کہ مبہم شاعری میں فضا کی تخلیق کرنے والے مصرعے از خود حذف ہو جاتے ہیں ـــــ دن سے چاند اگا نہ سورج نکلا ہے / جب سے تم پردیس گئے ہو، بہت اندھیرا ہے / رات رات بھر پانی برسے / دھول اڑے دن دن بھر / لوہارن لوٹے ا لگے ہتھوڑا من پر / بڑھئی بیچارہ لکڑی چیرے / میں دیکھوں اٹھ اٹھ کر / نئی صراحی میں بھی پانی ندا پیاسا ہے / جب سے تم پردیس گئے ہو بہت ہے /　　[ندا فاضلی]

اس گیت نما نظم کی بابت عنوان چشتی یوں رقم طراز ہیں کہ:

> " اس گیت میں ایک برہنی اپنے سوامی کو یاد کرتی ہے چونکہ اس کا سوامی نظروں سے دور ہے۔ اس لیے ساری دھرتی تاریک ہے۔ لوہار لوہے کو پیٹے، بڑھئی لکڑی کو چیرے، چوٹ اس کے دل پہ لگتی ہے اور نئی صراحی سے پانی کی موجودگی نے اس کی پیاس کو اور نمایاں کر دیا ہے اور ہجر کے اس پورے عمل میں خود کلامی یا حسرت زدگی کا احساس ہے۔ مگر مہجور اپنے دل سے مجبور ہو کر کوئی خارجی عمل نہیں کرتی بلکہ خود کلامی کرتی ہے۔ اس گیت کا یہی انداز اسے حسن گیت بناتا ہے۔"

[اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت۔ عنوان چشتی ص۱۴۲]

اس کے علاوہ نئی شاعری کا ایک اور پہلو ہے اور وہ یہ ہے کہ جنسی خواہشات کے اظہار میں غیر ضروری عریانی سے کام لینا تمثیلی طور پر زاہد ڈار "لفظوں کے سلسلے" کا یہ اقتباس دیکھیے کہ ـــــ میرے لیے تو بارو / لڑکی کا خوبصورت / ننگا بدن خدا ہے　[لفظوں کے سلسلے زاہد ڈار] ستی اور گندگی کے علاوہ دریدہ دہنی اور بے ادبی اور گستاخی بھی جانِ مضمون ہے۔ مگر جدیدیت کو مستحکم کرنے کی ضد میں شمیم حنفی یہاں تک کہ فرائڈ کی اصطلاح میں، اساطیری علامات کی طرح یہ تجربے بھی "خواہشاتی تفکر" کا نتیجہ ہیں　[نئی شعری روایت۔ شمیم حنفی ص۱۱۷]

حالانکہ خود فرائڈ کی زبان میں فن دراصل جنس کی ارتفاعی صورت (SUBLIMATED SEXUALITY) ہے اور وہ بات یہاں مفقود ہے۔ پھر بھی عمیق حنفی کی یہ نظم قدرے غنیمت ہے کہ ؎ جتنی تیز احساس کی لے / اتنی ہی تیز بدن کی تال / خون و عرق کا قطرہ، قطرہ گویا جامِ شوق کا جام / دونوں جانیں جسم سراپا، دونوں جسم ہیں جان تمام [ایک رات - عمیق حنفی]

یہ ایک الگ بات کہ اب بڑھتی ہوئی معاشی دشواری اور مادی کشمکش کے جبر نے اس انداز نے جنسی تجربات کی نوعیت ہی بدل دی ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ جنسی تجربے میں ندرت اور انوکھے پن کے لیے ایک بے جا CRAZE بھی ہو گیا ہے۔ جیسا کہ میں نے کہا تھا کہ نئی شاعری کا مجموعی نقشہ ہی نہیں بنا ہے اور اس کی ترتیب دریافت کرنا ممکن نہیں تو اس کا سبب یہ بھی تھا کہ جدیدیت سے وابستہ شاعری کا حال بھی جدیدیت سے وابستہ تنقید کی طرح ہے جو متضاد دھاروں کے امتزاج سے عبارت ہے اور جہاں کوئی بھی اصول و نظریۂ تنقید ایسا ہے ہی نہیں جس کی بنیاد پر کوئی مجموعی نقشہ بنایا جا سکے یا ترتیب

[illegible]

کے قائم کردہ معیار سے کہیں بہتر ہے کہ اگر کہیں لڑکی کا خوبصورت جسم مدنِ خدا ہے اور یہ شاعری بھی قابلِ التفات ٹھہرتی ہے تو کہیں مذہبی رجحانات بھی گم ہیں اور ان کے بابت بھی وہی توصیفی کلمات لکھے گئے ہیں جو اوّل الذکر نظم کے لیے لکھے جا چکے ہیں۔

کچھ ایسی نظموں کو بھی دیکھ لیجئے جہاں شاعر مذہبی رجحانات اور مذہبی احساسات سے سرشار ہے۔ مذہب اور خُدا سے وابستگی شاعری میں مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوتی ہے اور یہ رشتہ شاعروں کے معاملے میں انفرادی بھی ہو سکتا ہے (INDIVIDUAL'S RESPONSE) جو مختلف شاعروں کے درمیان مختلف ہو سکتا ہے۔ تمثیلی طور پر یہ اقتباسات دیکھئے ؎ سیلِ زماں پہ کشتیِ مکاں ہے ظاہر بہاؤ باطن جمود / کھینچے حدود کی جھنجھلاہٹوں نے وسعتِ عدم میں پائے وجود / مشکل ہے نیک و بد کی تمیز گڈمڈ ہوئے ہیں ایسے حدود / نیلے سمندری پانیوں پہ چھایا ہو جیسے چرخِ کبود / آبِ رواں پہ شل حبابِ تہذیب کی اِم نمود / تہذیب تو ہے ایسا چراغ جس کو ملا ہے فانوسِ دود / مجبور ہے علم، مرتاض و ماہ یکساں ہے دراصل شہود / ایمان نہ ہو تو مشقِ حسابِ تحقیقِ عالمِ ہست و بود / مدّت کے بعد، مدّت کے بعد پیشانیوں میں تڑپے سجود / ہو گئے تھے ہم تم سے دُور اور کتنی دور، تم پر درود / ٹوٹے ہوئے سارے قیود، اب پر تمہارا آیا ہے نام / خیرالانام، تم پر درود، تم پر صلوٰۃ، تم پر سلام / [صلصلۃ الجرس - عمیق حنفی]

اور مختار صدیقی کی نظم "کوئی ایسی طرزِ طواف" بھی مذہبی رجحان لئے ہوئے ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ وہ ایسی راہیں تلاش کرتے ہیں اور پسند کرتے ہیں جو کعبے سے پلٹ آتی ہیں مگر بتکدے کو نکل جاتی ہیں ؎ یہ وہ راہیں ہیں جو سرتابہ حرم جاتی ہیں / اور ان میں ہم ... / یہ وہ راہیں ہیں جو کعبے سے پلٹ آتی ہیں بتکدے کو نکل جاتی ہیں / اور ان میں کوئی پیچ و خم بھی نہیں / [کوئی ایسی طرزِ طواف - مختار صدیقی]

اس طرح ایک بے حد پیچیدہ، مبہم اور گنجلک مذہبی رجحان لیے ہوئے یوسف ظفر کی یہ نظم دیکھئے کہ ؎ اپنا ہی دشنۂ حلقوم ہوں میں / زندگی ہے مرا خالق کی تمنا کا شہود / کہیں وہ نورِ سحر ہے کہیں نارِ نمرود / کہیں فاراں پہ معراج کی خلوت کا وجود / [ہفت خواں - یوسف ظفر]

اب اسی طرح ایک مذہبی رجحان واقعاتِ کربلا اور حضرت امام حسینؓ کی شہادت کی بابت ہے جو یقیناً اسلام کی تاریخ میں المناک ہی نہیں بلکہ سب سے زیادہ المناک واقعہ ہے کہ نوعیت کے اعتبار سے اتنا منفرد ہے کہ رہتی دنیا تک اس کی مثال نہیں مل سکتی مگر یہاں بھی دو مختلف رجحانات سامنے آتے ہیں۔ تمثیلی طور پر یہ دیکھئے کہ ؎ حسینؓ دشتِ بلا میں تنہا کھڑے رہیں گے / صدائے حق پتھروں سے سر پھوڑتی رہے گی / شہر بھر کی شہید صدائیں۔ وحید اختر

اور پھر خلیل الرحمٰن اعظمی کا یہ شعر دیکھئے کہ ؎

بس اک حسینؓ کا کہیں ملتا نہیں سراغ یوں ہر زمیں یہاں کی زمینِ کربلا لگی

اب ایک بات اور کہ مذہبی عناصر کو الگ کر کے نئی شاعری کا مطالعہ کیجئے تو وقت کے ابعادِ ثلاثہ یعنی ماضی، حال، مستقبل کے درمیان خطِ تنسیخ کھینچنے کی اور کبھی کبھی ارتباط اور تسلسل قائم کرنے کی کوشش بھی نئے شعرا کے یہاں درجۂ اتم پائی جاتی ہے کہ ہمارا جاننا عمر ہر پیچیدہ اور مبہم سوال کو منظوم کر کے اس کا کچھ نہ کچھ الٹا سیدھا مطلب نکال لیتا ہے اور پھر اُس پر وہ مصر ہوتا ہے اور نقادوں کی مہر بھی لگ ہی جاتی ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ وقت کے ساتھ ہر حقیقت بدل جاتی ہے اور جس حقیقت کا ہم مطالعہ کرتے ہیں وہ تغیر پذیر ہونے کے سبب بدل رہی ہے اس لیے ہم حقیقت کا مطالعہ نہیں کرتے ہیں بلکہ حقیقت کی تبدیلی کا بلکہ صرف تبدیلی کا مطالعہ کرتے ہیں۔ کہنے کو تو مل راج کومل کے یہاں وقت کے آغاز سے انجام تک ہونے کا احساس ایک روحانی

ا صورت یوں پیش ہوتا ہے کہ "میں وقت کے آغاز سے انجام تک موجود ہوں / دیکھتی آنکھوں سے ہر شے دیکھتا ہوں روز و شب / مضطرب ہوں جانے والوں کے لیے / منتظر ہوں آنے والوں کے لیے / [بل راج کومل]

مگر یہ بہرحال درست ہے کہ محبت خود بھی ایک تبدیلی کا نام ہے کہ محبت لمحہ لمحہ بدلتی رہتی ہے اور تبدیلی کا دوسرا نام سلسلہ ہے اور سلسلے کا دوسرا نام ت ہے۔ وقت کو بانٹتے چلے جائیے۔ وقت کے سلسلے زنجیر کی طرح کڑی در کڑی مضبوط ہوتے چلے جائیں گے۔ زندگی کے حلقے کرتے چلے جائیے ماضی، ل اور مستقبل، زندگی پھر لوٹ کر وہیں پہنچ جائے گی جہاں سے چلی تھی کہ یہی زندگی کا اصل الاصول ہے۔ وقت کے ابعاد ملاتے ہوں کہ زندگی کے ابعاد ۔سب ایک سلسلے کی صورت ہوں گے مگر یہ سلسلے ماضی سے نکلتے ہیں اور زندگی کے سوتے ماضی سے پھوٹ کر، آگے بڑھتے ہیں اور شاید مستقبل کی ف بڑھ کر پھر لوٹ جاتے ہیں کہ بقول برگساں DURATION IS THE CONTINUOUS PROGRESS OF PAST WHICH GROWS INTO THE FUTURE WHICH SWELLS AS IT ADVANCES

"جدید غزلوں" کا پس منظر "ترقی پسند غزل گوؤں" سے وابستہ ہے کہ نہیں؟ یہ ایک پیچیدہ اور مبہم سا سوال ہے لیکن یہ بہرحال طے ہے کہ غزلوں کی ری ایجاز اور اختصار، رمزیت اور ایمائیت کی شاعری ہوتی ہے اور عروض کی روشنی میں یہاں ہیئتی تجربوں کی گنجائش نہیں اور نہ تو ابہام پرستی ، کی کوئی گنجائش ہے یا کم ازکم ابہام پرستی اس حد تک ممکن نہیں جس حد تک نظموں میں ہوسکتی ہے اور اسے یوں سمجھئے "کہ اگر غالب غزل گو نہ ہوتے تو ان کا ہام میراجی کے ابہام سے کہیں زیادہ پُرپیچ ہوتا مگر غزلوں کے اشعار اس کے متحمل نہیں ہوسکتے اور یہ بھی سچ ہے کہ غزلوں کی شاعری ہو کہ اردو شاعری اعتبار مجموعی ہو، غالب بہرحال اردو کا سب سے بڑا شاعر ہی قرار پائے گا کہ ماہرین غالبیات کی روشنی میں غالب اردو شاعری میں مجتہد کا درجہ رکھتا ہے اور بات کہ فارسی شاعری میں غالب ایک مقلد کی حیثیت رکھتا ہے مگر یہ طے ہے کہ فنی اجتہادات میں بطور خاص ژولیدگی بیان اور ژرف نگاہی میں تب کا جواب نہیں۔ اب رہی بات جدت پسندی کی تو جدت پسندی ایک مثبت رجحان اور حقیقت کو فعال اور متحرک مان کر چلنے کا دوسرا نام ہے ب کہ جدیدیت ایک منفی رجحان ہے اور حقیقت کو جامد بنا کر یا جامد مان کر، تخلیقات اور تنقیدی نگارشات پیش کرنے کا دوسرا نام کہ جدت پسندی ، بہترین تعریف تو اقبال کے اس شعر سے ہو جاتی ہے کہ

طرح نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم ... این چہ حیرت خانۂ امروز فردا ساختی

اور اقبال کی شاعری کے تمام تر مثبت پہلوؤں میں یہ شعر جان مضمون ہے۔ اس کا بڑا سبب یہ بھی ہے کہ وہ مغربی استعماریت کے کرب کو محسوس رہے تھے اور اپنی نظم "زمانہ" میں انہوں نے اسے "مغربی مقامروں کے قمار خانے" سے موسوم بھی کیا ہے۔ ترقی پسند غزل گویوں میں سردار جعفری ں نثار اختر، جذبی، مجروح، مخدوم محی الدین وغیرہ کے یہاں کم و بیش یہی مثبت جدت پسندی رہی ہے۔ تمثیلی طور پر یہ اشعار دیکھئے کہ

دل کی آگ جوانی کے رخساروں کو دہکائے ہے ... بہے پسینہ مکھڑے پر یا سورج پگھلا جائے ہے ... [سردار جعفری]

بچوں کے سوکھے ہونٹوں پر پیاس کی سوکھی ریت جمی ... دودھ کی دھاریں گائے کے تھن سے گر گئیں ناگوں کے پھن میں ... سردار جعفری

ہم نے لوگوں کے دکھ درد کا حل ڈھونڈ لیا ہے ... کیا بُرا ہے جو یہ افواہ اڑا دی جائے ... [جاں نثار اختر]

یہ دل کا داغ جو چمکے تو کیسی تاریکی ... اسی گھٹا میں چلیں ہم، اسی گگن میں چلیں ... [جذبی]

بے تیشۂ نظر نہ چلو، راہِ رفتگاں ... ہر نقشِ پا بلند ہے دیوار کی طرح ... [مجروح سلطانپوری]

ستونِ دار پر رکھتے چلو سروں کے چراغ ... جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے ... [مجروح سلطانپوری]

اس شہر میں اک آہوئے خوش چشم سے ہم کو ... کم کم ہی سہی نسبت پیمانہ رہی ہے ... [مخدوم محی الدین]

اور احساسِ تمازت میں اضافہ ہوگا ... دھوپ کے لمس میں سایوں کا سفر کیا معنی ... [اعجاز صدیقی]

کھلائے شعلے نسیم سحر سے دور نہیں ... سوادِ رنگ، سوادِ نظر سے دور نہیں ... [غلام ربانی تاباں]

کل جہاں ظلم نے کاٹی تھیں سروں کی فصلیں ... نم ہوئی ہے تو اسی خاک سے لشکر نکلا ... [وحید اختر]

ایک اک سنگِ ملامت سے کیا ہے تعمیر ... کیسے اس شہر کو چھوڑوں کہ مرا گھر ہے یہاں ... [سہاب جعفری]

ایک ٹھہرا ہوا دریا ہے مری آنکھوں میں — کن سرابوں میں ڈبوتی ہے تری پیاس مجھے [شاذ تمکنت]

محولہ بالا اشعار میں "دل کی آگ کا رخساروں کو دہکانا" "مکڑی پر سورج کا پگھلنا، افواہ اڑا دینا، گھٹا اور گہن میں چلنا" "نظر کے تیشے / ستون دار پر سروں کے چراغ رکھ دینا" "آہوئے خوش چشم سے نسبت پیمانہ ہونا"، "دھوپ کے لمس میں سایوں کا سفر"، "فصلیں کاٹنا، پیاس کا سرابوں میں ڈبونا، سوکھے ہونٹوں پر پیاس کی سوکھی ریت کا جمنا" — یہ سب جدت پسندی کی ہی مثالیں ہیں۔ اور نئی پیکر تراشی بھی یہیں سے وجود میں آتی ہے۔ مگر یہاں رجحان مثبت ہے۔ نئے شاعروں میں غزلوں کی صنف میں ایسے ہی خوبصورت تجربے اور مثبت رجحان کام یاب تجربے، نئی پیکر تراشی کی مثال کے طور پر یوں ہیں سلہ

دن کو دفتر میں اکیلا شب بھرے گھر میں اکیلا — میں کہ عکسِ منتشر، ایک ایک منظر میں اکیلا [بانی]

کیا دل خراش کام ہوا ہے مرے سپرد — اک زرد رت کے برگ و ثمر چن رہا ہوں کیا [بانی]

وہ سب حروف جو بے شکل تھے سلامت ہیں — جو لفظ چہرہ نما تھا مٹا دیا ہے اسے [احمد فراز]

کونپلیں زخموں کی پھر مرجھا گئیں اہلِ جنوں — آؤ شاخِ آرزو کو خوں سے سینچو ذرا [شہریار]

منہ مانے ہوئے سندِ وفا کھولے ہیں اس نے — یہ شب کے اندھیروں کے مہکنے کی گھڑی ہے [منیر نیازی]

چراغوں کو آنکھوں میں محفوظ رکھنا — بڑی دور تک رات ہی رات ہو گی [بشیر بدر]

اوس کی بوند میں بکھرا ہوا منظر جیسے — سب کا اس دور میں یہ حال ہے میرا ہی نہیں [شکیب جلالی]

موسم، کہاں مانتا ہے تہذیب کی سرحدوں کو — جسموں سے نکل کے باہر انگڑائیاں بولتی ہیں [ندا فاضلی]

سانحہ یہ بھی اک روز کر جاؤں گا — وقت کی پالکی سے اتر جاؤں گا [مظہر امام]

یہاں بھی خوبصورت پیکر تراشی ہے جو نئی پیکر تراشی کے مثبت رجحان کی عکاسی کرتی ہے۔ مثلاً عکسِ منتشر، بے شکل حروف، اندھیروں کا مہکنا، چراغوں کو آنکھوں میں محفوظ رکھنا وغیرہ نئی پیکر تراشی ہے اور کام یاب بھی ہے مگر بہت جلد یہ سلسلہ خراب سے خراب تر ہوتا گیا۔ ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کر لی۔ اور "آنکھوں کی آواز" "سانس کا سایہ" "لہو کی آہٹ" اور پتہ نہیں کیا کیا اول فول سب کچھ سامنے آ گیا مگر یہ غلط یا صحیح ترسیل یا ابلاغ کا قائل ہوں اور تمام نقادوں کی مداحی کے باوجود، اگر شاعر ترسیل اور ابلاغ میں ناکام ہے۔ تو میرے لیے کسی کام کا نہیں۔

اب ایک غیر ادبی بات جو ادبی موضوعات سے الگ نہیں کی جا سکتی وہ بات ہے علامہ اقبال کے بابت کہ یہ ایک امرِ واقعہ ہے کہ نئی نسل اور بالخصوص جدیدیت سے وابستہ شعراء کی تخلیقی فکر اور اعتقادات سے وابستہ نظریات میں اقبال کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں نکلتی ہے کہ نئی شعری روایت کے سقدی پس منظر میں یہ اقتباس بے حد اہم ہو جاتا ہے کہ "اقبال شاعری کی حد تک تو نسلی امتیاز اور عصبیت کے مخالف اور محمود اور ایاز کو ایک ہی صف میں رکھنے کے حامی ہیں لیکن اپنی ذاتی زندگی میں وہ نسلیت کے اس اثر سے خود کو آزاد نہ رکھ سکے۔ چنانچہ اپنے بھتیجے اعجاز احمد کی شادی کے سلسلے میں اپنے ایک خط میں انہوں نے اس پریشانی کا اظہار کیا ہے کہ انہیں سپرو گوتر کا کوئی کشمیری برہمن خاندان مسلمانوں میں ایسا نہیں ملتا جہاں وہ رشتے کی بات کر سکیں" [نئی شعری روایت۔ شمیم حنفی۔ ص ۱۵۰]

یہ نہیں ماہرینِ اقبالیات ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد اور "اقبال شناسی" والے سردار جعفری اس بابت کیا فرماتے ہیں ؟ کہ ایک انتہا پسند گروہ دوسرے سرے پر بیٹھا ہوا ہے جو اقبال کو "دنیا کا سب سے بڑا شاعر" منوانے پر مصر ہے اور جہاں بنیادی مفروضہ ہی یہ ہو وہاں تو اقبال کا کردار اور تشخص لانڈری میں دھل دھلا کر آئے گا اور منٹو کی زبان میں رحمۃ اللہ علیہ کی کھونٹی پر لٹکا دیا جائے گا۔ ایسی جگہوں میں موتوبا یہ بیٹھئے اور سرِ تسلیم خم کر دیجئے کہ اس کے علاوہ چارہ ہی کیا ہے ؟ اسی لیے اس خرابے میں ماہرینِ اقبالیات میں جگن ناتھ آزاد اور سردار جعفری کے اسمائے گرامی نمایاں نظر آتے ہیں۔

ایک بات اور کہوں گا کہ نئی نسل ہو کر پرانی نسل، ترقی پسند ہو کہ جدیدیوں کا ہجوم یہ بھی ایک امرِ واقعہ ہے کہ غالب نے سب کو یکساں پر متاثر کیا ہے اور خواہ شاعری میں معاشرتی اور معاشی مسائل تلاش کیے جائیں خواہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے حالات کی عکاسی دیکھی جائے

روؤں کے ضبط اور نشار اور شخصیت کی شکست و ریخت کو تلاش کیا جائے۔ بہر عنوان غالب ایک بلند قامت شاعر قرار پاتا ہے جو ہر مکتبۂ فکر کے یکساں طور پر قابلِ قبول ہے اور بطورِ خاص غالب کا یہ شعر کہ ؎

نہ گُلِ نغمہ ہوں ، نہ پردۂ ساز　　　میں ہوں اپنی شکست کی آواز

جدیدیت کی موجودہ روش کے لیے بے حد موزوں ہے کہ یہ شکست کی آواز، اینائیت کی شکست ہے، جسے غالب آشوبِ آگہی کا نام دیتے ہیں۔ شخصیت جب سامنے آتی ہے تو جو تصویر ابھرتی ہے وہ غم، فسردگی، شکست خوردگی اور زوال پسندی کی تصویر ہوتی ہے۔ یہ تصویر خواب اور حقیقت تصادم کے نتیجے میں سامنے آتی ہے ـــــ کم و بیش نئی نسل کا المیہ بھی یہی ہے اور اگر اس عنوان نئی شاعری غالب سے اکتسابِ فیض کرتی ہے تو یہ ایک مستحسن عمل ہے ہر چند کہ پاکستان کی نئی شاعری کے بابت تفصیل سے لکھنا اس لیے مشکل ہے کہ تمام تر پاکستانی ادبی رسالے ہمارے دسترس میں نہیں ہوتے یہ ہماری مجبوری ہے۔ تاہم! مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب وہاں کے شعرا جدیدیت کے وفاداروں اور حامیوں کی لاسمیت اور بے معنویت کے گھیرے وڈکر باہر نکل چکے ہیں اور ملکی، معاشرتی اور ثقافتی سطحوں پر اپنی شناخت، حیثیت اور حد جاننا چاہتے ہیں کہ ان کے یہاں شعری مسائل اور موضوعات ہی ہیں حق کہ ہندوستان کے اکثر و بیشتر شعرا کی حالت عجیب ہے کہ یہ اب تک غیر ارضی مسائل میں الجھے ہوئے ہیں اور بے ہار جدیدیت کے علمبرداروں کا اتباع کر رہے ہیں، جنھوں نے اسے ایک فرضی المیے سے دوچار کر کے، شعرا کے اظہار کا رُخ لاسمیت اور بے معنویت کی طرف موڑ دیا ہے۔ میں اپنے مندرجہ بالا اقوال کے ثبوت کے طور پر پاکستانی شعرا کے کچھ اشعار، انتخاب کر کے، پیش کرتا ہوں جو حرف حرف اس قول پر صادق آتے ہیں ؎

ہم سے تنہا یہ فصیلیں نہ گریں گی لیکن　　　صورتِ روزن و دیوار تو کر سکتے ہیں　　　[فارغ بخاری]
روشنی کے دشمنوں نے روشنی ہونے نہ دی　　　ایک مدت تک خیال و فکر دھندلاتے رہے　　　[حبیب جالب]
منیر اس ملک پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے　　　کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ　　　[منیر نیازی]
زمیں سے مسکنِ شر، آسماں سراب آلود　　　ہے سارا عہد سزا میں کسی خطا کے لیے　　　[منیر نیازی]
ستم کے عہد میں چپ چاپ جی رہا ہوں فراز　　　کہ دوسروں کی طرح یا ضمیر میں بکا تھا　　　[احمد فراز]
وہی سیاہ ستم خیمہ زن ہے چاروں طرف　　　جو میرے بخت میں تھا اب نصیبِ شہر بھی ہے　　　[احمد فراز]
تم نے خود آگ لگائی ہے چمن میں اپنے　　　بے سبب گردشِ ایام کو الزام نہ دو　　　[عظیم اقبال]

اور نسبتاً نئے شعرا میں حسن عباس رضا، آفتاب اقبال شمیم، عبید اللہ علیم، صغیر لال، ادعال احمد، محمد اظہار الحق، شاہدہ حسن وغیرہ سب کے سب اسی ڈگر پر گامزن ہیں۔ تمثیلی طور پر یہ اشعار دیکھ لیجیے کہ ؎

نہ آرزوؤں کا چاند چمکا نہ قربتوں کے گلاب مہکے　　　نہ ہجرتوں کا عذاب سہتے ہوئے مسافر گھروں کو لوٹے
قبیلے والو، اٹھو اور اپنا بچاؤ کر لو کہ میں نے کل شب　　　فصیلِ شہرِ اماں کے باہر نقب زنوں کے گروہ دیکھے　　　[حسن عباس رضا]
جو رہ سکا، نہ نقلِ سکونت ہی کر سکا　　　اُس شخص کا مکاں ہے آدھا ڈہا ہوا　　　[آفتاب اقبال شمیم]
انساں ہو کسی بھی صدی کا، کہیں کا ہو　　　یہ جب اُٹھا ضمیر کی آواز سے اٹھا　　　[عبید اللہ علیم]

کیا یہاں شعری مسائل اور موضوعات ارضی نہیں ؟

اب رہی بات عرفانِ ذات کی ـــــ تو کیا ہے کہ جدیدیت عرفانِ ذات کے نام پر قیدِ ذات کی باتیں کرتی ہے اور عرفانِ ذات اور قیدِ ذات دو الگ چیزیں ہیں۔ عرفانِ ذات کی بہترین مثالیں اقبال کے ان اشعار میں ملتی ہیں کہ ؎

ا　برمقامِ خود رسیدن زندگی است　　　ذات را بے پردہ دیدن زندگی است

پھر یہ شعر کہ ؎

ڈھونڈتا پھرتا ہے کیا اقبال اپنے آپ کو　　　آپ ہی گویا مسافر آپ ہی منزل ہوں میں

نئے شاعروں میں، اقبال کے عرفانِ ذات کے تصوّر کا عکس کچھ یوں ملتا ہے کہ ؎

مجھ کو آکر مرے ہونے کی خبر دے کوئی    یہ تمنا نہیں اب دادِ ہنر دے کوئی    [خلیل الرحمٰن اعظمی]

یہ ذات کا طلسم مگر ٹوٹتا نہیں    میں تو خدا کے ساتھ وفادار بھی رہا    [ساقی فاروقی]

بس یہیں پر ایک نکتے کی بات ہے جس کی اصلاح بے حد ضروری ہے اور وہ یہ کہ عرفانِ ذات اور قیدِ ذات دو الگ باتیں ہیں۔ جدیدیت پسندی اور پھر اس کا منفی رُجحان، ذات کے نہاں خانے کو شعور کا زندان بنا دیتا ہے اور اس کے سبب ایک گھٹن کی سی کیفیت ہو جاتی ہے۔ ویسی جو حبسِ دوام کے قیدی کا مقدّر ہوتی ہے اور نئے شاعروں نے بھی اب یہ محسوس کر لیا ہے کہ جدیدیت عرفانِ ذات کے نام پر قیدِ ذات کی باتیں کر اور اس بیزاری کا اظہار بھی انہیں نئے شاعروں کے یہاں صاف طور پر نظر آ رہا ہے جو عرفانِ ذات کو موضوعِ سخن بناتے رہے ہیں۔ تمثیلی ط شعر دیکھیے کہ ؎

آپ خود زنجیر ہیں، آپ ہی جکڑے ہوئے    ہم کہ جو بیٹھے ہوئے ہیں، اپنے سر پکڑے ہوئے    [عمیق حنفی]

اب اس شعر کو یوں کر دیجیے کہ ؎

ہم کہ جو بیٹھے ہوئے ہیں، اپنے سر پکڑے ہوئے    آپ خود زنجیر ہیں، آپ ہی جکڑے ہوئے

یہاں شاعر جیسا کہ شعر سے ظاہر ہے کہ قیدِ ذات سے بیزاری کے سبب سراپا زنجیر کی صورت جکڑا ہوا ہے اور گویا کہ اسی کے سبب سر پکڑے ہوئے بیٹھا ہے۔ جو ظاہر ہے کہ شدید بیزاری کا اظہار ہی ہے جب کہ یہ بھی سچ ہے کہ نئے شعرا اور نئے ادبا میں ایسے بہت سے نکل آئیں گے جنھوں نے اپنی تخلیقی قوت سے صورتِ شمشیر کام لے کر اس زندان کی سلاخوں اور زنجیروں کو کاٹ پھینکا ہے اب یہ اور بات کہ جدیدیت انہیں قابلِ ملامت قرار دیتی ہے اور اپنی برادری میں شامل کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ پھر کچھ ایسے نام بھی نکل آتے ہیں جو کشاں کشاں اس زندان سے باہر آنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن ایسا لگتا ہے جیسے پرندے پنجروں سے باہر جانے سے پہلے پروں کو تول رہے ہوں۔ تمثیلی طور پر یہ بدلا ہوا لب و لہجہ دیکھیے کہ ؎

آؤ شاخِ آرزو کو خون سے سینچو ذرا    کونپلیں زخموں کی پھر مرجھا گئیں اہلِ جنوں    [شہریار]

یا پھر مظہر امام کا یہ شعر دیکھیے کہ ؎

آپ کے شہر کا انداز نرالا نکلا    خوں اوڑھے ہوئے ہر گھر کا سراپا نکلا

بہر حال، یہ طے ہے کہ نئے عہد کا مزاج نیا ہے اور اگرچہ یہ درست ہے کہ ہر عہد اپنا تنقیدی ذوق خود بنا لیتا ہے۔ تاہم، یہ بھی سچ ہے کہ ان شعلہ پیکر عقابوں میں قوّتِ پرواز ابھی باقی ہے اور یہ کسی بھی نظریے کی سمت جانا نہیں چاہتے بلکہ یہ نئے مرحلے اپنی راہ خود بنانا چاہتے ہیں اور شاید اقبال کے اس شعر کو مشعلِ راہ کے طور پر لے رہے ہیں کہ ؎

تراش از تیشۂ خود، جادۂ خویش    تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
کہ براہِ دیگراں رفتن عذاب است    رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

اور اب نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ یہ اپنی تلاش، اپنی نظر اور اپنے تجربے کو ہی اپنی فلسفیانہ اساس سمجھتے ہیں خواہ یہ باتیں جدیدیت کی فلسفیانہ اساس سے ہم آہنگ ہوں کہ نہ ہوں۔ اور اس متاعِ بے بہا کی خاطر ہر نقصان برداشت کرنے کو تیار ہیں اور اس مرحلے میں اس حد تک آگے بڑھ چکے ہیں کہ نا خضرِ راہ رہے آپ اس تناظر میں نقاد کہہ لیجیے، کے تجربے پر، اپنی نظر، اپنی تلاش اور اپنے تجربے کو قربان کرنے سے بھٹک جانے کو ترجیح دیتے ہیں ؎

رستہ ہو جا ہے صاف بھٹک جانا چاہیے    اپنی تلاش، اپنی نظر، اپنا تجربہ    [ندا فاضلی]

کم و بیش یہی صورتِ حال تمام حسّاس ادبا اور شعرا کی ہو چکی ہے اور یہی سبب ہے کہ باعتبارِ نتیجہ ایک ایسی بھیڑ وجود میں آئی ہے جو سوچ اور فکر کے عمل سے گزر تو رہی ہے لیکن کسی کو بھی یہ پتہ نہیں شکیب جلالی کے اس شعر کی صورت کہ منزل کہاں ہے اور راستہ کون سا ہے؟

کیا جانے منزل ہے کہاں؟ جاتے ہیں کس سمت؟    بھٹکی ہوئی اس بھیڑ میں سب سوچ رہے ہیں    [شکیب جلالی]

دیکھنے والی بات تو خیر یہ بھی ہے کہ یہاں لاسمیت سے بیزاری صاف طور پر ظاہر ہو رہی ہے۔

اب کیا ہے کہ لاسمیت اور بے معنویت کے اس دور میں نئی شاعری کا مجموعی نقشہ بنانا اور ترتیب دریافت کرنا، اگر بہ قول فیض ممکن نہیں تو اس
، چراغ پا ہونے کی بات نہیں اور بے سبب ہنگامے کرنا بھی مناسب نہیں کہ جب کوئی معقول بات کہی جاتی ہے اور کسی بڑی ادبی شخصیت کی زبان سے
ئی جملہ ایسا نکلتا ہے جو تلخ اور ناقابلِ برداشت ہو تو اُس کی وجہ بھی معقول ہوتی ہے۔ ظاہر ہے ایسا درشت لہجہ اختیار کرنے سے قبل فیض پر کیا
رری ہوگی! کہ جب درد، حد سے سوا ہو جاتا ہے تب کہیں جا کر تلخ نوائی وجود میں آتی ہے؟ —— فیض کی بات بہرحال معقول ہے۔ فیض کا قلم جو
سویر کشی کرتا ہے وہ ان محرومیوں اور مجبوریوں کی تصویر کشی ہے جو اُن حالات کی پروردہ تھیں، جن میں وہ زندگی گزار رہے تھے کہ شاعری میں
ی فیض کے اشعار میں محسوسات نے حالات کو، گویا متشکل کر کے، فنی سطح پر، اپنے درد و غم کے اظہار کے لیے راستہ نکالا ہے، میری رائے میں موجود
ی صورتِ حال بھی گویا فیض کے ان اشعار میں متشکل ہو جاتی ہے ؎

| | |
|---|---|
| اس وقت تو، یوں لگتا ہے، اب کچھ بھی نہیں ہے | مہتاب ہے نہ سورج، نہ اندھیرا، نہ سویرا |
| آنکھوں کے دریچوں میں کسی حُسن کی جھلکن | اور دل کی پناہوں میں کسی درد کا ڈیرا |
| ممکن ہے کوئی وہم تھا، ممکن ہے سُنا ہو | گلیوں میں کسی چاپ کا اک آخری پھیرا |
| شاخوں میں خیالوں کے گھنے پیڑ کی شاید | اب آ کے کرے گا نہ کوئی خواب بسیرا |

عین رشید

## گناہِ اوّل

ایک بالکل گول طشتری پر
ایک سیب بیٹھا ہے
اور اس کے مقابل
حقیقتوں کا مصوّر
سیب کی حقیقی تصویر بنانے کی ناکام کوششیں کر رہا ہے
کمبخت سیب ہے کہ رنگوں میں ڈھلتا ہی نہیں
اس معاملے میں اس کی اپنی رائے ہے
(ذرا مختلف قسم کی)
مصوّر پہ رفتہ رفتہ یہ بات واضح ہوتی ہے کہ
سیب اس کا دشمن ہے
پھر وہ بے چارہ
خیالات کے
نائیلن والے جال میں پھنس جاتا ہے
پھر اس کے ذہن میں سیب کا ایک درخت اُگتا ہے
پھر جنت
پھر ہاتھ میں برانڈی کا گلاس لئے سانپ
پھر آدم
پھر حوا
اور پھر گناہِ اوّل
اور پھر اسے محسوس ہوتا ہے سیب یک بیک غائب ہو گیا ہے
اور پھر
اسے نیند آجاتی ہے

## پہلا دائرہ

ہر طرف رات ہے پتھریلی رات
بے نوا چیخوں کے سنّاٹے ہیں
اندھیرا ہے
رقِ بے نور کسی زخمی پرندے کی طرح
سر پٹکتی ہے ذرا اڑتی ہے گر جاتی ہے
نرم آہوں میں پگھلتی ہوئی لرزیدہ ہوا
دست بستہ کسی مجرم کی طرح سہمی
انپتی چلتی ہے دو گام
ٹھہر جاتی ہے
یسا صحرا ہے یہ کھوئی آنکھوں کا ہجوم ؟
تنی سوئی کہ نظر آئیں رہ گزارِ حیات
نی مغموم کہ ہو ان پہ زندگی کا گماں
یسا دوزخ ہے یہاں ظلم نہیں آگ نہیں ؟
ن سے لوگ ہیں امید وں کی صورت کیا ہے ؟

فلیٹ ۲۲، بلاک ۵، ۱/۱/۲۸ گریاہٹ روڈ، کلکتہ ۲۹



کلام حیدری
کلچرل اکادمی، رینا ہاؤس، جگجیون روڈ، گیا (بہار)

# پورب کی جیوتی

اب آئے ہیں تو پُرانا گیا بھی دیکھ لیں،

عہد پارینہ کا تقدس، اس کی عظمت اور رفعتوں کا اندازہ آثار قدیمہ کے سوا اور کہاں ملے گا؟ ہم اس ملک کے رہنے والے ہیں جس کی تہذیب رمیوں میں دفن ہیں، جس کے قیمتی سپنوں کی بزدوں میں دفن ہے منہ چھپائے پھر رہے ہیں، جو ہم تک پہونچتے ہیں وہ یورپ کے ہو کے ہو چکے، وہ ہم تک یوں پہنچتے ہیں کہ ہم ان پر یقیں نہیں کر سکتے، ان پر بھروسہ نہیں کر سکتے ــــــ

آدرشوں کے اس دیس میں آدرش وادی قصوں میں سے اتنا ختم ہو گیا ہے کہ ہمیں کچھ ملا ہی نہیں،

اب آئے ہیں تو بودھ گیا بھی دیکھ لیں،

مگر اُس وقت ہم نے بودھ کے بھکشوؤں کو مار مار کر اس دیس سے ہی نکال دیا،

عجیب پرم پرا ہے ہماری کہ ہم ــــــ

اپنے یہاں کی ہر نفیس، خوبصورت، شاداب، نازک اور بامعنی شے کو دیس نکالا دیتے ہیں اور اس کے چہرے کو داغدار بنا کر ایسا کر دیتے ہیں کہ آگے آنے والا زمانہ یہ ماننے میں ہچکچاہٹ محسوس کرے کہ یہ وہی چہرے ہیں جن پر آنکھیں گڑی رہ جاتی تھیں۔

غالبؔ کی غزلیں گا گا کر لکھ پتی بننے والے ہم ــــــ

غالبؔ کی زبان کی مسکراہٹ کو اس کے چہرے سے یہ کہہ کر دھو رہے ہیں کہ یہ ہمارے ملک کی زبان نہیں ہے، کیونکہ یہ دائیں سے بائیں کی لپی میں لکھی جاتی ہے ــــــ

زندہ زبان کو دفن کر کے ہم اس کے مقبرے بنائیں گے اور اس کی زیارت کر کے گائیں گے اور سیاحوں کو بتائیں گے کہ یہ اس کا مزار ہے ــــــ کہ یہ وہ مکان ہے جہاں فراق گورکھپوری رہتا تھا۔

ANTIQUITEES سے عشق کرتے ہیں ہم ــــــ! ششدر سے ہم عہد پارینہ کو دیکھتے ہیں اور اس طرح دیکھتے ہیں جیسے ہم خود بھی ANTIQUITIES میں سے ایک ہیں۔

ہمیں دیکھو، ہمیں دیکھو بھائیو! ــــــ دیکھو کہ ہم راون کو ہر سال ہزاروں کی تعداد میں جنم دیتے ہیں، لاکھوں کروڑوں ان اونچے اونچے کاغذ کے راونوں کو تخلیق کرنے کے لیے بے دریغ خرچ کرتے ہیں۔

اور پھر ان سب کو جلا دیتے ہیں

حالانکہ راون نہیں جلتا، راون آج تک ہمارے اربوں کھربوں روپیوں کی ودیا دیتے جلا جلا آ رہا ہے اور ــــــ

ہم رام جنم بھومی کی تلاش میں مست اور منشا دونوں کو دفن کر رہے ہیں

ہمارا کیا نام ہے؟

رام ــــــ؟

بابر ــــــ؟

رام جنم بھومی؟

یا ــــــ بابری مسجد؟

راون بھوتوں پریتوں کی طرح چنگھاڑتا ہے، خوفناک قہقہے لگاتا ہے، ہماری مورکھتا پر ــــــ کہ ہم رہتی دنیا تک اپنی دولت اس کو تخلیق کرنے پر خرچ کرتے رہیں گے سو سو فٹ اونچے پتلے بنا کر جلاتے رہیں گے!

بودھ گیا سے ہمیں عشق ہے کہ وہ ANTIQUITIES میں سے ایک ہے اور ہر سال دیئے جلا کر اپنی سیمپتی جلاتے ہیں مگر ان ہزاروں دیوں کی روشنی میں ہم ننگے بھوکے بچوں کے ڈراؤں کو نہیں دیکھ

باے جو کاسۂ گدا لئے چوبیس گھنٹے موجود رہتے اور ہر ایک کا دامن
تھام لیتے ہیں'

ہم بھوکے ہیں !

ہم ننگے ہیں ! ہم بیچ ہیں' ہم ....

ہم' جو رام کے بھگت ہیں' ہمارے لئے رام نے راون کو مار کر
ہم پر کتنا بڑا احسان کیا تھا اور ہم ہر سال کروڑوں روپے پھونک
کر اپنے ہی بنائے ہوئے خیالی راونوں کو پٹاخوں کی آوازوں اور
انگاروں کی دھوم دھام سے خوش ہیں ——

اپنی صحت مند بزم پرا بنانے سے زیادہ ہمیں عہد رفتہ کو پوجنا
آتا ہے !

ANTIQUITIE ہمیں اتنا پرجوش کیوں بنا دیتی ہیں ؟

اس لئے کہ حال تشکیک میں حل ہو گیا ہے' حال پر یقین ٹوٹ
پھوٹ سا گیا ہے ؟ اور مستقبل ؟

حال سے آگے تو وہ دیکھے گا جو حال پر یقین کے ساتھ اپنے قدم
جمائے گا !

مستقبل تک پہنچنے والی بصارت اور بصیرت سے ہم محروم ہو
گئے ہیں ؟

تو یار اٹھو اب چلو پہلے پرانا گیا دیکھ لیں

گاڑی ایک جگہ روک دینی پڑی کہ بس آگے پیدل چلنے کے لائق
تنگ گلیاں تھیں اور مکانوں' کھنڈروں میں سے ہوتے ہوئے ....

پنڈدان کرانے والے اس پرانے گیا میں —— بڑے بڑے
خاندانی پنڈا رہتے ہیں کہ جن کو فخر تھا کہ مہاراجہ کشمیر تک کے پرکھوں کو
پنڈدان انہوں نے کرایا تھا اور ہاتھی جو سونے کے زیورات پہنے ہوا
تھا انعام میں دیا گیا تھا۔ پرکھوں کی روحوں کو نجات دلانے کے عوض
سونے اور جواہرات کی کیا قیمت ہو سکتی ہے ؟

اور درجنوں پنڈے ایسے تھے جو راجاؤں اور رئیسوں پر بھی
بھاری پڑتے تھے کیونکہ ان کے پاس دولت فراوانی کے ساتھ آتی تھی
اور وہ روحوں کو نجات دلانے کا ہنر جانتے تھے۔

" یہاں چار لاکھ سے زیادہ آدمی ہر سال پتر پکش پر آتے ہیں"

شاید یہ گائیڈ کی آواز تھی

اور میں کہاں تھا ؟

میں اپنے دوستوں کے ساتھ تھا اور میرا دماغ مجھے چھوڑ کر
کہیں چلا گیا تھا !

اور یہ کوئی نئی بات نہیں' یہ عجیب بھی نہیں' ایسا میرے ساتھ
اکثر ہوتا ہے' یہاں تک کہ جب میں کہانی لکھنے بیٹھتا ہوں تو بھی دماغ
مجھے چھوڑ کر کہیں چلا جاتا ہے' مارا مارا پھرتا ہے اور ساتھ کہانی بھی
ماری ماری پھرتی ہے۔ پیشہ ور بیکلوں کی طرح اپنے دماغ کو کہانی کی
تشکیل کرنے کو کہتا ہوں، کہانی کا خاکہ بنانے کو کہتا ہوں' پلاٹ بنانے
کو کہتا ہوں' تعمیر اجزا اور کہانی پن —— اسلوب اور نئی تکنیک
کی دریافت پر آمادہ کرتا ہوں مگر دماغ، عالم و فاضل نقاد ہنر مندوں
کی طرح میری باتیں بھی نہیں سنتا۔ اسے آوارہ گردی کے سوا کسی بات
کا شوق ہی نہیں' سرکشی کے سوا کسی بات پر آمادہ نہیں۔

زندگی کتنی بار بدلی ہے ؟

کس کس طرح بدلی ہے ؟

زندگی کہاں بدلتی ہے ؟

وہ بھی زمین کی طرح اپنے محور پر گھومتی رہتی ہے' تشکیل کے لئے
ٹھہرتی نہیں کہ اسے جامد ہونا نہیں آتا !

کائنات کے اجزا کیا کیا ہیں' یہ مقرر ہو جائے طے ہو جائے تو
کہانی کی تشکیل بھی ہو سکے گی۔

اور میرے دماغ کو مارا مارا نہ پھرنا پڑے ..

وہ سب کے سب دوست بودھ گیا' پرانا گیا —— سب دیکھ
کر چلے گئے' ہیں وہ دور دراز کے لئے تو آئے تھے اور یہاں کے عہد پارینہ
کو پورا عہد سمجھ کر' دیکھ کر چلے گئے' ....

.... حالانکہ میں ان کو اپنا حال بتانا چاہتا تھا مگر نہیں
بتا سکا۔ بتانا چاہتا تھا کہ ان میں سے کسی کا حال شاید میرے جیسا ہو' مگر پھر
مجھے اپنی حماقت کا بروقت خیال آ گیا اور میں خاموش رہا ....

اس احساس سے ان کو یا کسی کو کیا لینا دینا کہ میرے شانوں پر
دو آسیب سوار ہیں اور میرے دونوں کندھے جھکے جا رہے ہیں ——
گرچہ دونوں کندھے فرشتوں کے لئے خدا نے مخصوص کر دئے ہیں۔ ایک
وہ جو میری نیکیاں شمار کر کے لکھتا ہے' دوسرا وہ جو بدی گن گن کر
لکھتا ہے —— آسیب نے دونوں فرشتوں کو بھگا دیا تو دونوں کہاں
چلے گئے ؟ اور جتنے دنوں سے یہ غائب ہیں اتنے دن تک .... اور پتہ
نہیں کب تک میری نیکیوں اور بدیوں کا شمار کون کر رہا ہو گا ؟ کوئی بھی
نہیں ! حساب لکھا ہی نہیں جا رہا ہے !

اور یہ آسیب ــــ

یہ میرے دونوں کندھوں پر کیا کر رہے ہیں؟ یہ نہ نیکیاں لکھتے ہوں گے، نہ بدیاں ــــ

پھر قیامت کے دن میرا کیا ہوگا؟ نہ نیکیاں لکھی ہوں گی نہ بدیاں اور میرے کھاتے کے سادہ اوراق پھڑپھڑا کر اپنی تہی دامنی کا نوحہ کر رہے ہوں گے اور آوازیں دے رہے ہوں گے ان فرشتوں کو جو میرے کھاتوں کے لکھنے پر مامور تھے!

آسیبوں نے ان کو بھگا کر میری عاقبت کو معلق ہوا میں لٹکا دیا ہے، نہ پلڑا ترازو کا ادھر جھکتا ہے اور نہ اُدھر ــــ اس تذبذب اور بے رحم بے یقینی کے عذاب میں مبتلا میں سب سے الگ کھڑا رہوں گا اور آہستہ آہستہ سارے لوگ جنّت یا جہنّم کا رُخ کر لیں گے اور میدانِ محشر میں میرے اعمال کے کھاتے کے سادہ اوراق پھڑپھڑاتے رہیں گے....

.... آئندہ مجھے ڈراتا ہے۔

.... حال مجھے آسودگی نہیں دیتا۔

اور ماضی بہت سہانا بن کر حافظے کے لئے عذاب بن گیا ہے۔

فرشتو! میرے کندھوں پر آجاؤ کہ آسیب ہٹیں، مگر جن کندھوں پر آسیب ہوں اُن پر فرشتے کہاں ہوں گے؟

خوف کے آسیب نے میرے کندھوں سے فرشتوں کو غائب کر دیا ہے!

میں!

ہم ضحاک بادشاہ کے زمانے کے لوگ کیوں لگنے لگے ہیں؟ ہم ضحاک بادشاہ کی رعایا کیسے ہو گئے!

ضحاک کے کندھوں پر دو مردم خور سانپ ہوا کرتے تھے اور وہ بادشاہ بڑے کرّوفر اور شان و شکوہ کا تھا، وہ ان دونوں سانپوں سمیت اپنی بہت بڑی، بڑی خوبصورت دلربا راج دھانی میں لعل کے بنے ہوئے قلعے میں دربار کرتا تھا ــــ اور جب جی چاہتا اپنے وزیروں کو دربار سے نکال دیتا اور رعایا ....

رعایا میں سے دو آدمیوں کو روزانہ قتل کراتا تھا اور ان دونوں کا مغز دونوں سانپوں کو کھلاتا تھا .... اور رعایا ....؟

کیونکہ اگر ضحاک ایسا نہ کرتا تو دونوں سانپ خود ضحاک کا مغز چبا جاتے ــــ!

ضحاک جیسے کرّوفر والے بادشاہ کے یہاں غریبوں اور بزدلوں کی کمی نہیں ہوتی جو اپنے کندھوں پر آسیب کا بوجھ محسوس کرتے رہتے ہیں اور ان کے کندھے میری طرح جھکے رہتے ہیں۔

ایسے ہی لوگوں میں سے دو روزانہ ضحاک کے کندھوں والے سانپوں کی خوراک بن جاتے تھے!

زندگی بھی زمیں کی طرح گھومتی ہے یارو!

زندگی بس اتنی بدلی ہے کہ لعل کے بنے ہوئے قلعے میں بہت بڑا ضحاک پورے شان و شکوہ کے ساتھ ہے، اس کے سیکڑوں وزیر دور دور ملک میں پھیلے ہوئے، بے شمار وزرا، اس کے درباریوں اور وزرا سب کے کندھوں پر وہی سانپ ہیں جو بادشاہ کے کندھوں پر ہیں۔ اور ہزاروں افراد کی گردنیں روزانہ کٹتی ہیں اور ضحاک اور اس کے درباریوں اور وزراء کے کندھوں پر اُگے ہوئے سانپوں کو ان ہزاروں افراد کے مغز کھلائے جاتے ہیں۔

تاریخوں کو ANTIQUITIES میں تلاش کرنے والے ہم بھی ان سانپوں کی خوراک بن جائیں گے۔ لعل کے قلعے کے ضحاک اپنی حفاظت کی خاطر آدمیوں کے مغز ان سانپوں کو کھلاتے رہیں گے جو غذا نہ ملنے پر خود اُن کا اور درباریوں کے مغز کھا جائیں گے۔

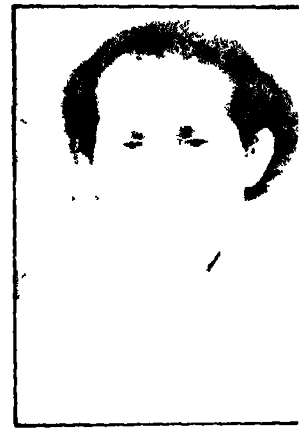
ایک ہی حکم روزانہ جاری ہوتا ہے:

یہاں سے ــــ وہاں سے ــــ
اُتر سے، پورب سے، پچھم سے، دکھن سے ــــ
اتنی گردنیں جھکا کر کاٹ لو
گردنیں جھکا دو
کہ آج تم سب کی باری ہے
مگر
کوئی ایک گردن بھی نہیں جھکی
کوئی ایک تلوار بھی نہیں اٹھ سکی

گردنیں نہیں جھکیں ــــ ان سب کی نگاہیں سامنے دور دیکھ رہی تھیں....

گردنیں اب نہیں جھکیں گی

کیونکہ انھوں نے پورب سے ابھرتی ہوئی جیوتی میں تپتی ہوئی گردنیں دیکھ لی ہیں!



## یعقوب راہی

ر و ضبط کو بخشوں زبان کیوں؟
ہے منظور میرا امتحان کیوں؟

سوا ہیں اور بھی کتنے ہی سر بلند!
ہی سر پہ بوجھ تیرا آسمان کیوں؟

راکھ ہو چکے اے چشم نم! مگر
ہے ہیں آج وہ سارے مکان کیوں؟

نہیں کہ سبھی تیر ہوں خطا
ہے اپنے ہاتھ سے تونے کمان کیوں؟

اب بھی پلکوں پہ جلتے تو ہیں چراغ
اعتبار سے دل بدگمان کیوں؟

پلاٹ نمبر ۱۔۳۔۱۰، بھوانی نگر، مرول، مروشی روڈ
مرول، اندھیری، ایسٹ، بمبئی ۔ ۵۹

## عتیق اللہ

چھت کی مٹی نہ کھری فرش کا پتھر نہ ہلا
اسکی رفتار میں کچھ اب کے نیا پن سا تھا

میں کسی چیخ کا انکر تھا کہ اس جنگل میں
جس جگہ پھوٹ کے نکلا ہوں وہیں شور ہوا

یوں تو خوش آیا ہوا تھا اسے انکار بہت
پیٹھ پہ ہاتھ رکھا تھا کہ لہو بجنے لگا

کائی پہ کھینچے ہوئے حرف کی مہلت میں تھا
تیری تحویل میں آجانے سے شہ زور ہوا

اے جی ۷۵، سالیمار باغ نئی دہلی ۳۴



## حسن عباس رضا

کسی کے ہجر میں آنکھوں کو لال کیا کرنا
جسے بچھڑنا تھا، اس کا ملال کیا کرنا

ہمیں اس کی جدائی عزیز رکھنی ہے
یہ جاہ و حشمت و مال و منال کیا کرنا

یہی بہت ہے کہ وہ شہر خواب سے گزرے
اب اس سے زیادہ کسی سے سوال کیا کرنا

محبتیں تو فقط انتہائیں مانگتی ہیں
محبتوں میں بھلا اعتدال کیا کرنا

یہ کار عشق تو "بچوں کا کھیل" ٹھہرا ہے
سو کار عشق میں کوئی کمال کیا کرنا

وہ رابطے جو کئے خود ہی کالعدم ہم نے
نئے سرے سے پھر ان کو بحال کیا کرنا

ڈی کے ۔ ۵۹۱، پراچا کالونی، الیس ٹاؤن، راولپنڈی، پاکستان



محافظ حیدر

معرفت: اختر مرزا، ۲۰۔ اے، فریرا مینشن شتلا دیوی ٹیمپل روڈ ماہم۔ ممبئی ۴۰۰۰۱۶

# کنفیشن

**ننھا** سا فرشتہ کہنے لگا۔ "یہ دُنیا میری مسکراہٹ کی طرح معصوم ہے" ہالے کے زیور سے سجی مدر میری کی پورٹریٹ بولی۔ "گناہ اگر کوئی چیز ہے سب سے بڑی گناہ گار میں ہوتی۔"

اور کانٹوں کا تاج پہنے یسوع مسیح نے کہا۔ "میری میگڈلین کو اس گناہ کی سزا صرف وہی آدمی پتھر مارے جس نے کبھی گناہ نہ کیا ہو۔"

چرچ کی دیواروں پر اُوپر کی طرف بنے ہوئے لال پیلے نیلے ہرے رنگوں کے شیشوں سے تشکیل دی ہوئی تصویریں اور مناظر ادر ربیلو بتیس پینتیس سال سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن تین تصویروں سے اُس نے نور کی کرنوں کی طرح پھوٹتی ہوئی آوازوں کو پہلی بار سُنا تھا۔ سرمن ختم ہوگیا۔ گھنٹہ بجنے لگا۔ آرگن اُبھرنے لگا۔ حمدیہ ترانہ بج اُٹھا۔

فادر ربیلو نے ترانہ گانے والوں کو ایک نظر یہاں سے وہاں دیکھا۔ مسز فلورنس بریٹو، مسز الیزا کیٹیلینو، مس سارا مسکرینس، میریا ایکوکرکے، مسز ڈیبرا ڈی سوزا، مس کرسٹابل ڈی پینا، وہ سبھی عورتیں دکھائی دیں جو اپنے حسن کے لئے مشہور اور جوانی لئے بدنام تھیں۔ جن کے گناہ، خاص طور سے جنسی گناہ، ناجائز جنسی کے اعتراف، 'کنفشن'، اُس نے سُنے تھے۔ جن کی بخشش کے لئے اُس نے دُعائیں کی تھیں۔ جن کو اُس نے کفارہ بھی بتایا تھا۔ ایسے گناہگار مرد اور گناہگار عورتیں اس پیرش میں بہت سی تھیں۔ ربیلو کے خیال میں یہی گناہ زیادہ عام ہوگیا ہے۔ کبھی کبھی عجیب بھی ہو جاتا ہے۔ جیسے ماریا سیکوئرا کا کنفیشن۔ وہ کوئی تیرہ یا چودہ سال کی تھی۔ اُس نے کنفیشن کیا کہ اب وہ کنواری نہیں رہی۔

"خداوند یسوع مسیح کی تم پر رحمت نازل ہو۔" فادر ربیلو نے کہ تمہارا ضمیر تمہیں ملامت کر رہا ہے۔"

"فادر۔" ریٹا بولی۔ "مجھے پتہ نہیں ضمیر کیا ہوتا ہے۔ میری سہیلیوں نے مجھے بتایا کہ کسی لڑکی کا کنواری رہنا آج کل فیشن کے خلاف ہے۔ اور یہ بھی سنا ہے کہ شادی کے بنا جنسی فعل گناہ ہے۔ بس یونہی کنفیشن کے لئے آگئی۔"

یا پھر کرسٹابل ڈی پینا کا کنفیشن۔ وہ زنا بالجبر کا شکار بننے کے بعد اُن کے پاس آئی تھی۔

"میری پوری پوری ہمدردی تمہارے ساتھ ہے۔" یہ کہکر فادر ربیلو اس کے لئے دُعا کرنے ہی لگا تھا کہ کرسٹابل نے قطع کلام کیا۔

"فادر! میرے لئے نہیں۔ اُس آدمی کی بخشش کے لئے دُعا کرو۔ گناہ میں نے نہیں اُس نے کیا ہے۔ یہی کام وہ مجھے منا کر اور میری رضامندی سے بھی کرسکتا تھا۔"

حمدیہ ترانے گانے والوں میں اُسے انورادھا جوشی نہیں دکھائی دی۔ فادر ربیلو کو احساس تھا کہ وہ گناہگار تو ضرور ہے مگر اُس نے کبھی اپنے کسی گناہ کا اعتراف نہیں کیا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ انورادھا کبھی چرچ نہیں آتی۔ پھر بھی اس کی آنکھیں انورادھا کو ہمیشہ چرچ میں ڈھونڈتی رہتی ہیں۔ جیسے خود فادر ربیلو کو اُس سے کنفیشن کرنا ہو۔ جیسے انورادھا ہی اُس کی بخشائش اور نجات کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

انورادھا تین چار سال پہلے اس پیرش میں رہنے کے لئے آئی تھی۔ وہ کوئی ستائیس اٹھائیس سال کی تھی۔ وہ مس سارا میسکرینس کی پے انگ گیسٹ تھی۔ ایم۔ اے تھی۔ اور پونہ سے آئی تھی اور بمبئی کے مضافات میں کسی کالج میں لکچرر ہوگئی تھی۔ انورادھا کا پر دادا بائبل کا مراٹھی ترجمہ کرنے والوں میں سے ایک تھا۔ اور اپنی ذاتی عقیدت مندی سے کیتھلک ہوگیا تھا۔ ایک بار جب فادر ربیلو سارا کے گھر گیا تھا تو اُس نے انورادھا کا تعارف یہ کہکر کروایا تھا کہ وہ کٹر کیتھلک ہے۔ یہ سُن کر فادر ربیلو کو

بڑی مسّرت ہوئی تھی۔ اُس کی ایک خوبی جو فادر ربیلو نے خود ہی دیکھ لی تھی، وہ تھا انوارادھا کا جسم۔ پونا کی چیت پاون برہمن عورتیں اپنی خوبصورتی اور صحت مند جسم کے لئے مشہور ہیں۔ مگر انوارادھا کا جواب تو شاید اُن میں بھی نہ ملے۔ اس کے گداز بدن کا تناسب، گولائیاں اور نشیب و فراز کی لکیریں دیکھتے ہی فادر ربیلو کو اپنے زندگی بھر کنوارے رہنے کی قسم یاد آگئی۔ وہ تڑپ کر رہ گیا۔ اور انوارادھا کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ نہ جانے کب تک دیکھتا رہا۔ سارا کافی کی ٹرے لے آئی۔ وہ چونک اُٹھا۔ جانے سے پہلے وہ سب سے پیار اور محبّت کرنے کی تلقین کرنے لگا۔

فادر ربیلو کو انوارادھا کسی بھی خاص یا عام عبادت میں کبھی نہیں دکھائی دی۔ لیکن جب بھی وہ کسی جوان اور خوبصورت عورت کو دیکھتا تو اُس میں اُسے انوارادھا دکھائی دینے لگتی۔ جب بھی اسکی نظر چرچ کی دیواروں پر رنگین شیشوں سے بنے چہروں پر جاتی تو اُسے ہر ایک میں صرف انوارادھا ہی دکھائی دیتی۔ ننھے فرشتوں میں، مریم میں، یسوع مسیح میں۔

ایک روز وہ بے اختیار انوارادھا سے ملنے چل پڑا۔ انوارادھا گھر پر اکیلی تھی۔ سارا جو پیشہ ور نرس تھی، ڈیوٹی پر گئی ہوئی تھی۔ انوارادھا اور ربیلو آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ انوارادھا کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

"میں جانتی تھی تم مجھ سے ملنے ضرور آؤ گے!"

فادر ربیلو کو جھٹکا سا لگا۔ سنبھل کر بولا "پیرش کا دورہ کرنا اور سب کی خبر رکھنا ہمارا فرض ہے۔"

"یہ تو ایک بہانہ ہے۔" انوارادھا کے طنز کے شیشے کا رنگ اور گہرا ہو گیا۔ جس میں ربیلو کو اپنے روحانی خدوخال نظر آنے لگے۔

"بہانے کی کوئی بات نہیں۔" ربیلو نے کچھ خود اعتمادی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "سارا نے بتایا تھا تم ایک کٹر کیتھلک ہو، لیکن چرچ میں کبھی نہیں دیکھا تم کو۔"

"نہ ہی میں کٹر کیتھلک ہوں، اور نہ چرچ جاتی ہوں۔ وہ تو اس کنواری بڑھیا سارا نے شرط رکھی تھی کہ وہ کسی کٹر کیتھلک ہی کو کمرہ کرائے پر دے گی۔ تو میں نے بھی کہدیا کہ میں کٹر ہوں۔ آٹھ دس سال پہلے ضرور تھی لیکن اس سے مجھے بڑا نقصان ہوا۔"

"کیسے؟" فادر ربیلو نے حیرت سے پوچھا۔

"کالج میں ایک بڑا ہی خوبصورت اور شریف لڑکا میرا دوست تھا، صادق مسیح"۔ انوارادھا کھڑکی سے دُور اُفق کی طرف دیکھتے ہوئے اور میں گم ہوتے ہوئے بول رہی تھی۔ "ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ وہ مجھ سے شادی کرنے کے لئے بے تاب تھا۔ لیکن میں راضی نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ میں خالص برہمن کیتھلک تھی اور وہ مسلمان پر دشتندہ" ایک ٹھنڈی سانس لے کر وہ چند لمحے خاموش رہی۔ "اس وقت کتنی بیوقوف تھی میں۔ اب ایسا پیار کرنے والا مجھے پھر نہیں ملے گا۔"

فادر ربیلو نے سوچا کہ وہ صادق مسیح سے زیادہ اُسے پیار دے سکتا ہے۔

انوارادھا نے اپنے سر کو ہولے سے جھٹکا اور آگے کو گری ہوئی زلفوں کی پوری لٹ جس سے اُس کا آدھا چہرہ چھپا ہوا تھا پیچھے چلی گئی۔

فادر ربیلو اُس کے دلی سکون کے لئے دُعا کرنے لگا۔

"رہنے دو فادر!" انوارادھا نے ٹوکا۔ "مجھے یہ مکّاری بالکل پسند نہیں۔ ان دُعاؤں سے کچھ ہوا ہے نہ ہو گا۔ سب ڈھونگ ہے، چاہے کوئی مذہب ہو۔ اپنے شدید احساسِ خوف پر غلبہ پانے کے لئے انسان نے گڑھ لی ہیں یہ باتیں۔ خدا اور مذہب اور مقدس کتابیں اور "خدا تمہیں صحیح راستہ دکھائے!"

"صحیح راستہ مجھے کارل مارکس دکھا چکا ہے۔ مگر سارا سے یہ نہ کہنا ورنہ وُہ مجھے دھکّے دے کر گھر سے نکال دیگی۔ پھر میں کہاں رہونگی، تمہارے پاس؟ ہوں؟" اور وُہ مسکرانے لگی۔

فادر ربیلو کا مُنہ کھلا ہی رہ گیا۔

"اُہو! بڑا شاک لگا تمہیں۔ لیکن دل میں تو انار پھوٹ رہے ہوں گے۔"

فادر ربیلو سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

"اچھا فرض کرو، میں تمہارے کوارٹرز میں آکر رہنے لگوں، کیا کرو گے تم؟ میں تمہارے ہی کمرے میں رہوں گی۔ تمہارے بستر پر سوؤں گی تمہارے ساتھ۔ بولو کیا کرو گے؟"

فادر ربیلو کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔

"مائی گاڈ!" اُس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا پھر اچانک اُٹھ کر نظریں نیچی کئے تیزی سے نکل گیا۔

فادر ربیلو کو پھر کبھی انوارادھا کے پاس جانے کی ہمت نہیں

انورادھا ویسے ہی چرچ میں نہیں آتی تھی۔ یوں وقت گزرتا گیا۔ اُسے کم سے کم دُور ہی سے دیکھ لینے کی تمنا میں فادر ربیلو جینے لگا۔

ایک روز اُس سے رہا نہ گیا۔ سارا جب اس سے لوٹنے لگی تو فادر ربیلو نے اُس سے کہا۔

"سارا، انورادھا کو ماس میں کیوں نہیں لاتیں ؟"

"کہاں سے لاؤں فادر، وہ تو کب کی چلی گئی۔"

فادر ربیلو کو بڑی ٹھیس لگی۔ اس کی نظر اُوپر رنگین شیشوں کے مناظر پر چلی گئی۔ یسوع مسیح اُسے صلیب سے لٹکے نظر آئے۔ کچھ بلند، ر فرشتے پرواز کر رہے تھے۔

کوئی ایک سال گزر گیا۔

ایک روز وُہ کنفیشن باکس میں بیٹھا اُونگھ رہا تھا۔ ایک نسوانی واز نے اُسے چونکا دیا۔

"ہلّو فادر !"

انورادھا کی آواز سُن کر فادر ربیلو کو جتنی خوشی ہوئی اُس سے زیادہ وہ سہم بھی گیا۔

"کہاں رہیں اتنے دنوں"؟ ڈرتے ڈرتے فادر ربیلو نے پوچھا۔

"میں ایک نکسلائیٹ سردار جی کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ وہ کالج ں میرا شاگرد بھی تھا۔ پچھلے مہینے وہ ڈی آئی آر کے تحت گرفتار ہو کر بل چلا گیا۔"

"تو کیا بجتائش کے لئے ۔۔۔۔۔"

"جہنم میں جائے بجتائش۔ میں تو صرف تم سے ملنے آئی ہوں۔ تم کو میڑنے آئی ہوں۔ بڑا مزہ آتا ہے مجھے۔ فادر۔ تم جیسا بڑی عمر والا کیسے آدمی مجھے بھانے لگا ہے۔ اچانک تمہاری یاد ستانے لگی۔ تم ے ملنے چلی آئی۔"

"یسوع مسیح نے اسی بہانے سہی تمہیں چرچ تو بھیج دیا۔ یہ معجزہ یں تو اور کیا ہے۔"

"تو یہ بھی سُن لو کہ معجزہ کس قسم کا ہے۔ کچھ ہی روز ہوئے میں نے ۔ فلم فسٹیول کی رپورٹ پڑھی تھی۔ اُس میں روم کی بنی ہوئی ایک ۔ دکھائی گئی تھی۔ روم جو تمہارا مذہبی مرکز ہے۔ کہانی یہ تھی کہ ایک سے بدحال اور بے روزگار لیکن جوان اور صحت مند آدمی کو ۔ رحم کھا کر اور جھوٹ موٹ گونگا بنا کر ایک ننری میں مالی کی نوکری ۔ادی۔ کیونکہ وہاں کوئی مالن نہیں تھی اور ایک ننری میں مرد نوکر نہیں

رکھے جاتے۔ روز رات کو باری باری ایک نن اس کے پاس جاتی اور جنسی اختلاط کرتی۔ ایک روز مدر سپیریئر بھی اُس کے پاس چلی گئی۔ صحبت کے دوران مدر سپیریئر کی چیخ نکل گئی۔ مالی کے منہ سے بے اختیار نکلا "جیسس کرائسٹ"۔ مدر سپیریئر حیران ہو گئی۔ اور اُس کے نیچے سے چلاتی ہوئی نکل بھاگی۔ معجزہ! معجزہ!! گونگے کو زبان مل گئی۔ گونگا بولنے لگا۔ کرائسٹ کا ر مدد معجزہ ۔۔۔۔۔۔"

"پاگل لڑکی۔ نکل جا یہاں سے۔" فادر ربیلو غصّہ سے کھڑا ہو گیا۔ وہ کانپ رہا تھا۔" روح القدس مجھے اس کفر کے لئے معاف کرے جو میں تیری گندی زبان سے سُن رہا تھا۔"

کچھ مہینوں بعد فادر ربیلو کو رجسٹرڈ پوسٹ سے ایک کتاب تحفے میں ملی۔ یہ انگریزی ناول "دی اکسارسٹ" تھا۔ یہ تحفہ بڑے خلوص و احترام سے مس انورادھا جوشی نے بھیجا تھا۔ فادر ربیلو تاڑ گیا کہ اس میں بھی انورادھا کی کوئی شرارت ہے۔ اس لئے کئی مہینوں تک اسے ڈال رکھا۔ پھر بے پرواہی کی جگہ آہستہ آہستہ کشمکش نے لے لی۔ اور اس شدید کشمکش ذہنی سے نجات پانے کے لئے اُس نے چوری چھپے ناول پڑھنا شروع کر دیا۔ پڑھتے پڑھتے ایک صفحہ ایسا آیا جس پر حاشیے میں سرخ پنسل سے ایک صلیب بنی ہوئی تھی۔ اس صفحے پر انتہائی وحشت، نادانی اور بے اختیاری کے عالم میں ایک چھوٹی سی دھاتی صلیب کے ذریعہ ہیروئن کے جنسی تلذذ حاصل کرنے کا بیان تھا۔

"کاش وہ صلیب ۔۔" فادر ربیلو سوچنے لگا۔

ایک روز وہ چرچ سے نکل کر اپنے کوارٹرز کی طرف جا رہا تھا۔ اچانک اسے وُہی آواز آئی۔

"ہلّو فادر!"

فادر ربیلو کا دل دہل گیا۔

"پڑھ لیا وہ ناول ؟" انورادھا نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

"پوپ کی طرف سے اس ناول کا پڑھنا کیتھلکس کے لئے منع ہے۔"

"اچھا وہ صفحہ جس پر میں نے نشان لگایا تھا۔" انورادھا نے اس کی بات اَن سُنی کرتے ہوئے کہا۔ "وہ کیسا لگا ؟"

فادر ربیلو نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"دیکھو فادر! صلیب کے جنسی استعمال کو مذہبی نکتۂ نظر سے نہ دیکھو۔ اُس نے جو بھی کیا، اس کے تحت الشعور نے اُس سے کروایا جو اس کی جبلی ضرورت تھی۔ اس کے گھٹے ہوئے جذبات دبی ہوئی

خواہشیں، اور اُن کے ذمے دار وہ منفی اور غیر فطری سماجی اور مذہبی اصول ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"تم کیوں میرا وقت خراب کر رہی ہو !"

"تم ایک شتر مُرغ ہو فادر ۔ حقیقتوں سے مُنہ چھپا کر سمجھتے ہو کہ ان کا کوئی وجود ہی نہیں ۔ ارے میں کہتی ہوں جنسیات کے بنا زندگی کا مزہ ہی کیا ۔ انسانوں میں جانوروں میں، پرندوں، پھولوں ۔ ۔ ۔ ۔"

"تم انسان نہیں، شیطان ہو انورادھا !"

"میں عورت ہوں، مریم کا روپ ہوں ۔ مجھے بھی ایک مقدس کنواری ماں سمجھو ۔ کبھی مجھے تم پر ماں کی طرح پیار آتا ہے ۔ کبھی میں تم کو بیٹے باپ کے روپ میں دیکھتی ہوں ۔"

"تم سچ مچ پاگل ہو ۔"

اور "میں سمجھتی ہوں تم پاگل ہو ۔ جنس کے مارے ہوئے ہو، اور جنسیات سے نفرت کرتے ہو ۔ فادر، ہر مذہب نے جنسیات کی اہمیت تسلیم کیا ہے ۔ شیو لنگ دیکھا ہے ؟ کھاجوراہو کا نام سُنا ہے ؟ مسجد کے کھڑے ہوئے مینار اور گنبد کی علامت پر غور کیا ہے ؟"

"مجھے بہت دیر ہو گئی ہے ۔" فادر ربیلو جانے لگا ۔

"ٹھہرو ! ایک آخری بات اور ۔ میرا دل کہتا ہے کہ تم نے کبھی جوان اور خوبصورت عورت کو ننگا نہیں دیکھا ۔ تم نے کسی عورت سے جنسی اختلاط نہیں کیا ۔ تم نے زندگی بھر کنوارہ رہنے کا جو حلف پر عائد کر لیا ہے وہ تمہارے لئے ایک روحانی کینسر بن گیا ہے ۔ سے تمہاری موت بڑی اذیت سے ہو گی ۔ لیکن تم اس اذیت کا اظہار نہ کر سکو گے ۔ کیونکہ تم میں اپنی غلطی کے کنفشن کی اخلاقی جرأت نہیں ہے ۔"

فادر ربیلو کے ذہن میں انورادھا کا تصور دن رات رہتا ۔ کانوں میں اسی کی باتیں گونجتی رہتیں ۔ کبھی کبھی مقدس مریم کے مجسمے کی طرف دیکھتے ہوئے بھی اسے انورادھا ہی دکھائی دیتی ۔ جب وہ پلپٹ پر کھڑا ہوتا یا کنفشن سُننے کے لئے تیار ہوتا تو اُسے انورادھا کی تلاش رہتی ۔ ماس میں کبھی کبھی انورادھا اُسے دکھائی دیتی ۔ اور جب بھی اُسے دیکھتا تو اپنی ہی طرف دیکھتی اور مسکراتی پاتا ۔ وہ گھبرا کر دوسری طرف نگاہیں پھیر لیتا ۔ اُسے کبھی یہ پتہ ہی نہ چلتا کہ اُس نے سچ مچ انورادھا کو دیکھا ہے یا صرف یہ اس کا تصور ہے ۔ جب وہ بائبل پڑھتا تو انورادھا کی باتیں چھپے ہوئے جملے بن کر اس کے سامنے آ جاتے ۔ مراقبہ کرتا تو انورادھا کی صورت، جسم اور باتوں کے سوا وہ کچھ سوچ نہ پاتا ۔ یہاں تک کہ مقدس مریم کی شبیہہ کو گھیرا ہوا ہالہ اُس کی روح میں پھیلتا گیا ۔ اور صلیب کا سایہ سکڑتا گیا ۔

اور آج چرچ میں بیٹھے بیٹھے اُسے گیان مل گیا ۔ رنگین شیشوں کی شبیہیں اس سے بول رہی تھیں ۔ دُنیا اور زندگی اسے رنگین دکھائی دینے لگی ۔

فادر ربیلو نے حمدیہ ترانے گانے والے مجمع پر نظر ڈالی ۔ اسے وہ عورتیں بھی دکھائی دیں جنہوں نے ناجائز جنسی فعل کئے تھے ۔ صرف انورادھا جوشی وہاں نہ تھی ۔ شاید اس لئے کہ وہ گنہگار نہ تھی ۔ وہ اسے مل جاتی تو فادر ربیلو اسے اپنا فیصلہ سُنا دیتا کہ وہ پریسٹ ہڈ سے استعفیٰ دے گا اور جیسے ہی اس کے حلف سے اسے آزاد کر دیا جائیگا، وہ انورادھا سے شادی کر لے گا ۔ اور اگر وہ بنا شادی کے اس کے ساتھ رہنا پسند کرے گی تو اسے یہ بھی منظور ہو گا ۔

اچانک فادر ربیلو کے بدن میں درد کی لہر دوڑی اور وہ دُہرا ہو کر گر پڑا ۔

فادر ربیلو کی آنکھ کھلی ۔ بڑی دیر بعد پُتلیوں میں روشنی آئی اور آہستہ آہستہ اُسے پتہ چلا کہ وہ ہسپتال میں ہے ۔ اس کے پاس اس کے پادری ساتھی تھے ۔ میری اور ایزا اور سارا اور دیرا بھی تھیں ۔ انورادھا جوشی بھی تھی ۔ سب کے چہرے اُسے اداس لگ رہے تھے ۔ معصوم اور مقدس بھی لگ رہے تھے ۔ رنگین شیشوں سے تشکیل دی ہوئی شبیہوں کی طرح ۔

"مجھے کیا ہوا انورادھا ؟"

"کینسر !" انورادھا نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا ۔ "غذا کی نال سے کینسر اچانک پھوٹ کر جگر کی طرف تیزی سے پھیل رہا ہے ۔"

فادر ربیلو نے دیکھا کہ بھیگی بھیگی خلاء میں کھڑکی سے نکلتے ہوئے ملجے ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے ہیں ۔ اور ایک اکٹوپس انہیں پکڑنے کے لئے اپنے بہت سے ہاتھ پیر مار رہا ہے ۔

انورادھا نے فادر ربیلو کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا ۔

فادر ربیلو کی نظر کمرے کی دیوار پر ٹنگی یسوع مسیح کی تصویر پر گئی ۔ اور اس نے دیکھا کہ صلیب پر لٹکتے ہوئے، کانٹوں کا تاج پہنے ہوئے اور ہاتھ پیر لہولہان ہوتے ہوئے بھی یسوع مسیح کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ تھی ۔



## عبداللہ کمال

زخم پلکوں پر سجانا، درد منظر کاٹنا
عمر بھر اُس کی جدائی کے سمندر کاٹنا

شام ہوتے ہی جگانا اک طلسمِ خوں کی جوت
اور سحر ہونے سے کچھ پہلے مرا سر کاٹنا

گُل کترنا جب سوا نیزے پہ آئے آفتاب
رات جب بازو سمیٹے، دن کے شہ پر کاٹنا

وہ چمکنا خوشۂ گندم کا سورج کی طرح
وہ مرا سیّاروں جیسا اس کے چکّر کاٹنا

دیکھنا شاخوں پہ تازہ پھول پھل آتے ہوئے
لمحہ لمحہ اک شجر کا اجنبی ڈر کاٹنا

بے یقینی کا جہنّم، خوف و مایوسی کا زہر
چار دن کی زندگی بھی زیرِ خنجر کاٹنا

خود ہی اپنے عشق کو خوشبو بنا دینا کمالؔ
اور پھر سنگِ ملامت مسکرا کر کاٹنا

◆

ہر اک جگہ کی وہی داستان ہے بھائی
جہاں بھی جاؤ، یہی آسمان ہے بھائی

سمٹ رہا ہے ہر اک سمت سے پروں میں افق
فلک نشانہ سہی اپنی اڑان ہے بھائی

عجیب گوشت کی خوشبو اڑی ہے جنگل میں
کسی شجر پہ کہیں اک مچان ہے بھائی

بھروسہ کیجیے خود پر بھی اجنبی کی طرح
کہ ہر یقین سے پہلے گمان ہے بھائی

دھڑکنے دیجیے دل میں حسین لوگوں کو
انھیں کے دم سے ہر آتش جوان ہے بھائی

نظر کے سامنے رکھیے ہرا بھرا سا بدن
کہ اس پرندے میں تھوڑی سی جان بچی ہے بھائی

قدم قدم پہ یہاں خواب بک رہے ہیں کمالؔ
یہ شہر کیا ہے سزا کی دکان ہے بھائی

◆

…تھ اس کا تھا، مگر تحریر ہونا تھا مجھے
…واب اس کے تھے، مگر تعبیر ہونا تھا مجھے

…سلسلہ دل کا تھا، میں نے درد سے جوڑا اسے
…درد کے رشتے سے عالمگیر ہونا تھا مجھے

…کھل رہی تھی میرے آگے کوئی دوشیزہ سی را…
…ور اپنے پانو کی زنجیر ہونا تھا مجھے

…پھر اترنی تھی مری رگ رگ میں اک موسم کی آگ
…پھر کسی منظر میں آتش گیر ہونا تھا مجھے

…عکس بے پیکر تھا اور حیرت تماشا میں نہ تھی
…آئینہ ٹوٹا تھا اور تصویر ہونا تھا مجھے

…زندگی کے جتنے رُخ تھے مجھ پہ آ کر کھل گئے
…م کا جو بھی روپ تھا، تقدیر ہونا تھا مجھے

…بن کر اپنے ہی حوالے سے ہوں عبداللہ کمالؔ
…کوئی غالب اور نہ کوئی میرؔ ہونا تھا مجھے



ندا فاضلی

۱۰۳ - امر اپارٹمنٹ، ڈانڈپاڑہ - ۱، کھار ویسٹ، بمبئی ۴۰۰۰۵۲

# دیواروں کے بیچ

(قسط نمبر ۳)

گھر کا ماحول اور والد کے ساتھ اکثر شعری نشستوں میں شرکت نے ندا میں بھی ادبی ذوق پیدا کر دیا ہے سمجھ بوجھ کیا خاک سے پاس چھوٹی بحروں وزن میں مصرع جوڑنے کی صلاحیت ظاہر ہوتی ہے۔ نصاب کی کتابوں سے زیادہ قافیوں کی تلاش میں وقت ضائع کرنے لگے ہیں۔ یادداشت اچھی ہے۔ داغ، نوح اور اپنے والد کے بہت سے شعر یاد ہو گئے ہیں۔ انہیں کو الٹ پھیر کر شعر بنا لیتے ہیں۔ گھر سے اسکول تک ریاض صاحب کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اور ہر روز راستے میں انہیں نئے شعر سناتے ہیں۔ وہ چلتے رہتے ہیں۔ داد بھی دیتے ہیں اور ساتھ میں اصلاح بھی کرتے جاتے ہیں۔ شعر اس طرح کے ہیں۔ ؎

قدر الفت میں ستمگر نے نہ جانی میری — ہائے دل ہائے جگر ہائے جوانی میری
وفائیں تم کئے جاؤ جفائیں ہم کئے جائیں — تمہیں وہ کام آتا ہے ہمیں یہ کام آتا ہے

گوالیار میں آئے دن نشستیں ہوتی ہیں۔ اچھا خاصا ادبی ماحول ہے۔ اساتذہ میں ضیا، عباس، حکیم احمد (جو سندھیا دربار میں وزیر تھے) کیناں پال (ریٹائرڈ فوجی ہونے کے ناطے کے آگے کپتان جڑ گیا ہے) نارائن پرشاد مہر، مہاراج نارائن ور، غنی گوالیاری، سائل گوالیاری، انور سیتاب گڑھی، رامش جیوری، دعا ڈبائیوی ہیں۔ جاں نثار اختر حال ہی میں علی گڑھ سے تعلیم مکمل کرکے آئے ہیں اور وکٹوریہ کالج میں لکچرر منتخب ہوئے ہیں۔ ان کی نظم "گرلس کالج کی لاری" کی شہرت ان کے یہاں آنے سے پہلے سے ہے۔ سیدھی سادی نظم ہے۔ لیکن اظہار کی بے باکی کی وجہ سے نوجوانوں میں بہت مقبول رہی۔ ان کی شراب نوشی کی طرح ان کا عشق بھی مشہور ہے۔ یہ عشق بھی غیر روایتی ہے۔ ایک شادی شدہ خاتون فاطمہ زبیر کو موضوع سخن بنائے ہوئے ہیں۔

فاطمہ زبیر مقامی اسکول میں مدرس ہیں۔ پچھلی تیسری پشت میں ان کا رشتہ غالب کے ہم عصر مومن خاں سے ملتا ہے۔ ادبی ذوق کی ہم مزاجی نے دونوں کو قریب کر دیا ہے۔ شوہر شریف آدمی ہیں۔ غزل کے عاشق و معشوق کے درمیان رقیب کا کردار ادا کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے اور ہمیشہ کے لئے بتہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن فاطمہ اپنے نام سے ان کا نام الگ کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ وہ ابھی تک فاطمہ زبیر ہی ہیں۔ اختر بھی اس سماجی وفاداری کے مخالف نہیں ہیں۔

فاطمہ زبیر کی دو لڑکیوں اور دو لڑکوں کے نکاحی والد زبیر ہیں۔ ان لڑکوں میں بڑے کا نام نثار پرویز ہے۔ اس کا ذکر صفیہ اختر کے خطوط میں کئی جگہ ملتا ہے۔ شباہت کے لحاظ سے یہ سرتاپا جاں نثار اختر ہی ہیں۔ وہی لہجہ میں نرمی آنکھوں میں وہی نیم غنودگی...

جاں نثار کی نئی شاعری اور شاعرانہ زندگی نے ان کے اردگرد نوجوان شاعروں کا حلقہ پیدا کر دیا ہے۔ ایوب مرزا، جہاں قدر، کالیکا پرشاد شرر، نثار پرویز اور دوسرے کئی شاعری کی نئی فضا پیدا کئے ہوئے ہیں۔ نشستوں میں غزلوں کے ساتھ گیت اور آزاد نظمیں بھی پڑھی جاتی ہیں۔ ان میں شرر اپنے ترنم کی وجہ سے زیادہ مقبول ہیں۔ جب پڑھتے ہیں چھا جاتے ہیں۔ کالج میں جاں نثار کے شاگرد ہیں۔ کلام پر بھی انہیں سے اصلاح لیتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو ان کی شعر گوئی پر شک ہے۔ وہ ان کے اشعار کو بھی جاں نثار سے ہی منسوب کرتے ہیں۔ آواز بڑی پرکشش ہے سامنے کے رومانی شعر، بے محابا پیرایۂ اظہار ہے جس محفل میں ہوتے ہیں۔ چہروں سے نقابیں سرکنے لگتی ہیں۔ ان سرکتی نقابوں میں ایک دو کے

ـانے بھی بنتے ہیں۔لیکن کوئی بھی خوش انجام نہیں ہوتا۔

بشر ریلوے پر کسی اچھی پوسٹ پر ہیں۔ کچھ دن سے ایک چہرہ بشر کی خلوتوں کو منوّر کرنے لگا ہے۔ چھوٹی بستیوں میں ایسے اجالے ـت جلد دوسروں پر روشن ہو جاتے ہیں۔ بشر اور لڑکی جس عمر میں ہیں اس میں مذہب سے زیادہ مقدس جسم ہوتا ہے۔ لیکن لڑکی کا باپ اسـ ـذہبی عمر کو بہت پیچھے چھوڑ چکا ہے۔ وہ جسموں کے درمیان مذہب کو پاکر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔۔۔۔

ـشہر کے باثر لوگوں میں ہے۔ اس اثر سے کام لیتا ہے۔ جو اپنوں سے براہ راست ٹکرانے کے بجائے ریلوے کے بڑے افسران کو کھلا پلا کر ـوا بنا لیتا ہے اور بشر کا تبادلہ کسی دور دراز علاقے میں کروا دیتا ہے۔ نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری۔۔۔!

ـڑکی کچھ دن رو پیٹ کر والدین کی پسند سے شادی کرنے پر راضی ہو جاتی ہے اور ایک دو بچوں کے بعد ذہنی طور سے اپنے شوہر سے ـرب ہو جاتی ہے۔

لیکن بشر ہمیشہ کے لئے شاعری سے دور ہو جاتے ہیں۔۔۔۔

ان کے ملنے جلنے والوں کا حلقہ بھی بدل گیا ہے۔

دوپہر کے وقت سب سوئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ندّا آہستہ سے کھسک جاتے ہیں۔ گھر سے تھوڑی دور سڑک کے نکڑ پر ایک پنجابی سردار نے بچوں کے کھیل کے سامان کی دوکان کھولی ہے۔ رنگ برنگے کھلونوں کے علاوہ ہاکی، بلے، گیندیں، فٹ بال بھی وہاں بکتی ہیں۔

دوکاندار مضبوط بدن کا ادھیڑ عمر کا آدمی ہے۔ اس کی دلچسپ باتیں اور دوکان کے سامان کی کشش ہر وقت محلے کے بچوں کو وہاں جمع ـلتی ہے۔ وہ بچوں کو چھوٹے موٹے تحفوں سے بھی نوازتا رہتا ہے۔ کبھی کسی کو چاکلیٹ تھما دیتا ہے۔ کبھی کسی کی کسی بات پر خوش ہو کر گیند ـے دیتا ہے۔

اس کے پاس ایک پرانا البم ہے جسے وہ اکثر موڈ میں آکر بچوں کو دکھاتا ہے۔ اس میں وہ کئی جگہ لنگوٹ باندھے باکستی لڑتے دکھائی دیتا ہے۔ ـم دکھاتے ہوئے اس کی کمنٹری بھی چلتی رہتی ہے۔

گاما پہلوان کا کیا کہنا۔ وہ تو دھرتی پر بھگوان کا اوتار تھا۔ دنیا کے سارے پہلوانوں میں نمبر پہلا تھا۔ ان کا ایک دسمبر کے دنوں میں لندن کشتی ـے گئے۔ وہاں ایک دن سویرے ململ کے باریک کرتے میں سڑک پر ٹہلنے نکلے تو انگریزوں کی بھیڑ لگ گئی۔ ٹھنڈی سردی میں صرف ایک باریک کرتے میں ـوان کو دیکھ کر وہ حیرت میں تھیں۔۔۔۔۔!

اس کی کھلائی بھی کیا تھی۔ دو بکروں کی یخنی روزانہ، دن بھر ایک دو کلو بادام چبانا، دودھ بالٹی بھر کر چڑھانا۔۔۔۔ اصلی گھی کو پانی کی طرح پیـ ـا اور ورزش کے پسینے سے چٹکی میں ان سب کو پچانا۔۔۔ بچوں کے ذہن میں گاما، کہانی کے دیو کی طرح ابھرتا ہے۔ آپ تو ان سے ملے ہوں ـگے۔۔ ایک بچہ ہاتھ میں مگدر لئے ایک چھوٹے قد کے موٹے آدمی کو دیکھ کر پنجابی سے پوچھتا ہے۔

ـلے کیوں نہیں! میں انہیں کے اکھاڑے کا ہوں۔ ان سے ہاتھ ملاؤ تو یوں لگتا ہے جیسے لوہے کے شکنجے میں ہاتھ چلا گیا۔ ہم کبھی وہ اکھاڑے ـرنے پٹھوں سے کس بل بھی کرتے تھے۔

سارے بچے چپ چاپ دیر تک ان کی باتوں میں کھوئے رہتے ہیں۔ ملّا جی کا چھوٹا لڑکا جمیل بچوں میں سب سے زیادہ توانا ہے۔ وہ دو ـان پر ـنے بیٹھے ہی اسے ایک دو داؤ پیچ بھی سکھاتے ہیں۔ جن کو وہ ان کے سامنے ہی دوسروں پر آزماتا ہے۔ پنجابی اس کی ہر اچھی کامیابی پر اُسے کچھ ـکچھ انعام دیتے ہیں۔

ان سب باتوں کی وجہ سے جمیل کو پہلوانی سیکھنے کا شوق ہو گیا ہے۔ ندّا اور جمیل کو لے کر پنجابی خود اکھاڑے جاتے ہیں۔ ندّا تو ایک دو بار ـاں کے غصہ کرنے پر رک جاتے ہیں۔ لیکن جمیل ہر شام کو وہاں جاتا ہے۔

ہر روز کی ورزش نے اس کی بھوک اور پیاس بڑھا دی ہے۔ ملّا جی کے یہاں سب کو گن گن کر روٹیاں دی جاتی ہیں۔ ان کی محدود آمدنی ـھر کے ایک فرد کی بڑھتی ہوئی بھوک پر جھنجھلانے لگتی ہے۔ کھانے کے وقت جمیل کو روز ماں کی ڈانٹ پھٹکار کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ملّا جی گھر کا

نار کے ساتھ لوٹ کر کھانے بیٹھتے ہیں۔ لیکن ان کے حصے کی دو روٹیاں چوری ہو چکی ہیں۔ جمیل کھا چکا ہوتا ہے۔ ملّاجی طیش میں آ کر اسے حلاتے
۔ موسی کو ٹرن ٹارٹ ... ہیں۔ دونوں لڑکے اور ریڈیو میں لڑکی بے بسی سے ماں کو روتا چلاتا دیکھتے ہیں۔ جمیل ان کو بچانے کی کوشش کرتا ہے اور
جرم کی سزا میں گھر سے نکال دیا جاتا ہے۔ ۔ ۔ دو دن تک وہ غائب رہتا ہے۔ ماں اُدھر اُدھر پڑوس میں اپنا دکھ سناتی رہتی ہے۔ تیسرے دن
ندی کے کنارے وہ ایسے پڑا ہوا پایا جاتا ہے۔ پہچان کر ٹھنڈی سی سانس لے اللہ اکبر کہتے ہیں ... ! اور لاش لے کر گھر آ جاتے ہیں۔

جمیل کی مدفن کے لئے جو چندہ اٹھایا جاتا ہے اس میں سب سے بڑا حصہ پنجابی کا ہوتا ہے۔ اس کا اپنا زخم آج پھر سے ہرا ہو گیا ہے۔ ملکی
سم سماجی کو بیلوار سے سب روکتی ہے اور جمیل کو مریمی لے ڈوبتی ہے۔

املی کا پیڑ کئی دن سے اُداس ہے۔ اس کے ساتھ کھیلنے والے بچوں میں آج ایک کم ہے ۔۔۔۔ اور ملّاجی کی بیوی پڑوس میں بیٹھی لالالا
نہیں یہ کہہ رہی ہیں۔ اس نے مر کر سب کو آرام سے کر دیا ہے۔ اب ملّاجی روز کی طرح سے چیخ و پکار کرتے ہیں نہ مارتے پیٹتے ہیں ... بڑے کو
۔ی کی دکان پر بٹھا دیا ہے۔ کچھ دن میں چار پیسے وہ بھی لانے لگے گا۔۔۔۔۔!!

جمیل کو خواجہ صاحب کی درگاہ کے قبرستان میں دفنا دیا گیا ہے۔ وہاں کی زمین دوسری جگہ سے مہنگی ہے لیکن مرتضیٰ حسن کی سفارش سے
رعایت کر دی گئی ہے۔

خواجہ صاحب کی درگاہ کو گوالیار میں ہندو مسلم اشتراک کا مقدس مقام مانا جاتا ہے۔ ہر جمعرات کو یہاں ایک میلہ لگتا ہے۔ درگاہ کے باہر کھانے
، مذہبی کتابوں اور کھلونوں کی کئی دکانیں لگ جاتی ہیں۔ شہر میں یوں تو اور بھی مزارات ہیں لیکن اس درگاہ سے عوام کی وابستگی زیادہ ہے۔ بڑے
میں پھیلی ہوئی درگاہ کے عقیدت مند بھی زیادہ ہوتے ہیں۔

مزار کے اردگرد پتھر کی جالیاں ہیں۔ ان جالیوں میں بے شمار ڈوروں میں پرچے بندھے ہیں۔ ان پرچوں میں حاجت مندوں کی مراد اور
لکھے ہوتے ہیں۔ خواجہ کے پاس ان سب کا حساب ہے جو درگاہ کے سجادہ نشین اپنے رجسٹر میں درج کرتے رہتے ہیں۔ انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ
ن باہر کی پیٹی میں کتنے پیسے ڈالتا ہے۔ طوائف، چور، سود خور سب کا پیسہ اس پیٹی میں آکر پاک صاف ہو جاتا ہے۔ مزار کے قریب ہی ایک
باوڑی ہے۔ اس میں برسوں کی خاک دھول جمع ہے۔ اس کا پانی کبھی کم نہیں ہوتا۔ جتنا کم ہوتا ہے اس سے کچھ زیادہ ہی اس میں بھر
ہے۔ اس کی صفائی کا کوئی انتظام نہیں ...! پانی سفید سے مٹ میلا ہو چکا ہے۔ لیکن اس کی شفایابی ہنوز برقرار ہے۔ ہر دکھ بیماری کی
ایک دو چمچے کافی ہوتے ہیں۔ چڑھاوے، قیمتی چادریں اور تبرکات عقیدت مندان رات دن نذر کرتے ہیں۔ ان سب کو پہلے سجادہ نشین اپنے
سے چھو کر شرفِ قبولیت بخشتے ہیں۔ سرکاری وقف سے ایک بڑی آمدنی بھی درگاہ کے لئے مقرر ہے۔ اس کے علاوہ کئی زمینیں ہیں ....

کہتے ہیں گوالیار کی گدی سندھیا کو ایک صوفی منصور علی شاہ کی دین ہے۔ راج گھرانے میں مسلم بزرگوں کے مزاروں سے عقیدت اسی روایت
سلسلہ ہے۔ عرس کے دوران مہاراجہ درگاہ پر حاضری دیتے ہیں۔ اس کارِ خیر میں ان کے ساتھ وزیر اور درباریوں کی بھیڑ بھی ہوتی ہے۔ وہ
سے ننگے پاؤں اتر کر درگاہ میں داخل ہوتے ہیں۔ راجہ کو دیکھ کر پرجا میں بھی عقیدت پیدا ہو گئی ہے۔ جو بھی درگاہ کے قریب سے گزرتا ہے وہ
اپنا سر جھکا دیتا ہے۔ لیکن راجہ اس حاضری کو ایک موروثی رسم کے طور پر نبھاتے ہیں۔ ویسے خود ہندو مہاسبھا کی سربراہی فرماتے ہیں۔

مرتضیٰ حسن اپنی تمام رنگینیوں کے باوجود مذہبی مزاج کے ہیں۔ عرس کے دوران مشاعرہ کرتے ہیں اور ہر سال نئی منقبت کے ساتھ اس میں
یک ہوتے ہیں۔ اس درگاہ کے سجادہ نشین موٹے کپڑے کے لبادہ میں ملبوس ہر وقت تسبیح ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ بڑھاپے میں بھی کافی تندرست
سرخ و سفید ہیں۔ شہر کے لوگ ان کے بارے میں عجیب باتیں کرتے ہیں، کوئی ان کا تعلق طوائفوں سے جوڑتا ہے اور کوئی کم عمر لڑکوں سے ان
غیر اخلاقی رشتوں کی داستان سناتا ہے۔ (باقی آئندہ

منظر وہی، پیکر وہی، دیکھیں کوئی پیاسا بھی ہے
لشکر بھی ہے، خنجر بھی ہے، پہرہ بھی ہے دریا بھی ہے

اے آسماں، اے آسماں، پھر امتحاں پھر امتحاں
سینہ بھی ہے، نیزہ بھی ہے، شعلہ بھی ہے، خیمہ بھی ہے

وسوچنا ہے سوچ لے، رکنا ہے یا جانا تجھے
رخصت بھی ہے، مہلت بھی ہے، ناقہ بھی ہے رستہ بھی ہے

کچھ پیچ و تاب وہائے ہو، اے دل ہمیں دکھلا کر تو
قیدی بھی ہے، وحشی بھی ہے، زخمی بھی ہے زندہ بھی ہے

شفتگاں، کیا چاہئے اس حرف کے کشکول میں
نعرہ بھی ہے، نالہ بھی ہے، نوحہ بھی ہے، نغمہ بھی ہے

صدیوں سے ہے اک معرکہ، لیکن یہ سر کا روقا
قائم بھی ہے، دائم بھی ہے، برحق بھی ہے، برپا بھی ہے

◆

ایک طریقہ یہ بھی ہے جب جینا اک ناچاری ہو
ہاتھ بندھے ہوں سینے پر، دل بیعت سے انکاری ہو

جشنِ ظفر ایک اور سفر کی ساعت کا دیباچہ ہے
بزم طرف برپا بھی رہے اور کوچ کی بھی تیاری ہو

دائم ہے سلطانی ہم آزاد دلاں خانہ بر دوشوں کی
برق و شرر کی مسند ہو یا تختِ بادِ بہاری ہو

چشمِ طلب کو منظرِ شب میں اکثر ایسا لگتا ہے
خاکِ گزر کے پیچھے جیسے پیکِ سحر کی سواری ہو

ہم تو رات کا مطلب سمجھیں خواب، ستارے، چاند، چراغ
آگے کا احوال وہ جانے جس نے رات گزاری ہو

◆

برا جسم اور کہیں، میرا خیال اور کہیں
بہ کو لے جائے گی یہ موجِ وصال اور کہیں

یا ہوا ہے کہ ترے شہر میں ملتی ہی نہیں
نیشۂ دل کے سوا گردِ ملال اور کہیں

یرِ افلاک ستاروں کا سفر جاری ہے
ب کے نکلیں گے ہم اے شامِ زوال اور کہیں

بھ اسی دشت پہ موقوف نہیں تیرِ ستم
ندگی ہے تو ہدف ہوں گے غزال اور کہیں

ورتک آئینے ویران ہیں آنکھوں کی طرح
ھونڈنے جائیے اپنے مہ و سال اور کہیں

ہم ترے حرفِ دل آزار سے خوش ہیں جاناں
وں بھی ہوتی ہے کہاں پرسشِ حال اور کہیں

◆

ندی سے پھول نہ گنجِ گہر نکلتا ہے
جو طشتِ موج اٹھاتا ہوا اک سر نکلتا ہے

لہو میں غرق ہمارے بدن کو سہل نہ جان
یہ آفتاب ہے اور ڈوب کر نکلتا ہے

جراحتیں مجھے کارِ رفو سکھاتی ہیں
مرا عدو ہی مرا چارہ گر نکلتا ہے

زمین پھر بھی کشادہ ہے بال و پر کیلئے
کہ آسمان تو حدِ نظر نکلتا ہے

کبھی جو بند ہوں آنکھیں تو شب کے زنداں میں
عجیب سلسلۂ بام و در نکلتا ہے

◆

اک تماشہ ہے کہ آشفتہ سری میری ہے
غم کسی اور کے ہیں نوحہ گری میری ہے

کچھ مرے پاس بھی ہے، خاکِ مسافت ہی سہی
ملک تیرا ہے مگر دربدری میری ہے

طائرِ بام تجھے اوروں کے انجام سے کیا
آسماں میرا ہے، بے بال و پری میری ہے

عکس ہو جاتی ہے دنیا مرے آئینے میں
اور اس کام میں کیا خوش ہنری میری ہے



عظمت منزل۔ حیدر مرزا روڈ۔ گولا گنج لکھنؤ

عرفان صدیقی



مہدی جعفر
ریڈ ۲۳، سروجنی نگر، نئی دہلی ۲۳ ۱۰

# کہانی یا افسانہ

افسانہ ایک اہم صنفِ سخن ہے۔ یہ افسانہ ایک مرحلے سے EVOLVE ہو رہا ہے۔ یہاں EVOLVE [ارتقاء] کا لفظ ڈارون کی اصطلاح میں نہیں استعمال کیا گیا ہے بلکہ برآمد ہونے، نکل آنے یا طلوع ہونے کا مفہوم لیے ہوئے ہے۔ ارتقاء توسیع سے بھی مختلف ہے۔ ان دونوں صورتوں کو خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ افسانے سے میری مراد جدید افسانہ ہے۔ یہی افسانہ EVOLVE ہو کر سامنے آیا ہے۔ اگر جدید افسانہ ترقی پسندی کی توسیع ہوتا تو یقیناً پریم چند اپنے افسانے "کفن" کو مجموعے سے خارج نہ کر دیتے۔ انہوں نے ایسا اس لیے کیا کہ "کفن" جیسے جدید افسانے کی ادبی شکل اپنی ارتقائی صورت میں کسی نظریے کی ارتقائی شکل نہیں بن سکی تھی۔ اگر نظریہ الجھائے رکھتے تو افسانہ زیادہ سے زیادہ نئی ٹکنیک کا نمونہ بن سکتا ہے پھر اور تخلیق کا آئینہ نہیں۔ علی عباس حسینی کا ایک افسانہ "مصنف" ہے جس میں کہانی کا مجموعی تاثر توڑنے کا کام چابک دستی سے انجام دیا گیا ہے۔ افسانے میں ہی کہانی کو ہر جگہ پاش پاش کیا گیا ہے۔ صاف دیکھا جا سکتا ہے کہ یہ افسانہ اپنی اصل میں افسانہ ہے، کہانی کے فارمولے کی پیروی نہیں۔ "مصنف" میں کہانی کی ہیئت شکنی کی گئی ہے جو درحقیقت ایک نئی چیز ہے۔ اس برتاؤ کو جدیدیت کے عمل تعبیر کرنے میں چنداں مضائقہ نہیں۔ یہاں جدیدیت کا سراغ ملتا ہے۔

افسانے کی جدید خصوصیتیں آہستہ آہستہ سامنے آئی ہیں۔ "انگارے" کی جدید تخلیقات اس کا سراغ دیتی ہیں۔ سجاد ظہیر کا افسانہ "نیند نہیں آتی" ہی لے لیجیے۔ اس میں شعور کی رو کی ٹکنیک برتی گئی ہے۔ بعد میں جیل کر دیا۔ یا بھی جدیدیت پس منظر میں۔ منٹو، بیدی، کرشن چندر، ممتاز مفتی، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی وغیرہ نے بھی اپنے افسانوں کے درمیان کبھی کبھی اور کہیں کہیں تخلیقی ندرت سے کام لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں بھی جدیدیت کی غیر شعوری جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ مثالیں ضروری نہیں۔ ان کے دور میں جدیدیت کے سوتے نیچے ہوئے تھے اور اکثر یہاں وہاں پانی نکل آتا تھا۔

اگر میں یہ کہوں کہ افسانہ اس طرح سے کہانی نہیں ہے جس طرح سے جدیدیت ترقی پسند نہیں ہے تو بات نہیں بنتی۔ میں جدید افسانے اور افسانے میں کوئی فرق روا رکھنا نہیں چاہتا اور پر زور الفاظ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ افسانے کا ٹکراؤ ترقی پسندی سے نہیں بلکہ کہانی سے رہا ہے۔ جہاں تک جدیدیت اور ترقی پسندی کا تعلق ہے افسانے کی جدید شکل دونوں حلقوں میں قابلِ قبول ہے۔ اگر نہیں ہے تو ہونی چاہیے۔ حقیقی افسانے کو جب خدا اپنا جاتا ہے اور سورۂ یوسف کی صورت میں اس کا جزو بنا ملتا ہے تو افسانوں حقیقت کو ترقی پسندی یا جدیدیت قبول ہونا ہی کر سکتی۔ رہا کہانی کا معاملہ تو وہ ایک مدت سے اپنی جدا اور سبق آموز والی حیثیت کھوتی جا رہی ہے۔ اس طرح اپنی صنف کو کم کر رہی ہے۔ کہانی اگر کچھ ہے تو صرف اپنے تحیر، مسرت اور دلچسپی کو زندہ رکھنے کا باعث۔ یہ آج بھی کہانی اور افسانے کی قدر مشترک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانے کو کہانی اور کہانی کو افسانے کے نام سے پکارنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی جاتی۔ دونوں میں فرق بہر حال ہے۔ جب کہ افسانے میں کہانی ضم کی جا سکتی ہے، افسانہ ایسا فارم ہے جس کے وسیع تر دامن میں نوع بہ نوع صورتیں، کیفیات، تاثرات اور اسالیب کے لیے وافر گنجائش نکلتی ہے۔ ایسی کیفیات اور اسالیب جن کے لیے کہانی کا فارم ناکافی ہے۔ ایسا افسانہ جس میں کہانی ضم نہ ہو پائے شوکت حیات کے مطابق "کہانی" کہلائے گی۔

جیسے جیسے افسانے کی جدیدیت نمایاں ہوتی گئی ہے ۔ وحدتِ تاثر اس کی شناخت بن گئی ہے ۔ بلراج مین را ، انور سجاد ، بلراج کومل، شوکت حیات اور حمید سہروردی وحدتِ تاثر کا اچھا نمونہ ہیں کہانی پن کا نہیں ۔ البتہ جوگیندر پال اپنی کہانیوں میں کسی حد تک کہانی پن لانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ عصری اظہار اثرات کی ایک مجموعی صورت نیوز کرنا چاہتا ہے ۔ اس لیے کہ افسانوی عمل تجزیاتی نہیں بلکہ تشکیلی ہے ۔ ظاہر ہے اگر فن کار چوکس نہیں ہے تو افسانے میں کئی طرح کے تاثرات شامل کرنے کی ہوس ایک طرح کا ڈھیلا پن یا بے ربطی جنم دے سکتی ہے ۔ محض تاثرات کا ڈھیر لگانا خوبی نہیں ۔ خوبی تو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب منتخب تاثرات کھپتے ہیں ، ایک طرلق کار کے طور پر ان کا تفاعل ہوتا ہے ، وہ ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے ہیں یا / اور ایک ، دوسرے کی جمالیات کو فزوں تر کرتا ہے ۔ تاثرات کا ذخیرہ دکھا کر چونکانا الگ ہے تاثرات کی جلوہ آرائی الگ ۔ پہلی چیز افسانے کی تکنیک ہو سکتی ہے اور دوسری خود افسانہ ۔

سریندر پرکاش اور انور عظیم کے افسانے "بازگوئی" اور "مردہ گھوڑے کی آنکھیں" وحدتِ تاثر کے بجائے مجموعۂ تاثرات کا نقش پیش کرتے ہیں جن میں تاثرات کی وحدت کے درمیان کئی تاثرات برتے گئے ہیں ۔ ناول کی سطح پر آئیے تو انور سجاد کا "خوشیوں کا باغ" مجموعۂ تاثرات کی اچھی مثال ہے ۔ قرۃ العین حیدر کے افسانے " قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے" میں انیس ، دبیر ، اقبال وغیرہ کے مذہبی نظریاتی تاثرات کو افسانوی پس منظر میں بکھیرنے کی کاوش اچھی ہے ۔ کئی طرح کے تاثرات ان شعراء کی نظموں کے توسط سے ضم کیے ہیں ۔ یہ تاثرات بنے بنائے دائرے کے چھوٹے حصے ہیں جن سے افسانے میں جان ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ البتہ افسانوی فن تو وہیں پتہ چلے گا جب اپنے قد آور تاثرات پیدا ہوں اور اپنی پوری شدت کے ساتھ خود ایک بڑا دائرہ وحدت خلق کریں ، محض دوسروں کے دائرے میں قید ہو کر نہ رہ جائیں ۔ افسانویت کے معنی یہیں سے ابھریں گے ۔

جملہ تاثرات کا باہم دگر ٹریٹمنٹ جدید افسانوں میں اکثر غیر شعوری رخ سے نظر آتا ہے ۔ مثلاً رشید امجد کے اکثر افسانوں میں افسانوی تاثر ، تصویر کشی اور شعری تاثر کا تخلیقی انضمام ہے ۔ اقبال مجید کے افسانے "ایک حلفیہ بیان" میں تاثرات کا اختلاط کہانی پن اور ڈرامائیت کے ادغام سے ہوا ہے ۔ نیر مسعود "خواب ، علامت اور بیانیہ امیجری کی پیوستگی سے افسانوی تفہیم پیدا کرتے ہیں ۔ جب کہ خالدہ اصغر کے یہاں حسیاتی / محسوساتی امیجری اور منظراتی بیان کا باہم اتصال ہے ۔ کبھی کبھی اردو افسانے میں ایک دوسرے کے مخالف اثرات کچھ اس طرح تفاعل کرتے ہیں کہ اینٹی اسٹوری کی شکل نظر آتی ہے جس میں منفیت اور لامرکزیت بڑی اہم ہیں ۔ اسی طرح چند دوسرے افسانہ نگار بھی موجود ہیں ۔

کہانی عموماً آغاز ، انجام اور وسط کے مثلث سے بنتی ہے ۔ بہت ہوا تو ایک زاویہ کم ہو گیا ۔ کہانی کے برخلاف افسانے میں آغاز ہی آغاز ، انجام ہی انجام یا وسط ہی وسط یا محض ایک نقطہ ہی ہو سکتا ہے ۔ یعنی محض صورت حال ، کوئی واقعاتی تصادم نہیں ۔ ظاہر ہے افسانے کے لیے واقعاتی انتہا کا ہونا ضروری امر نہیں ۔ وہ برانگیختگی یا انجماد جیسے حال میں بھی جی اٹھتا ہے ۔ محض سچویشن کی بنیاد پر بھی افسانہ بن جاتا ہے ، جس میں تناؤ اور سکون یا یا شدت اور عدم شدت کی دھوپ چھاؤں دیکھی جا سکتی ہے ۔ اقبال مجید کا افسانہ "پیشاب گھر آگے ہے" تناؤ والی سچویشن کو فزیالوجیکل ٹنشن میں بدل کر پیش کرتا ہے ۔ اچھی زبان اور پرقوت بیان کے ساتھ قاضی عبدالستار کے یہاں رنگوں جیسی لہروں کا بہتاؤ ہے درحالیکہ وہ واقعہ کی بنا پر افسانہ لکھتے ہیں ۔ سریندر پرکاش کا "تلقارمس" ذہنی سچویشن کا افسانہ ہے ۔ انور عظیم ، کلام حیدری ، رشید امجد ، اعجاز راہی ، شوکت حیات ، حمید سہروردی ، شہنشاہ مرزا اور دوسروں نے اکثر واقعے سے گریز کیا ہے ۔ واقعے پر مبنی جدید افسانے انور سجاد ، خالدہ اصغر ، شفق ، محمد منشا یاد ، مرزا حامد بیگ ، احمد داؤد ، انور خان ، علی امام نقوی ، سید محمد اشرف ، سلام بن رزاق ، قمر احسن ، کمار پاشی اور دوسرے فن کاروں کے یہاں زیادہ ملیں گے ۔ مگر ان میں زیادہ تر لوگ واقعے کو وہ اہمیت نہیں دیتے جو صورت حال کو دیتے ہیں ۔ علامتی طرز میں لکھنے والے مظہر الزماں خاں ، حسین الحق اور دیگر فن کاروں کے یہاں بھی قصہ یہی ہے ۔

جہاں تک امکانات کی جستجو کا تعلق ہے اس کا قرعہ فال بھی جدید افسانے کے نام نکلا ۔ فن کار نے اپنے فن کو کبھی ذاتی اور کبھی عالمی کرب سے ہم آہنگ کیا ۔ عالمی اعتبار سے محمد عمر میمن کے استعاراتی اور تلمیحی افسانے خاص اہمیت رکھتے ہیں ۔ قمر احسن نے "اسپ کشت مات" لکھا جس میں علامتی انداز میں بمباری ، پچھلی نسل سے دبی دبی برانگیختگی اور نئی نسل کی صحیح احساساتی اور ذہنی صورتِ حال سمجھنے کی ذہانت صاف نظر آتی ہے ۔ شفق نے "کابوکا انگ" لکھا ... تمثیل خلق کی ۔ احمد ہمیش نے "کہانی مجھے لکھتی ہے" کے توسط سے سوانحی کرب



صادق

## دو نظمیں

✿

خوب صورت آنکھوں والی لڑکی
اپنے نوزائیدہ خوابوں کو
ذہن کے غاروں میں چھپا دو ۔
انھیں زمین پر مت چھوڑو
زمین درندوں کا مسکن ہے
وہ انھیں پھاڑ کھائیں گے ۔
نہیں، انھیں آکاش پر مت اڑنے دو
بلندیوں پر، بھوکی چیلوں اور
گدھوں کے غول منڈلا رہے ہیں ۔
نہیں نہیں ، انھیں سمندر میں بھی مت چھوڑو
اس کے کناروں پر ان گنت نہنگ ہیں
اور گہرائیوں میں آکٹوپس
....لیکن ذہن کے غاروں میں بھی
مکڑیاں ہوں گی
کہیں وہ اُن پر جالے نہ بُن دیں !

✿

اپنی آنکھ کے تل میں
سما جانے والے آکاش پر بھروسہ نہ کرنا
وہ سورج کو گھنے بادلوں میں چھپا کر
آنکھ کے تل سے نکل جائے گا
اور جاتے جاتے
ایک ننھی سی بدلی چھوڑ جائے گا
جسے اپنے اظہار کے لیے
تمھاری آنکھوں کا راستہ پسند ہے
بدلی کو راستہ مت دینا
کہیں ایسا نہ ہو کہ سمندر مچل اُٹھے
وہی، جو ایک بار
تمھاری آنکھ کے تل میں سما گیا تھا
ہاں، خوابوں پر بھروسہ کر سکتی ہو
خواب بڑے معصوم ہوتے ہیں
کسی کو دھوکہ نہیں دیتے
دوسروں کے گناہوں کے کفارے کی خاطر
کانٹوں کا تاج قبول کر لیتے ہیں
صلیب پر چڑھ جاتے ہیں
لیکن خدا نہیں مانے جاتے ۔

● اے۔جی ۲/۱۰۴ سی، وکاس پوری، نئی دہلی - ۱۸



مقدر حمید

۲؍سی/۲۰۶، آشیانہ، ماپ خان نگر، مرول اندھیری (ایسٹ)، ممبئی ۰۵۹ ۴۰۰

# اڑان

مشترک بالکنی میں قدیم طرز کا پیتل کا پنجرہ اور اس پنجرے میں سر نیوڑھائے سوچ میں غرق لال کنٹھی والا طوطا۔ دس بائی دس کے دو کمروں اور مالو چوں پر مشتمل پرانی چال میں یہ ایک گھر، یوں تو سناٹوں میں ڈوبا رہتا لیکن بھرا پرا ہو جاتا جب جب مٹھو ترنگ میں آکر بولتا۔ وہ نام جو نسلائے ہوئے رفتہ رفتہ بڑے ہو گئے اور پھر اڑانیں بھر کر کہیں اور اپنے اپنے ٹھکانے بنا لیے۔ وہ جو اب اس گھر میں نہیں، ان کے بیتے دنوں کے معمولات اور مشاغل مٹھو میاں کی چہک کے ساتھ جیسے دہرائے جانے لگے "تنو منو اٹھو اٹھو۔ ادا مٹھو کو کھانا دو۔ اکو پاپا آئے۔ پاپا آئے ..." مٹھو بولتا اور یہ گھر پر شور ہنگاموں کی رونق میں سانسیں لینے لگتا۔ آوازیں جو کبھی اس گھر کا حصہ تھیں۔

"میرے اسکول کا وقت ہوا، ناشتہ لگاؤ۔"

"میرے موزے نہیں ملتے۔ کہاں ہیں؟"

"یہ غسل خانے میں کون گھسا ہے گھنٹوں سے۔"

"ارے گملے میں کسی نے پانی ڈالا کہ نہیں!"

"ذرا یہ چادر بالکنی میں تو ڈال آؤ۔"

مٹھو بھولے بسرے نام دہراتا اور اس کی رٹ کے ساتھ کئی آوازیں جاگ پڑتی تھیں پھر مٹھو چپ ہو جاتا یک بیک اور گھر خاموشیوں میں ڈوب جاتا۔ یہ نہیں کہ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ دو ایسے مکیں جو گھر میں تھے بھی اور نہیں بھی۔ وہاں ہوتے ہوئے بھی جو اس منظر کا حصہ نہیں بنتے تھے، اجنبیوں کی طرح الگ الگ اور اکھڑے اکھڑے سے۔ ایک چھوٹی سی بچی اور ایک بے حد طرح دار حسین عورت جو اس بچی کی ماں تھی۔ یہ دونوں ماں بیٹی ٹکر ٹکر گھر کی دیواروں کو دیکھتیں اور بڑے اچنبھے سے مٹھو میاں کی زبانی ان ناموں کی گردان سنتیں۔ وہ عورت ان لوگوں کو اور ان ناموں کو پہچاننے کی کوشش کرتی جن کی صورتوں اور اس عورت کی نگاہوں کے بیچ گہری دھند تھی۔ ان آوازوں کا پیچھا کرتے کرتے کبھی راستہ بھٹک کر وہاں پہنچ جاتی، جہاں سے وہ مسلسل دوڑ رہی تھی۔ تیز اور تیز۔ یہاں تک کہ اس کا دم پھول گیا تھا، چہرہ گرد آلود ہو گیا تھا، ٹانگیں شل ہو چلی تھیں اور تلووں میں آبلے آگئے تھے۔

"جنم جلی۔ جانے کس منحوس گھڑی میں اس کو بہو بنا کر لائے تھے۔ آتے ہی خصم کو چٹ کر گئی اور جانے کس کس کو کھائے گی۔"

اس نے تو ابھی اپنے مرد کو ٹھیک سے دیکھا بھی نہیں تھا۔ اس کی خوشبو پوری طرح اپنے میں بسا بھی نہیں پائی تھی کہ وہ اچانک ذرا دیر کو اس کی کوکھ میں ٹھہر کر لمبے سفر پر روانہ ہو گیا۔ وہ تو روئی بھی نہیں تھی۔ اس قدر اچانک، اتنی جلدی یہ سب ہو گیا تھا کہ ذہن صدمے اور صدمے کے رد عمل کے لیے تیار بھی نہ ہو سکا تھا۔

"جانے کب یہ بلا سر سے ٹلے گی۔"

اور پھر بلا ان کے سر سے ٹل کر میکے والوں کے سر پر سوار ہو گئی۔ ماں، باپ، بھائی، بہن، سب کی نظروں میں کھٹکنے لگی تھی وہ۔ یہاں بھی وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ آخر ایسا کیا ہو گیا کہ یہ پیارے پیارے میٹھے میٹھے رشتے زہر کی طرح کڑوے ہو گئے۔ کیوں؟ آخر کیوں؟ وہ چیخ اٹھی اور یہ چیخ اس کی کوکھ سے اچھل کر باہر آگئی۔ جس دن یہ واقعہ ہوا سارے گھر میں ایسی ماتمی فضا طاری تھی جیسے سارے کنبے کو موت سونگھ گئی ہو۔

چِلّا نہا کر وہ کھڑی ہوئی تو اور زیادہ نکھر گئی۔ راستے چاہے ٹیڑھے ہوں یا سیدھے سفر تو تکمیل کی جانب بہر حال جاری رہتا ہے۔ اس کا بدن نظر فریب سچائیوں کا مرقع بن گیا تھا کہ جو دیکھتا مسحور ہو جاتا۔ لیکن میکے میں وہ ایک بوجھ تھی جسے سب کے سب اپنے سر

سے جھٹک دینے پر تلے ہوئے تھے۔ لہٰذا جیسے تیسے اس کو ایک دوزخ رکے پَلّے باندھ کر گھر کے لوگوں نے اطمینان کی سانس لی۔ چلو بلا ٹلی۔

وہ رنڈوا تھا اور پہلی دو بیویوں سے اس کی کوئی اولاد بھی نہ تھی۔ بے حد تُند اور سخت مزاج آدمی تھا وہ۔ بچّی کو تو وہ بالکل پسند نہ کرتا لیکن اس عورت کو جو سر تا پا دہکتا شعلہ دکھتی تھی، موقع بے موقع اُدھیڑ کر رکھ دیتا۔ کسی درندے کی طرح۔ اور وہ چھت کو تکتے ہوئے، چت لیٹی سوچتی رہتی کہ دھوپ کے اس تھکا دینے والے سفر میں، یہ جو چھاؤں ہاتھ آئی ہے تو اس میں ٹھنڈی ٹھنڈی راحت کیوں مفقود ہے؟ ساری چبھن ہی چبھن کیوں ہے؟ ساری جلن ہی جلن کیوں ہے؟ وہ چت لیٹی اپنی آنکھوں سے، اپنے ذہن اور دل کی گہرائیوں سے، جسم و جاں کی تمام تر شدتوں سے سچی خوشی کی اس ذرا سی ٹھنڈک کو تلاشتی رہتی اور اس بیچ اس کا جسم اور اس کی روح خار دار جھاڑیوں سے الجھ، خراشوں سے نڈھال زخمی اور چُور چُور ہو کر رہ جاتی۔ بھلا بُرا جیسا بھی تھا، ابھی ٹھیک طرح سے وہ خود کو اس نئے ماحول میں بسا بھی نہ پائی تھی کہ ایک شام اس کا یہ سخت گیر کڑوا کسیلا اور غصیلا شوہر جلدی سے گھر آ کر ایسا سویا کہ پھر کبھی نہ اٹھا۔ وہ ایک بار پھر میکے میں بلا جن کر نازل ہو گئی اور اب تو اس کی شخصیت پر نحوست کی چھاپ لگ گئی تھی۔

"جہاں جاتی ہے خصم کھا جاتی ہے۔ اُجاڑ ماری۔ دو تو شکار ہو چکے۔ اب کس میں ہمت ہے کہ اس خوبصورت بلا کو گلے لگائے اور موت کو دعوت دے۔"

وہ جو نگاہوں کو خیرہ کر دینے والے شعلے کی طرح دہک رہی تھی چہ میگوئیوں، طعنوں اور تنہائیوں کے اتھاہ پانیوں میں ڈوب کر اندر ہی اندر بجھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ برف کی سل کی طرح ٹھنڈی اور سخت ہو کر رہ گئی۔ اب نہ خواہشوں کی کوئی چنگاری تھی نہ امنگوں کی پرواز۔ بس ایک خوف تھا، ایک دہشت تھی کہ جس نے سب کچھ منجمد کر کے رکھ دیا تھا۔ ایسے میں جانے کہاں سے آ کر شیخ جی اس کے سر پر سائبان کی طرح تن گئے۔

"لیکن شیخ صاحب کو کیا سوجھی؟ اور وہ بھی اس عمر میں؟ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں، اور یہ سب اسنا بے حد خوبصورت ہے وہ اور ایک بچی بھی ساتھ لائی ہے۔ چلو دو رنڈیوں کا سہارا تو ہوا۔ لیکن یہ حضرت کرتے کیا ہوں گے۔"

"ارے بابو پُرانی ہڈی ہے۔ اصلی گھی کی بنی ہوئی!"

شیخ صاحب اپنی نئی نویلی بیوی سے سخت پردہ کراتے تھے۔ وہ تو کبھی باہر نہ نکلتی، البتہ شام کو کبھی کبھار بچّی انگلی تھامے شیخ جی کے ساتھ نظر آجاتی۔ بچپن کے ننھے منّے اور تھکی ہوئی عمر کے لڑکھڑاتے قدموں کی ملی جلی چاپ گلی کی آوازوں میں شامل ہو گئی تھی۔ اور وہ جو کبھی کھولے بھٹے کھڑکی میں آن کھڑی ہوتی یا چلتے پھرتے بالکنی میں جھلک دکھا جاتی تو گلی کے لڑکوں کی گردنیں آسمان کی طرف تن جاتیں اور فلمی عشقیہ گانے بیک وقت کئی اسٹیشنوں سے نشر ہو کر فضا میں تیرنے لگتے۔ کچھ لوگ جو شیخ جی کے قریب تھے یا ذرا سے بے تکلف تھے اشاروں کنایوں میں پوچھ ہی بیٹھے۔ وہ مسکرا کر بولے "مجھے معلوم ہے یہ بات بحث کا موضوع بنی ہوئی ہے۔ آپ بھی یہی سوچ رہے ہیں نا کہ اس عمر میں کیوں اس بکھیڑے میں پڑا۔ سچ پوچھئے تو مجھ سے ایسا دکھ سہا گیا نہ اس کا دیکھا گیا۔ اس قدر بے سہارا ہو گئی تھی وہ بے چاری۔ میں نے سوچا اس کو سماجی تحفظ کی ضرورت ہے اور بس وہی میں اسے دے سکتا ہوں، سو میں نے دے دیا۔ باقی ضرورتوں کے سلسلے میں کچھ ایسے تلخ تجربے ہیں اس غریب کے، کہ وہ اس بات کے درمیان نہ ہونے پر بے حد خوش ہے۔ آپ یقین کریں نہ کریں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ایک انوکھی عجیب مسرت سے آشنا ہوئے ہیں ہم اور جو بھی بامعنی بے معنی رشتہ ہمارے بیچ ہے، اتنا پائیدار، اتنا مضبوط اور اتنا پیارا ہے کہ بیان نہیں کر سکتا!"

وہ ٹکر ٹکر گھر کی چھت کو دیواروں کو تکا کرتی اور پیتل کے بے حد پُرانے پنجرے میں قید مٹھو شیخ جی کے بیٹوں بیٹیوں، پوتوں نواسوں، نواسیوں کے نام اور معمولات کی گردان کرنے لگتا۔ اور سارا گھر وقت کے پہیے پر گھوم کر پُرانے موسموں کے دھندلکے میں گم ہو جاتا۔

"وہ لوگ دور جا بسے ہیں۔ خوش ہیں اپنی اپنی زندگی سے" شیخ جی اپنے کنبے کے بارے میں بتاتے۔

"آتے نہیں کبھی؟"

"نہیں آتے۔ شکلیں نہیں دکھاتے اپنی۔ خاص طور پہ اسے گھر لے آنے کے بعد سے تو لگتا ہے سخت ناراض ہیں مجھ سے۔"

چند پُرانے لوگوں کے سوا، بہت سوں نے مٹھو میاں کی زبانی ہی ان کے صرف نام سُنے تھے لیکن سوئم کے فاتحہ اور قرآن خوانی

والے دن وہ سب دیکھنے کو ملے۔ ان میں سے بیشتر چہرے شیخ جی کے تھے۔ پراپرٹی کے بٹوارے کے سلسلے میں بڑی تو تو میں میں ہوئی محلّے کے لوگوں نے بیچ میں پڑ کر چالیسویں تک سارے معاملات طے کر دیے۔ جوان بیوہ کے حصّے میں گھر کا کچھ سامان اور بینک میں جمع شدہ رقم آئی۔ گھر اور چھوٹی سی دکان جو کرایے پر اٹھا رکھی تھی، دونوں پر بیٹوں پوتوں نے قبضہ کر لیا۔ اس کو گھر خالی کرنا پڑا۔ لیکن مرحوم نے جتنا کچھ اس کے لیے چھوڑا تھا ان پیسوں سے وہ اپنے گاؤں جا کر اپنے لیے ایک چھوٹا موٹا گھر تو ضرور خرید سکتی تھی یا پھر یہیں شہر میں ایک آدھ کمرہ کسی پرانی چال میں کرایے پر مل سکتا تھا۔ لیکن اس نے کسی کو کچھ بتایا نہیں کہ اس کا منشا کیا ہے۔ کہاں جا کر رہنا چاہتی ہے وہ۔ کیا ازدواجی زندگی کی اتنی دوزخوں سے گزرنے کے بعد پھر کسی مجازی خدا کی پناہ ڈھونڈے گی یا اکیلے ہی اپنا سفر طے کرنے کی ٹھانی ہے۔ کوئی بولے، زبان کھولے تو کتنے سارے عقدے حل ہوتے نظر آتے ہیں لیکن خاموشی تو اسرار بن جاتی ہے اور تجسّس کو ہوا دیتی ہے۔ اس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ شبہات، قیاس آرائیاں، چہ میگوئیاں ابھی اب تو کفالت کا بھی انتظام ہے اپنی مرضی کا ڈھونڈے گی کوئی۔"

"اتنی ٹھوکروں کے بعد کون اس آگ میں کودے گا؟"

"چیز بھی تو ایسی ہے۔"

جتنے منہ اتنی باتیں۔ اور جواب میں اس کی بس ایک چپ۔ لوگ تڑپتے رہے یہ جاننے کو کہ اس کے من میں کیا ہے۔ اور وہ خاموش ان کی جھلاہٹ دیکھتی رہی۔

جس دن وہ رخصت ہو رہی تھی، اس کے چہرے پر ایک ایسا خالی پن تھا جو حادثوں کا شکار ہونے پر لاتعلّقی کی کیفیت سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ دلاسے سن کر بھی نہیں سُن رہی تھی۔ اپنے اردگرد بے شمار چہروں کو دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں دیکھ رہی تھی۔ چل پھر رہی تھی تو کچھ اس طرح جیسے نیند کے عالم میں۔ ایک ایک کر کے اس کا سارا سامان لاری میں لادا جا چکا تو اُس نے ایک بار پھر خالی خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور آگے بڑھنے لگی۔ اچانک اس کی نگاہ بالکنی میں ٹنگے مٹھو کے پنجرے پر ٹھہر گئی۔ وہ ٹھٹک کر پلٹی اور اس کے چہرے پر ایک نیا رنگ آگیا۔ وہ بڑے سکون سے مسکرائی، بالکنی سے پنجرا اتارا، پھر پنجرے کو ریلنگ پر ٹکا کر اس کا پٹ کھول دیا۔ پرندہ سہما سہما اندر ہی بیٹھا رہا، اس نے پُچکار کر مٹھو کو باہر نکالا وہ جھجکتا، رُکتا، پُھدک کر ریلنگ پر بیٹھ گیا۔ اُس نے ہش ہش کر کے بڑے پیار سے اڑنے کی ترغیب دینی شروع کی۔

مٹھو نے بے یقینی کے انداز میں بازو پھیلائے، پر تولے اور پھر جھکائی کھا کر پھڑپھڑاتا ہوا اچانک دور آسمان کی وسعتوں میں گم ہوگیا۔

سارے کا سارا مجمع دم بخود اس کارروائی کو دیکھتا رہا۔ تمام چہرے تصویر ہو گئے تھے، غیر متحرک اور جامد۔ تھوڑی سی دیر کو لگا وقت نے سانس روک لی ہے۔ سوائے اس چھوٹی سی بچّی کے، جس کے چہرے پر مسرّت کی کہکشاں نے دُودھیا اُجالے بکھار رکھے تھے۔ اور جو اپنی ننھی سی انگلی ٹھوڑی سے ٹکائے معصوم نظروں سے مٹھو کی پرواز کا پیچھا کرتے کرتے خود کہیں دور پہنچ گئی تھی۔

ماں نے مضبوطی سے بچّی کا ہاتھ تھاما اور زینے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ ❋

بقیہ صفحہ ۴۰ نارمل ڈلیوری

رحم اور بچہ دونوں کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ لیجئے یہ کنجی میرے چیمبر سے سرجری باکس لے آئیے—"

"مگر ڈاکٹر بابو—؟"

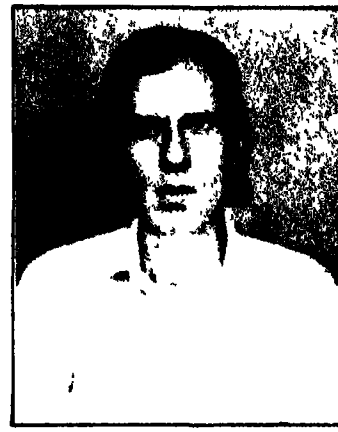
"آپ جانے سے کیوں ڈرتے ہیں— میرا چیمبر تو آپ ہی کے محلّے میں ہے—!"

"مگر آپ کا چیمبر تو—"

میں سمجھ گیا— مگر مجھے ابھی اسی وقت ایک سرجری نائیف چاہئے—"

"نہیں ڈاکٹر کو چھری مت د.. ..." یہ آواز قصّہ گو کی تھی— پوری بات وہ کہہ نہ پایا۔ شاید اس کے منہ پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا تھا۔

مجھے سرجری نائیف لا کر دیجئے، اس ماں کی زندگی اور آنے والے مہمان کی سلامتی کے لیے چھُری ضروری ہے۔ نارمل ڈلیوری کی سوچ خطرے کو گلے سے لگانا ہے سرجری باکس میرے گھر میں بھی ہے اس سے پہلے کہ کچھ ہو جائے آپ میں سے کوئی جائے اور فوراً اسے لے آئے۔ ایک شخص ڈاکٹر کے گھر کی طرف دوڑ گیا اور ڈاکٹر چھری کا انتظار کرنے لگا—!! ❋



## امان اختر

صرف رنگوں سے شناسائی میں رکھا گیا ہے
پھول سے چاندی کے گلدان کا رشتہ کیا ہے

کارخانے تو سبھی بند ہیں بجلی کے بغیر
پھر دھواں کیسا ہے یہ شہر میں جلتا کیا ہے

جب کوئی حادثہ ہوتا ہے تو دیکھ آتے ہیں
اور اب دید کے قابل یہاں ہوتا کیا ہے

ور اس گھر سے چھناکوں کی صدا آتی ہے
اور گلی سوچتی رہتی ہے کہ ٹوٹا کیا ہے

میرا کیا میرے لئے شہر میں سڑکیں ہیں بہت
تو بتا، تیرا شبِ ماہ ارادہ کیا ہے

● معرفت پروفیسر جی۔ ڈی۔ ایس تیمپخ پرشنکر یلا، اپارٹمنٹس بند گارڈن روڈ پونہ ۴۱۱۰۰۱

## یوسف عثمانی

مہر و وفا کے ہوتے نہیں چند باب یاد
جورِ جفا کی کرتے ہیں لیکن کتاب یاد

شاید اسی کو کہتے ہیں قربت کی انتہا
اپنا سوال یاد نہ اس کا جواب یاد

کتنا عجیب ربط ہے لذت کا درد سے
کانٹوں کو دیکھ کر مجھے آئے گلاب یاد

صورت تو اس کی بھول گیا ہے یہ دل مگر
اس کی عنائتیں ہیں ابھی بے حساب یاد

یوسف اسی کے ہاتھ رہی محفلِ غزل
"شعر سراج جس نے کیا بے حجاب یاد"

● اجنتا کلینک جے سنگھ پورہ، اورنگ آباد ۴۳۱۰۰۲ (مہاراشٹر)



## ذکی حیدر

ایک لمحہ کی خوشی اک شخص کا ملنا رہا
اور پھر تا زندگی اس بات کا رونا رہا

ہر شگوفہ کھل رہا ہے جیسے وہ آنے کو ہے
میں صبا کی آہٹوں پر عمر بھر بہلا رہا

لو چراغوں کی کترکر اٹھ گیا محفل سے کون
ہر پتنگے کے کلیجہ سے دھواں اٹھتا رہا

تتلیوں میں منعکس تھی اسکے قامت کی بہار
ہر شگوفہ آرزو میں پھول کی کھلتا رہا

گرم نظروں میں بلا کی سرد مہری تھی ذکی
جلنے والا آتشِ گل کی طرح جلتا رہا

● ۔ ڈور والی گلی، ترکاری منڈی
(چوک، لکھنؤ۔ ۳ (یوپی)



فیروز عابد

گورنمنٹ اُڑیا مڈل اسکول، ۴ حیات خان لین۔ کلکتہ ۔ ۹

# نارمل ڈیلیوری

قصہ گو تھوڑی دیر کے لیے رکا اور اس نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے سامعین کے چہروں کی طرف دیکھا۔ اسے ایسا لگا جیسے سب کے سب ہی لاتعلق سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ کسی کے چہرے پر بھی وہ تاثر نہیں تھا جو کہ وہ اپنی باتوں سے ان کے چہروں پر ابھارنا چاہتا تھا۔ کوئی جماہی لے رہا تھا اور کوئی انگڑائی۔ کوئی پہلو بدل رہا تھا تو کوئی باتیں کر رہا تھا۔ کسی بھی چہرے پر خوف اور غم کے آثار نہیں تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے قصہ گو کو اپنی آنکھیں دھندلی ہوتی محسوس ہونے لگیں۔ اسے خود اپنی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی لگی۔ سینے کے اندر اس کا دل بجھنے لگا لیکن وہ سنبھلا اور گویا ہوا،

اگر ایسے میں تمہارے چاقو کا پھل بجائے اس کے پیٹ میں اترنے کے تمہارے پیٹ میں اتر جائے تو تم کیا کروگے؟!

جناب جی ہمارے چاقو کا پھل اگر ہمارے پیٹ میں اتر گیا تو پھر سوائے موت کے اور کیا رہ جائے گا۔ ہم وہ چاقو اپنے پیٹ سے نکال کر کسی اور کے سینے میں گھونپنے سے رہے۔ ہمارے پاس تو چاقو نہ اب ہیں اور نہ پہلے کبھی تھے تو پھر کسی کے پیٹ میں اتارنے اور اپنے پیٹ میں پلٹ کر اتر جانے کا واقعہ ہم کیوں سنیں یا دہرائیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ صدیوں سے چاقو ہمارے پیٹ اور سینے میں اتارے جا رہے ہیں لیکن ہماری تعداد ہے کہ بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ قصہ گو نے جب یہ باتیں سنیں تو وہ تھوڑی دیر کے لیے چکرا گیا۔ اس نے سامعین پر بھرپور نظر ڈالی، نہ سمجھنے والے لوگ بھی اسے سمجھ دار نظر آنے لگے۔ اس نے ایک منٹ کے لیے سوچا بات کا رخ کس طرح موڑا جائے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک اور شخص نے کہا" بابو صاحب یہ لوگ کہانی سناتے سناتے آپ کہاں بھٹک گئے کہ مرنے مارنے کی بات کرنے لگے۔ ہماری سمجھ میں آپ کی بات ذرا بھی نہیں آئی۔"

تب ہی قصہ گو نے کہا" ہاں ہماری بات تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتی کہ تم لوگ بہت سیدھے سادے اور معصوم ہو۔ زندگی جس طرح بھی مل جائے تم اس سے سمجھوتہ کر لیتے ہو۔ تم بغاوت کے شعلہ اور اس کی طاقت سے ناواقف ہو۔ تم اپنی زندگی بلند کرنا نہیں چاہتے بلکہ وہ تمہارے پاس جس روپ میں آجائے اسے قبول کر لیتے ہو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ لوگ چاند اور ستاروں کی بات کر رہے ہیں اور تم ہو کہ بس....

سنیے صاحب، ہم نے آپ کا اپدیش سن لیا۔ بات کچھ سمجھ میں آئی اور کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ علاقہ جو آپ دیکھ رہے ہیں ایسے لوگوں سے آباد ہے جو صبح اٹھ کر کام میں جٹ جاتے ہیں۔ کبھی شام تک اور کبھی رات گئے تک کام کرتے ہیں اور پھر کبھی اچھا، کبھی روکھا پھیکا، کبھی بھرپیٹ کبھی آدھا پیٹ کھا کر دوسری صبح کا انتظار بغیر کسی منصوبے کے کرتے ہیں۔ یہاں سب ہی قسم کے لوگ ہیں۔ رنگ اور نسل، مذہب اور زبان سب کچھ الگ الگ ہوتے ہوئے بھی ہم ایک ہی نل سے پانی پیتے ہیں اور ایک ہی دودھ والے سے دودھ لیتے ہیں۔ چھری سے ہم سبزی اور ترکاریاں چھیلتے اور کاٹتے ہیں۔ چاقو کا نام ہم نے سنا ضرور ہے لیکن اسے اپنے پاس نہیں رکھتے اس لیے کہ جو چیز ڈھکنے میں بند کر کے یا موڑ کر رکھی جائے اسے ہم اچھا نہیں سمجھتے کیا اب بھی آپ کو کچھ کہنا ہے ــــ؟"

"واہ بھئی واہ آپ تو اچھا بہت اچھا بول لیتے ہیں۔ پڑھے لکھے آدمی معلوم پڑتے ہیں مگر آپ نے میری بات سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی اور آپ کے دفاع سے متعلق میں جو سمجھاؤ دینے والا تھا اسے آپ نے کاٹ دیا۔ آپ کو دوسرے لوگوں سے اپنا بچاؤ تو کرنا ہی ہے۔ آپ نے کیا یہ نہیں دیکھا کہ آپ لوگوں میں کوئی دوسرا نہیں ہے۔ آپ نے چھری کی بات کی' ارے بھائی سبزی کاٹنے والی چھری ہی تو کل رات کسی نے اس آدمی کے پیٹ میں اتار دی تھی۔ کیا آپ نے سنا نہیں کہ لاش کے پیٹ میں چھری اٹکی ہوئی تھی؟"

چہ میگوئیاں ہونے لگیں پھر ایک عجیب سناٹا چاروں طرف پھیل گیا۔ آنکھوں میں شبہے جاگنے لگے۔ مٹھیاں کسی جانے لگیں پیشانی پر بل پڑنے لگے۔ قصہ گو کا چہرہ چمکنے لگا — اس کی مٹھی کھل گئی۔ اس کی پیشانی بے شکن ہونے لگی۔ اس کے بدن کی رگیں شانت ہونے لگیں۔ ماحول پر اس نے آخری چوٹ لگائی۔ "آج کی رات آپ لوگ اپنے اپنے کھانوں سے فارغ ہونے کے بعد بستروں میں جائیں تو سوچیں اس بدلتے ہوئے آدمی کے پیٹ میں چھری کس نے اتاری تھی اور اس کی سزا کس کو ملنی چاہیئے۔"

ہر طرف بکھری ہوئی خاموشی اور گہری ہوگئی۔

قصہ گو نے مجمع پر بھرپور نظر ڈالی اور لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا آس پاس کے گھروں، دوکانوں اور کارخانوں کو تکتا ہوا اپنے گھر کی طرف نکل گیا۔

"تم کہاں چلے جاتے ہو — کہہ کر جایا کرو — آج پھر ایک لاش ملی ہے، مگر وہ کسی اور کی ہے — اس کے پیٹ میں بھی چھری گھسی ہوئی تھی۔ کمرے میں جاؤ آج بہو کے پیٹ کا درد کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا ہے۔ ڈر سے اسپتال نہیں گئی۔ کہیں کچھ ہوگیا تو — دائی نے کہا ہے، ویسے دوں سے ہے، کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا ہے — "

"ماں مجھے ابھی بہت کام ہے۔ بات ابھی تک بن نہیں سکی ہے"

"مگر بیٹا بہو کے لیے کچھ سوچ، کیوں ایسی ویسی بات کرنے لگا"

"اپنے مستقبل کو بچانے کے لیے تو ایسی ویسی بات کر رہا ہوں۔ تم اپنی بہو کو دیکھو میں آرہا ہوں — " قصہ گو پھر دوسری اور نکل گیا — مگر وہ جلد ہی واپس آگیا۔

"اچھا ہوا تو آگیا — بہو درد سے تڑپ رہی ہے — دائی نے آنے سے معذوری ظاہر کردی ہے — ؟!"

"ماں تم پڑوس میں جاکر کسی سے کہو کوئی انتظام کردے گا۔ میں بہت پریشان ہوں۔ میں کچھ نہیں کرسکتا — "

بموں کی آوازیں آنی شروع ہوگئی تھیں۔ بموں کی آوازوں کے ساتھ انسانوں کی آوازوں کا شور بھی شامل ہوگیا تھا۔ کچھ لوگ گھروں میں خاموش دبکے جا رہے تھے اور کچھ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتے ہوئے باہر کی طرف دوڑ رہے تھے۔ قصہ گو کی بیوی تڑپ رہی تھی۔ گاڑیاں بند ہوگئی تھیں۔ محافظ دستوں کی آمد نے کس کو مشتعل کر دیا تھا اور کسی کو اتنا خوف زدہ کہ پتہ کھڑکنے پر وہ لرزنے لگتا تھا۔

قصہ گو کی ماں گلی گلی، دروازے دوڑ رہی تھی۔ بہو کو درد سے کس طرح بچایا جائے۔ اس نے محلے کے ایک سنجیدہ با اثر بزرگ کو بہو کی ساری حالت بتائی۔ آوازوں کی بھیڑ میں اس شخص نے قصہ گو کی ماں کو بتایا کہ اسپتال جانا تو ممکن نہیں، ہاں فلاں گلی کے آخری موڑ پر ڈاکٹر صاحب ہیں مگر ان کو لایا کیسے جائے؟ سنا ہے ہمارے اپنے لوگوں نے ان کے گھر کا محاصرہ کر رکھا ہے اور وہ اپنے گھر کے اندر قید ہیں مگر ان کو لانے کی ذمہ داری کون لے گا — "

"کون ڈاکٹر صاحب — وہ ڈاکٹر صاحب — مگر وہ تو..... کیا وہ میری بہو کو بچا لیں گے نا نہیں نہیں ایسا نہیں ہوسکتا، وہ ایسا نہیں کرسکتے مگر یہ جو چاروں طرف آگ پھیلی ہوئی ہے۔ لوگ اپنے دامن میں آگ چھپائے گھوم رہے ہیں۔ کہیں ڈاکٹر صاحب نے میری بہو سے اس کا بدلہ لیا تو..... نہیں وہ ایسا نہیں کرسکتے۔"

"کیا ہوا تم کیا بڑبڑانے لگیں، بتاؤ ڈاکٹر صاحب کی سلامتی کی ذمہ داری کون لے گا؟"

"میں لوں گی بھیا — میں جاؤں گی ان کو لانے کے لیے — مجھے اپنے شوہر کا نام زندہ رکھنا ہے۔ مجھے اپنے بیٹے کی اولاد کو اپنے ہاتھوں سے پالنا پوسنا ہے۔؟!"

قصہ گو کی ماں، وہ سنجیدہ آدمی، کئی بڑوسی اور دوسرے کئی لوگ اس موڑ کی طرف چلے۔

"کہاں جا رہے ہیں — ؟ کیوں جا رہے ہیں؟ کیا کسی کا خون ہو گیا؟" آوازیں ان کے آگے پیچھے لپکتی رہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے مکان کے ارد گرد جو چہرے پہلے سے جمع تھے ان کے سوال وجواب میں وقت کی وہ گرد جمع تھی جو کہیں باہر سے ان کے الفاظ کے دجرے پر ڈھیر کر دی گئی تھی ورنہ چہروں کے تناؤ کے پیچھے ان کا وہ خوف بھی شامل تھا جو ایک سچے اور صحیح انسان کا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر بابو — میری مدد کیجئے — میری بہو مر جائے گی اسے بچا لیجئے جلدی کیجئے۔ دھماکے ہو رہے تھے — زندگی جست لگانا بھول گئی تھی لیکن موت جست لگا رہی تھی۔ وسوسوں کے درمیان خوابوں کے در بند ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر اپنے بیگ کے ساتھ مکان سے نکلے — آگے آگے وہ عورت وہ سنجیدہ بزرگ اور پیچھے پیچھے ڈاکٹر اور دوسرے لوگ — !

ابھی اسی وقت آپریشن کرنا ہوگا، نورمل ڈیلیوری کا انتظار کرنے سے

(باقی صفحہ ۳۷ پر دیکھیے)



## زرد آنکھیں اور پیلی سائیں سائیں

شین کاف نظام

کیسا لگتا ہے اب
جب ہو گئے ہیں
ایک جیسے
چاروں اور چھور

ساربانوں کے کہیں
اٹھتے بیٹھتے مڑتے ٹوٹتے
سُر ہیں،
نہ اونٹوں کے گلے کی گھنٹیوں کی
دوریوں کے دریاؤں میں
دھیرے دھیرے
ڈوبتی
گونجیں

نہ کہیں
نجروں پہ بیٹھیں
خواب بنتیں
خانہ بدوش دوشیزائیں
جن کے
برہے سننے
ٹھہر جاتا تھا
ساون
تمھارے صحن میں بھی

ہر شوق کی تکمیل کرتے
شطر پر
شب ہی کی شب میں
دریائی صحرائی سفر کر
لوٹنے والے
دلاور بھی نہیں
کچھ بھی نہیں
پسرتی سمتوں میں
گھورتی
تنہائیوں کو
تمہاری زرد آنکھیں
اور پل پل پھیلتی جاتی
ایک پیلی سائیں ... سائیں ■

## زمین کی جمالیات

زمین زبان ہے
آسماں کے آنسو
جس کو سینچتے ہیں
پھوٹتی ہیں
سبز ثنا کی صوت
ہری ہری حمدیں
بنوں کی بحریں
موسموں کی موسیقی —— منقبت!
بغیر موئے قلم کا
مصوّر
بھرتا ہے جس میں رنگ
استعارہ و علامت کے
گنگناتا ہے جنھیں
گردش میں غلطاں
صوفی سمے ■

● کلوں والی گلی جودھپور (راجستھان)



شفیع مشہدی
سی - ۱۰۳ نیو آنیسرز ہوسٹل، بیلی روڈ، پٹنہ (بہار)

# اس کے بعد

کچی قبر کی مٹی ابھی گیلی تھی اور وہ اُس کے کنارے ڈبڈبائی آنکھیں لیے کھڑا تھا۔ منوں مٹی کے نیچے وہ دفن تھا جو اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا۔ چاروں طرف بکھری ہوئی بے شمار قبریں اُسے خاموشی سے دیکھ رہی تھیں۔ اُس نے اپنے ہاتھوں میں بھرے گلاب کے پھولوں کی طرف دیکھا جو قبر پر نثار ہونے کو بے چین تھے۔ سُرخ پتیوں نے اُس کی دونوں ہتھیلیوں کو سُرخ کر دیا تھا۔

یہ ہتھیلیاں اُس وقت بھی سُرخ ہوئی تھیں جب اُس کے ہاتھ میں سر دیئے اُس نے خون کی قے کی تھی اور دم توڑ دیا تھا۔ خون اُس کے دونوں ہاتھوں پر پھیل گیا تھا۔ ڈاکٹر اُسے دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انجکشن دے رہے تھے۔ سانس کو دوبارہ واپس لانے کیلئے اس کے سینے کو دبا رہے تھے۔ مشین کے ذریعے سانس بھرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر وہ تو آخری ہچکی کے ساتھ اُس کی ہتھیلیوں کو اپنا آخری خونِ جگر دے کر تمام قید و بند سے آزاد ہو چکا تھا۔ وہ جس نے تمام عمر اپنا خونِ جگر دوسروں کو دیا تھا دم توڑتے وقت بھی اپنے آخری قطرۂ خون سے ہتھیلیوں کی حنابندی کر گیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ڈاکٹروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُسے سکتہ لگ گیا تھا اُس کے سامنے نحیف مُردہ جسم پُرسکون انداز میں پڑا تھا۔ چہرے پر سکون و آسودگی کے نقوش نمایاں تھے۔ جیسے عمر بھر کی بے قراری کو اچانک قرار آ گیا ہو۔ وہ خاموش کھڑا تھا۔ ڈاکٹر نے سفید چادر سے لاش ڈھک دی تھی۔ لاش۔ ؟ جو ایک لمحہ پہلے جیتا جاگتا ہوا سے دوسرے لمحے لاش... نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ چیخ پڑا تھا۔ لیکن اُس کی چیخ ہسپتال کی دیواروں سے ٹکرا کر واپس آ گئی تھی۔

"پلیز!" ۔ ڈاکٹر مہندر سنگھ اسے ہمدردی سے سمجھا رہا تھا "یہاں دل کے کئی مریض سیریس حالت میں ہیں۔ اُن پر بُرا اثر پڑ سکتا ہے۔ آپ دھیرج رکھیئے" گویا اُسے رونے کی اجازت نہیں تھی۔ اُس نے اپنی چیخیں سینے میں دبا دیں۔ کلیجہ پھٹنے لگا مگر وہ رو نہ سکا۔

پھر جب لاش کو گھر لایا گیا تو قیامت کا سماں تھا۔ عزیز و اقارب سینہ پیٹ پیٹ کر رو رہے تھے۔ مگر وہ اب بھی خاموش کھڑا تھا۔ اس کا جی چاہا وہ اپنا سر دیوار سے ٹکرا دے اور خود بھی اُس کے برابر لیٹ جائے مگر وہ خاموش کھڑا رہا۔

"کسی کا انتظار تو نہیں کرنا ہے۔" ایک معمر شخص نے اس سے ہمدردی سے پوچھا تھا۔

"نہیں" ۔ آواز اُسے بھی سنائی دی تھی۔

تو پھر تجہیز و تکفین میں جلدی کرنی چاہیئے۔ جمعہ کی نماز مل جائے گی۔"

"ٹھیک ہے" اُس نے بغیر سوچے سمجھے جواب دے دیا تھا

تھوڑی دیر بعد اُس کے کاندھوں پر میّت تھی اور وہ قبرستان کی طرف جا رہا تھا۔ لوگ آگے بڑھ کر کاندھا دے رہے تھے۔ کئی لوگ اُس کی طرف بھی بڑھے تھے۔ مگر اس نے جھٹک دیا تھا۔ پھر ایک قریبی عزیز نے اُس سے کاندھا لیا تو وہ خاموشی سے الگ ہو گیا۔

پہلی بار جب وہ قبرستان میں داخل ہوا تو وہ اُسے ایک باغ کی صورت خوشنما دکھائی دیا۔ دونوں جانب بے شمار قبریں پھیلی ہوئی تھیں سفید، ہری، لال زرد سنگِ مرمر کی، ٹائلس کی، سُرخ پتھر کی اور پھر کچی قبریں۔ جن میں سے کچھ دھنس بھی گئی تھیں۔ وہ آگے بڑھا تو بائیں جانب نشیب میں کئی کھدی ہوئی قبریں منھ کھولے دکھائی دیں۔ اُسے کچھ عجیب سا لگا تھا۔

" اتنی ساری قبریں کیوں کھدی ہوئی ہیں" کسی نے وہ سوال پوچھ لیا تھا۔ جو خود اُس کے ذہن میں مچل رہا تھا۔

پہلے سے تیار رکھتے ہیں تاکہ تاخیر نہ ہو۔ دوسرے نے وضاحت کی "بڑا شہر ہے۔ کام کاجی لوگ ہیں۔ کتنا انتظار کریں گے۔ گورکن نے لقمہ دیا۔

"بڑا معقول انتظام ہے" ایک اور شخص بولا۔

"اور جانتے ہو۔ قبر، پتھر کی سلوں اور مزدوری سب کے لئے صرف نوّے روپئے لیتے ہیں،" تیسرا بولا

"واہ بھئی۔ اس گرانی میں تو یہ کچھ بھی نہیں ایک شخص نے جواب دیا۔

"دھوپ بہت تیز ہے۔ جلدی کرنی چاہیے۔ کسی نے کہا۔

"ہاں بھئی مجھے دفتر بھی پہونچنا ہے،" پہلے شخص نے کہا۔

"جگہ کافی خوش گوار ہے۔ بہت ہری بھری ہے اور پُرسکون ہے"۔ دوسرے شخص نے لمبی سانس لی۔

"کیا ارادہ ہے؟ پسند آگئی جگہ۔" اُس کے ساتھ والے شخص نے ہنستے ہوئے کہا۔ اغل بغل کھڑے دو تین لوگ مسکرانے لگے۔ پھر جلدی سے خاموش ہوگئے۔

وہ چپ چاپ خالی خالی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ لوگ جلدی جلدی تدفین کے مراحل سے گذر کر واپس جانا چاہتے تھے۔ اُس کی لاش کو قبر میں اتار دیا گیا تھا اور فرشِ خاک پر وہ جسم اطہر پڑا ہوا تھا جسے نرم بستروں کی عادت تھی۔ اس کا کلیجہ پھٹنے لگا۔ آنسو بے اختیار بہنے لگے۔ سانس گھٹنے لگی اور ہچکیاں گلے میں پھندہ بن کر اس کا دم گھوٹنے لگیں۔ اس کا جی چاہا کہ وہ قبر میں اُتر جائے اور لوگوں سے کہے کہ پتھر کی سلیں پاٹ دیں۔ اس کی جدائی کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر وہ خاموش کھڑا رہا۔ پتھر کی سلیں رکھی گئیں اور مٹی ڈالی جانے لگی۔ آناً فاناً مٹی کا انبار سامنے تھا۔ اور وہ جسم جو اس کے جسم کا ایک جزو تھا منوں مٹی کے نیچے روپوش ہوگیا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ قبر سے لپٹ کر اتنا روئے، اتنا روئے کہ اس کا بھی دم نکل جائے کسی نے نرمی سے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور وہ اُس کے ساتھ چل پڑا۔

وہ بالکل خالی الذہن ڈگمگاتے قدموں سے گھر کی طرف لوٹ رہا تھا اُسے ویرانے میں چھوڑ کر وہ گھر واپس آگیا اور بے جان سا کرسی میں ڈھیر پڑا۔

تمام عزیز و اقارب مغموم بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے بہت سے وہ بھی تھے جو اُس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ کل رات سے کسی کے منہ میں اناج کا ایک دانہ بھی نہیں گیا تھا۔

کسی نے اس کی طرف پانی کا گلاس بڑھایا تو وہ ایک سانس میں پی گیا زیادہ تر لوگ قبرستان سے ہی واپس جا چکے تھے۔ کچھ لوگ جو گھر تک واپس آئے تھے جلد از جلد جانے کی فکر میں تھے۔ اُسے ایک عزیز اُٹھا کر دوسرے کمرے میں لائے۔ اُسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ فرش پر دسترخوان بچھا تھا اور تمام عزیز و اقارب اُس کے گرد بیٹھے تھے۔ بیچ میں قورمہ اور تندوری روٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ بھی ایک کنارے بیٹھ گیا۔ پھر اُس نے دیکھا کہ وہ لوگ جن کی آنکھیں روتے روتے سُرخ ہوگئی تھیں اور جو غم سے نڈھال تھے۔ روٹی اور قورمہ کھانے لگے۔ یہ کھانا پڑوس کے حسین صاحب کے یہاں سے آیا تھا۔ قورمے سے اُٹھتی ہوئی خوشبو نے بھوک کو مہمیز لگا دی تھی اور بیس گھنٹے کے بھوکے لوگ سارے غم کو بھول کر کھانے میں لگ گئے تھے۔ کسی نے اُس کے سامنے رکھی پلیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ اور اُس نے بھی بے دلی کے ساتھ ایک لقمہ منہ میں رکھ لیا۔ پھر نہ جانے کہاں کھوئے کھوئے ہی وہ دو روٹیاں کھا چکا تھا۔ اور اس کا پیٹ بھر گیا تھا۔ ایک صاحب کھانے کی تعریف کر رہے تھے اور حسین صاحب کی فرض شناسی کی بھی۔ حسین صاحب شرماکر کہہ رہے تھے کہ یہ تو اُن کا فرض تھا۔ آخر پڑوس کے لوگ اتنا بھی نہیں کریں گے کیا۔ وہ خالی خالی نظروں سے ان کی طرف دیکھتا رہا۔

پھر وہ اپنے کمرے کی طرف چلا گیا جہاں آئینے پر نظر پڑنے پر اُسے احساس ہوا کہ آج اُس نے شیو نہیں کیا تھا اُسے عجیب سی بے چینی کا احساس ہوا پھر دیر تک کھڑے کھڑے اُس نے شیو کیا۔ اور غسل خانے میں جاکر خوب نہایا۔ کپڑے بدلے اور واپس آکر بے خبر سو گیا۔ نہ جانے وہ کتنی دیر تک سوتا رہا تھا کہ اچانک اس کی نیند ٹوٹ گئی۔ اُس نے بڑا بھیانک خواب دیکھا تھا۔ ایک خواب میں اس نے دیکھا کہ وہ تازہ قبر کے کنارے کھڑا ہوا تھا۔ اور جو اُسے اُس کی جان سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ قبر کے اندر سے پکار کر کہہ رہا تھا ——
ابھی تو میری قبر کی مٹی بھی نہیں سوکھی اور تم مجھے بھول گئے۔ میرے لئے جان دینے کا وعدہ کرنے والے کھا پی کر سو گئے۔ اور میں یاد تک نہ آیا۔

اس کا سارا جسم پسینے سے تر الور ہو اُٹھا تھا ایک عجیب سی بے چینی اُسے مضطرب کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ قبرستان میں تھا۔ قبرستان کے منظر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ سیدھا اُس کی قبر کے کنارے پہونچا اگربتیاں جل کر بجھ چکی تھیں۔ گلاب کے پھول مرجھا چکے تھے۔ قبر کی مٹی ابھی گیلی تھی اور اُس کے سرہانے لگے سُرخ پتھر پر مرنے والے کا نام لکھا ہوا تھا۔

وہ دھیرے دھیرے کتبے کی طرف بڑھا اور اوپر لکھے نام کے نیچے اُس نے اپنا بھی نام لکھ دیا ❋

## اُردو، ہندوستان ہے

## ہندوستان اُردو ہے

اظہر نیاز

معرفت: احمد داؤد، اے۔۱۱۰۳، موہن پورہ راولپنڈی [ پاکستان ]

# زیرو + زیرو

وہ اپنے ایک دوست کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے اور اُن دوست دوسرے کمرے میں ان کی دعوت کے انتظامات میں مصروف تھا۔ وہ کچھ دیر خاموش ایک دوسرے کو دیکھتے رہے کوئی بھی ایک دوسرے کو نہیں جانتا تھا لیکن وہ سب اپنے میزبان دوست سے واقف تھے جس نے انہیں آج اپنے گھر میں پہلی دفعہ دعوت پر بلایا تھا۔

کمرے میں آویزاں ایک پورٹریٹ سب کو اپنی طرف متوجہ کئے ہوئے تھا۔ ان کی نظریں ڈرائنگ روم میں سجی ہوئی دوسری اشیاء سے ہوتی ہوئی تصویر پر آکر رک جاتیں۔ اس تصویر میں ایک نامعلوم کشش تھی کہ آپ اگر اس کمرے میں بیٹھے ہیں تو آپ اس تصویر کے علاوہ کچھ نہیں دیکھ سکتے، کچھ نہیں سوچ سکتے۔

"ایک ماں اپنے بچے کو تھامے ہوئے دور خلاؤں میں گھوم رہی ہے۔"

جی نہیں وہ خلاؤں میں قطعی نہیں گھوم رہی، بلکہ وہ اپنے سامنے موجود منظر کو دیکھ رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ماضی کے دکھ ہیں اور سامنے ایک راستہ معلوم نہیں وہ کہاں سے آرہی ہے اور اُسے کہاں جانا ہے ایک طویل سفر نے اسے تھکا دیا، وہ یہاں آکر رکی اور اب سامنے دیکھ رہی ہے لیکن اُسے کوئی امید نظر نہیں آتی۔

بچے کی آنکھوں میں حیرت ہے اور یہ حیرت ماں کی آنکھوں کے دکھ سے بالکل انجان ہے۔ دونوں ایک ہی منظر کو دیکھ رہے ہیں لیکن دونوں کا احساس مختلف ہے کیونکہ دونوں کے تجربات و مشاہدات مختلف ہیں۔

کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے ؟

شاید آپ کچھ بتا سکیں ؟

جی ہاں ! مجھے معلوم ہے !

یہ عورت اپنے پورے خاندان کے ساتھ ایک خوبصورت شہر میں رہتی تھی۔ ایک دن جب یہ لوگ سو کر اٹھے تو معلوم ہوا خوبصورت شہر دشمنوں کے قبضے میں ہے۔ آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ اس کا پورا خاندان موت کے کھیل کی نذر ہو گیا۔ یہ صرف اپنے بچے کو بچا سکی اور اپنے شہر سے ہجرت کر گئی کہ خدا کی زمین بہت کشادہ ہے اور اب اس کشادہ زمین میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ وہ سوچ رہی ہے کہ اپنے شہر کا جہنم زیادہ آسودہ تھا یا یہ جہنم کہ جس کا کوئی کنارہ نہیں کوئی انت نہیں۔

آپ یہ دیکھ رہے ہیں کہ اس نے اپنے بچے کو کس طرح اپنے ہاتھ سے تحفظ دے رکھا ہے یہ اس کا مستقبل ہے اور بچے کے ہاتھ میں کھلونا ہے اس طرح اس تصویر میں تین علامتیں ہیں، ماں، بچہ اور کھلونا۔ ماں ہمارا ماضی ہے بچہ مستقبل اور کھلونا ہمارا حال ہے جو بچے کے ہاتھ میں ہے۔

شاید آپ سب لوگوں نے اس تصویر کے رنگوں پر غور نہیں کیا۔ پہلا رنگ جو پوری تصویر کو اپنی اداسی میں لپیٹے ہوئے ہے، عورت نے سرخ چادر اوڑھ رکھی ہے جس کا رنگ پھیکا پڑتا جا رہا ہے اور بچے کے کپڑوں کا رنگ نیلا ہے۔

کیا آپ مجھے کچھ کہنے کی اجازت نہ دیں گے ؟

دراصل عورت اور بچے کے سامنے ایک شخص کو گولی مار کر ہلاک کیا جا رہا ہے۔ وہ شخص اس عورت کا شوہر ہے اور اس کا جرم یہ ہے کہ وہ اپنے وطن سے محبت کرتا ہے لیکن وطن دشمنوں کا چراغ اس کے سامنے جل نہیں رہا اس لئے اسے ملک دشمن اور غدار کہہ کر ہلاک کرنا چاہتے ہیں کیونکہ اختیار ان کے پاس ہے۔ وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ عورت بھی وہی منظر دیکھ رہی ہے اور بچہ بھی وہی منظر دیکھ رہا ہے۔ ان کے سامنے ظلم ہو رہا ہے عورت کی آنکھوں میں دکھ ہے، ہونٹوں پر احتجاج ہے جو سی دئے گئے ہیں اور اس نے اپنے بیٹے کو مضبوطی سے تھام رکھا ہے اور اس کا

سرو قار سے بلند ہے اور اس کے دل میں یہ عزم کہ اس کا بیٹا اس کا مستقبل اپنے باپ کا بدلہ لے گا اور عوام کو یہ سب کچھ اس لئے قومی نشریاتی رابطے پر براہِ راست دکھایا جا رہا ہے کہ عوام عبرت حاصل کریں کہ جو صاحبِ اختیار ہے وہی صاحبِ اخلاق ہے اور منبعٔ رشد و ہدایت ہے اور سچ کا علمبردار ہے اور وہ جو جھوٹے ہیں ان کا یہ انجام ہے۔

آپ محض جذباتی ہو رہے ہیں یہ صوفیہ لورین کی تصویر ہے جو غالباً فلم "مدر اینڈ چائلڈ" سے لی گئی ہے۔

جی نہیں یہ کسی فلم سے ماخوذ نہیں ہے بلکہ یہ بہت بڑی پینٹنگ ہے جس میں آرٹسٹ نے اس کائنات کے تمام تر فلسفے کو بیان کر دیا ہے۔ یہ تصویر زندگی اور موت کا درمیان ہے۔ یہ عورت اور اس کا بچہ ایک سواری پر سوار ہیں۔ وہ سواری اس تصویر کے فریم سے باہر ہے لیکن آپ اس کے وجود سے انکار نہیں کر سکتے۔

آپ کا مطلب ہے کہ 'وقت'

زمانہ؟

خدا؟

آپ اسے کچھ بھی کہیں وہ موجود ہے اور یہ نامعلوم سے نامعلوم کی طرف جا رہے ہیں اور یہ بیک وقت ہر وقت میں موجود ہیں۔ ماضی میں بھی، حال میں بھی، اور مستقبل میں بھی اور یہ اس کمرے میں ہمیشہ سے موجود ہے۔

جی نہیں میں اسے پہلی دفعہ دیکھ رہا ہوں اس لئے کہ آپ پہلی دفعہ کمرے میں آئے ہیں۔ اور وہ اپنے بارے میں سوچنے لگا۔

یہ ایک بدکردار عورت ہے اور یہ اس کا حرامی بچہ ہے یہ جس معاشرے میں رہ رہی تھی جب انھیں اس بات کا پتہ چلا تو انھوں نے اسے سنگسار کرنا چاہا اور یہ وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی اور اب یہ اپنے حرامی بچے کو سینے سے لگائے شہر شہر گھوم رہی ہے لیکن کوئی شہر اسے پناہ نہیں دے رہا۔۔۔

میرے خیال میں اس عورت کے ساتھ جس نے زنا کیا ہے اُسے اس کے سامنے اس وقت سنگسار کیا جا رہا ہے اور اس کے بعد اسے سنگسار کیا جائے گا وہ اپنے آپ کو سزا کے لئے تیار کر رہی ہے اور اسے اپنے بچے کی فکر ہے کہ میرے بعد اس کا کیا ہوگا۔

دراصل آرٹسٹ نے "سوفیز چوائس" کو پینٹ کیا ہے جب ٹارچر کیمپ میں اس سے پوچھا جاتا ہے کہ تمھارے بیٹے یا بیٹی میں سے کس کو ہلاک کر دیا جائے تو وہ فیصلہ اپنے بیٹے کے حق میں دیتی ہے اور کہتی ہے کہ میری بیٹی کو مار دیا جائے اور پھر وہ بے آواز چیخ کہ ماں ہوتے ہوئے اس نے کیا فیصلہ دے دیا۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ وہ دونوں کو زندہ نہیں چھوڑیں گے لیکن اب اس کا انتخاب اس کے لئے عمر بھر کا پچھتاوا تھا کہ یہ اس سے کیا ہو گیا۔ حالانکہ اس کے پاس اس کا جواز موجود تھا۔ اس نے بیٹے کو منتخب کر کے اپنے شوہر کو بچایا تھا اور بیٹی کو مار دینے کا کہہ کر اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالا تھا لیکن وہ ماں تھی اس کا شعور اس کے لاشعور کے انتخاب کو تسلیم کرنے سے انکار کر رہا تھا۔ اور یہ تصویر جس میں وہ بیٹے کو تھامے ہوئے ہے اس کی شرمندگی ہے۔ عمر بھر کا روگ۔ آہ میں نے کیا انتخاب کیا۔ ایسے لئے کس دکھ کو چنا۔

میرے خیال میں یہ عورت نیتھنل ہاتھورن کے ناول "اسکارلٹ لیٹر" کا بنیادی کردار ہے جس کے ساتھ پادری نے زنا کیا تھا اور اب وہ اپنے خلاف فیصلہ سن رہی ہے۔ اس کے سامنے کھلے میدان میں وہی پادری تقریر کر رہا ہے کہ یہ گناہ گار ہے اور اگر یہ بستی میں رہنا چاہتی ہے تو روایت کے مطابق اپنے سینے پر "ز" کا حرف کشیدہ کر کے پھرے تاکہ لوگ جان جائیں کہ یہ وہ عورت ہے جو گناہ گار ہے۔ زانیہ ہے اور اس نے ایک حرامی بچے کو جنم دیا ہے۔

آپ سب لوگ بکواس کر رہے ہیں۔ دراصل یہ مریم ہے اور اب وہ سوچ رہی ہے کہ دنیا کو کیا جواب دے لیکن بچے کے کھلے ہونٹ اپنی ماں کی بے گناہی کی گواہی دے رہے ہیں۔

آپ خوامخواہ اس معمولی تصویر کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں حالانکہ یہ ایک خیالی تصویر ہے۔ ماں اور بچہ عام طور پر ہمارے آرٹسٹوں اور فوٹوگرافروں کا موضوع رہا ہے اور ہمارے میزبان دوست کو یہ تصویر پسند آ گئی ہو گی اور اس نے بازار سے خرید کر اسے اپنے ڈرائنگ روم کی زینت بنا دیا۔

اگر آپ سب لوگ اپنی اپنی ہانک چکے ہیں تو مجھے کچھ کہنے کی اجازت دی جائے۔

آپ لوگ میرے بارے میں نہیں جانتے لیکن ہمارے میزبان دوست مجھے بخوبی جانتے ہیں۔ میں نے اپنی عمر کا ایک طویل حصہ سیر و سیاحت میں صرف کیا ہے۔ میں جن دنوں اٹلی میں تھا تو وہاں کی ایک مشہور ماڈل گرل سے میرے تعلقات تھے۔ یہ اس ماڈل گرل کی تصویر ہے۔ جس کی تصویر ڈرائنگ روم میں سجانا اٹلی میں فیشن اور کریز بن گیا تھا۔ میں

(باقی صفحہ ۱۸۸ پر دیکھئے)

# مکتوبات

**نامی انصاری** ۔ اے ۔ ۲۱/۱۴ ، نواب صاحب کا احاطہ ، سول لائنز کانپور

شاعر کے دو تازہ تازہ شمارے مل گئے ہیں ۔ اکیسویں صدی کی غزل پر سید محمد عقیل رضوی صاحب کا عالمانہ مقالہ دونوں شماروں میں کل سرسید کی حیثیت رکھتا ہے ۔ انھوں نے موجودہ غزل کے موضوعات ، اسالیب اور لسانی شکست و ریخت پر قابل قدر تجزیاتی مطالعہ کر کے پیش کرتے ہوئے ان نقادوں کی بھی خاصی گرفت کی ہے جو غزل کے معیار و میزان سے ناواقفیت کے سبب ادھر ادھر پینترے بازی تو بہت کرتے ہیں مگر جدید غزل کی بے لاگ تنقید سے کنی کاٹ جاتے ہیں ۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کا مقالہ " اردو املا اور لسانیات " بہت مسائل اور علمی ہوا ہے ۔ اردو زبان و ادب کے طالب علم اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں ۔ خاص طور سے اضافت کے لیے " ہمزہ " ، " کسرہ " اور " یے " کے محل استعمال پر ان کا فارمولا سادہ بھی ہے اور قابل عمل بھی ۔ اردو املا کی معیار بندی میں ان دنوں جو کوششیں کی جا رہی ہیں وہ یقیناً کارآمد ہیں مگر ان پر عمل درآمد کے لیے کوئی ایسی کارگر مشنری نہیں ہے جو ہند و پاک میں شائع ہونے والے تمام رسائل و جرائد اور اخبارات میں ان کو بروئے کار لا سکے ۔

ندا فاضلی صاحب کے خود نوشت سوانح بسلسلۂ راوی یعنی ؎

دکھ اسی پری وش کا

اور چہرہ بیان اپنا ، کافی دلچسپ ہیں ۔ بے باک نگاری اور جرأت اظہار کے ایسے نمونے کوئی ادیب اسی وقت پیش کر سکتا ہے جب وہ سماج اور اس کے بنائے ہوئے معیار کو خاطر میں نہ لا کر خود اپنے ضمیر کی آواز کا ساتھ دے ۔ ندا فاضلی صاحب میں یہ وصف بدرجۂ اتم موجود ہے ، اللہ شاءاللہ ۔

زحمہ پر ظ انصاری صاحب کا تبصرہ ان کے مخصوص انداز میں بہت دلچسپ ہے ۔ شاعر کے گرانی کا یہ جملہ بہت معنی خیز ہے کہ :

بحر مفتی ہو اور ردیف طویل ، تو کہنے کی جگہ کہاں رہ جاتی ہے

ردیف کا اونٹ شاعر کے خیمے میں گھس پڑا تو خیال غریب کہاں

ٹھہرے گا "

**اظہر افسر** ۔ چندن بیڑمس ، پرنس مارکیٹ ، لاڈ بازار ، حیدرآباد ۔ ۲

شاعر کے شمارہ نمبر ۱ اور ۲ میں محمود حسن ذوق اور امیر مینائی پر مختصر مضامین نہایت معلوماتی ہیں ۔ خطوں پر اردو میں پتے لکھنے کی تحریک بہت اہم ہے بشرطیکہ فی صد لوگ بھی اس پر عمل کریں تو بڑا اثر ہے ۔ شاعر نے ہمیشہ اردو کے بنیادی مسائل پر توجہ دی ہے ۔

**سلیم شہزاد** ۔ ۳۲۳ ، ٹھکوار وارڈ ، مالیگاؤں ، مہاراشٹر

شاعر کے دو شمارے بھیج کر تو آپ نے حیران کر دیا ۔ ان دونوں شماروں کے مشمولات بہت اہم ہیں خصوصاً مضامین ۔ ندا فاضلی کی خود نوشت بہت خوب ہے سلسلہ جاری رکھیے ۔

**فاروق شفق** ۔ جی ۔ ۱۸۵ ، دھان کھیتی ، گارڈن ریچ ، کلکتہ ۔

کافی انتظار کے بعد شاعر کے دو تازہ شمارے ایک ساتھ ملے ۔ دونوں شماروں میں صفحات گرچہ کم ہیں لیکن بہرحال کیفیت ، کمیت پر حاوی ہے ۔ ڈاکٹر نارنگ اور سید محمد عقیل کے مضامین حاصل شمارہ ہیں ۔ ندا فاضلی کی خود نوشت سوانح حیات کا سلسلہ شاعر میں ایک خوبصورت باب کا اضافہ ہے ۔ منظومات کا حصہ بھی اچھا لگا غزلوں کے بعض اشعار بہت خوبصورت ہیں ۔

**ایم منوجہ** ۔ ۱۹ ، ۷۹/ ، سادھو ٹی ٹی نگر ، بھوپال ( ایم پی )

مدت کے بعد شاعر کے دو شمارے ملے ، طبیعت خوش ہو گئی ۔ اردو لسانیات پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا مضمون بے حد مفید اور عالمانہ ہے ۔ اردو کے طلبا اس سے استفادہ کریں گے ۔ ایسے ہی اور معیاری مضامین جو شاعر میں شائع ہوتے رہتے ہیں ۔ ماضی کے اعلیٰ ادبی رسائل کی روایت کو آگے بڑھاتے ہیں ۔ شاعر ہی دراصل طلبا نے تخلیق کار اور محققین کو بہتر سے بہتر مواد فراہم کرتا ہے ۔

**ن ۔ ا ۔ ناظر** ۔ معرفت اختر جمال " تاج محمد کی چال " ، کلیان روڈ بھیونڈی

شاعر کے دو شمارے ان دنوں زیر مطالعہ ہیں ، بلاشبہ مضامین چونکا دینے والے فکر انگیز ہیں اور منظومات کا حصہ وقیع ہے ۔ نئی غزل پر ڈاکٹر سید محمد عقیل کا مضمون بحث کے دروازے کھولتا ہے نیز یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ نے صرف مہاراشٹر بلکہ ہندوستان بھر کے جدید ترین شعراء کی تخلیقات کو ہم سب کے موقر جریدے شاعر کے صفحات میں جگہ دے کر ایک طرح سے ان کی نمائندگی کی ہے ۔

**کیف بلگرامی** ۔ پولیس کیس ڈائری ، سول کورٹ ، ہردوئی ۔ ۰۰۱ ۲۴۱

شاعر کے دونوں شماروں میں آپ کا اداریہ " اپنے خطوں پر پتے اردو میں لکھیے ، مگر " پسند آیا ، یہ ایک عملی تحریک ہے ، اس تحریک میں تمام اردو والوں کو بھرپور تعاون دینا چاہیے ۔ مجھے آپ کی تجویز سے اتفاق ہے ۔ اردو کی ترویج و اشاعت اور اس کی بقا کے لیے یہ عملی تحریک وقت کا سب سے بڑا تقاضہ ہے

**عباس دانا** ۔ ۵ نعیم منزل ، پرتاپ نگر روڈ ، بڑودہ ( گجرات )

" اپنے خطوں پر پتے اردو میں لکھیے ، مگر " آپ کا تحریر کردہ اداریہ قابل قبول ہے ، کاش اردو داں طبقہ اس پر عمل کرے تو خوشگوار نتائج حاصل

ہو سکتے ہیں۔ آپ کی اس پیش قدمی پر نیک خواہشات کا اظہار اور پر خلوص دعائیں اور عمل کی ابتداء۔ "دیواروں کے بیچ" "بدانا خلی اچھے لگتے ہیں۔ "دیگر احوال یہ ہے کہ" مجتبیٰ حسین کی ایک دلپذیر تحریر ہے۔

**شیخ احمد**۔ احمد پورہ، مکان نمبر ۸۷-۵-۴، کریم نگر ۵۰۵۰۰۱ (اے پی)

شمارہ ۲، ۱۹۸۹ء میں آپ کے اداریے کی ترغیب پر آج ہی سے عمل شروع ہو گیا ہے۔ ہر روز ایک خط، پتہ اردو میں لکھ کر تحریک میں شامل ہو جاؤں گا۔ انشاء اللہ ایک خط آپ کو بھی آئے گا اور آتا رہے گا۔

## بقیہ صفحہ ۴۵ زیرو زیرو

لڑکوں کے معاملے میں ذرا اسپیشل موڈ رکھتا ہوں کہ جس لڑکی سے میرے تعلقات ہیں وہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے لیکن وہ — اور یہی وجہ تھی کہ میں اسے چھوڑ کر واپس چلا آیا۔ مجھے یہاں آکر پتہ چلا کہ اس کے پاس میرا ایک بچہ بھی ہے۔

اتنے میں میزبان دوست کمرے میں داخل ہوتا ہے چلیے آپ ہی سے پوچھ لیتے ہیں — یہ پینٹنگ ؟؟

سوری، میں آپ لوگوں سے ملوانا بھول گیا۔ دراصل یہ میری بیوی ہے اور یہ میرا بیٹا ہے — چلئے ڈرائنگ روم میں وہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ ❋

## بقیہ صفحہ ۳۲ کہانی یا افسانہ

کی نمائندگی کی۔ مرزا حامد بیگ اپنی انفرادیت میں اپنے ترچھے پن سے واقعاتی افسانہ ترتیب دیتے ہیں۔ رشید امجد کا علامتی صورتِ حال میں تحلیل اور تجسیم کا عمل ایک ماورائی حقیقت نگاری کو جنم دیتا ہے۔ رام لعل کا افسانہ "دوزخ سے واپسی" اینٹی ڈائیلاگ کا اچھوتا ٹریٹمنٹ پیش کرتا ہوا جدید افسانہ ہے جس میں واقعے پر صورتِ حال غالب ہے۔ عبداللہ حسین اپنے بیانیہ سے لطیف احساسات کو افسانوی حسیت میں بدلنے کا کام لیتے ہیں۔ بلراج مین را لفظوں کو سخت ترین مرحلوں سے گذارنے کی کوشش میں ایک توانا اور اچھوتا ساختیاتی ادراک منطبق کرتے ہیں۔ انور سجاد رقصِ بسمل والے اسلوب میں جانفشانی نقش کرتے ہیں اور انتظار حسین گہری تعکیری بیان میں اکثر گمشدہ ماضی کے اوراق الٹتے ہیں اور وہاں سے یا عہد نامہ خلق کرنے کا جتن کرتے ہیں۔ غرض کہ آج کا افسانہ نگار اردو افسانے کو ایک ارتقاء یافتہ صنفِ سخن بنانے پر مصر ہے، کامیاب ہو یا نہ ہو۔ ❋

## بقیہ صفحہ ۴۸ محفل اپنی

ہو جائیں۔ سب کے لیے ایک ہی لاٹھی۔

ان تمام تر مشکلات کے باوجود شاعر کو جاری رکھنا ہے، اسے خوب سے خوب تر بنانے کی روایت کو توسیع دیتے رہنا ہے۔ صفحات چاہے کم ہی کیوں نہ ہوں مگر مواد اور معیار کے اعتبار سے شاعر کو آپ ہمیشہ ہی منفرد اور بلند پائیں گے۔

شاعر کو ہمیشہ ہی سے اپنے بے شمار ان دیکھے قارئین، خریداروں اور ایجنٹوں کا تعاون حاصل رہا ہے۔ انھیں کے حوصلوں نے شاعر کو ہمیشہ نئی زندگی دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "اقبال نمبر" جیسے عظیم کام شاعر کے ذریعے ممکن ہو سکے ہیں۔

شاعر کے آئندہ پروگراموں کا ایک خاکہ بنایا جا رہا ہے۔ کئی موضوعی عام شمارے اور نمبر زیرِ ترتیب ہیں۔ جلد ہی شاعر میں ان کے اعلانات کیے جائیں گے۔ اقبال نمبر-۲ زیرِ ترتیب ہے۔ کئی تجرباتی شمارے زیرِ غور ہیں۔ شاعر کے مستقل عنوانات کی تجدید بھی جلد ہی کی جائے گی۔ صفحات میں بھی اضافہ ہوگا۔

شاعر کے سلسلے میں ہمیں آپ کے گراں قدر مشوروں کا انتظار رہے گا۔

---


## بیان ملکیت اور دیگر تفصیلات شاعر بمبئی

(مطابق فارم نمبر ۴۔ قاعدہ نمبر ۸)

مقام اشاعت بمبئی

پرنٹر و پبلشر ناظر نعمان صدیقی

پتا دینا ناتھ بلڈنگ، تیسرا منزلہ فاکلنڈ روڈ بمبئی۔ ۴

ایڈیٹر افتخار امام صدیقی

پتا دینا ناتھ بلڈنگ تیسرا منزلہ فاکلنڈ روڈ بمبئی۔ ۴

وقفۂ اشاعت ماہنامہ

قومیت ہندستانی

ملکیت ناظر نعمان صدیقی

قومیت ہندستانی

میں ناظر نعمان صدیقی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط۔ ناظر نعمان صدیقی ۲۸ / فروری سنہ ۱۹۹۹ء

# محفلِ اپنی

۱۹۸۹ء میں شاعر کا یہ تیسرا شمارہ نذرِ قارئین ہے۔ گذشتہ دونوں شماروں کو ہمارے قارئین نے پسند کیا اور اظہارِ پسندیدگی کے ساتھ ساتھ بہت سے استفسارات بھی کئے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

شاعر کی ساٹھ سالہ زندگی میں نشیب و فراز آتے ہی رہے ہیں لیکن اقبال نمبر کی اشاعت اور مابعد اقبال نمبر سے جو حالات پیدا ہوئے انھوں نے ہمیں نئے امتحانوں میں مبتلا کیا اور شاعر کی زندگی کو خطرات لاحق ہوئے۔ اس کی کئی ایک وجوہ ہیں۔ تفصیلات میں جائے بغیر یہ عرض کر دینا کافی ہے کہ اقبال نمبر کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر اور زرِ کثیر کے بوجھ نے ہمیں بے طرح متاثر کیا تھا۔ اپنے محدود وسائل کی جمع و تفریق سے کسی طرح نمبر شائع کیا گیا اور جب نمبر شائع ہوا تو لگا کہ جیسے ہم نے اپنی زندگی ہی داؤ پر لگا دی ہو۔ اقبال نمبر کی ضخامت اور قیمت کے تعین میں کئی بار ردوبدل ہوا اور ہم نے ۵۰ روپے قیمت کا اعلان کر دیا تھا جب کہ ایک کاپی پر ۵۰ روپے سے زائد کی لاگت آئی اس کے باوجود اقبال نمبر اعلان شدہ قیمت ہی میں دیا گیا نتیجتاً سوئے زیاں کے کچھ اور ہاتھ نہیں آیا سنبھلتے سنبھلتے ہی میں شاعر کی اشاعتیں غیر معمولی تاخیر کی نذر ہو گئیں۔

اقبال نمبر شائع ہوا اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ اپنی اشاعت کے ایک ہی ماہ میں تمام کاپیاں ختم ہو گئیں۔ اقبال نمبر کی غیر معمولی مقبولیت نے شاعر ہی کے سابقہ ریکارڈ توڑ دیے۔ اور یہ بھی ایک طویل کہانی ہے کہ اقبال نمبر نے ادبی رسائل کے خاص نمبروں، شخصیات پر شائع ہونے والے نمبروں، عام قارئین کے لئے بنے ہوئے تمام مفروضوں اور اقبال پر اب تک کے شائع ہوئے خصوصی شماروں کے مقابلے میں شاعر کے اقبال نمبر نے کون سے نئے سنگ میل قائم کئے؟ کیا نئی ادبی تاریخ بنائی؟ اس سے بھی زیادہ دلچسپ اور حیرت انگیز وہ خطوط ہیں جو ہمیں عام قارئین سے، مشاہیر سے، اپنے خریداروں اور ایجنٹوں سے موصول ہوئے ہیں۔ اقبال نمبر ۲ میں یہ سب کچھ اپنے پورے حقائق کے ساتھ پیش کیا جائے گا۔

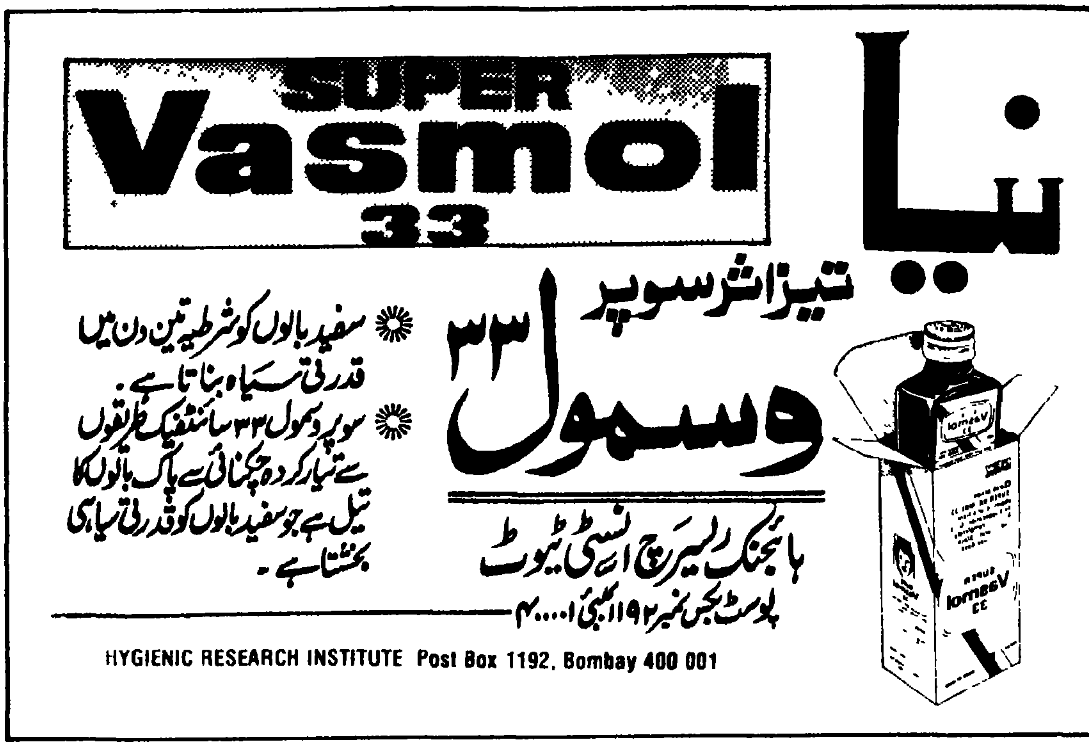
ہم معذرت خواہ ہیں اپنے ان تمام ایجنٹوں، خریداروں اور قارئین سے جنھیں اقبال نمبر نہیں مل سکا، ہم ان کی فرمائشیں پوری نہیں کر سکے۔ اقبال نمبر کا دوسرا ایڈیشن اپنی کسی بھی بڑھتی ہوئی تعداد میں فروخت ہو سکتا تھا لیکن حالات نے اس کی اجازت نہیں دی۔

ہم اپنے ناگفتہ بہ حالات کی کشمکش کے سبب شمارہ نمبر ۱ اور ۲ میں کسی بھی طرح کی وضاحت یا صراحت نہیں کر سکے تھے کہ یہ شمارے اتنی تاخیر سے کیوں شائع ہوئے؟ ۱۹۸۸ء میں اقبال نمبر اور صرف ایک شمارہ نمبر ۲ ہی کیوں؟ قارئین! حالات پر قابو پانے اور شاعر کو پابندئ وقت کے ساتھ شائع کرنے کے لیے یہ ناگزیر تھا کہ ۱۹۸۸ء کی بقیہ اشاعتوں کو ادھورا چھوڑتے ہوئے ۱۹۸۹ء کی اشاعتوں کو باقاعدہ کیا جائے لیکن اس سے شاعر کے پرانے خریداروں پر کوئی اثر نہیں پڑے گا کہ ان کی مدت خریداری میں ۵، ۵ ماہ کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ یہ ان لوگوں کے لیے ہے جنھوں نے اقبال نمبر سے قبل اپنا زرِ سالانہ ارسال کیا تھا یا تجدید خریداری کی تھی۔ جن خریداروں نے اقبال نمبر نہیں منگوایا تھا یا کسی سبب سے اقبال نمبر ان تک نہیں پہنچ سکا تھا، ان کی مدت خریداری میں ۶، ۶ ماہ کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ بیشتر خریداروں نے ۱۹۸۸ء کے پانچ شماروں کے بارے میں استفسار کیا ہے، فرداً فرداً تمام لوگوں کو جواب دینا ممکن نہیں کہ ۱۹۸۸ء میں اقبال نمبر اور شمارہ نمبر ۲، دو ہی شمارے شائع ہوئے ہیں مزید شماروں کا انتظار نہ کریں۔

ہم نے اقبال نمبر کے اداریے میں شاعر کے متعلق بہت سی افواہوں کا ذکر کیا تھا، یہ افواہیں اب تک گردش میں ہیں، ان کے متعلق ہمیں کچھ نہیں کہنا ہے کہ شاعر نے اپنی ساٹھ سالہ زندگی میں ایسی افواہوں کا ہمیشہ سے سامنا کیا ہے، یہ اور بات ہے کہ آج اوسط ذہن سے بھی کم سطح کی ذہنیت شعر و ادب اور ادبی صحافت میں کارفرما ہے۔ لیکن ہم تو شکر گذار ہیں ان بے شمار دوستوں اور شاعر نوازوں کے جنھوں نے خطوط، تار، ٹرنکال اور مسلسل ٹیلیفون کے ذریعہ شاعر کی طویل غیر حاضری پر اپنی تشویش کا اظہار کیا اور ہمیں حوصلے بھی دیے۔

جنوری ۱۹۸۹ء سے اخباری دنیا میں کئی انقلاب آئے ہیں۔ کاغذ کے دام دوگنے ہو گئے۔ طباعت کے تمام شعبوں میں زبردست تبدیلیاں آئی ہیں کہ ہر چیز کے نرخ آسمان پر ہیں۔ بڑے بڑے تجارتی اداروں نے اپنے رسائل و جرائد کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا، اشتہارات کے نرخ بڑھا دیے۔ کئی رسائل و اخبارات تو بند ہی ہو گئے۔ اب سوال یہ ہے کہ شاعر جیسے چھوٹے علمی و ادبی جرائد کیا کریں؟ ان کے لیے اشتہارات کہاں ہیں کہ نرخ بڑھائے جائیں۔ قیمت میں اضافہ کیا کریں کہ شاعر ویسے ہی مہنگا پرچہ ہے۔ جب دو تین روپے قیمت میں اچھی کتابت و طباعت میں سجے سجائے رسالے مارکیٹ میں مل جاتے ہیں تو ہم قیمت کہاں سے بڑھائیں! جوازی سائز میں ڈھائی سو صفحات کا نمبر ۵ روپے میں دستیاب ہو کہ کاغذ اعلیٰ کوالٹی کا استعمال کیا گیا ہو کہ شاعر جیسے رسائل اپنے سرورق پر بھی ایسا کاغذ استعمال نہ کر سکیں، شاعر کی قیمت کیا بڑھائی جائے؟ حکومت کی طرف سے وضع کی گئی پالیسی میں علمی و ادبی جرائد خواہ وہ کسی بھی زبان میں شائع ہوتے ہوں، کوئی گنجائش نہیں، شائع ہوں یا بند

(بقیہ صفحہ ۴۷ پر دیکھئے)


SUPER
Vasmol
33
نیا
تیز اثر سوپر
وسمول ۳۳
سفید بالوں کو شرطیہ تین دن میں قدرتی سیاہ بناتا ہے۔
سوپر وسمول ۳۳ سائنٹفک طریقوں سے تیار کردہ چکنائی سے پاک بالوں کا تیل ہے جو سفید بالوں کو قدرتی سیاہی بخشتا ہے۔
ہائجنک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹۲ بمبئی ۴۰۰۰۰۱
HYGIENIC RESEARCH INSTITUTE Post Box 1192, Bombay 400 001


IT'S JUST NOT EXCELLENT, IT'S
253
EXCELLENT
NO 253
EXCELLENT
PLAYING CARDS
T.M.R.No.176412
METRO PLAYING CARD CO.
BOMBAY - 29
METRO PLAYING CARD CO.
Metro Estate, Bombay-400 029. ● TEL.: 531687

Regd No MH-BYW 311 Price Rs 5

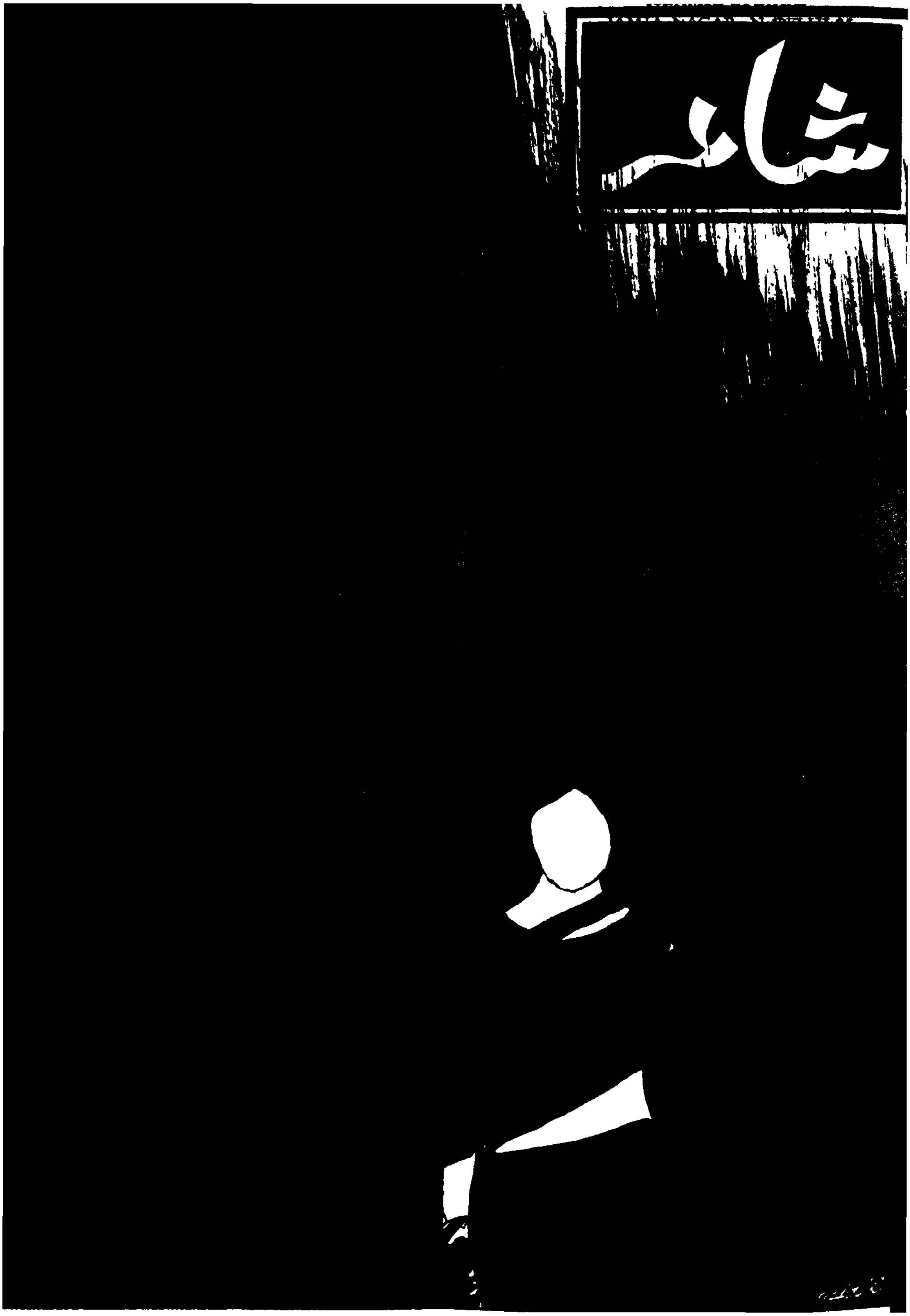
THE 'SHAIR" (MONTHLY) BOMBAY-400 008.

60 Years of Publication ✱ (Publishing Date 27-28) ✱ Issue No 3 1989✱ Telephone No 359904

Registered with the Registrar of Newspapers at R N No 14482 5'



پرنٹر، پبلشر، مالک، ناظر عمان محمد تلی نے ملٹی [illegible]


شاعر



# سائل دہلوی

۲۰ شوال ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۷ء — ۷ شوال ۱۳۶۴ھ مطابق ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء

رئیس ملک سخن گستری و پیرو داغ
مئے کہن سے لبالب بھرا ہے تیرا ایاغ
فصاحتیں بھی ہیں تیری فصاحتوں پہ نثار
تو خانوادۂ نواب داغ کا ہے چراغ

تحقیق و تدوین: افتخار امام صدیقی

تخلیق: اعجاز صدیقی مرحوم

سراج الدین احمد خاں کنیت ابوالمعظم اور نواب حامدال لقب۔ ان کے والد کا نام مرزا شہاب الدین احمد خاں اور تخلص ثاقب تھا۔ حضرت سائل کے جدامجد نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر و رخشاں، فرمانروائے ریاست لوہارو تھے۔ نواب صاحب کے چچا اور مشہور شاعر الٰہی بخش معروف کی صاحبزادی امراؤ بیگم غالب سے منسوب تھیں۔ اوائل عمری میں والد کا انتقال ہوگیا تو آپ کے جدامجد نے پرورش کی۔ چوں کہ فرمانروائے لوہارو علم نجوم کے ماہر تھے لہٰذا ابوالمعظم رئیس قدر نام رکھا گیا لیکن مرزا غالب نے خاندانی ناموں کے لحاظ سے سراج الدین نام تجویز کیا اور وہ اسی نام سے مشہور ہوئے۔ ۱۴ سال کی عمر میں عربی اور فارسی کی اچھی تعلیم حاصل کی۔ مرزا ارشد گورگانی نے فن شاعری کی تعلیم دی اور سائل نے "رسالہ عبدالواسع ہانسوی" اور "حدائق البلاغت" ختم کرکے شاعری کی ابتدا کی۔ شروع میں ارشد گورگانی سے اصلاح لیتے رہے لیکن پھر ۱۹۰۰ء میں نواب داغ کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوگئے۔

ابتدائی تعلیمی مراحل میں مولوی قاسم علی ان کے اتالیق تھے۔ عربی کی ابتدائی کتابیں ڈپٹی نذیر احمد سے پڑھیں۔ طب کی تدریس عبدالحمید خاں سے کی۔ محدث دہلوی سے حدیث کا درس لیا۔ خوش نویسی کی مشق میر پنجہ کش دہلوی کے شاگرد مولوی رضی الدین احمد خاں دہلوی سے بہم پہنچائی۔

نواب سائل، دراز قامت، وجیہ چہرہ اور دلکش خد و خال کے مالک تھے۔ سر پہ چوگوشیہ ٹوپی، چوڑی دار پائجامہ اور انگرکھا، یہ ان کی وضع قطع تھی۔

استاد داغ سے سائل کا ایک اور بھی رشتہ تھا۔ داغ کی متبنّٰی بیٹی لاڈلی بیگم سے ۱۹۰۱ء میں ان کا عقد ثانی ہوا تھا۔ اس سے قبل وہ اپنی پہلی بیوی ممتو بیگم کو طلاق دے چکے تھے۔ لاڈلی بیگم، نواب سائل کے برادر اصغر، مرزا ممتاز الدین مائل کی بیوی تھیں، ان کے انتقال کے بعد وہ سائل کے نکاح میں آئیں۔

نواب سائل مشاعروں میں ترنم سے غزل سناتے تھے۔ کہتے ہیں کہ مشاعروں میں ترنم سے غزل پڑھنے کی ابتدا انھیں سے ہوئی ہے۔ جب وہ ترنم سے مسلسل پڑھتے تھے تو روح لذت گیر معلوم ہوتی۔

۱۹۳۸ء کے قیام حیدرآباد میں اچانک گر جانے سے سائل کی کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی جس سے وہ آخری عمر تک معذور رہے۔ سماعت و بصارت میں بھی ضعف پیدا ہوگیا تھا۔ دہلی میں انتقال ہوا۔

حضرت سائل کی شاعری اس دور کی یادگار ہے جب روایتی شاعری کا چلن عام تھا۔ استاد داغ کے بیشتر شاگردوں نے جس رنگ کی شاعری کی سائل اس کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ جن عناصر سے ان کی شاعری ترتیب پذیر ہوئی تھی ان میں لوچ، دل نشینی، چستگی، سلاست، روانی اور روزمرّہ کی کثرت ہے۔ ایسی شاعری جس میں فکر سے زیادہ جذبے کو اہمیت دی گئی ہو۔

# فکرِ امروز



آگرہ اسکول کا ذکر آگیا ہے۔ تو اس کی وضاحت میں چند سطریں اور لکھ دوں۔

آگرہ اسکول ہی بعض کوئی ادارہ خیال ۔ تھا۔ اس متعینہ اصلاح نے اس کا وجود متعین کیا اور مستحکم کر دیا۔ آگرہ یا اکبرآباد، دہلی اور لکھنؤ کے مابین ایک قدیم اسلامی دارالسلطنت ہے جہاں بابر، ہمایوں، اکبر اعظم اور شاہجہاں نے اپنا تختِ حکومت بچھایا اور دنیا بھر کے ممتاز اربابِ کمال کو وہاں دعوتِ مرکزیت دی۔ انتقالِ دارالحکومت کے بعد اکبرآباد کے مشہور علماء و شعراء دہلی اور لکھنؤ چلے گئے اور جس چیز نے یہاں نشو و نما پائی تھی اسے دہلی اور لکھنؤ میں عروج ملا۔

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ آگرہ ہی میں پیدا ہوئے، یہیں پروان چڑھے یہیں تعلیم و تربیت پائی اور یہیں سے دہلی گئے۔

میر تقی میرؔ بھی آگرہ ہی میں پیدا ہوئے، یہیں تعلیم پائی، یہیں شعر کہنا سیکھا، سنِ بلوغ کے بعد یہیں سے دہلی اور پھر دہلی سے لکھنؤ پہنچے۔

دہلی اور لکھنؤ میں مرکزیت قائم ہونے کے بعد اکبرآباد (آگرہ) کی حیثیت ایک ثالث کی سی رہی، وہ دیکھتا رہا کہ دہلی اور لکھنؤ میں لسانی اور علمی تحقیق کا زاویۂ نگاہ کیا ہے؟ کبھی تو اس نے اس فیصلے کو تسلیم کر لیا جس پر دہلی اور لکھنؤ کا اتفاق تھا۔ کبھی دونوں کے اختلاف سے فائدہ اٹھا کر "خذ ما صفا و دع ما کدر" پر عامل ہو گیا اور کبھی بہ حیثیت ثالث خود اپنا نظریہ پیش کر کے اس پر قائم رہا۔ اس طرح آگرہ کی زبان کو دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا عطر یا نچوڑ کہنا چاہیے اور آگرہ کی شاعری کو لکھنؤ اور دہلی کی شاعری کا تجزیۂ بہتر۔ اس کا ثبوت اکبرآباد کے قدیم مشاہیر شعراء کا کلام ہے جس میں زبان، محاورہ، اسلوبِ بیان غرضیکہ ہر انداز متوسط اور معتدل پایا جاتا ہے۔ "خیر الامور اوسطہا"۔ آگرہ اسکول اسی لسانی و ذہنی اعتدال کی تعلیم و تبلیغ کا ایک ادارہ ہے۔

سیمابؔ اکبرآبادی


بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بہ یادگار اعجاز صدیقی مرحوم

اشاعت کا ۶۰ واں سال

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

# شاعر

جلد ——— ۶۰
شمارہ ——— ۴

فون: ۳۵۹۹۰۴

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت :- ۵ روپے

| زرِ سالانہ | لائبریریوں سے |
| --- | --- |
| ۵۰ روپے | ۶۰ روپے |

| تاحیات خریداری | معاونین سے | ممالکِ غیر سے |
| --- | --- | --- |
| ۱۰۰۰ روپے | ۱۰۰ روپے | ۳۵۰ روپے |

شاعر، مکتبہ قصر الادب، بمبئی سنٹرل پوسٹ آفس پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶، بمبئی ۴۰۰۰۰۸

# فہرست

## مقالات



## نظمیں



## کہانیاں



## غزلیں



## منتخب غزلیں



## خود نوشت



## بساطِ سخن



## آثارِ لفظ لفظ



## بازیافت



## جرعات



سرورق
غزل

عمل
سلطانِ سبحانی


شمارہ نمبر ۴ ۔ جلد ۶۰
۱۹۸۹ء

# بہار اور یوپی کے بعد مہاراشٹر میں اردو

بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا اس طرح ایک طویل جدوجہد کا اختتام ہوا۔ یہی عمل یوپی میں بھی دہرایا گیا ہے۔ اعلان تو ہو چکا ہے لیکن ابھی بل پاس نہیں ہوا۔ یقیناً یہ حکومتِ وقت کے مستحسن اقدامات ہیں لیکن یہ اردو کا جائز حق بھی ہے۔ اب اس عمل کے پس منظر میں جو بھی سیاسی عوامل کارفرما رہے ہوں اس سے قطع نظر دیکھنا یہ ہے کہ ہم اردو والے اپنی ذمہ داریاں کسی حد تک نباہتے ہیں کیوں کہ محض یہ اعلان ہی کافی نہیں ہے، سچ پوچھیئے تو صحیح معنوں میں کام کا آغاز اب ہوا ہے کہ عملی طور پر ہمیں جو کام کرنے ہیں وہ اس سے قبل بھی ہم نے نہیں کیے ورنہ درخواستوں اور گذارشوں کی سطح سے بہت بلند ہو کر ہم نے بہت پہلے اپنے حقوق حاصل کر لیے ہوتے۔ اردو تحریک سے وابستہ افراد بخوبی جانتے ہیں کہ انھیں اپنی منزلوں کا علم ہے لیکن راستوں سے واقفیت نہیں۔ ہم نے راستے وہی اپنائے ہیں جو تحریروں اور تقریروں سے ہو کر گذرتے ہیں، جلسوں اور کانفرنسوں سے ابھرتے ہیں اور موٹی موٹی فائلوں کے دبیز کاغذوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ عمل کی یہ صورتیں سیاسی سطح پر بہار اور یوپی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان تو بنا سکتی ہیں لیکن کلی طور پر اردو کا نفاذ نہیں کروا سکتی کہ عمل کی تعمیری صورتیں تو کچھ اور ہی ہوتی ہیں، ہم کسی بھی علاقائی زبان کو معیار بنا کر اس کا تقابل کر سکتے ہیں۔

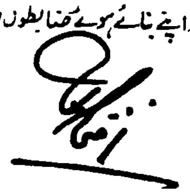
ایک طرف تو اردو پریس شکریوں اور تعریفوں کے ڈونگرے برسا رہا ہے، دوسری طرف ہندی، انگریزی اور علاقائی زبانوں کا پریس بین السطور میں کچھ اور ہی کہہ رہا ہے۔ اس وقت ملک کی نعمابے حد انتشار پذیر ہے۔ کشت وخون کے سلسلے دراز تر ہیں، الیکشن قریب ہے، چھوٹی بڑی اہم اور غیر اہم سیاسی جماعتیں اپنا اپنا منشور ترتیب دے رہی ہیں۔ اردو ایک بار پھر سیاست دانوں کے نرغے میں ہے۔ ایک بار پھر نئے نئے نقاب بننے لگے ہیں۔ مداری اپنا تماشا دکھانے آ رہے ہیں، تماشائی جمع ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ لیکن ان سب سے قطع نظر ہندوستان کی سالمیت اور قومی یکجہتی کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہندی اور اردو یہ دونوں ہی زبانیں اپنے آپ میں تال میل پیدا کریں، گو یہ کام شروع ہو چکا ہے اور بعض ہندی والے اردو کی حمایت میں سرگرم عمل بھی ہیں لیکن سوال یہی ابھرتا ہے کہ خود اردو والے عملی طور پر کیا کر رہے ہیں۔؟

اردو پورے ہندوستان کی زبان ہے۔ بہار اور یوپی کے بعد اسے ملک کی دیگر علاقائی زبانوں کے ساتھ دوسری سرکاری زبان کا درجہ ملنا چاہیئے ہم نے مہاراشٹر میں اس تحریک کا آغاز کر دیا ہے۔ ابھی اسے مدھیہ پردیش، مغربی بنگال، کرناٹک، آندھرا پردیش، گجرات، ہماچل پردیش، راجستھان، پنجاب، ہریانہ وغیرہ میں بھی کسی تحریک کی صورت ابھرنا ہے تاہم وہ بہار ہو یا یوپی یا مہاراشٹر کوئی اور صوبہ ہو یا پورا ہندوستان اردو والوں میں جب تک عملی بیداری پیدا نہیں ہوگی، کچھ نہیں ہو سکے گا کہ ہمارا قانونی ڈھانچہ ہی ایسا ہے کہ جہاں ایک بات کی اجازت ملتی ہے تو اسی کے ساتھ پابندیاں بھی لگ جاتی ہیں۔

کوئی اردو تحریک خواہ وہ کسی صوبے میں دوسری سرکاری زبان کے لیے ہو یا پھر پورے ملک میں ہندی کے مساوی مراعات کے حصول کے لیے ہو اس میں عوام کی شمولیت ضروری ہے اور عوامی سطح پر کیے جانے والے کاموں کی درجہ بندی، اس کا نفاذ اور اجتماعی سرگرمیاں، ان کی ترتیب اور نظم و ضبط ضروری ہے جس کی طرف آزادی کے بعد سے حالیہ برسوں تک توجہ ہی نہیں دی گئی۔ ہر تحریک کی اپنی ایک نفسیات ہوتی ہے جسے پورے معاشرے اور سیاسی تناظر میں دیکھا اور سمجھا جاتا ہے۔ اردو تحریک کی اپنی کوئی نفسیات ہی نہیں بن سکی ہے اور اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اس کی جڑیں عوام میں گہری نہیں ہو سکی ہیں۔

عوامی سطح پر کرنے کے بہت سے ایسے کام ہیں جو ایک بار شروع ہو جائیں تو ان کے نتائج از خود اردو کے بہت سے مسائل حل کر دیں گے۔ وہ کام کیا ہو سکتے ہیں اس کا اجمالی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس طرف اردو کے کسی ادارے نے توجہ ہی نہیں دی۔ مثلاً اپنے خطوں پر اردو میں پتے لکھنے کا عمل، ایک غیر ضروری خوف کے اسیر اردو والوں نے، جانے کیوں اس عمل کو ترک کر رکھا ہے۔ ! شاعر کے ادارئیے کا خاطر خواہ اثر ہوا ہے اور اردو میں پتے نہ لکھنے کی وجوہ سامنے آ رہی ہیں۔ بمبئی اور مہاراشٹر ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں اس تحریک کا خوش گوار اثر پڑا ہے۔ اردو تحریک کو مؤثر بنانے کا ایک اہم ترین عملی قدم ایک مدت سے رکا پڑا تھا۔ اس کی وجہ بھی غالباً یہی ہے کہ ہمارے بزرگوں نے نہ صرف عمل کی ان تعمیری صورتوں کو نظر انداز کر رکھا ہے بلکہ عوامی سطح پر کیے جانے والے اقدامات کی طرف بھی توجہ نہیں دی ہے۔

اردو میں پتے لکھے جانے کی مہم کو اردو عوام کامیاب بنانے کی کوشش میں ہیں تاہم اردو کے بڑے بھائی لوگ اور بزرگ، اردو اکادمیاں اور ایسے ہی تمام بڑے ادارے اب بھی خاموش ہیں۔ ان کی طرف سے کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی ہے، اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ لوگ یا تو اپنے بنائے ہوئے ضابطوں اور حدود کے پابند اور مصلحتوں کے اسیر ہیں یا پھر اس طرح کے کاموں کو غیر منفعت بخش ہی سمجھتے ہیں۔ [جاری]



# اصلاحِ سخن

## سید محمد مبین صاحب ماہر بیتھوی کی غزل پر حضرت مولانا احسن صاحب مارہروی مرحوم کی اصلاح

سرِ بزم گردشِ جام

ہے وہ شوخ دَورِ شراب ہی اور عدو کی محفلِ عام ہے ۱ کوئی اس کے ہجر میں جان دے بھلا اس سے کیا اُسے کام ہے

اگر اس پہ تجھ کو دماغ ہے کہ ستمگری ترا کام ہے ۲ تو مجھے یہ باعثِ فخر ہے میرا ظلم سہنے میں نام ہے

جو کہا کہ مرتا ہوں تجھ پہ مَیں تو لگا یہ کہنے وہ طنز سے ۳ ارے باز آ نہ یوں جان دے کہ یہ خودکشی ہی حرام ہے

شبانہ روز کی گردش

کسی بے وفا کے فراق میں کوئی دیکھے میری یہ جستجو ۴ کہ لگانا گردشیں رات دن مرا شغل ہے میرا کام ہے

نہیں / نہ چلا کہیں بھی مگر پتا / تمہارا

تجھے ڈھونڈا ہم نے تو جابجا یہ پتہ مگر نہ مجھے ملا ۵ کہ وہ کون ایسا مقام ہے کہ جہاں پہ تیرا قیام ہے

تو ہی دے پیام انہیں

وہاں جاکے میری طرف سے ان کو پیام دینا ہی صبا

۶

ہے تباہ ماہرِ خستہ جاں تری یاد اسکو مدام ہے

**توجیہ:۔**

(۱) اصلاح سے مصرع چست ہوگیا حالانکہ دَورِ شراب اور گردشِ جام ایک ہی بات ہے۔

(۴) گردش کرنا محاورہ ہے، نہ کہ لگانا۔

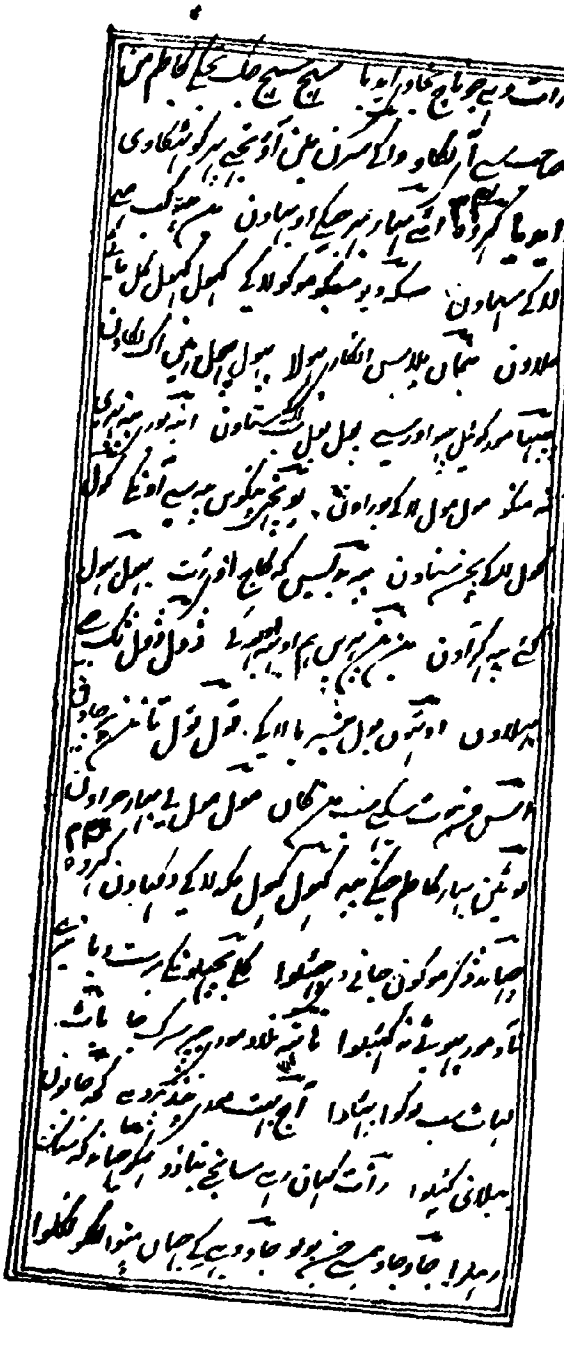
(۵) اس شعر کے مصرع اولیٰ میں تنزگربہ تھا، ایک جگہ تم نے لکھا گیا تھا اور دوسری جگہ "مجھے"۔ اصلاح سے مصرع اولیٰ چست ہوگیا۔ مصرع ثانی میں "کہ جہاں پہ تیرا" کی بجائے "کہ جہاں تمہارا" نے روانی پیدا کر دی

(۶) مصرع اولیٰ کے پہلے ٹکڑے میں کو "آنا چاہیے تھا لیکن وہ دوسرے ٹکڑے" پیام دینا ہی صبا کے ساتھ مل جاتا ہے اس نقص کو دور کرنے کے لئے اصلاح دی گئی ہے۔

اعجاز صدیقی

---

سا[illegible] کا اجراء فروری ۱۹۳۰ء میں آگرہ سے ہوا، فروری ۱۹۵۱ء سے اس کی اشاعت کا سلسلہ بمبئی سے شروع ہوا۔ جنوری ۱۹۸۰ء میں اشاعت کے پچاس [illegible] ہوئے اور اب جنوری ۱۹۹۰ء میں اس اشاعتی سفر کے ساٹھ سال مکمل ہو رہے ہیں۔ اس موقع پر شاعر کے لیے جو کچھ بھی کیا جائے گا اس کا اعلان تو [illegible] میں کیا جائے گا لیکن شاعر کی پرانی فائلوں [۵۰ - ۱۹۳۰ء] سے بعض ان مشہور کالموں کی تجدید اشاعت کا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے جو [illegible] شاعر کا حصہ ہیں۔ ان کالموں کی کل بھی ضرورت تھی، آج بھی ہے بلکہ آج اس نوع کے کالم کل سے زیادہ اہم ہیں کہ صغر ہوتی ہوئی زمین اور سکڑتی ہوئی [illegible] میں جہل کے سائے علم کی روشنیوں کے برابر آگئے ہیں اور ان کے پھیل جانے کا احتمال زیادہ ہے۔



**عکسِ تحریر شاہ کاظم قلندر**

قلمی سانت رس کا ایک صفحہ بخط مصنف۔ بہ سلسلۂ مضمون "کرشن بھکتی کے دو مسلمان شاعر" از محمد کمال الدین۔ یہ مضمون اسی شمارے میں ملاحظہ کیجیے۔

Phones. 710556 71073

رئیس امروہوی

۱۲۹۔ اے۔ مانک جی اسٹریٹ۔ گارڈن ایسٹ۔ کراچی ۳

RAIS AMROHVI

129/A MANAKJI STREET GARDEN EAST, KARACHI-3

تاریخ ۱۹۸۸

[illegible]

دعاگو

# رئیس امروہوی

ایک اہم شاعر، ادیب، صحافی، کالم نگار، سیاست داں، ماہرِ نفسیات اور کئی دیگر علوم و فنون میں دسترس رکھنے والے، اپنی ذات میں ایک ادارہ۔ ادبی و تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے ...... روحِ رواں، ہوش ربا، صورت گر، نفیس، جلیس، پورے اردو دنیا کے لیے محترم، معتبر، ہمہ وقت مصروفِ عمل، بے پناہ تخلیقی قوتوں کے مالک تم سب کے رئیس امروہوی ۲۲ ستمبر ۱۹۸۸ء کو کراچی میں ماسپردِ خاک کردیے گئے۔ انھیں نہایت ہی سفاکی کے ساتھ قتل کردیا گیا تھا۔ عمر بھر حق کی شمعیں روشن کرنے والا اپنوں ہی کے ہاتھوں بجھا دیا گیا۔

رئیس امروہوی مرحوم رسالہ شاعر اور اس کی پوری روایت میں اس طرح پیوستہ ہیں کہ بے شمار یادوں اور باتوں کی سمائی ان چند سطور میں ممکن نہیں۔ مرحوم نے اپنا مختصر سوانحی اشاریہ اور اپنی چار غیر مطبوعہ غزلیں بہ طورِ خاص شاعر کے لیے ارسال کی تھیں۔ اگست ۱۹۸۸ء تک ان سے مراسلت رہی تھی۔ ہم انھیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں، اس یقین کے ساتھ کہ کسی موقع سے ان کے متعلق شاعر میں تفصیل سے لکھا جائے گا۔

ع پردۂ دل پہ ابھی روشن ہے تو

## غزل

(رئیس امروہوی)

ڈھل گئی ہستیٔ دل یوں تری رعنائی میں
مادہ جیسے نکھر جائے توانائی میں

پہلے منزل پس منزل پس منزل اور پھر
راستے ڈوب گئے عالم تنہائی میں

گاہ گاہے کوئی جگنو سا چمک اٹھتا ہے
میرے ظلمت کدۂ انجمن آرائی میں

ڈھونڈتا پھرتا ہوں خود اپنی بصارت کی حدود
کھو گئی ہیں مری نظریں مری بینائی میں

اس سے محفل میں ملاقات بھی کم تھی نہ مگر
اف وہ آداب جو سیکھے گئے تنہائی میں

یوں لگا جیسے کہ دل لے کے دھڑک ٹوٹ گئی
تم نے وقفہ جو لیا ناز سے انگڑائی میں

منکشف دیکھے ہیں تری روح کے رستے ہوئے زخم
کون اترا ہے ترے قلب کی گہرائی میں

## غزل

(رئیس امروہوی)

محو ہر انجمن ہیں ہم لوگ
اپنے ہی جلاوطن ہیں ہم لوگ

وہ سبزہ و برگ سے ہو محروم
وہ شبنم بے کفن ہیں ہم لوگ

اے اپنی ہی خلوتوں میں محبوس
شاید تری انجمن ہیں ہم لوگ

خود اپنے شعور حال سے ملکوں
بے پیکر و پیرہن ہیں ہم لوگ

اے عالم رنگ رنگ تخلیق
آزردۂ جان و تن ہیں ہم لوگ

خود اپنے وجود ہی میں تقسیم
وابستۂ ہر کس ہیں ہم لوگ

ہر شہر کی شہریت سے محروم
ہر شہر میں بے وطن ہیں ہم لوگ

## غزل

(رئیس امروہوی)

کہیں سے سازِ شکستہ کی پھر صدا آئی
بہت دنوں میں اک آواز آشنا آئی

چلی کچھ آج کسی انداز سے نسیم سحر
کہ بار بار کسی کی صدائے پا آئی

شروع عشق میں اس سے بھی کچھ حجاب سا تھا
کبھی کبھی تو خود اپنے سے بھی حیا آئی

ہم اپنے حالِ پریشاں پہ بارہا روئے
اور اس کے بعد ہنسی ہم کو بارہا آئی

عجیب ٹھنڈی ہواؤں کی یاد کے جھونکے
کہ جیسے دل کے دریچے کھلے ہوا آئی

رہِ حیات میں کانٹے بکھیرنے والے
حیات بھی ترے در پر برہنہ پا آئی

چمن سے پہلے تو اک سیل آتشیں گزرا
پھر اس کے بعد برستی ہوئی گھٹا آئی

## غزل

(رئیس امروہوی)

ہم نے اے دوست رفاقت سے بھلا کیا پایا
دو رہے آپ ہی تو میں شجر بے سایہ

درد تو عقل کے اسرار سے بھی رہتا ہے
عشق کے تحفۂ دوراں کا ہے وہی سرمایہ

دیدہ و دل سے گزرتا ہے کوئی شخص اکثر
جیسے آہوئے رمیدہ کا گریزاں سایہ

میں ہوں خود اپنی ہی خاکستر جاں میں مدفون
صورت داغ چراغوں میں کوئی سرمایہ

کل فقط گیسوئے برہم تھے پریشاں ترے حسن
آج دیکھا تو انہیں اور پریشاں پایا





محمد علی صدیقی

اے۔ ۵۹۲ بلاک جے، نارتھ ناظم آباد، کراچی (پاکستان)

# اردو افسانہ اور پاکستانی معاشرہ

آج دنیا میں شاید ہی کوئی ایسی ادبی روایت ہو جس میں افسانہ کسی نہ کسی شکل میں موجود نہ ہو۔ قصوں اور داستانوں کے ذریعہ ایک نسل اور علاقہ کے زمانی اور مکانی محسوسات کو جس طرح تخلیقی طور پر سوچا گیا اور تخلیقی طور پر برتا گیا افسانہ یا افسانہ سے ملتی صنف۔ سچ پوچھئے تو یہ میں آتی چلی گئی۔ مختصر افسانہ انسان کی مجبوری ہیں۔ مجبوریاں تو اور بھی بہت کچھ ہیں لیکن وقت اور فن کے مابین روزِ آفرینش سے جو جنگ جاری ہے وہ اسے مجاز اور اپنے زاویہ ہائے نظر موقع اور ضرورت کی مناسبت سے وضع کرتی رہی ہے۔

پاکستان کا اردو افسانہ برِصغیر کے اردو افسانہ کی روایت سے گہرا تعلق رکھتا ہے ہر چند کہ موقع اور ضرورت کے فرق سے پاکستان میں لکھے جانے والا افسانہ ہندوستان میں تحریر ہونے والے افسانہ سے مختلف ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ایسا ہونا ہی تھا اور ایسا ہونا ناگزیر بھی ہے لیکن ہمارے افسانوں کے مرکزی حوالے سے جس نوع کے معاشرہ کی صورت گری ہوتی نظر آرہی ہے اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ ترقی اور تبدیلی کے تمام تر دعوؤں کے باوجود افسانہ جس منظرنامہ کو پیش کر رہا ہے وہ ٹرن حد تک سماجی و معاشی عدل سے محروم ہے، بیسویں صدی کی ناگزیر ذہنی فضا بھی محض "حرِ بروں" کی حد تک حال خال نظر آتی ہے، سیاسی صورتِ حال خاصی غیر اطمینان بخش ہے، ادیب بڑی حد تک بالو بیرونی عنصر بنا دیا گیا ہے یا وہ بہر اس درجہ سیاسی ہو چلا ہے کہ ایک جانب علامتوں کے زوال کا گلہ ہے اور دوسری طرف علامتوں کے یکسر مختلف النوع استعمال پر اصرار ہے۔ ہماری صورتِ حال میں علامتوں کی اہمیت اس وجہ سے بھی بہت فروں تر ہو چلی ہے کہ پیچیدہ مسائل جب نادرِ حل طلب رہتے ہیں تو پھر زبان پر بے پناہ دباؤ پڑنے لگتا ہے اور ہر ایک طرح سے معاشرہ میں تحمل و برداشت کی قوت میں کمی کی علامت ہے۔

پاکستان کی سماجی زندگی کے مطالعہ کے لئے بھی اردو افسانہ نے جس نوع کا مواد ہمارے سامنے رکھا ہے وہ ہماری سماجی تاریخ کا اہم اور حساس ترین باب ہے۔ ہم اردو افسانہ کے آئینہ میں پاکستان کی بدلتی ہوئی صورتِ حال کا جس طرح ادراک کر پاتے ہیں وہ پاکستان کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی تاریخ پر تحقیقی کتب کے ذریعے ممکن نہیں۔ لیکن اس نوع کے مطالعہ میں جس چیز کی کمی رہ جائے گی وہ خود پاکستانی سماج کی جیتی جاگتی تصویر ہو گی جس کے بغیر آنے والے زمانہ کا مورخ خود کو ایک اہم اور اسے محروم سمجھے گا۔

ہمارے یہاں افسانہ کے بارے میں بہت سے مباحث جاری ہیں جن میں سے ایک بحث کا دائرہ یہ بھی ہے کہ افسانہ کیا ہے۔ پروفیسر احتشام حسین کے خیال میں اردو افسانہ کی ابتدا اور نشوونما "بیسویں صدی کے ادبی شعور اور ذہنی ارتقا سے گہرا ربط رکھتی ہے"[1] انھوں نے اردو افسانہ کو ایک نئے شعور کا اظہار اور ایک نئی دریافت قرار دیا تھا جو "اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے کہانی کی اس ہیئت کا عکس معلوم ہوتا ہے جس کا ارتقا انیسویں صدی کے یورپ اور امریکہ میں ہوا۔"[2]

"نئی دریافت" اور "ایک نئے شعور کے اظہار" کی طرف احتشام صاحب کا اشارہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے قارئین نے

---

[1] عکس اور آئینے از احتشام حسین صفحہ ۹۵، ۹۶ [2] ادبی تاثرات حصہ اوّل۔ ل۔ احمد اکبرآبادی صفحہ ۱۲۱

اپنے معاشرتی مسائل کو افسانہ کے ذریعہ جس قدر زیادہ سمجھا ہے خاص طور سے ترقی پسند تحریک کے بعد سے۔ اور پھر حقیقت نگاری کے اس داعیہ کی وجہ سے کہ زندگی کے ڈرامہ کے لیے اسٹیج لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس ذرا اپنے کرے کا رُخ کسی فرد یا خاندان کی طرف موڑ دیجیئے اس طرح آپ پورا معاشرہ دیکھ سکیں گے۔ ایک فرد کی زندگی بھی اس جملہ اثرات سے عبارت ہوئی ہے جو ماضی اور حال کے مابین جنگ یا وصال سے پیدا ہوتی ہے اور نظریۂ علم THEORY OF KNOWLEDGF کے فرق سے ترقی یا تنزّلی کے بارے میں بہت ہی پیش پا افتادہ لیکن بہت ضروری تصورات پر روشنی ڈالتی ہے۔ افسانہ خواہ ل احمد اکبرآبادی کے مطابق "کسی ایک واقعے یا جذبے یا احساس کی تاریخ"[1] قرار پائے یا پھر سعادت حسین منٹو کے خیال میں محض ایک تاثر ہے۔ بہر حال واقعات پر سے گزرے وقت اور موڑ کی بازیافت کا فن ہے۔ بازیافت دیگر فنون کا بھی ایک باقاعدہ مسئلہ ہے۔ افسانہ کی حد تک الفاظ، بیانیہ کا تسلسل اور زیادہ سے زیادہ موثر COMMUNICATION کی صورت تلاش کرنے کا فرض سب فنکاروں پر عائد ہوتا ہے لیکن اس فرض سے بطریقۂ احسن عہدہ برآئی سب کے حصے میں نہیں آپاتی۔ بہت سے لکھنے والے اپنے اوزاروں سے جنگ کرنے ہوئے زندگی گزار دیتے ہیں۔ بہت سے ایک یا دو کوششوں ہی کے ذریعہ وقت اور سماج سے ابھی معاملت کا کچھ ایسا نقشِ جمیل چھوڑ جاتے ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاید فطرت نے افسانہ میں بیان کردہ تاثر ہی کے لئے وہ محفلِ ہستی سجائی تھی اور ہمارا افسانہ نگار عین اس وقت وہاں جا پہنچا تھا جب منظر تبدیل ہونے والا تھا یعنی ایک فنکار کی بروقت موجودگی اور اس کی جملہ FACULTIES کے روبکار آسکنے زندگی کی ایک قاش SLICF کو معدوم ہونے سے بچا لیا ہے۔ بقول اختر اورینوی "افسانہ کا ایمائی پہلو جانِ ادب ہے۔ ناول نویس شاہراہ حیات کا ایک مرقعہ پیش کرتا ہے اور افسانہ نویس گزرگاہِ ہستی کے کسی چوراہے کی تصویر"[2]

تقسیم برصغیر کے وقت آخر وہ کون سا موضوع تھا جو پاکستانی اور برصغیر کے دوسرے افسانہ نگاروں کے احاطۂ تحریر سے باہر رہ چکا تھا۔ جنگ عظیم دوئم کے براہ راست اور بالواسطہ اثرات، جنگ آزادی میں بھرپور شرکت، معاشی کساد بازاری کے سبب دنیا کے یکدم سکڑنے اور دوسرے ممالک میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کا اپنے ملک پر پڑنے والے اثرات سے پہلے پہلے آنکھیں چرانے اور پھر کچھ عرصہ بعد انھیں معتبر حقیقت کے طور پر تسلیم کر لینے کا رجحان، سماجی تبدیلیوں کے بارے میں مختلف رویّے، معاشی عدل کے باب میں ایک نئی سماجی شیرازہ بندی کا خواب ذات پات کی تفریق، انسانی بہیمیت، غربت، جہالت، گداگری، عصمت فروشی، جہیز، شادی بیاہ کے مسائل، شہری اور دیہی زندگی کے مابین ایک مقابلہ کی سی کیفیت اور خود شہری زندگی میں مروّجہ اخلاقی اقدار کی پائمالی غرضیکہ نہ صرف یہ بلکہ بہت سے مسائل کے بارے میں افسانہ نگاروں کی بڑی تعداد نے انسان دوستی کے حوالہ سے قلم اٹھایا اور اس طرح آہستہ آہستہ لیکن قابلِ ادراک طریق پر، ایک ایسی ذہنی تبدیلی کے لئے راہ ہموار کرنی شروع کی اس تبدیلی نے بڑی معاشی تبدیلی کی ناگزیریت پر یقین میں نہ صرف اضافہ کیا بلکہ غور و فکر کے جدید نظام کے لیے ایک بہترین فضا قائم کرنے میں مدد دی۔ ادیبوں کے فرائضِ منصبی کا یہی ایک رُخ اس قدر اہم ہے کہ اگر ہم ادب کی عینک سے پاکستانی سماج کا مطالعہ کریں تو بہت سی فروعی باتیں جنہیں خواہ مخواہ بھاری بھرکم فکر کے ساتھ جوڑ دیا گیا تھا اور آسمان سر پر اٹھا لیا گیا تھا وہ ادبی اظہار کی سطح پر اپنی توثیق VALIDITY نہیں کر پاتیں اور بہت سی ایسی تبدیلیاں جنھوں نے بادِ مخالف کے باوجود آغازِ سفر کیا بہت زیادہ اہمیت کی حامل نظر آنے لگتی ہیں۔ تخلیقی فنکار کے یہاں مندرجہ بالا اہتمامات SFLFCTIVITY ہی ادب کا وہ سب سے موثر ہتھیار ہے جس نے ادب کی ضرورت اور اہمیت کے احساس میں اضافہ کیا ہے اور اسے سماجی تاریخ نگاری میں غیر معمولی اہمیت کا حامل بنا دیا ہے۔ سماجی مطالعہ اور افسانہ کی منزلیں، بڑی حد تک ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔ ایک کے ذکر سے بظاہر تحقیق، تحلیل و تجزیہ کی جانب توجہ مبذول ہوئی ہے اور دوسرے کے ذریعہ زندگی کے کسی رُخ پر کچھ اس انداز میں روشنی پڑتی ہے کہ سارا منظر روشن ہو جاتا ہے اور ہم اس روشن منظر کی تعمیم کر پاتے ہیں۔

[ اس مضمون میں افسانہ کے بارے میں عمومی گفتگو اس لیے ضروری نظر آئی کہ میں نے اپنے مضمون میں صرف ان افسانہ نگاروں کو۔ اورا بعد منتخب افسانہ نگاروں کے صرف ایسے افسانوں کو پیش نظر رکھا ہے جو غالباً سماجی مورّخ کی کسی نہ کسی حد تک مدد کر سکتے ہیں۔ میں بہ غرض کر

---

[1] ادبی تاثرات حصّہ اول۔ ل احمد اکبرآبادی صفحہ ۲۲۱ [2] تنقیق و تنقید ڈاکٹر اختر اورینوی

کہ میں اپنے پیش نظر جملہ افسانہ نگاروں کی تخلیقات رکھنے کا دعویٰ نہیں کروں گا۔ بعض افسانہ نگاروں کا ذکر ان کی تخلیقات کی اہمیت اور پاکستان کے سماجی مطالعہ میں ضرورت کے طور پر ابھری ہے ممکن ہے کہ کسی اور تناظر میں صورت حال یکسر بدل جائے۔ ]

قیام پاکستان کے وقت اردو افسانہ میں احمد علی، ابوالفضل صدیقی، منٹو، قاسمی، بیدی، اوپندر ناتھ اشک، عصمت چغتائی، اختر حسین رائے پوری، عزیز احمد، غلام عباس، حیات اللہ انصاری، اے حمید، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، اختر اورینوی، شکیلہ اختر، کرشن چندر، اختر انصاری دہلوی، ابراہیم جلیس، سید انور، ممتاز شیریں اور قرۃ العین حیدر کے علاوہ کچھ اور افسانہ نگار بھی منظر پر موجود تھے۔ ان میں سے بعض شہرت کما چکے تھے اور بعض نے افسانہ کی دنیا میں نیا نیا قدم رکھا تھا۔ لیکن ان افسانہ نگاروں کی اہمیت میں کوئی کلام نہ تھا۔

مندرجہ بالا افسانہ نگاروں میں سے بیشتر نے حقیقت نگاری کے رجحان کا ساتھ دیا تھا۔ سماجی مطالعہ میں حقیقت نگاری کی اہمیت خاصی اہم ہو جاتی ہے۔ یہی ایک ایسا ذریعہ VEHICLE ہے جس کے ذریعہ سماج کی ہیئت ترکیبی اور سماجی رشتوں کے حقیقی تناؤ TENSIONS زیادہ کھل کر سامنے آتے ہیں۔ افسانہ جب تک کسی اہم فکری تناؤ TENSIONS سے گتھم گتھا نہ ہو بیانیہ کی سطح سے بہت زیادہ بلند نہیں ہو پاتا۔ اگر بیانیہ بھی صرف بیانیہ ہی نظر آئے اور ہمیں تھوڑی دیر کے لیے اپنے ساتھ لے کر نہ چل سکے تو وہ دیرپا افسانہ نہیں رہ پاتا۔ تو پھر میرے اس مضمون میں زیادہ تر "دیرپا" افسانوں کی بنیاد پر کچھ باتیں کہی گئی ہیں۔ "دیرپا" ظاہر ہے کہ یہ ایک اضافی اصطلاح ہے اور اس کے بارے میں بحث و مباحثہ ہو سکتا ہے۔ آپ حضرات کی آراء میری رائے سے مختلف ہو سکتی ہیں اور یہی وہ حق ہے جو ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ رہ کر اور ایک دوسرے کو سمجھ کر کمایا ہے۔ ان دنوں تحریر ہونے والے افسانے اگر تقسیم برصغیر کے شروع بارہ تیرہ سال کے افسانوں کے مقابل رکھ دیے جائیں تو ایک دور کے بارے میں عمومی خیال دوسرے یعنی آخرالذکر دور کے عمومی خیال کے بارے میں یہ سرگوشی کرتا ہوا ملتا ہے کہ پہلے فراخدلی زیادہ تھی اور اب ایسا نہیں ہے۔ فراخدل معاشروں میں حقیقت پسندی کا عروج ہوتا ہے اور بیانیہ اس قدر ترقی یافتہ ہو جاتا ہے کہ وہ تنگ دل معاشروں کی دانشورانہ جمناسٹک اور تجربیت EXPERIMENTALISM کے سامنے یہ معروضہ رکھتا ہے کہ فراخدل معاشرہ ہی روایت کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔ تنگ دل معاشرہ اپنے ان خوابوں کو محفوظ نہیں رکھ پاتا جن کی حفاظت کے لیے نظریہ کے دفاع کی دیواریں بنائی جاتی ہیں۔ بہت جلد ہی وہ وقت آجاتا ہے جب دیوار چین محض دیوار قہقہہ بن کر رہ جاتی ہے جب افسانہ میں بالائی سطح کے بظاہر سکوت کے نیچے موجزن تلاطم کو "مواد" بنایا جاتا ہے وہ لامحالہ طور پر EXPERIMENTAL اظہار کی طرف مائل ہو جاتا ہے لیکن بڑے فنکار کا سب سے بڑا امتحان ہی یہ ہے کہ وہ اپنے اسلوب کو کب تک EXPERIMENTAL رکھتا ہے۔ تجربیت کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ زیر سطح تلاطم دیکھنے والی آنکھوں کا مشاہدہ چند افراد تک محدود رہتا ہے اور اس طرح ادب اور زندگی کے مابین تفاعل باہمی میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ اس طرح تبدیلی کی قوتیں محض اخبارات کی سرخیوں کا جھاگ نظر آتی ہیں۔ ان قوتوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی بجائے ان سے پہلوتہی کا رجحان پیدا ہوتا ہے جو پہلے فرد کو معاشرہ سے، پھر فرد کو فرد سے اور پھر فرد کو خود سے الگ تھلگ کرنے پر منتج ہو جاتا ہے۔ یہ سراسر ترقی و تبدیلی کے خلاف مزاحم رجحان ہے اور ہمارے ... ملک میں اردو افسانہ نے گذشتہ ۴۲ سال میں اس ملک کے جملہ مسائل کے بارے میں آپ کی توجہ مبذول کی ہے۔ بیشتر اردو افسانہ نگاروں کا تعلق شہروں سے ہے۔ یہ بات اگر بطور الزام بھی دہرائی جائے تو اس سے یہ نتیجہ کہاں نکلتا ہے کہ افسانہ نگار اپنے تجربات کی حدود کو پھلانگ سکتا ہے لیکن شہر کے حاشیوں سے گاؤں کا نظارہ کیا جا سکتا ہے اور خود شہروں میں دیہی آبادی کے مسلسل نقل مکانی کی وجہ سے دیہات کی ناآسودگیوں کا ایک گونہ اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ ہمارے دیہات میں چھوٹے کسانوں کے لئے اب کوئی گنجائش نہیں ہے اور خود شہر جس طرح دیہات پر اثر انداز ہو رہا ہے اس کی روشنی میں حقیقت شہر اور گاؤں کی علیحدہ علیحدہ حد بندیوں میں نہیں ہے بلکہ ایک کی روشنی میں دوسرے کو پرکھنے اور دیکھنے میں ہے۔ جدید تر اردو افسانہ میں یہ رجحان خاصا مضبوط نظر آتا ہے اور اسے شہروں کی آبادیوں میں بے ہنگم اضافہ پر اظہار بیزاری ہی کہا جا سکتا ہے۔

اب ہم مرحلہ وار آگے بڑھتے ہیں ۴۲ سالہ دور تین حصوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) ۴۷ سے ۵۸-۵۹ (۲) ۵۸-۵۹ سے ۷۱ تک (۳) آج تک کا دور۔ پہلے دور کے چند اہم موضوعات ہیں۔ آزادی، نئے ملک کے قیام کی ضرورت اور اہمیت، فسادات، ترقی و تبدیلی کی خواہشات

اور ایک نئے رومان، تبدیلی کی ضرورت کا احساس جو ظاہرداری کے یکسر خلاف تھا۔ فسادات پر لکھے گئے افسانے ترقی پسندانہ حقیقت نگاری ہی کی توسیع تھے۔ جو یہ دراصل فسادات پر کیف افسوس تھا بھی ایک نا ہی REPRESENTATIONAL رویّہ تھا جس میں حقیقت نگاری کے ساتھ IRONY بھی در آئی تھی۔ جن افسانوں میں موخرالذکر خصوصیت ابھر آئی ہے وہ زمانے کے ابھرے پن سے دور نظر آتے ہیں جس وسعت نے فسادات کے گرد گھومنے والے افسانوں کو زندہ رکھا وہ حقیقت پسندانہ طرزِ اسلوب پر بھی لکھنے والے افسانہ نگاروں کے یہاں IRONY کی صلاحیت تھی۔ موخرالذکر صلاحیت واقعہ یا حادثے سے ذرا سی دُوری سے میسر آتی ہے۔ تاکہ میلوڈراما پن سے محفوظ رہا جا سکے۔ منٹو، قاسمی، قدرت اللہ شہاب، اشفاق احمد، ہاجرہ مسرور، اور خدیجہ مستور کے افسانوں میں جہاں جہاں IRONY ابھر آئی ہے ان کے افسانوں کی دربائی میں حد درجہ اضافہ ہو گیا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد کے مسائل، خواہ وہ فسادات سے تعلق رکھتے ہوں یا ایک کروڑ سے زائد افراد کی نقل مکانی کے مسائل۔ یہ مسائل بہ طور نو آباد ممالک کے سماجوں کی شکستگی CRIPPLENESS ظاہر کر رہے تھے جس تیزی کے ساتھ روحانی اقدار کے حامل معاشروں نے صدیوں پر محیط انسانی رشتوں کی بدلی کی تھی وہ ایک ڈراؤنے خواب سے کم نہ تھا۔ آزادی کی دیوی کا خون اور آگ کے دریا سے گزرنے کا منظر خاصہ روح فرسا تھا۔ ایک طرف یہ سب کچھ تھا اور دوسری طرف انسانی ابتلا سے فائدہ اٹھانے کے رجحان نے ہمارے سماج کی بنیادوں کو بہت کمزور ثابت کیا۔ اس صورت حال نے اس خیال کو جنم دیا کہ کیا انسانی رشتوں کے حوالہ سے غیر زمینی باتیں کی جا سکتی ہیں؟ اس پس منظر میں ایسے تمام افسانہ نگاروں کی تحریریں قابل توجہ ٹھہرتی ہیں جو جلتی آگ کے شعلوں کو اپنی تحریروں کے "رومان" سے بجھانا چاہتے تھے۔ وہ انسان کے حال سے مایوس ہوتے ہوئے بھی اس کے مستقبل سے مایوس نہ ہو سکے۔ کچھ افسانہ نگاروں نے اس صورت حال کے پس منظر رومان کو خیرباد کہہ دیا اور اس طرح زندگی نے دشمن قوتوں سے برسرپیکار ہونے کی بجائے یاسیت میں پناہ لے لی۔ جدیدیت کا فلسفہ کم سے کم اس فلسفہ کی وہ صورت جو ہمارے یہاں ترقی پسند روایت کے خلاف ردّعمل کے طور پر آئی ہے انسان اور اس کے آدرشوں سے مایوس ہے۔ جدیدیت کی روایت بنیادی طور پر بیزاری سے عبارت ہے اور اس کی زد میں سیاسی فلسفے ہی نہیں بلکہ خود مذہب بھی آتا ہے لیکن حیرت ہے کہ ہمارے یہاں مذہبی اقدار کے بعض ادیبوں نے بھی منفی جدیدیت کو صرف ایک ہدف کے خلاف استعمال کرنے کے شوق میں اس کی لازمی منطقی تقسیم یا SPILL OVER EFFECT کی طرف توجہ نہ دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وجودیت کو اس ملک میں ایک ایسی پناہ مل گئی جو ایک نوزائیدہ ملک کی تعمیر و ترقی میں معاون ہونے کی بجائے انفرادیت پسندی کی ایک ایسی لہر کی ترقی کا سبب بنی جو تعمیر و تشکیل ہونے کے بڑے ضروری عمل سے متصادم بھی۔ لوکاچ نے کہا ہے کہ جدیدیت وہ فلسفہ ادب ہے جس کے مطابق انسان ایک دوسرے سے باہم لاتعلق ذرات کے سلسلوں میں منقسم ہو جاتا ہے "MAN IS REDUCED TO A SERVICE OF UNRELATED FRAGMENTS" [1]

لایعنی اور مجہول جدیدیت مجموعہ یا صرف کے ادراک پر زور دیتی ہے نہ کہ اس کے کلی ادراک پر۔ یہ انسانی وجود کی مقصدیت کو کارِ لاحاصل سمجھتی ہے یہ ملاقاتِ ذات اور اپنے خارج سے متحد کرنے کی بجائے تلاشِ ذات پر زور دیتی ہے جو ایک نوع کی فراریت سے مشابہ ہے۔ ارونگ ہو IRWING HOWE نے اپنی تصنیف DECLINE OF THE NEW میں ڈی۔ ایچ۔ لارنس کا ایک قول نقل کیا ہے جو پاکستان کے بعض جدید افسانہ نگاروں اور ادیبوں پر صادق آتا ہے وہ یہ ہے کہ "میں خلقت کی انفرادیت سے بیزار ہوں۔ اپنے علاوہ خلقت کی انفرادیت کے احساس سے میرا سر چکرانے لگتا ہے"۔ ہمارے ملک کے سماجی حقیقت نگاروں نے جس دور میں رومانی یعنی مقصدی رویّہ اختیار کیا تھا وہ ملک کے معرضِ وجود میں آنے اور فطری طور پر اس کی تشکیل و تعمیر سے رغبت کا دور تھا۔ ہمارے یہاں جدیدیت کے معتقد و مبلغین اس حقیقت کو فراموش کر بیٹھے ہیں کہ D.H. LAWRENCE برطانیہ میں صنعتی نظام اور جمہوریت کی دو صدیوں کے TRIAL AND ERROR کی پیداوار تھا جب کہ ہم ابھی تک قبائلی اور جاگیردارانہ نظام کے سماجی ڈھانچوں کی بالادستی کے دور میں زندہ ہیں۔ ہمارے یہاں صنعتی انقلاب اور جمہوریت دوستی پر پلنے والا "رومان" ابھی تک ایک تاریخی ضرورت ہے اور ہمارے اپنے D.H. LAWRENCE کی پیدائش فی الحال اس قدر قبل از وقت نظر آتی ہے کہ اس دنیا میں ناسو

---

[1] "GEORGE LUKAS" THE IDEOLOGY OF MODERNISM P 10"

کا سمٹنا SHRINKING سمجھ میں آسکتا ہے لیکن بڑی مدت بعد کا خود بخود بڑی بات ہو جانا دور از کار بلکہ محال عقلی بات ہے۔

اسی لیے قاسمی سے انور سجاد اور پھر احمد داؤد تک کا سفر ایک "رواں" کا سفر ہے جو اسلوبیاتی سطح پر REPRESENTATIONAL کی بجائے موضوعی یا تاثراتی تو ہو سکتا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ ہمارے سماج میں حسیت کے تلازموں کا مقاطعہ DISSOCIATISM OF SENSIBILITY ظہور پذیر ہو چکا ہے۔ صرف اسی وقت ممکن ہے جب ڈی۔ ایچ لارنس اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے وکلاء اپنے ڈرائنگ روموں میں بیٹھے چند ہم نفسوں کو قوم سمجھنے اور پھر اسے مفروضہ کو درست سمجھنے کا بھی فیصلہ کر لیں۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ جدیدیت پسندوں نے سرفروشانہ انداز میں سسٹم برادری پر وہ دباؤ ہے اس کی جانب سے سماجی حقیقت نگاری کی اجتماع دوستی رکھنے دشمنی کا طعنہ بھی سمجھ میں آجاتا ہے کہ اس طرح تعمیر و تشکیل کی قوتوں کے خلاف بند باندھا جا سکتا ہے لیکن آخر یہ کس طرح ممکن ہے کہ انھیں "نظریہ" سے اصولی اختلاف میں عافیت نظر آئے۔ آخر وہ ایسے رجحان کے گرد CARL POPPER کی طرح ہر قسم کے نظریات کی اصولی مخالفت کیوں نہیں کرتے۔ ہمارے بعض افسانہ نگاروں نے "نظریہ" کو اوڑھنا بچھونا بنانے کی بجائے خاموشی سے در آتے ہوئے ان احساسات کی تہہ میں پہنچنا چاہا جہاں زندگی کی مثبت اور منفی خواہشیں URGES اپنی اصل حالت میں موجود ہیں اور اس طرح زندگی پر حکم لگاتی رہتی ہیں۔ یہ رجحانات بذات خود ایک مثبت رجحان ہے۔ اگر منٹو کی کہانیاں "بابو گوپی ناتھ" "ممی" "موذیل" "ٹوبہ ٹیک سنگھ" زندگی کے ایک رُخ کو پیش کرتی ہیں تو "کالی شلوار" اور "ٹھنڈا گوشت" دوسرے رُخ کو پیش کرتی ہیں۔ مؤخر الذکر کہانیوں میں "جنس" اقتضائے حقیقت کے طور پر آتی ہے اور زندگی کے بارے میں ہماری آگہی میں اضافہ کا موجب بنی ہے۔ منٹو، ممتاز مفتی، سعادت شیریں اور حسن عسکری پر یونگ یا ڈی ایچ۔ لارنس کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان افسانہ نگاروں کی خوبی یہ ہے کہ ان میں ہر ایک اپنا PERSONAL تخلیق کرنے میں کامیاب ہوا ہے جو کسی نہ کسی افسانے میں اپنے تخلیق کار کے ذاتی حالات کی ترجمانی کرتا رہتا ہے۔ قرۃ العین حیدر ہوں یا ممتاز شیریں، غلام عباس ہوں یا قاسمی، منٹو ہوں یا ممتاز مفتی اشفاق احمد ہوں یا اے حمید ان افسانہ نگاروں کے PERSONAS سامنے رہتے ہیں کہ افسانہ نگار سماجی تبدیلی کے بارے میں کہاں کھڑے ہوئے ہیں۔ اس صدی کے چوتھے عشرہ میں منٹو کے افسانہ "تماشہ" کا کردار خالد منٹو ہی کی نمائندگی کرتا ہوا ملتا ہے وہ ایک مقام پر کہتا ہے۔

" میں اپنے فرائض سے غافل نہیں ہوں۔ میری جان تک حاضر ہے۔ میرا مطمعِ نظر وہی ہے جو وطن کو آزاد کرانے والوں کا ہوتا ہے۔ میں اس جنگ میں جو ہم لوگوں نے شروع کر رکھی ہے، آخری دم تک لڑوں گا اس لیے کہ میں سمجھتا ہوں کہ وطن کے مصائب کا واحد علاج آزادی ہے۔ میری موت اس دیو سے لڑتے ہوئے ہوگی جس کو ملوکیت کے نام سے پکارا جاتا ہے ...."

آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ آزادی کے بعد منٹو کا PERSONA غائب ہو جائے یہ PERSONA "یزید" اور متعدد افسانوں میں بعینہ موجود ہے۔ معاصر نقاد فتح محمد ملک نے اپنے مضمون "افسانہ اور نیا افسانہ"[1] میں دلچسپ بحث چھیڑتے ہوئے پاکستان کے اردو افسانہ کے بارے میں ایک دلچسپ بات کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

" قیام پاکستان کے ساتھ ہی افسانہ نگاری (مختصر افسانہ اور ناول) کی اس روایت کا طلسم ٹوٹ گیا جو سن ستاون کی جنگ آزادی میں ناکامی کے ساتھ شروع ہوئی تھی۔ نقادوں سے پوچھئے تو وہ آپ کو بتاتے کہ اردو افسانہ نگاری کی روایت انگریز راج کی منجملہ برکات میں سے ایک ہے۔ اب مجھ سے پوچھا ہے تو سن رکھیے کہ اردو افسانہ تو سن ستاون کے ہنگامۂ دار و گیر میں کھو گیا تھا ..." ان کا خیال یہ کہ حقیقت نگاری کے "اولیں نمونے فراہم کرنے والے ان قصوں کی بنیاد اس جھوٹ پر ہے کہ

---

[1] افسانہ اور نیا افسانہ، ادبِ لطیف جوبلی نمبر ۱۹۶۳ء صفحہ ۴۱

انسانی زندگی کا سارا حُسن دولت و ثروت اور جاہ و منصب کا حُسن ہے۔ پس دیدہ و دل وا کر کے حیاتیاتی اور روحانی اقدار کی تخلیق و ترویج بے کار محض ہے۔ صرف ظاہر کی آنکھ سے تماشہ کیجئے اور معلومات کو علم کا اور وظیفۂ زوجیت کو عشق کا نعم البدل مانئے۔"

اس مضمون میں حقیقت پسندی کا انگریزوں سے تعلق اور اس بنیاد پر اس کی مذمت کا رجحان نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ فتح محمد ملک اور انتظار حسین کے مابین ایک نادیدہ اتفاقِ رائے کا پتہ بھی دیتا ہے۔ حقیقت پسندی کا تعلق کسی مخصوص معاشرہ سے وابستہ کرنا بذاتِ خود اس قدر دلچسپ خیال ہے کہ اس کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے یہاں حقیقت پسندی ایک "خوف" ہے اور ہم ہمہ اقسام کے خوف، وسوسوں اور نظریہ ہائے سازش کے اس درجہ خوگر ہو چکے ہیں کہ ہمارے نقادوں کی اچھی خاصی بڑی تعداد نے ہی تعقل و تجربہ کا سائنسی رویّہ اپنے اوپر حرام کر رکھا ہے شاید اسی وجہ سے ان نقادوں کی تحریروں سے پاکستانی سماج کا جو نقشہ ابھرتا ہے وہ صرف تلاشِ ذات کا سفر معلوم ہوتا ہے۔ خارج سے لاتعلق ہو کر نقشہ تو ایک طرف رہا خاکہ بھی تیار نہیں کیا جا سکتا۔ فتح محمد ملک نے اپنے متذکرہ بالا مضمون میں قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین، انتظار حسین، اور جمیلہ ہاشمی کے افسانوں میں ہجرت کے موضوع کو ہدفِ تنقید بنایا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ان حضرات کے یہاں حقیقت نگاری کا رومان ہے لیکن صداقت کا فقدان ہے۔ ان کا خیال ہے کہ تقسیم پاکستان کے بعد رومانیت اور حقیقت نگاری کے اسالیب موت سے ہم کنار ہو جاتے ہیں اور احمد ندیم قاسمی کی "صداقت پسندی" کا اسلوب روشنی کے مینار کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے (فتح محمد ملک نے یہ نکتہ احمد ندیم قاسمی کے مضمون "حقیقت اور صحتِ حقیقت" مطبوعہ نقوش جون ۱۹۵۰ء سے اخذ کیا ہے جس میں انھوں نے حقیقت پسندی اور صداقت پسندی کے بارے میں اپنے خیالات پیش کئے ہیں۔

میرے خیال میں حقیقت پسندی کا ایک واضح مفہوم ہے اور پاکستان کے ابتدائی زمانہ میں یہ رجحان۔ خود احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کے یہاں۔ اس قدر غالب رہا ہے کہ اس مسئلہ پر ذاتی پسند یا ناپسند کو ادبی رویّہ سمجھنے کی بجائے اسے ایک طرفہ ARBITRARY فیصلہ ہی سمجھنا چاہئے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک کے اردو افسانہ کا مطالعہ ہمیں پاکستانی معاشرہ کے ہر ایک رُخ سے اس طرح متعارف کراتا ہے کہ ہم آدرشوں کی حیات و موت کے بحران میں مبتلا ہوتے دکھائی دیتے ہیں ۱۹۵۴ء میں سے مشرقی بنگال میں مسلم لیگ کی شکست اور فوجی معاہدوں میں شرکت کے بعد سے ہمارے افسانوں میں خواب اور شکستِ خواب کا موضوع اہمیت اختیار کرتا چلا جاتا ہے حقیقت پسندوں نے دورانِ ذات کی جانب سفر کرنا شروع کیا اور ایک نئی حیثیت تشکیل پذیر ہوتی ہوئی نظر آنے لگی جس نے ۱۹۵۸ء تک ایک واضح شکل اختیار کر لی۔

۱۹۵۸ء کے بعد ہمارے یہاں اس دروں بینی نے علامتی تحریک کا رنگ اختیار کرنا شروع کیا۔ انور سجاد اور انتظار حسین کے افسانے، دو مختلف سطحوں پر تخلیل و تجزیہ کی جانب بڑھتے ہوئے ملتے ہیں۔ انتظار حسین کو اس ہنگام علامتوں کی اہمیت کا خیال پیدا ہوا۔ علامتیں بھی ایسی جو ماضی کو GLORIFY کرتی ہوئی ملتی ہیں۔ اسی زمانہ میں انور سجاد نے انتظار حسین کے یہاں علامتوں کے زوال کے احساس پر اس طور توجہ دی کہ اس نے اپنے آدرشوں کی علامتوں کو روشن کیا، ماضی میں پناہ ڈھونڈنے کی بجائے مستقبل سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ پیدا کیا اور اس طرح علامت نگاروں میں بھی ایک ایسا حلقہ پیدا ہو گیا جس نے علامت نگاری کی تکنیک کے میدان میں اشتراک کے باوجود علامتوں سے مستقبل آفرینی کا کام لینا شروع کیا، علامتی اظہار اردو افسانہ کے لئے یکسر نئی بات نہیں تھی۔ احمد علی کا افسانہ "میرا کمرہ" عزیز احمد کا "مدن سینا"، ممتاز شیریں کا "میگھ ملہار"، کرشن چندر کا "مہالکشمی کا پل" اور منٹو کے افسانے "پھندنے" اور "ٹوبہ ٹیک سنگھ" ایک لحاظ سے علامتی ہی تھے۔

انتظار حسین بلاشک و شبہ وہ واحد افسانہ نگار ہیں جنھوں نے علامہ اقبال کا سہارا لیتے ہوئے یہ داعیہ پیش کیا کہ اقبال کی شاعری علامتوں کی تجدید کی ایک تحریک تھی۔[۱۰] انھوں نے خیال ظاہر کیا کہ اس دس برس میں لکھنے والے نے حقیقت نگاری کے جوش میں باطنی زندگی کے سفر سے منہ موڑ لیا اور خارجی حقیقت کو براہِ راست دیکھنے کی اس میں تاب نہیں تھی اس لئے کترا کر جذباتیت میں پناہ لی حقیقت نگار جب حقیقت سے گریز کرتے ہیں تو جذباتیت میں پناہ لیتے ہیں۔[۱۱]"

---

۱۰، ۱۱ علامتوں کا زوال صفحہ ۱۵۱ (۱۹۸۳)

انتظار حسین نے باطنی وارداتوں کے حوالہ سے جو بات کہی ہے وہ صرف نصف صحیح ہے۔ دوسرا نصف سچ وہ ہے جس کا اعلان نئے علامت نگاروں نے سیاسی علامتوں کے ذریعے کیا ہے۔ اب انتظار حسین ان نئے علامت نگاروں کو بھی "جذباتی" قرار دیں گے چونکہ وہ جس زمانی ومکانی فریم ورک میں دلچسپی رکھتے ہیں وہ واقعتاً بہت پیچھے رہ گیا ہے۔

حقیقت نگاری ہو یا جدیدیت پسندی یا علامت نگاری اصل سوال یہ ہے کہ آیا افسانہ ہم عصری صداقتوں کی جانب محض اشارے کر رہا ہے یا رومان پسندی کے تقاضوں کے تحت انسانی صورتِ حال کی بہتر سمت میں تبدیلی چاہتا ہے۔ آیا یہ ہمیں جوگندر پال کے الفاظ میں زندگی کے مسائل میں بھرپور شرکت کی دعوت دیتا ہے یا ہمیں حقیقت سے چشم پوشی پر مائل کرتا ہے۔ اس بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے سماج میں ۱۹۵۸ سے ۱۹۷۱ تک بہرحال ایک ایسی صورت ضرور پیدا ہو گئی تھی جب باطنی علامتوں کے زوال کا نوحہ ممکن تھا۔ باطنی علامتوں کا زوال درحقیقت تیزی سے بدلتی ہوئی زندگی سے خوف کی علامت ہے اور ہمارے جدید افسانہ نگاروں کا وہ گروہ جو علامتوں ہی کے ذریعہ معاشرتی گھٹن اور استبداد کا نوحہ پڑھ رہا تھا اس نے ۱۹۵۸ کے بعد ایک ایسا افسانوی ادب تخلیق کیا جو جمہوریت کے فقدان کے زمانہ میں جمہوری امنگوں کا نہ صرف آئینہ دار رہا ہے بلکہ جس نے جملہ معاشرتی اور معاشی عدم مساوات اور سماجی انفعالیت کو ایک ایسے نظامِ سیاست کا لازمی نتیجہ خیال کیا ہے جو فرد کی آزادی اور جمہوری اقدار پر یقین نہیں رکھتا، قاسمی، غلام عباس، شوکت صدیقی، آغا بابر، انور، مرزا ادیب، الطاف فاطمہ، حمید کاشمیری، اور دیگر افسانہ نگاروں کے یہاں بہرحال، ایک ایسا رجحان نظر آتا ہے جو حکمراں قیادت کی غلط کاریوں پر کبیدہ خاطر ہے۔ ۱۹۷۱ کے بعد مشرقی پاکستان کے المیے نے اس کبیدہ خاطری میں حد درجہ اضافہ کیا۔ انتظار حسین نے ۱۹۷۱ کے المیہ پر متعدد افسانے لکھے۔ ان کا مجموعہ "شہر افسوس" مسعود اشعر کا "آنکھوں پر دونوں ہاتھ" اختر جمال کا "انگلیاں فگار اپنی" مسعود مفتی کے افسانے، علی حیدر ملک (بے زمین بے آسمان)، زاہدہ حنا (عیدی سانس لیتا ہے) اسے خیام اور راشد عمارہ کے بعض افسانے اس المیہ کی شدت کو سامنے لاتے ہیں۔ اگر ہم پاکستانی رسائل میں شائع ہونے والی تحریروں کو پیشِ نظر رکھیں تو پھر ان پاکستانی اور بنگلہ دیشی احمد سعدی، س۔م۔ ساجد، زین العابدین، غلام محمد، ایوب جوہر، ذاکر عزیزی نے بھی بطور خاص ۱۹۷۱ کے پس منظر میں بہت کامیاب افسانے لکھے اور اس طرح ملک کے اتحاد کی راہ میں پڑنے والی دراڑ کے پس پشت جھانک کر دیکھنے کی کوشش کیں۔

انتظار حسین نے بالخصوص مواد CONTENT اور ہیئت FORM کے فنکارانہ اتصال اور آمیزہ سے ایک ایسا اسلوب وضع کیا جو یاسیت اور حرماں نصیبی کے لیے انتہائی موزوں پیراہن نظر آتا ہے۔ ۱۹۷۱ کے المیہ سے انتظار حسین کی فکر میں یہ تبدیلی ضرور پیدا کی کہ وہ بھی سیاست کے ذریعہ انسانی مقدر HUMAN DESTINY میں تبدیلی کے قائل ہوتے دکھائی دینے لگے۔ کم از کم ماضی میں وقوع پذیر ہونے والے اثرات کے بارے میں اس کا یہ احساس دُہری مثال موجود ہے انور سجاد نے آمریت کے مختلف رویوں کے خلاف جس منفرد انداز سے آواز اٹھائی تھی اسے مسعود اشعر، احمد داؤد، اعجاز راہی، رشید امجد، مظہر الاسلام، محمد منشا یاد، عمر عباس، ندیم، آغا سہیل، رحمان مذنب، زاہدہ حنا، ذکا الرحمٰن، نسیم ترکی سعادت گدرو، نعیم آروی، حسن منظر، محمود فاضی، مشرف احمد، سلطان جمیل نسیم اور کچھ دوسرے افسانہ نگاروں نے بھی اپنے اپنے انداز میں لبیک کہا اور اس طرح پاکستانی معاشرہ کے سب سے حساس گروہ نے ۱۹۵۸ کے بعد سے آزادی کی پامالی کا شدت کے ساتھ احساس کیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے ایک مضمون علامتی افسانہ ایک منفی رجحان میں اظہار کی آزادی کو حقیقی جمہوریت کی اولین شرط قرار دیا تھا۔ ان کے خیال میں مارشل لا کے نفاذ کے بعد اظہار کی آزادی ہمارے معاشرہ سے مفقود ہو چکی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

> "یہی وہ صورتِ حال تھی جس سے نئی نسل کے افسانہ نگاروں کو حقیقت پسند افسانہ نگاروں کے خلاف ردِّعمل کے اظہار کا موقعہ ہاتھ آیا۔"[1]

ڈاکٹر جمیل جالبی کی رائے اہم بھی اور قابلِ غور بھی چونکہ حقیقی آزادی بذاتِ خود معاشی عدل ہی کی جانب ایک قدم ثابت ہوا کرتی ہے۔

---

[1] مطبوعہ اوراق، خاص نمبر مارچ ۱۹۸۴، صفحہ ۱۰

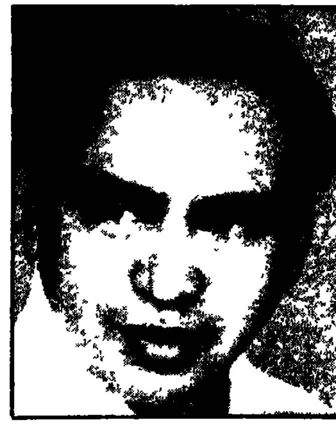
آزادی کے فقدان کی صورت میں معاشرہ یا قومیں کمزور ہو جایا کرتی ہیں اور اس طرح متعدد سماجی و معاشی برائیاں کچھ اس طرح جڑیں پکڑ لیتی ہیں کہ وہ پہلے محض مسئلہ تمام برداشت TOLERATE کی جاتی ہیں اور پھر اپنے لیے باقاعدہ جگہ بنا لیتی ہیں۔ اس موقع پر جدید اردو افسانہ کے ایک اہم نام قمر عباس ندیم کے افسانہ "کینسر" کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ قمر عباس ندیم نے غالباً یہ افسانہ لکھتے ہوئے سولزے نٹسن کے مشہور ناول CANCER WARD کو اپنے ذہن کے کسی کونے میں جگہ دی ہوگی لیکن اس نے پاکستانی معاشرہ کی صورتِ حال کو جس طرح تخلیق کیا ہے اس سے پورے معاشرہ کا عکس سامنے آ جاتا ہے اور "سرطان" کی علامت اس قدر موثر ہو جاتی ہے کہ ہم اپنے اردگرد سرطان کے پھیلتے ہوئے معنی حلقوں کے TENTACLES دیکھ کر محصور ہو جاتے ہیں۔

جدید اردو افسانہ کے پیچھے دو دہائی ا۔ ۹ کے افسانوں کی ایک خاص بات یہ ہے کہ علامت نگاری نے واضح طور پر دو شکلیں اختیار کر لی ہیں۔ ماضی پرستی اور نئی سائنسی بصیرت پر قائم ایک مستقبل آفرینی کا جذبہ جو حال کے انحراف REJECTION میں پوشیدہ تھا۔ دیہات سے متعلق افسانوں میں بھی ایک دروں بینی کی سی کیفیت در آئی۔ علام الثقلین نقوی، منصور قیصر، مظہر الاسلام، محمد منشا یاد، علی حیدر، زیتون بانو، کہکشاں ملک، محمود طارق، صغیر ملال کے افسانوں اور نسیم کنول اور شہاب محبوب کے ترجمہ شدہ اردو افسانوں نے دیہی زندگی کے بارے میں بہت گہری اور دور رس روشنیاں بکھیریں، یہ روشنیاں تکنیک کے حوالہ سے بھی ہیں اور مواد کے انتخاب کے حوالہ سے بھی۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ بیانیہ کے سپاٹ اور اکہرے پن کے خلاف چلائی جانے والی تحریک کے ساتھیوں میں سے متعدد خود بھی ہیئت یا FORM رومان کا شکار ہو کر رہ گئے جبکہ مواد کی اہمیت پر زور دینے والے بدستور غمِ ذات سے غمِ دنیا اور غمِ کائنات کی جانب سفر کرتے رہے۔ علامت نگاروں کی صف میں یہی وہ گروپ ہے جس نے کسی مخصوص تکنیک یا اسلوب یا روایتی روش کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے جمود کے سامنے سر نہیں جھکایا علامتی تحریک کے خلاف یہ بغاوت بذاتِ خود علامتی تحریک ہی کی توسیع ہے۔ اس تحریک کی وجہ سے ذات کے خول میں بند ہونے کے رجحان میں کمی آئی۔ علامت نگاروں کے اس گروپ نے معاشرہ اور اجتماعی مسائل کو پیش کرنے کا ایک ایسا ڈھنگ نکالا کہ علامتی افسانہ باریک، گہرے اور لطیف پہلوؤں NUANCES پر موثر گرفت کا مظاہرہ کرتا ہے جو بیانیہ کے سطحی اکہرے افسانہ نگاروں کے بس سے باہر ہے۔ خالدہ حسین کے متعدد افسانوں کے مطالعہ سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے افسانہ نگار ذہنی تناؤ TENSIONS کے اصل منبع SOURCE تک پہنچ چکی ہے۔ انور سجاد کا افسانہ "کونپل" اعجاز راہی کا "سہم طلمات" خالدہ حسین کا "دروازہ" "قیدی سانس لیتا ہے" قمر عباس ندیم "بند دروازے ہوا کے" اور "چیخ کا چہرہ" احسن مطر کا "ندیدہ"، مستنصر حسین تارڑ کا "کوئے مراد"۔ احمد داؤد کے "مکمل گناہ" کا بطورِ خاص ذکر کیا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ بھی متعدد ایسے افسانے ہیں جن کا ذکر ممکن ہے۔

یہ ایسے افسانے ہیں جو ہمیں معاشرہ سے اس معاشرہ کی ساخت، اس ساخت کے اندر جاری و ساری کشمکش اور ذہنی گھٹن اور دور کھلے منظروں میں زندگی کے لئے بیقراری اور والہانہ پن کا پتہ دیتے ہیں۔ جو سماج امید اور ارمانوں سے بہرہ ور ہو اسے زندہ سماج قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اردو افسانہ وقت کے اس اہم موڑ پر ایک بڑا اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ آپ اسے غیر یقینی صورتِ حال کے باوجود ایک رجائی ادبی رویہ قرار دے سکتے ہیں۔ چونکہ زندگی اور ادب کے باہمی ربط میں جو پہلو سب سے زیادہ قابلِ اطمینان ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ جب کسی صورتِ حال سے ملو DISCIPLINES مایوس ہونے لگتے ہیں تب بھی ادب اپنے سماج کے لئے بہتر زندگی کے خواب سے دستبردار نہیں ہوتا۔ آج کا اردو افسانہ جس استقامت کے ساتھ یہ بڑا فریضہ ادا کر رہا ہے وہ اپنی جگہ بہت خوش کن ہے۔

---

**اپنے خطوں پر پتے اردو میں لکھیئے ۔ اس عملی تحریک کو کامیاب بنائیے**



حمیدالماس

## پیکار

چلتے چلتے آج سائے رک گئے
پھر ہوئی دونوں میں حرکت اس طرح
برسرِ پیکار جیسے
مرتے مرتے کچھ نہ کچھ
مرنے والوں نے کہا ہوگا مگر
وہ صدائے حرفِ آخر ہے کہاں
جس کی لہروں میں صداقت بے اسیر
بڑھ رہے ہیں
کوچے کوچے میں فسادوں کے وحوش
بدگمانی کے نقوش

## تجزیہ

آج کیا بات ہے میرے گھر میں
کونے کونے سے سسکنے کی صدا آتی ہے
ایسے لگتی ہے صدائے گریہ
جیسے بپھری ہوئی بارش کی بھیانک آواز
زیرِ پا آتشِ مواج کی گونج
سرد راتوں کی خموشی میں
لرزتی ہوئی شاخوں کی کراہ
نالۂ خوابِ گریزاں
مہ و انجم کے تصادم کی گرج
ساری تشبیہیں ہیں بے سود مگر
میرے بچّے کی ہے بولی گویا
حمد پڑھتے ہوئے
معصوم پرندوں کی سہانی آواز

## ڈھانچے

جل رہا ہے
آتشِ خلوت سے ساحل
ایک جیسے ہیں زمین و آسماں کے رنگ
یادیں مر گئی ہیں
شورشِ رفتہ کی ہلکی سی صدائیں تک
نہیں ہیں ذہن میں
پھر یہاں
اجڑے ہوئے ساحل پہ آئیں گی
کہاں سے کشتیاں
دھندلی دھندلی سی ہے
فردا کی جبیں
کل کوئی ملاح آئے تو اسے
شاید فقط ڈھانچے ملیں

● ۹۲۲، آپ اسٹیئرز ۱۰ مین، ۹ واں بلاک، جیانگر، بینگلور ۵۶۰۰۶۹



رتن سنگھ

۲۲- آدرش نگر، نزد ارودُ جبلپور، ۴۸۲۰۰۸

# ایک گاتھا

دھرم گرنتھوں میں آیا ہے کہ پرانے زمانے میں ایک مہارشی اس دھرتی کے بیچ و بیچ ایک گھنے جنگل میں تپ کیا کرتے تھے۔ تپ کرتے کرتے ایک بار اُن کے من میں آیا کہ یہ تو ست یگ کا زمانہ ہے، ہر طرف سچ کا انصاف کا دور دورہ ہے۔ لیکن ست یگ کے بعد آنے والے لوگوں کو بہت دُکھ اُٹھانے پڑیں گے۔ اس لئے کوئی ایسا اُپائے کیا جائے کہ یا تو ست یگ کی معیاد بڑھ جائے یا آنے والوں یگوں میں لوگوں کو کم سے کم دُکھ اٹھانے پڑیں۔ اس مسئلے کا اُپائے سوچتے سوچتے آخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ست یگ کی معیاد تو بڑھائی گھٹائی نہیں جا سکتی۔ یہ تو پرماتما کے نیم میں خلل ڈالنے والی بات ہوگی۔ اس لئے اگر میں آنے والے لوگوں کے کلیان کے لئے گھور تپسیا کروں تو ہو سکتا ہے کہ اُن کے دُکھوں میں کسی حد تک کمی ہو جائے۔

بس ان کے من میں یہ آنا تھا کہ مہارشی نے سمادھی پر بیٹھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ جب وہ پورن سمادھی کے اوستھا میں رہیں گے تو اُن کے مادّی جسم کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ یہ اُن کے لئے کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ انہوں نے اُسی وقت یوگ مایا سے ایک رشی کنیا کو جنم دیا اور اُسے سارے کام کاج سمجھا بجھا کر مہارشی اپنی کٹیا کے اندر دھونی رما کر بیٹھ گئے۔

رشی کنیا کا روز کا معمول یہ تھا کہ صبح اُٹھ کر صاف پانی سے اشنان کر کے مہارشی کو پرنام کرتی، دھونی کی آگ کو تیز کر دیتی۔ لکڑیاں کم ہوں تو اور ڈال دیتی، فالتو راکھ اُٹھا کر باہر پھینک دیتی، پھر کٹیا کو جھاڑ پونچھ کر بگیا سے تازہ پھول توڑ کر مہارشی کے کمرے کو سگندھ سے بھر دیتی۔ دن کے وقت یا شام کو دیئے کی لو میں وہ بھی اکثر آلتی پالتی مار کر سمادھی میں گم مہارشی کو ایک ٹک دیکھتی رہتی تھی۔ ایسے موقعوں پر مہارشی کے ماتھے پر چمکتے ہوئے نور کی لو اُسے دھونی میں چمکتی ہوئی کسی آگ کی ننھی سی لپٹ کی طرح لگتی اور وہ سوچتی کہ اس روشنی کی مدد سے دنیا کے دُکھوں کا اندھیرا دور ہو سکتا ہے۔ وہ سوچتی مہارشی کی تپسیا سپھل ہو گئی تو آنے والے یگوں میں لوگوں کا کلیان ہو جائے گا۔

اس طرح وقت گزرتا رہا۔

کچھ دیر بعد جب کبھی کنیا نے اپنے آپ کو اکیلا محسوس کیا تو اُس نے بھی یوگ مایا سے کچھ رنگ برنگے پھولوں کی کایا بدل کر اُن میں جان ڈال دی۔ اور اس طرح اپنی کچھ سہیلیوں کو جنم دے دیا۔ اب وہ دن بھر اُن سہیلیوں کے ساتھ کھیلتی کودتی اور اسی دوران مہارشی کی دھونی کے لئے جنگل کی لکڑیاں بھی چن لاتی۔ اب اکثر ایسا ہوتا کہ مہارشی کا خیال رکھنے کے لئے اپنی ذمہ داری کچھ دیر کے لئے کٹیا کے دروازے پر پہرہ دے رہے شیروں یا کٹیا کے چاروں طرف چکر کاٹتے ہوئے ناگ ناگن کو دے کر رشی کنیا اپنی ان سہیلیوں کے ساتھ مل کر جنگل پیڑوں پر چڑھ کر ٹہنی ٹہنی گھومتی۔ سب سہیلیاں مل کر جنگل کے پھل پھول توڑتیں، کچھ کھاتیں، کچھ نیچے گراتیں، بیچ بیچ میں وہ کٹیا میں بھی جھانک کر دیکھ لیتیں۔ پھر پیڑوں سے اُتر کر وہ سرور میں تیرتی ہوئی اٹھکھیلیاں بھی کرتیں اور ندیوں کے پھول بھی پوجا کے لئے توڑ کر لاتیں۔ ایسے موقعوں پر رنگ برنگے پھولوں کی گیند بنا کر ایک دوسرے کو مارنا اُن کا سب سے محبوب کھیل تھا۔

وقت آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔

مہارشی کی سمادھی لگی رہی۔

اور رشی کنیا اور اس کی ساتھیوں کی عمر بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہی۔

ایک دن رشی کنیا اپنی ہمجولیوں کے ساتھ کٹیا سے کچھ دور اپر جنگل میں کھیل رہی تھی کہ اس نے سُنا کہ ایک پیڑ سے چڑیا کے ننھے منے بچے

چیخ کر آسمان سر پہ اُٹھائے ہوئے ہیں۔

لڑکیوں نے سوچا۔ ضرور بے چاروں پر کوئی مصیبت آپڑی ہے بس پھر کیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب لڑکیاں پیڑ پر چڑھ گئیں۔ رِشی کنیا سب سے آگے تھی۔ اُوپر جا کر وہ کیا دیکھتی ہے کہ ایک چیل، چڑیا کے گھونسلے کے عین اوپر منڈرا رہی ہے اور بوتوں پر جھپٹنے کے لئے پنکھ تول رہی ہے۔

رِشی کنیا غصّے میں تو تھی ہی اُس وقت پتہ نہیں دل میں کیا سوچا اور پھر ایک نظر گھور کر جو چیل کی طرف دیکھا تو چیل نے ایسا محسوس کیا جیسے کوئی تیر اُس کے جسم میں اُترتا چلا گیا ہو۔ اور وہ اُسی وقت پنکھ پھڑ پھڑا کر زمین پر گر پڑی۔

چیل کو گرتے دیکھ کر بوتوں نے سُکھ کی سانس لی۔ اور رِشی کنیا نے اُنہیں ہاتھوں میں اُٹھا کر اُن کے نرم نرم اور گرم پنکھوں پر ہاتھ پھیرا اور اُنہیں باری باری چوم لیا۔

جب رِشی کنیا اُن بوتوں کو واپس گھونسلے میں رکھ رہی تھی تو اُس نے یوں محسوس کیا جیسے گھنی گہری اور میٹھی خوشبو کا جھونکا اُس کے پاس سے گزر گیا ہو۔

" یہ خوشبو کہاں سے آرہی ہے ؟ رِشی کنیا نے من ہی من میں سوچا اور پھر چاروں طرف گھوم کر دیکھا۔ وہاں تو کچھ بھی نہ تھا، سوائے پیڑوں کی اوپری اوپری شاخوں کے۔ چاروں طرف نیلا آسمان پھیلا ہوا تھا۔ اور آسمان کے نیچے سنہری دھوپ دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

اتنی ساری دُھوپ ایک ساتھ دیکھ کر رِشی کنیا کا دِل کھل اُٹھا..... اور پھر....

"ارے یہ خوشبو! اتنی ڈھیر سی خوشبو۔ کہیں دھوپ کے کن ہی سے پھول بن کر تو نہیں کھل اُٹھے۔ اور پھر اس نے کچھ سوچا۔ اور ٹہنی پر بیٹھی اپنی ہمجولی سے پوچھا۔ " ارے تم کو بھی خوشبو آرہی ہے؟"

" ہاں آرہی ہے۔ ایک کے بجائے سب کی سب ہمجولیوں نے جواب دیا۔

"لیکن کہاں سے " یہاں تو کوئی پھول نہیں ہے۔"

"ہے " ہمجولیوں نے کھل کر ہنستے ہوئے کہا۔

"کہاں ہے "

اور رِشی کنیا کی سب ہمجولیاں اُس کی طرف دیکھتی ہوئی کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ تم ہو۔ اور ابھی ابھی کھلی ہو۔"

"کہاں ؟ کب ؟" رِشی کنیا نے حیران ہو کر ایک مرتبہ پھر اپنے چاروں طرف دیکھا۔

"اری پگلی۔ ابھی جب تم چڑیوں کے بوتوں کو چوم رہی تھیں تو تمہارے چہرے کا رنگ گُلنار ہو گیا تھا۔"

"لیکن یہ خوشبو ؟"

"ہاں! یہ تمہارے اپنے جسم ہی سے آرہی ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ ایک مرتبہ پھر ہنس پڑیں اور اُن کی ہنسی میں رِشی کنیا کی ہنسی بھی شامل ہو گئی۔

اور پیڑوں کے پتّے خوشی میں جھوم اُٹھے۔ تالیاں بجانے لگے۔

رِشی کنیا جوان ہو گئی تھی۔

اور ساتھ ہی اُس کی سکھیاں بھی۔

اِس واقعہ کے کچھ دن بعد کی بات ہے۔ رات کا وقت تھا۔ آدھی رات اِدھر اور آدھی رات اُدھر اچانک رِشی کنیا کی نیند ٹوٹ گئی۔ اُس نے اُٹھ کر کٹیا کے چاروں طرف دیکھا۔ اُس کی ساری سکھی سہیلیاں گہری نیند سو رہی تھیں۔ کٹیا کے دوسرے حصّے میں دیا جل رہا تھا۔ اور مہارشی اسی طرح سمادھی لگائے انتردھیان میں گم تھے۔ تبھی رِشی کنیا کی نظر باہر کی طرف پڑی۔ وہاں چاندنی کچھ اس طرح بچھی ہوئی تھی جیسے باہیں پھیلا کر رِشی کنیا کو باہر آنے کی دعوت دے رہی ہو۔ رِشی کنیا نے اپنے بکھرے ہوئے بال سمیٹے اور باہر چاندنی میں آگئی۔ وہاں بگیا کے پودے، پھول، جنگل کے پیڑ، سامنے سروور کی طرف جاتا ہوا راستہ سر بسر چاندنی میں نہائی ہوئی تھی۔ اور چاندنی دار کی پھوار بن کر رِشی کنیا کے روئیں روئیں کو چھیدتی ہوئی جیسے اُس کے وجود کی تہوں میں کہیں اُترتی جا رہی تھی۔ خوشی سے شرابور ہو کر اُس کا من جھوم اُٹھا اور خود بخود اس کے پاؤں سروور کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر ہو لئے۔

سروور میں چاروں طرف پھیلے ہوئے پھولوں نے اپنی سوئی سوئی آنکھوں سے جب رِشی کنیا کو آتے دیکھا تو وہ اپنی نیند توڑ کر کچھ طرح اکٹھے ہو گئے کہ اُن سے کنول کے پھولوں کی ایک خوبصورت ناؤ بن گئی۔

رِشی کنیا کو پھولوں کی یہ ادا بہت بھلی لگی اور وہ ناؤ پر سوار ہو گئی۔

ناؤ دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی۔ اور رشی کنیا اپنے اردگرد پھیلے ہوئے خوبصورت نظارے کو اپنی آنکھوں میں بسا رہی تھی۔ چاروں طرف دُور دُور تک پھیلا ہوا جنگل چاندنی کی چادر اوڑھ کر سو رہا تھا۔ اِس کے سامنے سرووَر کے ہلکورے کھاتے ہوئے پانی پہ تصویر تو اور بھی خوبصورت ہو گئی تھی۔ نیلے پانی پہ چاندنی کی پرت چڑھی ہوئی۔ اور اُس کے نیچے ایسا لگتا تھا جیسے سارا آسمان جھیل میں اُتر آیا ہو۔ ہلکا نیلا آکاش، آکاش پہ جھلملاتے تارے، گول گول سا نورانی چاند، سب کچھ تو جھیل کے اندر جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔ پھر جنگل کے پیڑوں کے سائے بھی جھیل کے پانی میں نہانے چلے آئے تھے۔

تبھی ناؤ کے پاس چھپ کی آواز ہوئی۔ رشی کنیا نے اِدھر اُدھر گھوم کر دیکھا تو ایک جل پری ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔ رشی کنیا کو اپنی طرف متوجہ پا کر جل پری اُسے پرنام کرتے ہوئے ایک بڑا قیمتی موتی اس کے چرنوں میں رکھ دیا۔

"اور یہ مہارشی کی بھینٹ" جل پری نے ایک اور بڑا سا موتی رشی کنیا کے ہاتھ پر رکھا۔

"لیکن وہ تو سمادھی میں ہیں۔" رشی کنیا نے کہا۔

"اُن کی سمادھی ٹوٹنے والی ہے۔ اِس لئے میں نے سوچا..."

"اُن کی تپسیا ختم ہونے والی ہے۔ یہ تمہیں کیسے معلوم؟" رشی کنیا نے پوچھا۔

ہم جل پریوں کو دھرتی پہ ہونے والی خاص گھٹناؤں کا تھوڑا بہت گیان ہوتا ہی ہے۔ رشی کنیا"

رشی کنیا اس سے کچھ اور پوچھنے ہی والی تھی کہ اُس نے دیکھا کہ جل پری نے سرووَر میں چھلانگ لگائی اور نیچے ہی نیچے اترتی چلی گئی۔ رشی کنیا کی نظر اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ لیکن جل پری کا پاتال کا سفر کہیں ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ تبھی رشی کنیا نے دیکھا کہ جل پری تو کہیں غائب ہو گئی ہے اور اُسے کوئی اور ہی دُنیا دکھائی دے رہی ہے۔ رشی کنیا کو اندازہ ہو گیا کہ وہ وقت کی حدوں کو پار کر آنے والے کلجگ کے دور کی دُنیا کو دیکھ رہی ہے۔

رشی کنیا کیا دیکھتی ہے کہ ہر طرف بھوک اور بیماری کا دور دورہ ہے۔ غریبی اور درد رتا نے ہر طرف پاؤں پھیلا رکھے ہیں، لوگ سے دُکھ اور درد کے جال میں پھنسے سسک رہے ہیں۔ اور نجات کا کوئی راستہ نہیں۔ ماں بچے کو بیچ رہی ہے۔ بیٹا باپ کو دھوکا دے رہا ہے۔ انسان، انسان کا دشمن ہو رہا ہے، اندھیرے مکانوں میں لوگ ایسے زندگی گزار رہے ہیں۔ جیسے گندی نالیوں میں کلبلاتے ہوئے کیڑے اور اُن کی زندگی میں روشنی کا کوئی گزر نہیں۔

یہ سب دیکھتے ہوئے رشی کنیا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور اُس نے سوچا کہ اچھا ہی ہے کہ مہارشی اِن کے کلیان کے لئے تپ کر رہے ہیں، بھگوان کرے کہ اُن کا تپ سپھل ہو۔

رشی کنیا نے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن دوسرے ہی پل وہ پھر نیچے پاتال میں دیکھ رہی تھی۔ اُس نے دیکھا کہ ایک بیل گاڑی ہے جو بیلوں کے بغیر ہی بڑی تیزی سے بھاگتی چلی جا رہی ہے،

"ہائے بھگوان۔ یہ گاڑی بیلوں یا گھوڑوں کے جوتے بغیر کیسے بھاگ رہی ہے۔ اِتنے میں گاڑی رُک گئی تو اِس نے دیکھا کہ گاڑی میں ایک بڑا ہی خوبصورت آدمی بہت بڑھیا کپڑے پہنے بیٹھا ہے اور گاڑی کے رُکتے ہی ننگ دھڑنگ بچوں، دھنگی عورتوں نے اُس گاڑی والے کے سامنے ہاتھ پھیلا دئے ہیں۔

"بابو جی کچھ مِل جائے۔ پیسہ دو پیسہ۔"

"کچھ کھانے کو بابو۔ میرا بچہ کئی دِنوں سے بھوکا ہے۔" ایک عورت گود میں اُٹھائے ہوئے بچے کو دکھاتی ہوئی گِڑگِڑا رہی تھی۔

لیکن وہ گاڑی والا اُن سب سے بیزار اُنہیں دُھتکار رہا تھا۔ گالی دے رہا تھا۔

یہ سب دیکھ کر رشی کنیا سے نہ رہا گیا۔ اور وہ زمانے اور وقت کی حدوں کو پار کر کے اُس خوبصورت آدمی کے پاس پہنچ گئی۔

"ارے گوتم۔ تمہیں اِن اناتھوں کی مدد کرنی چاہیئے۔"

اُس آدمی نے رشی کنیا کی طرف ایک نظر دیکھا اور بولا "اِن کی تو نہیں مگر میں تمہاری مدد ضرور کر سکتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اُس آدمی نے بڑی بھوکی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا اور اپنی گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

"چلو چلتی ہو"؟

رشی کنیا کو یہ سب کچھ عجیب لگا، اُس نے ایک نظر پلٹ کر اُس آدمی کی طرف دیکھا وہ اُسکی طرف میلی نظروں سے دیکھتا ہوا بہت ہی بدصورت ہو گیا

"تو کیا آنے والے زمانوں میں لوگ رشی کنیا کی طرف بھی میلی نظروں سے دیکھیں گے۔ اور وہ بھی گوتم جیسے لوگ۔ رشی کنیا سوچتی سوچتی سہم سے بھیگ گئی اور اپنی پھولوں کی ناؤ پر واپس آ گئی۔

وہ پتہ نہیں کب تک پاتال کی دُنیا کے خیالوں میں کھوئی رہتی، لیکن یہاں سرودر کے پانی پر اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ بڑے زور کا طوفان آیا ہوا تھا۔ شاید سرودر میں بڑی زور زور کی مچھلیں اُٹھ رہی تھیں۔ کنول کے پھولوں کی نازک ناؤ ڈانواں ڈول ہو رہی تھی اور وہ بے چارے کومل سے پھول بڑی مشکل سے رشی کنیا کو سرودر میں گرنے سے بچا پا رہے تھے۔

اب اِدھر تو رشی کنیا اپنی ڈگمگ کرتی ناؤ سے کنارے پر پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی اور اُدھر یہ ہوا کہ کوئی ڈراؤنا سپنا دیکھ کر اس کی ایک سہیلی کی نیند ٹوٹ گئی۔ اس کے جگانے پر باقی سکھیاں جب ہڑبڑا کر اُٹھیں تو انہیں یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ رشی کنیا اُن کے بیچ نہیں ہے۔ وہ جلدی سے باہر نکلیں تو سرودر کی طرف جاتی ہوئی پگڈنڈی پر گرتی ہوئی شبنم میں پاؤں کے نشاں دیکھ کر وہ جب سرودر پر پہنچیں تو رشی کنیا اپنی ناؤ سے کنارے پر اُتر رہی تھی۔

"آپ اِس وقت یہاں؟" سکھیوں نے پوچھا۔

"ہاں میری نیند ٹوٹ گئی تھی۔ اور تم؟"

"میں نے بڑا ڈراؤنا سپنا دیکھا تھا۔ ایک نے کہا۔ باقیوں نے بھی کہا کہ ڈراؤنا سپنا تو وہ بھی دیکھ رہی تھیں۔

"ذرا بتاؤ تو؟

میں نے دیکھا کہ۔

"ارے جنگل میں آگ لگی ہے۔ باپ رے باپ۔"

"کدھر؟"

"وہ دیکھو تمہارے پیچھے، سرودر کے اُس پار۔"

"ارے! کہیں کلجگ کی آگ ہمارے زمانے میں تو نہیں چلی آئی ہے"؟ رشی کنیا نے سوچا اور اپنی نظروں ہی نظروں سے آگ کو باندھ دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے آگ بجھ گئی۔

"ارے رشی کنیا۔ دیکھو یہ دو شیر آپس میں لڑتے ہوئے اِدھر چلے ہیں۔ لگتا ہے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں"،

رشی کنیا نے اُن کو بھی گھور کر دیکھا اور دونوں دُم ہلاتے ہوئے رشی کنیا کے پاؤں میں آگرے۔

"جاؤ بھاگو۔ آپس میں لڑنا اچھی بات نہیں ہے۔"

اور وہ دونوں شیر جنگل کی طرف ہو لئے۔

رشی کنیا! "یہ آگ یہ پانی، جنگل کے پھول، شیر، جانور، جاندار غیر جاندار سب کے سب آپ کی بات کیسے مان لیتے ہیں۔؟"

"ماننے ہیں ابھی تو ست یگ ہے۔ ورنہ کلجگ نہ ہو جائے۔"

رشی کنیا نے کہا چھوڑو اِن باتوں کو تم بتاؤ وہ سپنا کیا تھا؟"

"سپنا بڑا بھیانک تھا رشی کنیا۔ کیا بتاؤں۔ اِس کے تصور ہی سے میرے رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں۔ کیا دیکھتی ہوں کہ دو آدمی ساتھ ساتھ باتیں کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اتنے میں میرے دیکھتے ہی دیکھتے اُن میں سے ایک آدمی سانپ بن گیا۔"

"سانپ بن گیا؟"

"ہاں سانپ بن گیا اور اپنے ساتھ چلنے والے آدمی کو کاٹ لیا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

اِس کے بعد اُسی سانپ کی کوکھ سے سینکڑوں ہزاروں سانپ نکل کر دھرتی پر پھیل گئے، اور انہوں نے پوری زمین کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا میں نے دیکھا رشی کنیا کہ اُن سانپوں کے ڈر سے سمندر سوکھے جا رہے تھے اور بڑے بڑے پہاڑ ڈر کے مارے کانپ رہے تھے۔ اور اُن کانپتے ہوئے پہاڑوں سے بڑے بڑے پتھر نیچے گر رہے تھے اور لوگ اُن پتھروں سے بچنے کیلئے ڈر کے مارے بھاگ رہے تھے۔ لیکن بھاگ کے جاتے کہاں سب اُن پتھروں کے نیچے آ کر کچلے جاتے تھے۔ ہر طرف چیخ و پکار تھی۔ رونا دھونا تھا اور رشی کنیا سپنا سنتے سنتے سرودر کی تہہ میں دیکھتے ہوئے دردناک واقعات میں کھو گئی اور اُداس ہو گئی۔

جب وہ کٹیا میں پہنچیں تو دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ کٹیا کی بگیا کے تمام پھول اِس طرح گر کر زمیں پر بکھرے ہوئے تھے جیسے بہت بڑے طوفان نے پودوں کو جھنجھوڑ دیا ہو۔

کٹیا کے اندر جا کر رشی کنیا کو احساس ہو گیا کہ مہارشی کی سمادھی ٹوٹنے والی ہے۔ اُن کے چہرے کی طرف دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ مکمل سکون کی کیفیت سے نکل کر مادی دُنیا کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ وہ اور اُس کی سکھیاں مہارشی کے سامنے چپ چاپ بیٹھ گئیں۔ انہوں نے محسوس کیا کہ مہارشی کی اندریاں آہستہ آہستہ اپنے ارد گرد کے ماحول سے مانوس ہو رہی ہیں۔ یہ تبدیلی بہت ہی آہستہ آہستہ ہو رہی تھی لیکن یہ صاف ظاہر تھا کہ تبدیلی آ رہی ہے۔ اس لئے رشی کنیا نے کٹیا کو صاف ستھرا کر رکھ دیا۔ کچھ پھول باہر سے لے آئی سکھیوں کو بھیج کر کچھ پھول، سرودر سے منگوا کر رکھ لئے۔ وہ سارے انتظامات کر کے ہٹی ہی تھی، کہ مہارشی کی سمادھی پوری طرح ٹوٹ گئی

اور اُنہوں نے ادم ادم کا اُچارن کرتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔

سروور میں اشنان کرنے کے بعد جب مہارشی واپس اپنے آسن پر آکر بیٹھے تو وہ خوش نہیں لگ رہے تھے۔ پھر سہمی سی رشی کنیا نے ڈرتے ڈرتے پوچھ لیا "آپ کا تپ سپھل رہا؟"

مہارشی تھوڑا سا مسکرائے اور بولے "بھگوان کی اچھا کچھ اور ہے۔"

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ پھر مہارشی بولے "بگیا کے سارے پھول گرے ہوئے ہیں۔ کیا کوئی طوفان آیا تھا؟"

"طوفان آیا تھا۔ لیکن سروور میں۔"

"ہاں! اُس کا تو مجھے پتہ ہے" مہارشی بولے وہ کچھ دیر چپ رہے اور پھر بولے۔ رشی کنیا تم نے اپنی سکھیوں کا یہ کیسے روپ بنا لیا

"مہاراج یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ سب کی سب میری ہی روپ ہیں۔ یہ بتائیے کہ آپ کو سروور کے طوفان کی بات کیسے معلوم ہے۔"

وہ سب مایا تھی۔ مہارشی بولے، مایا ہی نے آدھی رات کو تمہاری نیند اچاٹ کی تھی۔ مایا ہی نے تمہیں اپنی شکتی سے پھولوں کی ناؤ پر بٹھایا۔ مایا ہی جل پری بن کر تمہیں موتی پیش کیا۔

"ارے یہ موتی تو پتھر ہو گیا۔!!" رشی کنیا، مہارشی کے چرنوں میں پتھر دیکھ کر حیران ہو گئی۔

"ہاں! یہ سب نظر کا دھوکا تھا۔ رشی کنیا۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ مایا ہی نے سروور کے پانی میں تمہیں کلجگ کی جھلک دکھائی۔ مایا ہی نے مجھے سمادھی کی اوستھا میں بتایا کہ سروور میں طوفان آیا ہے اور رشی کنیا ڈوب رہی ہے۔ اسی لئے مجھے سمادھی توڑ کر تمہاری ڈوبتی ناؤ کو کنارے لگانا پڑا۔"

یہ سنتے ہی رشی کنیا کی آنکھوں سے چھم چھم آنسو برسنے لگے تو مہارشی اپنے آسن سے اُٹھے اور اُسے اپنے گلے سے لگا کر اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"رشی کنیائیں رویا نہیں کرتیں۔ بھگوان جو کرتا ہے ٹھیک ہی کرتا ہے۔"

"لیکن میری وجہ سے آپ کی سمادھی ٹوٹ گئی آپ کی برسوں کی محنت بے کار چلی گئی۔"

"یہ اچھا ہی ہوا کہ سمادھی ٹوٹ گئی۔ کنیا جوان ہو جائے تو باپ کی سمادھی ٹوٹنی ہی چاہئے۔"

"نہیں مہارشی نہیں۔ میں اپنے آپ کو دوشی محسوس کر رہی ہوں۔ ایسی صورت میں تو میں ہرگز شادی نہیں کروں گی۔

شادی تو تمہاری ہونی چاہئے۔ اور تمہاری سکھیوں کی بھی۔ تم تو مجھے یہ بتاؤ کہ بر کیسا ہونا چاہئے؟

رشی کنیا کچھ دیر خاموش رہی۔ مہارشی نے دوبارہ پوچھا تو بولی "اگر ایسا ہی ہے تو میں شادی ایسے آدمی سے کروں گی جو آنے والی دنیا کو ان دکھوں سے بچا سکے جن کی ایک جھلک دیکھنے ہی سے میرا دل تڑپ اُٹھا تھا۔ جن کی وجہ سے سروور میں طوفان آگیا تھا، جنگل میں خود بخود آگ لگ گئی تھی اور بگیا کے سارے پھول ٹوٹ کر گر گئے تھے۔

"ہماری بھی یہی اِچھا ہے" رشی کنیا کی سکھیاں ایک آواز ہو کر بول پڑیں۔

مہارشی نے بڑے پیار سے ایک بار رشی کنیا کی طرف دیکھا اور پھر اُس کی سکھیوں کی طرف پھر وہ اُسی وقت اُن کے لئے مناسب بر کی تلاش میں نکل پڑے۔

مہارشی کا یہ سفر اُن کی تپسیا سے بھی زیادہ مشکل ثابت ہوا ہے۔

اِس بات کو ہزاروں سال بیت چکے ہیں۔

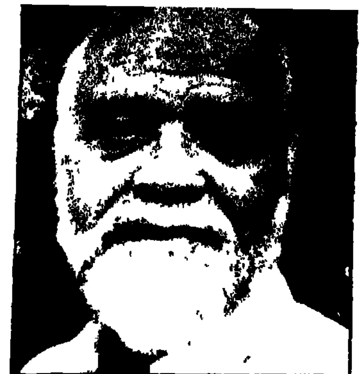
رشی کنیا اور اس کی سکھیاں گھنے جنگل سے گھرے اپنے آشرم میں انتظار کر رہی ہیں۔

مہارشی ابھی تک نہیں لوٹے۔ ✳

بقیہ صفحہ ۲۶ کرنی اور بھرنی

جیسے اور دھماکے سے محلّے والے جاگ اُٹھے۔ جس وقت ڈاکٹر مجید کو ملبے میں سے نکالا اس وقت تک وہ مر چکا تھا۔

ریحانہ نے گلی میں ذرا دور کھڑے ہو کر سب کچھ دیکھا اور ایک جھرجھری سی لی —— ڈاکٹر شبنم کی گاڑی کو وہ اچھی طرح پہچانتی تھی —— اس کے بریک بھی تو بیکار کیے جا سکتے تھے!!! ✳



## خلش بڑودی

. ورتوں پہ ہیں مائل طبیعتیں سب کی
لون لُوٹ گیا ہے محبتیں سب کی

، اک عذاب دلِ دردمند رکھنا بھی
زر رہی ہیں ہمیں پر اذیتیں سب کی

اک لفظ کا چہرہ ہے پھیکا پھیکا سا
ڈلی ہیں یہ کس نے حلاوتیں سب کی

اں تو چاروں طرف قتل ہو رہے ہیں لوگ
، کیسے دوں گا اکیلا شہادتیں سب کی

اے دوش پہ ہر آدمی سوار ہے آج
باں گئی وہ فراغت وہ فرصتیں سب کی

ھی گیا نہیں یارانِ رفتگاں کا خیال
ی تو پھرتی ہیں آنکھوں میں صورتیں سب کی

ے بھلے کا تمہیں بھی شعور آئے گا
اری طرح اٹھاؤ تو صحبتیں سب کی

میروں کی طرح ہم بھی جی رہے ہیں یہاں
بس بھی دھونی پڑی ہیں کثافتیں سب کی

لش اب اور بُرا وقت آنے والا ہے
ں دعا ہے کہ رہ جائیں عزتیں سب کی

اِس پار کی کوئی شے اُس پار نہ رکھ دینا
صحرا کی ہتھیلی پر گلزار نہ رکھ دینا

دنیا جسے کہتے ہیں اک جنگ کا میداں ہے
ہاتھوں سے کبھی اپنے تلوار نہ رکھ دینا

اب عزم بھی ہے دل میں تیشہ بھی ہے ہاتھوں میں
اب پھر مرے رستے میں دیوار نہ رکھ دینا

یہ حسن ہے جتنا بھی دھوکا ہے نگاہوں کا
اس داؤ پہ تم اپنا کردار نہ رکھ دینا

لکھنا ہے ضروری تو خط ان کو لکھو لیکن
لفظوں میں غمِ دل کا اظہار نہ رکھ دینا

مضبوط حکومت سے قوموں کی ترقی ہے
دلّی میں ظفر جیسی سرکار نہ رکھ دینا

جب تک نہ لگے ٹھوکر چلنے کا مزہ کیا ہے
رستہ مرے قدموں میں ہموار نہ رکھ دینا

دنیا کو ابھی ہم نے جی بھر کے نہیں دیکھا
دنیا سے ہمیں کر کے بیزار نہ رکھ دینا

کچھ نام خدا کا بھی لینے دو خلش اِن کو
لوگوں کی زبانوں پر اشعار نہ رکھ دینا

یاقوت پورہ، بڑودہ … گجرات



## محسن زیدی

اس رہ گزر سے آئیں کہ اُس رہ گزر سے آئیں
منزل تو سب کی ایک ہے چاہے جدھر سے آئیں

یہ ظلم دیکھئے کہ گھروں میں لگی ہے آگ
اور حکم ہے مکین نکل کر نہ گھر سے آئیں

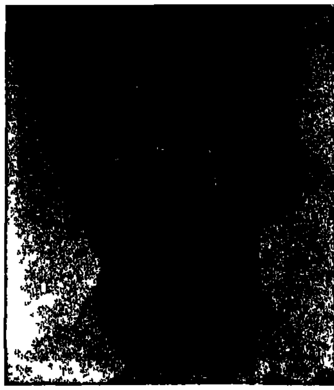
احباب کیوں تلاش کریں اور کوئی در
اُن کے لئے تو وا ہے یہ دل وہ ادھر سے آئیں

تم سے ملیں تو کیسے کہ دشمن ہے تاک میں
کس طرح بچ کے حلقۂ دامِ نظر سے آئیں

ہم تو کھڑے ہوئے ہیں اسی طرح سر بلند
اب جس قدر بھی سنگِ ملامت اُدھر سے آئیں

محسن نکل سکیں گے نہ وہ اس حصار سے
چاہے جدھر سے جائیں وہ چاہے جدھر سے آئیں

۱۷۷ راؤز ایوینیو، نئی دہلی ۲ ۱۱۰۰۰



انور عنایت اللہ

ایف - ۱۹، پہلا منزلہ، بلاک نمبر۲ - پی - ای - سی - ایچ سوسائٹی کراچی ۲۹

# کرنی اور بھرنی

یہ احساس عجیب جان لیوا تھا کہ آج کی رات وہ اس خاموش کوٹھی میں اس کے ساتھ تنہا تھا۔ کیسی عجیب رات تھی یہ جو ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ بے چین راتیں تو اس نے سندھ کے ان دور دراز کے علاقوں میں بھی گزاری تھیں جہاں دن کو وڈیرے کی حکومت ہوتی اور رات کو ڈاکوؤں کی۔ سرکاری افسر، پولیس، عدالتیں سب کچھ وہاں موجود تھیں لیکن زمینداروں اور ڈاکوؤں کی قوت کے مقابلے میں اکثر بے بس نظر آتیں۔ ان کی کشمکش میں وہ بس کر رہ گیا تھا۔ یوں تو وہ بھی سرکاری افسر تھا لیکن جہاں اسے سڑکیں بنانی تھیں وہاں رشوت کا بازار اتنا گرم تھا کہ اس میں کوئی دیانت دار افسر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے ایسے ہی کئی خطرناک علاقوں میں چھ سال گزارے تھے اور اب خدا خدا کر کے اس کا تبادلہ کراچی ہوا تھا۔

بستر پر کروٹیں بدلتے بدلتے اکتا کر اس نے تکیے کے نیچے سے گھڑی نکالی اور وقت دیکھا۔ صرف پونے دو بجے تھے۔ ابھی تو صبح کے اجالے میں کئی گھنٹے باقی تھے۔ جانے کب سے اسے اجالوں کا انتظار تھا اور اجالے تھے کہ پچھلے چھ سال سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔

جب اضطراب بڑھ گیا تو اس نے اٹھ کر ڈریسنگ گاؤن کے فیتے باندھے اور سگریٹ سلگا لیا۔ وہ اپنے تاریک کمرے سے نکل کر جوں ہی بالکونی میں آیا اس کے قدم وہیں رک گئے اور معاً اسے یوں محسوس ہوا جیسے آج رات نیند اس کوٹھی سے بہت دور تھی۔ تیز سنہری چاندنی چٹکی ہوئی تھی اور چاروں طرف ایک عجیب سکوت چھا گیا تھا۔ آج ہوا بھی خاموش تھی۔ یہ ایک لمبی بالکونی تھی جس میں دونوں خوابگاہوں کے دروازے کھلتے تھے عرفان نے دیکھا۔ وہ اپنے کمرے کے عین مقابل ریلنگ پر جھکی کچھ اس طرح کھڑی تھی کہ اس کی پشت عرفان کی طرف تھی۔ اس نے اپنے سفید ڈھیلے ڈھالے کپڑوں پر کسی گہرے رنگ کا ڈریسنگ گاؤن پہن رکھا تھا۔ ایسی حسین پاگل کر دینے والی چاندنی میں اکثر دل کی ویرانیاں اور بڑھ جائیں اور حی ایک انجانی پیاس میں تڑپ اٹھتا اور غم کی آگ سے دل سلگ اٹھتا اور زندگی اجیرن لگتی۔ عرفان تو ایسی بے چینیوں کا عادی ہو گیا تھا۔ لیکن آج اسے اتنے قریب دیکھ کر اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

چند لمحوں تک وہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ رات حسین تھی اور دونوں تنہا تھے اور دونوں آج بھی جوان تھے اور ان کے درمیان صرف چند گز کا فاصلہ تھا۔ لیکن اس اونچی دیوار کی وجہ سے اب یہ فاصلہ ناقابلِ عبور ہو گیا تھا جس کا نام دنیا والوں نے شادی رکھا تھا۔ اس سے جدا ہو کر عرفان نے اب تک شادی نہیں کی تھی۔ پچھلے چھ سال تک جنگلوں اور غیر آباد علاقوں میں بھٹکتے رہنے کے بعد اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ ریحانہ سے کبھی نہ مل سکے گا۔ لیکن جانے قدرت کو کیا سوجھی کہ کراچی آتے ہی اسے اس کا بچپن کا دوست مجید مل گیا جو شہر کا مشہور ڈاکٹر تھا۔ مجید اسے زبردستی گھر لایا تھا۔ یہاں آنے کے بعد عرفان کو پتہ چلا کہ ریحانہ، مجید کی بیوی تھی!

اس کے خیالات خدا جانے کہاں بھٹک رہے تھے کہ یکایک دور سے اسے ریحانہ کی آواز سنائی دی۔

"وہیں رک کیوں گئے عرفان؟ مجھے یقین تھا تم بھی سو نہ سکو گے!" اس نے بغیر مڑے کہا۔ اس کی آواز پر عرفان بری طرح سے چونک گیا اور اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے بعض باتیں خاموشی ہی میں کی جائیں تو بہتر ہوتی ہیں۔ اس نے غور

سے ریحانہ کو دیکھا۔ وہ بالکل نہیں بدلی تھی۔ اب بھی بے حد حسین تھی جیسے اس کے لیے وقت رک گیا ہو۔

رات کے کھانے پر سب سے زیادہ مجید ہی نے باتیں کی تھیں۔ کھانے کے بعد وہ کافی پی رہے تھے کہ ہسپتال سے مجید کے لیے فون آگیا تھا۔ کوئی ایمرجنسی تھی۔ اسے فوراً ہسپتال جانا تھا۔ یہ جان کر عرفان نے فوراً ہوٹل منتقل ہونے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ یہ سنتے ہی مجید نے قہقہہ لگایا تھا۔

"خدا کے لیے عرفان"۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ "میرا یقین کرو۔ ریحانہ بے حد بے ضرر ہے۔ ڈرو نہیں۔ تمہیں کھا نہیں لے گی!"

عرفان کے لیے ریحانہ کے ساتھ اس بڑی اور خاموش کوٹھی میں تنہا رات گزارنے کا خیال بڑا تکلیف دہ تھا۔ اسے اپنے آپ پر مکمل اعتماد تھا۔ یہ بھی صحیح تھا کہ ریحانہ اب شادی شدہ تھی اور اس کے دوست کی بیوی تھی۔ لیکن یہ بھی تو صحیح تھا کہ دونوں جوان تھے اور کبھی دونوں کو ایک دوسرے سے والہانہ محبت تھی اور آج کی رات بے حد حسین تھی ——— ایسی رات جب دل میں فتنے جاگا کرتے ہیں۔ ایسی راتوں میں تو بڑوں بڑوں کے پاؤں ڈگمگا جاتے ہیں۔

کھانے کی میز پر ریحانہ سے بہت کم باتیں ہوئی تھیں۔ کبھی کبھی دونوں کی نظریں ملتیں تو عرفان کو لگتا جیسے اس کی روشن چراغ جیسی آنکھیں کچھ کہنا چاہتی ہوں پر مجید کی موجودگی کی وجہ سے خاموش رہنے پر مجبور ہوں۔

ہسپتال جانے سے پہلے جب مجید اٹھ کر اپنا بیگ لینے کمرے میں گیا تو اس وقت یکایک عرفان کو یوں لگا تھا، جیسے ریحانہ کی جھیل جیسی گہری اور پُراسرار آنکھیں کہنا چاہتی ہوں

خدا کے لیے رک جاؤ عرفان ——— یہ صحیح ہے ہمارے درمیان ایک بڑی خلیج حائل ہے۔ لیکن کبھی کبھی یہ احساس بھی بڑا سکون دیتا ہے کہ وہ جو کبھی زندگی میں سب کچھ تھا، آج اس قدر قریب موجود ہے ——— قُرب کا یہ احساس تمہیں اچھا نہیں لگتا عرفان؟

اب ہوا میں خنکی پیدا ہو گئی تھی اور کہیں دور آوارہ کتوں نے بھونکنا شروع کر دیا تھا۔ صرف چند لمحوں پہلے اس نے ریحانہ کی آواز سنی تھی پر اسے لگ رہا تھا جیسے صدیاں گزر گئی ہوں۔ اسے یوں خاموش دیکھ کر وہ اس کی طرف مڑی، ایک طویل ٹھنڈی سانس لی اور آہستہ سے کہا۔

"کیا اب مجھ سے اس قدر خفا ہو کہ اب بولو گے بھی نہیں؟"

"ریحانہ!" اس کے منہ سے صرف اس کا نام ہی نکل سکا۔

"ہاں عرفان ——— تمہیں حیرت ہو رہی ہے نا کہ جس لڑکی نے کبھی اپنی محبت کا صاف لفظوں میں اظہار نہیں کیا تھا وہ آج کہہ رہی تھی ——— مجھے یقین تھا تم بھی سو نہ سکو گے ——— جیسے وہ اپنی بے چینی کا اظہار کر رہی ہو ——— وقت بڑا ظالم ہوتا ہے عرفان ——— وہ شرم اور حیا، روایات اور رسوم ——— مذہبی اور معاشرتی پابندیاں۔ سب کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ میں اب وہ ریحانہ نہیں رہی جسے تم جانتے تھے، جسے تم والہانہ چاہتے تھے۔ اب تو میں ایک آوارہ روح ہوں جو پچھلے چھ سال سے تمام بندشیں توڑ کر نکل بھاگنے کی فکر میں ہے ——— آج کی رات برسوں کے بعد مجھے یہ آزادی کا پیغام لے کر آئی ہے عرفان!"

یہ کہتے ہوئے وہ یکایک رک گئی اور اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے بالوں کی اس باغی لٹ کو آنکھوں پر سے ہٹایا جو پیشانی پر سے ہوتی ہوئی اس کے چہرے پر آگئی تھی۔

کیا کہہ رہی ہے یہ؟ ——— عرفان نے بے چینی سے سوچا۔ یہ حقیقت نہیں ہو سکتی۔ یہ یقیناً خواب ہے۔ ایسے خواب ٹوٹتے ہیں تو دل کی ویرانیاں بڑھ جاتی ہیں ——— خدایا ——— میں کراچی آیا ہی کیوں؟

"لگتا ہے تم واقعی مجھ سے بہت خفا ہو ——— کاش تم میرے قریب آ کر، میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھ سکتے کہ ان میں کتنا دُکھ بھرا ہوا ہے۔ یہ آنکھیں جو تمہیں کبھی بہت پسند تھیں اس قدر آنسو بہا چکی ہیں کہ اب ان میں صرف وحشت اور اضطراب اور مردوں کے لیے نفرت اور حقارت رہ گئی ہے۔ میں نے تو صرف بابا کی خوشی کی خاطر مجید سے شادی کی تھی۔ بابا کا خیال تھا تم ایک معمولی انجینئر ہو اور مجید ایک دولت مند ڈاکٹر۔ شادی کے بعد مجھے پتہ چلا کہ اس نے مجھ سے نہیں بلکہ بابا کی دولت سے شادی کی تھی۔ محبت اسے شمیم سے تھی۔ ڈاکٹر شمیم احمد جس کے ساتھ رات گزارنے وہ ہسپتال کا بہانہ کر کے آج بھی گیا ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہو تم؟" عرفان نے چونک کر پوچھا۔ اسے خود اپنی آواز اجنبی سی لگی۔

"ہاں ــــ ایک آدھ چاندنی رات وہ اس کے ساتھ ضرور گزارتے ہیں ــــ اسے بھلا کر یہ چاندنی راتیں میری روح کی ویرانیوں میں بھی ہلچل مچا سکتی ہیں ــــ میرے پیاسے مجروح جسم کو بھی بیدار کرسکتی ہیں۔ میرے دل اور دماغ میں بھی بجلیاں بھر سکتی ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ میں اُن کے راز سے واقف ہوں۔ پھر بھی ان کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ عورت کے لیے یہ احساس بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے ــــ اس احساسِ شکست کے ساتھ عورت کی انا جاگ اٹھتی ہے اور پھر ایسے زلزلے آتے ہیں جو بڑی بڑی عمارتوں کو پل بھر میں مسمار کرسکتے ہیں ــــ جانتے ہو آج مجید ہمیں تنہا کیوں چھوڑ گئے ہیں ؟"

"کیا اسے معلوم ہے کہ ہم ایک دوسرے کو کبھی چاہتے تھے ؟" عرفان نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہاں ــــ اس طرف دیکھو!" اس نے پورچ کی طرف اشارہ کیا۔ "ان کی کار وہاں کھڑی ہے۔ پچھلے چھ سال میں یہ کار ایک رات کے لیے بھی یوں گیراج سے باہر نہیں چھوڑی گئی۔ مجھے یقین ہے۔ اس کی چابی بھی آج اندر لٹک رہی ہوگی !" وہ رک کر عرفان کے قریب آگئی اور پوچھا۔

"جانتے ہو کیوں ؟"

"نہیں" عرفان نے جواب دیا۔

"اس لیے کہ وہ چاہتے ہیں کہ ہم تنہائی کا فائدہ اٹھائیں۔ میں انہیں مایوس نہیں کروں گی ــــ سنو عرفان ــــ میرے زیورات میرے ہی پاس ہیں۔ بینک میں میرے نام بہت سی رقم جمع ہے۔ کار سامنے کھڑی ہے ــــ چلو ــــ چپ چاپ یہاں سے نکل چلیں یقین کرو۔ وہ نہ ہمارا تعاقب کریں گے اور نہ پولیس ہی کو اطلاع دیں گے ــــ چلو فوراً انہیں کپڑوں میں نکل چلیں !"

یہ کہتے ہوئے ریحانہ نے عرفان کا ہاتھ اتنی مضبوطی سے تھاما کہ انگلیاں گڑ گئیں اور اس کے ساتھ ہی عرفان کے جسم میں آگ سی لگ گئی۔ جانے اس کمزور عورت میں دیکھتے ہی دیکھتے اتنی قوت کہاں سے آگئی تھی۔

"نکل چلیں ؟" عرفان نے گھبرا کر اس کے الفاظ دہرائے۔ "یہ کہاں ؟ ــــ اور مجید ؟"

عرفان نے مزاحمت کی لیکن اس کا لہجہ ایسا بے جان تھا جیسے اگر ریحانہ ذرا سا بھی زور دے تو وہ فوراً اس کے ساتھ ہولے گا۔

"مجید ؟ ــــ اس کی فکر نہ کرو۔" یہ کہتے ہوئے وہ آہستہ سے ہنسی اور پیار سے اسے اپنی طرف کھینچا اور اسے لپٹا لیا اور معاً ایک بار پھر عرفان کو یوں لگا جیسے وہ کوئی حسین خواب دیکھ رہا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد دو سائے چپکے سے کوٹھی سے باہر آئے۔ حسبِ توقع کار میں چابی لٹک رہی تھی۔ دونوں نے کار کے دروازے آہستہ سے بند کیے۔ چند لمحوں کے بعد کار اسٹارٹ ہوئی اور پھر پلک جھپکتے قیامت کی رفتار سے بڑے پھاٹک سے باہر نکل گئی۔

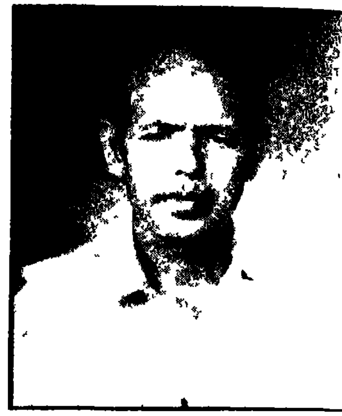
دور سے رات کے سناٹے میں گھڑی نے کہیں تین بجائے۔ قریب ہی کسی مرغے نے بانگ دی اور کوٹھی کے نیم تاریک ڈرائینگ روم میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کسی نے چپکے سے ٹیلیفون کا ریسیور اٹھایا اور ایک نمبر ملایا۔ کمرے میں روشنی نہیں کی۔

"ہائی شمو ــــ تمہیں زیادہ انتظار کرنا تو نہیں پڑا ؟ ہاں ہاں ــــ روانہ ہوئے ــــ قیامت کی تیزی سے بھاگے تھے جیسے ان کے تعاقب میں شیطان ہو ــــ اطمینان رکھو۔ زیادہ دور نہ جاسکیں گے۔ بریک میں نے بالکل بے کار کر دئے تھے۔ اس وقت سے کورنگی روڈ پر ٹرکوں کی آمد و رفت شروع ہو جاتی ہے۔ کسی نہ کسی سے ضرور ٹکرائیں گے ــــ میں چند منٹ اور انتظار کرلوں تو آجاؤں گا۔ میں نے تمہاری کار گھر سے دور گلی میں کھڑی کر رکھی ہے ــــ خدا حافظ !"

یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر مجید نے مسکرا کر ریسیور رکھ دیا۔ خوشی سے دونوں ہاتھ ملے اور پھر روشنی کیے بغیر صوفے پر ٹانگیں پھیلا کر سگار سلگایا۔ چند منٹ وہ خاموشی سے سگار پیتا رہا، پھر بے چینی سے ایش ٹرے میں رکھ دیا اور چپکے سے کوٹھی سے باہر نکل آیا۔

اب صبح کاذب کے آثار تھے اور بڑی سڑک پر ٹرکوں کی آمد و رفت شروع ہوگئی تھی۔ رات کی خاموشی میں یکایک ایک اور کار اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ چند لمحے اس کا انجن چلتا رہا۔ پھر گلی میں سے جوں ہی یہ کار بڑی سڑک پر آئی، سامنے سے ایک ٹرک آگیا۔ ڈرائیور نے بچانے کی بہت کوشش کی لیکن غالباً کار کے بریک فیل ہوگئے۔ ایک زور کا دھماکا ہوا، ایک چیخ فضا میں بلند ہوئی اور کار ایک بے بس تنکے کی طرح اچھل کر بیس گز پرے جا گری

[بقیہ صفحہ ۲۲ پر دیکھئے]



## وزیر آغا

# ہوا سے کہنا!

ہوا سے کہنا
خدارا اتنی نہ تیز آئے
کہ سبز پتے
لچکتی شاخوں سے ٹوٹ کر گر پڑیں
زمیں پر
ہوا سے کہنا!

ہوا کے جبر کے
نہ جانے کب سے میں سہہ رہا ہوں
مگر یہ جبر کا تو سارے جبروں سے سخت تر ہے
کہ سبز پیڑوں سے چادریں بھی اتارے وہ
تمام گہنے بھی چھین لے وہ
برہنگی کا عذاب نازل کرے زمیں پر
زمیں کے معصوم باسیوں پر

برہنگی سے نہیں ہے بڑھ کر عذاب کوئی
ہوا سے کہنا!

ہوا سے کہنا
خدارا اتنی نہ تیز آئے!!

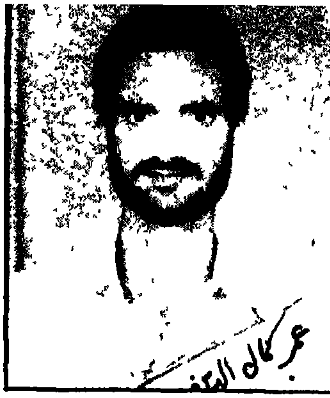
# دستک!

یہ دستک سی کیا ہے؟
ہر اک لمحہ دستک!
یہ دن رات اور ماہ و سال اور صدیاں
فقط دستکیں!
میرے سینے کی دھڑکن بھی دستک
ہوا رات بھر دستکیں دے کے
سوئے ہوؤں کو جگائے
پھیلی ہوئی۔ اپنے اندر بھی باہر بھی
چاروں طرف بے محابا بکھرتی ہوئی
چاندنی جس کو چھالی سے اپنی لگائے
یہ بھوری زمیں
آسماں کا سینہ بھاری دھڑکن کھٹکھٹاتی
خموشی کے ریزوں کو چن چن کے جھولی میں بھرتی
ازل اور ابد میں تنے
ایک ظالم اندھیرے کی چادر میں محبوس،
قرنوں کی آنکھیں جھپکتی ہوئی
بے ثمر، بے نتیجہ، پُر اسرار
دستک کی آوازیں
غرق ہوتی ہوئی!!

# صحرا کی بارش!

کہاں ہے وہ بادل
پرندے کہاں ہیں؟
کہاں ہیں وہ صحرا کے سینے سے
دم بھر میں باہر کی جانب
اڈتے، لپکتے ہوئے سرخ پھولوں کے چہرے
جو ندی کے ویراں کناروں کی
بے آب درزوں میں
سوئے پڑے تھے؟
کہاں ہے وہ ریکھا
کہ جس نے ہتھیلی کی ریکھا کو
جو ستلو بھرے دودھ سے بھر دیا تھا؟
کہاں ہے وہ ندی کہ جس نے مجھے
اپنے بنجر کناروں پہ
اُگنے دیا تھا
مہکنے دیا تھا
مجھے ایک پل کے لئے
اس کراں تا کراں پھیلی
صحرا کی پتھریلی چھب کے مقابل
کھڑا کر دیا تھا؟؟

۹۰ دی سول لائنز، سرگودھا (پاکستان)




عمر کمال الدین

معرفت نیر مسعود "ادبستان" دین دیال روڈ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

# کرشن بھگتی کے دو مسلمان شاعر

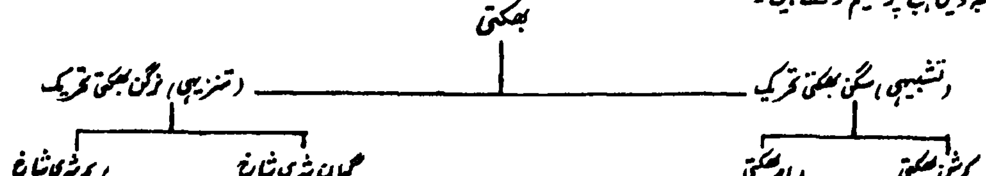
## (شاہ کاظم قلندر، شاہ تراب قلندر)

قصبات اودھ میں قصبہ کاکوری اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر ممتاز حیثیت کا حامل رہا ہے۔ علم وفضل، فقر و درویشی، شعر و ادب اور سیاست و صحافت میں اہل کاکوری کی خدمت تقریباً ڈھائی سو سالوں پر محیط ہیں جن کی بوقلمونی نے علم و ادب کے گنج گرانمایہ میں بیش قیمت اضافے کیے۔ زیر نظر سطور میں اس خانوادہ کے بانی حضرت شاہ محمد کاظم قلندر (۱۱۵۸ھ - ۱۲۲۱ھ) اور ان کے صاحبزادے شاہ تراب علی قلندر (۱۲۷۵ھ) کی ہندی شاعری میں کرشن بھکتی پریم بھکتی وارانہ ہم آہنگی اور صلح کل سے متعلق خدمات کا مختصر جائزہ پیش ہے۔

شاہ محمد کاظم قلندر نے اپنی شاعری میں مذہبی بے تعصبی، عدم تشدد، اخوت، مساوات، اتحاد و یگانگی کی تعلیم دی اور ذات پات کی تفریق سے نفرت، ظاہر داری، ریاکاری، دل آزاری، خود بینی و خود ستائی کی نفی کو اپنا شعار بنایا۔ اس کا بیّن ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ اگر ان کے جاں نثاروں میں منشی فیض بخش صاحب چشمہ فیض و تاریخ فرح بخش مفتی خلیل الدین خاں بہادر قاضی القضاۃ نجم الدین علی خاں بہادر ثاقب تھے تو ان کے ارادت مندوں و عقیدت کیشوں میں مہاراجہ ٹلیت رائے وزیر اودھ، لالہ بینی رام، لالہ شتاب رائے، لالہ مجلس رائے اور ٹھاکر پرشاد وغیرہ شامل تھے۔ کرشن جی کے تو وہ عاشق زار تھے ان کی ہندی شاعری میں جگہ جگہ کرشن جی کے عہد طفلی کی معصوم اداؤں اور عہد شباب کی شوخ و شنگ حرکات گوپیوں کے وصال و فراق کے پر تاثیر حالات کی منظر کشی ملتی ہے۔

قبل اس کے کہ شاہ کاظم قلندر کی ہندی شاعری کے اس پہلو پر روشنی ڈالی جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کرشن بھکتی کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈال لی جائے۔

بھکتی تحریک، بھکتی کال یا ہندی ادب کا وسط اول ہندی کے ممتاز محقق و ناقد آچاریہ رام چندر شکل کے مطابق ۱۳۱۸ء سے تا ۱۶۴۳ء تک ہے اس زمانے کے سیاسی، سماجی و مذہبی حالات سے قطع نظر صرف بھکتی تحریک کی ایک شاخ کرشن بھکتی کی مختصر تاریخ پیش ہے۔ بھکتی تحریک کو ہم مندرجہ ذیل نہج پر تقسیم کر سکتے ہیں۔




کرشن بھکتی شاخ میں شری کرشن کی عہد طفلی کی مختلف اداؤں کا بیان خاص موضوع ہے۔ اس تحریک کے شاعروں نے شری کرشن کو انسانوں سے اعلیٰ و ارفع مقام کا حامل قرار دیا ہے۔

کرشن بھکتی کا آغاز مشہور ہندی وِدّیاپتی کی شاعری سے مانا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ آٹھ شاعروں کا ایک گروپ جسے ہندی ادب میں "اشٹ چھاپ" کی اصطلاح سے شہرت حاصل ہے اس تحریک کے ارتقا میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ "اشٹ چھاپ" سے دراصل کرشن بھکتی سلسلہ کے وہ آٹھ مشہور شاعر ہیں جو ولبھ آچاریہ (م۔ ۱۵۳۱ء) اور ان کے فرزند و جانشین وٹھل ناتھ (م ۱۵۸۵ء) کے شاگرد ہیں جن کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) سورداس (۲) کرشن داس (۳) پرجانند داس (۴) کمبھن داس (۵) گوند سوامی (۶) چھترِ بھج داس (۷) بھجت داس (۸) نند داس ۔

ان میں اولی الذکر چاؐر شاعر ولبھ آچاریہ اور آخرالذکر چار شاعر وٹھل ناتھ کے شاگرد ہیں ۔

سورداس نے (م ۱۶۴۰ سمبت) جن کا شمار بھی "اشٹ چھاپ" کے شاعروں میں ہے اسے بام عروج پر پہنچا دیا اور اس میداں میں وہ نہ صرف ہندی کے بلکہ دنیا کے عظیم شاعروں میں شمار کیے گئے۔ اس کے علاوہ ہری داس اور چیتنیہ کی تعلیمات سے متاثر شاعروں نے بھی کرشن لیلاؤں کی نغمہ سرائی کی۔ میرا بائی (م ۱۶۰۳ سمبت) اس سلسلے کی عظیم شاعرہ تھی اس کے علاوہ نروتم داس (م ۱۶۰۵ سمبت لگ بھگ) اور جگن ناتھ داس رتناکر (م ۱۹۸۹ سمبت) کی تخلیقات بھی کرشن بھگتی ادب میں منفرد اہمیت کی حامل ہیں ۔

کرشن جی کی تعلمات سے متاثر مسلمان ہندی شاعروں میں سید ابراہیم بہانی والے المتخلص بہ رسکھان (م ۱۶۸۵ سمبت) کا شمار اس سلسلے کے عظیم شاعروں میں ہوتا ہے ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے مشہور ہندی شاعر و نقاد بھارتیندو ہریش چند (م۔ ۱۸۸۵) نے کہا تھا ؎

"इन मुसलमान हरिजनन पै कोटिन हिन्दू वारि"

"اِن مسلمان ہری جنن پہ کوٹن ہندو واری"

"یعنی (کرشن کے) اِن مسلمان عقیدت مندوں (بندوں) پر کروڑوں ہندو قربان کیے جا سکتے ہیں۔"

اس کے علاوہ عبدالرحیم خانخاناں (م ۱۶۸۲ سمبت) کا شمار بھی کرشن بھگتی کے اہم شعرا میں ہوتا ہے ۔

شاہ محمد کاظم قلندر (م۔ ۱۲۲۱ھ) کا ہندی کلام موسومہ بہ "سانت رس" تقریباً پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ آپ کو کرشن جی سے بڑی عقیدت تھی اُن کی تعریف میں ایک جگہ لکھتے ہیں ۔

"کرشن جی کہ ہنگامہ و شورِ عشق بازی ان کی ذات سے تھا اگرچہ وہ مجاز میں محسوب تھے لیکن ہم لوگ وحدت الوجود کے قائل ہیں ہمارے نزدیک جو کچھ تھا عین حقیقت تھا کیونکہ کرشن جی عارف حقیقت شناس تھے۔" [1]

کرشن جی کی شرارتیں ملاحظہ ہوں

وہ گوپیوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے ان کی گگریوں کو پھوڑتے ہیں اور ان کو نت نئے طریقوں سے پریشان کرتے ہیں عاجز آ کر گوپیاں یوں فریاد کناں ہوتی ہیں ؎

پھینک ذرے موری کانہہ ڈگریا — جانے دے گھر کہوں پھوٹے نہ گگریا
تیں چھیڑت لوگن کے آگے — لاج آوت جیا مورے سگریا
جائے چھیڑو کسی اور کو موہن — موہی سے کا تیری اٹکی بگریا

छेक नरेमोरी कान्ह डगरिया = जाने दे घर कहूं फूटे नगगरिया ।।
तै छेड़त लोगन के आगे = लाज आवत जिया मोरे सगरिया ।।
जाए छेड़ो किसी और को मोहन = मोही का तेरी अटकी बगरिया ।।

("اے کرشن! تو میرا راستہ نہ روک مجھے گھر جانے دے (تیری شرارتوں کی وجہ سے) کہیں میری گگری نہ پھوٹ جائے۔" تو مجھے سب کے سامنے چھیڑتا ہے اور میں شرم سے پانی پانی ہو جاتی ہوں تو جا اور کسی دوسرے کو چھیڑ۔ کیا صرف میں ہی تیرے چھیڑنے کو رہ گئی ہوں"۔)

کرشن جی کی سانولی سلونی صورت پر فریفتہ گوپیوں کے جذبات دروں ملاحظہ ہوں ؎

---

[1] "سانت رس" شرح اردو ص۱۱ از شاہ مجتبیٰ حیدر قلندر

اس چبھ گئی مورے ہیئے چھب ساؤنری     اے جسدا تیرے لال کی
جس کاگد مس ویسے لاگی     بل جاؤں اپنے کھیال کی
کو سہے پین سین نینن کے     سہی جائے برچھی بھال کی
مُر مسکن وہ بانکی چتون     نہیں بسرت نند لال کی

अस चुभ गई मोरे हिए छवि सांवरी । ऐ जसुदा तेरे लाल की ।।
जस कागद मसि वैसे लागी । बलि जाऊँ अपने खियाल की ।।
को सहे पैन सैन नैनन के । सही जाए बरछी भाल की ।।
मुर मुस्किन वह बाकी चितवन । नहीं बिसरत नन्दलाल की ।।

(اے یسودا! تیرے لال (شری کرشن) کی سانولی صورت میرے دل میں اس طرح نقش ہو گئی کہ جیسے کاغذ پر روشنائی۔ اب میں اپنے تصوّر پر فدا ہوں (کیونکہ اس میں صرف میرا محبوب ہے) برچھی اور بھالے تو سہے جا سکتے ہیں لیکن تیر نظر کو کون سہہ سکتا ہے ہائے وہ تیری زیرِ لب مسکراہٹ اور تیری ترچھی چتون کو کون بھول سکتا ہے)

دوسری جگہ کرشن جی کی نت نئی شرارتوں سے مخمور و مسرور ہو کر بظاہر خفگی و ناراضگی لیکن بباطن جذبۂ شوق و محبت سے کہتی ہیں کہ جس نے

بن پھاگے جن دھوم مچائی     پھاگ ماسو کا کچھ رنگ لائی

बिन फागे जिन धूम मचाई । फाग मा सो का कुछ रंग लाई ।।

کرشن جی کے دوارکا چلے جانے پر گوپیوں کی دردِ فراق و غمِ ہجر میں بے تابی و بے قراری اور ناشکیبائی کی حالت زار کا کیا یہ اثر نقشہ کھینچا ہے ؎

کہاں گئے برج لال کنھیّا     من موہن بنسی کے بجیّا
کہاں چھپی جائے موہنی مورت     سگرے نگر کے من کے چھلیّا
جون کرت رہو کھیل کنجن کا     کونے کنج چھپے رے دیّا!
چھین چھین ددھی مٹکی پھوڑ پھوڑ     برج اجاڑ گا برج بسیّا

कहा गए ब्रजलाल कन्हैया = मन मोहन बंसी के बजैया ।
कहा छिपी जाए मोहनी सूरत = सगरे नगर के मन के छलैया ।
जौन करत रहो खेल कुजन का = कौने कुंजछिपोरे दैया ।
छीन-छीन दधि मटकी फोड़ फोड़ ब्रज उजाड़ गा ब्रज बसैया ।

(اے برج کو اپنی دلکش نغمہ سرائی سے معمور کر دینے والے کرشن! تم کہاں چلے گئے سارے شہر کو اپنی موہنی صورت پر والہ و شیدا کرنے والے تمہاری شکل کہاں چھپ گئی۔ اے میرے خدا! کنج گلشن میں کرشمہ سازیاں کرنے والا (کرشن) کہاں جا چھپا۔ دودھ کی مٹکیوں کو چھین کر پھوڑ دینے کے ہنگامے سے برج میں زندگی کے آثار پیدا کرنے والا (کرشن) برج کو اجاڑ کر جانے کہاں چلا گیا ہے۔

کرشن کے فراق میں گوپیاں اتنی بے قرار اور بے کل ہیں کہ انہیں برسات کا حسین و دلرُبا موسم بھی ایک آنکھ نہیں بھاتا ہے وہ بادل سے کہتی ہیں کہ اے بادل بس کر اب نہ برس کیونکہ کرشن جی یہاں نہیں ہیں جب وہ آویں تب برسنا۔ ان کے بغیر تو صرف بادل دیکھ کر ہی ہماری آنکھیں بھر آتی ہیں۔ اگر پانی برسنے لگے تو خدا جانے کیا غضب ہو جائے ؎

بس بس رے بس کر

اب نہ برس بس کردے میگھا　　بالم ناہیں مورے گھر
برسے بچھڑا کلات ہے موہن　　ٹھہرت ناہیں کو نیو کر
جب گھر آوے مور پیروا　　تب چاہے برسے رے جھر جھر
بن گھنشیام کے دیکھے گھنشیام　　نینا آوت ہیں بھر بھر

बस बस रे बस कर

अब न बरस कर दे मेघा = बालम नाहीं मोरे घर ।।
घर से बिछड़ अकुलात है मो मन　　ठहरत नाहीं कौनिक कर ।।
जब घर आवे मोर पियरवा = तब चाहे बरसे रे झर-झर ।।
बिन घनश्याम के देखे घनश्याम = नैना आवत है भर-भर ।।

شاہ صاحب کی ہندی شاعری محبت کی شاعری ہے محبت ہی کو وہ انسان کے لیے وسیلۂ نجات سمجھتے ہیں ان کے عقیدے کے مطابق جو مناجات محبت کی نغمہ سرائی سے محروم ہے اس کی گنتی بھلے مانسوں میں نہیں ہوتی ہے ؎

پیم بھجن بن "کاظم" لوگوا　　بھل منئی نہیں ہیں یہ پاجی
पेम भजन बिन "काज़िम" लोगवा,　　भल मनई नहीं है यह पाजी ।

لیکن یہ محبت جبھی بڑھے گی جب کہ محبوب (حقیقی) کا ذکر کیا جائے انسان ظلوم وجہول کو جلد از جلد اس کے ذکر میں مشغول ہوجانا چاہیے ؎

نام بھجے تیں پیم بڑھت ہے　　مورکھ بھج لے نام سویرے
नाम भजे ते "पेम" बढ़त है = मूरख भज ले नाम सबेरे ।।

دوسری جگہ کہتے ہیں کہ محبوب (حقیقی) کی زیارت مناجات محبت کی نغمہ سرائی صرف انہیں لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جن کی آنکھیں (علائق دنیوی کی گردسے) دھندلائی نہیں ہیں ؎

پیم بھجن "کاظم" پیا دیکھیں　　جن کی نہیں آنکھن ما دھندری
पेम भजन "काज़िम" पिया देखे = जिनकी नहीं आखिन मा धुंधरी ।।

ان کی نظر میں مذہبی تعصب، عقائد کی تنگ نظری، نظریات کی شدت، جزوی مسائل میں مجادلہ ومناظرہ قابل تعزیر عمل ہے ایسے افعال کا خوگر خواہ وہ جبہ ودستار ریز پوش عالم دین ہو یا تلک اور جنیودھاری پنڈت شاہ صاحب کے نزدیک ادنیٰ گنوار کے مانند ہیں اگرچہ ان میں جذبہ محبت سبھی جذبات پر غالب نہ ہو۔ کہتے ہیں ؎

پیم بھگت بن ملا پانڈے　　دیکھے دوؤ نپٹ گنوارا
पेम भगत बिन मुल्ला पाण्डे = देखे दोऊ निपट गँवारा ।।

وہ خود تو یہ دعا کرتے ہیں کہ مجھے ایسی طاقت عطا کی جائے کہ جس سے میں محبت کے رنگ میں ایسا رنگ جاؤں کہ ہم رنگ محبت کہلاؤں کیونکہ اس کے بغیر نجات نہیں ہے ؎

پیم بھگت جاسوں بن آوے　　ایسی شکتی مورے رنگ دے
بھگت بنا کب ہوئے نستارا

पेम भगत जासोबन आवे　　ऐसी शक्ति मोरे रंग दे ।
भगत बिना कब होवे निस्तारा ।।

شاہ کاظم قلندرؒ کے بعد ان کے نامور صاحبزادے شاہ تراب علی قلندر (م۔ ۱۲۷۵ھ) نے بھی والد محترم کی پیروی میں ہندی شاعری میں زور قلم

دکھایا ہے آپ کی شاعری میں ہندستانی تہوار بسنت، ہولی، دیوالی کی منظر کشی نہایت برمحل اور فطری انداز میں ہوتی ہے۔ مندرجہ ذیل "بسنت" میں کرشن نیا موسم لگتے ہی نئی نئی ہنگامہ آرائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں دوسری طرف حسینانِ گوکل بھی اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ متاعِ صبر و شکیب پر شب خون مارنے کو پر تول رہی ہیں اک نئی رسمِ محبت کا آغاز ہو رہا ہے جس کی کامرانی و نامرادی دونوں ایک نیا انداز لئے ہوئے ہیں ؎

آیو بسنت نئی رُت لاگی　　لائے ہیں شیام گہار نئی
رنگ نیا اور نئی پچکاری　　نیکی لگت ہے پھہار نئی
نئی نئی چھبی سو رجھاون لاگی　　بن ٹھن کے سب نار نئی
پیت کی ریت نئی ہے یا میں　　جیت نئی ہے ہار نئی

आयी बसंत नई ऋत लागी　=　लाए है श्याम गुहार नई ।
रंग नया और नई पिचकारी　=　नीकी लागत है फुहार नई ।
नई-नई छवि सो रिझावन लागी　　बन ठन के सब नार नई ।
पीत की रीत नई है यामे　　जीत नई है हार नई ।

ہولی کا موسم رنگ و نور لیکر آ گیا ہے کرشن جی نے گوکل میں ہنگامہ خیزیوں سے ایک سماں سا باندھ دیا ہے عبیر و گلال چھڑکنے کی دھوم کا کیا پوچھنا اس بیان میں نئی جابکدستی ملاحظہ ہو ؎

اب کی ہوری کا رنگ نہ پوچھو　　دھوم مچی ہے بندرا بن ماں
شیام بہاری چتر کھلاڑی　　کھیل رہا ہوری سکھین ماں

अबकी होरी का रंग न पूछो　=　धूम मची है बिन्दाबन माँ ।
श्याम बिहारी चतुर खिलाड़ी　=　खेल रहा होरी सखियन माँ ।

رنگ کھیلنے کے دوران گوپیاں کرشن جی کی شرارتوں اور ڈھٹائیوں سے تنگ آکر اپنے غصّہ اور جھنجھلاہٹ کا اظہار کرتی ہیں۔ گالیاں سناتی ہیں لیکن کرشن جی اسے لعل شکر خا را کے مصداق فراموش کرکے اپنے کو بچاکر ان کو رنگ سے شرابور کرنے میں مشغول رہتے ہیں ؎

ہو جسمت کے ڈھیٹ لنگروا　　کاہیکو موکا رنگ ما بورے
جا تورے پھاگ میں آگ لگاؤں　　پنڈ پڑا ہے ناحق مورے

हो जसमत के ढीट लंगरवा　=　काहे को मोका रंग मा बोरे ।
जा तोरे फग मे आग लगाऊँ　=　पिंड पड़ा है नाहक मोरे ।

جارے کنھیا میں گاری دیت ہوں　　کاہے کھڑا ہے مورے تیر
اپنی تو پاگ بچائے رکھت ہے　　مورے بھجووت چیر

जारे कन्हैया मै गारी देत हूँ　=　काहे खड़ा है मोरे बीर ।
अपनी तो पाग बचाए रखत है　=　मोर भिजोवत चीर ।

لیکن یہ سب ظاہری باتیں ہیں حقیقت تو یہ ہے ؎

دیکھے جرت ہوں نہ دیکھے مرت ہوں　　پیت کی ریت ہے نوکھی ہماری

देखे जरत हो न देखे मरत हो　=　पीत की रीत है नोखी हमारी ।

اگر کرشن جی کسی دوسری طرف چلے جائیں تو یہ شکایت ہوتی ہے ؎

[باقی صفحہ ۵۴ پر دیکھئے]



## مصوّر سبزواری

نہ اترے برف میں پھر بھی پگھل گئے ہم تم
گری نہ برق کوئی اور جل گئے ہم تم

تمام عمر چلیں اب مگر نہ مل پائیں
دیارِ خواب سے کوسوں نکل گئے ہم تم

بنی ہے حادثہ اک کوششِ تکلم بھی
فصیلِ حرف گری تو کچل گئے ہم تم

ہوں جیسے سونگھے ہوئے پھول کی سی خوشبوئیں
دماغ و ذہن سے ایسے نکل گئے ہم تم

بدن تھے کاغذی پھولوں کے پیرہن کی طرح
لہو لہان امیدوں سے پھل گئے ہم تم

نہ برگِ زرد نہ پھلی شناخت کے غم ہیں
بدلتی رُت میں یہ کیسے بدل گئے ہم تم

پوسٹ آفس نوہ، ضلع گڑگاں
(ہریانہ) ۱۲۲۱۰۷



## ظہیر غازی پوری

آئینہ چہرے سے اور عکس تباہی سے بچا
تجھ کو میں نے نہیں دیکھا تو گواہی سے بچا

یہ بھی اچھا ہوا لکھا نہ مجھے تونے کہیں
ذہن فکروں سے تو کاغذ بھی سیاہی سے بچا

کیوں لئے بیٹھے ہو اک دامنِ یوسف کی مثال
کون اس دہر میں ناکردہ گناہی سے بچا

اُن زمینوں کی طرف اب کے سفر کرنا ہے
جن کا ہر خطّ نقوشِ کفِ راہی سے بچا

اس کو شبنم کی لطافت بھی گراں گزری ہے
وحشتِ غم میں جو تیری شعلہ نگاہی سے بچا

جسم چھلنی ہوا، نشتر لگے، نیزے بھی چبھے
شیشہ شیشہ مگر احساس تباہی سے بچا

آج تک آئینۂ فکر و مطالب کیسے
میرے اندر کے انا دار سپاہی سے بچا

آفس سپرنٹنڈنٹ، بی ایس۔ او ٹی، کارپوریشن ہزاری باغ
(بہار) ۸۲۵۳۰۱



## ذکاء الدین شایاں

پھولوں کو بالوں میں لگا کر خوشبو کو بہکایا ہے
سچ اور جھوٹ کے بیچ میں تم نے کیسا جادو جگایا ہے

اس کی عنایت دل پہ گراں تھی، آدھے رستے چھوڑ دیا
اپنا غم تھا، تنہا تنہا سارا بوجھ اٹھایا ہے

راہوں کا دعوت نامہ تھا، منزل کا پیغام بھی تھا
ہم وہ راہی۔ اپنا رستہ اور گھر الگ بنایا ہے

خشک، سنہری، خاکی فضائیں، جسم وہی بارش میں باغ!
گرم ہوا کے پیکر نے بھیگے کپڑوں کو سجایا ہے

سوتے جاگتے غم کے مسافر اپنے سفر پر نکلے ہیں
چہرہ چہرہ وہی ہے سورج، پلکوں پلکوں سایا ہے

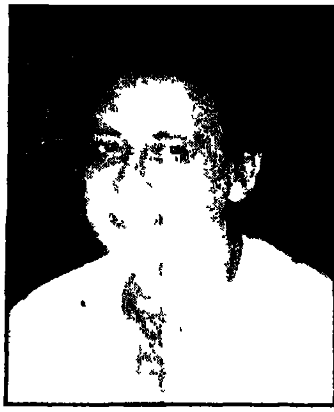
کمرے کی ہر شے خود جاگی، خوابوں نے کروٹ بدلی
پہلی شب میں چاند کا چہرہ جب کھڑکی تک آیا ہے

دیکھ کے اُس رُخ کو یہ خبر دیں، صبح کہاں تک پھیل گئی
پوچھ کے اُن آنکھوں سے بتائیں، راتوں نے کیا پایا ہے

سرداولڈ سٹی پوسٹ آفس پیلار با۔ پیلی بھیت ۲۶۲۰۰۱

ندا فاضلی
۱۰۳- امر اپارٹمنٹ، ڈانڈا پاڑہ - ۱۱ کھار (ویسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۵۲

# دیواروں کے بیچ



قسط نمبر:

ان افواہوں کی روک تھام کے لئے سجادہ صاحب کے بڑے لڑکے اب اپنا زیادہ وقت درگاہ میں ہی گزارتے ہیں۔ اس قسم کی افواہیں اور عقیدت دونوں کے لئے منفر تابت ہوتی ہیں۔ مرتضیٰ حسن کو ان افواہوں پر یقین نہیں ہے لیکن جمیل فاطمہ خدا اور رسول کے درمیان کسی تیسرے کی شرکت قبول نہیں کرتیں۔ بزرگان کا احترام کرتی ہیں لیکن قبروں کی پرستش کو شرک سمجھتی ہیں۔ یہ تبدیلی ان میں انھیں جھوٹی سچی خبروں کے ردعمل میں پیدا ہوئی ہے اب وہ درگاہ پر حاضری دینے کے بجائے گھر میں ہی خواجہ کی نذر و نیاز کرنے لگی ہیں۔

گھر میں اکثر میلاد کی محفلیں ہوتی ہیں۔ ان میں میلاد اکبر کو شروع سے آخر تک دہرایا جاتا ہے۔ نثری حکایات وہ خود پڑھتی ہیں اور حمد نعت ساری خواتین آواز میں آواز ملا کر گاتی ہیں۔ یہ محفلیں عشا کی نماز کے بعد شروع ہو کر رات کے بارہ ساڑھے بارہ بجے تک چلتی ہیں۔ میلاد کے اختتام پر خواتین اور لڑکیوں کو ان کے گھروں تک پہونچایا جاتا ہے۔ اس کام کے لئے ندا اور اس کے بڑے بھائی کو اٹھایا جاتا ہے۔ اگر وہ گہری نیند میں ہوتے ہیں تو پانی کے چھپاکوں سے ہوش میں لایا جاتا ہے۔

سارا قافلہ مکان کے پیچھے کی تنگ گلی سے گزرتا ہے۔ چہلیں کرتا ہوا، قہقہے لگاتا ہوا، ان میں ایک لڑکی بہت شریر ہے۔ وہ اندھیرے میں ندا کو ٹٹول کر گالوں میں چٹکی لیتی ہے اور خاموشی سے آگے پیچھے ہو جاتی ہے۔ ندا اندھیرے کے باوجود انگلیوں کی نرمی سے اسے پہچان لیتا ہے اور چپ چاپ درد برداشت کر لیتا ہے۔ میلاد کے بتاشے اور پھول دوسرے دن نقشیں رکابیوں پر کڑھے ہوئے غلاف ڈھانک کر محلے کے ہر گھر میں بھیجے جاتے ہیں اس تبرک میں کو لیوں کی عورتوں کا حصہ بھی ہوتا جو وہ صبح دو ہاتھوں میں پرشاد کی طرح لے کر آنچل میں باندھ لیتی ہیں۔

اسکول کے راستے میں ایک مندر ہے۔ شیو جی مندر۔ سنگ مرمر کی مورتی، بڑی بڑی آنکھیں، گردن میں سانپ، اس مندر میں لمبی سفید داڑھی کا ایک پجاری ہے۔ گورا رنگ، ماتھے پر کیسر کا تلک۔ اپنے دھیان میں محو، وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے وقفے سے گردن اٹھا کر گھنٹی بجاتا ہے اور ہر ہر مہادیو کی کار کرتا ہے۔ اس کی آواز سے سناٹوں میں ارتعاش سا ہوتا ہے۔ اسکول جاتے لڑکے اُنھیں دیکھتے ہی ہاتھ جوڑ کر ہر ہر مہادیو بولتے ہیں۔ لیکن پجاری کی آواز میں یہ لفظ معنی نہ سمجھتے ہوئے بھی اچھے لگتے ہیں۔ ایک بار ندا مندر کی چوکھٹ پر پڑا ایک گلاب کا پھول پجاری کی نظر بچا کر اٹھا لیتا ہے۔ پھول اٹھاتے ہی گھنٹی بجتی ہے اور ساتھ میں ہر ہر مہادیو..... وہ سہم جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ سے پھول گر جاتا ہے۔

پجاری یہ دیکھ کر مورتی کے پاس سے اٹھتا ہے اور گرے ہوئے پھول کو اٹھا کر اس کے ہاتھ میں رکھ دیتا ہے۔ وہ کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتا۔

ڈرو نہیں۔ یہ بھی بھگوان کا پھول ہے۔ تم بھی بھگوان کے پھول ہو.... لے جاؤ....!

اس دن سے وہ جب بھی ندا کو گزرتا دیکھتا ہے آواز دے کر بلاتا ہے اور ایک تازہ گلاب کا پھول مورتی سے اٹھا کر ہاتھ میں رکھ دیتا۔ ستر پچھتر سال کے پجاری اور سات ساڑھے سات سال کے لڑکے کا یہ رشتہ عجیب ہے جو چوری کے ایک پھول سے شروع ہوتا ہے۔ اور پورا کئی پھولوں تک پھیل جاتا ہے۔ مہکتا ہوا بے نام رشتہ۔ نہ پجاری لڑکے کے نام سے واقف ہے۔ نہ لڑکا اس کے بارے میں کچھ جانتا ہے۔ دونوں کے درمیان صرف سُرخ گلابی پھول ہیں۔ ان میں ہر پھول کا نام گلاب ہے۔ ہر ایک کا دھرم خوشبو ہے۔

بیماری کی وجہ سے ندا چار پانچ دن اسکول نہیں جاتا۔ پجاری خود ہی کسی سے پتہ پوچھتا ہوا گھر تک آجاتا ہے۔ وہ دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کئی تازہ گلاب کے پھول ہوتے ہیں۔ ماں اسے پھول بیچنے والا سمجھتے ہوئے پلّو سے پیسے کھولتے ہوئے پھولوں کی قیمت پوچھتی ہے۔ وہ جواب میں صرف مسکراتے ہوئے ہر ہر مہادیو کہتا ہے۔ اس کی آواز سنتے ہی ندا باہر آجاتا ہے۔ پجاری آگے بڑھ کر سر پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے کہتا ہے۔ بابا تم کئی دن سے نہیں آئے۔ میں خود ہی تمہارا پتہ لگا کر تمہارے پھول تمہیں دینے چلا آیا۔

ماں یہ دیکھ کر حیرت میں ہے۔ جب ندا انھیں پوری بات بتاتا ہے تو وہ ان پھولوں کو ایک پانی بھرے کٹورے میں ڈال کر ندا کے سرہانے رکھ دیتی ہیں اور جب ندا اچھا ہو جاتا ہے تو مرجھائے ہوئے پھولوں کو کوڑے میں پھینکنے کے بجائے اسی کنویں میں ڈلوا دیتی ہیں جس میں پرانے تعویز یا عربی لکھے کاغذوں کو ٹھنڈا کرتی ہیں۔

مرتضیٰ حسن کے دوستوں میں ڈاکٹر کوئیکر اور پروفیسر رام نارائن گھرے افراد جیسے ہیں۔ کوئیکر کسی سرکاری ہوسٹل میں سرجن ہیں اور رام نارائن ایک مقامی کالج میں انگریزی کے استاد ہیں۔ بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں رام نارائن جی سے رائے لی جاتی ہے اور بیماری میں ہر دفعہ ڈاکٹر کوئیکر کو بلایا جاتا ہے۔

رام نارائن اور مرتضیٰ حسن میں بہت بے تکلفی ہے۔ وہ جب بھی آتے ہیں تو اپنی آمد کی اطلاع دروازے پر دستک یا کنڈی کھٹکھٹانے کے بجائے بھاری آواز میں دو چار گالیوں سے دیتے ہیں۔ یہ ساری گالیاں مرتضیٰ حسن کے لئے ہوتی ہیں۔

بار بار دہرائے جانے سے ان گالیوں کا گالی پن ختم ہو چکا ہے۔ حرامی، ذلیل، آوارہ، بدمعاش جیسے غیر تہذیبی لفظ با تہذیب ہو کر دوستی کی پہچان بن چکے ہیں۔ انھیں سن کر مرتضیٰ حسن کی مسکراہٹ میں لڑکپن جھانکنے لگتا ہے۔ اور جمیل فاطمہ چائے کے ساتھ ان کی پسند کے پالک کے سموسے تل کر لے آتی ہیں۔ لیکن ایک بار جب وہ یہی الفاظ ندا کے منہ سے سنتی ہیں تو لکڑی اٹھا کر دھننا شروع کر دیتی ہیں۔ اس جرم کی سزا میں وہ رات ندا کو خالی پیٹ ہی سونی پڑتی ہے۔

ان گالیوں کو شائستہ بنانے کے لئے رام نارائن جی کو کافی وقت لگتا ہے۔ تیس پینتیس برس سے بھی زیادہ اور ندا انھیں سنتے ہی دہرانے لگتا ہے۔ اسی لئے اس کے منہ میں آکر یہ پھر سے فحش بن جاتی ہیں۔۔۔ بات دراصل یہ ہے کہ کوئی لفظ اپنے اندر اچھا یا برا نہیں ہوتا۔ ان کو بولنے والے ہی انھیں اچھا برا بنا دیتے ہیں۔ لفظ اور شخصیت کی یہ سوجھ بوجھ بہت دنوں میں آتی ہے۔

ہجڑوں کے گرو حاجی صاحب کے انتقال کو ایک سال ہو چکا ہے۔ ان کی قبر پیلی حویلی کے اندر ہی ہے۔ ان کی پہلی برسی پر ملک بھر سے سینکڑوں ہجڑے اس تقریب میں شریک ہونے کو آتے ہیں۔ دو دن ناچ گانے کی محفلیں جڑتی ہیں بعد میں چادر چڑھانے کی رسم ہوتی ہے۔ باجے تاشے کے ساتھ چادر کو ایک بڑے سے تھال میں رکھ کر کئی سڑکوں کا گشت کیا جاتا ہے۔ اس گشت میں سارے مقامی اور بیرونی ہجڑے شریک ہوتے ہیں۔ جگہ جگہ دوکانوں کے سامنے ٹھہرتا ہوا یہ جلوس بڑی مسجد کے سامنے رکتا ہے زمین پر تھال رکھ کر ایک بزرگ ہجڑا منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہے۔

چادر حویلی کے اندر لے جائی جاتی ہے۔ حویلی میں ہجڑوں کے علاوہ کسی اور کو داخلہ کی اجازت نہیں ہے۔ چادر چڑھانے کے بعد باہر مٹھائی تقسیم ہوتی ہے۔ ایک مٹھائی کا تھال مسجد میں بھی بھیجا جاتا ہے۔ !

روایت کے مطابق چادر کی رسم کے بعد برادری کے رجسٹر میں نئے نام درج کئے جاتے ہیں۔ نیپال سے آئے ہوئے زنخے کو برادری میں شامل کرنے سے پہلے کلمہ پڑھانے کے لئے مسجد لے جایا جاتا ہے۔ مسجد کے پیش امام اس سے آہستہ آہستہ کلمہ پڑھواتے ہیں۔ نیپالی بھاشا کی عادی زبان سے عربی کے الفاظ بمشکل اٹک اٹک کر ادا ہوتے ہیں۔ جیسے تیسے ٹکڑوں میں کلمہ پورا ہوتا ہے اور پھر اسے دولہا کی طرح اسے گھوڑے پر بٹھا کر چاروں طرف گھمایا جاتا ہے۔ وہ شرمیلی آنکھوں سے مسکراتا ہوا ادھر ادھر دیکھ رہا ہے۔ سارے ہجڑے ناچتے ڈھول بجاتے آگے آگے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے چل رہے ہیں۔ یہ جلوس سڑک کی ہر بڑی دوکان پر رکتا ہے۔ نیپالی گھوڑے پر بیٹھا ہوا سلام کرتا ہے دوسرے ہجڑے اس سلام کی اجرت وصول کرتے ہیں۔

یہ سارا شور شرابا شام کو چھ بجے شروع ہو کر رات کو کہیں آٹھ ساڑھے آٹھ بجے ختم ہو جاتا ہے۔ شہر کے ہندو سبھا کے آفس میں ایک ایمرجنسی میٹنگ ہوتی ہے۔ نیپالی کا دھرم پری ورتن موضوع بحث بنتا۔ مسلمانوں کی اس ہٹ دھرمی پر لوگ مشتعل ہیں۔ اب یہ ہجڑوں کی برسوں پرانی رسم نہ رہ کر ہندو مسلمان کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ ذرا دیر میں پورے شہر میں تناؤ پیدا ہو جاتا ہے.... صبح ہوتے ہی نیپالی کو زبردستی اٹھا کر پارٹی کے دفتر لایا جاتا ہے۔ اس خبر کو پاتے ہی دوسرے ہجڑے محلے کے قصائیوں سے ملتے ہیں۔ قصائی اسلام کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے سر لیتے ہیں۔

نیپالی کو بہلا پھسلا کر شدھی کے لئے آمادہ کیا جاتا ہے۔ ہری دھوتی اور چولی کی جگہ اس کے کپڑے اب بھگوا رنگ کے ہو جاتے ہیں۔ بڑے مندر کے پجاری اپنے ہاتھ سے ہنومان کے سر پر سے سندور لے کر اس کے ماتھے پر تلک لگاتے ہیں اور نیپالی بھاشا کی عادی زبان سے سنسکرت کے شلوک کہلواتے ہیں جو عربی کی طرح اٹک اٹک کر قسطوں میں ادا ہوتے ہیں۔ اسی خوشی کے موقع پر نیپالی کو ایک بنے سجے رتھ میں بٹھا کر چاروں طرف گھمایا جاتا ہے۔ لیکن اس بار اس کے ساتھ ہجڑوں کی جگہ ہندو مہاسبھا کے کارکنان ہی ناچ گا کر جلوس کو بارونق بناتے ہیں۔ جلوس کے پیچھے پولیس کی جیپ چلتی ہے۔ اور شہر میں امن کے لئے دو تین قصائیوں کو گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ ہجڑوں کی حویلی پر پولیس کا پہرہ لگا ہے ... ایک بوڑھا ہجڑا جلوس کو دیکھتے ہوئے تالی بجا کر کہتا ہے۔ ارے اس جلسے جلوس سے کیا ہوتا ہے ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں، جس کا ہاتھی اس کا ناؤں... ! ہجڑے تو ہمیشہ سے ہی کلمہ گو ہیں۔

پارٹیشن ہوئے دو تین مہینے گزر چکے ہیں۔ ملک کے دیگر شہروں کے برعکس گوالیار ابھی تک پرسکون ہے۔ اخبار کی خبروں سے فرور ہونا کیا پیدا ہو رہی ہیں......

پاکستان سے لٹے پٹے شرنارتھی شہر میں آنے لگے ہیں۔ پاکستان میں ان کے ساتھ مسلمانوں کی ناانصافیاں ہوٹلوں، چوراہوں اور دوکانوں میں گھومنے لگی ہیں۔ آپس کے رشتوں میں بغیر محسوس تبدیلیاں پیدا ہوتی جا رہی ہیں۔

شام کو شہر میں ایک بہت بڑا جلسہ ہندو مہاسبھا کے جھنڈے تلے منعقد ہوتا ہے۔ اس جلسے کے خاص مقرر کسی چھوٹی سی ریاست کے راجہ ہیں۔ ان کا قیام منصور شاہ کی درگاہ کے سجادہ نشین اور سندھیا کے روحانی گرو سردار سری صاحب کے باڑے میں ہے سری صاحب گوالیار کے مسلمانوں کے رہنما بھی ہیں۔ راجہ صاحب کئی پھولوں اور گوٹے کے ہار پہن کر تقریر کرتے ہیں۔

مسلمانوں کو اب یہاں رہنے کا کوئی ادھیکار نہیں ہے۔ اس کے لئے ہم نے پاکستان دے دیا ہے۔ ہمارے گھر میں رہ کر ہی کسی ہندو کو مسلمان بنانا ایک ایسا اپرادھ ہے جو معاف نہیں کیا جائے گا۔ یہ اورنگ زیب کا راج نہیں ہے۔ ہندوؤں کی حکومت ہے....

عوام مشتعل ہو کر جوش میں جے جے کار لگاتے ہیں اور دلوں میں نفرتوں کی آگ کے لئے منتشر ہو جاتے ہیں۔

راجہ صاحب تقریر ختم کرنے کے بعد سری صاحب کے ساتھ ہم پیالہ ہوتے ہیں۔ رات کو رقص کی محفل جمتی ہے اور صبح الفنس کی کار میں رخصت ہو جاتے ہیں لیکن شہر کی فضا مکدر ہو جاتی ہے۔

دوسرے دن اسکول سے لوٹتے وقت ندا کا ہم جماعت بیرکار اچانک چلتے چلتے پوچھ لیتا ہے....

"یار۔ پاکستان ہے کہاں، کل گھر میں بھابی بھی تیرے پاکستان کی بات کر رہی تھی"!

"مجھے کیا پتہ!" ندا جواب دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے: "معلوم تو مجھے بھی نہیں ہے۔ کل ریاضی ماسٹر سے پوچھیں گے...!"

لیکن پاکستان کا جغرافیہ معلوم ہونے سے پہلے ہی ندا کا اسکول جانا بند ہو جاتا ہے....

صبح کے گیارہ بجے ہیں۔ نومبر کی ابتدا ہے۔ ہواؤں میں خنکی شامل ہو گئی ہے۔ ٹھیلوں پر سفید گلابی امرودوں کے ڈھیر سے لگے ہیں۔ بڑی بہن آنگن میں کئی رنگوں کے کٹورے رکھے۔ ایک ڈوپٹے کو دھنک کی طرح کئی رنگوں سے سجا رہی ہے۔ اچانک کوئی آکر بتاتا ہے۔ گلی کے نکڑ پر مسلمان رنگ ریز کی دوکان لٹ رہی ہے.... ! مرتضیٰ حسن سنتے ہیں۔ لیکن اس کا الزام وہ رنگ ریز کے لڑکوں پر رکھتے ہیں وہ لڑکے کسی کام کے ہی نہیں۔ سالے آوارگی کرتے پھرتے ہیں۔ رات دن لڑتے جھگڑتے ہیں۔ یہ ہی علاج ہے ان کمینے پن کا۔ موچی اولی کی مسجد پر شرنارتھیوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ اس خبر کے بارے میں بھی ان کی رائے دوسروں سے مختلف ہوتی ہے۔ جس مسجد میں تین دن چراغ روشن نہیں ہوتا اسے ایسا ہی

[باقی صفحہ ۱۴ پر دیکھیے]

# چھ نظمیں

تنہا تماپوری

❁

تمہیں دُور سے دیکھ کر سوچتا ہوں
کہ وہ تم ہی تھے،
ابھی تم جو میرے قریب آگئے ہو
تو وہ تم نہیں ہو
اگر مجھ میں تحلیل ہوتا پڑا تو
کبھی یہ نہ کہنا کہ
میں کون ہوں ؟

❁

ماں کی کھیتی ہری
ڈھونڈ کر لائیے
یہ تو شمشان ہے
لوریاں کس کی خاطر اُگاتے ہیں آپ
دودھ کا کھیت سوکھے زمانہ ہُوا

❁

ایسا ہوا تھا
کچھ دن سے وہ
گھر میں نہیں تھا
اُس کے بستر کا وہ حصّہ۔
ایسا ہوا تھا
خالی نہیں تھا۔

❁

اُس کے گھر کی سیڑھی تک
کون آیا ہے

آنگن میں کچھ پھول کھلے ہیں
شاخوں کے گہوارے ہیں
کچھ ٹھنڈے سائے جھول رہے ہیں
بادل کی بیلیں
کھڑکی سے اندر اُتری ہیں
وہ بستر پر مرا پڑا ہے

❁

میں ہوں ٹوٹا آئینہ
اپنا چہرہ
روبرو میرے ذرا سا جوڑئے

❁

میں کسی کا خواب ہوں
دیکھو مجھے
مجھ میں میرے خواب بے تعبیر ہیں۔

## تجلّی

خواب سونے کی آرزو کے لئے
اس نے سوچا نہیں تھا کچھ بھی مگر
دونوں آنکھوں کو سی گیا
شاید
تیسری آنکھ وہم تھا اس کا
اُس نے خواہش کو چھُو کے دیکھ لیا
اک ننھی سی روشنی کے لئے



ایک ننھی سے روشنی کے لیے
کتنا ممنوع ہوگیا ہے وہ
ناشناسی کے اس قدر ٹانکے
لگ گئے ہیں اب اس کے رستوں میں
تلخ تر حادثے ہی اُگتے ہیں
اجنبیت کے رنگ دھونے کو
یہ تجلّی بہت ضروری تھی

## سوچ کی گھنٹی

دعا کے ہونٹ میلے ہو چکے ہیں
صدائیں پھر سے لوٹائی گئی ہیں
میرے سجدوں کی قسمت : بے لباسی
انا کی ٹوٹتی پرچھائیوں کو
چھپا کر گیلی پلکوں میں ابھی تک
اطاعت کتنی شرمندہ ہوئی ہے
وفا روکوں ؟ اُداسی پوچھتی ہے
بُجھا دو تشنگی میرے بدن میں
بُجھا دو خواہشوں کی بتیوں کو
یہ کوشش اب تو کرنی ہی پڑے گی
کہ گھنٹی سوچ کی بجنے نہ پائے

● وسنت آفس رنگم پیٹ. ضلع گلبرگہ۔۵۸۵۲۲۰



م۔ ناگ

معرفت مرحوم حمید خان، جیا ناکیرز کپاؤنڈ، بوریولی ویسٹ بمبئی۔ ۹۲ ۰۰۰ ۴۰

# گھرونده

وہ بوڑھا بیس سال کی عمر میں ایک پرائیویٹ کمپنی میں کلرک تھا۔ انکریمنٹ ملتے گئے، پروموشن ہوا۔ چار پانچ سال میں اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ کی پوسٹ ملی اور پچپن سال وہ ریٹائرڈ ہوگیا۔ سرد گرم تجربات، اتار چڑھاؤ خوشی اور غم کے ملے جلے لمحات سے گزرتے ہوئے کب بڑھاپا آگیا پتہ بھی نہ چلا۔ شادی جلد ہوجانے سے وہ جلد باپ بھی بن گیا ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ ریٹائرڈ ہونے سے پہلے ہی لڑکا ایک فارماسیوٹیکل کمپنی میں کیمیکل انجینئر ہوگیا۔ لڑکی کالج میں پڑھ رہی تھی۔ یعنی ریٹائرڈ ہونے تک سب کچھ سیٹل ہوگیا تھا۔

اب اسے اکیلے کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔ سارا انتظام اندر ہی تھا، باتھ روم، پاخانہ، کتابوں کا شیلف، ٹی وی، جنرل دوائیاں ایک دو مذہبی کتابیں، تسبیح، باہر کی طرف گیلری۔ روز ایک نوکرانی آتی اور کمرے کی صفائی کرکے چلی جاتی تھی۔ مگر وہ دیواروں سے باتیں کرتے ہوئے بہت جلد بور ہوگیا۔ کہاں تو عمر کاٹنی تھی اور کہاں کچھ ہی دنوں میں اُکتا گیا۔ بوس زندگی پھر اس پر حاوی رہی۔ "بہت ہوگیا، بہت محنت کی آپ نے۔ سب کچھ سیٹل کر دیا، اب آرام کیجئے۔"

—— مگر اسے ایسا لگا وہ ایسی بند فائیل ہے جو دھول کھاتی رکارڈ روم میں پڑی ہے۔ کمرے کی دھول تو نوکرانی جھاڑ لیتی ہے مگر اس کی دھول، وہ دھول جو تہہ در تہہ اس کے بڑھاپے پر جمتی جا رہی ہے —— یا پھر وہ گلی ڈنڈے کا وہ کھیل ہے جس میں گلی جہاں پڑی وہاں سڑی ہوجاتی ہے —— اسے لگتا کہ اس کے پاس زندگی بھر کا سرمایہ کچھ تجربات اور مشاہدات ایسے ہیں جیسے سننے اور کرنے سے کسی کا بھی بھلا ہوگا۔ زندگی کی اچھی بری ساعتیں، جیسی زندگی اس نے گزاری جن کامیابیوں سے وہ ہم کنار ہوا۔ جیسے خوشیوں بھرے لمحے اس نے بتائے۔ وہ چاہتا کوئی آئے اور پوچھے کہ اس نے کیا کیا؟ کیسے کیا؟ کیسے کرنا چاہئے تھا؟ کیسے ہونا چاہئے تھا؟ وہ ورق ورق سنانا چاہتا تھا مگر سننے والا کوئی نہ تھا۔ یہی اس کی ٹریجڈی تھی وہ چاہتا لوگ آئیں اس سے ملیں، مشورہ کریں مگر شاید کسی کو بھی فرصت نہ تھی۔

وہ جیسے نیند سے جاگا۔ پتہ نہیں دوپہر تھی یا صبح۔ مگر سورج بہت زیادہ روشن لگ رہا تھا —— گیلری میں آیا تو باہر سارا منظر بدل چکا تھا۔ عمارتیں اور بھی اونچی ہوگئی تھیں۔ بھیڑ بڑھ گئی تھی۔ آسمان اور زمین سب بدلے بدلے سے تھے وہ زینہ سے نیچے اترا۔ سیدھے ہال میں آیا۔ وہاں سب لوگ جمع تھے، اس کی بیوی، بہو، لڑکا، لڑکی سب ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ اس نے بات کرنی چاہی۔ مگر وہ اس کا مدعا نہیں سمجھے۔ وہ باہر نکلا اور سڑک پر آگیا۔ سڑک پر آکر وہ آئس کریم کی طرح پگھلتا رہا۔

پہلے جب وہ نیچے والے کمرے میں رہتا تھا اور ابھی لڑکے کی شادی بھی نہ ہوئی تھی تب لڑکا اور لڑکی دونوں صبح و شام اس کے پاس آتے تھے۔ ادب سے بیٹھتے تھے۔ اس کی باتیں سنتے تھے۔ اپنی باتیں کہتے تھے۔ کچن میں کیا ہو رہا ہے۔ کیا ٹوٹا کیا گرا سب پتہ چل جاتا تھا۔ بہت دنوں تک وہ سنتے رہے۔ پھر بہت دنوں تک وہ جماہیاں لیتے رہے۔ پھر بہت دنوں تک وہ کنی کاٹتے رہے۔ پھر ایسا وقت آیا کہ اس کے پاس نہ لڑکا آتا تھا نہ لڑکی۔ وہ خود ان کے کمرے میں جانے لگا اور لڑکا لڑکی دونوں کمروں سے باہر ادھر ادھر کترانے لگے۔

یک دن لڑکے نے کہہ دیا۔

"پپا آپ تو پرانی باتیں سنا سنا کر ہمارے دوستوں کو بور کر دیتے ہیں۔"

" پر میں تو ان کے کلیان کے لیے کہتا ہوں بیٹا "

" یہ کلیان آپ اپنے تک ہی رکھئے نا، وہ کہتے ہیں تیرا بڈھا باپ بہت بور کرتا ہے، ہم لوگ تیرے گھر نہیں آئیں گے "۔

لڑکی کہنے لگی " میرے کلاس کی لڑکیاں کہتی ہیں تو رائٹر بنے گی۔ تیرے پپا تو تجربات کا بھنڈار ہیں"۔

بوڑھے نے کہا " اگر ایسا ہوا تو بہت اچھا ہوگا "۔

" کیا اچھا ہوگا ؟"

یہی کہ تو رائٹر بنے"

" نہیں مجھے نہیں بننا ہے رائٹر . . . . میرا کالج میں رہنا مشکل ہو گیا ہے "۔

وہ روتی صورت بنا گئی۔ تب بوڑھے نے اس کی پیٹھ پر پیار سے جو ہاتھ پھیرا تو وہ دنادن پیر پٹکتی باہر چلی گئی اور فضا کا نوالہ بن گئی ــــ اس کے بعد بیوی کی جانب سے کچھ احکامات صادر ہوئے ــ ان میں ایک یہ بھی تھا " آپ آرام سے کمرے میں بیٹھئے کیوں بچوں میں اپنی ہنسی اڑواتے ہیں "۔

اس نے کہیں پڑھا تھا کہ یا مفریٹ مچھلی کا سر کھانے سے دماغ تر و تازہ رہتا ہے۔ وہ یا مفریٹ مچھلی کا سر ہمیشہ اپنی بیوی کو کھلاتا تھا۔ جب عرصہ گزر گیا اور پتہ چلا کہ وہ غلطی پر ہے۔ کیونکہ بیوی الٹے اس کا سر کھانے لگی تھی۔ اس نے پھر سوچا کہ بیوی کو یا مفریٹ کی دم کھلائی جائے تاکہ آنے والے دنوں میں کم سے کم وہ اس کے لئے اپنی دم تو ہلائے ! ــــ

مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ الٹا بیوی اسے دبانے لگی اور بوڑھے کو اس نے مٹھی میں کر لیا۔

ایک دن بک شیلف میں کوئی کتاب ڈھونڈنے، دیکھتے اس نے ایک کتاب ہاتھ میں لے لی۔ کتاب پرانی تھی۔ دھول جھاڑی اور چشمہ لگا کر نام پڑھا لکھا تھا " سپٹمبر سیکس " اس نے سوچا۔ چلو اسے ہی پڑھ ڈالیں پہلے کبھی پڑھی ہوگی، مگر دوبارہ پڑھنے میں اور پھر اس بوڑھی فرصت میں کچھ اور ہی مزا آئے گا۔ اس نے کتاب پڑھنی شروع کی۔

ساٹھ سال کے بعد بھی آدمی یا عورت اکثر کورس میں بے کام نہیں ہوتے بلکہ یہ تندرستی کے لیے فائدے مند ہوتا ہے۔ بوڑھے نے سوچا بیوی سے یہ سب کہنا چاہیئے۔ اسے کتاب پڑھ کر سنانی چاہیئے۔

مگر وہ صرف سوچ کر رہ گیا۔ کیسے کہے بیوی سے ؟ سنے گی تو کہیں یاد سخت احکامات صادر نہ کر دے کتاب میں ہارمونس کے انجیکشن لگانے کو بھی کہا تھا ــــ وہ گھومنے گیا تو ایک پہچان والے ڈاکٹر سے مل کر مشورہ بھی کیا۔ پھر کتاب پڑھی ــــ پھر یہی خیال کہ بیوی سے کیسے کہے؟ اس نے تو کہا تھا مالا جپنے کو اور یہاں سپٹمبر سیکس ! ــــ اب تو خون بھی سرد ہوگیا اپنا۔ مگر نہیں ! خون پورا سرد تو نہیں ہوا ہے۔ کہیں نہ کہیں جگنو چمک جاتے ہیں۔ بیوی سے کہوں گا تو شاید پیر بہوئی پاؤں سے کھولے گی !

سمندر کنارے گھومنے گیا۔ ایک بچی گھروندہ بنا رہی تھی۔ وہ بڑے شوق سے اسے دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد بچی نے گھروندہ توڑ دیا۔ اس نے پوچھا "کیوں"؟ بچی بولی " ٹھیک نہیں تھا ــــ پھر دوسرا گھروندہ بنانے لگی ــــ وہ وہیں بیٹھا رہا۔ دوسرا گھروندہ جب مکمل ہوگیا تو بچی نے پھر توڑ دیا۔ بوڑھا بولا "کیوں ؟ " بہت اچھا بن گیا تھا " بچی نے کہا ــــ وہ بہت محظوظ ہوا۔ وہ گنگناتا وہاں سے چلا اور ایک لمبا چکر کاٹ کر گھر لوٹا جب وہ گھر آیا تو لان میں اسے لڑکا نظر آیا اس کے ساتھ ایک خوبصورت سی لڑکی بھی تھی۔ اس نے سوچا لڑکے کی دوست ہوگی اور خیال گزرا کہ اب لڑکے کی شادی ہو جانی چاہیئے ــــ لڑکے نے بوڑھے کی طرف دیکھا مسکرایا تب بوڑھا بھی مسکرا دیا۔ اور اشارے سے پوچھا کہ یہ لڑکی کون ہے ! تب لڑکا قریب آیا ساتھ لڑکی بھی تھی ــــ

" یہ ریکھا ہے" اور لڑکی سے کہا " ریکھا یہ میرے پپا "،

لڑکی نے ہاتھ جوڑے

بوڑھے نے آشیرواد دیا۔ " واہ بھی نری دبانسی "

" ہاں پپا جون میں شادی کروں گا۔ ماں کو معلوم ہے "

" ٹھیک ہے اب تم شادی کروگے۔ ٹھیک ہے "

بوڑھا ریکھا سے بولا " ریکھا تو اب شادی کرے گی تو تجھے رتی شاستر کا گیان تو یہ کچھ ہے کہ نہیں "۔

ریکھا شرم سے پانی پانی۔ لڑکا آگ بگولہ " اسٹاپ اِٹ پپا۔ اسٹاپ اِٹ "۔

لڑکا لڑکی کا ہاتھ کھینچتا دندناتا باہر نکل گیا ــــ وہ بیچارہ ہی رہ گیا ــــ " ارے بیٹا ــــ میرا مقصد . . . . !

رات کو لڑکا آیا۔ خوب باتیں سنائیں۔ وہ چپ ہوگیا۔ اسے

ڈر لگا۔ آج کل کے لڑکوں کا کیا بھروسہ۔ باپ پر ہاتھ چلا دیں۔ اپنی غلطی محسوس ہوئی اس لڑکی کو کتنا اپ سیٹ لگا ہوگا۔ لیکن بوڑھا چپ رہا — غلطی قبول نہ کی —— کیوں کرے قبول ؟ کون ہے وہ ؟ میرا ہی لڑکا نا !

شام کو سیر کرکے لوٹ رہا تھا اس نے دیکھا ایک بوڑھا دوڑ رہا ہے جیسے جوانوں کے پیچھے لگا ہو — وہ ہنسا — ہوتے ہیں کچھ بوڑھے ایسے بھی، مگر میں نہیں — میں تو انہیں آئندہ کے لیے تیار کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ انھیں زندگی کی دوڑمیں پیچھے نہ دیکھنا پڑے ! اور پھر کیا تجربات کبھی پرانے پڑتے ہیں ؟

مگر کون سمجھائے آج کل کے لڑکوں کو ؟

گھر لوٹتے ہوئے اسے جوبے ملا۔ وہ اس کا پرانا دوست تھا۔ بولنے میں چوکھا، بدن سے بھی مضبوط —— پھر جوبے کا ایسی سوی پر داؤ بھی خوب ! آواز دی کہ بیوی حاضر !

"کیا کیا چل رہا ہے آج کل" جوبے نے پوچھا

"اب کیا — رٹائرڈ — آرام" بوڑھا بولا "ٹائم پاس ہوتا ہے تیرا" ؟

"کیوں نہ پاس ہو۔ بیوی بچے ہیں۔ خوب اچھی طرح پاس ہوتا ہے تیرا" ؟

"میرا کیا ؟ وقت پاس ہی نہیں ہوتا۔ بور ہوتا ہوں۔ کوئی کام ہی نہیں۔ کوئی بات بھی سنتا نہیں۔ کوئی پوچھتا نہیں۔ اپنے دوست سب ایک ایک کرکے مر رہے ہیں"۔

"ہاں وہ تو ہے —— مریں گے اپن بھی ایسے ہی"

بوڑھے نے سگریٹ جلائی۔

جوبے تمباکو کھانے لگا "ڈاکٹر کہہ رہا تھا اس عمر میں ٹھیک نہیں ہے تمباکو کھانا"

بوڑھا ہنسا "ڈاکٹر کہہ رہا تھا یا لڑکا" ؟

"ایک ہی بات ہے۔ لڑکا بھی کہتا ہے یہی بات"

کچھ دیر بعد جوبے نے پوچھا "کیا رے، بیوی کے ساتھ ... ؟

"نہیں —" بوڑھے نے انکار میں سر ہلایا۔

بیوی کے پاس جایا کر —— اتنی ہی تفریح اور اب رہا بھی کیا یہی عادت رکھنی چاہیے۔ اچھا لگتا ہے۔ جوانی کا احساس بنا رہتا ہے۔ اپن تو اب بھی پندرہ بیس دنوں میں ایک بار"۔

بوڑھے نے سوچا۔ جوبے کی تندرستی بھی بھلی۔ بیوی بھی سننے والی۔ اپنا کیا۔ ایک تو ڈھان پان جسم۔ اوپر سے خود کا خود پر بھروسہ نہیں۔ صرف جوبے بھی کیا آدمی ہے۔ جوبے کے تو مزے ہی مزے ہیں اپنا کیا، ذرا کچھ بات کرو تو بیوی ایل پی کی طرح بولتی ہے اور ہیڈ ماسٹر ہو کر بھی زبان نکالے سننا پڑتا ہے !

..... آخر اس نے ایک پلان فائنل کیا —— نیچے داہنے کمرے میں بیوی سوتی ہے۔ اس کے کمرے کا دروازہ بند نہیں ہوتا، بھڑا ہوا رہتا ہے۔ باقی سب اپنے اپنے بیڈروم میں سوتے ہیں۔ لڑکے نے شادی کر لی ہے وہ جلد ہی اپنے بیڈروم میں چلا جاتا ہے۔ اور لڑکی کنواری اس کی نیند میٹھی ہوتی ہے۔ میں جاؤں گا۔ دھیرے سے دروازہ دھکیلوں گا۔ اسے ایک ذرا ہاتھ لگایا تو اٹھ بیٹھی گی، پوچھے گی کیا کام ہے۔ سب آہستہ سے سیچمبر بکس کے بارے میں بتاؤں گا مگر مجھ سے ہو پائے گا یہ سب ! ہمت ! ہاں ہمت کہاں سے آئے گی ! یہاں تو ڈھان پان جسم خود کا خود پر بھروسہ کبھی نہیں ! وہسکی کا ایک آدھ پیگ کیسا رہے گا۔ ایک آدھ پیگ۔ زیادہ نہیں۔ ورنہ سب گڑ گوبر ہو جائے گا !

بوڑھا نیچے اترا۔ آہستہ سے دروازہ کھولا۔ کمرے میں داخل ہوا۔ مدھم اجالے میں بیوی پلنگ پر سوئی تھی، نہیں لیٹی تھی۔ دروازہ ذرا چرچرایا وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

بوڑھا مسکرایا۔ بیوی اسے گھورنے لگی۔

"کیوں — کیا کام ہے ؟"

"بوڑھا آگے بڑھا — بیوی بوڑھے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھورے جا رہی تھی۔

"اوپر جاؤ — اوپر جاؤ"

بیوی کا ہاتھ اوپر کی طرف۔

بوڑھے نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھی اور آگے بڑھا۔

بیوی چیخی —— بوڑھا سرگوشیوں میں بولنے کی کوشش کرنے لگا۔

"پرائیویٹ بات ہے تو چلاّ مت"

"نہیں جو کام ہے صبح کہنا۔ ابھی جاؤ"

مگر یک لخت بوڑھے نے اسے اپنی باہوں میں بھر لیا

یہ حالت بیوی کے لئے غیر متوقع تھی وہ رونے لگی — تیز آواز میں

رونے لگی۔

بوڑھے نے کہا " ذرا ۱۹۴۰ کا زمانہ یاد کرو "

اور بوڑھے نے اس کی کمر پکڑلی۔

پیچھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ لڑکا تھا!

"کیا ہے۔ کیا ہو رہا ہے"

"پرکاش — یہ ہم میاں بیوی کا معاملہ ہے تو جا"

"او مائی گاڈ"

بیوی نے اب رونا بند کردیا تھا اور بوڑھے کے چنگل سے اپنے آپ کو چھڑانے لگی تھی۔

" اف دارو کی بھی بو آرہی ہے" لڑکا بولا۔ لڑکے کے پیچھے بیٹی اور بہو بھی آگئے۔ تب کہیں بوڑھے نے بیوی کی کمر چھوڑی اور سیدھا کھڑا ہوگیا۔

" پاپا، آپ اتنی رات کو، اس عمر میں — آپ کو شرم آنی چاہئے اس کی طبیعت کا تو خیال کرنا تھا۔

" ارے میں کچھ معلومات دینے آیا تھا اور بحث کرنے "

" کیسی معلومات اتنی رات گئے — چلو جاؤ — اوپر جاؤ کل بات کرنا"

بوڑھا ڈر گیا۔ آج کل کے لڑکوں کا کیا بھروسہ۔ باپ پر ہاتھ اٹھا دیں۔ اپنی غلطی محسوس ہوئی۔ سب کے سامنے کتنا شرمندہ ہونا پڑا مگر بوڑھا چپ رہا۔ غلطی قبول نہ کی — کیوں کرے قبول ؟ اس کی ہے وہ ؟ آخر میری بیوی نا ؟ یہ سب میرے بچے نا ؟ ان سب کے لیے میں نے اتنا کیا ؟

دوسرے دن —

بوڑھا سڑک پر چلتا رہا۔ وہ چوبے سے ملنا چاہتا تھا دور کہیں بھاگ جانا چاہتا تھا وہ بس اسٹاپ پر کھڑا ہوگیا۔ اسے لگا وہ آئس کریم کی طرح دھیرے دھیرے پگھل رہا ہے۔ رات والا واقعہ وہ پھر سے جینے لگا۔ اب نہیں جاؤں گا اس گھر میں — نہیں چاہتے وہ لوگ، بھلے ہی اپنا خون ہوں کیا سمجھتے ہیں خود کو — میں کون ہوں ؟ ان کا باپ نا ؟ تو باپ کے ساتھ ایسا سلوک! ابھی ابھی نہیں میں چوبے سے ملوں گا۔ میں چوبے کے پاس جاؤں گا۔ پرایڈ ٹائم پر پرایڈ پلیس پر سب سپیشل کر کے دیا۔ کیا ملا ؟

اُسے لگا۔ کوئی قریب کھڑا ہے اور آواز دے رہا ہے۔

پاپا پاپا۔ یہاں کیوں بیٹھے ہو ؟

" ہوں! پرکاش!" بوڑھے نے پہچان لیا" میں ذرا چوبے کے گھر جا رہا ہوں!"

چوبے کے گھر — ٹھیک ہے — مگر یہاں کیوں بیٹھے ہیں ؟"

"بس سے جاؤں گا"

" مگر پاپا، کوئی بس یہیں رُکے گی۔ بس اسٹاپ کینسل ہوگیا ہے"

" کینسل ہوگیا — مگر کب ؟" بوڑھے نے تعجب سے پوچھا —

" یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم — مگر دیکھئے لکھا ہے —

کینسلڈ CANCELLED

❋

بقیہ صفحہ ۲۶ دیواروں کے بیچ

ڈیرا ڈال لیا ہے۔ ایسی مسجدوں سے فائدہ کیا جس کو نمازی میسر نہ ہوں۔ شیطان کے ڈیرا ڈالنے سے تو اچھا ہے اس میں انسان بس گئے ہیں۔ خدا مسجد میں نہیں انسان کے دل میں ہوتا ہے دلوں کی حفاظت کرنی چاہیئے ...!

اسی دوران ندا چُنّی حلوائی کی دوکان سے اپنے والد کے لئے موگر (تلی ہوئی مونگ کی دال) لینے جاتا ہے۔ گلی کے موڑ پر اچانک چار یا پانچ لوگ چیلوں کی طرح ایک بوڑھے پر جھپٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک چیخ ابھرتی ہے اور خاموشی کو چیرتی ہوئی گر جاتی ہے۔ بوڑھا زمین پر خون میں لت پت تڑپ رہا ہے۔ ندا کے پاؤں تھم جاتے ہیں۔ ڈر کے مارے اس کے ہاتھ سے دونا گر جاتا ہے۔ چُنّی حلوائی اپنی دوکان سے کود کر ندا کو اٹھا کر بھاگتا ہوا گھر کے دروازے پر چھوڑ جاتا ہے۔

وہ بوڑھا آدمی پڑوس کا ایک بزرگ محمد علی ہے۔ اس کا چھوٹا لڑکا ندا کے بڑے بھائی کا کلاس فیلو ہے جو اکثر ان کے گھر آتا ہے۔ ندا نے پہلی بار کسی آدمی کو خون میں لتھڑا ہوا دیکھا ہے۔ سرخ گاڑھا خون، بالکل قربانی کے بکرے جیسا۔ آدمی اور جانور کے خون کی رنگت اسے حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جب بکرا حلال کیا جاتا ہے تو اس کا سارا خون گردن کے نیچے کھدے ہوئے گڈھے میں جمع ہو جاتا ہے۔ جسے محلے کا کوئی کولی اپنے برتن میں بھر کرلے جاتا ہے اور اسے پکا کر خود بھی کھاتا ہے اور اپنے بال بچوں کو بھی کھلاتا ہے۔

[باقی آئندہ]

## ملکہ نسیم

میری سانسیں شام کی بھیگی ہوا میں گھل گئیں
بند کی آنکھیں تو ماضی کی کتابیں کھل گئیں
بچپنے میں جو بنائی تھیں کبھی دیوار پر
اب کی بارش میں وہ تصویریں بھی ساری دھل گئیں
کر گئیں موجیں شرارت جب بھی لکھا تیرا نام
ریت پر جتنی لکیریں تھیں وہ سب مل جل گئیں
میری آنکھوں میں سنہرے خواب ٹھہرے تھے مگر
خواب جب پہونچے حقیقت تک تو آنکھیں کھل گئیں
پتھروں کی سیج سے ابھریں گی خوشبوئیں نسیمؔ
اب زمانے سے رسوم و کاکل و سنبل گئیں ●

اے ۱۷/۲ ۱۲۴۳ ایرا کالونی، بھوپال۔ ۴۶۲۰۱۶

## پروین راجہ

لو چراغوں کی بڑھا دو شام تک
ان خرابوں کو سجا دو شام تک
میرے حصّے کے ستارے اے صبا
اپنے آنچل میں چھپا دو شام تک
شہر میں وہ قافلے پھر آ گئے
ہم نشینوں کو بتا دو شام تک
جنگلوں میں اور ڈر ہے آگ کا
فاختاؤں کو صدا دو شام تک
دوپہر کی دھوپ سے ہم جل گئے
شام ہونے کی دعا دو شام تک ●

اپنا منزل، شالہ دیوان بیگم، سرینگر۔ ۱۹۰۰۰۹

## انیس سلطانہ

کس درجہ ظلمتیں ہیں کہ دن کا سحر گیا
کس دل کا تھا غبار جو سورج کے سر گیا
صدیوں کے گرد جھاڑ رہا تھا فضا میں جو
سورج، سمندروں کے تلاطم میں گھر گیا
تسخیر کائنات پہ مائل ہر اک جواں
جھونکا ہوا کا تھا، ادھر آیا اُدھر گیا
ہاں موج خوں بہار کا دامن بھگو گئی
معصوم تتلیوں کا نصیبہ سنور گیا
دریا کی مخبری کو کنارے پہ آئے تھے
کیوں موتیوں کے روپ کا پانی اتر گیا

۳۴۔ عقب موتی مسجد، بھوپال (ایم پی)

## وفا قیصری

سرگرم کارِ حُسنِ عمل، سیلِ رواں ہے
منزل کے لیے گردشِ احساس جواں ہے
یہ جشنِ فتح ہے کسی جانباز کے سر کا
ٹوٹی ہوئی تلوار سرِ دستِ اماں ہے
ہم اہلِ قلم طرزِ نگارش کے دھنی ہیں
الفاظ کے ہونٹوں پہ رکھی اپنی زباں ہے
سنتے ہیں محبت کی حدیں ٹوٹ گئی ہیں
سہمی ہوئی برسوں سے موذن کی اذاں ہے
یوں تنگیٔ حالات کا شکوہ بھی نہیں ہے
اب دامنِ امید میں وسعت ہی کہاں ہے

**شاہ نواز قریشی**

مکان نمبر ۸۴-۷۷/۳۶۴ بلوچ پورہ لکھنؤ (یوپی)

# اور سقراط مر گیا

کافی ہاؤس کو آوازوں کی گونج، سگریٹ کے دھویں اور کافی کی تلخ مہک نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ ہر میز پر کوئی بحث ہو رہی تھی اور سارے مسائل کافی کی پیالیوں میں حل ہو رہے تھے۔

"انقلاب زندہ باد!"

"انقلاب زندہ باد!"

باہر سڑک پر ایک جلوس گزر رہا تھا۔ جلوس کافی لمبا تھا۔ جس میں عورتیں بھی تھیں، نوجوان بھی اور بوڑھے بھی۔

"یہ لوگ ہمیشہ انقلاب زندہ باد ہی کرتے رہ گئے" باجپئی کہتا ہے" اور انقلاب تھا کہ اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ ہو گیا.... اور انقلاب کی راہ دکھانے والے اسٹیبلشمنٹ کے گن گانے میں لگ گئے اور اس کام میں ایک دوسرے کو مات دینے کی کوشش کرنے لگے۔"

سفیر کے ذہن میں وہ مصرعہ گونجنے لگتا ہے" نام آوارانِ عہدِ بغاوت کو کیا ہوا...... نام آوارانِ عہد بغاوت کو کیا ہوا..؟؟"

پھر سفیر پوچھتا ہے" مگر ہم لوگ کیا کریں؟" باجپئی جواب دیتا ہے "ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ہمارے بس میں کیا ہے۔" سفیر سوچتا ہے۔ ہم واقعی کس قدر بے بس ہیں۔ وقت کے سامنے بھی، حالات کے سامنے بھی۔ کیسی اونچی اونچی باتیں سنتے ہیں۔ اونچی اونچی باتیں کرتے ہیں۔ مگر ہمارے بس میں کیا ہے؟ اتنا بھی اپنے بس میں نہیں ہے کہ ایک مکان ہی اپنا ہو جاتا۔ کسی ایک مقام پر مستقل طور سے۔ جہاں سے کہیں اور منتقل ہونے کا سوال نہ اٹھتا۔ ہم کرائے کی زندگی جی رہے ہیں۔ ۱۵ نمبر امداد علی لین سے ۴۴ نمبر علیم الدین اسٹریٹ تک کا سفر کیا ان دیکھا سفر تھا جو کیسی خاموشی سے طے ہو گیا۔ پھر وہاں سے شاہ گنج اور شاہ گنج سے نادان محل کا سفر کس قدر اذیت ناک تھا۔ ۴۴ نمبر علیم الدین اسٹریٹ کی کوٹھی بک گئی اور سنا ہے وہاں کوئی نئی کوٹھی تعمیر ہو گئی ہے۔ سفیر سوچتا ہے کہ کبھی وہاں جانا ہوا تو اسے اجنبیوں کی طرح وہاں سے گزرنا ہوگا۔ اس کوٹھی میں اس کا بچپن بیتا تھا اور بچپن کی یادیں بکھری پڑی ہیں وہ بیگانوں اور اجنبیوں کی طرح وہاں سے کیسے گزر سکے گا؟

کبھی شاہ گنج اور نادان محل سے گزرتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ اس کے سینے کے اندر کوئی چیخ چیخ کر رونا چاہتا ہے۔ اس کی آنکھیں سلگنے لگتی ہیں اور قدم لڑکھڑانے لگتے ہیں۔

مگر یہ باجپئی بھی خوب ہے۔ اس کی زندگی بھی عجب... اس کی زندگی کیا ہے؟ نہ یہ خود بتاتا ہے نہ میری ہمت ہوتی ہے کہ اس سے پوچھوں مگر کیسا گہرا آدمی ہے۔ ذہانت تو چہرے ہی سے نمایاں ہے۔ بس یہیں کافی ہاؤس میں بیٹھا مل جاتا ہے اور ہمیشہ ایک لباس یعنی کھدر کے کرتے پاجامے میں ملبوس۔ جو اکثر اتنا میلا ہو جاتا ہے کہ اس کا اصل رنگ پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ اس پر ناک بھوں بھی چڑھاتے ہیں۔ لیکن سفیر کو اس کے ساتھ بیٹھنے اور اس سے گفتگو کرنے میں بڑا سکون اور طمانیت محسوس ہوتی اور وہ چاہتا کہ زیادہ سے زیادہ وقت اس کے ساتھ گزارے۔ گفتگو بھی اس سے مختلف موضوعات پر ہوتی۔ کبھی سیاست پر کبھی ادب اور شاعری پر۔ سفیر کو یاد ہے کہ ایک بار اس نے بات ہی بات میں علامہ اقبال پر کچھ نکتہ چینی کی تھی تو باجپئی نے کافی زور دے کر اسے روک دیا تھا اور کہا تھا" آپ لوگ اقبال کو سمجھ نہیں پائے۔ وہ بہت بڑا شاعر تھا اور مفکر بھی۔" سفیر نے کہا" آپ تو اردو بھی نہیں جانتے۔ پھر اقبال کو آپ نے کیسے سمجھ لیا؟

"اقبال۔ جیسے پوئٹ کسی لینگویج کے دائرے میں قید ہو کر نہیں رہ سکتے۔ میں نے ان کی شاعری کو دوسروں سے پڑھوا کر سنا ہے۔ ان کی بہت سی چیزیں انگریزی میں ٹرانسلیٹ بھی ہوئی ہیں جو میں نے دیکھی ہیں۔"

سفیر ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر بولا' اقبال نے اپنے کو

محدود بھی تو کر لیا تھا۔ آخری زمانے میں تو وہ اسلام کے پروپیگنڈے پر ہی اتر آئے تھے۔ کیا ایک فن کار کا یہی رول ہوتا ہے؟"

"آپ ان کے خیالات سے اختلاف کر سکتے ہیں۔ لیکن جہاں جہاں انھوں نے شاعری کی ہے وہ بڑی مضبوط اور پنچ کرنے والی ہے!"

باجپئی کے اس آرگیومینٹ پر سفیر خاموش ہو گیا تھا۔

یہ سیاہ فام آدمی کون ہے؟ کیسے نشیب و فراز سے گزر کر وہ یہاں تک آیا ہے؟ سفیر اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ لیکن ہم کسی کے بارے میں کچھ جان بھی لیتے ہیں تو کیا فرق پڑتا ہے؟ کسی کے حالات جان لینے سے کیا ہم اسے جان لیتے ہیں؟ سمجھ لیتے ہیں؟ سفیر سوچتا کیا یہ کافی نہیں ہے کہ ہم دو گھڑی ساتھ بیٹھ لیتے ہیں۔ جب ہم ایک دوسرے کے لیے ہی کر سکتے کسی کا کوئی مسئلہ حل نہیں کر سکتے تو اس کے بارے میں زیادہ جان کر کیا کریں گے

کافی ہاؤس کے علاوہ باجپئی اکثر سفیر کے دفتر بھی آیا۔ کبھی کسی ضرورت کے تحت اور کبھی بس ملاقات کرنے۔ سفیر کو جانے کیوں اس کی معمولی سی، چھوٹی سی ضرورت پوری کرنے میں بھی بڑی راحت کا احساس ہوتا۔

سفیر نے اپنی زندگی کو بھی ایک ڈھرّے پر لگا لیا تھا، محفلوں میں دوستوں کے ہجوم میں، جلسوں، نشستوں اور تقریبات میں کیا رکھا ہے؟ سب پوز کرتے ہیں۔ سب جھوٹ بولتے ہیں۔ کھوکھلے دعوے کرتے ہیں۔ اس قدر کھوکھلے کہ گھٹن ہونے لگتی ہے۔ محفل آرائیاں، دعوتیں، تقریبات صرف ادبلائج کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔ خلوص کہاں اڑ گیا....؟؟

(اب تو جلوس ہی جلوس ہے)....شادی کی دعوت یا اسی طرح کی کسی اور تقریب میں شریک ہونے سے تو اسے الرجی تھی۔ اگر زبردست دباؤ سے سفیر کسی دعوت وغیرہ میں چلا بھی جاتا تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ اس سے زیادہ کمینہ اور ذلیل انسان اس دھرتی پر شاید ہی کوئی ہو۔ اس کا دم گھٹنے لگتا اور اس کا جی چاہتا کہ فوراً یہاں سے بھاگ جائے۔ زرق برق، چمکتے لباس، نمائشی شان و شوکت اور قدم قدم پہ بناوٹ تصنع.... ایکٹنگ، اُوور ایکٹنگ.... گھٹیا مذاق، بچکانہ طور طریقے، ڈگریوں کی دی ہوئی جہالت.... کیا یہی انسان اشرف المخلوقات ہے، مار دھاڑ اور بناؤ سنگھار کا یہ کلچر ہمیں کہاں لے جائے گا؟ ہمیں کسی لائق رہنے دے گا؟؟ سفیر گھنٹوں سوچا کرتا اور سوچتے سوچتے پریشان ہو جاتا تو باجپئی کے پاس کافی ہاؤس چلا آتا۔ یہاں آکر اسے جیسے شانتی مل جاتی۔ کافی ہاؤس سے باہر آتا تو وہی بھاگ دوڑ، وہی لوٹ، وہی کرپشن، وہی بد مذاقی، وہی بھدا پن، وہی بھونڈا پن، لیکن یہاں جینا ہے تو کرپٹ بننا پڑے گا۔ ورنہ ہمیشہ کرائے کی زندگی جیو گے اور موت قسطوں میں ہو گی۔

باجپئی کہتا ہے — "ڈاکٹر اقبال نے 'چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا، مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا' کہہ کر ایک انٹرنیشنل ازم کی بات کی تھی۔ سفیر خاموش ہے۔ اس کے ذہن میں وہ مصرعہ گونجنے لگتا ہے۔ — "رہنے کو گھر نہیں ہے سارا جہاں ہمارا.... رہنے کو گھر نہیں ہے سارا جہاں ہمارا..!"

۴۶ نمبر علیم الدین اسٹریٹ سے شاہ گنج اور شاہ گنج سے نادان محل اور پھر نادان محل سے یہاں تک.... کتنے آشیاں بدلے اور کیسے کیسے طوفانوں سے گزرنا پڑا۔ لیکن...."ہم نے بنا لیا ہے نیا آشیاں پھر سے . ہم نے بنا لیا ہے نیا پھر سے آشیاں"... مگر بنا کہاں سے لیا ہے۔ ہم تو کرائے کی زندگی جی رہے ہیں اور.... اور یہاں تو ہر چیز بک رہی ہے، ہر چیز کی قیمت لگ رہی ہے۔ اسٹیبلشمنٹ ہر چیز خریدنا جانتا ہے اور ہر چیز خرید سکتا ہے.... ہم جو کچھ کرتے ہیں، ہمارا جو کام ہے، جو پیشہ ہے، وہ ہمارے اندر کے آدمی سے ہم آہنگ نہیں ہے.... جی رہا ہوں دوسروں کے جسم میں.... لیکن یہ باجپئی کس طرح جی رہا ہے۔ کس کے جسم میں جی رہا ہے؟

ایسا نہیں تھا کہ کافی ہاؤس میں وہ محض سفیر ہی کے ساتھ بیٹھتا تھا۔ کافی ہاؤس میں اور لوگ بھی اس کے ساتھ بیٹھے نظر آئے، وہ سب لوگ بھی باجپئی سے متاثر بلکہ مرعوب نظر آتے تھے۔ ان میں ادیب بھی تھے، جرنلسٹ اور شاعر بھی اور مختلف سیاسی پارٹیوں کے لوگ اور سرگرم کارکن بھی۔

باجپئی کے چہرے اور لہجے دونوں میں بڑا ٹھہراؤ تھا اور وہ متانت کے ساتھ رک رک کر گفتگو کرتا تھا۔ انگریزی پر بھی اچھا خاصا کمانڈ تھا۔ لیکن یہاں ٹیلنٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں بدتمیزی اور بے ہودگی کی ضرورت ہے، غنڈہ گردی کی ضرورت ہے۔ تیز لہجے میں چلّا کر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔

سفیر سوچتا ہے بلکہ دیکھ بھی رہا ہے کہ جو جتنا زیادہ بدتمیز اور بے ہودہ ہے، وہ اتنا ہی کامیاب ہے.... چاروں طرف جہالت، کمینہ پن، چھین جھپٹ، حرامی پن!.... آگے بڑھنے کے لیے کسی کو بھی دھکا دے کر گرایا جا سکتا ہے۔ مگر یہ باجپئی ہر ضروری اور غیر ضروری شے سے بے نیاز ہے۔ اس کی زندگی شاید ایک نقطے پر آکر ٹھہر گئی ہے اور وہ نقطہ ہے یہ کافی ہاؤس.....

سفیر کی زندگی PHASE میں بٹی ہوئی ہے۔ اس کا دفتر شہر کے سب سے مہنگے اور صاف ستھرے علاقے میں ہے اور گھر سب سے گندے اور پچھڑے علاقے میں۔ مگر یہ گھر ہے؟ کرائے کی زندگی کو گھر کون کہتا ہے.....؟

کافی ہاؤس بھی سفیر روزانہ نہیں آتا۔ کبھی کبھی تو وہ پندرہ پندرہ دن کے بعد آتا ہے۔ اس روز بھی وہ تقریباً ۲۰ دن کے بعد کافی ہاؤس آیا تھا۔ اس روز باجپئی کافی ہاؤس میں نہیں تھا۔ اس نے سوچا ابھی آ ہی جائے گا۔ وہ کافی کی چسکیاں لیتا رہا اور اپنی بکھری بکھری سوچوں سے الجھتا رہا۔ اس بکھراؤ اور تنہائی میں' اداسی میں اسے ایک لذت بھی محسوس ہوتی اور اس کا من چاہتا کہ وہ گھنٹوں ایسے ہی خاموش اور تنہا بیٹھا رہے۔ کوئی اس سے مخاطب نہ ہو اور وہ بس سوچا کرے اور سوچتا ہی رہے.... لیکن یہ باجپئی آج کہاں چلا گیا؟؟

۳۰-۲۵ سال پہلے بنی وہ ہندی فلم آج بھی کتنی سچی لگتی ہے۔ جس کا مرکزی کردار فلم کے اختتام پر اپنی محبوبہ سے کہتا ہے...." نہیں مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے..... مجھے شکایت ہے اس تہذیب سے' اس سنسکرتی سے جہاں جھک کر ملنا ایک کمزوری ہے اور کسی کے دکھ درد پر دو آنسو بہا لینا بزدلی۔ مجھے ایسے ماحول میں کبھی شانتی نہیں مل سکتی کبھی سکون نہیں مل سکتا.... اس لیے میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ دور... بہت دور..... وہاں' جہاں سے مجھے اور دور نہ جانا پڑے"

"ارے بھئی' سفیر صاحب! آج کچھ زیادہ ہی کھوئے ہوئے نظر آرہے ہیں آپ" تیواری کی آواز پر وہ چونک پڑا — "نہیں' نہیں' آیئے! کافی پیجئے۔ وہ تیواری کے لیے کافی کا آرڈر دیتا ہے۔

"آج باجپئی کہاں ہیں" سفیر پوچھتا ہے۔

"باجپئی؟" تیواری کے لہجے میں حیرت ہے۔ "آپ کو نہیں معلوم؟"

"کیا نہیں معلوم؟"

"باجپئی کا تو انتقال ہو گیا"

"کب"؟ سفیر کا لہجہ بالکل سپاٹ ہے۔

"یہی کوئی ایک ہفتہ پہلے"

اب بھی سقراط پر زہر اب اثر کرتا ہے.... اب بھی سقراط پر زہر آب اثر کرتا ہے.... اور پھر سفیر خاموش ہو جاتا ہے۔ اب وہ کچھ اور سننا بھی نہیں چاہتا....

باجپئی کون تھا، کیا تھا، اس کی کہانی کیا تھی؟ اسے اب کون بتائے گا؟؟ اس نے آخر اس سے اس کے بارے میں کبھی کچھ پوچھا کیوں نہیں؟ اور اس کے بارے میں جاننے کی اب یہ خلش کیسی تھی؟؟

لیکن اچھا ہی ہوا کہ وہ مر گیا۔ اسے اس گندی اور ذلیل دنیا سے اور لوگوں کے احسانات سے نجات تو مل گئی۔ اور پھر وہ نہیں رہا تو یہاں کون سی کمی آگئی؟ اس دنیا کو اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ یہاں تو ان کی ضرورت ہے' جن کے کپڑے اجلے ہوں اور دل میلے۔

کافی ہاؤس کی رونق شباب پر تھی۔ آوازوں کی گونج نے سارے ماحول کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ ہر میز پر کوئی بحث ہو رہی تھی اور سارے مسائل کافی کی پیالیوں میں حل ہو رہے تھے۔

سفیر کا دل چاہا کہ وہ چلائے اور چیخ چیخ کر کہے کہ اس دنیا کو آگ لگا دو۔ اسے تباہ کر دو۔ اسے جلا ڈالو ... لیکن وہ کچھ نہیں کہہ پاتا۔ اس کی آواز حلق میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔ ❋

بقیہ صفحہ ۳۲ کرشن بھکتی کے دو مسلمان شاعر

ہمری سبھا میں وہ آوت ناہیں　　بیٹھ رہا سوتن کی جتھا میں

हमरी सभा मे वह आवत नाही　=　बैठ रहा सौतन की जथा मे ।

مندرجہ بالا حقائق و شواہد سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ شاہ محمد کاظم قلندر و شاہ تراب علی قلندر کی ہندی شاعری اگر ایک طرف اپنے مطالب کے صوفیانہ پہلوؤں کی گہرائی و گیرائی سے تصوف کے پیچیدہ و دقیق مسائل کی عقدہ کشائی میں معاون ثابت ہوتی ہے تو دوسری طرف سادہ اسلوب، سہل زبان، سلاست مضامین اور عام فہم طرز بیان سے بسنت، ہولی، دیوالی کی منظر کشی برج کے سبزہ زاروں اور حسین وادیوں میں شری کرشن جی کی شوخیوں، شرارتوں اور گوپیوں کی عشوہ طرازیوں اور کرشمہ سازیوں کی دلکش داستانیں اپنے اندر محبت کے جولازوال جذبات سموئے ہیں انہیں جذبات کی ذوبہ تو رنگینی نے اپنے تخیلی مراحل میں وہ رنگ اختیار کیا جسے ہم آدمیت کا، انسانیت کا، محبت کا، ایمان کا رنگ کہہ سکتے ہیں اور جس کا معیار یہ ہے ؎

دردِ دل پاس وفا جذبہ ایماں ہونا　　آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا ❋

# مکتوب

## راجرن رستوگی ـــــــ پیروباڑی گوہاٹی (آسام)

اداریہ انہی خطوں پہ ہے اُردو میں لکھیے مگر طرزِ نگارش پر صحافتی حس
لی کا آئینہ دار تو ہے مگر حقائق سے چشم پوشی کرتا نظر آتا ہے۔ انگریزی عالمی
ن ہے اور ہندوستان میں اس زبان کا مخصوص رول رہا ہے۔ ہندی اردو
دوسری ہندوستانی زبانوں کے اسکولوں میں پڑھنے والے طلبہ انگریزی
یم اسکولوں میں زیر تعلیم طلبہ کے سامنے ہیچ دیوچ رہتے ہیں مرید رول
ٹکنیک، وزن، سیاسیات وغیرہ انگریزی ہی سے حاصل ہوتے ہیں ـــ
ی اور اردو کو فروغ پذیر تو ضرور کیا جائے مگر انگریزی کے بغیر وہ فروغ
لواقع جد ماتی فروغ ہی ہوگا۔ اگر کوئی سرپھرا کیش KFATS ایسے
رکونا بالغ زبان کا شاعر بتا دے تو وہ صرف اپنی بے بصیرتی کا اعلان ہی کرتا
۔ انگریزی کے خلاف ہر محاذ آرائی سعی لاحاصل کے سوا اور کچھ نہیں تھی
تھی۔ ہندی کے دیوانوں میں اردو کے حصے بھی شامل ہو گئے جس کے وجوہ
سیاسی ہیں۔

مدل کے بیچ (ندا فاضلی) شکوہ کا تو رکا (یوسف ناظم)، دیگر احوال یہ بیگ (منتخب حسین) بہت
اری ہیں۔ غزلیات، نظمیں اور افسانے سبھی اچھے ہیں، خاصے اچھے ہیں۔
سوس محسن بھوپالی اور مظفر وارثی کی غزلیات درخور اعتنا ہیں ؎

راوسے کوئی مفر نہیں مجھے پاتا
دائی ایک بھی منظر نہیں مجھے پاتا
بات میں الستطور ہوتی ہے
شعر میں حاشیے نہیں ہوتے

(محسن بھوپالی)

لوگ دو گام مسافت کو سے چلے دیتے
اپنے ہم راہ اگر زادِ سفر لے آتا

(مظفر وارثی)

یہ پیارے اشعار ہیں۔

اردو املا اور لسانیات (ڈاکٹر گوپی چند نارنگ) کچھ اچھے فقروں کا مرقع
ظر آتا ہے۔ لسانیات کی تکرار نے تحریر کی شکل بگاڑ کر رکھ دی ہے ـــ
یہ پیوند کوئی کرے، ان سطور میں رشید حسن خان، شمس الرحمٰن
قی، ابو محمد سحر، گیان چند، مسعود حسن خان اور نارنگ صاحب کی جلد
کی جھلک نمایاں نظر آتی ہیں۔ بلوم فیلڈ BLOOM FIELD کی تصنیفات
نامہ ہوتے ہوئے بھی پامال ہو چکی ہیں WITTGENSTEIN
سٹائن COOLING WOOD کولنگ وڈ WHITE HEAD
ٹ ہیڈ YOUGENY BASI وغیرہ متعدد یورپی، امریکی سکالروں اور
مفکروں نے جو نئے آفاق و افلاک پیش کیے ہیں ان پر اردو والوں
ابھی تک تو نظر مبذول نہیں فرمائی ہے۔

تھیل میسیح کے پاتجلی نے اپنی معروف تصنیف "اشٹ ادھیائی"
کی جانب بھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھا گیا ہے۔ آج تک کسی
اردو کے ادیب نے یہ نہیں کہا کہ "ح" اور "ہ" بھی SEMI-VOWEL
نیم مصوتہ) ہے جس کی سب سے پہلے نشان دہی پاتجلی نے کی تھی۔
لسانیات، سماجیاتی لسانیاتی، مصوتیات، معنیات وغیرہ میرے
توجہات میں دو تین سال ہی شامل ہوئے ہیں۔ اردو کا املا حیا ہے دلیا ہے
اس پہ نظر ڈالتے وقت روایت سے روایت مرتکزات کو پیش نظر رکھا

ضروری معلوم ہوتا ہے یہاں یہ بھی عرض کر دوں، اس ضمن میں اپنے مطالعے
کو ہنوز ناکافی سمجھتا ہوں۔

•

شاعر کے اقبال خصوصی نمبر پر ابھی تک کوئی تبصرہ نظر سے نہیں
گذرا، اردو حلقوں کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ نمبر ہٰذا اقبال انسائکلوپیڈیا
ایسا شمارہ جس کا اقبالیات میں ہمیشہ مقام رہے گا۔

## نثار احمد فاروقی ـــ پوسٹ بکس نمبر ۹۷۲۲ نئی دہلی ۲۵-۱۱

شاعر کا شمارہ (ج ۶۹/۱-۲) دیکھا تو بے اختیار پروفیسر
رشید احمد صدیقی مرحوم کا ایک جملہ یاد آگیا، انھوں نے ایک بار رشید حسن
خاں کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ان کی مثال بنارس کے جلاہوں کی سی ہے
یہ کہہ کر رشید صاحب مسکرائے اور دیر تک خاموش رہے، میں سوچنے
لگا کہ آخر یہ کیا کہہ رہے ہیں پھر خود انھوں نے وضاحت کی کہ بنارس کے
کاریگر کیسی محنت سے زری کی اعلا درجے کی ساڑیاں بناتے ہیں، مگر ان کو
معمولی مزدوری ملتی ہے، نفع سب سیٹھوں کی جیب میں جاتا ہے!

اردو املا پر رشید حسن خاں نے کام کیا تھا، کچھ زیادہ ہی تفصیل
سے کر ڈالا۔ ابھی ان کی کتاب چھپی بھی نہ تھی کہ اس کا عطر بازار میں آچکا تھا۔
ان جیسے اہل قلم تو ادھر اُدھر کھوج کر لکھتے ہیں، مگر ہمارے درمیان ایسے
بھی صاحبان کشف و کمال موجود ہیں جن پر مضامین کا نزول آسمان سے
ہوتا ہے، اور ظاہر ہے کہ زمین کے معاملے میں آسمان کی بات زیادہ معتبر
ہونی چاہیے۔

جس طرح بہت سی اچھی اور نفیس باتوں پر حماقت کی چھاپ ہو سکتی
ہے اسی طرح حماقتوں کو بھی نفیس بنانا کچھ دشوار نہیں ہے۔ توفیق رفیق ہونی
چاہیے!

املا کے مسائل ہر دور کی ضرورت کے لحاظ سے خاموشی کے ساتھ پیدا
بھی ہوتے ہیں اور حل بھی ہوتے رہتے ہیں۔ آپ بارہویں اور تیرہویں صدی سے
لے کر بیسویں صدی تک کی مختلف (فارسی رسم الخط کی) تحریروں کے نمونے
سامنے رکھ کر دیکھیں تو وہاں کوئی "ماہر لسانیات" نہیں بیٹھا ہے، مگر تغیر و
تبدیلی کا عمل خود ہی جاری ہے۔ املا کا مسئلہ صرف پڑھانے کے لیے نہیں ہے،
(بہ روایتی نکات کو چھوڑ کر) کوئی اس طرح پڑھانا لکھانا ہے جس کے لیے
قواعد املا، بنانے کی ضرورت محسوس ہو اور کوئی شخص اس لیے سر کھپائے
کہ اس سے تدریس میں سہولت ہوگی۔ اصل ضرورت لغت میں کسی لفظ کی صحیح
اور مستند شکل ظاہر کرنا ہے۔ آپ کے مضمون نگار نے نوائے وقت پر ہمزہ لکھنے
کا فتویٰ دیا اور فرمادیا کہ اگر کوئی فرمودۂ غالب کی پیروی میں "بغیر ہمزہ لکھنا
چاہے تو غلط قرار نہیں دیا جاسکتا۔

غالب کون سے ماہر لسانیات ہیں؟ بات یوں ہوتی تو ایک ڈھب بھی تھا
کہ نوائے وقت (ہمزہ کے بدون) لکھنا ازروئے قاعدہ درست ہے، لیکن
رواجِ عام کو دیکھتے ہوئے (ہمزہ کے ساتھ) بھی لکھا ہو تو اُسے غلط نہیں
کہنا چاہیے۔ مطلب یہ کہ گوارا کر لیا جائے۔

نوائے وقت دو لفظوں کا مرکب ہے، نوا + وقت، الف پر کسرۂ
اضافت نہیں آسکتا تو اس کو (ے) سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اب یہاں یہ امیر
ہمزہ کیا کریں گے؟

املا اور لسانیات کے اتنے بلند بانگ دعوے کرنے والے کو اعراب کا
مفہوم بھی معلوم نہیں ان کے لیے مناسب ہوگا کہ پہلے اس پر ایک سمینار کر کے

اہل علم کی آرا سے استفادہ کر لیا جائے۔

نئے الفاظ وضع کرنا بھی خاصا پرخطر کام ہے آج کل ایک ایسو
(خصوصاً تنقید میں) اُبھر رہی ہے جس کا کوئی سر پیر نہیں، یہ الفاظ
کی دنیا کے بچے ہیں جو اپنا بستہ خود اپنی کمر سے باندھے ٹہل رہے ہیں،
تناظر، ساختیاتی، وغیرہ)

اگر ان کی چیکنگ نہیں ہوتی تو پھر ہوا یہ ہے کہ اونٹ خیمے کے اند
اور متدو ماہر بارشش میں ٹیا جھیگ رہا ہوگا۔ اور لسانیات کی زبانی دہ
ہوگا کہ: "پیٹ چلتا ہے آنکھ آئی ہے!"

ارادہ تو ہوا تھا کہ املا، کے موضوع پر ایک "طرحی غزل" ہی
لکھ دوں، مگر آخر کار، لکھنے میں ہی بھلائی دیکھی۔ امام غزالی کی ایک
کا نام ہے المضنون بہ علیٰ غیر اھلہ (یعنی ایسی کتاب جسے نا
چھپا کر رکھا جائے) اور پروفیسر عبدالعزیز میمن کہا کرتے تھے کہ
کچھ لوگ "نمک حرام" ہوتے ہیں ایسے ہی "علم حرام" بھی پائے جاتے ہیں۔
علمی بحث کو اکھاڑا بنانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہماری چودھ
کو مانو۔ یقیناً ہمارے فاضل دوست پروفیسر ابو محمد سحر صاحب
یکتے کے رمز آشنا ہوں گے!

❁

آپ نے میرا بھیجا ہوا امیر مینائی کا خط شائع کر دیا۔ شکریہ ۲۱،
جو نوٹ لکھا ہے وہ تشنہ ہے اور اس میں بعض باتیں رہ گئیں خیر۔ رام پو
منیاراں ضلع سہارنپور کا ایک قصبہ ہے۔ مولوی عبدالسمیع بیدل کا وطن دہ
ان کی تصانیف بھی متعدد ہیں جن کی تفصیل بعض مضامین میں آچکی
کچھ احوال ایوب قادری مرحوم کی کتاب "غالب اور عصرِ غالب" میں موجود
ان کی تصانیف میں "انوارِ ساطعہ" بعض عقائد کی وضاحت میں ہے
بہت مقبول ہوئی، اس کا جواب مولانا رشید احمد گنگوہی نے "براہین ق
کے نام سے لکھا تھا اور مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے نام سے چھپ
تھا۔ مصائب کتابوں میں حالق باری کے طرز پر حمد باری بہت مشہور ہے

## اخلاق اثر ـــــ صادق منزل، چوکی امام باڑہ بھو

بڑی تاخیر کے بعد شاعر کے دو شمارے شائع ہوئے۔ ان شمار
میں شامل مضامین اور تخلیقات قابل توجہ ہیں۔ مضامین میں پروفیسر گو
چند نارنگ اور تخلیقات میں ندا فاضلی کی خودنوشت کو ایک ہی نشست
میں پڑھ ڈالا۔ پروفیسر نارنگ کا لہجہ اگرچہ تیکھا اور ماگھی میرائل کی طرز
لیے ہوئے ہے پھر بھی ان کی تحریر میں دوسری تحریروں کے لیے مثبت ا
نظر موجود ہے۔ پروفیسر نارنگ اور پروفیسر سحر اردو قاعدے کی صرف
معیاری اصوات اور ان کی صرف بعض حرکتوں سے توجہ کرتے ہ
مگر ان کی علامتوں اور ان کی مختلف شکلوں پر توجہ نہیں دیتے۔ پروفیس
نارنگ اور پروفیسر سحر صاحب اگر کسی بھی اردو قاعدے کے طریقۂ تدر
یا اسلام ہجا پر لکھیں تو روایتی تدریس اور لسانیاتی طریقۂ تدریس کا صح
تجزیہ اور ان کی افادیت کے بارے میں بھی کوئی رائے پیش کی جا سکے۔
نارنگ نے این سی ای آر ٹی کے لیے اردو کی پہلی کتاب ترتیب دی ہ
پروفیسر سحر کا پسندیدہ قاعدہ مولوی محمد اسماعیل صاحب کا ہے
ندا فاضلی نثر بھی خوب لکھتے ہیں۔ بڑی دلکش اور دلگداز تصا
انھوں نے پیش کی ہیں۔ ان کی ذات کے ساتھ ساتھ اس دور کی معنو

بھی نمایاں ہو جاتی ہیں۔ تکنیک کے بارے میں میرا خیال ہے کہ بیانیہ کی جگہ اگر شعری بیانیہ ہوتا تو اس کا تاثر اور گہرا ہو جاتا۔ شاعر کے آئندہ شماروں میں اتنی تاخیر نہ کریں کہ خود نوشت کے واقعات ذہن سے محو ہو جائیں۔

**آل احمد سرور** —— سر سید نگر، سر سید روڈ علی گڑھ

شاعر کے پچھلے دو شمارے ملے، ان کی مشمولات میں تازگی تھی۔ خرعات میں بھی معنی خیز باتیں کہی گئی ہیں۔ آپ لوگ جس طرح موجودہ حالات میں ایک اچھا ادبی رسالہ جاری رکھے ہوئے ہیں یہ بڑی بات ہے۔ اب شاعر ہماری ادبی صورت حال کا آئینہ بن گیا ہے۔

**مظہر امام** —— ۷۔ پرتاپ پارک ملیٹس، ریسیڈنسی روڈ سری نگر

اقبال نمبر کے بعد ایک شمارہ اور اب دو شمارے ملے، شاعر کا بہت انتظار رہتا ہے۔ رسالے کی ضخامت کم ہے لیکن معیار پر کوئی حرف نہیں آیا ہے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔

**ظہیر غازی پوری** ۔ آفس سپرنٹنڈنٹ ، ایل ایس۔ آر۔ ٹی۔ ہزاری باغ (بہار)

زیر نظر شماروں میں آپ نے کئی اہم مضامین شامل کر کے ذوقِ مطالعہ کی تسکین کا سامان فراہم کر دیا ہے۔ گوپی چند نارنگ کا مقالہ "اردو املا اور لسانیات" اور سید محمد عقیل کا تنقیدی مضمون "اکیسویں صدی کی غزل" — ایک اندازہ تبیہ جد معلوماتی ہیں اور بڑی محنت سے لکھے گئے ہیں۔ ندا فاضلی کی خود نوشت بھی لائقِ تحسین اور دلچسپ سلسلہ ہے۔ جگن ناتھ آزاد، مصابی اور حسرت ظفر کی شعری تخلیقات نے متاثر کیا۔ مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم کے طنزیہ مضامین لاجواب ہیں۔

**انور ملینائی** —— الامین ایجوکیشنل کامپلکس۔ کولار (کرناٹک)

گوپی چند نارنگ کا مقالہ اردو املا اور لسانیات کی دونوں قسطیں نظر افروز ہوئیں۔ لسانیات کے ریسرچ اسکالروں کے لیے الفاظ کے املا کے متعلق متعین کی ہوئی علامتیں اور اصول، رہنما کہے جا سکتے ہیں۔ اس مقالے سے نارنگ صاحب کی لسانیات پر دسترس، ان کی پختگی اور محنت کا اندازہ ہوتا ہے۔ موصوف نے ابو محمد سحر کے املا کے اصولوں کا معائنہ کرتے ہوئے جو مقبولیت اسے ادبی دیانت داری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

حروف تہجی پر بحث سائنٹفک ہے۔ صوتیت اور ہکاریت کی بحث بھی استدلالی ہے۔ موصوف سے بعض جگہ کچھ اختلاف کے ساتھ ان کی اس دیدہ ریزی پر داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ حروف تہجی کے تحت نارنگ صاحب نے لکھا ہے۔ چار کا اضافہ فارسی میں ہوا۔ مولوی عبدالحق نے قواعد اردو میں فارسی کے خاص حروف کے طور پر پ۔ چ۔ گ۔ ژ۔ لکھا ہے اور پ چ گ کو فارسی اور ہندی مشترک الفاظ میں شمار کیا ہے۔ نارنگ صاحب اگر حروف تہجی کے فارسی حروف کو الگ تحریر کر دیتے تو الجھن دور ہو جاتی۔

الگ سے ہند آریائی حروف (یعنی ہندی حروف) کو نہیں لکھا۔ جن کی تعداد انھوں نے تین بتائی ہے۔ عبدالحق مرحوم نے ٹ۔ ڈ۔ ڑ کو ہندی کے خاص حروف لکھا ہے۔ عربی کے جملہ ۲۸ (اٹھائیس) الفاظ حروف تہجی میں شامل ہیں۔ ۱۴ حروف شمسی اور باقی قمری۔ نارنگ صاحب نے اردو حروف تہجی میں شامل کل ۲۹ (انتیس) حروف کا ذکر کیا ہے۔ یہ وضاحت [...]ہ ان کے حروف الگ لکھ کر دینا ضروری تھا۔

نارنگ صاحب لکھتے ہیں "اردو میں آخری حروف ہمیشہ ساکن ہوتا [...] جب یہ متحرک ہو ہی نہیں سکتا تو ہر بار اس کو ساکن یا موقوف کہلوانا کیا [...] معنی رکھتا ہے۔" موصوف نے موقوف اور ساکن کو ہم معنی تصور کیا ہے۔ [...] یہ ٹھیک نہیں۔ کیوں کہ ساکن وہ حروف ہے جس پر کوئی حرکت نہیں۔ اور

موقوف سہ حرفی (عربی) چہار حرفی (فارسی) اور پنج حرفی (ہندی یا انگریزی) الفاظ میں بالترتیب ایک۔ دو۔ اور تین حروف ہوتے ہیں جو ساکن سے پہلے آتے ہیں جیسے (۱) "سحر" (ر ساکن۔ ح موقوف) (۲) ریست (یائے معروف میں موقوف اور تائے ساکن ہے) (۳) "شانتی" میں رائے ساکن لفظ میں اور تائے موقوف ہیں۔ اس طرح موقوف حرف ساکن حرف سے پہلے آتا ہے۔ جس کی تعداد لفظ کے طوالت و اختصار پر منحصر ہے۔

نارنگ صاحب نے غالب کے مندرج مصرعے میں "کوئی" کو بروزن فاع بتایا ہے۔ جو درست نہیں ہے۔ ؎

حز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار

یہ مصرع بروزن مفعولُ فاعلاتُ مفاعیلُ فاعلان ہے۔ تقطیع۔ جز قیس = مفعولُ۔ اور کوئی نا = فاعلاتُ۔ ن آیا ب = مفاعیلُ۔ روئے کار = فاعلان۔ لفظ کوئی یہاں بروزن لات تقطیع ہوتا ہے — لات = فَعَلْ لکھ کر کوئی "بروزن فَعَلْ موزوں کیا جا سکتا ہے لیکن اسے فاع = کے وزن پر نہیں لکھا جا سکتا۔ کیوں کہ یہاں فرق معصوم اور بدنام کا ہے جو کسی صورت ہم وزن نہیں ہیں۔

**اسلم حنیف** ۔ پوسٹ آفس گنور ڈسٹرکٹ بدایوں —— (یوپی)

جنوری فروری ۱۹۸۹ء کے ایک وقت دو شمارے موصول ہوئے ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر سید محمد عقیل کے مضامین اپنی اپنی نوعیت کے اعتبار سے اہم ہیں۔ اردو املا اور لسانیات کے سلسلے میں آج سے بہت قبل شاعر کے کسی شمارے میں ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب کا مضمون شائع ہوا تھا اس میں پیش کردہ نقطۂ نظر کے خلاف میں نے کچھ باتیں پیش کرنے کی جرأت کی تھی لیکن وہ مکتوب نہ معلوم کن وجوہات کے سبب شائع نہیں ہو سکا۔ اب نارنگ صاحب کے مضمون اردو املا اور لسانیات کو پڑھ کر اس لیے زیادہ مسرت ہوئی کہ انھوں نے معروضی انداز فکر اختیار کرتے ہوئے ان تمام مسائل پر کھل کر لکھا ہے جسے دیگر اہل لسانیات نے مغالطوں کا شکار بنا کر پیش کیا ہے۔ معلوم نہیں کہ اردو کے ہم صوت حروف سے لوگوں کو کس لیے کھٹکتے ہیں؟ اور وہ ایک سے زائد حروف کو کیسے اڑا دینا چاہتے ہیں؟ لسانیات نے جس شعبے میں بدل جا سکتی ہے اس بحث کر اسے استعمال کی کیوں کوشش کی جا رہی ہیں؟ البتہ کھلا کہے نارنگ صاحب کا کہ ان کا موقف تو بہت صحیح اور بہت اہل قدر بحث کے حوالے سے گراں قدر مضمون لکھا ہے رشید حسن خاں اور ابو محمد سحر جن نظریات کو ہوا دے رہے ہیں ان سے سوائے گمراہی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا اس لیے لسانیات کے قارئین کو یہی ہدایت دی جا سکتی ہے کہ

"اے گرفتار ابوبکر و علی ہشیار باش"

اکیسویں صدی کی غزل کے حوالے سے میں عقیل صاحب کا اندازہ کسی حد تک عصری غزل نگاروں کی ہیئتِ لسانی اور جمالیاتی بے گانگی کو ظاہر نہیں کرتا ملکہ روایت کے خلاف اجتہاد کے اس نامعقول راستے کی جانب غلط اشارہ کرتا ہے جہاں پہنچ کر غزل اپنے اس خارجی تقاضوں سے بھی محروم ہو جانے کی جس کے بغیر اس صنف کا کوئی ذاتی وجود برقرار رہ سکے گا۔ مضمون کافی محنت سے لکھا گیا ہے لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے ایک رسالے سے ماخوذ دو شعروں پر جو تبصرہ کیا گیا ہے اس میں ایک شعر ان کی گرفت سے پھسل گیا ہے ؎

لوگ پھر سنگ اُٹھانے لپکتے ہیں
کچھ ہم بھی ایک رکھتے ہیں شانوں پہ صفت  — نشتر

مذکورہ بالا دونوں مصرعوں پر ان کا اعتراض یہ ہے:۔

کلاسیکی انداز کی غزل میں سنگ اور کچھ کی آواز میں جو غزل کے اوزان شعر میں استعمال ہوئی ہیں سقم شعری میں شمار ہوں گی۔ سنگ میں "گ" کی دھمک والی آواز نہ ہونی چاہیے اسی طرح "کچھ میں ح" کی واضح آواز ہے

شاید انھیں یہ علم نہیں کہ پہلے مصرعے میں "ک" کی مکمل دھمک موجود ہے کیوں کہ اس دھمک کو "اٹھانے" کے الف سے مکمل طور پر برقرار رکھا ہے۔ علم عروض سے واقف لوگ جانتے ہیں کہ جہاں "الف" لفظ کی ابتدا میں آجاتا ہے وہ اپنے ماقبل کے لفظ کے آخری حرف کو یا تو اپنے آگے والے حرف سے جوڑ دیتا ہے یا پھر اس کے آہنگ کو مس وصل صورت میں بحال رکھنے کیلئے خود وصل کی کیفیت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ بات کسی دوسرے حرف میں نہیں پائی جاتی اسی لیے بعض ماہرانِ فن بائے ہوز کو بھی الف وصلیہ کی طرح تصور کرتے ہیں اور اسی لیے ناموزوں اشعار کی تخلیق ہوتی رہتی ہے دوسرے مصرعے میں یہی خامی ہے اور عقیل صاحب اس نکتہ کو واضح نہ کرنے کے باوجود صحیح بات کہہ گئے ہیں لیکن پہلے مصرع کے بارے میں وہ خود دھوکا کھا گئے ہیں۔

نئے شاعروں پر انھیں یہ بھی اعتراض ہے کہ یہ لوگ الفاظ کے صحیح استعمال سے واقف نہیں ہوتے۔ اس سے مجھے بھی اتفاق ہے یہاں اختر بدایونی کے دو مصرعے پیش کیے دیتا ہوں۔

ایک تواتر ایک تسلسل ایک ہی انبات کے ساتھ
اعتبارِ عمل سارے شکستہ لگا رہے

لفظ اور عمل کی جو درگت بنائی گئی ہے اس کی مثالیں عصری شعرا کے یہاں بغیر جستجو کے دستیاب ہو سکتی ہیں۔ الفاظ کا املا کیا ہوتا ہے؟ اس سے بے خبر کوئی اور شعر مرض الموت میں مبتلا ہوا۔ حالی نے اگرچہ غلط العام فصیح کے سہارے بہت سے ایسے الفاظ کو سند دے رکھی ہے جو اصرار کیا ہے جو مقبول عوام ہو چکے ہیں مگر میں اس سے اس لیے اتفاق نہیں کرتا کہ فنکار کو عوام کی پسند کا دھیان ضرور رکھنا چاہیے بلکہ عوام اس کی تحریر کا دستور سے علاحاصل کرتی ہے اس لیے لغت کا خون کس طرح درست نہیں اور اگر اس نکتہ کو اجاگر کیا اور تیر کے ایسا کے کا تصور بھی سطح پر پورا کیا جائے گا تو میں سمجھتا ہوں کہ ایک جاہل اور فنکار کے درمیان فرق محسوس نہیں کیا جا سکے گا۔ بات کہاں پہنچ گئی کہہ یہ رہا تھا کہ خود عقیل صاحب جس چیز پر معترض ہیں وہی بات ان کے مضمون میں بھی موجود ہے۔ ادراک عشق کے ساتھ ساتھ سارے علائم اور پورا ماحول بدل رہا ہے"

کون پوچھے کہ یہ علائم کس لفظ کی جمع ہے؟ بیچارے عقیل صاحب ہی کیا رہ جاتے کہتے ہیں اور بڑے نقاد اس لفظ کو استعمال کر رہے ہیں اور اس کو اس طرح مروج کر چھوڑا ہے جیسے واقعی یہ لفظ علامت کی جمع ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ہمارے بزرگوں کا یہ حال ہے تو پھر ان کے سامنے کھڑی نوجوان نسل کا کیا حشر ہوگا؟

جنوری کے شمارے میں ڈاکٹر سید محمد عقیل صاحب کے مذکورہ مضمون کی پہلی قسط شائع کی گئی ہے۔ آپ نے غزل کی ہیئت و مزاج پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کیا ہے

"اردو غزل کا پورا ایک کم و بیش جاگیردارانہ ہے۔ طریق عشق تصور عشق، معاملات عشق رہر دکھانے اور بوسہ برتاؤ BEHAVIORS کے ساتھ اظہار اور طریقِ اظہار یہاں

تک کہ تغزل اور غیر تغزل سب CONCEPT کا سب کچھ آسرا۔ اور جاگیردارانہ معیار اور انداز سے مجموعی طور پر سے کر آیا ہے " (ص ۲۳)

پہلی بات تو یہ کہ بہت سی غیر ضروری تفصیلات کے سہارے مضمون کو پھیلا یا نہیں گیا ہے بلکہ اکثر کام جو ہونے ہیں پھر ان کا یہ نظریہ درست ہی ہے کہ مذکورہ اقتباس میں ہتایا ہوا ہے تو انھیں آج کے جمہوری عہد میں غزل سے روایت شکنی کے نقوش کی جلوہ گری پر افسوس کیوں ہو رہا ہے۔ آزادی کے بعد جو فشار وجود کے بیچ در آیا ہے وہی جبر خیال کے حوالے سے غزل کے داخل وخارج کو متاثر کر رہی ہے اب اگر آج غزل اپنی قدیم روایتوں کی حدود سے باہر نکل آئی ہے تو اس کو پھر آسرا۔ اور جاگیردارانہ مزاج عطا کرنے کی فکر کیوں لگی ہوئی ہے؟ بات دراصل یہ ہے کہ موصوف جس تنقیدی دبستان سے متعلق ہیں وہاں غزل کا تصور یہی تھا اسی لیے ترقی پسندوں نے اس کی تم کر مخالفت کی مگر جب فیض جیسے اوسط درجے کے شاعروں کو غزل کے حوالے سے وسیع پیمانے پر شہرت حاصل ہوئی ترقی پسندوں نے اسے اپنی انگلی سے چھوڑ دی۔ اپنا غلطی کرتا ہے تو اس کی حمایت میں وکالت کی ہی جاتی ہے۔ تحریک کے لوگوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ لیکن اس کے باوجود غزل کے خلاف جو مخالفت کا رویہ تھا وہ دھول میں دب کر رہ گیا اور حمایت کے وقت بھی کسی نہ کسی صورت میں اظہار میں آتا رہا۔ عقیل صاحب بھی گم رہے۔ غزل کیا کوئی بھی صنف ایسی نہیں جو آسرا۔ اور شاہانہ نظام فکر کے خلاف عمل میں آئی ہو۔ مضمون کا انتظار کیجئے یہاں بات بڑھانا مناسب نہیں تا یہ میرا ذاتی نظریہ ہے لیکن مجھے اس پر بھرپور یقین ضرور ہے۔ مختصر یہ کہ نظریہ ہی غلط ہو تو صنف کے امکانات پر روشنی بھی مدھم پڑ سکتی ہے۔ عقیل صاحب بہت کچھ کہہ کر بھی اسی لیے ناکام نظر آتے ہیں۔

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ آج نئی عروض سے جو ناوابستگی کی روش عام ہوئی ہے اس سے آئندہ کے لیے خطرات محسوس ہوتے ہیں مگر اس طرف باقاعدہ توجہ دلائی جائے تو ایسا بھی نہیں ہے کہ موجودہ نسل سیکھنے کی کوشش نہ کرے۔

خط طویل ہو گیا ہے میرا ارادہ تھا کہ دونوں شماروں کے افسانوں اور غزلیات پر اختصار کے ساتھ کچھ لکھوں مگر باتیں ایسی تھیں کہ وضاحت ضروری ہو گئی ــــ چلتے چلتے آپ کو یہ خوشخبری بھی دے دوں کہ سحر عشق آبادی نے جن نئے بارہ اوزان رباعی کے بارے میں اشارے کئے ہیں میں اُن سے اتفاق ہی نہیں کرتا بلکہ پہلی بار تخلیقی سطح پر چوبیس اوزان میں رباعیات کو پیش کرنے کا فخر بھی حاصل کر چکا ہوں۔ مختلف جرائد میں یہ چھپ بھی چکی ہیں اور چھپیں گی بھی۔

**رفیق اعظم** ۔ مرود مدرا انگلش اسکول محلہ رتن پورہ اوتھانولی جیبرہ (بہار)

ندا فاضلی کی خود نوشت "دیواروں کے بیچ" کا جو سلسلہ آپ نے شروع کیا ہے بہت زیادہ پسند آیا۔ اسلوب واقعی دل پذیر ہے۔ لگتا ہے خود نوشت نہیں بلکہ کوئی کہانی کہی جا رہی ہو۔ چوں کہ ندا فاضلی کا تعلق فلمی دنیا سے ہے اس لیے اس مضمون میں CINEMATIC TECHNIQUE کا استعمال خود بخود ہو گیا ہے یعنی اگر ضرورت ہو تو اسے فلمایا جا سکتا ہے۔ نثر خالص شاعری ہے۔

گوپی چند نارنگ کے مضمون "اردو املا اور لسانیات" میں قابل اعتراض بات یہ ہے کہ گوپی چند خود کو بہت قابل سمجھتے ہیں اور دوسروں کو پہلے درجے کا کند ذہن مثلاً ڈاکٹر ابو محمد سحر کو۔ خود کو گوپی چند خاکسار کہتے ہیں لیکن طرز ایک مغرور کا ہے۔

گوپی چند اپنا مضمون بغیر کسی حاشیہ بندی کے شروع کر سکتے تھے لیکن ایسا لگتا ہے کہ ان کو کچھ لوگوں سے بغض سد ھانا ہے ڈ رشید حسن خاں اور ابو محمد سحر تا۔ اور جس مضمون میں PERSONAL BIAS PREJUDICE کا سرا نظر آنے لگے وہ مضمون نیچے درجہ کا مانا جاتا ہے ابو الکیث جاوید کا افسانہ "کنارے کٹ رہے ہیں" گھسا پٹا ہے۔ دوسرے وہ اس افسانہ کے عام کے بارے میں CONSCIOUS نہیں ہیں کیوں کہ افسانہ جس طرح شروع ہوتا ہے اگر اسی سطر پر اس کا اختتام ہوا ہوتا تو اس میں ایک گونا گونی ہوتی لیکن "اور ندی اپنے مخصوص انداز میں پھیلاتی جا رہی ہے" کے علاوہ اضافہ سے جو تصور قائم رہی دیگر افسانوں میں بھی کوئی نیا پن نہیں ہے کچھ STALE ہیں۔ بہت دنوں سے ایک ہی طرح کی بات لکھی جا رہی ہے جس سے پڑھنے والے اب اوب گئے ہیں مثلاً یعقوب یاور کے اس میں کیا خاص بات ہے۔

فصاحت عیسی کی غزل پڑھ کر مسرت کا احساس ہوا۔ ایک یا دو شعر اگر اس غزل سے نکال دیئے جائیں تو پوری غزل مربوط ہو جائے گی۔ مثال کے طور پر خاص کر یہ شعر پوری غزل کے تاثر کو DILUTE کر دیتا ہے۔

یہ آب آب سمندر اور کرب خشک لبی
ہوں کا تیر میں ڈل جھیل کا شکارا میں

لگتا ہے اچانک کوئی بہت ہی سنجیدہ جبیر ہلکی ہو گئی ہو۔ بہرکیف یہ غزل بہت اعلیٰ ہے اور طلاقت۔ فصاحت عیسی ابھی ہندوستان کے پہلی صف کے شاعر ہیں اداجعفری کی نظم پڑھتے ہوئے سمانے بھی پسند آئی ہے خالد سعید اور ضیا احمد ضیا کی غزلیں بھی اچھی ہیں۔

**حبیب سوز** ــــــ امام باڑہ الاپور بدایوں (یوپی)

یوں تو ہندوستان میں اردو کے بہت سے ادبی رسائل شائع ہوتے رہتے ہیں مگر شاعر کی جو سب سے بڑی خوبی ہے وہ یہ کہ اس کا معیار اپنی جگہ ہے ہی لیکن اس کی ترتیب کا کوئی جواب نہیں۔

ندا فاضلی کی خود نوشت شائع کر کے آپ نے ایک نہیں بلکہ دو کام کیے ہیں، ایک شباب کا اضافہ اور دوسرے حیات ہی نے پاک اور دل پذیر نثر پڑھنے کو مل رہی ہے۔

**سہیل ساحل خان** ۔ لاج سلوجرا، موتی ہاری (بہار)

شاعر کے شمارہ ۱ اور ۲ موصول ہوئے آپ کا یہ ایک بہترین اور ونڈرفل آئیڈیا ہے کہ "اپنے خطوں پر پتے اردو میں لکھیئے"۔ اگر اردو داں طبقہ آنکھ بند کر کے ہی اس پر عمل کرنا شروع کر دے تو اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے لیکن اس کی توقع اردو والوں سے کم ہی ہے کیوں کہ وہ اردو کا ماتم کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں اور عملی کام کرنے میں پیچھے۔ خیر اس نے اللہ کا نام لے کر اس کام کی شروعات کر دی ہے اور پہلا خط آپ کو لکھ رہا ہوں۔

**غلام احمد تماپوری** ۔ رنگم پیٹ ڈسٹرکٹ گلبرگہ ۵۸۵۲۲ (کرناٹک)

شاعر شمارہ ۱ اور دو کے "شروعات" میں جو مشورہ آپ نے اردو والوں کو دیا ہے وہ بہت پہلے ہونا چاہئے تھا۔ میں نے تو سب سے پہلے یہ مشورہ شاعر ہی میں پڑھا ہے، دل کو بڑی مسرت ہوئی۔ میں نے اپنے خطوں پر پتے اردو میں لکھنے کا آغاز کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس تحریک کو کامیابی عطا فرمائے۔ آمین!

میں نے اپنے تمام اردو دوست حضرات تک آپ کی بات پہنچائی ہے اور وہ لوگ بھی اس مہم کو پسند کر رہے ہیں، کچھ لوگوں نے ابتدا کر دی ہے۔

**محمد حسن ریاض** ــــــ بھاگل پور ۱۰

شاعر میں د شمارہ ۲۰۱ ــ ۲۸۹ ء آپ کا اداریہ "اپنے خط پتے اردو میں لکھیے" پسند آیا اس کی شروعات میں آپ کو اردو میں یہ لکھ کر کر رہا ہوں۔ ہمارا مشورہ ہے کہ اردو کو زندہ رکھنے کے لیے عربی کی طرح فرض سمجھ کر بچوں کو پڑھانے کا نظم گھر پر ضرور کریں۔

**احمد کمال پروازی** ۔ پرٹ نارو اسٹیل فیکٹری، توپ خانہ روڈ، امرتسر

اردو میں پتے لکھنے کی تحریک بہت ہی موثر اور کم حستہ ہے۔ اردو کے مستقبل کے تئیں ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر مسلسل سوچتے رہنے پر یہ تحریک ابھر کر سامنے آ سکتی ہے اور پھر مثبت روایات کی پاسداری اعلیٰ قدروں کی بحالی کے لیے تو آپ کی بیڑیاں کھب گئی ہیں۔

تازہ شماروں میں محترم ڈاکٹر سید محمد عقیل کے مضمون اور ندا فاضلی کی خود نوشت شماروں کو وقیع اور دلچسپ بنانے میں معاون ہیں وسیم بریلوی اور ضیا احمد ضیا کی غزلیں پسند آئیں۔

**منصور اعجاز** ــ رشید اسٹوڈیو، یوسف مال د مہاراشٹر

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر سید محمد عقیل کے مضامین اور ندا کی خود نوشت دو الگ الگ شماروں کے مضامین ایک ہی نشست میں پڑھنے کو مل گئے۔ ندا فاضلی کی کتاب "ملاقاتیں" میرے پاس ہے۔ انٹرویو ہیں لیکن جس طرح کی زبان اور اسلوب "ملاقاتیں" کا ہے وہ خود نوشت میں نہیں ہے۔ "ملاقاتیں" میں ندا کی نثر ان کی شاعری سے اچھی لگتی ہے۔

* ندا فاضلی کی خود نوشت پسند آئی ــــ **اقبال علوی** احمد

* ندا فاضلی کی خود نوشت کا اسلوبی انداز بیان بہت پیارا ہے دل میں اتر جاتا ہے بقیہ مشمولات معیاری اور اہم ہیں ــ

**اشفاق عادل**

* "اپنے خطوں پر پتے اردو میں لکھیئے" ایک تحریک، ایک مہم جس میں اجتماعی شرکت ضروری ہے ــ **پرویز اختر** چاند پور (یوپی)

* شاعروں سے دن بہ دن ہماری کمزوری مٹتی جا رہی ہے۔ اس رسالے نے خاص طور پر نئی نسل کی نمائندگی کی ہے۔ نئی نسل کو آپ سے اور شاعر سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں ــــ **خورشید طلب** گریڈیہہ (بہار)

* شاعر کا معیار آج بھی وہی ہے جو تیس سال قبل تھا، بلکہ اور نکھار آیا ہے۔ چیدہ چیدہ تخلیقات کی اشاعت اور ہر مکتبہ فکر کی نمائندگی اس کی انفرادیت ہے۔ ــ **اے جبار غنم** روڑکیلا (اڑیسہ)

* خطوں پر اردو میں پتے لکھنے والی آپ کی تجویز کی میں تائید کرتا ہوں۔ **اسرار اکبر آبادی** ۔ آگرہ

* اس وقت اردو میں پتے لکھنے کی ایک تحریک چل رہی ہے لیکن جو آپ نے لکھا ہے وہ کسی نے بھی نہیں لکھا۔ اتنے اچھے مشوروں کے لیے مبارکباد۔ یہ خط اس تحریک کے زیر اثر لکھا گیا ہے۔ **صابر سنبھلی** ۔ مراد آباد (یوپی)

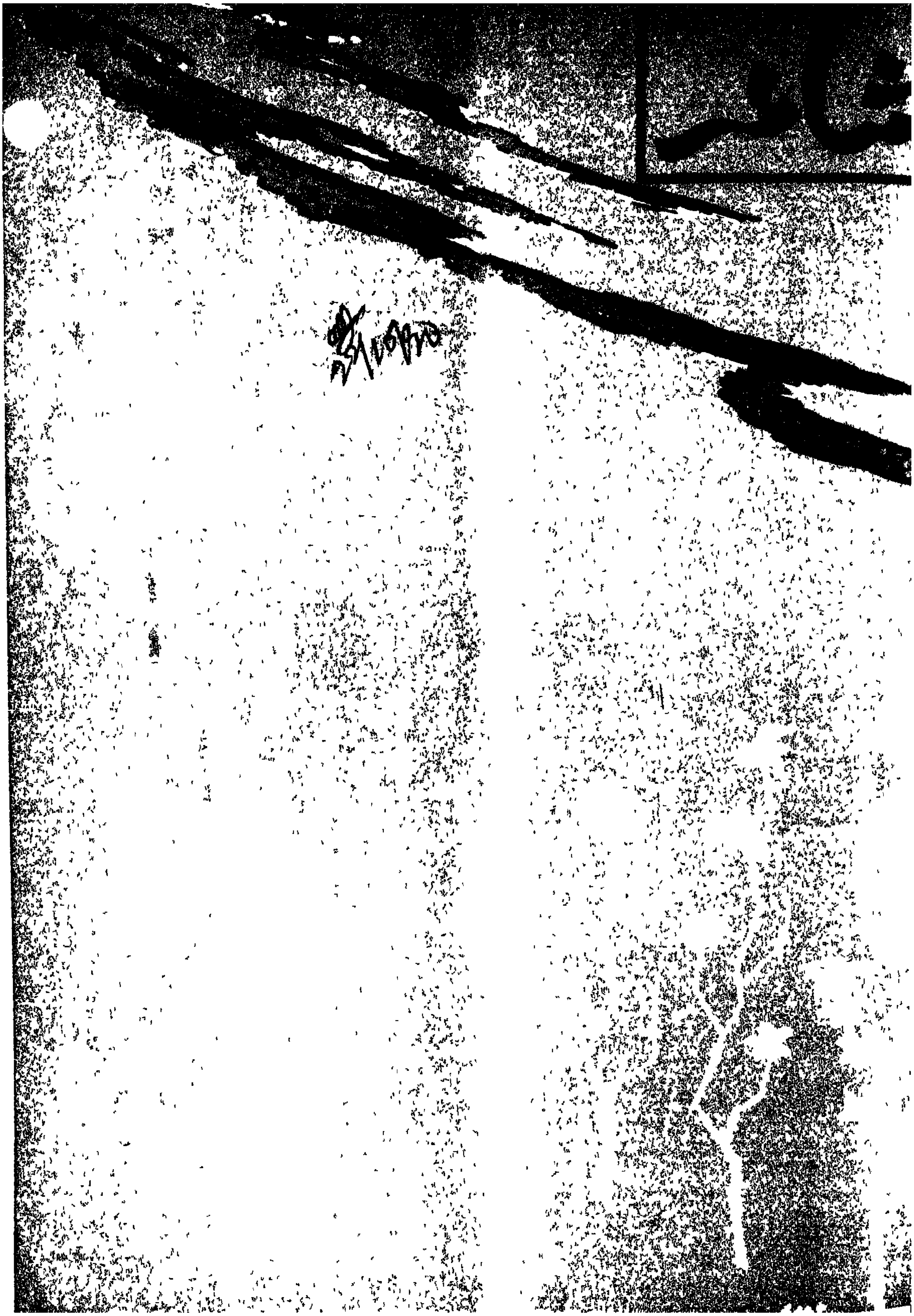
Regd No MH-BYW 311 شاعر

THE 'SHAIR" (MONTHLY) BOMBAY-400 008.

Price Rs 5

0 Years of Publication ✱ (Publishing Date 27 3) ✱ Issue No 4 1989 ✱ Telephone No 5900

Registered with the Registrar of Newspapers at R.N. No 1997-5



# بساطِ سخن

جلد ۱

ستیش بترا



زیرِ تدوین
افتخار امام صدیقی

عکس
جینت پرمار

# فکر امروز



دنیا کا موجودہ انتشار اور بے سکونی انتشارِ عالم میں کوئی نئی چیز نہیں، ہر دور انقلاب میں انسان کے خیالات پریشان ہو جاتے ہیں، یہ ایک فطری چیز ہے لیکن نئی بات یہ ہے کہ آج شاعر اپنے ادوارِ ماضی کی طرح اس دور میں محرکِ انقلاب نہیں ہے۔

انسانیت چوں کہ ہر لحظہ بے پردہ ہوتی جا رہی ہے اس لیے انسان موجودہ انتشار و اضطراب کو بے سبب سمجھنے لگا ہے حالاں کہ یہ عالمِ ہست و بود عالمِ اسباب ہے اور یہاں ہر مسبّب کا ایک سبب موجود ہے۔

ہنگامۂ سیاست اور تعصب پرستی نے دنیا کو تباہ کر دیا ہے۔ ادب کی قوت و اختیار میں تھا کہ وہ اس تباہی میں امن و سکون کے آثار پیدا کر کے نئے انقلاب کی تخلیق کرتا۔ لیکن آج ادب خود ہمارے ہاتھوں میں ایک پیکرِ بے روح اور ایک نقشِ پامال کی حیثیت رکھتا ہے اور ہم اس پیکرِ بے روح کے فنا شدہ خد و خال اور نقوشِ مردہ کی چہرہ کشائی کر کے اپنی مردہ پرستی کا زندہ ثبوت دے رہے ہیں۔

شاعر (آگرہ) جون
سنہ ۱۹۴۰ء

سیماب اکبرآبادی

---

بانیٔ مؤسس
سیماب اکبرآبادی مرحوم
جاری شدہ ۱۹۳۰ء
بہ یادگار
اعجاز صدیقی مرحوم
اشاعت کا ۶۰ واں سال
علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

# شاعر

جلد — ۶۰
شمارہ — ۵
نومبر ۱۹۹۰ء

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت: ۵ روپے

زرِ سالانہ ۵۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۶۰ روپے

تاحیات خریداری ۱۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے ◆ ممالک غیر سے ۳۵۰ روپے

ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب، بمبئی سینٹرل پوسٹ آفس پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶، بمبئی ۴۰۰۰۰۸

سرورق

یہ زندگی کا کارواں

عکس

سلطان سبحانی


شمارہ نمبر ۵ - جلد ۶۰

۱۹۸۹ء

# اردو، سرکاری زبان، الیکشن اور ہم

**[۲]**

یوپی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا، بل پاس ہوا، ہنگامے اور فسادات ہوئے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس اعلامیہ کے ردِّ عمل میں گمشدہ اور تمام دھندلے منظر یکسر صاف اور واضح ہو گئے ہیں۔ متعدد سوال ہیں، ان کا تنوّر ہے، مسائل ہیں، بابری مسجد اور رام جنم بھومی ہے، وشو ہندو پریشد، آر ایس ایس، بی جے پی، شیو سینا ہے، جنتا دل اور کانگریس ہے، فسادات اور خاک و خون ہوتے ہوئے ہندوستانی عوام ہیں۔ اس پر مستزاد الیکشن کی آمد آمد۔

آزادی کے بعد اردو کے ساتھ سیاسی اور سماجی سطح پر جو کچھ بھی ہوا ہے اس کی ذمہ دار حکومت تو رہی ہے لیکن اس سے زیادہ قصوروار خود اردو والے ہیں کہ جس طرح سیاست والوں کو اپنا سیاسی کاروبار چمکانے کے لیے نت نئے مسائل پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح اردو والوں میں ایسے بڑے جیالے لوگ بھی پیدا ہوتے رہے جنھوں نے اردو کے نام پر خوب خوب اپنی دکانیں چمکائی ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اردو کے لیے بہت کچھ ہوا ہے، سب کچھ ہوا سبیل جمع ہو رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو کے نام نہاد خدمت گذاروں نے اب تک دنیا کے دو آسان ترین کاموں سے آگے قدم رکھا ہی نہیں ہے، اور یہ دو کام ہیں تنقید کرنا اور مشورے دینا۔ اس کیلئے عمل کی صورتیں کانفرنسیں اور سمینار ہیں ایسے لوگوں کا اجتماع ہے جنھیں صرف اور صرف شعر و ادب سے علاقہ ہوتا ہے، زبان سے نہیں۔ کسی تال میل کے بغیر اور عمل سے خالی، اردو عوام سے دور۔ اردو کے مسائل۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی دور میں کوئی بھی اردو تحریک عوامی تحریک نہیں بن سکی۔ اردو کے بنیادی مسائل حل نہیں ہو سکے۔ کرنے کے کام کئے نہیں نہ کرنے کے کام ہوتے رہے اور انھیں کو سب کچھ سمجھ لیا گیا۔ آپ کہیں گے کہ بہار اور یوپی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا ہے۔ کیا یہ کافی ہے؟ اور میں کہوں گا کہ ایسا ہوا ہے کہنا ہی زیادہ کرخوں زبو۔ ہمارے بے روح اعمال اس مثبت قدم کو رائیگاں کر دیں گے کہ اردو کے دانشور (؟) ادبا و شعراء وغیرہ تو کچھ کرنے سے رہے اور معاف کیجیے گا کوئی بھی تحریک اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک وہ عوامی سطح سے نہ ابھرے، اس کی جڑیں عوام میں گہری اور اندر تک نہ اتر جائیں۔ کیا آزادی کے بعد سے اب تک ایسا ہوا ہے؟

مہاراشٹر میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنائے جانے کا مطالبہ بہار اور یوپی طرز پر نہیں ہے، وہاں جو کچھ بھی ہوا ہے وہ سیاسی سطح پر مصلحتوں کی دین ہے۔ مہاراشٹر میں ہمارے مطالبے کی کامیابی تمام تر ان عملی صورتوں پر ہو گی جو صحیح معنوں میں مہاراشٹر ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان کے لیے قابلِ تقلید ہوں گی۔

حطوں پر اردو میں پتے لکھے جانے کی مہم نے بہت کچھ واضح کر دیا ہے۔ یہ بتا دیا ہے کہ چھوٹے چھوٹے بنیادی کاموں کی مدد سے ہم اپنی منزل کو پا سکتے ہیں اور یہ بھی کہ اردو عوام تک "بڑے لوگوں" کی آوازیں نہیں پہنچ پا رہی ہیں۔ اردو عوام یکجہتی اور پوری اکائی کے ساتھ اردو کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں لیکن ان کی رہنمائی اور سرپرستی کوئی بھی نہیں کر رہا ہے، پھر اردو کے مسائل کس طرح حل ہوں گے؟ یوپی اور بہار میں اردو سرکاری زبان بن گئی ہے مگر ابھی انھیں ذو لسانی ریاستیں بھی بننا ہے مگر یہ کیسے ہوگا؟ عوام میں تو اردو نہیں ہے، رسم الخط سے واقفیت نہیں ہے۔ ہمارا ایک اہم ترین کام اپنے رسم الخط کا تحفظ بھی ہے۔ رسم الخط کے بغیر آپ اور ہم کیا کر لیں گے؟ ان امور پر آگے بحث ہوگی کہ ہمارے بنیادی کام کیا ہیں اور ان کی عملی صورتیں کیا ہوں گی۔ ہمارا مطالبہ صرف یہ نہیں ہے کہ اردو کو مہاراشٹر اسٹیٹ کی دوسری سرکاری زبان بنا دیا جائے یا پورے ملک کی دوسری سرکاری زبان۔ ہم اپنے مطالبے کو عوامی رنگ دیں گے اور سرکار کو اپنے عمل کے ذریعے مجبور کر دیں گے کہ وہ ہمارے مطالبات کو تسلیم کرے۔

الیکشن سر پر ہے، تمام پارٹیوں نے اپنے آپ کو ہر سطح پہ بے نقاب کر دیا ہے۔ کیا ہوگا یہ بہت زیادہ واضح تو نہیں تاہم اتنا روشن ضرور ہے کہ ہم اپنے شعور کی آنکھ سے بہت کچھ دیکھ سکتے ہیں، سوچ سکتے ہیں ـــ قارئین! آپ چاہے جس پارٹی کو ووٹ دیں، جسے چاہیں کامیاب کریں لیکن آپ اپنی پارٹیوں سے، اپنے حلقے کے امیدواروں سے اپنی زبان اردو کے لیے بات تو کر سکتے ہیں، اپنے مطالبات تو کر سکتے ہیں، کل جو ہوگا سو ہوگا، آج آپ اپنے ضمیر کی آواز کو مت دبایئے۔ بے خوف ہو کر اپنی زبان اور اس کے تحفظ کی بات کیجیے۔ ایسا کر کے گویا آپ اپنے وجود اور اس کے تحفظ کی بات کریں گے۔ اور یہ آپ کا جمہوری حق ہے۔

اردو کے بنیادی عملی کام کیا ہوں گے اس کے لیے ہم شاعر اور تمام اخبارات و رسائل اور دیگر ذرائعوں سے آپ تک پہنچ رہے ہیں۔

[جاری ہے]

٧٦

رباعی

کوئی نہیں پابندِ وفا میرے بعد
محبوب میں اب بات، وفا میرے بعد
فطرت کو نظر آیا یہ جب میرا جواب
دنیا کو دیا حکمِ فنا میرے بعد

حیدر دہلوی

٧٧

رباعی

دل جن سے معمور کئے دیتے ہیں
بے واسطہ نور کئے دیتے ہیں
وہ ترک کے قابل ہی کسی عنوان نہیں
ہم ترک سے مجبور کئے دیتے ہیں

حیدر دہلوی

٨٠

رباعی

اے گردشِ روزگار مرد و برابر ہم
سن نابلدی باندھ دینگے ہم
ہم راز سے پیچیدہ شعر اسرارِ جہاں
فطرت کی زبان سمجھ رہے ہیں الہام ہم

حیدر دہلوی

٨١

رباعی

جو منکر ہیں بس ترک نوا ہونا
منکر ہی نہ ہو کوئی ثنا خواں ہونا
اللہ دو لفظ ہے بیانِ دل کا
بعض زبانوں سے ادا ہونا

حیدر دہلوی

## رباعیاتِ حیدر

حکیم الہند حیدر دہلوی مرحوم کی رباعیوں کا مجموعہ "رباعیاتِ حیدر" ۱۹۳۹ء میں اور حیدری دہلوی مہتمم کتب ادارۂ حیدری جامع مسجد دہلی سے شائع ہوا تھا۔ ضخامت: ۱۲۶ صفحات۔ سائز: ۲۰×۳۰/۳۲ ۔ ۱۹۶ رباعیات ہے مختلف النوع رباعیات کا یہ مختصر مجموعہ اپنے آپ میں فنِ رباعی کی مکمل طور پر نمائندگی کرتا ہے۔

بہ شکریہ خلیفہ ترودوی برودہ [گجرات]



# تاج بھوپالی

- نام ○ سید محمد علی
- تخلص ○ تاج
- ولدیت ○ سید رمضان علی
- وطن ○ بھوپال
- پیدائش ○ ۱۴ر جولائی ۱۹۲۶ء
- تلمیذ ○ سہا مجددی بھوپالی، عبدالحمید شاد
- انتقال ○ ۱۲ر اپریل ۱۹۷۸ء، بھوپال
- تصانیف ○ خمینۂ گل [انتخاب کلام] مکتبہ افکار بھوپال ۱۹۵۸ء

نئی گیتانجلی اور انیہ کویتائیں [دیوناگری] دگنت پرکاشن، بھوپال ۱۹۷۹ء

سورج نما [غزلیں، نظمیں] مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی بھوپال ۱۹۸۱ء

- فلمی خدمات ○ جلتے دیپ، سرحدی لٹیرا، آنسو بن گئے پھول وغیرہ فلموں میں گیت لکھے

(بہ شکریہ خالد عابد، اندور)

۲۳ر فروری

ڈیئر بیٹے

تقریباً ایک سال قبل آپ کا خط بمبئی میں شکیلہ کے پتہ پر
ملا تھا اور مجھے اسی وقت ان سے آپ کو جواب لکھوا دیا
تھا بیٹے میں اپنی محبت برداشت نہیں کر پاؤں گا
بمبئی سے بڑی شدید جذباتی شکست کھا کے
بھوپال واپس آ گیا خمینۂ گل کے بعد ایک مجموعہ اور
چھاپنے کا سوچ رہا ہوں اپنی لگن اور کچھ نہیں
غرض یہ کہ اللہ کے دو چار دنوں میں روانہ کر سکا
کبھی ادھر سے گزرو تو بھوپال میں کچھ دن ٹھہرو
یا مجھ کو بلا بھیجو بہتر تو یہ ہے کہ مشاعرہ ہی بلوا سکتے ہو
حیدرآباد آ کر ہوئے دلی روح پاتی ہے
جو کبھی ہم نوالہ اور ہم پیالہ تھے اب آپ قبر میں
ملیں گی میری مراد مخدوم شاہد اور ایسے
ہے میں تمہاری طرح تم کو خط کس طرح لکھوں
تم نے مجھ کو بہت جذباتی کر دیا ہے محسن کچھ بھی نہیں
لکھا جا رہا تو اچھا کچھ نہیں تو اب میرے
سامنے سے ہٹ جاؤ ورنہ میں تم سے لپٹ جاؤں گا
اور خوب روؤں گا تو یہ سنو

میرا پتہ عزیز دولت موتیا پارک بھوپال

یہ جو کچھ آج ہو گیا تو نہیں ہے
یہ شامِ غم مسلسل تو نہیں ہے
میں اکثر راستوں پہ سوچتا ہوں
یہ بستی کوئی جنگل تو نہیں ہے
یقیناً تم میں کوئی بات ہوگی
یہ دنیا یونہی پاگل تو نہیں ہے
میں لمحہ لمحہ مرتا جا رہا ہوں
مرا گھر میرا مقتل تو نہیں ہے
کبھی پھر چھا گیا برسا کبھی پھر
وہ اک آوارہ بادل تو نہیں ہے

فقط تمہارا
محمد مجتبیٰ تاج

یہ غزل [illegible]
شوقِ تشنگی کو عام کر دو
میں کب کہتا ہوں میرا نام کر دو
[illegible] دو دن چمن میں
ہر اک صحرا [illegible] نام کر دو
یہ میں یوسف ہوں تم کوئی زلیخا
جہاں چاہو مجھے نیلام کر دو
وہ میرے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں
حریمِ حسن کو ناکام کر دو
تم اپنا حسن آخر کیا کرو گے
مجھے کچھ تو خدا کے نام کر دو

# تاج بھوپالی

مرحوم کا ایک خط، تین غزلیں اور تصویر جناب رؤف نیر (حیدرآباد) کے شکریہ کے ساتھ شائع کی جا رہی ہیں ۔ یہ غزلیں کتاب (لکھنؤ) اور سب رنگ (بمبئی) میں شائع ہو چکی ہیں ۔

یہ تینوں غزلیں تاج مرحوم کے آخری مجموعے سورج نما میں شامل نہیں ہو سکی تھیں ۔ بخط شاعر پہلی بار یہ تینوں غزلیں شاعر میں شائع کی جا رہی ہیں ۔

ہر درد سی باندھی ہوئی [illegible] کوئی گذرے
قاتل کوئی گذرے کہ مسیحا کوئی گذرے
[illegible] پھر راہ گذر پہ لگی ہیں آنکھیں
اک عمر سے بیٹھے ہیں کہ تم سا کوئی گذرے
وہ تشنگیِ جاں ہے کہ صحرا کو ترس آئے
اب ہوش کو چھوتا ہوا دریا کوئی گذرے
ان میں بھی علاجِ غمِ پنہاں ہی ہوگا
[illegible] سا کوئی گذرے

اچھا رخصت
[illegible]
[illegible] تاج

اس سے بہتر خط لکھا کرو



## بلراج کومل

## شہر میں ایک تحریر

میں نے پتھر سے لکھا
اس نے شیشے پر پڑھا
درسِ عبرت خوب تھا
چند لمحوں کے لئے
طفلِ مکتب کی طرح
وہ پریشاں ہو گیا
اور پھر اس شخص نے
ٹھیک اسی انداز سے
جو مرا انداز تھا
ہاتھ میں پتھر لیا
اور سارے شہر میں
درسِ عبرت لکھ دیا

## مساوات

سر بریدہ
پا بریدہ
لوگ سارے
پیڑ تھے کل
برگ و گل تھے
شاد ماں تھے
داستاں تھے
آج لیکن
کٹ چکے ہیں
چیتھڑوں میں
بٹ چکے ہیں
ہو چکے ہیں
سب مساوی
کون زندہ
کون مردہ
داستاں کا
کون راوی؟

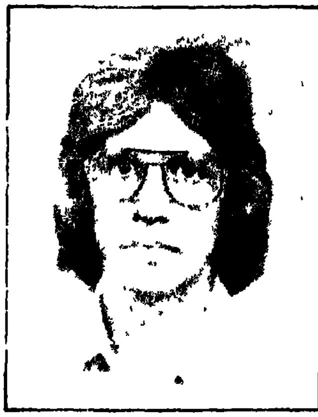
## بجلی، بادل، لمبی بارش

بجلی، بادل، لمبی بارش
لڑکی تھی، وہ رک جاتی تو اچھا ہوتا
بھیگ چکی، لیکن وہ پھر بھی
دور دور تک پانی میں ڈوبے رستے پر
بے پروا سی چلی جاتی !!

## آگ

تمھیں گھر یاد آتا ہے
مکانوں کی چھتوں سے سنگ باری کوچہ و بازار سونے ہیں
وہ ننھا منا پودا تم نے جو پرسوں لگایا تھا
اسے بے کار اب تم یاد کرتے ہو
وہ شاید جل چکا ہوگا۔

ای ۹ ۱۳۹۔ کالکاجی نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۱۹




شین کاف نظام

کلوں والی گلی - جودھپور، (راجستھان)


# دوہا — ایک تعارف چند سوال

اپنے آغاز ہی سے اُردو انجذاب اور اس سے متعلق اوصاف سے مالامال رہی ہے۔ اس - ان اوصاف کا انعکاس اس کی اصناف ادب پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک طرف اُردو نے اگر ہر نئی صنف کو سمجھنے اور اسے اپنے مذاق و معیار کے مطابق ڈھالنے کی سعیِ مسعود کی تو دوسری طرف اس نے پُرانی اصناف کے امکانات کو کھنگالنے کی بھی مقدور - کوششیں کی ہیں۔ اس عمل میں جو صنف اس کے مزاج کے مطابق ڈھل گئی وہ اس کا جزوِ لاینفک ہو گئی اور جس سے اس کے مذاق و معیار میں مناسبت و مطابقت پیدا نہیں ہو سکی وہ صنف رفتہ رفتہ طاقِ نسیاں ہو گئی۔ انجذاب کے ساتھ ساتھ اعتدال اُردو کا دوسرا امتیازی وصف رہا ہے۔ اپنے اسی وصف کی بدولت اُردو ان گم شدہ یا فراموش کردہ اصناف سے اپنے رشتے استوار کرنے میں کامیابی حاصل کر سکی جنھیں بنا کسی معقول وجہ کے اُردو باہر کر دیا گیا تھا یا جنھیں غیر اُردو اصناف قرار دے دیا گیا۔ دوہے کی صنف بھی ایسی ہی بھولی بسری اصناف میں سے ایک ہے۔

ایک مشہور روایت کے مطابق جب حضرت امیر خسرو، اپنے پیر و مرشد اور محبوبِ الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا کی میّت پر پہنچے تو ان کے ہونٹوں پر یہ دوہا تھا ؎

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چہو دیس

لیکن چند حضرات کے نزدیک حضرت امیر خسرو کے گیتوں، دوسخنوں، کہہ مکرنیوں، پہیلیوں، دوہوں وغیرہم کو اہمیت دینے کی قطعاً ضرورت نہیں کیوں کہ خود خسرو نے ان کی طرف خاطر خواہ توجہ صرف نہیں کی۔ خود خسرو نے اپنے ایسے کلام کو درخورِ اعتنا نہیں جانا اس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ایسے کلام کو اپنے کسی دیوان میں جگہ نہیں دی۔ بادی النظر میں بات وزن دار معلوم ہوتی ہے مگر ہمیں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم نے اس نوعیت کے تمام مفروضات تسلیم کیے ہیں؟ دوسری بات یہ ہے کہ ایسا کون ہے جو وثوق سے یہ کہہ سکے کہ حضرت امیر خسرو کے نزدیک بھی ان کا ایسا کلام معیار سے ساقط تھا؟ ان کے دیوان فارسی کے ہیں۔ ممکن ہے فارسی کلام کے ساتھ انھوں نے اُردو کلام شائع کرایا [illegible] تھا اُردو میں شعر کہنا ذریعۂ عزت نہیں تھا اور فارسی میں شعر کہنا ایک کمال تھا۔ تیسری بات یہ کہ اگر بہ فرضِ محال یہ ثابت بھی ہو جائے کہ حضرت امیر خسرو کے نزدیک ان کا ایسا کلام پایۂ اعتبار سے ساقط تھا تو اس سے یہ کیسے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا یہ کلام واقعی نظر انداز کیے جانے کے قابل تھا یا آج بھی وہ تلف ہونے دیے جانے کا مستحق ہے؟ ڈی۔ ایچ۔ لارنس نے کہا تھا کہانی پر اعتبار کرو کہانی کار پر نہیں۔ بہ ظاہر لارنس کی یہ بات کہانی سے متعلق ہے مگر اس کا اطلاق ہر قسم کے آرٹ پر ہو سکتا ہے۔ پھر ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ تنقید کا سروکار تصنیف سے ہوتا ہے مصنف یا اس کے قول سے نہیں۔ اگر خسرو کے متعلق متذکرہ مندرجہ بالا مفروضے کو مستند مان لیا جائے تو ہمارے پاس غالب کے قول کو گوزِ شتر سمجھنے کا کیا جواز ہے؟ غالب نے تو صاف یہی کہا تھا کہ میرا فارسی کلام اہم ہے اُردو کا کلام تو کچھ بھی نہیں ہے۔ کیا ہم نے اُن کی یہ بات مان لی؟ نہیں مانی۔ اور معاف کیجیے نہ ماننے پر ایسی کوئی گستاخی بھی نہیں کی جس کے لیے ہمیں غالب سے معذرت خواہ ہونا پڑے۔ جو ہمارے نزدیک اچھا تھا اُسے ہم نے سر آنکھوں پر جگہ دی جو غالب کے نزدیک اچھا تھا اسے سینے سے لگا لیا۔ کیا بُرا کیا؟ خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ بات تو اتنی ہی ہے کہ مفروضوں کو مفروضے ہی ماننا چاہیے مگر افسوس تو اس بات کا

ہے کہ ایسے ہی مفروضوں کے پیشِ نظر ہم نے اُردو کے اس عظیم شاعر، جو کچھ لوگوں کے نزدیک اُردو کا پہلا شاعر بھی ہے، کا کلام ضائع کر دیا اور اب اکثر ہم یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ یہ کلام مستند نہیں ہے اس میں گھال میل اور گھپلا بہت ہو گیا ہے۔ ع جیسی جس کے گمان میں آئی۔ تو اس روایت کے رو سے دوہے کے ضمن میں یہ بڑی بات ٹھہری کہ امیر خسرو جیسا فارسی کا قادر الکلام شاعر، جب اپنی زندگی کے عظیم ترین سانحہ سے دوچار ہونے کے بعد، اپنی قلبی کیفیت کے متعلق مظہر ہوتا ہے تو کسی فارسی صنفِ سخن یا مرثیے یا نوحہ کے فارم میں نہیں بلکہ اسی ہندوستانی ہیئت میں جس کا نام دوہا ہے۔

دوہا برِّصغیر کی تہذیب کا شناخت نامہ ہے۔ اپنے مضمون 'دوہے کا کلچر' میں ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں :

" دوہے کی ایک اپنی فرہنگ اور ایک اپنا کلچر ہے جو اس برِّصغیر کے ہزاروں برس پر پھیلے ہوئے ماضی کا ثمرہ بھی ہے اور مظہر بھی : شاید ہی کوئی شعری صنف بیک وقت اتنی رجعت پسند اور جدیدیت نواز ہو جتنی کہ دوہے کی صنف جو اپنے قدیم لہجہ اور مزاج کو خود میں سمونے پر ہمہ وقت مستعد دکھائی دیتی ہو۔ ،، [1]

مختلف زبانوں کے دوہے شاہد ہیں کہ دوہا صنف میں زندگی کی پوری عکاسی موجود ہے۔ قدرت و فطرت کے اسرار کی عقدہ کشائی کی کوششیں ہیں تو جسمانی و روحانی رشتوں کی دریافت و بازیافت بھی ملتی ہے۔ مکمل سپردگی کے عہد البکتی کال کے سنتوں کی پراسرار تھنائیں، تنبیہ و تلقین کا ٹھاٹیں مارتا ہوا سمندر بھی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ دوہا صنف میں حیات و کائنات کے ہر مسئلہ کا ذکر ہے۔ عوامی ادب کے دوہوں میں تو مختلف موضوعات کی قوسِ قزح ملتی ہے۔ کہیں انسانی خیر سگالی کی باتیں تو کہیں تاریخی یادداشتیں، کہیں تیج تیوہار کے قصے تو کہیں میلے ٹھیلے، کہیں موسمیات کے متعلق پیشین گوئیاں تو کہیں نیتی کی نصیحتیں، اور یہ سب ایسی وافر تعداد میں کہ اگر انھیں جمع کیجیے تو دفتر درکار ہوں۔ معلوم نہیں کس خیال کی رو میں ہم اُردو والوں نے اپنے آبا و اجداد کے احساس و ادراک، تجربات و مشاہدات، انسانی ارتقا کی تاریخی دستاویز اور ثقافتی سرمایے کے ایسے بیش بہا خزانے کو نہ صرف یہ کہ قدر و منزلت کی نظر سے نہیں دیکھا بلکہ اس سے اجتناب و احتساب کا سلوک روا رکھتے ہوئے اپنی لاتعلقی کا اظہار بھی کیا۔ دوسری زبانوں کے لوگوں نے کہا کہ یہ گھر بار لاوارث ہے نہ، لائیے انھیں ہم اپنے دامن میں ڈال لیتے ہیں اور اس طرح وہ مشترکہ سرمایے کے واحد مالک بن بیٹھے۔ اس کی ایک مثال ہندی ہے جس نے برج، اودھی، وغیرہ زبانوں کو ہندی کی ابتدائی یا قدیم شکل جان مان کر اس کے ادبی سرمایے کو اپنا لیا اور مالا مال ہو گئی۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہماری PURITAN پیوریٹن مزاجی نے ایسے فیصلہ کن مراحل پر اکثر ہمیں دھوکا دیا اور اس کی وجہ سے ہماری زبان کو ناقابلِ تلافی نقصان اٹھانے پڑے۔ دوہا چاہے کسی بھی وجہ سے ہندی صنف قرار دیا گیا ہو، چاہے کسی بھی جذبے یا خیال کے تحت ہم نے ہماری عروضی کتب کو دوہے کے ذکر سے پاک و صاف رکھا ہو لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ آج دوہا ہندی سے کہیں زیادہ اُردو میں مقبول و مروّج ہے۔ ہمارے شعرا نے نہ صرف دوہا بلکہ دوہے کے وزن پر دیگر اصناف میں بھی قابلِ قدر کامیاب تجربے کیے اور اُردو ادب کے سرمایے میں گراں قدر اضافے کیے ہیں۔ ان کا ذکر نہ یہاں ممکن ہے نہ مقصود۔ اس پر پھر کبھی۔ ابھی تو یہی کہوں گا کہ کبھی دیکھیے تو سہی کہ تلسی، کبیر، رحیم، ملک محمد جائسی، ورند، میرا، نانک، ملّا داؤد، بہاری وغیرہ کی روایت میں ہمارے شعرا نے کیسے کیسے دوہے کہے ہیں۔ متقدمین و متاخرین کا ذکر چھوڑیے جدید عہد اور ماضی قریب کے شعرا میں فراق گورکھپوری، جمیل الدین عالی، سرشار بلند شہری، کرشن موہن، عبدالعزیز خالد، کرشن مراری، چندربھان خیال، رشید قیصرانی، حامد برگی، ساقی صدیقی، بھگوان داس اعجاز، مان ہوش سرحدی، اے۔ ڈی۔ راہی، وقار واثقی، جمیل عظیم آبادی، عامد پشاوری، صائمہ خیری اور ندا فاضلی وغیرہ کے دوہے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ان حضرات نے منہ کا مزہ بدلنے کے لیے دوہا صنف اختیار نہیں کی بلکہ اس صنف کو ان حضرات نے سنجیدگی سے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ ان میں سے چند حضرات نے تو دوہوں کے مجموعے بھی شائع کیے ہیں۔ جی تو یہی چاہتا کہ ہر شاعر کے دوہے پیش کیے جائیں لیکن کچھ کام تو قاری کے لیے بھی چھوڑنا چاہیے نہ اس لیے یہ کام قاری کے سپرد کرتے ہوئے آئیے ہم دوہے کے حدود پہچاننے کی سعی کرتے ہیں۔

موٹے طور پر شعری صنف کی شناخت دو طرح سے ممکن ہے ایک زبان کا استعمال۔ زبان و بیان مفہوم و مافیہ سے الگ نہیں۔ دوسرا اس کا ساونڈ،

---

[1] نئے تناظر : ڈاکٹر وزیر آغا ص۱۰۱

عروضی کتب دوہے کے ذکر سے خالی ہیں۔ تب ہمارے سامنے رہ جاتے ہیں دوہے، جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کسی معیار کو سامنے نہیں رکھا گیا ہے سوائے اس کے کہ دوہا مطلع جیسی ایک چیز ہوتا ہے۔ یعنی مختلف بحوروں کہے گئے مطلعے دوہے کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ ایسے میں ہم کیا کریں؟ اس میں تو شک نہیں کہ غزل کے مطلع اور دوہے میں مماثلت ہوتی ہے لیکن جس طرح ہر چار مصرعوں والا مصرعہ رباعی کہلانے کے مستحق نہیں ہوتے ویسے ہی ہر مطلع دوہا نہیں کہا جا سکتا۔ تعجب ہے کہ جس دوہے سے ڈاکٹر راہی معصوم رضا غزل کا رشتہ جوڑتے ہیں اسی دوہے کی شناخت ہمارے پاس نہیں ہے۔ ڈاکٹر راہی معصوم رضا لکھتے ہیں:

ہماری غزل فارسی غزل کی توسیع نہیں ہے۔ بلکہ ہندوستانی ادبی روایتوں کی ایک ارتقائی شکل ہے۔ خود ایران میں کسی "ایک بیتی" ہیئت کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ایرانی غزل تشبیب سے برآمد ہوئی اور تشبیب چونکہ ایک اکائی ہے اس لیے ایرانی غزل کے مزاج میں ایک تسلسل ہے۔ ابتدائی غزلوں میں یہ تسلسل دیکھا بھی جا سکتا ہے۔ پھر آخر وہ تسلسل کیسے ختم ہوا اور غزل کا ہر شعر آزاد کیسے ہو گیا۔ اسے ہیئت میں معمولی سی تبدیلی کہہ کر گزر جانا صحیح نہیں ہے..... تشبیب کا ہر شعر آزاد اور مکمل نہیں ہوتا۔ تو پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں ہیئتیں ایک ہیں یعنی خود ایرانی غزل کی بنیاد بدل گئی ہے.....

ایرانی غزل نے جب تشبیب کے تسلسل کی زنجیروں سے آزاد ہونا چاہا تو اسے ہندوستانی کی دو یک بیتی ہیئتوں نے سہارا دیا۔ یہ دوہے اور سورٹھے کی ہیئتیں ہیں۔ یہ بات ثابت نہیں کی جا سکتی لیکن یہ بات دیکھی جا سکتی ہے..... [1]

دوہوں کی پہچان بین کے لیے ایک چیز اور ہے لغت۔ فرہنگِ آصفیہ میں لکھا ہے: دوہا / دوہرا: مذکر: جوڑا، بیت، دو مصرعوں کا ہندی شعر۔[2] لغت کی اپنی حدود ہیں۔ ایسے میں ہندی سے رجوع کرنے کے علاوہ کیا چارہ ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب ہم یہ مان رہے ہیں کہ دوہا تو اردو کی اصنافِ سخن میں سے ہے پھر ہندی کی طرف رجوع کیوں کریں؟ سوال تو واجب ہے مگر ایک مدتِ مدید سے ہم نے دوہے سے رشتہ منقطع کر لیا ہے یہی حقیقت ہے اور اسے ہندی صنف قرار دے دیا ہے۔ دوہا چھند جواب صرف ہندی کی وراثت ہے کسی زمانے میں اردو اور ہندی کی مشترکہ امانت تھی (اس وقت اردو ہندی کا قضیہ ہی کہاں تھا؟) میری حقیر رائے میں تو دوہا آج بھی مشترکہ وراثت ہے اکیلی ہندی اس کی مالک نہیں ہو سکتی۔ خیر اس سے پہلے کہ ہم ہندی سے رجوع کریں پہلے ہمارے علماء کی رائے دیکھ لیں کہ وہ اس ضمن میں کیا کہتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

"اس (دوہے) نے برِّصغیر کے دونوں ثقافتی دھاروں ہی کو خود میں نہیں سمویا بلکہ اپنی ہیئت کی تشکیل میں بھی اس دوئی کو بڑی خوبصورتی سے برقرار رکھا۔ چنانچہ دیکھیے کہ ہر دوہے کے نہ صرف دو ہم قافیہ مصرعے ہوتے ہیں (دوہا کی لفظی ترکیب بھی اسی امر کی طرف ایک اشارہ ہے) بلکہ اس کا ہر مصرعہ بھی تیرہ اور گیارہ ماتراؤں میں منقسم ہے اور ان دونوں حصوں کے درمیان ٹھہراؤ یا وشرام کا لمحہ بھی اُبھرتا ہے..... دوہا شاید وہ واحد صنفِ شعر ہے جس نے برِّصغیر کے بطون میں موجود دو نمایاں ثقافتی میلانات کو اپنی ہیئت یا فارم میں اس طرح منعکس کیا ہے کہ یہ ہیئت بجائے خود ثنویت کی ایک درخشاں مثال بن گئی ہے۔ لہٰذا اگر یہ کہیں کہ دوہے کا کلچر اس کے خد و خال میں بھی موجود ہے تو یہ بات تعجب خیز تو ہوگی مگر غلط ہرگز نہیں۔"[3]

ڈاکٹر وزیر آغا کے مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دوہے کا ایک مخصوص وزن ہوتا ہے۔ جو مطلع اس مخصوص وزن کے تقاضے پورے کرتا ہے وہی دوہا کہلانے کا مستحق ہے۔ مایہ ناز نقاد و محقق پروفیسر گیان چند بھی ایسا ہی خیال رکھتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے:

"دوہے میں ۴۸ ماترائیں ہوتی ہیں۔ ہر مصرع کے دو جز ہوتے ہیں۔ پہلا تیرہ (۱۳) ماتراؤں کا دوسرا ۱۱ (گیارہ) ماتراؤں کا۔ مصرع کے شروع میں فعول لانا ممنوع ہے اور آخر میں فاع یا فعول یا فعلان لانا ضروری ہے۔"[5]

---

(۱) تنقیدِ غزل: ڈاکٹر راہی معصوم رضا (تنقید کے بنیادی مسائل: مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور ص۲۰۶ تا ص۲۰۸) (۲) فرہنگِ آصفیہ (جلد دوم) صفحہ ۲۸۵
(۳) سے تناظر ص۵۳ (۵) "کرشن موہن کے دوہے"۔ تحریک (دہلی) ستمبر ۱۹۶۷ء صفحہ ۱۳

گیان چند صاحب کے اقتباس سے ماترائی نظام کے علاوہ مصرع کے آغاز و اختتام کی بھی وضاحت ہو گئی اور یہ معلوم ہوا کہ آغاز میں فعول نہیں لانا چاہیے اور مصرع کا اختتام فاع، فعول، فعِلان اور فعلان میں سے کسی ایک پر ضروری ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر عنوان چشتی کی بھی یہی رائے ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

" دوہے میں دو مصرعے ہوتے ہیں۔ دونوں مقفیٰ ہوتے ہیں۔ اس کی شکل غزل کے مطلع سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ اس کا ہر مصرع دو حصوں میں منقسم ہوتا ہے۔ پہلے مصرع کے پہلے حصے کو 'سم' کہتے ہیں اس میں ۱۳ (تیرہ) ماترائیں ہوتی ہیں دوسرا حصہ 'وشم' کہلاتا ہے اس میں ۱۱ (گیارہ) ماترائیں ہوتی ہیں۔ دوسرے مصرعے کے دونوں حصے کے بالترتیب یہی نام ہیں اور ماتراؤں کی تعداد بھی پہلے مصرع کے مطابق ہوتی ہے۔ دوہے کے ہر مصرع کے ہر حصے کو پاد' یا چرن کہتے ہیں۔ دوہے کے پہلے اور دوسرے مصرع کے پہلے حصے کے شروع میں جگن نہیں ہونا چاہیئے۔ اس طرح پہلے اور دوسرے مصرع کے آخر میں لگھو ماترا ہونی چاہیئے۔"(۱)

اپنی اسی تصنیف میں پروفیسر عنوان چشتی نے ڈاکٹر بھولا شنکر ویاس کے حوالے سے لکھا ہے :

" دوہا چھند کے ۲۳ اقسام ہیں۔ ہر قسم میں ایک گرو ٹوٹتا ہے اور لگھو بڑھتے جاتے ہیں۔ ان قسموں کو ایک نقشے کے ذریعہ اس طرح دکھایا جا سکتا ہے :

| نمبر شمار | نام (۱۰) | تعداد گرو | تعداد لگھو | کل |
|---|---|---|---|---|
| ۱ | بھرمر | ۲۲ | ۴ | ۲۶ |
| ۲ | بھرامر | ۲۱ | ۶ | ۲۷ |
| ۳ | شرَبھ | ۲۰ | ۸ | ۲۸ |
| ۴ | شیین | ۱۹ | ۱۰ | ۲۹ |
| ۵ | منڈوک | ۱۸ | ۱۲ | ۳۰ |
| ۶ | مرکٹ | ۱۷ | ۱۴ | ۳۱ |
| ۷ | کرَبھ | ۱۶ | ۱۶ | ۳۲ |
| ۸ | نَر | ۱۵ | ۱۸ | ۳۳ |
| ۹ | مرال | ۱۴ | ۲۰ | ۳۴ |
| ۱۰ | مدکل | ۱۳ | ۲۲ | ۳۵ |
| ۱۱ | پیودھر | ۱۲ | ۲۴ | ۳۶ |
| ۱۲ | بَل | ۱۱ | ۲۶ | ۳۷ |
| ۱۳ | بانر | ۱۰ | ۲۸ | ۳۸ |
| ۱۴ | ترکل | ۹ | ۳۰ | ۳۹ |
| ۱۵ | کچھپ | ۸ | ۳۲ | ۴۰ |
| ۱۶ | متیہ | ۷ | ۳۴ | ۴۱ |
| ۱۷ | شاردول | ۶ | ۳۶ | ۴۲ |

(۱) اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے صفحہ ۱۶۳

| نمبر شمار | نام دوہا | تعداد گرو | تعداد لگھو | کل اکشر |
|---|---|---|---|---|
| ۱۸ | ابھی ور | ۵ | ۳۸ | ۴۳ |
| ۱۹ | دیا گھر | ۴ | ۴۰ | ۴۴ |
| ۲۰ | وڈال | ۳ | ۴۲ | ۴۵ |
| ۲۱ | ٹنگ | ۲ | ۴۴ | ۴۶ |
| ۲۲ | اُندر | ۱ | ۴۶ | ۴۷ |
| ۲۳ | سرپ | ۰ | ۴۸ | ۴۸ صٹ ❁ |

پروفیسر گیان چند نے اپنے مضمون "کرشن موہن کے دوہے" میں دوہا صنف کے وزن کو اُردو عروض کے ارکان میں ظاہر کیا ہے اور ہر مصرع کے جزوِ اوّل اور جزوِ دوم کی ساخت کو واضح کیا ہے۔ مندرجہ ذیل نقشہ میں بقول گیان چند صاحب جہاں 'فعل' لکھا گیا ہے وہاں ان کی مراد عین متحرک ہے اور جہاں 'فاع' لکھا ہے وہاں ان کی مراد 'فعل' بہ سکونِ عین ہے۔ اسی طرح 'فعلن' بہ تحریکِ عین کو 'فیلن' اور فعلات بہ سکونِ عین کو فیلان لکھا گیا ہے۔ ایسا اس لیے کیا گیا کہ ایک سی غلطی کے راہ پانے کا امکان نہ رہے۔

مصرع اوّل کا نقشہ :۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| (۱) | فعلن | فعلن | فاعلن |
| (۲) | فعلن | فیلن | فاعلن |
| (۳) | فیلن | فعلن | فاعلن |
| (۴) | فیلن | فیلن | فاعلن |
| (۵) | مفاعلن | فع | فاعلن |
| (۶) | فعل | فاعلن | فاعلن |
| (۷) | فاع | فاعلن | فاعلن |
| (۸) | فع | فعلاتن | فاعلن |
| (۹) | فعلاتن | فعلن | فعل |
| (۱۰) | مفاعلن | فعلن | فعل |
| (۱۱) | فعلن | فعل | مفاعلن |
| (۱۲) | فیلن | فعل | مفاعلن |
| (۱۳) | فع | فعلات | مفاعلن |
| (۱۴) | فیلن | فاع | مفاعلن |

مصرع کا جزوِ اوّل مندرجہ بالا اوزان میں سے کسی ایک میں ہو سکتا ہے اور مصرع کا جزوِ دوم ذیل کے ۲۶ اوزان میں سے کسی میں بھی

---

❁ (۱) گرو کے بتدریج گھٹنے اور لگھو کے بتدریج بڑھنے کے باوجود ان کا ماترائی نظام ۱۳ : ۱۱ / ۱۳ : ۱۱ ہی رہے گا اس میں یہی سب ہے کہ لگھو بڑھے اور گرو گھٹے مگر اس ماترائی نظام میں فرق نہ آنے پائے۔

(۱) راجستھانی اور دوسری زبانوں میں بھی دوہوں - چھند تو یہی ہے بس نام میں فرق ہے۔ (۷) اُردو شاعری میں ہیئت کے تجربے صـ۱۴۳ تا صـ۱۶۴ (۸) مطبوعہ تحریک (دہلی) ستمبر ۱۹۶۶ء

ہو سکتا ہے :-

| | | | |
|---|---|---|---|
| (۱) | فعلن | فعلن | فاع |
| (۲) | فعلن | فیلُن | فاع |
| (۳) | فیلن | فعلن | فاع |
| (۴) | فیلن | فیلن | فاع |
| (۵) | فعل | فعل | فیلان |
| (۶) | فعل | فاعلن | فاع |
| (۷) | فاع | فاعلن | فاع |
| (۸) | فع | فعلن | فیلان |
| (۹) | فیلن | فعل | فعول |
| (۱۰) | فعلن | فعل | فعول |
| (۱۱) | فیلن | فع | فعِلان |
| (۱۲) | فعلن | فع | فعِلان |
| (۱۳) | فع | فعلن | فعِلان |
| (۱۴) | فعلن | فعلن | فع |
| (۱۵) | فعلن | فیلن | فع |
| (۱۶) | فیلن | فعلن | فع |
| (۱۷) | فیلن | فیلن | فع |
| (۱۸) | فعل | فعل | فیلن |
| (۱۹) | فعل | فاعلن | فع |
| (۲۰) | فاع | فاعلن | فع |
| (۲۱) | فع | فعلن | فیلن |
| (۲۲) | فیلن | فعل | فعل |
| (۲۳) | فعلن | فعل | فعل |
| (۲۴) | فیلن | فع | فعِلن |
| (۲۵) | فعلن | فع | فعلن |
| (۲۶) | فع | فعلن | فعلن |

دونوں اجزا کے اجتماع سے ۱۴ × ۲۶ = ۳۶۴ وزن بنتے ہیں۔ یہ سب اوزان مساوی اور متبادل ہیں۔ ان میں ۱۸۲ وزن ۲۴ ماترا کے اور ۱۸۲ وزن ۲۳ ماترا کے ہوں گے۔ اردو اور ہندی میں جہاں کہیں دوہا نظر آئے انھیں اوزان میں سے کسی ایک میں ہوگا اگر نہیں ہے تو وہ غیر موزوں ہے۔" ص۹

---

(۹) ایضاً

پروفیسر گیان چند کے بتائے گئے نقشے سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ دوہے میں ۴۸ کے ساتھ ۴۲ ماترائیں بھی ہوسکتی ہیں دوسری یہ کہ مصرع کے جزوِ اوّل میں تو ماتراؤں کی تعداد ۱۳ ہی ہوگی ہاں جزوِ دوم میں کبھی گیارہ اور کبھی دس ماترائیں بھی ہوسکتی ہیں جیسا کہ مصرع کے جزوِ دوم کے نقشے میں وزن نمبر ۱۴ تا ۲۶ بتایا گیا ہے۔ تو اس طرح ہماری معلومات میں ایک اور اضافہ ہوا۔

اُردو میں ماترائیں شمار کرنے میں دقت پیش آتی ہے اس کی دو خاص وجوہ ہیں (۱) ہم اس طریقۂ تقطیع سے ناآشنا ہیں (۲) ہمارا عروضی نظام کچھ ایسا ہے یا یوں کہئے کہ ہم نے اُسے ایسا بنا لیا ہے اور ایسے لکیر کے فقیر ہوکے رہ گئے ہیں کہ اس میں ترمیم کی گنجائش نہیں رہی۔ اگر کوئی کوشش کرتا بھی ہے تو عروضی لٹھ لے کے پیچھے پڑ جاتا ہے اکثر اُردو کے مزاج و مذاق کی دہائی دی جاتی ہے لیکن دہائی دینے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ مزاج و مذاق اضافی چیز ہے اُن میں تبدیلی ممکن ہے۔ خیر یہ تو الگ بحث ہے ابھی تو صرف اتنے پر اکتفا کی جاتی ہے کہ اگر ہم ہندی کی طرح ماترائیں شمار کرنا سیکھنا چاہیں تو اُردو عروض میں معمولی شد بد بہت ہے۔ پروفیسر گیان چند نے اس ضمن میں بڑا کارآمد مشورہ دیا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے۔

> " ماترائیں گننے کی ترکیب یہ ہے کہ کسی مصرع کو موزوں پڑھیے یعنی اُس میں جو حرف دب رہے ہیں انھیں محذوف مان لیجئے اور اُس کے بعد تلفظ کے مطابق حروف کی تعداد گن لیجیے یہ مصرع کی تعداد ہوگی۔ اُردو املا ماتراؤں کی تعداد بڑی خوبی سے ظاہر کرتی ہے " ص[10]

ماترائیں گننا چاہیں یا سیکھنا چاہیں تو گیان چند صاحب نے جو آسان سا طریقہ بتایا وہ آپ کے سامنے رکھ دیا میری ناچیز رائے میں اس سے آسان تر اور سبک تر تدبیر نہیں ہوسکتے۔ خیر بات اُردو دوہے کی ہے تو مندرجہ بالا اوزان کی رو سے اگر اُردو دوہوں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے یہاں اس کی پابندی بہت کم ہوسکی ہے۔ ہمارے اکثر دوہے سرسی چھند میں ملتے ہیں۔ آپ سوچیں گے یہ سرسی چھند نئی بلا کہاں سے نازل ہوگئی مگر جب معاملہ ہی پیچیدہ ہو تو کیا کیا جائے۔ ہندی کے عروضی کُتب میں تو سرسی چھند کے متعلق خاصہ تفصیل سے لکھا ہی گیا ہے مگر ہمارے علما و ساتذہ نے بھی اس باب میں بہت کچھ لکھا ہے۔ پروفیسر گیان چند لکھتے ہیں :

> " سرسی میں ۲۷ ماترائیں ہوتی ہیں۔ ہر مصرع دو اجزا سے مرکّب ہوتا ہے۔ پہلے جز میں ۱۶ ماترائیں اور دوسرے میں ۱۱۔ آخر میں فاع لانا ضروری ہے۔ اُردو میں بعض اوقات مصرع کو فع پر ختم کرکے ۲۶ ماتراؤں پر اکتفا کی گئی ہے اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں " ص[11]

پروفیسر عنوان چشتی لکھتے ہیں :

> " سرسی میں ۲۷ ماترائیں ہوتی ہیں۔ سرسی کے دونوں مصرع دوہے کی طرح باہم مقفّیٰ ہوتے ہیں اور دونوں مصرعوں کے پہلے حصّہ میں ۱۶ اور دوسرے حصّہ میں ۱۱ ماترائیں ہوتی ہیں۔ دونوں حصّوں کے درمیان وقفہ ہوتا ہے۔ سرسی چھند کے آخر میں ایک گرو اور ایک لگھُو ہوتا ہے "

اب جمیل الدّین عالی کا یہ دوہا دیکھیے :

ساجن ہم سے ملے بھی لیکن ایسے ملے کہ ہائے
جیسے سوکھے کھیت سے بادل بن برسے اڑ جائے

پہلے مصرع کے جزوِ اوّل میں ۱۶ ماترائیں (بھی کا بھ) جزوِ دوم میں ۱۱ ماترائیں (ہائے کو ہا یعنی ایک لگھُو) ہیں۔ دوسرے مصرع کے جزوِ اوّل میں ۱۶ ماترائیں (سے کا سَ) جزوِ دوم میں ۱۱ ماترائیں (رُے کا وہی عمل) ہیں۔

عالی جی صاحب کا ایک اور دوہا دیکھیے ؎

سور، کبیر، بہاری، میرا رحمٰن، تلسی داس

---

(۱۰) ایضاً (۱۱) اُردو شاعری میں ہیئت کے تجربے ص۱۶۵

سب کی سیوا کی پرعالی گئی نہ من کی پیاس

مصرعِ اوّل کے جزوِ اوّل میں ۱۶ ماترائیں (کوئی حرف نہیں دبا) اور جزوِ دوم میں ۱۱ ماترائیں (کوئی حرف نہیں دبا) کل میزان ۲۷ مصرعِ ثانی کے جزوِ اوّل میں ۱۶ ماترائیں (کوئی حرف نہیں دبا) اور جزوِ دوم میں آخری لفظ 'پیاس' کا 'یا' 'س' ہو گیا اور گیارہ ماترائیں رہ گئیں کل میزان ۲۷ ماترائیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ عالی صاحب کا یہ دوہا سرسی چھند پر بھی کھرا اُترتا ہے اور مندرجہ بالا اقتباسات کی روشنی میں اگر ان دوہوں کو کوئی 'سرسی چھند' کا نام دے گا تو اُسے ہم غلط نہیں کہہ سکتے۔ لیکن مسئلہ تب پیش آئے گا جب ہم انھیں دوہوں کا اسم عطا کرنا چاہیں گے۔ مندرجہ بالا اقتباسات سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ دوہے میں جزوِ اوّل کی ماترائیں ۱۳ ہونی چاہئیں اور جزوِ دوم میں ۱۱ یا ۱۰۔ اگر عالی صاحب کے بتائے گئے نقشے کے مطابق، تب ہم انھیں دوہا کیسے کہیں؟ اس ضمن میں حتمی فیصلے سے پہلے اگر ایک نظر ہندی عروض کے اس باب پر بھی ڈال لیں جس میں دوہوں کا ذکر آیا ہے تو بات کو ایک نیا موڑ مل سکتا ہے اور اس طرح ہم یہ بھی سمجھ لیں گے ہندی میں دوہا چھند کی کیا کیفیت ہے یا رہی ہے۔

سنسکرت روایات میں تالیف و تصنیف ہوئی عروضی کتب میں دوہے کا ذکر نہیں ملتا۔ وجہ غالباً یہ ہو کہ قدیم سنسکرت زبان میں دوہا کہنے کا رواج ہی نہ رہا ہو۔ سنسکرت کی قدیم ترین عروضی کتاب छन्दोलक्षण ग्रन्थ چھند و لکشن گرنتھ میں بھی دوہے کا ذکر نہیں ملتا۔ سنسکرت کے دیگر چھند شاستر کی کتب مثلاً جے دیو کا "جے دیو چھندس" کالیداس کے "شرت بودھ"، جے کیرتی کے "چھندونشاسم" छन्दोनुशासम् کشیمیندر کے "سورت تلک" وغیرہ میں بھی دوہے کا ذکر نہیں ملتا۔ آٹھویں صدی کے چھند لکشن کار وِرہانک نے دوہے کی ابتدائی شکل دُوہَا (دْوِی پتھک) کا ذکر کیا ہے۔ ہے انھوں نے دوپادیا چرن یعنی دو مصرعوں والا چھند مانا ہے۔ سویمبھو स्वयंभू نے دُوہَا کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ (۱) उवदुवहज (اُودُوہَا) جس میں ماتراؤں کا التزام ۱۳، ۱۲ : ۱۳، ۱۲ یعنی پہلے اور تیسرے جز میں ۱۳ : ۱۳ ماترائیں اور دوسرے چوتھے جز میں ۱۲ : ۱۲ ماترائیں ہوتی ہیں۔ (۲) अवदुहज (اَودُوہَا) جس میں ماتراؤں کا التزام ۱۲، ۱۴ : ۱۲، ۱۴ ہوتا ہے یعنی پہلے اور تیسرے جزو میں ۱۲ : ۱۲ اور دوسرے چوتھے جزو میں ۱۴ : ۱۴ ماترائیں ہوتی ہیں۔

دوہا لفظ کے ضمن میں بھی کئی خیالات مروّج ہیں۔ ممکن ہے سنسکرت द्विपथक سے مرورِ ایام میں مسخ ہو کر दुवहज بنا، جس کا استعمال وِرہانک اور سویمبھو دونوں نے کیا۔ اس مسخ شدہ صورت سے ہندی 'دوُہا' दूहा اور اس کی ارتقا پذیر شکل دوہا ہوئی ہو۔ 'دوہک' لفظ کا استعمال ہیم چندر نے اپنے چھند ونشاسن میں کیا ہے۔ ایک خیال کے مطابق یہ دوہا یا दोहज کا مصنوعی روپ ہے یعنی یہ سنسکرت بنایا گیا ہے۔ جو بھی ہو اتنا تو طے ہی ہے کہ 'دوہا' کی شکل दुवहज اور سورٹھا کی قدیم شکل अवदुवहज چھند نویں صدی کے ہندی عروضیوں کے یہاں موجود تھی۔

"کوی درپن"۔ جس کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہے۔ میں दुवहज کے لیے دوہا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کتاب میں ایک نئی بات یہ ہے کہ اس میں दोहज (دوہا) کے سم پادوں، جسے پروفیسر عنوان چشتی کے مطابق بھی پہلا اور تیسرا جزو کہنا چاہیے، کا اختتام گرو لگھو [ی ا] پر کرنے کی ہدایت ہے۔ پراکرت پینگلم प्राकृत पैंगलम میں دوہا لفظ آ گیا ہے اور اس میں ماترائی التزام ۱۳، ۱۱ : ۱۳، ۱۱ دیا گیا ہے۔ اس میں پروفیسر عنوان چشتی کے بتائے گئے دوہوں کے بھرمر، بھرامر وغیرہ ۲۳ بھیدوں کا بھی ذکر ہے۔ اس میں گن ودھان ۔ ۶ + ۴ + ۳ = ۱۳، ۶ + ۴ + ۱ = ۱۱۔ بھی بتایا گیا ہے۔ اور اس کا الٹ یعنی ۱۱ : ۱۳، ۱۱ : ۱۳ کو سورٹھا सोरठा کہا ہے۔ کوی درپن کے مصنف نے دوہا کے بھید اُدّوہہ उवदोहय ۱۲ : ۱۱، ۱۲ : ۱۱ اور سندوہہ संदोहय ۱۵ : ۱۱، ۱۵ : ۱۱ کا بھی ذکر کیا ہے۔ دوہے کی اس قسم کو ہندی عروضیوں مثلاً بھکھاری داس، جانی بہاری لال اور جگن ناتھ پرشاد نے بھانو دوہا کہا ہے۔ بردیو داس نے ایک اور دوہے کی قسم کا ذکر کیا ہے اس کا ماترائی التزام ۱۲ : ۷، ۱۲ : ۷ ہے۔ بھکھاری داس نے اسے دُھروا ध्रुवा اور بھانو نے بڑوے बरवै کہا ہے۔ اودوہہ کو بھکھاری داس اور جان بہاری لال نے 'دوہرا' کہا ہے۔ بردیو داس نے اسے 'پنچا دوہا' کہا ہے اور اس کے ۲۱ بھید بتائے

ہیں۔ اب اس کی تفصیل کے لیے تو دفتر درکار ہے۔ اجمالاً ذکر یہاں مقصود تھا۔ تو مختلف ادوار سے گزرتے گزرتے آج دوہا چھند جہاں پہنچا ہے یا جسے اب متفقہ طور پر ہندی علما نے تسلیم کیا ہے وہ ۱۳ : ۱۱ کا ماترائی التزام ہے۔ نہ صرف ہندی بلکہ گجراتی اور راجستھانی میں بھی یہی تسلیم کیا گیا ہے تفصیل کے لیے پنگل سرومنی، رگھوناتھ رویک، ورت پنگل وغیرہ دیکھے جا سکتے ہیں۔

دوہے کے باب میں ڈاکٹر شوندن پرشاد کا ارشاد بھی توجہ طلب ہے۔ موصوف کے مطابق ہندی کے اکثر ماترک چھند عوامی موسیقی سے ماخوذ یا اس پر مبنی ہیں۔ اُن کا ماننا ہے کہ دوہے کا ماخذ لوک چھند کبھی عوام میں آٹھ ماتراؤں میں تال بند کر گایا جاتا ہوگا لیکن جب ملفوظی روایت مکتوبی روایت میں تبدیل ہونے لگی تو دوہے کی موجودہ شکل سامنے آئی ہوگی۔ یہاں یہ ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ دوہے کی موجودہ شکل کم از کم چھ سو سال پرانی ہے۔ پنگل یا ہندی عروض کی کتب پڑھتے وقت ایک اور دلچسپ بات سامنے آئی جس کا دوہے سے تعلق نہیں لیکن پنگل کا مزاج سمجھنے میں وہ شاید ہماری مدد کرے۔ رگھوناتھ رویک کے مصنف نے لکھا ہے کہ انسانی تاریخ کے کسی عہد میں پنگل نامی سانپ نے زمین پر از حد ظلم کیا۔ اس کا ظلم گروڑ سے برداشت نہیں ہوا، ویسے بھی گروڑ اور سانپ میں ازلی دشمنی ہے۔ گروڑ سانپ کو ختم کرنے پر آمادہ ہوا۔ سانپ نے جب موت کو سامنے پایا تو اس نے گروڑ سے کہا میرے پاس ایک علم (ودیا) ہے مجھے مارنے سے پہلے وہ آپ لے لیجیے۔ گروڑ سے مہلت پا کر وہ پنگل نامی سانپ چھند ودیا (علم عروض) لکھنے لگا اس طرح چھند ودیا یا پنگل شاستر کا جنم ہوا۔[۱۳]

جہاں ہم یہاں تک پہنچے ہیں تو پنگل شاستریوں کی ایک اور دلچسپ بات بھی دیکھتے چلیے، ویسے اس بات کا تعلق دوہا چھند سے نہیں ہے یہ ایک وہم محض معلوم ہوتی ہے لیکن ہے۔ اس کا احتیاط اُن کے نزدیک ضروری ہے یعنی شعری تخلیق کا آغاز ان ممنوع حروف سے نہ ہو۔ ان حروف کو انھوں نے دگدھاکشر दग्धाक्षर کہا ہے۔ ہمارے یہاں اَنتیس حروف کا جو تصوّر ہے یہ تصوّر بھی کچھ ویسا ہی ہے کچھ علما کے نزدیک ان حروف کی تعداد آٹھ ہے اور کچھ کے نزدیک ۱۸۔ وہ حروف ہیں: ح / ہ، جھ، دھ، ر، گھ، ت، ह اور ہ۔ جن حضرات کے نزدیک ایسے حروف کی تعداد ۱۸ ہے وہ ان آٹھ حروف کے علاوہ دس اور حروف بتاتے ہیں اور وہ یہ ہیں: چ، گ، ڈ، ٹھ، ٹ، تھ، د، ل، پ اور م۔ ان حضرات کی رائے کے مطابق ان حروف سے شروع ہونے والی تخلیق نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ دگدھاکشر کی تعداد آٹھ بتانے والوں نے اس کے متعلق ایک دوہا کہہ رکھا ہے جس کا مفہوم اس طرح ہے کہ ح / ہ سے اگر تخلیق کا آغاز ہوگا تو شاعر کی ابھی ہانی (نقصان) ہوگی، اگر جھ سے شروع ہوگا تو وہ روگ سے دوچار ہوگا، اگر دھ سے شروع کرے گا تو اسے حکومتِ وقت کا خوف ہوگا، 'ر' سے شروع کرے گا تو زیادہ دھن کا نقصان ہوگا، 'گھ' سے شروع کرے گا تو موی اور بدن کا ناش ہو جائے گا۔ 'ت' سے شروع ہونے والی تخلیق ذلّت کی موجب ہوگی، 'ह' شہرت کے لیے سم قاتل ثابت ہوگا اور 'ہ' سے شروع کرے گا تو بدیس میں گھومنا پڑ جائے گا، لیکن اگر کوئی تخلیق حمد و ثنا، نعت وغیرہ سے متعلق ہے تو ان کا کوئی برا نتیجہ نہیں نکلے گا۔ خیر یہ تو ایک جان کاری تھی جو شاید ہندی اور دیگر زبانوں کے عروض پر علاقائی اثرات سمجھنے میں ممد و معاون ثابت ہو۔ ہمیں تو اس وقت صرف دوہے سے غرض ہے۔

اس تفصیل کے بعد ہمیں کیا کرنا ہے؟ کس معیار کو مشعلِ راہ بنانا ہے؟ سبھی راستوں کو قابلِ قبول قرار دینا ہے یا کسی ایک معیار کو ہی ماننا ہے؟ سرسی چھند یا جو ۱۶ : ۱۱ کا ماترائی نظام جمیل الدین عالی نے روا رکھا ہے اور جو دوہوں کی پرانی شکل میں ملتا ہے جیسے مُلّا داؤد کے 'لورکہا' میں ملتا ہے مستند مان لیا جائے؟ یا اردو کے وہ دوہے مستند مانے جائیں جس میں ۴ ۴ یا ۳ ۴ ماتراؤں کا التزام ہے یعنی ۱۳ / ۱۱ یا ۱۲ ۱۰ جیسے یہ مندرجہ ذیل دوہے سے

نیا گھاؤ ہے پریم کا، جو چمکے دن رات — ہونہار بِروان کے، چکنے چکنے پات [فراق گورکھپوری]
کرم پھلی کی لالسا کرتے نہیں وِدوان — جو مکت ہو راگ دویش سے وہی اُتم انسان [عبدالعزیز خالد]
مسجد کے مینار سے اُڑا کبوتر ایک — سچ ہے پیارے سائیاں تیرے روپ انیک [سرشار بلند شہری]
نا تو میرا ساجنا، نا میں تیری کوئے — مکھ دیکھے کی پیت ہے کون کسی کا ہوئے [سرشار بلند شہری]

---

(۱۳) رگھوناتھ رویک ص۴

اس پابندی کے اور بھی انیک دوہے ہیں۔ یعنی انھیں معیار مان لیا جائے؟ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم دونوں کو معیار مان لیں۔ یعنی ۱۶ ، ۱۱ اور ۱۳ ، ۱۱ - ۱۰ دونوں ہی کو اُردو دوہوں کا معیار مان لیں؟ کیوں کہ اگر صرف سرسی یا ۱۶ : ۱۱ کو معیار مانیں گے تو امیر خسرو سے اب تک ۱۳ ، ۱۱ کی پابندی سے لکھے گئے دوہے ہمیں چھوڑنے پڑیں گے اور یہ کوئی عقل مندی کی بات نہیں ہوگی ترک کرنے کا کام ہم پہلے بھی بہت کر چکے ہیں۔ ایک صورت ہو سکتی ہے کہ ہم جزو کی قید ہٹا دیں، ایسے میں ۱۳ ، ۱۱ کی قید ہٹ جائے گی، ہماری توجّہ کل میزان پر مرکوز کر دیں یعنی ہم یہ مان لیں ماترائیں ۴۸ ہو جائیں جزو اس کے جیسا چاہیں ویسا بنائیں۔ ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ہم مندرجہ بالا تمام صورتوں کو اُردو میں مروّج کر دیں یعنی سوئیجو کے بیان کردہ सदोहय ، نندا دوہا وغیرہ۔ ۴۸ ماترائیں کل میزان کو مستند معیار ماننے میں صرف ایک غلطی کا خدشہ ہے اور وہ یہ کہ اُس صورت میں ہمیں प्रवद्धवहजा / उववुवह سورٹھا کو بھی دوہا ہی ماننا پڑے گا۔ ایک صورت یہ بھی ممکن ہے کہ دوہا چھند میں بھی رباعی جتنی رعایت روا رکھی جائے ماترائی نظام کے مذاق و معیار سے ایسا ممکن نظر نہیں آتا لیکن امکان سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ ایسی چیزوں کا انحصار تخلیقی تقاضوں پر ہوتا ہے اور اُن کے امکان کو نظر انداز کر کے جو بھی معیار بندی ہوگی وہ مشکوک ہوگی۔

عروضی امکانات کے علاوہ بھی دوہے کے باب میں چند ایسے امور ہیں جو غور و فکر کے متقاضی ہیں۔ مثلاً دوہوں کی زبان کیسی ہو؟ ہندی والوں نے تو اپنی زبان کا رشتہ عوام سے منقطع نہیں ہونے دیا مگر ہمارا رشتہ عوامی یا علاقائی زبانوں سے اس طرح کبھی رہا ہی نہیں۔ ہماری یہ وطن مزاجی تو ریطرا کبرآبادی پر بھی ناک بھوں سکوڑتی ہے۔ میری حقیر رائے میں تو ہمیں عوامی زبان سے رشتہ جوڑنا چاہیے۔ زبان جوڑنے کا وسیلہ ہے اُسے توڑنے کا آلہ بنائے رکھنا کہاں کی دانش مندی ہے؟ عوام یقیناً حرف شناس نہیں ہوتے یا وہ نام نہاد شائستگی سے کوسوں دور رہتے ہیں لیکن معاف کیجیے وہ تجربات و مشاہدات میں ہم کتابی کیڑوں کے مقابلے میں کہیں بڑھے ہوئے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میری یہ رائے توجہ؟ کی طرح ہے نقار خانہ میں طوطی کی آواز ہے لیکن میں اُردو کی انجذاب کی طاقت سے مایوس نہیں ہوں۔ اس سے اُردو کے مزاج میں بدمذاقی پیدا ہوگی یہ سوچنا بھی مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ ہمیں الفاظ سے دامن بچانے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ الفاظ سے دامن بھرا جائے۔ زبان کو غیر فطری بنانے کی ضرورت نہیں۔ کیا ضروری ہے کہ ہم الفاظ کے لیے عربی و فارسی کا منہ تاکیں اور علاقائی زبانوں سے منہ موڑ لیں۔ خود عربی و فارسی والے بھی تو دوسری زبانوں سے الفاظ لیتے ہیں ورنہ یہ معرب و مفرس کہاں کی اصطلاحیں ہیں؟ ہاں اس سلسلے میں احتیاط ضروری ہے۔ عالی کی زبان اور دیگر دوہا گو شعرا کی زبان واقعی فطری زبان ہے۔ جمیل الدین عالی کے دوہوں کی زبان پر لکھتے ہوئے محمد حسن عسکری مرحوم نے بہت اچھی بات کہی تھی۔ انھوں نے لکھا :

" عالی نے اپنے دوہوں کے لیے مروّجہ اُردو میں ہندی کے دس پانچ مقبول الفاظ ملا کر ایک خاص زبان وضع کی ہے جس کی وجہ سے اُن کے دوہوں کی تازگی دوبالا ہو گئی ہے۔" [دوہے : جمیل الدین عالی ص ۹]

ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی یہی کہا ہے کہ دوہے کی ایک اپنی فرہنگ ہے۔ زبان کے اعتبار سے یہ ایک اپنی فرہنگ ہی دوہے کی شناخت ہے۔

ہندی والوں کے نزدیک دوہا چھند مُکتک मुक्तक کاویہ کے زمرے میں شامل ہے اور مُکتک کاویہ یاد رکھے جانے اور وقتِ ضرورت استعمال کرنے کے لیے لکھا جاتا رہا ہے۔ اسی لیے اُن میں جامع کلمہ کا وصف APHORISM ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ استناد پذیری کا وصف QUOTABILITY بھی۔ بہ الفاظِ دیگر استناد پذیری اور جامع کلمہ ہونا مکتک کاویہ کا وصف خاص ہے۔ استناد پذیری یا جامع کلمہ کا وصف ہماری دیگر اصناف مثلاً رباعی، قطعہ اور غزل کے اشعار میں بھی موجود ہے پھر مطلع اور دوہے میں تو مماثلت بھی ہے۔ تو کیا دوہے کی زبان بھی غزل جیسی ہی ہونی چاہیے؟ متاخرین کے یہاں بیانیہ دوہے بھی ملتے ہیں ظاہر ہے کہ بیانیہ شاعری کی زبان دوسری طرح کی ہوتی ہے تو بیانیہ دوہوں کے لیے ہم کون سی اور کیسی زبان استعمال کریں گے؟

دوہوں کی ہیئت سے متعلق بھی کچھ باتیں غور طلب ہیں۔ کسی نامعلوم شاعر کا ایک دوہا ہے ؎

سجن ایسی پریت کر جیسی کرے کپاس
جیتے تو حرمت رکھے موئے چلے گی ساتھ [فرہنگ آصفیہ جلد سوم ص ۶۶۲]

اس دوہے میں ردیف و قوافی کا التزام نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ ایسے دوہے بہت کم ملتے ہیں مگر ملتے تو ہیں۔ ہم ایسے دوہوں کو جن میں ردیف و قوافی کا التزام نہیں رکھا گیا ہو انہیں دوہا مانیں گے کہ نہیں؟ اسی طرح ردیف کی کیا حیثیت ہوگی؟ بعض ایسے دوہے بھی ملتے ہیں جن میں ردیف الگ ہوتی ہے اور قافیہ الگ ویسے اکثر دوہے ہم ردیف و قوافی ہوتے ہیں۔ ایسے اور بھی کئی سوالات ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ ہمیں اس طرح کے تمام سوالات پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ اب اس قسم کے سوالات میں پڑنے کا کوئی مطلب نہیں کہ دوہا کس زبان کا ہے اور یہ ہمارے یہاں کب اور کیسے آیا۔ ہمیں تو یہ ماننا چاہیے کہ دوہا ہماری اپنی اصناف سخن میں سے ہے اور اب ہمیں ہماری زبان کے مزاج و مذاق کے مطابق اس کی معیار بندی کرنی ہے اور ایسی معیار بندی کرنی ہے کہ شاعری ورزش کم اور تخلیق زیادہ بنے۔

آپ شاید سوچ رہے ہوں گے کہ سوالات تو اتنے ہو گئے مگر جوابات کہاں ہیں؟ میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ تنقید کا اصل کام صحیح موقع پر صحیح سوال اٹھانا ہے۔ جواب تو سب کو مل کر ہی ڈھونڈنا ہوتا ہے۔ پھر جس طرح کے موضوع پر ہم گفتگو کر رہے ہیں اس کا تعلق تخلیق سے ہے۔ بہ الفاظِ دیگر ان سوالات کے جوابات ہمیں دوہوں اور دوہا نگاروں سے ملیں گے۔ جیسے جیسے دوہے ہمارے سامنے آتے رہیں گے ہمیں سوال کے جوابات بھی ملتے رہیں گے۔ ممکن ہے کچھ نئے سوال بھی ہمارے سامنے آئیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہم نے جو سوال یہاں اٹھائیں ہیں وہ بے معنی ہو کر رہ جائیں یا سب کے سب نئے رنگ و روپ میں ہمارے سامنے آئیں۔ معیار بندی کے معاملہ میں کسی یکہ و تنہا آدمی کے محاکمہ کو مستند ماننا مناسب بات نہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ناچیز کو اپنے خیالات کی تردید کا خوف ہے۔ خوف ہے تو اس بات کا کہ اس طرح اُن چاہے' میں بھی وہی کام کرنے لگوں گا جسے میں غلط مانتا ہوں۔ میری حقیر رائے میں تخلیق سے ہٹ کر جو معیار بندی ہوتی ہے وہ غلط ہے لیکن اب اس کا کیا علاج کہ ہمارے یہاں ہوتا یہی ہے، معیار بندی کوئی کرتا ہے اور اس نام نہاد معیار کی دستار بندی کوئی اور کرتا ہے۔ دونوں صورتوں میں تخلیقی تقاضوں کو سامنے نہیں رکھا جاتا۔ تعجب تب ہوتا ہے جب تخلیق فن کار کی شمولیت کے باوجود معیار بندی خامیوں کے خمیر سے تیار ہوتی ہے۔ اس لیے میں اپنی بات بورپس کے اس قول پر ختم کرنا چاہوں گا: "میں اس سان کا کام انجام دوں گا جس سے چاقو پر دھار رکھی جاتی ہے حالانکہ اس میں کاٹنے کی صلاحیت نہیں ہوتی"۔ ❋

بقیہ اگن کنول صفحہ ۲۳

اور چند ماں میں دمکتی آتما ہے، جل میں مچلتی آتما ہے۔ اس طرح بن آتما بھی ہوتی ہے۔ آپ کو اس کا لاب نہیں کرنا چاہئے تھا اور نہ ہی بھوگ، اس سے دور رہنا چاہیئے تھا۔"

"اب تو یہ سب ہو چکا پجاری جی" مہامنتری نے کہا۔

"اس لیے اپائے بتائیے" راجہ بولا۔

مہاپجاری کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ "پیانے بھوج پتروں میں ایسے منتر مل جاتے ہیں جن سے اس کا اپائے ہو سکتا ہے آپ جا کر ہون کنڈ کا پربندھ کریں میں آکر جاپ شروع کرتا ہوں۔"

اگلے دن ابھی اوشا آسمان پر براج رہی تھی کہ ہون کنڈ کے شعلے بلند ہو گئے۔ مہاپجاری نے اشنان کیا، جنیو کو ٹھیک کیا، گیندے کے پھولوں کے ہار پہنے اور تلسی کی ٹہنیاں ہاتھ میں لے کر اس نے ہون کنڈ کے کنارے بیٹھ کر جاپ شروع کیا، جیسے جیسے شعلے بلند ہوتے گئے جاپ میں بھی تیزی آتی گئی۔ پرجا دائرہ کی صورت میں ہاتھ باندھے خاموش کھڑی تھی مہامنتری ساکت شعلوں کی زبانیں دیکھ رہا تھا۔ راجہ سر جھکائے بیٹھا تھا اور پھر اچانک وہ دھڑام سے گر گیا۔ منتر کی جاپ رک گئی، مہاپجاری اسے پُرتشویش نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مہامنتری نے آگے بڑھ کر اٹھایا تو راجہ کا پنڈا تپ رہا تھا اور جسم پسینہ میں بھیگ رہا تھا۔

"مہاراج! آپ ٹھیک تو ہیں"

"ہاں میں ٹھیک ہوں"

مہامنتری اور مہاپجاری نے چونک کر راجہ کو دیکھا جس کی کڑک دار آواز اب عورت کی آواز میں تبدیل ہو چکی تھی!

مجمع خاموش تھا۔

راجہ نے سر اٹھا کر دیکھا تو یوں محسوس ہوا گویا اگن کنڈ کی آگ اس کی آنکھوں میں بھر گئی ہو۔ اور یہ سب اتنی جلدی ہوا کہ کسی کو سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سب کیا ہو گیا۔

راجہ نے مہاپجاری کو اپنے قوی بازوؤں میں اٹھا لیا۔ ایک لمحہ بعد مہاپجاری کی بھی ٹانگیں فضا میں معلق نظر آئیں۔ مگر خوف کی چیخ حلق سے نکلنے سے پیشتر وہ راجہ کے بازوؤں سے نکل کر شعلوں کے بازوؤں میں تھا۔ ❋



## مخمور سعیدی

◆

مجھ میں کسی کا عکس نہ پرتو، خالی آئینہ ہوں میں
میرے ٹکڑے کون سمیٹے، اب ٹوٹوں یا بکھروں میں

میری رسائی میری حدوں تک، تیری فضا میں تو بھی قید
تو مجھ تک آئے تو کیوں کر، مجھ تک کیسے پہنچوں میں

اک رستہ طے ہو جائے تو کتنے رستے دیں آواز
ختمِ سفر کی حسرت لے کر منزل منزل بھٹکوں میں

آنے والا کوئی نہیں ہے، کوئی نہیں ہے، کوئی نہیں
اے دل! اس ویران ڈگر پر کس کا رستہ دیکھوں میں؟

رُخ پہ جو تیرے شفق کھِلی ہے، خون ہے میرے خوابوں کا
کہے تو اے شامِ تنہائی تجھ سے لپٹ کر رو لوں میں

میرے دل کا بوجھ بنے ہیں اُس کی نظر سے گر کر بھی
اپنے ان بیکار دکھوں کو کس میزان میں تولوں میں

دوری کے یہ لمحے بڑھ کر کہیں نہ صدیاں بن جائیں
تجھ کو جب اپنے پاس نہ پاؤں جانے کیا کیا سوچوں میں

میرے گھر کی چھت پر کب سے تیرا بسیرا ہُوا نہیں
آسماں پر اڑتے پنچھی! آ تیرے پر کاٹوں میں

دیواروں سے سر ٹکراؤں بند دریچوں کے پیچھے
کھلی فضا میں آنکلوں تو موجِ ہوا سے اُلجھوں میں

کون سُنے گا یہ طولانی قصّہ کس کو فرصت ہے!
جو کچھ مجھ پر بیت رہی ہے اپنے دل میں رکھوں میں

لفظوں میں احساس کی کلیاں کھلا رہا ہوں اے مخمورؔ
جیسے کوئی مجھ سے کہتا ہو: آ تیرے لب چوموں میں

◆

سینے میں کسک بن کے اُترنے کے لیے ہے
ہر لمحۂ حاصل، کہ گزرنے کے لیے ہے

سنورے گا نہ اس شام کہیں کوئی نظارہ
یہ شام تو تیرے ہی سنورنے کے لیے ہے

ناموسِ گلستاں کا تقاضا سہی، پِھر بھی
خوشبو تو مگر قید نہ کرنے کے لیے ہے

تم ریت میں چاہو تو اسے کھے نہ سکو گے
کشتی، جو سمندر میں اترنے کے لیے ہے

کچھ اور نہیں دل کی تمنّاؤں کا حاصل
اس شاخ کا ہر پھول بکھرنے کے لیے ہے

سوئی ہوئی ہر ٹیس کبھی جاگ اٹھے گی
جو زخم ہے اس دل میں، نہ ابھرنے کے لیے ہے

تصویرِ غمِ دل بھی کہیں ماند پڑی ہے!
مٹتا ہوا ہر نقش، اُبھرنے کے لیے ہے

یہ قافلۂ عمرِ رواں، راہِ طلب پر
دو چار قدم چل کے ٹھہرنے کے لیے ہے

مخمورؔ! یہ دنیا وہ رسدگاہِ اصل ہے
زندہ ہے یہاں کوئی تو مرنے کے لیے ہے



سلیم اختر

۵۶۹ - ۳ - سی، جہاں زیب بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن - لاہور - ۱۸

# اگن کنول

راجہ کا منہ کھلا رہ گیا، اس نے کچھ کہنا چاہا مگر خشک حلق میں جیسے تھوہر اگ گئے۔ اس نے بمشکل بے ترتیب سانسوں کو مرتب کیا اور آہستگی سے بولا "کیا کہہ رہے ہو۔؟"

مہا منتری کا ادب سے جھکا ہوا سر اور بھی جھک گیا۔

"راجن! میری کئی پشتیں آپ کی خدمت میں زندہ رہی ہیں اور آپ کے نام پہ مری ہیں۔ یقین مانیے میں غلط بات نہیں کہہ سکتا۔"

"مگر اتنی بڑی بات؟" راجہ جھرجھری لے کر بولا۔

"مہا منتری دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا بات واقعی بڑی ہے مگر یہ سب ان آنکھوں کا دیکھا ہے" راجہ گہری سوچ میں تھا۔ مہا منتری بولا "غلط دیکھنے کی سزا میں میری آنکھیں نوچ کر تلوں سے مسل دیجیے"۔ راجہ نے اسے آنکھ بھر کر دیکھا تو مہا منتری کے چہرہ پر جہاں اندیشوں کی راکھ تھی وہاں آنکھوں میں سکون کے دو دیپ بھی روشن تھے ایسے دیپ کہ اندیشوں سے ان کی لو میں کپکپاہٹ نہ تھی۔ راجہ نے نظریں جھکا لیں۔

مہا منتری بولا "آگیا ہو تو عرض کر دوں؟"

"ہوں" راجہ نے جیسے بے خیالی سے کہا۔

مہا منتری کہنے لگا "راجن! آپ اس دن سے شروع کیجیے جب آپ پہلی مرتبہ ملے تھے" مہا منتری جان بوجھ کر نام نہ لے رہا تھا شاید وہ خوف زدہ تھا کہ زبان سے نام لے دینا ہی پاپ نہ بن جائے!

راجہ کیسے بھول سکتا تھا وہ دن!

وہ ایسا البیلا اور چمکیلا دن تھا کہ من میں خود بخود ترادٹ پیدا ہو، نہ اتنا گرم کہ پردہ نڈھال ہو اور نہ اتنا سرد کہ تن کپکپا اٹھے۔ کانٹے کی تول کا دن تھا وہ، گگن کے نیلے روپ میں بادل کے سفید ٹکڑے اضافہ کر رہے تھے۔ چیت کا وہ دن عجب مستی کا پیالہ تھا کہ پیتے جاؤ پیالہ پھر بھی بھرا ہوا۔ اس لیے راجہ کا من پنچھی بھی جیسے باؤلا ہو گیا۔

اگرچہ راجہ عادت کے مطابق راج کا کام کرتا۔ پرجا کے دکھ دور کرتا، مجرموں کو سزا دیتا، انصاف کرتا لیکن کچھ عرصہ سے وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے کسی چیز کی کمی ہو، کہیں نہ کہیں ایک آنچ کی کسر رہ گئی ہے، ذہن جیسے کسی خواب کی راحت یاد کرتا مگر یاد نہ کر پاتا، کسی نغمہ کا ٹکڑا پنچھی کی مانند تن نگر سے تیزی سے پرواز کر جاتا مگر یاد کے دام میں نہ آتا۔

راجہ اتنا بیاکل ہوا کہ اپنی رانیوں سے بھی بے زار ہے تا سا رہنے لگا۔ چیت کے اس سندر دن۔ اجلی دھوپ اور پروائی نے من میں وہ آندھی اٹھائی کہ راجہ سے نہ رہا گیا، مہا منتری کو بلایا، شاہی لباس اتار، پرجا کا لباس پہن، گھوڑوں پہ سوار ہو جنگل کی راہ لی۔

جنگل میں ہریالی کا راج تھا، پتے کبھی اتنے سبز نہ لگے تھے۔ پھول کبھی اتنے سرخ نظر نہ آئے تھے، درختوں کے تنوں نے یوں کبھی گردن نہ اٹھائی تھی اور نہ کبھی پیڑوں نے یوں بازو پھیلائے تھے کہ گویا خود میں سما جانے کی دعوت دے رہے ہوں۔ فضا میں عجب ٹونا تھا اور بے سدھ راجہ جنگل کے چھتر میں مست تھا۔ مہا منتری دونوں گھوڑے سنبھالے راجہ کے پیچھے پیچھے حیران چلا جا رہا تھا کہ مہاراج کدھر جا رہے ہیں اسے اس دم بدم گھنے جنگل کی بڑھتی ٹھنڈک سے انجانا۔ خوف محسوس ہو رہا تھا اسے درختوں کی پھیلی شاخیں اپنی جانب بڑھتی انگلیاں لگ رہی تھیں، درختوں سے لپٹی بیلوں کو وہ کوڑیالے کے مانند شوکتا محسوس کر رہا تھا۔ جنگل عجب باس دے رہا تھا اور اس کی نم آلود ٹھنڈک جسم پر مردار ہاتھ کے چپچپاتے لمس کی مانند تھی۔

مہا منتری کے جسم کی لرزش نے اعصاب میں ہر پیٹے ڈال دیے۔ چلتے چلتے گھوڑے بعض اوقات ٹھٹھک کر رک جاتے اور وہ باگ پکڑ کر انھیں کھینچتا۔ اس نے تلوار کے قبضہ پہ ہاتھ رکھا تو فولاد کی سخت

ٹھنڈک نے ڈھارس بندھائی وہ بزدل نہ تھا اور نہ ہی مرنے مارنے سے ڈرتا تھا اسے اگر ڈر تھا تو مہاراج کا۔ اسے اپنی جان کی پرواہ نہ تھی جنگل کا بے نام خوف اسے ٹھنڈا کیے جا رہا تھا مگر خوف کس بات کا۔؟ جنگل سے خوف کیوں؟ ہاں کیوں خوف؟ کیسا خوف؟ اور تب اسے احساس ہوا کہ جنگل بالکل خاموش ہے، حیوانوں اور پرندوں کی آوازوں سے یکسر خالی! کسی جانور کی آواز سے قطعی طور پر محروم! دراصل یہ گمبھیر خاموشی ہی اسے ڈرا رہی تھی۔ اتنا بڑا جنگل اور اس میں کوئی بھی جانور نہ ہو، اتنے بڑے بڑے پیڑ اور ان پر کسی بھی پرندے کا گھونسلہ نہ ہو، اور اتنی ڈالیاں اور ان پر کوئی پنچھی نہ چہچہائے۔ یہ کیسا جنگل ہے؟ مہا منتری نے جھرجھری لے کر چاروں اور پھیلے اس گونگے جنگل کو دیکھا اور احتیاطاً تلوار نکال لی۔ وہ ہر قیمت پر اس بھید بھرے جنگل سے اپنے راجہ کی رکشا کرنا چاہتا تھا۔

ادھر راجہ یوں محسوس کر رہا تھا گویا نظر نہ آنے والی ڈور اسے اپنی اور کھینچے جا رہی ہو۔ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ اس رات سمان جنگل میں کیوں بڑھتا جا رہا ہے۔ اس نے پیچھے چلتے مہا منتری کے تلوار نکالنے کی آواز سنی، پھر گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں سنیں جن میں خوف کی لرزش واضح تھی۔ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر ہی اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ مہا منتری اور گھوڑے دونوں خوف زدہ ہیں اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ دونوں آسانی سے ڈرنے والے نہیں، مگر جنگل کا جادو محسوس کرنے کے باوجود بھی وہ خوف زدہ نہ تھا بلکہ عجب پیاس تھی کہ نادیدہ چشمہ کی طرف کھینچ رہی تھی۔

راجہ کیسے بھول سکتا تھا۔ وہ سندر نار۔

وہ ٹھٹک کر رک گئے۔ سامنے کنول بھرا تالاب تھا۔ گہرے سبز اور چوڑے پتوں بیچ سرخ کنول چمک رہے تھے۔ تالاب کا شفاف پانی، سبز پتے اور سرخ کنول یہ سب آنکھوں میں ٹھنڈک کے کٹورے انڈیل رہے تھے۔ تلوار تھامے مہا منتری خاموش تھا۔ گھوڑے ساکت تھے، درخت، شاخیں، پتے، ہوا سب بے حرکت تھے۔ جیسے سانس روکے ہوں!

وہ جنھیں وہ سفید کنول سمجھتے تھے جب وہ سرخ کنولوں سے الگ ہوتے تو راجہ کے سینے میں رکی سانس خارج ہوئی، آنکھ بھر کر دیکھا تو محسوس ہوا گویا اوشا اشنان کر رہی ہو، پانی سے یوں باہر نکلی جیسے ہرنے ناری روپ لے لیا ہو، کنول بھرے تالاب میں وہ چندرماں کی طرح دمک رہی تھی۔ بالوں سے پانی کی ٹوٹتی بوندوں میں دھنک رنگ لہرا رہے تھے۔ مگر انگ پر بوند نہ ٹکتی۔

وہ اب تک ان کی موجودگی سے بے خبر تھی، راجہ اور منتری دونوں چتر بنے کھڑے تھے، گھوڑے گویا سانس نہ لے رہے تھے۔ جنگل، ہوا، سب چپ!

اور تب پہلی مرتبہ اسے ان کی موجودگی کا احساس ہوا، ادھر لاج سے ہاتھ اٹھا ادھر راجہ کی آنکھوں میں وہ کنول نین ڈوب گئے یوں کہ راجہ لڑکھڑا گیا۔ وہ مینکا تھی کہ شکنتلا؟ وہ جو بھی تھی واپسی میں راجہ کے ساتھ تھی!

راجہ کیسے بھول سکتا تھا وہ مدھ بھرا دن، راجہ کیسے بھول سکتا تھا وہ بھید بھرا جنگل اور راجہ کیسے بھول سکتا تھا وہ جل اپسرا! وہ تھی تو جل اپسرا مگر اس کے تن کی جوالا میں اشنان سے راجہ نے نئی شکتی پائی اور نئی مدھرتا کا مزا چکھا تو آتما کو شانت پایا!

تو راجہ کیسے بھول سکتا تھا وہ دن، راجہ کیسے بھول سکتا تھا وہ جنگل اور راجہ کیسے بھول سکتا تھا وہ نار؟

مہا منتری نے بے چینی سے پہلو بدلا دونوں ہاتھ جوڑے اور بولا، "مہاراج اسے یہاں آئے کتنے چاند بیت گئے ہیں؟"

"چھ!"

"اور ان چھ چاندوں میں ہمارے کتنے جانور غائب ہوئے؟"

راجہ کو گنتی کی ضرورت نہ تھی وہ جواب جانتا تھا سب یہی سمجھتے تھے کہ باگھ آتا ہے اور گائے، بیل، بھینس، بچھڑا، گھوڑا جو بھی ہاتھ لگے چٹ کر جاتا ہے یوں کہ ہڈیاں بھی نہ ملیں۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو"، راجہ نے پوچھا تو آواز میں لرزش تھی۔

"مہاراج..." مگر مہا منتری کے منہ سے بات نہ نکل رہی تھی راجہ اسے متوقع نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

وہ ہاتھ جوڑ کر تیزی سے یوں بولا جیسے ایک سانس میں سب اُگل دینا چاہتا ہو "مہاراج! یہ وہ نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں"

"کیا؟"

"جی مہاراج"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو مہا منتری"

وہ پھر ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "ہماری نسلوں نے آپ کی نسلوں کی سیوا کی ہے میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔" وہ ایک لمحہ کو رکا پھر غوطہ لگا دینے کے

انداز میں بولا۔ "مہاراج، یہ عورت نہیں۔ ناری روپ میں کچھ اور ہی ہے" وہ لرز کر چپ ہو گیا، راجہ نے نظر بھر کر دیکھا تو اپنے مہامنتری کو خوف زدہ پایا اور راجہ جانتا تھا کہ وہ آسانی سے ڈرنے والوں میں سے نہیں ہے "کہے جاؤ" وہ کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے بولا۔ "مجھے تم پر بھروسہ ہے"

"مہاراج جانتے ہیں کہ اب ان جنگلوں میں باگھ چیتا اور تیندوا قسم کا کوئی جانور نہیں رہا"

"ہاں! یہ تو ہے"

"اس لیے جب مسلسل جانور اور پھر لوگ غائب ہونے لگے تو مجھے شک ہوا کہ شاید راج کا کوئی دشمن یہ سب کچھ کر رہا ہے کہ پرجا بے چین ہو کر بھڑک اٹھے چنانچہ میں نے راتوں کو کھوج لگانا شروع کر دیا مگر کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔" "وہ ایک لمحہ کو رکا تو دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں"۔ "مہاراج! تب مجھے یاد آیا کہ وہ کس حالات میں ہمیں ملی تھی۔ بے لباس اور بے سہارا! پھر اس کا آپ کے ساتھ خوشی خوشی چلے آنا، تو میں کچھ مشکوک ہو گیا۔ پھر میں نے حساب کیا کہ محل میں اس کی آمد کے بعد ہی سے یہ سلسلہ شروع ہوا تھا بلکہ مہاراج اگر یاد کریں تو جس رات یہ محل میں آئی اس رات ایک باندی کا بچہ گم ہوا تھا"

راجہ کو یاد تھا۔

"تب مہاراج میں نے باہر گلیاں اور کھیت کھلیان چھوڑ کر محل کی نگرانی شروع کی، میں ہر رات محل کے مختلف حصوں میں چھپ کر بیٹھتا مگر کچھ معلوم نہ کر سکا اور تب کل رات" وہ جھجک کر خاموش ہو گیا۔

وہ رات!

اور کیسے بھول سکتا تھا مہامنتری وہ رات!

وہ جیالا مرد تھا مگر اس رات خوف سے وہ یوں ڈسا گیا کہ ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا ہو کر رہ گیا۔ اماوس کی رات کالی گھٹا بن کر گھر آئی تھی، وہ راجہ کی خواب گاہ کے سامنے تاریک جھروکے میں تاریکی کا سایہ بنا کھڑا تھا؛ نگاہیں خواب گاہ پر مرکوز کیے جہاں ابھی تک روشنی تھی، پھر یہ روشنی بجھ گئی۔ وقت اور تاریکی ہاتھ میں ہاتھ دیے گذر رہے تھے مسلسل گھورنے سے آنکھیں درد کر رہی تھیں۔ آسمان دیکھا تو کہکشاں سر سے ہٹ کر آسمان کے کنارے پر نظر آئی اس نے اندازہ لگایا تقریباً پون رات بیت گئی ہے۔ خواب گاہ کے باہر پہرہ دار نیند میں گہری سانس لے رہے تھے صرف ان کے سروں پر مشعلیں جلتی رہ گئیں تھیں اس نے دل کو خوف کی مٹھی میں پایا تو ہاتھ تلوار کے قبضہ پر مضبوط ہو گیا۔

دروازہ کھلا اور وہ چوکھٹ پر تصویر کی طرح نظر آئی، ہوا سے ہلتی مشعلوں نے اس کے چہرہ پر روشنی اور سائے کی لیلا رچائی تھی مشعل کی زرد روشنی میں وہ بے حد کمزور اور نڈھال دکھائی دے رہی تھی۔ گویا برسوں کی مریض ہو، وہ چلی تو یوں لگا گویا جسم کی ہڈیاں آپس میں ٹکرا کر آواز پیدا کر رہی ہوں۔ وہ عورت کی طرح نہیں بلکہ کسی ڈھانچہ کی مانند اچھل اچھل کر چل رہی تھی اور پھر غلام گردش کے اندھیرے نے اسے نگل لیا، مگر مہامنتری بھی تاریکی کا سایہ بنا پیچھے پیچھے تھا۔ وہ تاریکی اور نیند میں ڈوبے محل کی سنسان غلام گردشوں سے ہوتی ہوئی شاہی اصطبل کی جانب جا رہی تھی اور بڑی تیزی اور بے چینی کے عالم میں!

وہ اچانک رک گئی، گویا آہٹ لے رہی ہو۔ مہامنتری نے سانس روک لی مگر دوسرے لمحے اس نے شاہی اصطبل جانے کا راستہ ترک کر کے زنان خانہ کا رخ کیا وہ آہستگی سے ہر دروازہ ڈھکیلتی مگر جب بند پاتی تو دوسرے کا رخ کرتی اور پھر بالآخر اسے ایک دروازہ کھلا مل گیا۔ وہ تیزی سے اندر گئی اور باہر آئی کہ مہامنتری کی سانس رکی ہی رہی۔

اس کے بازوؤں میں خوابیدہ بچہ تھا وہ جیسے بھوک سے دیوانی ہو رہی تھی چنانچہ وہیں دہلیز پر بیٹھ کر اس نے بچہ کی شہ رگ میں اپنے دانت گاڑ دیے بچہ ایک لمحہ تو کسمسایا مگر اس کی مضبوط گرفت میں ساکت ہو کر رہ گیا، وہ جیسے جیسے خون پیتی گئی مرجھائے گالوں کی شام پر سرخی طلوع ہوتی گئی اور جلد ہی سب ختم۔ خون، گوشت، ہڈیاں سب ختم۔ اور یہ سب کچھ یوں کھایا کہ آواز دہلیز کے اس پار سوئی ماں کو نہ جگا سکی۔

تب مہامنتری نے اپنی آنکھوں کے سامنے اسے نیا شریر پہنتے دیکھا وہ دوبارہ من موہنی سندر ناری بن چکی تھی۔

مہامنتری خاموش کھڑا کانپتا رہا جیسے کہ وہ اب اپنے راجہ کے سامنے کانپ رہا تھا "دیوتا کی سوگند مہاراج! ایک شبد بھی جھوٹ نہیں"۔

"مجھے یقین ہے" راجہ بولا تو نہ جانے اس کی آواز کس اندھے کنوئیں سے آ رہی تھی "مگر اب اس کا اپائے کیا ہو"؟

"مہاراج میں نے بھی بہت وچار کیا بس یہی سمجھ میں آیا کہ مہا پجاری سے بات کی جائے ایسے معاملوں کو وہ ہم سے بہتر سمجھ سکتے ہیں"۔

سب سن کر پجاری غصہ سے بولا۔ "مہاراج آپ اتنے بدھی مان ہیں مگر آپ نے یہ کیوں نہ سوچا کہ یہ ناری آتما بھی تو ہو سکتی ہے"۔

"مطلب؟"

"مہاراج! جیسے پرمیشر شوں میں آتما ہے۔ گنگو میں پوتر آتما ہے۔ سوریہ

[ باقی صفحہ ۱۹ پر دیکھئے ]



[illegible] شہریار

## ہونٹوں سے نہیں لکھی

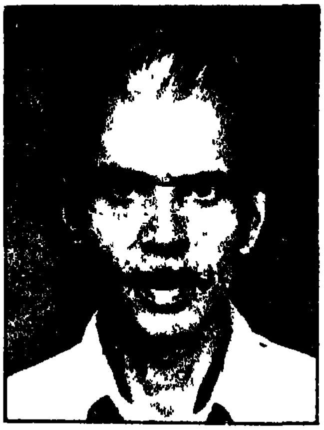
آج صاف پانی پر
انگلیوں سے لکھی ہے
تیرے نام ایک چھٹی

آئے اب ہوا آئے
اور صاف پانی کو
تیری سمت لے جائے

راستے میں ہاں اس کو
اور کوئی نہ پڑھ پائے
ہو نہ تیری رسوائی

تیرے نام یہ چھٹی
ہونٹوں سے نہیں لکھی
انگلیوں سے لکھی ہے

ہوسٹی، میڈیکل کالج کیمپس، علی گڈھ یونیورسٹی، علیگڈھ



[illegible]

جینا ہنر ہے اس کو ہنر ور بھی چاہیئے
پھولوں کے ساتھ ہاتھ میں خنجر بھی چاہیئے

مانا کہ زندگی ہے مسلسل سفر کا نام
لیکن مسافروں کو کوئی گھر بھی چاہیئے

یہ سادگی بھی ایک تماشے سے کم نہیں
کاغذ کی کشتیوں کو سمندر بھی چاہیئے

کیا جانے کس گلی میں سگ رہ جھپٹ پڑے
لازم ہے آج ہاتھ میں پتھر بھی چاہیئے

بس خواب دیکھتے رہو تا زندگی مگر
یہ مت کہو کہ خواب کو پیکر بھی چاہیئے

## ایک نظم

بے اماں راستوں کا مسافر ہے دل
کون ساتھی بنے
برف باری میں اک ٹوٹتی شاخ سے
اک پل کی وفا بھی خطرناک ہے
کون خود آپ ہی اپنا قاتل بنے

محلہ گھاٹی اورنگ آباد (مہاراشٹرا)



ستیش بترہ

# سوال زندگی کا

پانچ ۔ پانچ طویل سال جس کا پل پل کوشلیا، اُس کے بیٹوں اور بہوؤں پر بھاری رہا تھا۔ اس دوران گھر جنت سے دوزخ بن کر رہ گیا تھا۔ کہتے ہیں بیماری اور فوجداری دشمن کے گھر بھی نہ آئے۔ یہ خاندان کیا! پشتوں تک کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہے۔

پانچ سال پہلے یہ کوشلیا اور رگھونندن کا [illegible] بسا ہوا تھا۔ رگھونندن کو لڑکے اور بہوئیں کیا، چھوٹا سا پوتا بھی اپنی توتلی زبان میں بابوجی کہہ کر پکارتا۔ تیس ۳۳ تینتیس سال کی نوکری کے بعد بابوجی ریٹائر ہو چکے تھے۔ بڑا اندر کا انجینیئرنگ میں نوکر تھا۔ وہ اور اس کی بیوی ساوتری بھی اِن دونوں کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ [illegible] تیج ایک مشہور میڈیکل فرم کا نمائندہ تھا۔ اسے نوکری کے سلسلے میں اکثر لمبے لمبے دوروں پر رہنا پڑتا۔ اُس کی شادی بھی تو ایک امیر گھرانے میں ہوئی تھی۔ یہ درست تھا کہ اُس کی بیوی سنگیتا گھر کی ہر چیز پر ناک بھوں سکوڑتی لیکن وہ کوشلیا اور بابوجی کا واجبی احترام کرتی۔ اُس کا زیادہ وقت اپنے کمرے میں ناول پڑھتے یا بنتے سنورتے گزرتا۔ اِن دونوں کی شادی ہوئے کچھ زیادہ وقت نہ گزرا تھا اور کوشلیا کا خیال تھا کہ وہ کچھ وقت بعد گھر گھل مل جائے گی۔ اب بھی وہ کبھی کبھی موڈ ہونے پر کوشلیا اور ساوتری کے پاس آ بیٹھتی۔ اور چھوٹے چھوٹے کاموں میں ہاتھ بٹا دیتی۔ گھر میں سب اچھا خاصا کھا کما رہے تھے۔ اور گھر کا گذر بڑی اچھی طرح سے ہو جاتا۔

گھر کی رونق اندر اور ساوتری کے بیٹے بنٹی سے تھی۔ سات سال کی لمبی شادی کے بعد اُس کا جنم ہوا تھا۔ اور اُس کے آتے ہی گھر میں بہار آ گئی تھی۔ وہ دن بھر گھٹنوں کے بل گھسٹتا، اِس کمرے سے اُس کمرے میں، اِس گود سے اُس گود میں کلکاریاں مارتا، خود ہنستا، دوسروں کو ہنساتا [illegible] ہوتا رہتا۔ وہ سبھی کا لاڈلا تھا۔ لیکن دادا، دادی تو اُس پر جان چھڑکتے۔ اُس کا زیادہ وقت اُن ہی کے کمرے میں گزرتا۔ کبھی وہ بے تکلفی سے اُن کے بستروں میں آ کر چھپ جاتا۔ کبھی اُن کی انگلی پکڑے انہیں گھر بھر میں گھماتا پھرتا۔ اگر وہ گھر میں دکھائی نہ دیتا، تو اُس کا دادا، دادی کے کمرے سے برآمد ہونا طے تھا۔

وقت ہنستے کھیلتے گزر رہا تھا۔

اور پھر اچانک بابوجی پر فالج کا حملہ ہوا۔ ڈاکٹر بلایا گیا۔ اُس نے بڑے غور سے اُن کا معائنہ کیا۔ مختلف حصوں کو گدگدایا۔ جگہ جگہ چٹکیاں لیں، اُن کا دایاں حصّہ بالکل بے حس ہو کر رہ گیا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔

"فالج نے اُن کے بائیں حصّے کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں جکڑ لیا ہے۔ احتیاط بہت لازم ہے! ایسا نہ ہو کہ اس کا اثر اُن کے دماغ پر بھی پڑے۔ آپ یہ دوائیاں فوراً منگوا لیجئے گا!"

جاتی بار فیس لے کر اُس نے اپنے لیٹر پیڈ پر دوائیاں لکھ دیں۔ اُس نے ڈاکٹروں کی روایتی تسلّی دیتے ہوئے کہا فکر کی کوئی بات نہیں۔ صرف احتیاط لازمی ہے!

بابوجی کی بیماری نے گھر میں ہر کسی کو چوکنّا کر دیا۔ کوشلیا بڑے انہماک سے اُن کی تیمارداری میں جُٹ گئی۔ ساوتری بابوجی کی ہر ضرورت کو فوقیت دینے لگی۔ کھانا پینا، دوا دارو گھڑی کی پابندی کے ساتھ ہونے لگا۔ تیج جب دورے سے لوٹتا تو سارا دن بابوجی کے پاس بیٹھا رہتا۔ اندر بھی صبح جاتے ہوئے اور شام کو دفتر سے لوٹتے ہی بابوجی کے پاس باقاعدگی سے رکتا۔ بنٹی بھی دادا جی کے پاس آ کر اُن کا دل بہلاتا رہتا۔ اور تو اور سنگیتا بھی دن میں دو چار بار بابوجی کی حاضری دینے لگی تھی۔ بابوجی کو جب کبھی باتھ روم جانا ہوتا تو انہیں تھامنے اور پکڑ کر لے جانے کے لئے سبھی بھاگتے۔

بابوجی اب بہت کم بولنے لگے تھے۔ جب کبھی بنٹی بابوجی کے بستر کے پاس جا کھڑا ہوتا تو اُن کی نگاہیں اُس کے بھولے بھالے چہرے کو دیر تک نہارتی رہتیں۔ وہ محبت کرتے اپنا دایاں ہاتھ اُس کے سر پر یا اُس کے چہرے کو سہلاتے اور اُس کی پیٹھ تھپتھپاتے۔

بنٹی بھی خاموش اُن کی طرف تکتا رہتا۔ جیسے اِن دونوں میں ایک خاموش رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ جس میں ایک دوسرے کو ڈھارس دینے اور دلجوئی کے لیے بہت کچھ تھا۔

کچھ مہینوں بعد بابوجی کے قدم اور بھی لڑکھڑانے لگے۔ ڈاکٹر پھر بلائے گئے۔ یہ تو غنیمت تھا کہ اپنے پیشے کی وجہ سے تیج کی ڈاکٹروں کے ساتھ خاصی جان پہچان تھی۔ کچھ ڈاکٹر تو اپنی فیس بھی نہیں لیتے تھے اور لیتے بھی تو بہت معمولی۔ دوائیاں اکثر مفت مل جاتیں یا بہت ہی رعایتی داموں پر۔ لیکن بابوجی کی صحت دن بدن گرتی چلی جا رہی تھی۔ اب وہ باتھ روم تک جانے کے لیے بھی معذور تھے۔ گھر میں بیڈ پین اور پیشاب کے لیے صراحی دار برتن آ چکے تھے۔ میز پر بڑھتی ہوئی دوائیاں تیج کے رسوخ کی نشاندہی زیادہ کرتیں اور بابوجی کی بیماری کے افاقے کی کم۔

اندر کا معمول اب دفتر کو جاتے آتے معمولی سی حاضری دینے پر موقوف رہ گیا تھا۔ ساوتری کو بھی اب اِدھر اُدھر کے کام زیادہ سوجھنے لگے تھے۔ تیج اب پھر معمول کی طرح لمبے لمبے دوروں پر رہنے لگا تھا۔ سنگیتا اب پڑوس کی ہم عمر سہیلیوں اور اپنی ناولوں میں کچھ زیادہ ہی مصروف رہنے لگی تھی۔ کوشلیا اب بھی سارا دن بابوجی کے پاس بیٹھی رہتی۔ بابوجی کی نگاہیں تمام دن چھت کی سفیدی میں کچھ ڈھونڈا کرتیں۔ جب کہ کوشلیا اور بہوؤں کو اس سفیدی میں کچھ بھی نظر نہ آتا۔ بنٹی اب بھی اُن کے بستر کے پاس کھڑا ہوتا لیکن بابوجی کی نگاہیں اب بنٹی کی طرف کم ہی اُٹھتیں۔ بنٹی اِس صورتِ حال کو سمجھ نہ پاتا۔ ان کی نگاہیں اپنی طرف متوجہ نہ پا کر اُس کی تشفی نہ ہوتی اب وہ ماں اور دادی سے پوچھنے لگا تھا "بابوجی کو کیا ہو گیا ہے؟"

شروع شروع میں تو بابوجی کے کپڑے باقی لوگوں کی طرح ملازمہ دھویا کرتی تھی۔ لیکن اب وہ اُن کے گندے کپڑوں کو ہاتھ نہ لگاتی۔ اب کوشلیا کے لیے اِن کپڑوں کو خود دھونے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ جہاں پہلے لڑکے اور بہوئیں اُس کے ہر کام میں ہاتھ بٹا دیتی تھیں اب کوشلیا کو محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اکیلی ہوتی جا رہی ہو! بابوجی کی بیماری اب باقی لوگوں کے لیے ایک معمول بن کر رہ گئی تھی۔

ایک دن تو بابوجی کی حالت بالکل غیر ہو گئی تھی۔ اُن کا سانس بے قاعدگی سے آنے لگا تھا۔ فوراً ڈاکٹر بلوایا گیا۔ اتفاق سے تیج گھر میں موجود تھا۔ اندر بھی بینک سے آ گیا تھا۔ ڈاکٹر نے بابوجی کو جلد از جلد ہسپتال لے جانے کا مشورہ دیا۔ پڑوس کی ایک کار میں بابوجی کو ڈال کر ہسپتال پہنچا یا گیا جہاں اُنہیں فوراً آکسیجن دی گئی۔ اُن کا دوسرا حصہ بھی مفلوج ہو چکا تھا۔ آکسیجن دیر سے ملنے کی وجہ سے اُن پر بہت بڑا اثر پڑا تھا۔ اور اب اُن کے ہلنے جُلنے، بولنے تک کی طاقت ختم ہو چکی تھی۔ ڈاکٹروں نے اُنہیں کسی نرسنگ ہوم میں رکھنے کا مشورہ دیا۔ اگرچہ اُنہیں ابھی مسلسل طبی امداد کی ضرورت تھی لیکن ہسپتال کی سہولتیں دیگر مریضوں کے لئے زیادہ سود مند تھیں۔

اب سوال نرسنگ ہوم کے بھاری اخراجات کا تھا۔ کوشلیا کی لاچار نظروں نے اِندر اور تیج کی طرف دیکھا۔ اُنہوں نے ماں کو یقین دلایا کہ پیسے سے زیادہ بابوجی کی زندگی قیمتی ہے۔ لیکن آٹھ دس روز ہی نرسنگ ہوم میں رہنے کے بعد اُنہیں احساس ہوا کہ وہ دونوں مل کر بھی یہ مالی بوجھ اُٹھانے کے قابل نہیں ہیں۔ حالانکہ تیج کے ذاتی رسوخ کی وجہ سے اُنہیں نرسنگ ہوم کا صرف نصف خرچ ہی دینا پڑ رہا تھا۔ ڈاکٹروں سے پھر مشورہ کیا گیا اور انہوں نے مریض کو گھر لے جانے کی اجازت دے دی۔ چوں کہ مریض صرف آکسیجن پر ہی زندہ تھا۔ گھر میں آکسیجن کے استعمال کے لئے نرسوں کا کا اہتمام ضروری تھا۔

بابوجی آکسیجن کے سلنڈروں سمیت گھر لائے گئے۔ نلکیوں کے جال میں گھرے۔ وہ ایک زندہ لاش بن کر رہ گئے تھے۔ اُن کے جسم میں تحلیل شدہ خوراک پہنچتی رہتی۔ اور آکسیجن کی بدولت سانس چلتا رہا۔ نرسیں صبح شام آتیں، ڈیوٹی دے کر چلی جاتیں، اخراجات کا میٹر اگرچہ اتنی تیزی سے تو نہ چل رہا تھا لیکن پھر بھی اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔ گھر والوں نے کم عرصہ میں ہی سلنڈر بدلنے کی ترکیب اور تیمارداری کے مطلوبہ فرائض سمجھ لئے لیکن پھر بھی ایک نرس کا ہونا بہت ضروری تھا۔

بابوجی کی حالت میں سُدھار کا سوال تو پیدا ہی نہ ہوتا تھا۔ لیکن سوال تھا آخر کب تک؟ ڈاکٹر اُنہیں انسانی فرائض کی تکمیل کے لیے کہتے۔ کیا معلوم کوئی ایسی دوا ایجاد ہو جائے یا کوئی ایسا علاج نکل آئے جو مریضوں کے لئے مسیحائی پیغام لے آئے۔ وہ روز ڈاکٹروں سے پوچھتے تازہ میڈیکل جرنل کھنگالتے۔ کبھی کوئی ڈاکٹر کسی نئی دوا کا مشورہ دیتے ایک نئی امید کے ساتھ اِن دوائیوں کا استعمال کیا جاتا لیکن بابوجی کی حالت میں کوئی نمایاں فرق نہ پڑتا۔

سیلنڈر، دوائیں، دیکھ بھال اور نرس کا خرچ گھر کی سالوں سال کی بچت کو چاٹ گیا۔ بینک میں کام کرنے کی وجہ سے باقاعدہ کتاب کی حس کے مارے، اِندر کا جی تو دو بھر رہتا۔ اُس کا ذہن زندگی سے [illegible] نقصان کے بارے میں سوچتا رہتا ایسی زندگی سے کیا فائدہ۔ اور یہ [illegible] تک؟ اندر کبھی کبھی سوال کر بیٹھتا۔

مرنا جینا تو بھگوان کے ہاتھ ہے! شاید اُن کے زندہ رہنے ہی میں کوئی اچھائی کا پہلو ہوگا۔ کوشلیا کہتی ۔

"اچھائی کا پہلو ؟ سوائے یہ کہ گھر کی ہر چیز بک جائے ! ہم سب کنگال ہو جائیں! اندر کہتا ۔

ایسا ہی وقت تو آزمائش کا وقت ہوتا ہے! کوشلیا کہتی۔ لیکن پھر وہ دل میں سوچتی۔ نہ جانے اُن سب کو کس پچھلے جنم کی سزا مل رہی ہے ۔ وہ تو بھی حالات اور زندگی سے لڑتے جھوجھتے، تھک کر چور ہو چکی تھی!

گھر میں ایسی کہانیاں بھی دہرائی جانے لگیں جن میں بابو جی کی حالت میں پڑے ہوئے بے سدھ لوگ سالوں جیتے ہیں۔ مسلسل ایک ہی حالت میں رہنے کی وجہ سے ان کی ضروریات بھی نہ ہونے کے برابر رہ جاتی ہیں۔ جس کی وجہ سے زندگی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ آخر اس کا حل کیا تھا۔ ؟

کوشلیا بیٹھی بیٹھی بابو جی کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی۔ بابو جی نلکیوں کے جنگل میں گھرے تھے۔ یہ خوراک کی نلکی تھی۔ یہ آکسیجن کی، اگر بابو جی کو خوراک نہ ملے تو شاید وہ اور بھی کمزور ہو جائیں گے وہ پہلے ہی ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئے تھے ، اور اگر انہیں آکسیجن نہ ملے تو .... وہ سوچ سوچ کر لرز جاتی۔

مریض اور بستر کا رشتہ بھی اتنا اٹوٹ ہوتا ہے ۔ بستر اِن گنی چنی چیزوں میں سے ایک ہے جو جنم سے مرن تک انسان کا ساتھ دیتا ہے۔ لیکن یہ چوبیس گھنٹے کا ناطہ ؟ کیا بابو جی خود بھی اس سے نہ اکتا گئے ہوں گے۔ رام جانے ان کے من کے بھیتر کتنی کشمکش کتنی بے چینی ہوگی ؟

• وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگی۔ ہے بھگوان! اب ان کی آزمائش کا وقت ختم کر! انہیں اب زندگی سے موکش دلا ۔ گھر کے ماحول پر اُداسی ۔۔۔ میں جم گئی تھیں منہ سے اگر آواز نکلتی بھی تو بے جان سرگوشی بن کر! گھر پر جیسے موت کے سایوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ ایسے ماحول میں کبھی کبھار گھر کی چار دیواری سے باہر ۔۔۔ منٹو کی شوخ آواز سنائی دیتی لیکن دہلیز پار کرتے ہی اُس کی آواز بھی سہم جاتی۔ وہ اب بھی روزانہ بابو جی کو دیکھنے کمرے میں چلا آتا ۔

"دادی جی ! دادی جی ! بابو جی میرے ساتھ کب کھیلیں گے ؟ "

"جب وہ اچھے ہو جائیں گے! کوشلیا نے جواب دیا۔

"وہ کب اچھے ہو جائیں گے ؟" ننھے سے دماغ نے سوال کیا

"جب اُن کے مُنہ اور ناک سے نلکیاں اُتر جائیں گی ۔

"اچھا" وہ حیرت سے دادی کی طرف دیکھتا رہا ۔

کوشلیا پانی پینے کے لئے رسوئی چلی گئی۔ واپس آئی تو دیکھا بابو جی کے منہ اور ناک سے نلکیاں الگ ۔۔۔ ہو کر جھول رہی تھیں ۔ اور ان کی گردن ایک طرف لڑھک گئی تھی ۔

ننھا منٹو ۔۔۔ تالیاں بجا بجا کر کہہ رہا تھا "دادی جی ! میں نے بابو جی کی نلکیاں اُتار دی ہیں۔ اب وہ اچھے ہو جائیں گے ۔ اچھے ہو جائیں گے !"

کوشلیا کے لب حرکت کرتے کرتے رہ گئے ۔ وہ ایک پل کے لئے سوچنے لگی ۔ آخر منٹو نے ایسا کیوں کیا ؟ اُس کے ذہن میں اچانک یہ سوال اُبھر آیا پھر اس نے اپنی سوچ پر تیزی سے گرفت کرتے ہوئے اپنے ذہن کی تہوں میں اس سوال کو اتار دیا کبھی کبھی جواب بھی تو سوال پر بھاری ہو جایا کرتے ہیں ۔

## بقیہ شکایت صفحہ ۴۰

کے خلاف شکایت درج کروائی ہے۔ وہ بے زبان ہوا تو کیا، زندگی کا شعور تو رکھتا ہے۔ جہاں زندگی کا شعور ہے وہاں فرد، بھائی اور اپنے مقاصد کی خاطر ایسا رویہ جو آج جانوروں علاموں کے ساتھ روا رکھا جاتا تھا ناقابل قبول ہے۔

اچانک ٹرک کے پیچھے رشمی سی کسمساہٹ پیدا ہوئی۔ اس کے ہاتھ بھینچ گئے۔ اس کے ابروؤں پر خم اور آنکھوں میں چمک آئی اور وہ بولا

"اس کتے کا رنگ کالا ہے سر!" "رنگ سے کوئی فرق نہیں پڑتا"

"اس لیے زبان نے بہت سے ۔ ماں والوں کے ساتھ دوڑ لگا رکھی ہے انعام بھی لیا ہے اس کتے کا نام اب سب جانتے ہیں سر۔ بلائی کے خلاف شکایت کرنے والے کتے کا نام ٹومی ہے سر! ڈی ٹومی سر!"

لیکن بیلی ووں کے اس کنارے پر سمجھنے تک کہاں ۔۔۔ !!!

## بقیہ ہم عصر ادبی مسائل صفحہ ۳۷

۔۔۔ ابلاغ کو پھر ایک مرتبہ CULT کا درجہ ملتا جا رہا ہے۔ خواہ اسے تیسری دنیا کا نام دیں یا تیسری آواز کا درجہ عطا کریں یا کچھ اور کہہ لیں۔ سرد جنگ ایک نئے دور میں داخل ہوتی جا رہی ہے ۔ کیونکہ انسانی وجود کی اہمیت کا مسئلہ یا انسان اور کائنات کے رشتے کا تعین کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے۔ آج کا انسان حق کی ابدی تلاش میں سرگرداں ہے اور زندگی کا پُرمعنی اور بامقصد ہونا اس کے لئے اہم ہے۔ آج کا ادیب ادب کی تخلیق صرف تخلیقی کرب سے نجات پانے کے لئے نہیں بلکہ حال سے ٹکرانے کے لیے کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تخلیق ان بنیادی مسائل اور بنیادی ضرورتوں کی کوکھ سے جنم لینے والی سچائیاں کروٹیں لے رہی ہیں۔ !

## شان الحق حقی

فتنے جو کئی شکل کرشمات اٹھے ہیں
کچھ دل میں انوکھے سے خیالات اٹھے ہیں

محفل میں وہ جب بہرِ ملاقات اٹھے ہیں
ہم ازسرِ کرتے ہوئے کچھ بات اٹھے ہیں

آندھی تو ابھی صحنِ چمن تک نہیں پہنچی
اک جھونکے سے سوکھے ہوئے کچھ پات اٹھے ہیں

ہر پھر کے وہی سامنے تھا پردۂ اوہام
کہنے ہی کو آنکھوں سے حجابات اٹھے ہیں

من مست ہیں اس طرح رواں نفس کے پیچھے
سر کرنے کو گویا کہ مہمات اٹھے ہیں

اے شیخ نہ یہ کفر نہ فتنہ ہے نہ شر ہے
اک ہم بھی سنانے کو ہی بات اٹھے ہیں

سیرابیِ جاں دیکھ کہ ہم بزم سے اس کی
آنکھوں میں بسائے ہوئے برسات اٹھے ہیں

● ۱-۱۰-اے، خیابانِ تنظیم، ڈیفینس سوسائٹی،
کراچی، پاکستان)

## پرکاش فکری

یہاں دشت و صحرا کا منظر نہ تھا
یہی شہر اپنا تھا، بنجر نہ تھا

طلب میرے ہاتھوں کی پیاسی رہی
درختوں میں کوئی ثمر ور نہ تھا

کسک اپنی یادوں کی دے کر گیا
جو لوحِ جہاں پہ مکرر نہ تھا

سدا پاؤں نیچے زمیں تو رہی
مگر آسماں سر پہ اکثر نہ تھا

جگر پتھروں کا جو پانی کرے
مرا غم کبھی اس برابر نہ تھا

کبھی اپنے دکھ سے تھے اٹھائے ہوئے
یہ بارِ گراں اک مجھی پر نہ تھا

سنا: لوگ فکری یہ کہنے لگے
تو سب کچھ تھا لیکن سخنور نہ تھا

● پرانی ٹولی، ڈورنڈہ، رانچی، بہار)

## راغب مرادآبادی

عجب انتشار ہے زمیں سے آسماں تک
غبار ہی غبار ہے زمیں سے آسماں تک

وبائیں، قحط، زلزلے، لپک رہے ہیں پے بہ پے
یہ کس کا اقتدار ہے زمیں سے آسماں تک

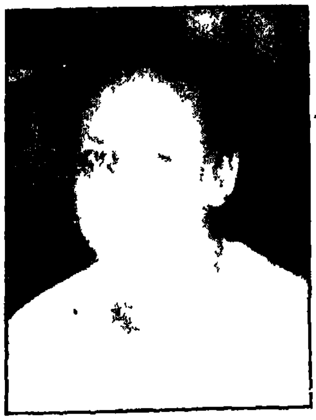
بساطِ خاک بھی تپاں، خلا بھی ہے دھواں دھواں
بس اک عذابِ نار ہے زمیں سے آسماں تک

گرفتِ پنجۂ فنا میں خستہ حال و خوں چکاں
حیاتِ مستعار ہے زمیں سے آسماں تک

فغان و اشک و آہ کا جگر گداز سلسلہ
بلطفِ کردگار ہے زمیں سے آسماں تک

متاعِ جبرِ زندگی ہمیں بھی جس نے کی عطا
اسی کا اختیار ہے زمیں سے آسماں تک

فرازِ عرش کے مکیں شکستہ دل ہمیں نہیں
ہر ایک بے قرار ہے زمیں سے آسماں تک



ندا فاضلی
۱۰۳- امر اپارٹمنٹ، ڈانڈ پاڑہ - ۱۱ کھار (ویسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۵۲

# دیواروں کے بیچ

## قسط نمبر ۵

بکرے کا خون اس نے کئی بار دیکھا ہے۔ اس خون کی دہشت کو مذہبی حکایات نے کم کر دیا ہے۔ ۔ قربانی کا بکرا، روز محشر تلوار کی دھار سے تیز اور بال سے باریک پل صراط پر قربانی کرنے والے کی سواری بنے گا۔ اسی لئے تو چھانٹ کر تندرست اور بڑے بکرے کو قربانی کے لئے منتخب کیا جاتا ہے۔ بکرے کو حلال کرنے کی ہدایتیں لکھی ہیں چھری کو پتھر پر گھس کر پہلے تیز کر لیا جاتا ہے۔ کند چھری سے بکرے کو زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ حلال کرنے سے پہلے اس کی بھوک پیاس کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ بھوکے پیاسے بکرے کی قربانی قبول نہیں ہوتی۔!!

لیکن آدمی کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہے۔ آدمی کے بدن سے پھوٹتے خون نے ندا کو بری طرح ڈرا دیا ہے.. وہ بخار میں مبتلا ہو کر سوتے سوتے اچانک چونک جاتا ہے۔

دن جمعہ کا ہے۔ جمیل فاطمہ نے اسی روایت سے منٹوں کو شہادت سے سرفراز فرما کر اسے سیدھا جنت میں بھیج دیا ہے۔ وہ مقدس دن شہید ہوئے ہیں اور شہید ہمیشہ حیات رہتے ہیں۔ وہ کبھی مرتے نہیں ہیں۔

شام کو رام نارائن آتے ہیں۔ وہ آتے کچھ چپ چپ سے ہیں۔ ان کے ماتھے پر شکنیں ہیں اور آنکھیں کھوئی ہوئی سی ہیں۔ وہ مرتضیٰ حسن سے سنجیدگی سے کہتے ہیں۔

"شہر کی فضا بہت خراب ہے۔ ایسا کرو تم دو چار دن کے لئے ان بچوں کو کسی مسلمان آبادی کے علاقے میں منتقل کر دو۔"

"مسلمان آبادی سے کیا مطلب ہے تمھارا.... رام نارائن تم جانتے ہو میں اس بھید بھاؤ کو نہیں مانتا" "میرے تمہارے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے ہم سب سیاستوں کی کٹھ پتلیاں ہیں۔ رام نارائن ہندو ہے وہ مسلمانوں کا دشمن ہے اور مرتضیٰ حسن نام سے مسلمان ہے جو ہندوستان کا دشمن ہے..." رام نارائن جی نے غصہ سے کانپتے ہوئے کہا۔

دوسرے دن مرتضیٰ حسن کا خاندان ایک حویلی میں پناہ گزیں ہو جاتا ہے۔ اس حویلی میں بھیڑ بکریوں کی طرح بہت سے لوگ بھرے ہیں۔ جمیل فاطمہ نے مکان چھوڑتے وقت جو تالا ڈالا تھا وہ ان کے جاتے ہی توڑ دیا جاتا ہے۔ کئی لوگ ایک ساتھ مکان میں گھستے ہیں اور جس کے جو ہاتھ لگتا ہے لے جاتا ہے۔

حویلی کی رات ڈراؤنی اور خاموش ہے۔ رات بھر ایک طرف سے ہر ہر مہادیو کا نعرہ گونجتا ہے تو کچھ دیر بعد دوسری طرف سے اللہ اکبر کا شور اٹھتا ہے۔ ان کو سن کر عورتیں خاموش ہو جاتی ہیں اور بچے سہم کر اپنی ماؤں کے قریب ہو جاتے ہیں۔

بخاری جی کے ہر ہر مہادیو اور ملا جی کے اللہ اکبر کے الفاظ آج ان اجنبی آوازوں میں گالیاں بن گئے ہیں۔ یہ اسی طرح گھناؤنے لگتے ہیں جس طرح رام بائی کی گالیاں ندا کے منہ میں فحش ہو گئی تھیں۔ لگتا ہے یہ لوگ بس ان لفظوں کو دہرا کر کوئی گناہ کر رہے ہیں۔ جس کی سزا میں ان کی مائیں بھی ماری جائیں گی اور بچوں کے پیٹ سلائیں گی بھی.....

بچپن کی سوچ صحیح ثابت ہوتی ہے۔ آسمان سے بلائیں اترتی ہیں اور دیکھتے دیکھتے ساری بستی ویران ہو جاتی ہے۔

نواب حمید اللہ خاں کا بھوپال: ایک لنگڑاتے بچّے کی طرح کسی اونچے ٹیلے پر کھڑا گہرے تالابوں میں پتھر پھینک رہا ہے۔ ان پتھروں سے نہ پانی کی سطح اونچی ہوتی ہے اور نہ اس کی پیاس بجھتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی لہریں ضرور ابھرتی ہیں لیکن پتھروں کے تلے میں اترتے تک پانی کا ٹھہراؤ انہیں پھر سے ہموار کر دیتا ہے۔ جب اس سعیٔ لاحاصل سے وہ تھک جاتا ہے تو لنگڑاتا ہوا چھوٹی بڑی گلیوں سے گزرتا ہوا کسی ایسی مسجد کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے جس میں میناروں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ مسجدیں تو کئی ہیں لیکن ان میں سے اکثر میں کبوتر، چڑیاں یا رسیوں سے بندھے بڑھے اپنی اپنی زبانوں میں عبادت کرتے رہتے ہیں۔

اللہ والے نماز سے فارغ ہو کر جب باہر نکلتے ہیں، تو اس کے ہاتھ میں بھی پیسہ دو پیسہ رکھ دیتے ہیں۔ اور اس طرح جو بھی اس کے ہاتھ لگتا ہے۔ اس سے روکھا سوکھا کھا کر کسی پیڑ سے ٹیک لگا کر وہ بیڑی سلگاتا ہے اور شعری بھوپالی کی غزل گنگناتا ہے ؎

ہمیں شام غم میں کاٹنی ہے زندگی اپنی     جہاں وہ ہوں وہیں اے چاند لے جا چاندنی اپنی

مسجد، تالاب، پتھر، غزل اور لنگڑاتے ہوئے بچّے کے اجزا سے بنا ہوا یہ شہر دن بھر اونگھتا ہے اور رات بھر جاگتا ہے۔ اس مسلسل اونگھ کو سائیکل کی گھنٹی، خدا رسول کے مقدس ناموں کے ساتھ، کوئی گالی یا بیچ چوراہے پر کسی کے بدن کی مالش کرتے ہوئے کسی مالشیے کا نعرہ 'یا علی' توڑتی ہیں کبھی، تھوڑا سا چونکاتا ہے تو عورتیں ٹاٹ کے پردوں کے پیچھے گلوریاں بنا کر چباتی ہیں اور گھر سے باہر جوا اٹھتی پختہ عمریں نو عمروں پر مہربانیاں لٹاتی ہیں۔

قرب و جوار کے اجڑے ہوئے مسلمان، ملکی تقسیم کا شکار ہو کر اپنے جان و مال کی حفاظت کے لیے یہاں آئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کو تقسیم ملک کے رہنماؤں کے نام بھی یاد نہیں ہیں۔ جو ہوا وہ کیوں ہوا یہ تجزیہ اُن کے دائرہ سے باہر ہے۔ جو ہو رہا ہے وہ بھی بھوک پیاس کی صورت ہی میں ان کا مسئلہ ہے۔ اور اس مسئلہ کا الجھاؤ ہی ان کا ہندوستان پاکستان ہے۔

ان کے لیے شہر سے کچھ دور ایک ویران علاقہ جس کا نام سٹّی گڈھ ہے صاف کرا دیا گیا ہے۔ یہاں پہلے انگریز چھاؤنی کا پڑاؤ تھا۔ چاروں طرف لال کھپریلوں کے کھلے کمرے پھیلے ہوئے ہیں۔ سارے ایک سے چہرے اور رقبوں کے ہیں۔ ہر کوارٹر میں دو گرہستیاں بسائی گئی ہیں۔ جو پہلے آئے ان کے سروں پر چھت ہے۔ بعد میں آنے والے میدان کے درختوں کی چھاؤں میں ڈیرہ ڈالے ہوئے ہیں۔ پورے علاقہ میں بجلی نہیں ہے۔ روشنی صرف رات میں کمروں میں موم بتی یا لالٹینوں سے ہوتی ہے۔ اور پانی باہر کے پبلک نلوں میں دو گھنٹوں کے لیے آتا ہے۔ صبح ہوتے ہی ہر نل پر عورتوں اور مردوں کی ایک لمبی قطار لگتی ہے لیکن تین چوتھائی قطار کے ختم ہونے سے پہلے ہی پانی نل سے رخصت ہو جاتا ہے۔ ہر روز جھنجھلاہٹیں، شور و غل اور ہاتھاپائی میں تبدیل ہوتی ہیں۔ اس شور و غل اور ہاتھاپائیوں سے سب ایک دوسرے کے حسب نسب سے واقف ہوتے رہتے ہیں۔ آٹے دال کی طرح پانی بھی آس پڑوس میں کٹوروں کے حساب کتاب سے لیا دیا جاتا ہے۔ روپے پیسے کے ادھار میں اوپر سود ممکن ہے لیکن پانی کا ادھار اچھے بھلے رشتوں میں دوریاں پیدا کر دیتا ہے۔

جمیل فاطمہ بھی انہیں مہاجرین میں اپنے بال بچوں کے ساتھ شامل ہیں۔ مرتضیٰ حسین گوالیار ہی میں ہیں وہ اپنے دوست رام نارائن کے گھر منتقل ہو گئے ہیں۔ سرکاری نوکری جان سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال کر بیوی بچوں کے لیے پیسے بھیجتے ہیں۔

جمیل فاطمہ کے ساتھ یہاں ان کے اپنے بچوں کے علاوہ ایک اٹھارہ انیس سال کا لڑکا بھی ہے۔ اس کا نام بابو ہے۔ گوالیار میں درزی کا کام کرتا تھا یہاں بھی وہی کرنے لگا ہے۔ بابو مرتضیٰ حسین کی شادی سے پہلے کی کسی بازاری آشنائی کی گواہی ہے۔ اس کی گواہ اب صرف اس کی ماں ہے۔ اس یک طرفہ گواہی نے اسے نہ صرف تعلیم سے دور کیا بلکہ ماں بیٹے کے رشتے میں بھی دراڑ ڈال دی ہے۔ اس کا ایک اور چھوٹا بھائی بھی ہے جو ماں کے ساتھ رہتا ہے مگر بابو میں ہوش سنبھالتے ہی ماں سے نفرت کرنے کا کمپلکس پیدا ہو گیا ہے۔ جمیل فاطمہ اور اس کے درمیان ایک خاموش دوری حائل ہے لیکن وہ انہیں اپنی ماں اور ان کے بچوں کو اپنے بہن بھائی ماننے پر بضد ہے۔ اسی ضد کی وجہ سے وہ اپنی ماں اور بھائی کو چھوڑ کر یہاں آیا ہے۔ گھر کے ہر کام کی ذمّہ داری اسی کے سر ہے۔ باہر سے پانی لانے سے راشن کا انتظام کرنے تک وہ گھر کی ضرورت بن چکا ہے۔ جمیل فاطمہ بات بے بات اس سے الجھ پڑتی ہیں لیکن وہ خاموشی سے اپنے فرض کی ادائیگی کرتا رہتا ہے۔

بابو جسمانی طور پر دبلا پتلا ہے۔ کبھی اکیلا ہوتا ہے تو بے تحاشہ کھانستا ہے یا دیوار پر چونے کے اکھڑے ہوئے نقوش کو گھورتا رہتا ہے وہ اپنی ضرورتیں خود پوری کرتا ہے۔ یہاں آتے ہی اس نے شہر میں کسی ٹیلر کے یہاں کام ڈھونڈ لیا ہے۔ صبح جلدی ہی ناشتہ کیے نکل جاتا ہے اور شام کو دن بھر کی محنت سے جو بھی ملتا ہے جمیل فاطمہ کے حوالے کر دیتا ہے۔ گھر کے چھوٹے بڑے کپڑے بھی وہ ہی سی کر لاتا ہے۔ کچھ دن بعد جب جمیل فاطمہ کے پاس اس کے دیے ہوئے روپیوں سے اچھی خاصی رقم بن جاتی ہے، تو ایک دن جمیل فاطمہ اس سے گوالیار میں اس کی ماں کو پیسے بھیجنے کو کہتی ہیں۔ وہ چپ چاپ سنتا ہے اور کام پر چلا جاتا

وقت نوٹ لے کر جیب میں رکھ لیتا ہے۔ لیکن جب شام کو واپس آتا ہے تو اس کے ہاتھ میں کچھ بنڈل ہوتے ہیں۔ ساڑی، چھوٹی قمیضوں اور کھلونوں کے پیکٹ اس نے ساری رقم گویا بار بھیجنے کے بجائے انہیں چیزوں پر خرچ کر دی تھی۔ ننھا فاضل اور دوسرے بچے بہت خوش ہیں۔ کھلونوں کی چھینا جھپٹی ہوتی ہے۔ وہ نام بہ نام سب کو چیزیں بانٹتا ہے لیکن جمیل فاطمہ کو یہ سب اچھا نہیں لگتا۔ وہ بابو کو بُری طرح پھٹکارنے لگتی ہیں۔ وہ خاموشی سے سنتا رہتا ہے۔ جمیل فاطمہ خود کلامی کے انداز میں کہہ رہی ہیں: "ماں کیسی بھی ہو اولاد کے لیے ایک نعمت ہے۔ آخر وہ تو جیسے پیٹ میں رکھتی ہے۔ دکھ درد سہتی ہے۔ ماں سے زیادہ اور کون رفیق ہوگا۔ جو اپنی ماں کا نہیں وہ اور کسی کا کیا ہوگا۔" وہ اس سے سارے سامان کو واپس کرنے اور پیسوں کو اپنی ماں کو بھیجنے کی تاکید کرتی ہیں۔

بابو کو پہلی بار غصہ آتا ہے۔ وہ جمیل فاطمہ کے سامنے کبھی سر بھی نہیں اٹھاتا تھا لیکن آج ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب میں آئے بولے جا رہا ہے۔

"ماں کیسی ماں، کس کی ماں۔ میں کسی طوائف کا بیٹا نہیں ہوں۔ مجھے پیدا کر کے اس نے جرم کیا ہے۔ دوسرے کی سزا میں کیوں بھگتوں۔ پیدا کر کے مجھے کیا دیا، اس نے، بدنامی، جہالت، بدقسمتی۔ میں بھی مصطفےٰ، معصومی کی طرح ہوں مگر گناہ ان سے ہم میں۔ میں بھی عزت سے جینا چاہتا ہوں اور آپ ہیں کہ . ."

بولتے بولتے اسے کھانسی کا دورہ پڑتا ہے اور اس کا گلا رندھ جاتا ہے۔ سارے ان کہے الفاظ اس کی آنکھوں میں آنسو بن کر ٹپکنا شروع ہو جاتے ہیں۔
وہ آنکھوں سے آنسو پونچھ کر بستر پر کروٹ لے کر لیٹ جاتا ہے۔ اور ضبط کرنے کے باوجود بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگتا ہے۔

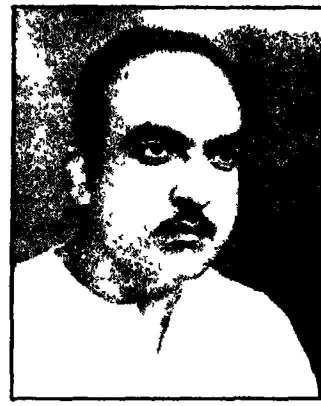
سارے بچے اسے اس حالت میں دیکھ کر اپنی اپنی جگہ سہم کر سمٹ جاتے ہیں۔ جمیل فاطمہ رونے کی آواز سن کر کچن کے باہر آتی ہیں اور شاید پہلی بار اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیتی ہیں۔ . . ! اور وہ اس ہاتھ کے لمس میں خاموشی سے روتے روتے بنا کھائے ہی سو جاتا ہے۔

کھانے کے وقت جب اسے جگایا جاتا ہے۔ تو وہ بھوک نہیں ہے کہہ کر کروٹ بدل لیتا ہے۔ جمیل فاطمہ جب اصرار کرتی ہیں تو وہ باہر سے کھا کے آنے کا بہانہ کر کے سو جاتا ہے۔

جمیل فاطمہ بچوں کو کھانا کھلانے کے بعد ایک بار سوئے ہوئے بابو کو دیکھتی ہیں اور پھر کچھ سوچتے ہوئے پائینتی پڑی چادر کھول کر اسے اوڑھا دیتی ہیں [illegible] کو لالٹین کی روشنی میں وہ مریضہ جس کے خط کا جواب لکھتی ہیں [illegible] کے بعد آخر میں ایک جملہ الگ سے بڑھا دیتی ہیں "بابو اچھا لڑکا ہے۔ گھر کا بہت خیال رکھتا ہے، کبھی کبھار اس کے نام بھی خط لکھ کر اس کی خیریت پوچھ لیا کیجئے۔"

میرا گڑھ کے غفورآباد علاقے میں [illegible] دنوں کے بعد [illegible] ہوتی ہے۔ [illegible] کی سرسراہٹوں سے گونجتے ہوئے ویران مکانوں کی شکل میں آدم زاد [illegible] پھیل رہی ہیں۔ آسمان کی اجلی نیلاہٹیں دھیمے دھیمے ماند پڑتی جا رہی ہیں [illegible] سے چڑیاں [illegible] رخصت ہو رہے ہیں اور رات میں [illegible] داخل ہو رہے ہیں۔ کونے کھدروں میں پڑی [illegible] ٹوٹی ہوئی چوڑیاں [illegible] کنگھوں میں الجھے ہوئے بال [illegible] نئی نئی کہانیاں سنا رہے ہیں لیکن [illegible] لوگوں کو [illegible] کی فرصت نہیں ہے۔ [illegible] اپنی اپنی الجھنوں میں الجھے ہوئے ہیں۔

ننھا فاضل اپنی ماں اور بھائیوں کے ساتھ جس کوارٹر میں ہے [illegible] سامنے ایک بڑا سا نیم کا درخت ہے۔ اس میں دن بھر جنگلی پرندے [illegible] رہتے ہیں۔ اس کا چہرہ مہرہ اور حلیہ گویا بار کے مکان کے [illegible] اپنی جگہ سے [illegible] یہاں آگئے [illegible] اس کا ذکر جب اپنی ماں سے کرتا ہے تو وہ مسکرانے لگتی ہیں [illegible] جب جو وہ ایک گھر چھوڑ کر دوسرے گھر میں [illegible] کی سمجھ میں نہیں آتی [illegible] طرح اس سے بزرگانہ شفقت سے پیش آتا ہے [illegible] بیٹوں کو یاد کرتا ہے تو اسی کی چھاؤں میں دیر تک بیٹھا رہتا ہے۔ [illegible]



## اقبال عزیز

تنگ رہی ہے آگ سی اندر تمام
ہو ہی جانا ہے مجھے جل کر تمام

آنکھ سے دل میں اتر آئی تپش
آگ کی تصویر ہیں منظر تمام

اندھی گلیوں کے مسافر بن گئے
کھو چکے بینائی دیدہ ور تمام

ہمتِ پرواز اب بھی دل میں ہے
لاکھ کوئی نوچ ڈالے پر تمام

گل کی مورت کو تراشیں کس طرح
بے ہنر ہیں وقت کے آذر تمام

رنگ بھر پائی نہ آنکھوں میں شفق
آج بھی صحرا گئے منظر تمام

● پیتی ٹریڈنگ کمپنی، ٹیلہ گاج سنگھ، ہینگ کی منڈی آگرہ (یوپی)

## فصیح اکمل

جڑوں سے سوکھتا تنہا شجر ہے
مرے اندر بھی اک پیاسا شجر ہے

ہزاروں آندھیاں جھیلی ہیں اس نے
زمیں تھامے ہوئے بوڑھا شجر ہے

پجاری جل چڑھا کر جا رہے ہیں
نگر میں دُکھ کے، سکھ داتا شجر ہے

مسافر اور پرندے جانتے ہیں
کہ ان کے واسطے کیا کیا شجر ہے

جو ہو فرصت تو اس کے پاس بیٹھو
قلندر ہے، ولی بابا شجر ہے

زمیں پر پیار تو زندہ ہے اس سے
ہم انسانوں سے تو اچھا شجر ہے

ہمارے شہر میں اکملؔ ابھی تک
محبت بانٹنے والا شجر ہے

● ۱۱۸ سلمیٰ منزل، کولی واڑہ، وسئی، ڈسٹرکٹ تھانہ (مہاراشٹر)

## اعجاز ....



خواہشیں اپنی سرابوں میں نہ رکھے کوئی
ان ہواؤں کو حبابوں میں نہ رکھے کوئی

چند لمحوں کا یہ جینا ہے غنیمت جانو
زندگی اپنی عذابوں میں نہ رکھے کوئی

آج ہر فرد ہے اک حسرتِ تعبیر لئے
اب خیالات کو خوابوں میں نہ رکھے کوئی

کام تحقیق کے عنواں پہ بڑھے گا کیسے
گر سوالوں کو جوابوں میں نہ رکھے کوئی

یہ بھی کیا ضد ہے کہ کانٹوں کو مہکنے دیجے
یعنی خوشبو کو گلابوں میں نہ رکھے کوئی

نیکیاں کتنی ہیں اعجازؔ حصارِ دل میں
خوبیاں ہوں تو خرابوں میں نہ رکھے کوئی

● مومن پورہ۔ اکولہ (مہاراشٹر)



مناظر عاشق ہرگانوی
مارواڑی کالج، بھاگلپور - ۷ (بہار)

# ہم عصر ادبی مسائل

ہر عصر اور ہر دور کے اپنے تقاضے اور منفرد رجحانات ہوتے ہیں۔ یہ رجحانات اور تقاضے اپنے دور کے ادیبوں کی سوچ اور فکر پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کے شہ پاروں میں بھرپور اظہار پاتے ہیں۔

ہم عصر ادب زندگی کے نشیب و فراز اور قدروں کی شکست و ریخت کے تابع ہوتا ہے اور اس کا رشتہ اشیاء اور فرد سے براہِ راست ہے اسی لیے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

اور چونکہ اشیاء سے فرد کا رشتہ گویا طبعی کائنات سے اس کے رشتے کا امین ہے اس لیے اس کا اثر انسانی ذہن پر پڑتا ہے۔

کائنات کی تفہیم، ذات کی تلاش، فرد کے مقام کا تعین اور ماضی و حال کی روشنی میں ایک بہتر مستقبل کا خاکہ ترتیب دینے کی کوشش، عالمی کلچر کے تناظر میں ابھرنے والے ہم عصر ادبی مسائل کی بازیافت ہے جس کے تحت ٹوٹتے بکھرتے معاشرے کے مقابل ایک پائیدار اور محکم انسانی معاشرے کا وجود ممکن ہو سکتا ہے۔

آج کی پگھلتی کائنات کا جو منظر نامہ ہمارے سامنے ہے اس سے تہذیبی اور سماجی مسائل پر غور و فکر کرنے کی تحریک ملتی ہے۔ اور یہ تحریک ادب کے راستے سے بھی ہمارے سامنے آتی ہے۔ لیکن تہذیب و ثقافت دراصل کسی قوم یا ملک کے تخلیقی اظہار کا وہ عمل ہوتا ہے جس سے ادب ہی نہیں فلسفہ و معاشرتی علوم کے واسطے سے کبھی موسیقی اور مصوری کے روپ میں، کبھی فن تعمیر میں اور کبھی دستکاریوں اور رہن سہن کے انداز سے مزاج کا تعین ہوتا ہے۔ مگر آج تہذیب کو سنوارنے اور بنانے والی قوتیں ایک انتشار اور تہذیب و ثقافت کے حالات ایک بے یقینی کے عالم میں ہیں۔ اس کا اثر ادب پر بھی پڑا ہے۔ ادب و فن اور اہل علم و فن ایک عجیب کسمپرسی کے عالم میں ہیں۔ ترجیحات اس طرح گڈ مڈ ہو گئی ہیں کہ آگے کی چیزیں پیچھے اور پیچھے کی آگے چلی گئی ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ آج ادب کے مسائل ایک طرف بڑے لطیف، باریک اور گریز پا ہیں تو دوسری طرف بڑے پیچیدہ اور پہلو دار بھی ہو گئے ہیں۔ ادب کا تعلق دراصل زندگی سے ہے اور یہ تعلق بہت ہی گہرا اور اٹوٹ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ادب زندگی سے ہی عبارت ہے۔ ادب اور زندگی آپس میں اس قدر مربوط و مشروط ہیں کہ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور ممکن نہیں ہے۔ اگر یوں کہا جائے کہ ادب زندگی کی مقتضیات میں سے ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ اور جب یہ دونوں لازم و ملزوم ٹھہرے تو بے شمار مسائل کا سر اٹھانا لازمی ہے۔ آج کی زندگی زیادہ متنوع اور ہمہ گیر ہو گئی ہے۔ سماجی نظام میں پھیلاؤ پیدا ہو گیا ہے، معاشرے کی حدود وسعت پذیر ہو گئی ہے۔ انسانی زندگی صرف عالم رنگ و بو پر ہی قانع نہیں رہی بلکہ اب اس کے سامنے آسمان اور بھی ہیں۔ ایسے میں بنیادی مسائل کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج زندگی میں معاشرتی اور اخلاقی تصادم اور پیکار جاری ہے اور اجتماعی نظام اور شخصی کردار میں اندرونی تناقضات بڑھتے جا رہے ہیں۔ ہم عصر ادیبوں کی زیادہ تعداد عدم واضح انتشار اور پراگندگی میں نظر آ رہی ہے۔ ان کے خیالات پریشان اور گڈ مڈ ہیں۔ دراصل آج انسان فرد موجود نہیں بلکہ تنے تنہا محض ہو گیا ہے۔ سماج کی تبدیلی کو سمجھنے کا یہ مابعد الطبیعاتی نقطۂ نظر ہے جو سماج اور انسان، اور سماج اور فن کے درمیان کشاکش کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ کشاکش موجود بالذات نہیں بلکہ دراصل خود آج کی سماجی کشاکش کا ہی ایک پہلو ہے۔ یعنی آج کا انسان سماجی کشاکش میں فن کو اور سماج سے حسن کو حقیقت

سے نا آہنگ پاتا اور محسوس کرتا ہے۔ اور آج کا فنکار ہر قسم کی وابستگی سے آزاد ہو کر FORMALISM کا دعویٰ کرنے لگا ہے۔ اور اس کی فکر میں زوال و انتشار اور قنوطیت اور کلبیت پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن غور و فکر کی یہ خاص سطح مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہے۔

فیوچر شاک کے حوالے سے راشد شاذ نے رشتوں کی تفہیم کا مسئلہ یوں بیان کیا ہے کہ ہمارا عہد PROCESS کی تکمیل، بلندیوں کے امکانات اور تیز رفتاری کی سطحوں پر ماضی سے قطعی مختلف ہے۔ معاشرے کی سطح پر ان امور کو زیادہ واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے درمیان ایک ایسی معاشرہ غیر محسوس طور پر پرورش پا رہا ہے۔ معاشرے اور کائنات کے علاوہ ذات کی سطح پر بھی اس عمل کو محسوس کیا جانا ضروری ہے۔ اس لیے کہ اس کی تحقیق و تفتیش سے رازہائے معانی کے اپنے پردے اٹھائے جا سکتے ہیں جن پر عقلی دلائل کے ساتھ بات کرنا بھی ممکن نہیں۔ AUTOMATION بذات خود انسانی تاریخ میں ایک بڑی تبدیلی کی علامت ہے مسئلہ خواہ اس پیچیدہ کائنات کا ہو یا مخصوص معاشرے کا، اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ تبدیلیوں کی مختلف کیفیت ان کے پہلو بہ پہلو موجود ہے۔ اس حقیقت کے ادراک کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم محض سنئے کا وجود ڈھونڈنے کے بجائے ہماری نگاہیں وجود کے مختلف زاویوں سے بھی آشنا ہوں۔ یہاں یہ بنیادی سوال بھی سامنے آتا ہے کہ واقعی تبدیلی ہے کیا؟ اس دوڑتی بھاگتی کائنات میں کسی سکونی لمحے کی دریافت کے بغیر اس حقیقت کا ادراک کیسے ممکن ہے؟

کمپیوٹر کی جدید تکنیک اور مختلف میدانوں میں اس کی بیش بہا کامیابیوں نے کائنات اور انسان کے درمیان پیدا شدہ رشتوں اور کائنات کے مختلف ابواب میں انسانی رویّوں کو بھی بُری طرح متاثر کیا ہے۔ کیا انسان بھی دوسری اشیاء کی طرح اس وسیع کائنات کا محض حصّہ ہے؟ اس کی نفسیات، اس کی ساخت، اس کی یادداشت اور دوسرے طریقۂ کار کیا کسی مشین کی طرح بندھے ٹکے ہیں؟ یہ معروضہ اور کائنات میں انسان کی حیثیت سے متعلق بنیادی سوالات بھی ابھی حل طلب ہیں۔

کرۂ ارض پر رہنے والی مخلوق کے درمیان تقسیم CLASSIFICATION کا عمل صرف رنگ، نسل، قوم، مذہب یا نظریے کی بنیاد پر ہی نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان کے درمیان انفرادی شناخت کے لیے مخصوص گروہ یا فرد کو اس کے سماجی اور تہذیبی پس منظر میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ شناخت کا یہ طریقۂ کار اس لیے بھی اہم ہے کہ اس کے بغیر دو گروہوں کا تقابلی مطالعہ (جسے صحیح معنوں میں تقابلی مطالعہ کہا جا سکے) ممکن نہیں۔ اس مسئلے کو "نئے فرد" کے تناظر میں بھی حل نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ اس کے نزدیک زندگی کی اہمیت اور اس کی قدر و قیمت ایک ٹریڈ مارک سے زیادہ نہیں اور جسے بغیر سمجھے بوجھے استعمال کیے جانے کا رواج عام ہے۔

تغیر ہماری زندگی میں ایک نئے عمل کا علامیہ بن چکا ہے، جس کے نتیجے میں ہمارے اندر غیر مستقلیت کا ایک نیا مزاج پیدا ہوا ہے۔ بلاشبہ یہ حقیقت بہت پہلے تسلیم کر لی گئی تھی۔ دانشوروں، ادیبوں اور مذہبی رہنماؤں نے تغیر کو انسانی فطرت کا خاصا بتایا تھا لیکن آج تغیر کا یہ عمل محسوس کی جانے والی مخصوص سطح سے بہت آگے جا چکا ہے۔ اس کے نتیجے میں ہمارا معاشرہ گھر کے سے سکون سے خالی ہو گیا ہے۔ انفرادی شناخت کی عدم زندگی کا یہ عالم ہے کہ ہر ڈرائنگ روم اور ہر محفلِ رقص و سرود میں پائی جانے والی شخصیت ایک سی معلوم ہونے لگی ہے جبکہ ہر لمحہ اپنے اردگرد کے نظامِ روحانی ارتقا پر شدّت سے ضرب لگا رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم غیر مستقلیت IMPERMANENCE کی ایک مخصوص فضا میں سانس لے رہے ہیں جہاں کسی بھی مسئلے پر اعتماد کے ساتھ گفتگو کرنا نہ صرف یہ کہ مشکل ہے بلکہ پیغمبرانہ بصیرت کے ساتھ بھی کوئی نتیجہ خیز گفتگو ممکن ہی نہیں۔

ہم عصر ادبی مسائل کے چند اہم نکتے کی نشاندہی ہم یوں کر سکتے ہیں کہ:

خواہشوں میں فوری تبدیلی اور پسند و ناپسند میں ترجیح کے فوری اقدامات نے ہماری زندگی کے بنیادی طریقۂ کار کو بری طرح متاثر کیا ہے۔

ہم لاشعوری طور پر ایک ایسے معاشرے کا مقابلہ کر رہے ہیں جہاں اشیاء سے ہمارا رشتہ چند لمحوں سے زیادہ نہیں رہ پاتا۔

آج ادب کا ایک بڑا حصہ سماجی اور نسلیاتی ہر دو اعتبار سے بیگانویت کی فلسفیانہ اساس تلاش کرنے میں مصروف ہے۔
زندگی کا بنیادی تصور اوجھل ہو گیا ہے۔ زندگی کی طرف فرد کا رویہ کسی گمراہ ذہن کا علامیہ بن گیا ہے۔
علامتی پیکروں کے ساتھ فرد کا تعلق عارضی ہوتا جا رہا ہے۔
معاشرے میں ہونے والی ہمہ وقتی تبدیلیاں، حقیقت اور مفروضے کے درمیان مانے جانے والے خلا میں مزید اضافہ کر رہی ہے۔
حقیقت کو محض ایک دھوکہ قرار دینا، اس سے فرار کے لیے منشیات کا بے پناہ استعمال، علوم مخفی کے بے پناہ شوق اور حقیقت کی تلاش کے لیے خطرناک سے خطرناک تجربات سے گزرنے کا عمل جاری ہے۔
نئی ابلاغ کا نعرہ بلند کر کے قاری کو مسترد کر دیا گیا ہے۔
نئی لسانی تشکیلات کے نام پر اسلوب میں استحسان کو فروغ دیا گیا ہے۔
اسی ذات میں خود ہی انجمن بن کر معاشرہ سے جذباتی رشتہ منقطع کرنے کا CULT عام کیا گیا ہے۔
استعارہ اور علامت کو آرائش اسلوب کے درجہ سے بلند کر کے انہیں موضوع کا منصب دیا گیا ہے۔
یہی وجہ ہے کہ آج تہذیبی رشتہ ایک دوسرے سے بے تعلق ہو کر تنکوں کی طرح بکھرنے لگا ہے۔
اخلاق و فکر کی مروجہ اقدار میں بدلتے زمانے اور اس کے نئے تقاضوں کا ساتھ دینے کی قوت باقی نہیں رہی ہے۔
معاشرے کی خواہشات اور ضروریات اسے قدیم تہذیبی اداروں سے متصادم ہونے لگی ہیں۔
اس صورت حال نے زندگی کی ہر سطح پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں جن کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے بڑے پتے کی باتیں کہی ہیں کہ آج زندگی کی ہر سطح پر ہم ایک تھکا دینے والے بحران سے گزر رہے ہیں۔ عدم تحفظ کے احساس نے لفظی اور احساس محرومی نے عام فرد کو خود غرضی، لالچ اور نفسا نفسی کی کیچڑ میں دھنسا دیا ہے۔
یہ بحران ہمارے مذہب، ہمارے فلسفے، ہماری سیاست و معیشت، ہمارے اخلاق و معاشرت، ہمارے عادات و اطوار، ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی اور سارے تہذیبی اداروں میں پھیل رہا ہے اور ہمارے کلچر کی وحدت کا ڈھانچہ ٹوٹ رہا ہے۔
زندگی میں ہم نے منزل اور معنویت کو گم کر دیا ہے۔ اسی لیے نئی نسل سرگرداں و پریشان ہے اور سارا معاشرہ برسات کے پانی کی طرح پامال ہونے کی وجہ سے، سڑکوں پر مارا مارا پھر رہا ہے اور جس کاٹ کر ادھر کو جدھر راستہ ملتا ہے، بہہ نکلتا ہے۔
اسی فکری بحران اور بے معنویت کے باعث ادب اور فنون لطیفہ کی تخلیقی قوتیں کچھ سی گئی ہیں جو سستی مداحی اور سنجیدگی جیسی اہم روایات بے معنی ہو گئی ہیں۔ عام تعلیم یافتہ طبقہ قتل و غارت گری، جاسوسی کے چھوٹے بچے قصے اور ملکی سطحی خبریں پڑھ کر اپنی پیاس بجھا رہا ہے۔ دیومالائی داستانیں اور رومانی قصے اسی لیے اخباروں اور رسالوں میں شائع ہو رہے ہیں کہ وہ پڑھنے والے کو زندگی کے تلخ حقائق سے فرار اختیار کرنے میں مدد دیتے ہیں۔
اسی فکری بحران کی وجہ سے قاری اور ادیب کا پرانا رشتہ باقی نہیں رہا ہے۔ فکر اور سوچ کے راستوں میں اتنے گہرے گڑھے ہو گئے کہ قاری اور ادیب کے لیے ان پر ایک ساتھ چلنا ممکن نہیں رہا۔ دونوں کی فکر کے دائرے الگ الگ ہو گئے ہیں۔
ردعمل کے بغیر لکھنے والے کے قلم کی روشنائی سوکھ جاتی ہے اور مفکر کی سوچ کے راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں جب نازیوں نے پیرس پر قبضہ کر کے اپنے مخالف ادیبوں، دانشوروں اور مفکروں کو گرفتار کر لیا تو ان کے لیے سزا یہ تجویز کی گئی کہ سب کو الگ الگ کوٹھریوں میں بند کر کے ہر کوٹھری میں ایک لاؤڈ اسپیکر لگا دیا گیا جس پر ان کے لیے خاص پروگرام نشر کیے جاتے تھے۔ ایسے پروگرام جن سے انہیں ذہنی اذیت پہنچے۔ وہ سن سکتے تھے، جواب نہیں دے سکتے تھے۔ کچھ عرصے تک تو پروگرام نشر ہوتے رہے لیکن جلد ہی ان پروگراموں کے لکھنے والے تھک گئے اور انہوں نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ سننے والوں کا ردعمل معلوم ہوئے بغیر ان کا قلم جواب دے گیا ہے۔ آخر گونگوں کے لیے کب تک اور کیسے لکھا جا سکتا ہے؟ سوچ تو ردعمل کی فضا میں آگے بڑھتی ہے اور جب یہ رشتہ کمزور پڑ جائے یا باقی نہ رہے تو سوچ

کے دروازے بھی بند ہو جاتے ہیں۔

اسی بحران اور بے معنویت کے باعث فرد اور معاشرے کا رشتہ بھی انتہائی کمزور پڑ گیا ہے۔ معاشرے کے افراد کی بھاری اکثریت خود غرضی لالچ، غیر ذمہ داری اور خوف کے موذی مرض میں مبتلا ہے۔ اجتماعیت اور حب الوطنی جیسی بنیادی قدریں اسی لیے جاں کنی کی حالت میں نظر آ رہی ہیں۔ ایک طرف بے رحمی اور تشدد بڑھ گیا ہے اور دوسری طرف فرد میں قوت حاصل کرنے کی خواہش شدید ہو گئی ہے۔ ہر صوبہ اپنے خول میں محصور ہے اور ایک دوسرے سے سوکنوں کی سی لڑائی لڑ رہا ہے۔ صلاحیت، کام، لگن، انہماک اور خلوص جیسی اعلیٰ و محترم قدریں فرد کے لیے بے معنی ہو کر رہ گئی ہیں۔ جنگ کی خواہش اندرونی و بیرونی سطح پر بڑھ گئی ہے۔ عقل و خرد کے بجائے صرف جذبات سے مسائل کا حل تلاش کیا جا رہا ہے۔ ایسی آواز دل کو بھاتی ہے جو اس نوع کے جذبات کو آسودہ کرے۔

وہ افراد بھی، عام طور پر، جو قدیم تہذیبی اداروں کو باقی رکھنا چاہتے ہیں، مخلص نہیں ہیں بلکہ ان تہذیبی اداروں کو اپنے فائدے کے لیے ڈھال یا چھتری کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ اور وہ بھی جو نئے معاشرے کو جنم دینا چاہتے ہیں۔ اسے طاقت حاصل کرنے کا موثر وسیلہ جان کر سیڑھی کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔

فرد تضاد کا شکار ہے۔ وہ جو کہتا ہے کرتا نہیں ہے۔ اور جو کرتا ہے وہ کہتا نہیں ہے۔ ہر ایک کے دل میں چور ہے اسی لیے "الفاظ" اور "اثر" کا رشتہ بھی ٹوٹ گیا ہے۔ مقرروں اور لیڈروں کے خوبصورت اور اچھے سے اچھے الفاظ بھی اب ہمیں متاثر نہیں کرتے۔ لفظوں نے اپنے معنی کھو دئے ہیں۔ خلوص اور ایک دوسرے پر اعتماد کے فقدان نے ایک ایسی فضا پیدا کر دی ہے کہ یقین ہی نہیں آتا کہ واقعی جو بات وہ کہہ رہا ہے اس کا اس سے یہی مطلب ہے۔ اسی لیے سچ اور جھوٹ میں تمیز باقی نہیں رہی۔ جب سچ اور جھوٹ مل جائیں تو لفظوں کی اثر آفرینی باقی نہیں رہتی۔ سارا معاشرہ یرقان کے مرض میں مبتلا ہے۔

تعلیمی، علمی و تحقیقی ادارے، سیاسی اکھاڑے بن گئے، اور استاد اور اہلِ علم نسخ حاصل کرنے کے لیے جنگلی مرغوں کی طرح ان اکھاڑوں میں اترے ہوئے ایک دوسرے کو نئے نئے داؤ پیچ سے شکست دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہاں بھی کل اقتدار حاصل کرنے کی خواہش یہ سب کھیل کھلا رہی ہے اور یہ لوگ تعلیم و علم کی روشنی پھیلانے کے بجائے ایک دوسرے کو کاٹنے اور رد کرنے میں مصروف ہیں !

انسانی شعور ہر لمحہ رواں دواں ہے۔ یہ ایک بہتا ہوا دھارا ہے اور ہر لمحہ ارتقا پذیر ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج انسانی زندگی کو متحرک اور معنی خیز بنانے کا مسئلہ سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ آج کے عہد کا ایک بڑا سوال یہ بھی ہے کہ میں کون ہوں ؟ اس سوال کا جواب تشکیک کی گہری تہوں تک پہونچا ہوا ہے جہاں انسانی ذہن ہستی اور نیستی کے مسائل سے دوچار ہے۔

آج ایسے قوانین اور نصب العین عنقا ہو چکے ہیں جو ایک انسان کو معنویت بخشتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے ادیب کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ایسی ذات کی تصویر کشی کس طرح کی جائے جس نے اپنی ہستی کو کھو دیا ہے۔

آج کے ہم عصر ادب میں زیادہ زور انسان کی داخلی زندگی پر ہے۔ مگر شخصیت کا ایک اندرونی مرکز بھی ہے جو ٹوٹ رہا ہے اور جو مشاہدات کو محفوظ کرتا ہے، تجربات کو پرکھتا ہے اور حیات و کائنات کی بے معنویت پر متفکر ہوتا ہے۔ انسانی شعور سے یہ غیر معمولی دلچسپی اس خوف کا بھی رد عمل ہے کہ جدید تکنیکی اور سرمایہ پرست تمدن کہیں انسان کی داخلی زندگی کا خاتمہ نہ کر دے اور انسان ایک چلتی پھرتی مشین ہو کر نہ رہ جائے۔

آج سائنس نے افکار کی دنیا میں اتھل پتھل پیدا کر دی ہے اور پرانے حقائق کو بھی رد کر دیا ہے جس کے نتیجے میں انسانی ذہن اس منزل پر آ کھڑا ہوا ہے کہ انسان اپنے علم سے زیادہ اپنی لاعلمی سے واقف ہو گیا ہے۔ ہم عصر ادب کا یہ بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔

اور آج کے ادب کا عظیم ترین مرحلہ لمحہ بہ لمحہ بدلتے ہوئے افکار سے نبرد آزما ہونا بھی ہے لیکن بقول نظام صدیقی، نیوکلیائی جنگ میں نوراہ راست نبرد آزما ہونے کا موقع بھی نصیب نہیں ہے کہ ہم کسی تو سیع پسند کے زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو کر محاذ آرائی کر سکیں۔ اب انسانی دردمندی اور انسانی جدوجہد کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے، جو عالمی نفرت سے بھری دنیا کے متبادل نئی دنیا کی تخلیق کا پیغام دے سکے۔ یہ محبت آگیں پیغام نکھرا ہوا ادراک بصیرت اور نئی جمالیاتی جاذبیت سے مملو ہے۔ ہم اپولی نیر APOLANAIRE کی اس جدیدیت سے کتنی دور ہٹ گئے ہیں جہاں انہوں

نے لفظوں کی سرحد کی ایک انحانی دھرتی پر صداقت کی تلاش کی دعوت دی تھی جو حقیقی تخلیقیت کا نقطۂ اول ہے۔ اس کے برخلاف ہم آج مجرمانہ حد تک ایک بالکل انوکھی مفاہمت پرست اور مصلحت اختہ صورت حال میں اسیر ہیں۔ جب اقتدار کے گھنے سایہ میں بیٹھے محفوظ دانشور، نافذ ادیب اور شاعر پوشیدہ مفاد کے زیر اثر آسانی سے خود کو ایک سانس میں فیشن گزیدہ جدید اور دوسری سانس میں ادارہ پسند ترقی پسند بھی کہہ سکتے ہیں۔!

ہم عصر ادب کے اس مسئلے کو ہم دیوانہ وار بھاگنے سے تشبیہ دے سکتے ہیں جس کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا کا کہنا ہے کہ ہم سب بیک وقت نہ صرف چاروں طرف دیوانہ وار بھاگ رہے ہیں بلکہ ہمہ وقت زیادہ سے زیادہ بولنے اور اپنی آواز کو بلند تر کرنے کی فکر میں بھی ہیں۔ لاؤڈ سپیکر اور ریڈیو سے لے جیٹ ہوائی جہاز اور پھر جوہری بم تک۔ آواز کے دائرے پھیلتے چلے گئے ہیں۔ تغیر اور تبدیلی کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ ہر شے چشم زدن میں پرانی دکھائی دینے لگتی ہے۔ چنانچہ ایک THROW AWAY CULTURE نمودار ہو رہا ہے جس میں فیشن گرگٹ کی طرح اپنے رنگ بدلتے ہیں۔ یہ تیز رفتاری بیک وقت تخریبی بھی ہے اور تعمیری بھی۔ تخریبی یوں کہ اس نے صدیوں پرانے سماجی اور مابعد الطبیعاتی نظام کو لرزہ براندام کر دیا ہے۔ اور اس کی پُرشور اور بے محابا یلغار کے سامنے سسٹم اور پیٹرن تاش کے پتوں کی طرح بکھرنے لگے ہیں۔ تعمیری یوں کہ ذہن کی تیز رفتاری نے بہت سے پردوں کو نوچ کر پرے پھینک دیا ہے اور انسانی نظر میں کائناتِ اکبر اور کائناتِ اصغر دونوں کا مطالعہ کر رہی ہیں۔ فلکیات نے کائنات کو اتنا وسیع کر دیا ہے کہ اس کا ادراک کرنے کی کوشش کریں تو تخیل کے بھی پر جل اٹھیں۔ حیاتیات کے مطالعہ نے خلیہ کی کوکھ میں ایک کائناتِ اصغر کا منظر دکھایا ہے۔ بلکہ GENS-SPLICING یا RECOMBINENT D N A سے تخلیق کاری کا ایک نیا باب کھول دیا ہے۔!

جدید ذہن بیک وقت پرانے جہان کے انہدام کا سانسائی بھی ہے اور ابھرتے ہوئے نئے جہان کا ناظر بھی۔ وہ رفتار سے لیس بھی ہے اور تغیر سے آشنا بھی۔ وہ انبوہ سے کٹ کر اپنی انفرادیت کو بھی نکھار رہا ہے اور تخلیقی طور پر فعال ہونے کے باعث اپنے اجتماعی روپ کو پہچاننے پر بھی قادر ہے۔

عصری ادب کے میلانات اور تخلیقی رجحانات کے جنم، نشو و نما، عروج اور زوال یعنی مسائل کے تعلق سے سلیم اختر نے صحیح لکھا ہے کہ عصری تقاضے ایک خاص مدت تک کارفرمائی کے بعد معاشرہ میں ایک خاص نوع کی صورت حال پیدا کر دیتے ہیں جس کے نتیجے میں اس عہد کے اہل قلم کے پاس دو طریقے رہ جاتے ہیں۔ ایک مفاہمت کا اور دوسرا عمل کا!

اگر ہم چاہیں تو اس مفاہمت اور ردعمل کے تجزیاتی مطالعہ کی روشنی میں عصری آگہی، طرز احساس اور ادب میں متغیر رجحانات و میلانات و صورت حال کا مطالعہ کر کے نتائج کے لیے درست تناظر مہیا کر سکتے ہیں۔ مفاہمت اور ردعمل، عمل اور بے عملی، مثبت اور منفی روایت اور بغاوت، مسلمات اور تجربات۔ یہ سب مختلف اصطلاحات ہیں مگر درحقیقت اس بنیادی آویزش کی مظہر ہیں جو عصری تقاضوں اور اہل قلم کے تخلیقی شعور میں جاری رہتی ہے اگر مسلم کار میں تخلیقی وزن کمزور ہوگا، طرز احساس میں توانائی نہ ہوگی اور سب سے بڑھ کر اس میں وہ جرأت نہ ہوگی جو ایک سچے تخلیق کار کے لیے زر خالص ثابت ہوتی ہے تو وہ پھر زمانہ کے ہاتھوں بے بس ہو جائے گا اور یوں محض وقت کے گنبد میں صدائے بازگشت بن کر رہ جائے گا۔ لیکن جب اس کے پاس ایک توانا تخلیقی وژن ہو، شدت سے پر طرز احساس ہو اور وہ آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی کی زندہ تصویر بھی ہو تو پھر وہ اپنے زمانہ اور معاشرہ سے عاجز نہیں آتا بلکہ تخلیق کے اسم اعظم سے ان سب پر حاوی ہو جاتا ہے۔ قلم کار کا اپنے عصر یا معاشرہ پر حاوی ہونا ان معنی میں کہ وہ اپنے معاشرہ کے داخلی تضادات اجاگر کرتا ہے، منافقت کے پردے چاک کرتا ہے، حصول مقاصد اور ذرائع کی غیر اخلاقی بنیاد کی نشاندہی کرتا ہے۔

لیکن چونکہ آج کے عصر میں ہر قدر مشکوک ہو چکی ہے اس لیے اچھائی اور برائی میں کوئی حد فاصل باقی نہیں رہی ہے۔ ویسے یہ سچائی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ عصری ادب میں تخلیقی توانائی کم ہو رہی ہے، ذاتی سوچ کے آفاق سمٹ رہے ہیں اور نظر کے زاویے محدود ہو کر رہ گئے ہیں، پھر بھی آج علامت، استعارہ اور تجرید نے ایک کلیشے کی صورت اختیار کر لی ہے جس کے نتیجہ میں

[ باقی صفحہ ۲۷ پر دیکھئے ]



## یوسف جمال

میں کالی شب کا مسافر، نگر ہے نورانی
مرا نصیب سیاہ ہے، نظر ہے نورانی

پرندے! تجھ سے جھلکتے ہیں روز و شب دونوں
ہے اک سیاہ ترا، ایک پر ہے نورانی

سفر کے پاؤں سے منزل کا سر نمایاں ہے
مناؤ جشنِ مسافت، ڈگر ہے نورانی

جوان رات کی سانسیں ابھی ہیں تیز تو کیا
سحر قریب ہے اور یہ سحر ہے نورانی

سماں بدل دیا جنگل کا، برف باری نے
لباس دودھیا ہے، ہر شجر ہے نورانی

درست ہے کہ ہیں الفاظ شب گزیدہ مگر
مری کتاب کی ہر اک سطر ہے نورانی

جمالؔ، تیرگی اس طرح ختم کی میں نے
جلا کے دیکھا یہ منظر کہ گھر ہے نورانی

راج گانگ پور ۷۷۰۰۱۷، (اڑیسہ)

## ظفر اکبر آبادی

کون ابھی تک آوارہ دل کے ویراں آثار میں ہے
کس کی مہک مٹی میں ہے کس کا چہرا دیوار میں ہے

اُس کی صدا کا پیچھا کرتے کس منزل پر پہنچے ہم
قطرۂ آب نہ دریا میں سایہ کہیں اشجار میں ہے

دوست ہی میرے دشمن نکلے اس کو کیا کہیے ورنہ
جوہر سے عاری ہے نہ کوئی زنگ مری تلوار میں ہے

بس تاریخ بدل جاتی ہے روز و شب رہتے ہیں وہی
کل بھی ایسی ہی دنیا تھی جیسی آج اخبار میں ہے

میری ارزانی سے ایسا فرق نہیں پڑنے کا کوئی
میں بھی اسی بازار میں ہوں اور تو بھی اسی بازار میں ہے

اس کی باتیں سن لیتا ہوں میں بھی توجہ سے ورنہ
سچ نہ کہیں اقرار میں اس کے اور نہ کسی انکار میں ہے

دل سے پیوستہ اس یاد کو کیسے الگ کر دوں میں ظفرؔ
موتی سی ہے سمندر میں وہ پتھر سی دیوار میں ہے

۹ ۷/ ۸۸۔ اے حیمن گنج۔ کانپور (یوپی)



## جعفر عسکری

بے یقینی کی رتوں میں ایک حرفِ معتبر بھی کم نہیں ہے
خشک ہستی کے بیاباں میں نمودِ یک شجر بھی کم نہیں ہے

ہے عبث لکھنا طویل و بے مزہ افسانۂ شوقِ فضول
لوحِ دل پر بس تمہارا نام لکھنا مختصر بھی کم نہیں ہے

ایک ہی ساعت میں جل کر راکھ ہو سکتا ہے یہ شہرِ نگاراں
اس تماشے کے لیے تو صرف اک رقصِ شرر بھی کم نہیں ہے

راہِ پُر آشوب میں اس سے زیادہ کی توقع تم نہ کرنا
جو فقط دو گام ہی تک ساتھ دے وہ ہمسفر بھی کم نہیں ہے

ہوں قلندر پر خیالِ ترکِ دنیا سے بھی خائف
بے سر و ساماں ہوں لیکن حسرتِ دیوار و در بھی کم نہیں ہے

قلب کی بے مائیگی پر غم زدہ ہونے کا یارو کیا نتیجہ
خواہشوں کے اس صدف میں آرزو کا اک گہر بھی کم نہیں ہے

صفحۂ قرطاس پر لکھتے رہو جعفرؔ حروفِ حق شناسی
اس ہنر کے قحط میں یہ کوششِ عرضِ ہنر بھی کم نہیں ہے



رضا الجبار
3311 Kingston Road Suite No 901 Scarborough
Ont M1M 1R1 Canada

# شکایت

پولیس اسٹیشن کے فون کی گھنٹی بجی۔ پولیس سارجنٹ مارٹن نے ریسیور اٹھا کر "ہلو" کہا اور پوچھا "میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

جواب میں کسی نے کچھ نہیں کہا۔ زور زور سے کسی کے سانس لینے کی آواز سنائی دے رہی تھی جیسے کوئی بدحال ہو رہا ہو۔ سارجنٹ مارٹن نے دوبارہ کہا "آپ اپنے گھر کا پتہ اور نام بتادیں تاکہ ہم میں سے کوئی فوراً پہنچ کر آپ کی مدد کر سکے۔ ہم دس پندرہ منٹ کے اندر پہنچ جائیں گے"

فون کے اس سرے پر کسی نے کچھ نہیں کہا۔ وہی لمبی لمبی سانس کی آواز رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ انٹرکام کے ذریعہ مارٹن نے اپنے سپروائزر کو فوراً اطلاع دی "کوئی سخت تکلیف میں ہے۔ سانس لینے میں زیادہ تکلیف معلوم ہوتی ہے کہ شکایت درج کرنے والے کے منہ سے الفاظ بھی نہیں نکل رہے ہیں۔ صرف سانس کی غیر معمولی رفتار کا پتہ چل رہا ہے۔"

پولیس کی مشنری فوراً حرکت میں آگئی۔ ٹیلی فون کمپنی آفس کے ذریعے نہ صرف فون نمبر ملا بلکہ فون کرنے والے کا نام اور پتہ بھی مل گیا۔

"مسٹر آدم اسمتھ۔ ۳۴ ہاتھرسٹ اسٹریٹ۔ عمر ۷۲ سال۔ اپنی بیوی ماریا عمر ۷۰ سال کے ساتھ رہتے ہیں۔ دونوں ریٹائرڈ ہیں۔"

مارٹن نے حالات کا تجزیہ کیا "کوئی خطرے کی گھڑی ہے جس کے لپیٹ میں دونوں آگئے ہیں۔ شاید ان میں کا ایک اس حد تک بہتر صورت حال میں ہے کہ پولیس کو فون کر سکا۔ شاید جوں ہی اس نے نمبر ڈائل کیا کوئی خطرہ ان پر حاوی آگیا۔"

مارٹن نے اپنے ہیڈ سے دوبارہ گفتگو کی اور یہ اندازہ لگایا گیا کہ دونوں میں سے ایک کی موت واقع پذیر ہو چکی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ دوسرا انتہائی ڈھالی حالت میں موت کی جانب بڑھ رہا ہو اور دوسرا کسی قدر ہوش میں ہے۔ دوسری کئی صورتیں بھی گفتگو میں آئیں۔ اس لئے یہ طے ہوا کہ ایک ایمبولینس کی گاڑی کے ساتھ ایک سراغ رساں بھی ہو۔

چند منٹوں کے بعد وہ آدم اسمتھ کے گھر کے دروازے پر تھے۔ انھوں نے بیل بجائی۔ دروازہ کسی نے نہیں کھولا۔ سراغ رساں برک نے گھر کے چکر لگائے۔ کوئی کھڑکی کھلی ہوئی یا کسی کھڑکی کے شیشے ٹوٹے ہوئے نہیں تھے۔ مارٹن نے دروازے پر آواز لگائی "مسٹر آدم اسمتھ! میں پولیس سارجنٹ مارٹن ہوں آپ کی مدد کرنے کے لئے آیا ہوں۔ کسی طرح دروازہ کھول دیں"۔

سراغ رساں برک نے دائیں بازو کے پڑوسی کے مکان پر جا کر کال بیل بجائی۔ حمید اللہ کی بوڑھی بیگم نے دروازہ کھولا اور برک کے سوال پر کہنے لگی کہ ان لوگوں کو کوئی غیر معمولی کیفیت دکھائی نہیں دی اور نہ کوئی ایسی آواز یا شور بھی کانوں پر نہیں پڑا۔ اس لیے ان کی توجہ اسمتھ کے گھر کی طرف نہیں گئی۔ انھوں نے کسی کو آتے ہوئے یا جاتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔

سامنے کے پڑوسی نے بھی ایسی ہی اطلاع دی اور بولے کہ انھوں نے آدم اسمتھ اور ان کی بیوی کو پچھلے شام لان میں پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھا ہوا دیکھا تھا۔ یہ بھی بتایا کہ وہ لوگ اپنی کار کو ہمیشہ گیرج میں رکھنے کے عادی ہیں اور گیرج بند رہتا ہے اس لئے یہ بتایا نہیں جا سکتا کہ آدم اسمتھ اپنے گھر کے اندر ہیں یا نہیں ہیں۔

وقت بڑھتا جا رہا تھا زیادہ وقت گنوانا کسی بھی پچھتاوے کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ اس لئے سارجنٹ مارٹن نے کسی بھی ترکیب سے دروازہ کھولنے کی اجازت حاصل کر لی۔ مارٹن نے دروازے سے پیوستہ ایک کھڑکی کے شیشے کو توڑا تاکہ اندر ہاتھ ڈال کر دروازے کی چٹخنی کو گرائے۔ اس اثناء میں مارٹن کی مدد کے لئے پولیس اسٹیشن سے ایک دوسرا سارجنٹ تھامسن بھی آگیا۔ دروازہ کھولنے میں کامیابی حاصل کر لینے کے بعد مارٹن نے تھامسن کو ہدایت دی کہ وہ دروازے پر کھڑا رہے اور کسی کو اندر آنے یا باہر جانے نہ دیں۔

مارٹن اور سراغ رساں برک نے جوں ہی ارادہ کیا کہ دروازے

کے اندر داخل ہوں ایک کتا اندر کی جانب سے آیا اور بھونکنے لگا۔ برک نے اس کے اوپر غنودگی طاری کرنے والی گیس چھوڑی اور دروازے کی آڑ میں اس وقت تک کھڑے رہے کہ جب تک کتے کے بھونکنے کی آواز میں گیس کے اثر سے نرمی نہ پیدا ہو جائے۔

مارٹن کے ہاتھ میں پستول تھا اور برک کے کاندھے پر سراغ رسانی کے آلات۔ دونوں اندر چلے گئے۔

ان کے اندر جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی ایک کار گھر کے سامنے آکر رکی۔ ایک معمر آدمی اور معمر خاتون حواس باختہ ہو کر گھر کی طرف دوڑ رہے تھے۔ سارجنٹ تھامسن نے انہیں دروازے پر روک دیا۔

"یہ سب یہاں کیا ہو رہا ہے؟" آئے ہوئے معمر آدمی نے بڑی فکر کے ساتھ کہا

"میں ٹھیک طرح سے نہیں جانتا کہ کیا ہو رہا ہے" تھامسن نے کہا "لیکن کوئی خطرے کی بات ضرور معلوم ہوتی ہے آپ تھوڑی دیر ٹھہر جائیں تو انکشاف ہو ہی جائیگا۔"

"کاہے کا خطرہ؟" معمر آدمی کے ساتھ آئی ہوئی معمر خاتون نے پوچھا۔ وہ بھی پریشان نظر آرہی تھی۔

"شاید کسی کا خون ہو گیا"

"خون؟ اوہ گاڈ" دونوں اپنی آوازوں میں بڑی حیرت کے ساتھ بولے معمر آدمی نے دوبارہ کہا "یہ میرا گھر ہے۔ میں آدم اسمتھ ہوں۔ اس گھر میں ہم دونوں کے سوائے تیسرا آدمی نہیں رہتا۔ ہاں ہمارا ایک کتا بھی ہے لیکن وہ اتنا شریف ہے کہ نہ وہ کسی کی جان لے سکتا ہے اور نہ کوئی اسے مارنا پسند کرے گا۔"

"ہائے مسٹر اسمتھ" تھامسن نے کہا "بات دراصل یہ ہے کہ سارجنٹ مارٹن اور سراغ رساں برک حالات کا پتہ چلانے کے لیے اندر گئے ہیں۔ انھوں نے مجھے ہدایت دے رکھی ہے کہ میں کسی شخص کو بھی اندر سے باہر یا باہر سے اندر نہیں گزرنے دوں۔ ان کا مطلب آپ سے قطعی نہیں ہوگا اس لئے بیل بجا کر انھیں بلاتا ہوں"

تھامسن نے باہر کے دروازے پر لگی ہوئی کال بیل کا بٹن دبا دیا

مسٹر اسمتھ کہہ رہے تھے

"گڈمارننگ شاپنگ پلازا جو یہاں سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر ہے وہاں پر ہم لوگ کچھ گراسری خریدنے کے لئے گئے تھے۔ توقع تھی کہ ہم آدھے گھنٹے کے اندر واپس ہو جائیں گے۔ لیکن جب ہم گراسری لے کر اپنی کار کے پاس آئے تو پتہ چلا کہ کار خراب ہو گئی ہے۔ ہم نے کاروں کی ایسوسی ایشن کے دفتر کو فون کیا تاکہ وہ اپنا میکانک روانہ کر سکیں۔ اس کے آنے اور کار کے درست ہونے میں گھنٹہ سوا گھنٹہ لگ گیا۔"

"ہو سکتا ہے کسی نے آپ کی کار کو آپ کی غیر موجودگی میں عمداً خراب کر دیا ہو تاکہ آپ کو گھر پہنچنے میں دیر ہو جائے۔" تھامسن نے کہا

"نہیں" اسمتھ کی بیوی بولی "یہ ہیڈ لائٹ بند کرنا بھول گئے تھے اور کار کی بیٹری جو پرانی ہے ختم ہو گئی۔ اسے ری چارج کروانا پڑا اور دو اسکرو جو ڈھیلے ہو گئے تھے انھیں ٹائیٹ کروانے تھے۔ بس اتنی ہی بات ہوئی"

اندر سے برک اور مارٹن آئے۔ مسٹر اسمتھ اور ان کی بیوی کے ساتھ وہ دوبارہ گھر کے اندر داخل ہوئے۔ فون کا ریسور ابھی تک اپنے کریڈل سے نیچے گرا ہوا تھا۔ مسٹر اسمتھ نے بتایا کہ انھوں نے اپنے فون کو کمپیوٹر اور آواز پڑا کرنے والے آلے سے منسلک کر رکھا ہے۔ ایک پروگرام کے ذریعہ سے فون کے بہت سے ضروری نمبرات کو انگریزی کے حروف تہجی کے ایک ایک حرف پر منتقل کر دیا گیا ہے۔ برک کے پوچھنے پر اسمتھ نے بتایا کہ پولس کو فون کرنے کے لیے کمپیوٹر کے بورڈ پر سے انگریزی حرف تہجی "P" کا دبایا جانا کافی ہے۔ پولس سے رابطہ قائم ہو جائے گا۔

آدھے گھنٹے کے بعد اپنی تفتیش کی رپورٹ مکمل کر کے برک نے ہیڈ آفس کو فون کیا۔

"بات بڑی معمولی ہے سر! آدم اسمتھ اور ان کی بیوی کو آج صبح گروسری خریدنی تھی۔ ان کا اندازہ تھا کہ گھر سے باہر جانے، واپس آنے اور خریدنے میں کوئی آدھا گھنٹہ لگے گا، زیادہ نہیں۔ اس لئے جب انھوں نے اپنے کتے کو سوتا ہوا پایا تو اسے یوں ہی سوتا ہوا چھوڑ کر وہ باہر چلے گئے۔ اس اثنا میں کتا جاگ اٹھا۔ اس نے اسمتھ کو تلاش کیا۔ کوئی دکھائی نہیں دیا تو اسے اپنی تنہائی اور قید کا احساس ہوا۔ کھڑکی میں سے جھانک کر باہر لان میں دیکھنے کے لئے میز پر کودا تو فون کا چونگا اپنے کریڈل سے نیچے گر پڑا۔ اس اچھل کود میں کتے کا پاؤں کمپیوٹر کے بورڈ کے حرف "پی" (P) پر پڑا جس کی وجہ سے فون پولس اسٹیشن سے مل گیا۔ جب مارٹن نے فون پر "ہلو" کہا اور اس کے بعد گفتگو کی تو کتے کو یوں لگا جیسے یہ مسٹر اسمتھ کی آواز ہے جس کے ذریعے وہ کوئی ہدایت دے رہے ہیں۔ کتا دم ہلا کر لمبی لمبی سانس لینے لگا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا آپ واقف ہیں!"

پھر برک ہنسنے لگا

ہیڈ آفس سے آواز آئی "اس کا مطلب یہ ہوا کہ کتے نے مسٹر اسمتھ

باقی صفحہ ۲۷ پر دیکھئے۔

## قاصر خیبی

رات ،جیسے دُکھ کا ساگر باد صَر صَر ایک موج
گھر کے باہر ایک طوفاں گھر کے اندر ایک موج
دیکھیے وحشی عزائم کب رُکیں کیوں کر رُکیں!
ذہن میں چلتی ہے آندھی پورا پیکر ایک موج
جل رہی ہیں خواہشوں کی آگ میں روحیں بہت
ساری قدریں پانی پانی قوت زر ایک موج
کوئی چہرہ معتبر بن کر ٹھہرتا ہی نہیں!
وقت بہتا تیز دھارا سارا منظر ایک موج
جیسے کیسے غم کے پتھر ریزہ بن کر بہہ گئے
میں ہوں گویا ایک دریا میرے اندر ایک موج

[illegible]

## صغیر منظر

ایک ایک ذرہ ستارہ ریت کا
برملا ہے استعارا ریت کا
تشنگی بجھتی نہیں، کہنے کو ہے
سات دریاؤں سے پیارا ریت کا
دونوں زیر آسماں، بے دست و پا
مشترک ہے سم ہمارا ریت کا
سارے جذبے رس کے تودے ہوئے
خواہشوں نے روپ دھارا ریت کا
ایک دن کھوئے گا سطر آب و تاب
تا بہ کہ چمکے گا تارا ریت کا

[illegible]

## تنویر سامانی

ہر اک سمت گھنڈر ہیں یہ ہاؤ ہو کیا ہے
میں سوچتا ہوں کہ دنیائے رنگ و بو کیا ہے
بھٹک رہا ہوں بدن چھوڑ کر خلاؤں میں
کوئی بتاؤ مجھے میری آرزو کیا ہے
جہنموں میں کبھی یخ کدوں میں بھٹکا ہوں
سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا کہ جستجو کیا ہے
وجود ریگ رواں کے سوا تو کچھ بھی نہیں
کوئی تو مجھ کو صدا دو کہ چار سو کیا ہے
ما کی گود میں جانے کو زندگی درکار
کبھی یہ بھید کھلے، خواہش نمو کیا ہے

[illegible]

## گنبد طائر

جو حق کی جنگ میں حق کے لیے سپر ہو گا
وہ زندگی کی نگاہوں میں معتبر ہو گا
طویل رات کے پُرہول سائے کہتے ہیں
قیام دن کا ہوا بھی تو مختصر ہو گا
اسی خیال سے ہم اس کو کچھ نہیں کہتے
ہماری بات کا اُس پر کہاں اثر ہو گا
میں گھر میں موت کے ڈر سے چھپا ہوا تھا مگر
کسے خبر تھی کہ مقتل میرا ہی گھر ہو گا
قدم قدم پہ ہیں صدیوں کے فاصلے طائر
سفر حیات کا کہنے کو مختصر ہو گا

[illegible]

## پرویز اختر

وہ میرا راز یہاں بھی اب اشتہار میں ہے
بہت خلوص تمہاری وفا کے وار میں ہے
[illegible] کسی مصرف کا اور نہ تو میرے
[illegible] ایک [illegible] یہاں [illegible] میں ہے
تعلقات کے ماہین یہ تکلف کیوں
کسی بھی کھیل کا حاصل تو [illegible] میں ہے
وہ جانے والا کبھی تو پلٹ کے آئے گا
[illegible] امید کا دروازہ انتظار میں ہے
اِدھر تو میرے مسائل میں پاؤں جکڑے ہوئے
اُدھر وہ کتنی ہی صدیوں سے انتظار میں ہے

[illegible]

## کشور

ہر [illegible] کیا خوش ہم تھے [illegible] اچھا بُرا کہتے رہے
زندگی کی [illegible] کو [illegible] کہتے رہے
[illegible] میں لپٹے ہوئے پیڑوں کی گنجائش [illegible]
ہمسفر جب تک قصدہ دھوپ کا کہتے رہے
لفظ [illegible] کے سب مفہوم سے خالی ملے
جانے کیا مجھ سے [illegible] آشنا کہتے رہے
اب خدا ہی جانتا ہے اس کا ہو انجام کیا
ناتراشیدہ کسی بُت کو خدا کہتے رہے
اپنی ہی پہچان ہم کو اک اذیت بن گئی
جانے ہم کس شخص کو اب تک [illegible] کہتے رہے

[illegible]

بنتِ مسعود
۴ ۔ اِی ورنداون، فلیٹ نمبر ۴۱۴، تیسرا منزلہ، راہیجا ٹاؤن شپ ملاڈ (ایسٹ) بمبئی



# شکستِ آرزو

شکنتلا اسے کسی بچے سے بھی زیادہ معصوم سمجھتی ہے گویا واسدیو کو یہ معلوم ہی نہیں کہ وہ خود ہی روپئے صندوق کے پیچھے، کواڑ کے پیچھے، کتابوں کے درمیان رکھ دیا کرتی ہے اور پھر اس سے کہتی ہے "تم کتنے بھلکڑ ہو واسدیو! پیسے رکھ کر بھول جاتے ہو۔ واسدیو کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ کو دیکھ کر وہ خود بھی مسکرانے لگتی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ان تمام باتوں سے وہ ممتا کی ایک چادر سی واسدیو کے چاروں طرف تانتی گئی۔ ایسے موقعوں پر احساس میں جس گہرائی کو واسدیو محسوس کرتا تھا یقیناً شکنتلا کی ہی مرہونِ منت تھی۔

شکنتلا جسے سب لوگ شکو بائی کہتے تھے واسدیو کے مالک مکان بھاؤ راؤ کی رکھیل تھی بھاؤ راؤ کی اس چال میں صبح اسی کی آواز سے نمودار ہوتی آج شکنتلا کی آواز سے علی الصبح واسدیو اٹھ بیٹھا اور اپنے ڈرامے کو ٹھیک ٹھاک کرنے لگا جو آج ہی اسٹیج ہونے والا تھا۔

واسدیو مراٹھی کا مشہور ادیب تھا وہ خود دلت تھا اور دلتوں کے لئے لکھنے کا بیڑا اٹھایا تھا ان پر ہونے والے استحصال کو وہ ختم کرنا چاہتا تھا اس کام کو اس نے اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا اور اسے اپنا یہ مقصد بہت عزیز تھا۔ وہ گاؤں گاؤں گلی گلی جا کر اپنا پیغام پہنچاتا۔ اس کی اپنی ناٹک منڈلی تھی جسے اپنے دوست ستیش کے ذریعے چلا رہا تھا یہ جنگ وہ ہر قیمت پر جاری رکھے ہوئے تھا پواڑوں (مراٹھی نظم کی صنف) کے ذریعے افسانوں کے ذریعے ناولوں ناٹکوں اور اپنی ناٹک منڈلی کے ذریعے گھر گھر اسی پیغام کو پہنچانے کے لیے اس نے گویا آج آپ کو وقف کر دیا تھا اس وقت وہ ڈرامے کے کلائمکس کو ٹھیک کر رہا تھا دودھ کے سمندر کے نیچے ستیش ناگ کے پھن کے اوپر دھری ہوئی یہ دنیا جتنی حسین ہے اتنی ہی بھیانک، بصورت استحصال زدہ اور گندی بھی ہے، اس کے سیاہ دھبوں کو دھویا، رنگ کیا اور خوشنما بنایا جا سکتا ہے اگر اسے کسانوں، مزدوروں، دلتوں اور اچھوتوں کے حوالے کر دیا جائے۔ وہ یہاں تک ہی لکھنے پایا تھا کہ دھڑ سے کھولی کا دروازہ کھول کر شکنتلا اندر داخل ہوگئی "آؤ شکو بائی" واسدیو نے گہری سانس چھوڑی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ اب کم از کم دس پندرہ منٹ تک تو کچھ نہیں لکھ پائے گا "۔ نوٹنکی یہاں نہیں چلے گی۔ بھاؤ کی چال کو تو تم لوگوں نے کچرے کا ٹیپ سمجھ لیا ہے۔ تمہارا جو مسلمان دوست ہے نا ستیش اس کو منع کرو، گوشت کھا کر ہڈی باہر پھینکنے کے لیے۔ سب کتے یہاں جمع ہو جاتے ہیں اور رات بھر بھونکتے رہتے ہیں شکنتلا ایک سانس میں بولتی رہی مگر جیسے ہی واسدیو سے اس کی نگاہ ملی وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹھک سی گئی ایک عجیب سا احساس گداز گداز کیفیت۔ دل کا یہ نرم نرم سا گوشہ اسے کچھ عجیب سا لگا بلکہ اچھا لگا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ وہ کچھ اور بولنے کے بجائے سوچوں میں ڈوب گئی۔

واسدیو پر شکنتلا کی بڑبڑاہٹ کا مطلق اثر نہ تھا، یہ تو شکنتلا کا معمول تھا اسے آتے ہی پہلے ڈانٹ پلانا پھر مفت مشورے دینا اس کے بعد اس کی ضرورتیں معلوم کرنا اور پھر کمرہ ٹھیک کرنے کے بہانے کچھ روپئے واسدیو کے لیے ادھر اُدھر رکھ دینا۔ اسے معلوم تھا کہ واسدیو اپنی تمام کمائی ناٹک منڈلی پر خرچ کر دیتا ہے اور خود اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں بچتی۔ شکنتلا کی سمجھ سے یہ باتیں بالاتر تھیں کہ جانے کون سی قدروں کی حصولیابی کے لئے یہ جد و جہد اس طرح سے جاری ہے۔

واسدیو کو شکنتلا کی ان باتوں پر قطعی تعجب نہ ہوتا کیوں کہ اسے معلوم تھا دنیا میں بھلے لوگ موجود ہیں ورنہ دنیا کا کاروبار کب کا بند ہو جائے۔ شکنتلا میں چھپی ہوئی آتما کو اس نے پہچان لیا تھا اور اسی پہچان کی بنا پر دونوں میں ایک رشتہ استوار ہوا تھا دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے ایک انوکھی کشش کی بنا پر جو دو انسانوں کو ایک دوسرے سے

قریب لاتی ہے جہاں کہنا سننا، جسمانی قربت، خاندانی پس منظر کی مطلق ضرورت نہیں ہوتی۔ واسدیو کو بھی شکنتلا کے بارے میں سب کچھ معلوم تھا مگر ان باتوں کی کوئی اہمیت نہ تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو شکو بائی؟" واسدیو نے کہا

"کچھ نہیں"۔ جیسے اس کی آواز بہت دور سے آئی ہو اور وہ جانے کے لیے مڑ گئی وہ یہ بھی بھول گئی کہ وہ کس مقصد کے تحت یہاں آئی تھی۔ اسے لوٹتا دیکھ کر خود واسدیو کو تعجب ہوا کہ آج بہت جلد سستے چھوٹ گئے۔ "شکو بائی ذرا چائے بھیج دینا۔" واسدیو نے ہانک لگائی۔

"آئی" گا رہائے ماں! شکنتلا کی طبیعت ناساز تھی ایک آگ کا دریا تھا جو اس کے دل میں موجزن تھا، بے چینی، بے قراری، تڑپ، چبھن۔ کیا واسدیو کی غیر حاضری کی بنا پر تھی؟ اس کا وہ فیصلہ نہ کر سکی۔ گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے اشتہار کی جلتی بجھتی روشنی کی پیلی پیلی کرنوں کے درمیان بھاؤ راؤ کا اس پر جھکا ہوا چہرہ اسے بہت کریہہ محسوس ہو رہا تھا اس وقت اسے تنہائی کی سخت ضرورت تھی اور بھاؤ راؤ تھا کہ اس کے سینے چاٹ رہا تھا اس کے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ کتا! اس نے سوچا اور اپنی بے بسی پر اس کا دل بھر آیا۔ آج اسے صبح سے ماں یاد آ رہی تھی اور بابو بھی رہ رہ کر یاد آ رہے تھے۔

سیدھے سادھے لوگ اس راکشس کے جنگل میں پھنس گئے۔ ماں، بابو، چھوٹو اور وہ رتناگری کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتے تھے۔ کھانے پینے کی کوئی خاص تکلیف نہ تھی سامنے جھیل کے پانی سے صبح شام مچھلیاں پکڑ لیتے تھے۔ تھوڑی بہت زمین تھی کھیتی ہو جاتی تھی اسی سے کام چل جاتا تھا مگر بھاؤ راؤ بابو کو اچھی نوکری کا لالچ دلا کر بمبئی لے آیا کیونکہ اس کی نظریں شکنتلا کی بے حد حسین ماں بائی پر تھیں۔ بمبئی آ کر بھاؤ راؤ نے پانڈو بائی پر ایسا جادو کر دیا کہ وہ کھلم کھلا و ڈھٹائی سے شکنتلا کے بابو سے بے وفائی کرنے لگی اور غیرت مند وٹھل نے تنگ آ کر خودکشی کر لی۔ اسی روز سے شکنتلا کو موت سے بہت ڈر لگنے لگا۔ بابو کی ابلی ہوئی آنکھیں اور باہر نکلی ہوئی زبان وہ کبھی نہیں بھول سکی۔ بابو کی موت کے بعد تو گھر میں بھاؤ راؤ کا راج ہو گیا۔ شکنتلا سیانی ہو چکی تھی اور اسے بھاؤ راؤ کا یوں گھور گھور کر دیکھنا اچھا نہیں لگتا تھا ایک ہی کمرہ تھا وہ جاتی بھی تو کہاں جاتی۔ ماں سے اس نے بہت کہا چلو گاؤں مگر اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس طرح کا کوئی ذکر وہ بھاؤ راؤ سے چھیڑ سکے۔

ایک روز ماں جیکی پر آٹا پسانے گئی تھی جب وہ واپس لوٹی تو بھاؤ راؤ شکنتلا کی عصمت دری کر چکا تھا۔ ماں کو اپنے کیے کا احساس ہوا اور اس بری طرح ہوا کہ پھر دوبارہ وہ بستر سے اٹھ نہ سکی۔

ابھی ماں کا کریا کرم بھی نہیں ہوا تھا کہ بھاؤ راؤ نے شکنتلا کو دھمکیاں دینی شروع کر دیں کہ ذرا بھی بھاگنے کی کوشش کی یا اس کی حکم عدولی کی تو وہ اس کے بھائی چھوٹو کو بھی ختم کر ڈالے گا اور شکنتلا کی ناک کاٹ دے گا خاندان میں ایک چھوٹو ہی اپنا رہ گیا تھا شکنتلا کو اس کی زندگی بے حد عزیز تھی اس نے بھاؤ راؤ کے خلاف اف تک نہ کی مگر جیسے جیسے شکنتلا کو سمجھ آتی گئی اس نے اپنے بچاؤ کے لیے راہیں ہموار کرنی شروع کر دیں اپنی ماں کا انجام اس کی نظروں کے سامنے تھا اس نے چالاکی سے بھاؤ راؤ کا سارا کاروبار اپنے قبضے میں لے لیا بلکہ بھاؤ راؤ اس کا محتاج ہو کر رہ گیا۔ چال کا کرایہ وہ وصول کرتی۔ سٹے کی بیٹ وہ لیتی۔ سراب کی بھٹی وہ چڑھاتی۔ سارے سفید و سیاہ کی مالک وہ بن بیٹھی بھاؤ راؤ کا ایک ہی کام رہ گیا تھا شکنتلا کے جسم سے حظ اٹھانا۔ جس میں نا کہنے کی بھی گنجائش نہ تھی اگر شکنتلا حاملہ بھی ہو جاتی تو اس کا بچہ گرا دیا جاتا کیونکہ بھاؤ راؤ خود دو تین جوان بچوں کا باپ تھا اسے بیوی بچوں کی نہیں ایک تندرست اور جوان جسم کی ضرورت تھی۔

اکثر شکنتلا کو محسوس ہوتا جیسے وہ ایک دم تنہا ہو گئی اور اسے تعجب ہوتا تھا کہ تنہائی کی شدت کے احساس کے باوجود وہ زندہ ہے اور تمام کام بحسن خوبی انجام پا رہے ہیں واہ رے انسان!

ادھر چرس اور گانجہ بیچتے بیچتے بھاؤ راؤ کو گردوں کے کینسر کی لت پڑ چکی تھی اور نشے میں وہ کسی وفادار کتے کی طرح شکنتلا کے اشاروں پر دم ہلاتا رہتا تھا۔ ادھر شکنتلا نے زندگی کو اس روپ میں کبھی قبول نہیں کیا مگر اس کا نعم البدل کیا ہو سکتا ہے۔ یہ اسے معلوم تھا مگر واسدیو کو دیکھ کر جیسے بغاوت کی آگ اس کی رگ رگ میں جاگ اٹھتی۔ یہ واسدیو بھی نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا جو کبھی اس کی جانب نظر بھی اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا ہاں! وہ مراٹھی کا اتنا نامور ادیب اور ڈرامہ نویس ہے کہ شاید اسے کم عقل، جاہل اور گمراہ سمجھتا ہے۔ شکنتلا کو سوچ سوچ کر کوفت ہوتی۔ بعض دفعہ وہ واسدیو سے کہتی "واسدیو تم تو ظلم اور استحصال کا قلع قمع کرنے نکلے ہو میرے لیے کچھ نہیں کرو گے؟" بھگوان تو نے کیسا نظام بنایا ہے جس میں عورتوں کے لئے ایسے لوگ بھی مددگار نہیں ہوتے ہیں جو دوسروں کے دکھ درد کو دور کرنے کا عزم رکھتے ہوں۔ پھر بھی اسے جانے کیوں واسدیو پر پورا

ضرورت ہے۔ دو ایک منٹ کے بعد واسدیو نے شکنتلا سے کہا۔ تم نے بھی کچھ نہ کچھ تو سوچا ہی ہوگا۔

شکنتلا کو جیسے ہی پتہ چلا کہ واسدیو دہلی سے واپس آگیا ہے اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ واسدیو کے کمرے میں جاتے وقت اسے اپنے قدم کچھ بھاری بھاری سے لگے۔ بڑی ہمت کر کے وہ اندر گئی اور بڑی بڑی دھات کی مورتی کو دیکھ کر اس نے کہا

"واسدیو تم بڑی مورتی دیکھ رہے ہو"

"وہاں سے ہی لے کر آیا ہوں" واسدیو نے کہا۔ آج واسدیو سے نظریں ملانے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں شکنتلا نے اس کے بارے میں کیسی کیسی باتیں سوچی تھیں وہ خود سے شرمانے لگی۔

"شکو بائی۔ یہ وہ پیسے ہیں جاتے وقت اگر تم ادھار نہ دیتیں تو شاید میں دہلی بھی نہ جا پاتا۔ کرایہ بھی ادا کر دوں گا تھوڑا صبر ابھی لے لو" واسدیو نے شکنتلا کو دیتے ہوئے کہا

میں پیسے مانگنے نہیں تم سے ملنے آئی ہوں۔ بہت بڑے آدمی بن گئے ہو نا تو معلوم ہے اب۔ انعام کی مورتی کہاں رکھو گے ؟ میں اسٹول لاتی ہوں۔

ٹھیک ہے مگر پیسے تو رکھ لو آخر تمہیں بھاؤ راؤ کو حساب دینا پڑتا ہوگا۔ مگر شکنتلا جا چکی تھی۔

عجیب عورت ہے واسدیو نے سوچا پچھلے دو سالوں سے روز کرایہ مانگتی تھی اب جب دے رہا ہوں تو لینے سے انکار کر رہی ہے۔ اتنے میں شکنتلا اسٹول لے آئی اور اس پر مجسمہ گوری کا کانسے کا مجسمہ رکھ واسدیو کو اس کی ادبی خدمات پر دہلی سے ملا تھا رکھ دیا۔

یکایک واسدیو نے کہا "دیکھو شکو بائی میں تمہارے لئے کپڑے لایا ہوں" سنہرے کپڑے دیکھ کر شکنتلا کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"سونے کے ہیں"

نہیں مگر کالے نہیں ہو جائیں گے واسدیو نے کہا۔ بہت مہنگے ہوں گے، شکنتلا نے پوچھا

"نہیں مہنگے تو نہیں ہیں"

واسدیو کا جواب سن کر وہ مچل گئی پھر تو مجھے نہیں چاہیے" اتنی دور سے اتنا سستا تحفہ لائے ہو"

اچھا ابا بہت مہنگے ہیں بس۔ اب تو خوش ہو جاؤ۔ وہ ہنسنے لگا دونوں خوش دلی سے ہنسنے لگے۔

تمہارا دوست شیخ بہت کم آیا تم نہیں تھے تو وہ اداس سا تھا۔ شکنتلا نے بتلایا

اچھا ؟

اور مجھے بھی کچھ اچھا نہیں لگتا تھا شکنتلا نے آہستہ سے کہا۔ واسدیو نے گہری نگاہوں سے شکنتلا کی جانب دیکھا تو اسے کچھ تبدیلیاں سی محسوس ہوئیں۔ جیسے وہ پہلے سے کچھ صاف ستھری اور اچھی لگنے لگی ہو۔ پاس میں گلے میں منگل سوتر تھا اور بال بھی سنورے ہوئے تھے۔

تم بہت اچھی ہو شکو بائی! واسدیو نے کہا ورنہ مہینے کا کرایہ ہونا نہ کھانے پینے کا۔

تم اتنی موٹی موٹی کتابیں لکھتے ہو، ناٹک لکھتے ہو، ناول لکھتے ہو اس سے ان کو دھن ملتا۔ ہاں پیسوں کی اتنی کمی رہتی ہے تمہیں دوسرے ملک کے لوگ انعام دیتے ہیں اور ہمارا۔۔۔۔۔

"یہ سب چھوڑ دو شکو بائی۔ مجھے کوئی گلہ نہیں ہے۔ تم صرف یہ بتاؤ کہ اور پاکیزگی آ گئی ہے یہ سب باتیں تو معمولی ہیں" واسدیو نے دیکھا کہ شکنتلا کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔

واسدیو کبھی میرے لئے بھی تم نے کچھ سوچا ہے؟ اس نے آخر ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔ تمہارے لئے میں بھلا کیا۔۔۔ کیا سوچوں گا؟ واسدیو نے تعجب سے پوچھا۔ اور اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ شکنتلا روتی ہوئی باہر چلی گئی۔ جانے کیوں واسدیو کو لگا جیسے قیمتی پتھر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور چلے گئے ہوں۔

رات بھر شکنتلا کروٹیں بدلتی رہی صبح جا کر کہیں اس کی آنکھ لگی۔ "شکو سالی اٹھ آج کیا سوتی رہے گی" بھاؤ راؤ کی کرخت آواز سن کر اس نے آنکھ کھولی۔ کافی دن چڑھ آیا تھا۔ سر میں شدید درد تھا جیسے ٹوٹا جا رہا ہو۔ ایک ایک جوڑ درد سے کراہ رہا تھا۔

"رات کو تو کیا روئی تھی۔ بھاؤ راؤ نے مشکوک نگاہوں سے دیکھا نہیں تو" شکنتلا نے بلاؤز کا بٹن لگاتے ہوئے کہا آج طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔

ہاں یہ رونا دھونا اپنے کو پسند نہیں۔ پوری دنیا کو لات مارتا ہوں، پاس رہتا ہوں اور تو بھاؤ راؤ کی۔۔۔ مزا چکھا دوں گا۔ تیرے بھائی کی ٹانگ توڑ دوں گا۔

دیکھ بھاؤ اس غریب کا نام مت لے

مرا لا ڈلا ہے نا کیسا درد ہوتا ہے جب اس کو مارتا ہوں۔ بھاؤ

نے کہا۔ ابھی تو کبھی اس کو مارا نا، دیوانگی شہرت [illegible] خدا قسم، میں ایک دن کھا کر سو جاؤں گی۔"

"دھمکی دیتی ہے سالی" بھاؤ راؤ نے تیسی لگائی "تو تم گئی تو پوری دنیا میں آگ لگا دوں گا۔" شکنتلا ڈبڈبائی آنکھوں سے بھاؤ راؤ کو دیکھتی رہی۔

"چل ادھر آ اور پیار کر میرے کو۔ سالی خالی مالی کا بھاؤ کھاتی ہے" پھر وہی سلسلہ جاری ہو گیا، جانے کب تک چلتا رہے گا اچانک واسدیو کے خیال سے اسے راحت ملی۔ یہی ایک واحد چیز تھی جس پر اس کو اعتبار تھا جو اس کی اپنی تھی سارے غموں کا مداوا۔ وہ واسدیو کے بارے میں ہی سوچتی رہی جیسے یہی اس کا روزگار ہو۔

"واسدیو آج پھر بھاؤ راؤ نے چھوٹو کو بہت مارا۔ وہ سارا غصہ چھوٹو پر نکالتا ہے" شکنتلا نے بتایا۔ "کیوں رہتے ہو تم لوگ یہاں، آخر چلے کیوں نہیں جاتے۔ اتنی بڑی دنیا ہے پھر ظلم سہنے کی ضرورت کیا ہے، برداشت کی بھی حد ہوتی ہے۔" واسدیو تلخ ہو گیا۔

"کہاں جائیں گے۔ کون ہمارا سہارا بنے گا۔ پھر بھاؤ سے بھی ڈر لگتا ہے کہ ہم کہیں بھی ہوں وہ ہمیں ڈھونڈ نکالے گا اور پکڑ کر واپس لے آئے گا اور خوب بدلے لے گا۔ ہمیں کسی مضبوط سہارے کی ضرورت ہے واسدیو! جو چٹان کی طرح ہماری پیٹھ سے لگ جائے۔" شکنتلا نے کہا۔

"کیا تمہیں اب تک ایک شخص بھی ایسا نہیں ملا جو تمہیں اس جہنم سے آزاد کرتا، تم سے شادی کرتا۔" واسدیو نے پوچھا

"ملا بھی تو اس نے کبھی نہیں پوچھا۔ اسے شاید سنسار کا خیال کرنے سے ہی فرصت نہیں کہ جو یہ ادھر ہو رہا ہے اسے بھی محسوس کرے لیکن اس میں اس کا بھی کیا قصور ہے بہرحال وہ ایک شریف آدمی ہے اور میں کسی کا کھیل ہوں" شکنتلا نے طنزاً کہا

"دیکھو شکونتلا! تم کیا کہنا چاہتی ہو وہ میں سمجھ رہا ہوں لیکن [illegible] کے لئے درمیانی محبت، ذہنی رفاقت بھی تو ضروری ہے۔ میں نے تمہیں [illegible] میں نے ایسا کبھی سوچا تک نہیں۔ میرے خیال میں [illegible]" بس شکنتلا ایک دم چپ ہو گئی جیسے طوفان تھم گیا ہو جیسے [illegible] بہہ گیا ہو۔

واسدیو "راستہ بتانے والے میں بہت ہمت ہونی چاہئے، کاش کہ تم اپنے آپ کو ٹٹولا ہوتا اور شکنتلا کے جذبات کا اس طرح مذاق نہیں اڑایا ہوتا" اس نے کہا "میں تمہیں پسند کرتا ہوں شکونتلا لیکن میری [illegible] گی

کا مقصد کچھ اور ہے [illegible] یہ کام زیادہ ہم سب ہمارے چکروں میں پڑ گیا تو الجھ کر رہ جاؤں گا سارا کام دھرا رہ جائے گا۔ ان دنوں میری طبیعت بھی اچھی نہیں رہتی ہے اور نہ ہی میرے پاس روپے ہیں کہ میں علاج کرواؤں، مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں [illegible] جیوں گا بھی نہیں اس لئے جو تھوڑا بہت وقت میرے پاس ہے اسے مجھے کام میں لگانے دو۔ تم میرے ساتھ اور دکھی ہو جاؤ گی۔" واسدیو نے سمجھایا۔ "سارے پیسے [illegible] والے [illegible] لیتے ہیں وہ تمہیں کیا دیتے ہیں ایک اسکاچ کی بوتل اور دو روپے کے پکوڑے" شکنتلا جھنجھلائی

"اگر پرمز اور پبلشر کو فائدہ ہوتا ہے اور مجھے کچھ نہیں ملتا، محض اس لئے میں لکھنا بند نہیں کر سکتا، شکونتلا تم جوان ہو حسین ہو، ذہین ہو اس لئے راستہ خود نکالو میرے پاس تو اتنا بھی وقت نہیں ہے کہ اپنے بارے میں تمہارے متعلق سے کچھ سوچ سکوں۔ اپنے آپ کو یہاں سے نکالو ہر کوئی راہیں خود مل جائیں گی" وہ بولا "تمہارے بنا میں یہ سب نہیں کر سکوں گی واسدیو۔ کیا تم اپنا فیصلہ بدل نہیں سکتے۔ تھوڑا سا وقت اگر میرے لئے بھی نکال سکو تو مجھے مل لینا۔ مجھے تمہارا انتظار رہے گا۔" یہ کہہ کر شکنتلا چلی گئی مگر واسدیو بکھری کتابوں، پھٹی پرانی بالٹیوں اور میکسم گورکی کے [illegible] کے ساتھ تنہا رہ گیا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے تھے، اس نے اپنے آپ کو بے حد کمزور محسوس کیا جیسے سارے قویٰ مضمحل ہو گئے ہوں۔ رات بھر وہ لکھتا رہا برق رفتاری سے، جب تھک گیا تو ایک جانب لڑھک گیا۔

صبح آنکھ کھلی تو سورج نصف النہار پر پہنچ چکا تھا، واسدیو نے سوچا زندگی بھی کتنی بے کیف، بے معنی ہوتی جا رہی ہے پرکاش نگر جو اس [illegible] کا نام ہے۔ یہاں کتنی گھٹن اور کتنا اندھیرا ہے۔ فرسٹریشن نے اسے دبوچ سا لیا، وہ بہت [illegible] جیسے کسی دلدل میں [illegible] ہو۔ پھر وہ اپنے دوست شیخ [illegible] چلا گیا اور [illegible] واپس آیا تو وہ کچھ زیادہ ہی FRASTRATED تھا اور مغموم بھی۔ بھاؤ راؤ کے اڈے سے [illegible] منگوا کر پیتا رہا اور بنا کھانا کھائے لیٹ گیا۔

یہ سلسلہ کئی دنوں تک چلتا رہا۔ شیخ نے ایک مرتبہ ضد کر کے ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا جس نے ڈھیر سارے ٹیسٹ کروانے کی صلاح دی۔ شیخ کو ناگہانی [illegible] کے ساتھ [illegible] جانا تھا۔ یہ سارے ٹیسٹ اب واپسی ہی پر ممکن ہو سکتے تھے۔ لہٰذا وہ شکنتلا کو ہدایت کر گیا کہ وہ واسدیو کا خیال رکھے۔ شیخ نے شکنتلا کو [illegible] خوشخبری بھی سنائی کہ تقریباً واسدیو کی پانچ

کہانیوں پر فلمیں بن رہی ہیں ایک تو مکمل ہو چکی ہے بس آج کل میں ریلیز ہونے والی ہے' پھر واسدیو کہاں ہوگا اور ہم لوگ کہاں ہونگے شکو بائی' فلیٹ گاڑی سب ہو جائے گا"۔ شیخ کی ہدایات کے مطابق شکنتلا روزانہ کھانا بھیجتی رہی مگر واسدیو نے وہ کھانا چھوا تک بھی نہیں، گھٹن اور اداسی جیسے اسے دبوچے رہی، فرسٹریشن تھا کہ بڑھتا ہی گیا۔

ایک روز صبح اس کی آنکھ کھلی تو کلیجے میں درد محسوس ہوا' کنارے آنکھیں جل رہی تھیں' کیلنڈر پر نظر ڈالی تو ۳۰ ستمبر جمعہ کا روز تھا اس روز اس کی فلم کا پریمیئر شو تھا اسے تیار ہو کر جانا تھا وہ اٹھنے لگا تو بستر ہی پر لڑھک گیا ایک گھبراہٹ سی طاری ہوئی اور اسے قے ہو گئی' اپنی میلی سفید چادر پر چاروں طرف خون پڑا دیکھ کر اسے عجب دہشت سی ہوئی بڑی مشکل سے وہ دروازے تک گیا' اتفاقاً چھوٹو نظر آیا۔ واسدیو نے چھوٹو سے کہا کہ "فوراً شکو بائی کو بھیج دو اور اس سے کہنا کہ میں نے ابھی اسی وقت اسے بلایا ہے"۔ وہ اپنے بستر تک بھی نہیں پہنچ پایا تھا کہ ساری دنیا اس کی نظروں میں گھومنے لگی جیسے وہ ڈوبتا چلا جا رہا ہو اندھیروں میں اتھاہ گہرے غاروں میں گرتا ہی جا رہا ہو، وہ اپنے بستر تک پہنچنے سے قبل ہی زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

جیسے ہی چھوٹو نے شکنتلا سے کہا کہ واسدیو نے اسے بلایا ہے اس کا رواں رواں لرز گیا' خوف کی ایک لہر اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی اس نے سوچا' میں بھی کتنی کٹھور اور خود غرض ہوں' اتنا عرصہ ہو گیا اور واسدیو کے قریب تک نہیں گئی' محض دور ہی سے اسے دیکھتی رہی میں چندن ہار کی طرح آج اس کے گلے سے لپٹ جاؤں گی اس سے کہوں گی واسدیو! فوراً یہاں سے مجھے لے چلو' اپنی شفقت کی گھنی چھاؤں میں بھلے ہی ہمیں کسی درخت کے نیچے جھونپڑا بنا کر رہنا پڑے اس دت کی طرح جو ہمارے سامنے والے برگد کے پیڑ کے نیچے اپنے دونوں بچوں کو لے کر رہتا ہے' مگر اس کے یہاں زندگی کی للک تو ہے' ساری امنگیں ہیں، جینے کی ساری خواہشیں اور گرہست جیون کی ساری کامنائیں تو موجود ہیں' واسدیو! ہم بھی ایسا ہی کریں گے۔ تم ہی تو کہتے تھے زندگی میں سہاروں کی ضرورت ہوتی ہے پھر خود ہی سہارا دینے سے کیوں ہچکچاتے رہے ہو۔ وہ سوچتی رہی اور تیز تیز قدموں سے واسدیو کی کھولی کی جانب بڑھتی رہی۔ ❋

[مراٹھی لوک شاہیر انا بھاؤ ساٹھے کی حالاتِ زندگی سے متاثر ہو کر]

# مکتوبات

**محمد عقیل** ۔ سینٹ ہاؤس الٰہ آباد یونیورسٹی الٰہ آباد (یو پی)

شاعر ستمبر کے حالیہ شمارے میں جس پر ہما ماصل کی تصویر چھپی ہوئی ہے، سفرنامے لندن ۔ او ۔ لندن پر ایک تبصرہ جناب بال انصاری صاحب کا شائع ہوا ہے ۔ یہ تبصرہ اس لحاظ سے بھرپور ہے کہ تبصرہ نگار نے پورے سکون کے ساتھ اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے ، صرف سرسری پڑھ کر نہیں لکھا ۔ ظاہر ہے کہ کسی کتاب کو پڑھ کر ہر قاری کو یہ حق پہنچتا ہے کہ جو کچھ اس نے سمجھا اور محسوس کیا ، جو کچھ خوبیاں اور خرابیاں اسے نظر آئیں ان کو بے کم و کاست بیان کر دیا ۔ اور بالی صاحب نے یہی کیا بھی ہے ۔ مصنف تو اپنی ہر تحریر اور کتاب کے ہر حصّے کو پسند ہی کرتا ہے اس لیے یہ خیال گزرتا ہے کہ ملاجلے یہ بھی تبصرہ نگار لکھتا تو اچھا ہوتا ۔ یہ خیال ہوتا ہے کہ کسی تبصرہ نگار سے برائی نہیں اور بادام توسا دالے ان کیوں قابل اعتنا نہیں کہا ۔ مگر اپنی اپنی رائے ہے ۔ بالی صاحب کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ یہ سفرنامہ ، سیر و تفریح سے زیادہ تاریخی اور ادبی نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہے ۔ بالی صاحب سے پہلے بھی لوگوں نے اپنے اپنے ڈھنگ سے لندن ۔ او ۔ لندن پر تبصرے کیے ہیں ۔ کسی کو یہ خیال ہوا کہ اس میں مصنف نے رومان انگیز واقعات نہیں لکھے ۔ ایسے واقعات سے یہ سفرنامہ اور دلچسپ ہو جاتا ۔ کسی کو یہ شکایت ہے کہ اس میں ادب اور تاریخ و تہذیب کی اتنی باتیں کی گئی ہیں کہ عام قاری کی دلچسپی کم ہو جاتی ہے کہ عام قاری رومان و معاشقوں کی تلاش سفرناموں میں کرتا ہے اور بہت سے تحیّر زا واقعے بھی ڈھونڈتا ہے جو سفرنامے کو رومانی اور سوسی واقعات کا آئینہ بنائے ۔ مصنف نے اس میں تنقید کی فضا پیدا کر دی ہے ۔ ایک قاری نے یہ بھی کہا کہ اگر مصنف نے اس میں کچھ معاشقے بھی لکھے ہوتے جیسا کہ مستنصر حسین تارڑ نے کیا ہے تو یہ سفرنامہ تخلیقی ہو جاتا ۔ گویا تخلیقی ہونے کے لیے معشقیہ داستانیں ضروری ہیں خواہ جتنے من گھڑت باتیں ۔ اب قاری کو کیا معلوم کہ مصنف اور نیو بند رسول ہے ۔ اونیسیس ONAISIS نہیں امیر عمر کی خالق کا بیڑہ کر اٹھتر سال کی عمر میں معاشقہ شروع کرے ۔ زندگی کے ابتدائی اوراق بھی اس لحاظ سے سادے ہیں تو اس بچی یہ شوق کہاں سے پیدا کرتا ۔ پھر اسے اس کا بھی محاورہ نہیں کہ جوش کی طرح ، یادوں کی برات لکھتا ۔ یہ سفرنامہ محض ایک مطالعہ ہے تسیروا فی الارض " کا اتباع ۔ اب جو کچھ اپنے مطالعہ میں آیا وہ قلمبند کر دیا گیا ۔

بالی صاحب نے زبان کے کچھ اغلاط اور تسامحات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے ۔ میرا خیال ہے کہ بعض معاملات میں ان کو سہو ہوا ہے ۔ مثلاً میں نے ایک جگہ " طرّاف " کا لفظ استعمال کیا ہے ۔ بالی صاحب کا خیال ہے کہ " طرّاف " ، طریف کی جمع ہے ۔ یہ صحیح نہیں ہے ۔ طریف کی جمع " ظرفا " ہے " طرّاف " نہیں ۔ " ظرّاف " تو واحد ہے اور ظریف کا مبالغہ SUPERLATIVE DEGREE ہے جیسے " رحیم " سے " رحمان " ۔ مجھ سے پہلے بھی لوگوں نے " ظرّاف " استعمال کیا ہے ۔ مثلاً رتن ناتھ سرشار کے فسانۂ آزاد جلد اوّل ص ۲۹۷ نولکشوری ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۲۸ء میں " ظرّاف " ایک عنوان بھی قائم کیا گیا ہے ۔ پھر جہاں واقعہ " ظرّاف " مولوی صاحب اور دیگر کرداروں کی گفتگو لکھی گئی ہے اس میں یہ عبارتیں بھی شامل ہیں ۔ مثلاً ؛

۱۔ ظرّاف ۔ بھئی دق کر دیا ہمیں ہم نے دو " ظرّاف " اور دیکھے ۔ یک نہ شد دو شد ظرّاف ۔ روش ملی ۔ ڈاک جانے جا کر ایک آنہ کا پوسٹ کارڈ لے آؤں ۔

۲۔ میاں آزاد ایک دل لگی باز ۔ قریب جا کر پوچھتے ہیں میاں یہ تمہاری گود میں کس کا بچہ ہے ۔ وہ بھی حاضر جواب آدمی اس نے کہا مت ٹھونک ۔ پلا پڑتا ہے میاں آزاد کی باچھیں کھل گئیں ۔ کو ہیر سے ایک ظرّاف تو ملا ۔ لوڑا ہاتھ ملایا ۔ (فسانۂ آزاد ص ۲۹۷ جلد اول ) مثال میں ظرّاف بھی ہے اور ایک ظرافت بھی ۔

دوسرا اعتراض بالی صاحب کا یہ ہے کہ میں نے ایک جگہ " زمیں معتوروں کا کعبہ " لکھا ہے ۔ ان صاحب کا خیال ہے کہ یہاں " مصوّروں کا مکّہ " ہونا چاہیئے ۔ مکّہ عرب ایک شہر ہے ۔ اس کا احترام کعبے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے ۔ ایمان والوں کی عقیدت کعبے سے ہے اور " مکّے " کا احترام اس لیے ہو گیا کہ وہاں کعبہ ہے پھر یہ اردو کا محاورہ بھی نہیں ہے ۔ پھر یہ اعتراض تو سب سے پہلے اقبال پر ہونا چاہیئے جنھوں نے مسجد قرطبہ کو کعبۂ ارباب فن لکھا ہے ۔ وہ مکّۂ ارباب فن لکھ سکتے تھے ؂

کعبۂ ارباب فن سطوتِ دینِ مبیں
تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں

میرے بیان میں بھی ارباب فن ہی کا تذکرہ ہے اور اگر بالی صاحب کا یہ خیال ہے کہ احتراماً " کعبہ " نہیں لکھنا چاہیئے تو شعر و ادب میں مولویوں کی اصلاحیات کہاں چلتی ہے ۔ اردو شعرا نے تو ایک قدم اور آگے بڑھ کر مقدسات پر چوٹ تک کی ہے ؂

کس کا قبلہ کیسا کعبہ ، کون حرم ہے کیا احرام
کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا (میر)

کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ
کچھ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا (سودا)

دل بدست آور کہ حج اکبر است

یوں تو تاریخ میں ایک دور ایسا بھی گزرا ہے جب مسلمان عمارۂ کعبہ سے سنگ اسود اکھاڑ کر عالمِ عمان اٹھا لے گئے اور کچھ مدت تک اس قابلِ احترام پتھر کو عمان ہی میں رکھا پھر ایک بھاری رقم لے کر واپس کیا ۔ یہ قرامطہ تھے ۔ اسی کے ساتھ یہ بھی سوچیئے کہ یہ جو لوگ اپنے والد محترم کو قبلہ و کعبہ ، اور قبلہ گاہی یا قبلہ گاہ لکھتے ہیں کیا وہ کعبے کی توہین کے مرتکب ہوتے ہیں ؟

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ میں نے " کچھ چاول اور سالن نکال کر دیئے " لکھا ہے ۔ یہاں بقول بالی صاحب " نکال کر دیا کا محل تھا " ۔ بھئی بالی صاحب یہ زبان کا مسئلہ ہے ۔ مختلف جگہوں میں مختلف طرح سے لوگ بولتے ہیں ۔ ہم لوگ " پکے ہوئے چاول " ہی بولتے ہیں ۔ " میٹھے چاول " بولتے ہیں ۔ " روٹیاں پکی ہیں " نہیں بولتے ۔ پھر چاول کے ساتھ سالن بھی ہے ۔ معلوم نہیں آپ یہ باریک بات کیسے بھول گئے ۔ خیر آپ ان سب جھگڑوں میں کہاں پڑیں گے ۔ ہمارے گھروں میں جس طرح بولتے ہیں جیسا کہ میں نے لکھا ہے ۔ آپ کے گھر کی زبان وہی ہو سکتی ہے جو آپ نے اصلاحی طور پر لکھی ہے ۔ معیاری اردو جو لکھنؤ میں کبھی بولی جاتی تھی اور آج بھی پرانے گھروں میں بولی جاتی ہے ، اس میں پکے چاول ، جمع ہی بولتے ہیں اور اعمال پر اس کی جمع کا اثر بھی ہوتا ہے ۔ لندن میں ایک مدرّس نے اس سفرنامے پر یہ اعتراض بھی کیا کہ اس میں " گدلا " کو " گندلا " لکھا گیا ہے جو غلط ہے ۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ اول تو اس کتاب میں " گدلا " بھی ایک جگہ لکھا ہے اور ایک جگہ " گندلا " بھی مگر اصل لفظ گندلا ہی ہے جو گندہ + لا سے مل کر بنا ہے ۔ ہندی لفظ ہے اور پوربی ہندی میں " گندلا " ہی صحیح ہے ۔ انھوں نے سند طلب کی ۔ میں نے کہا کہ بیرا لکھنا ہی سند ہے ۔ جس طرح " دُھند " سے " دُھندلا " بنا ، اسی طرح گندہ سے " گندلا " اور گندا بھی بنا ۔ اسی طرح مُند سے مندا بنا ۔ " بازار مندا ہو گیا " اور " بازار مندا ہو گیا " ۔ " سستا مَندا " بھی درست ہے اور " سستا مندا " بھی صحیح ہے ۔ مثالیں اور بھی ہو سکتی ہیں مگر اتنی ہی کافی ہیں ۔ کبھی کبھی کاتب بھی اپنی لیاقت دکھاتے ہیں ۔ اس سفرنامے میں ایک جگہ میں نے لکھا تھا کہ " شاعر چیزوں کو کس طرح PERC FIVE کرتا ہے " ۔ کاتب صاحب نے اس کو اس طرح لکھا کہ " چیزوں کو کس طرح PICCA DILLY کرتا ہے " ۔ میرے ایک مضمون میں جو شاعر کے اسی شمارے میں چھپا ہے ۔ حضرتِ کاتب نے " پیچیدہ " کو " بے چیدہ " لکھ دیا ہے ۔ اب ان سے کون فریاد کرے کہ حضرت " پیچیدہ " لفظ " پیچ " سے بنا ہے اور " بے چیدہ " کے کیا معنی ہوئے ؟ پھر ایک وقت یہ بھی آ سکتا ہے کہ آپ کا نام کاتب یوں لکھے " بالی آن صاری " ۔ اگر پیچیدہ ، بے چیدہ ہو سکتا ہے تو " انصاری " ، " آن صاری " کیوں نہیں ہو سکتا ۔ خیر یہ تو محض لطف لینے کے لیے ہے ۔ اور دلّی کے کاتبوں کے لیے بھی جو " پیچیدہ " کو برابر " بے چیدہ " لکھ رہے ہیں ۔

**میرزا ادیب** ۔ لاڈ صحرا ، چوبال روڈ ، اسلام پورہ لاہور

شاعر کے دو شمارے ملے ، یوں محسوس ہوا جیسے ممبئی کے شاداب ترین علاقے سے محبت و دوستی ہوا کا جھونکا آگیا ہے ، یادوں کی دنیا میں ہلچل پیدا ہو گئی ہے ، علامہ سیماب سامنے آ گئے ہیں اور میرا سر فرطِ ادب و احترام سے جھک گیا ہے ۔ اعجاز آ گئے ہیں اور میں ان سے لپٹ لپٹ گیا ہوں ۔

میں اپنا ہاتھ بڑھا کر آپ کے سر پر پھیر رہا ہوں ، زندہ رہو اعجاز خوش رہو افتخار ، اپنی خاندانی روایات کو ساتھ لے کر چل رہے ہو ۔ یہ بہت شاندار بہت تابناک خاندانی روایات ہیں ۔ اللہ آپ کو اور ان روایات کو زندہ رکھے ۔

شاعر میرا اپنا پرچہ ہے ، اس پر اتنا حق ہے کہ اس کے لیے جو چاہوں گا لکھوں گا ، جو چاہوں گا بھیجوں گا ۔

عزیزی ! آپ کو خبر نہیں ہو گی کہ میری زندگی کا ایک سال ممبئی میں گذرا ہے ، وہ تب دور کبھی فراموش نہیں کر سکتا ۔

**عطیش بڑودوی** ۔ یاقوت پورہ ، بڑودہ ۔ ۴

مہاراشٹر میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کی تحریک ضرور کامیاب ہو گی ، یوپی میں بھی اسے دوسری سرکاری زبان کا درجہ مل گیا ہے ۔ الیکشن سے پہلے اردو والوں کو اپنی تمام مانگیں منوا لینی چاہئیں جو آسانی سے پوری ہو سکتی ہیں بصورتِ دیگر وہ اعتماد کھو دیں گے ۔ اردو میں بچوں کا مسئلہ قدرے پیچیدہ ہو چلا ہے یہ خوف رہتا ہے کہ مٹ جائے گا یا نہیں اور جب تک یہ خوف دور نہیں ہو گا اردو میں بچے لکھنے کا جو کام ہی اٹھا پائیں گے اور یہ مسئلہ پورے ملک کا ہے ایک دو صوبوں کا معاملہ ہوتا تو بات اور تھی ۔

**ڈاکٹر جمیل جالبی** ۔ ۱۲ ۔ ڈی (مرلی) الیف ۸ ، جیلینا ، اسلام آباد

شاعر کے دو شمارے (۱۹۸۳/۲،۱) موصول ہوئے، انتہائی شکر گزار ہوں۔ ہمیشہ کی طرح قدیم اور جدید تحریروں کا امتزاج ان پرچوں میں موجود ہے۔ نعمات خلیل کی خود نوشت دلچسپ ہے۔ سید محمد عقیل کا مقالہ گیسوئے صدی کی غزل پسند آیا۔ اکبر حیدری کشمیری نے علامہ سیماب اور منشی محمد دین فوق کے تعلق پر نیا مواد فراہم کیا ہے۔

**پروفیسر عتیق احمد** ۔ آر ۱۹۵۔ بلاک نمبر ۱۵، دستگیر سوسائٹی کراچی ۳۸

آپ کا احسان مند ہوں کہ یاد فرمایا اور شاعر کے دو شماروں کی سوغات سے نوازا۔ دونوں شمارے دیکھ لئے ہیں، طبیعت سیر ہوئی۔ آپ کی لگن اور جدید اردو ادب کے سب ہی قارئین کے لیے ہمت اور حوصلہ افزا ہونا چاہیئے۔ میں نے تو دافعتاً یہی محسوس کیا ہے۔ ہوا کا تازہ جھونکا ایسا کہ سانس لو تو توانائی کا احساس ہو۔

**سلطان سبحانی** ۔ ۱۹۳ مہاراشٹرا ہاؤسنگ بورڈ کالونی، مالیگاؤں

شاعر شمارہ نمبر ۳ دستیاب ہوا۔ شکریہ۔ خورشید سمیع کا مضمون نئی شاعری کے پیچ و خم "حقیقت پسندانہ، بیباکانہ اور مردانہ شان رکھتا ہے۔ اس مضمون کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ خورشید سمیع نے چاروں سمت نگاہوں کو گردش میں رکھا ہے جس کی وجہ سے نئی شاعری کا پورا منظرنامہ مع تجزیہ نامہ، کارنامہ اور اعلانامہ مضمون کے پیچ و خم میں جھلک نما ہو گیا ہے۔ سمیع صاحب نے عصری مشرقی شاعری کو مغربی ادب کے حوالوں سے پیمانے کی بجائے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے جس کی وجہ سے پورا مضمون منطقی اصر گیا ہے۔ تفکر اور تجزیہ کے بیچ میں کہیں کہیں جلال و جمال کی کیفیت بھی پیدا ہو گئی ہے۔ ممکن ہے بہت سے حضرات چیں بہ جبیں ہوں لیکن حقیقت سے انکار یا انکار فن کاروں کا شیوہ نہیں ہے اس مضمون کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کسی مخصوص گروہ کو سہرا باندھنے کے لیے سامنے نہیں رکھا گیا ہے بلکہ مختلف رجحان و نظریہ رکھنے والے شاعروں کو بھی نئی شاعری کی صف میں مناسب مقام پر کھڑا کر دیا گیا ہے ورنہ عرصہ سے دیکھنے میں آرہا ہے کہ ہمارے بعض متعصب، تنگ نظر اور مبتذل اپیل نقاد ترقی پسندوں کو صرف رسوا کرنے کے لیے یاد فرماتے ہیں لیکن کہاں میں ان کے تاریخی کارناموں کو دیکھنے کی تاب نہیں ہے۔ خورشید سمیع کا مضمون "روایتی" جدید تنقید کی پشت پر چابک کی آواز ہے۔

اس کے برعکس کہانی یا افسانہ "کے عنوان سے مہدی جعفر کا تبصرہ محض رسمی سا ہو گیا ہے۔ مہدی جعفر بہت عرصہ سے جدید افسانہ پر تبصرہ فرما رہے ہیں اور اب جو ان کا پہلا جملہ دیکھتا ہوں کہ "افسانہ ایک اہم صنف سخن ہے" تو سوچتا ہوں کہ یہ نادر جملہ آنا لسا عرصہ گزارنے کے بعد کیوں لکھ رہے ہیں۔ اسے تو ابتدائی دور میں لکھا جانا چاہیئے تھا۔ کیا افسانہ بھی اب غزل یا رباعی ہو گیا ہے؟ اس جملے کے آگے کے جملوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مہدی جعفر باقاعدہ طور پر افسانہ پڑھانے لگ گئے ہیں مثلاً "... ارتقا اور توسیع سے بھی مختلف ہے" "... صورتوں کو غلط ملط نہیں کرنا چاہیئے ...." "اگر نہیں ہے تو ہونی چاہیئے" وغیرہ وغیرہ۔ "کہانی یا افسانہ" پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی گذشتہ کی باتوں کو دوبارہ لکھ گئے ہیں۔ صرف کہانی اور افسانہ کے فرق کی "اختراع" اس مضمون میں نئی شے ہے۔ اگر وہ اس مضمون کو ہندی میں لکھتے تو پتہ نہیں افسانہ کو کس نام سے پکارتے۔ خیر اس ذکر کو چھوڑیئے۔ جدید افسانہ کی ناکامی اور زوال کا سبب ہمارے نقادوں کی وہ کھیپ ہے جو محض ردعمل کے طور پر ظہور پذیر ہوئی۔ ان حضرات نے ایک طرف تو افسانہ نگاروں کو گمراہ کیا اور دوسری طرف اس کی وہ ساری خوبیاں بھی چھین لیں جو اسے ورثہ میں ملی تھیں۔ شاید وہ اس بات کو بھول گئے کہ افسانہ ہو یا شاعری، وہ توانائی کے مضامین کے باعث زندہ رہتی ہے۔ کاغذ کے دم پر نہیں۔ بلکہ ان کی زندگی کی ساری باگ ڈور قارئین کے ہاتھ میں ہوتی ہے ——— جدید افسانہ کی ناکامی کا سب سے کھلا ثبوت یہ ہے کہ ہمارے وہ نقاد جو سکہ رائج الوقت کی چمک سے سرتاپا مسرور تھے اب ان پر دو بارہ پالش کرنے لگ گئے ہیں اور دوسرا ثبوت یہ ہے کہ وہ پریم چند کے تلامذہ میں دراڑ ڈالنے یا کرشن چندر اور منٹو کو فراموش کرنے کے خواب دیکھنے لگے ہیں۔ پتہ نہیں کیا وجہ ہے کہ گذشتہ چند ماہ میں برسوں سے کچھ مخصوص افسانوں کے عنوانات کی رٹ جاری ہے گویا نئے افسانے لکھے ہی نہیں گئے۔ کچھ نقاد ایسے بھی ہیں جو صرف "شب خون" میں چھپے ہوئے افسانوں کو زیادہ پہچانتے ہیں یا جن افسانوں میں تصدہ بازی نہیں ہوتی انھیں نظرانداز کر دیتے ہیں۔ ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتنی ترمیت یافتہ نسل ہمارے سر پر کھڑی ہے۔

دیواروں کے بیچ خوش گوار ہے۔

**مختار شمیم** ۔ الیف۔۲، گورنمنٹ گرلز کالج کیمپس موتی لال نہرو روڈ

شاعر کے شمارہ ۱ اور ۲ میں مداما صلی کی خود نوشت سوانح حیات کی اشاعت کا سلسلہ خوب ہے۔ خود نوشت سوانح لکھنا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ ممکن ہے کہ مداما صلی کی بے باکی معترضین کو اختلاف کا موقع دے لیکن خود نوشت تو خود شناسی کے آئینہ میں سچائی کی تصویر ہے۔ یہ بے باکی بھی چھپی نہ گئی تو حقائق پر دھند چھا جائے گی۔ بہرحال "دیواروں کے بیچ" کا سلسلہ دلچسپ ہے۔ اداریاں کی رنگینی قاری کو مسحور کرتی ہے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا مضمون اردو املا اور لسانیات بھی فکر کے ان دونوں شماروں میں سلسلہ وار شائع ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پچھلے دو تین برسوں میں اس موضوع پر پروفیسر ابو محمد سحر کے مضامین نے ماہرین لسانیات کا چین و آرام چھین لیا ہے۔ ڈاکٹر نارنگ کا مضمون ان کی اسی بے چینی کا مظہر ہے۔ میری مختصر رائے میں انھوں نے سحر صاحب کے جن مضامین کا حوالہ دیا ہے وہ ان سے سرسری گذر گئے ہیں۔ ٹھنڈے دل سے ان پر غور کرتے تو شاید اتنے برہم نہ ہوتے۔

خود صاحبات کا عمل ان پر اتنا ستم ہے کہ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ پروفیسر ابو محمد سحر کی تحریر حیثیت کی منکر نہیں ہے علمی اختلافات الہام و تعبیر کی راہ متعین کرتے ہیں لیکن ڈاکٹر نارنگ نے اپنے مضمون کی ابتدا میں ان اختلافات کو ذاتی رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ اس قسم کی تحریر نارنگ صاحب کے شایان شان نہیں ہے۔

شاعر شمارہ نمبر ۳ کے نادریات میں آپ نے امیر خسرو کی مثنوی قران السعدین کے ایک صفحہ کا عکس شائع کیا ہے لیکن میں قران السعدین کی سرخی دیکھ کر حیران ہوں۔ کاتب نے ہر جگہ قرآن السعدین لکھا ہے جبکہ اصل قِران السعدین ہے (قران السعدین کی معنی ہیں زہرہ اور مشتری کا ایک برج میں ہونا) براہ کرم قریبی شمارے میں اس غلطی کی تصحیح کر دیں۔ زیر نظر شمارے کا حاصل ہیں عتیق حنفی مرحوم اور عرفان صدیقی کی غزلیں۔ عرفان صدیقی کو مبارکباد۔

**ساجد حمید** ۔ نمبر ۱۶۔ نہرو نگر، ساگر ۵۷۷۴۰۱ (کرناٹک)

شاعر کے شمارہ نمبر ۳ میں مضامین اور شعری حصے میں مطابقت نظر نہیں آتی۔ ایک طرف آپ جدیدیت اور جدید اردو شاعری کی بھوری مضامین شائع کرتے ہیں تو دوسری طرف جدید نظموں کا اسا رسٹا مل ہوتا ہے یہ پالیسی سمجھ میں نہیں آتی۔

**مشتاق مدنی** ۔ ۲۔ موتی اپارٹمنٹ بالمقابل بدوڑہ پولس اسٹیشن

تازہ شاعر ملا، سرورق نے حد جاذب نظر اور سلطان کے تخلیقی ذہن کا آئینہ دار ہے۔ منظومات میں عبداللہ کمال کی تینوں پسند آئیں۔ بقیہ منظومات بھی معیاری اور نئی وعصری اردو شاعری منتشر مگر خلاق ذہنوں کی عکاس ہیں۔ افسانے یوں تو سبھی اچھے ہیں مگر ساجد رشید کی کہانی "اس کے بعد" مجھے بہت اچھا لگا۔ اس کہانی کا واقعی کرب کی انتہاؤں کو جس انداز سے ختم شد کر گیا وہ کم از کم میرے لیے تو بالکل ہی نیا اور انوکھا اختتام تھا۔

**کشور** ۔ ۵۔۱۲۷، اکراسس روڈ نگر سنگمور،

"فصل اپنی" (شمارہ نمبر ۳) بہت ہی مؤثر ہے۔ رسالے کے مالی تعاون کے سلسلے میں عرض ہے کہ کچھ ایسے نام نہاد رسالے جو ادبی کہلائے جاتے تھے محض چند شعراء و ادباء کے مالی تعاون سے گڑھے رہ گئے ہیں کیوں کہ وہاں مدیر کیلئے فن سے زیادہ مقدم کرم فرما ہو جاتے ہیں کہلائے جاتے تھے محض چند شعراء و ادباء سے گھٹیا ہو کر رہ گئے کہ وہاں مدیر کے لیے فن سے زیادہ مقدم کرم فرما ہو جاتا ہے۔

**شاہد دھنباری** ۔ ٹی۔سی۔ کمپاؤنڈ، دھنباد

شاعر شمارہ نمبر ۳ کی فصل اپنی سے میں پوری طرح متفق ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعر ہندوستان میں اردو کا سب سے اچھا رسالہ ہے اور جب معیاری ہے تو اس پر ذمہ داریاں بھی بہت ہیں۔ آپ ان ذمہ داریوں کو کامیابی کے ساتھ پورا کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ اردو کی جو عملی تحریک آپ نے شروع کر رکھی ہے اس کے بارے میں خاص کر ہم بہار والے عمل پیرا ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ مل گیا ہے۔ اب ہمیں اسے دوام رکھنا ہے اور اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم خط و کتابت، تہذیب و ثقافت میں اردو کو شامل کریں۔

تازہ شمارے میں خورشید سمیع کا مضمون نئی شاعری کے بے حد عالمانہ مقالہ ہے۔ غزلوں میں عبداللہ کمال کی غزل کا یہ شعر چھو گیا ہے

عجیب گزشت کی خوشبو اڑی ہے ملگجا تیا
کسی شجر پہ کہیں اک مکان سے بھار

* گذشتہ شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی معیاری ہے۔ صاحب کی خود نوشت بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔

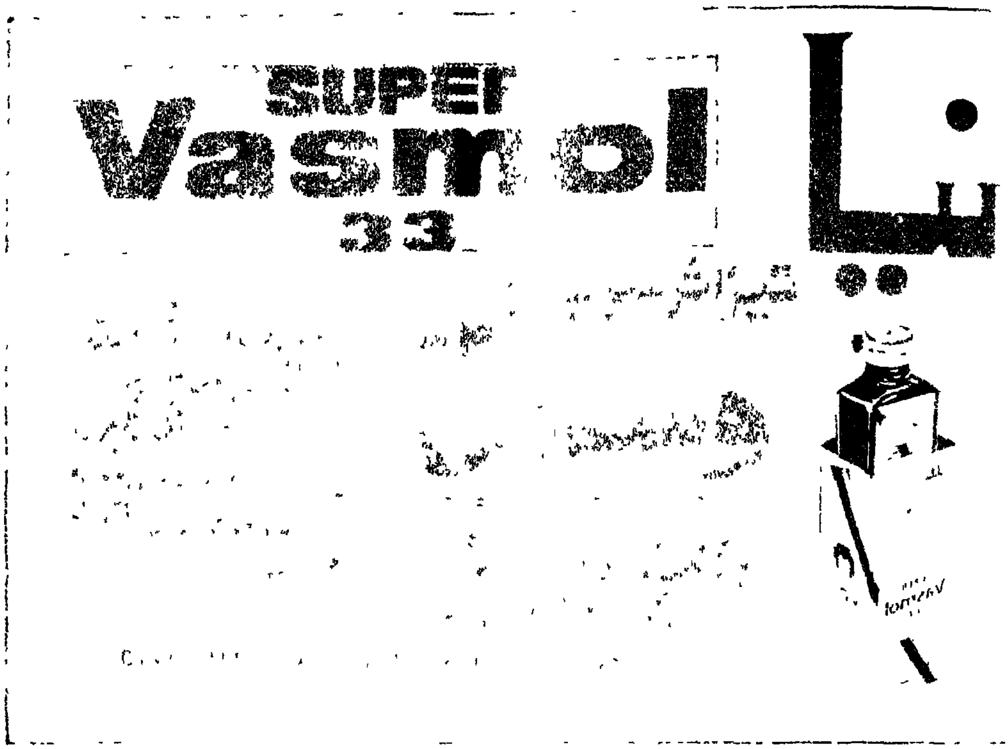
تحریر ہے ——— **نیاز جے راج پوری**

* آپ کی تحریر سیدانی کہ پتہ اردو میں لکھیے، دیے ہوئے خطوط اردو میں اردو کے پتوں کے ساتھ ہی پوسٹ

**ملکہ نسیم**

* شاعر کے دونوں شماروں کے مندرجات بے حد مداما صلی کی خود نوشت بہت دلچسپ ہے

الور
زردہ

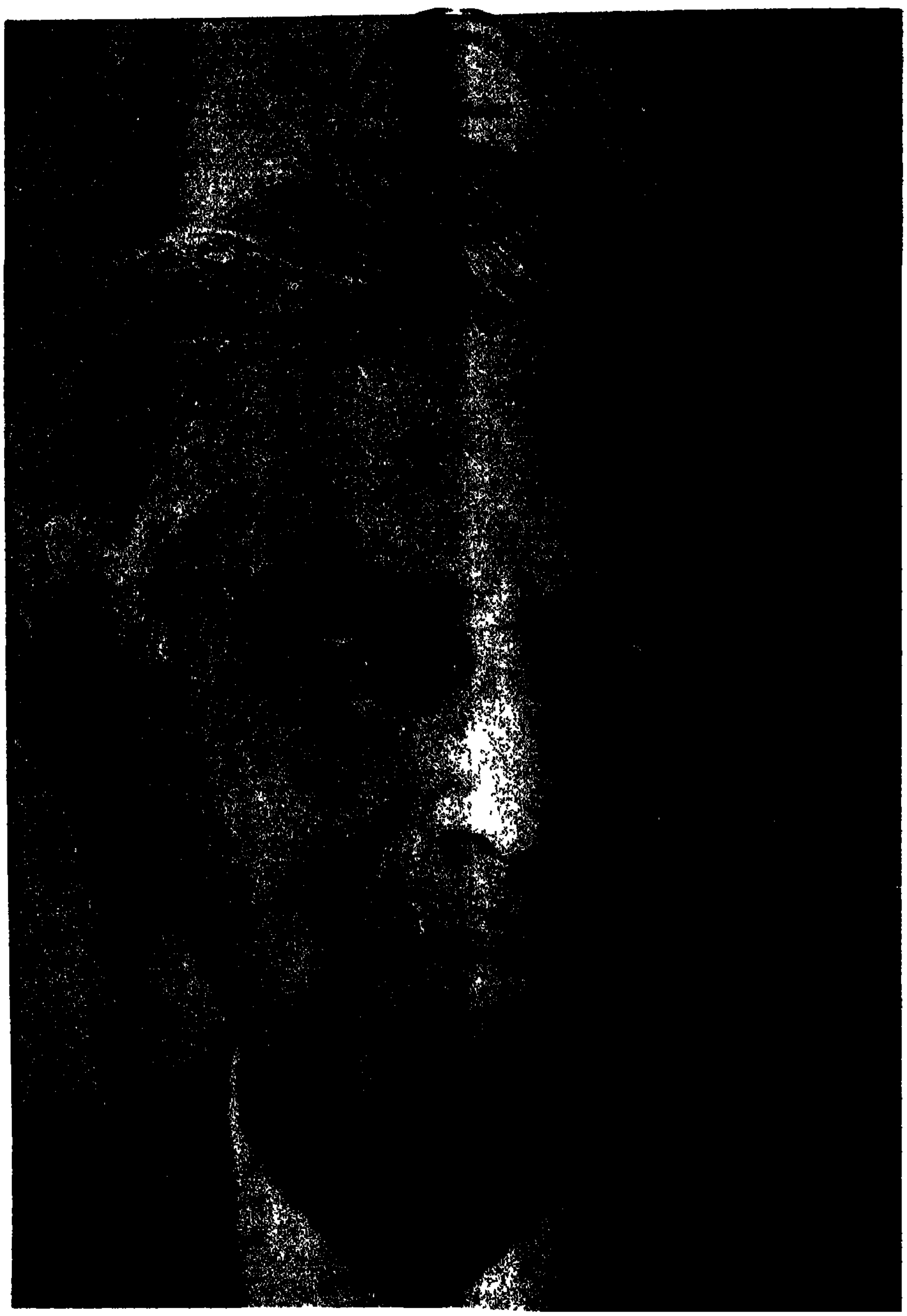

SUPER
Vasmol
33


CARD CO.
531687

THE 'SHAIR" (MONTHLY) BOMBAY-400 008.

# شاعر







# اختر شیرانی

پ: ۴ مئی ۱۹۰۵ء [ٹونک] م: ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء [لاہور]

تخلیق و تدوین: افتخار امام صدیقی

تزئین: اعجاز صدیقی

شباب و شعر کو ہم رنگ کر دیا تو نے
جوانیوں سے بڑا کام لے لیا تو نے
مگر ہے شیب کا پیغام تیرا کسل شباب
جواں رہا نہ بہت دن یہ کیا کیا تو نے

محلہ مہدی باغ، ٹونک [راجستھان] میں پیدا ہوئے۔ دادا کا نام مولوی محمد اسماعیل خاں تھا جو مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ والد کا نام محمود خاں شیرانی تھا۔ یہ خود بھی مشہور محقق، تاریخ داں اور ادیب گذرے ہیں۔ ۱۹۱۹ء میں محمود خاں شیرانی ترک سکونت کر کے ٹونک سے لاہور آ گئے اور اسلامیہ کالج میں فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اختر شیرانی کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ لاہور میں ۱۹۲۱ء میں باقاعدگی کے ساتھ تعلیم کا آغاز کیا۔ پہلے منشی فاضل کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ دوسرے سال ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا۔ ان امتحانات سے فارغ ہونے کے بعد کچھ دن تک "ہمایوں" [لاہور] کے ادارتی فرائض انجام دیے پھر رسالہ "بہارستان" کی ادارت کی۔ چند برسوں بعد از سرِ نو تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے اور اورنیٹل کالج میں داخلہ لیا۔ اپنا ایک ادبی رسالہ "خیالستان" جاری کیا۔ ۱۹۳۵ء میں ایک اور رسالہ "رومان" جاری کیا۔ ۱۹۴۱ء میں مولانا تاجور نجیب آبادی نے اپنے ادبی رسالے "شاہکار" کی ادارت میں شامل کیا۔ لاابالی اور سیماب صفت اختر شیرانی مستقل کوئی کام نہیں کر سکے۔

## تصانیف اختر شیرانی

**شاعری** ✿ پھولوں کے گیت [بچوں کے لیے نظمیں] ۱۹۳۶ء۔ نغمۂ حرم [بچوں اور لڑکیوں کے لیے نظمیں] ۱۹۳۹ء۔ شعرستان [۱۳ سانیٹ اور ۴ نظمیں سابقہ مجموعوں سے انتخاب] ۱۹۴۱ء۔ صبحِ بہار [رومانی نظموں کا پہلا مجموعہ مع چند رباعیاں] ۱۹۴۵ء۔ اخترستان [نظمیں اور سانیٹ] ۱۹۴۶ء۔ طیورِ آوارہ [غزلیں، گیت، رباعیاں، ماہیا] ۱۹۴۶ء۔ لالۂ طور [نظمیں اور سانیٹ] ۱۹۴۷ء۔ شہناز [نظمیں، غزلیں اور ماہیا] ۱۹۴۷ء۔ شہرود [نظمیں، غزلیں، نعتیں، سانیٹ اور ماہیا۔ بعد از مرگ اشاعت] ۱۹۴۹ء۔

---

**نثر** ✿ ضحاک [ایک ترکی ڈرامے کا ترجمہ] ۱۹۲۷ء۔ آئینہ خانے میں [۵ فلمی کہانیاں] ۱۹۳۶ء۔ جوامع الحکایات ولوامع الروایات [از محمد بن محمد العوانی، ترجمہ و تلخیص اختر شیرانی] ۱۹۴۳ء۔ وہ دھڑکتے دل [۱۲ افسانے طبع زاد و تراجم] ۱۹۴۶ء۔ وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھا [اردو کے مشاہیر ڈرامانگاروں کی منتخب تخلیقات کا انتخاب] ۱۹۴۷ء۔ اختر و سلمیٰ کے خطوط مرتبہ خادم حسین بلگرامی ۱۹۵۷ء۔

# فکر امروز



مشاعروں کی صدارت اپنے اندر جو علمی ادبی توقیں پوشیدہ رکھتی ہے وہ دوسری ملکی مجالس سے یکگونہ ممتاز اور مختلف ہیں۔ میرا نظریۂ صدارت سالہاسال سے یہ ہے کہ مشاعروں اور ادبی مجالس کی صدارت صرف انھیں لوگوں کو ملنی چاہیئے ——————

جو شعر و ادب کے صحیح ذوق سے بہرہ مند ہوں اور جو ادبی و علمی رجحانات کے اس جادۂ نو میں جس پر نوخیز نسلیں گامزن ہیں کسی نہ کسی نوعیت سے ہماری رہنمائی کر سکیں۔ میں اپنا نظریۂ صدارت سیکڑوں مشاعروں میں علی الرّس الاشہاد پیش کر چکا ہوں اور اب بھی میرا نظریہ یہی ہے کہ صدارت صاحبانِ دولت و جاہ سے زیادہ ان سادہ زندگی گذارنے والے اہلِ علم و ادب کو سزاوار ہے جو تختِ صدارت پر خاموش بیٹھنا پسند نہ کریں بلکہ اپنے علمی تجارب سے ہمیں مستفید و مستفیض ہونے کا بھی موقع دیں۔

خطبۂ صدارت مشاعرہ ناگپور ۲۱ جون ۱۹۴۳ء
مطبوعہ: شاعر آگرہ ۷ اگست ۱۹۴۳ء
جلد ۱۴، شمارہ ۸، صفحہ نمبر ۳۵

**سیماب اکبرآبادی**




# شاعر

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

بہ یادگار اعجاز صدیقی مرحوم

اشاعت کا ۶۰ واں سال

علمیہ ادبیہ و سنجیدہ ماہنامہ

جلد —— ۶۰
شمارہ —— ۶

فون ۳۵۹۹۰۴

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت:- ۵ روپے

زرِ سالانہ ۵۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۶۰ روپے

تاعمر خریداری ۱۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے ◆ ممالکِ غیر سے ۳۵۰ روپے

ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصرالادب، بمبئی سینٹرل پوسٹ آفس پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶، بمبئی ۴۰۰۰۰۸


آج کے هنگامہ خیز دور میں،
سنکارا هی زندگی کو تلخیوں سے بچاکر خوشگوار بناتا ہے
بوڑھے لوگ، نوجواں طالب علم، کام کرنے والے لوگ، گھریلو عورتیں، یہ سب آج کے دَور میں خود کو بہت پریشان اور تھکا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ زندگی ہر شخص کے لیے دشوار ہو گئی ہے۔ اس کا سبب فقط کام کی زیادتی یا بڑھاپا ہی نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق نظام ہضم سے بھی ہے۔ اگر ہضم کا فعل درست نہیں ہے تو بہتر سے بہتر غذا بھی آپ کے لیے بے سود ہے۔ ۲۹ سائنس دانوں کی تازہ سائنٹفک تحقیقات کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ سنکارا صرف شدہ طاقت کی جلد بحالی کا بہت ہی عمدہ اور مؤثر ذریعہ ہے۔ اس کے صرف دو چمچے روزانہ آپ کے لیے زندگی کو خوشگوار ترین بنا دیں گے
آپ کو سنکارا کی ضرورت کب پیش آتی ہے؟
* عام کمزوری اور نقاہت میں * تھکا دینے والی ورزش کے بعد * وٹامنز کی کمی میں * بیماری سے رخصت ہونے کے وقت * بھوک کی کمی میں * موسم کے خلاف جسم میں قوتِ مزاحمت پیدا کرنے کے لیے * حمل کے دنوں میں * طلبا کے ذہنی اور جسمانی نشوونما میں * وزن کی کمی میں * اضطراب اور تھکن میں * غذا کی معمولی کمی میں * اینٹی بایوٹک دواؤں کے استعمال کے سبب وٹامنز کی کمی ہونے پر * عصبی دباؤ اور بیماری کی شدت میں
cinkara
لازمی بنیادی عناصر، وٹامنوں اور جڑی بوٹیوں کا نادر مرکب
سنکارا
مشہور عالمی ٹانک — ہر موسم میں سب کے لیے
ہمدرد

## مقالات



## نظمیں



## کہانیاں



## غزلیں



## خود نوشت



## بساطِ سخن



## آثارِ لفظ لفظ



## بازیافت



## جرعات



## مکتوبات



## کتب و رسائل



تصویر سرورق

پروفیسر مجتبیٰ حسین


شمارہ نمبر ۶ ـــ جلد ۶۰
۱۹۸۹ء

# اُردو مسائل کی مسلسل تکرار اور عوامی بیداری

شمارہ کے گذشتہ اداریوں کا غیر معمولی ردّ عمل ہوا اور کئی اہم باتیں سامنے آئیں اور ثابت ہوا کہ اردو کے لیے عوامی سطح پر کیے جانے والے کاموں کی اہمیت و افادیت اردو کے مسائل حل کرنے کے لیے اب ناگزیر ہو گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ عمومی طور پر اردو والوں کے پاس کوئی ایسا پروگرام نہیں ہے جو ملک گیر سطح پر نافذ کیا جا سکے یہ منقسم اور بکھرے ہوئے اردو والے اپنی اپنی ڈفلیاں بول رہے ہیں بلکہ یہی ایک کام کر رہے ہیں یعنی صرف مسائل کا بیان، تنقید اور مشورے۔ آزادی کے بعد سے یہ کام مسلسل کیا جا رہا ہے، کوئی اخبار، رسالہ یا کتاب اٹھا لیجیے۔ اردو زبان کے بارے میں مسائل و مشورے ضرور مل جائیں گے۔ یہ آسان ترین کام ہر ایک نے کیا ہے اور خوب خوب کیا ہے لیکن کسی ادارے، انجمن یا اکاڈمی نے کوئی مکمل پروگرام کبھی نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے مسائل، مسائل ہی بنے رہے۔ اس طرح کی بحث و تکرار سے صرفِ نظر کرتے ہوئے یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اردو کے مسائل حل کرنے کے لیے عملی کام کیا کیا ہیں اور ملکی سطح پر ان کاموں کا نفاذ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے۔

ہمارا منشا ہے اردو میں پتے لکھنے کی تحریک نے خاطر خواہ نتائج دیے ہیں اور یہ ظاہر کر دیا ہے کہ عوام اردو زبان کو چاہتے ہیں، اس کے مسائل کا حل چاہتے ہیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں اس کا چلن چاہتے ہیں، وہ اب مسائل کے ذکر اور مشوروں سے اوب چکے ہیں، بیزار ہیں۔ وہ کوئی ٹھوس عملی کام چاہتے ہیں، اردو عوام لیے بزرگوں کو متحرک اور باعمل دیکھنا چاہتے ہیں۔ خطوں پر اردو میں پتے لکھنے کا عمل ایک معمولی کام سہی لیکن آج بھی بیشتر لوگ اس کام کو غیر ضروری سمجھتے ہیں اور عادتاً ذہنی کے تحت اردو زبان کے مسائل سے اپنی آنکھیں اور اپنے کان بھی بند کرتے جا رہے ہیں اور اس کی وجہ یہی ہے کہ اسٹریوٹائپ باتوں کی تکرار اور مسلسل تکرار نے ایک طرح کا نفسیاتی بوجھل پن پیدا کر دیا ہے۔ اردو اب خواص کے درمیان ہی رہ گئی ہے کہ وہ یا تو ادیب و شاعر ہیں یا پھر کسی نہ کسی طرح اُردو اُن کی روزی روٹی سے جڑی ہوئی ہے اور بس۔

اردو مسائل کے حل کے لیے پورے ہندوستان میں عمومی طور پر بنیادی عملی کاموں کا نفاذ ہونا چاہیے تاکہ عوامی سطح پر اردو تحریک کی ایک آواز بن سکے۔ ہمارے کرنے کے کام یہ ہیں:

اپنے خطوں پر پتے اردو میں لکھیں۔ ڈاک و تار کے تمام امور کا استعمال اردو میں ہو، مثلاً: منی آرڈر اردو میں تحریر کیے جائیں۔ اُردو پتوں کے ساتھ ہم تک منی آرڈر فارم پہنچ رہے ہیں، تاخیر ہی سے سہی۔

اپنے چیک اردو میں لکھیں، دستخط اُردو میں کریں۔ اپنے شناختی کارڈ، سائن بورڈ، ناموں کی تختی، کاروباری اور خانگی حسابات اردو میں ہوں۔ شکایتی رجسٹروں اور تاثرات بک میں کچھ لکھنا ہو وہ اردو میں لکھا جائے۔

ہمارے تعلیمی مسائل الجھے ہوئے تو ہیں ہی انھیں اور زیادہ الجھا دیا گیا ہے، ان مسائل کا حل انفرادی سطح پر ہرگز نہیں نکل سکتا، یہ تو اجتماعی طور پر کرنے کا کام ہے۔ ہندی اور انگریزی کے ساتھ ہندوستان کے تمام صوبوں میں سہ لسانی فارمولا اردو کے تعلیمی مسائل کو پیچیدہ بنائے ہوئے ہے۔ یہ کہہ دینا بہت آسان ہے کہ اپنے بچوں کو اردو میں تعلیم دلوائیے، یہ ہونا چاہیے لیکن کیا ہمارا تعلیمی ڈھانچہ جس میں سوائے معاشی وسائل کو حل کرنے یا تعلیم برائے ملازمت کا رجحان حاوی اور غالب ہو وہاں اردو ذریعۂ تعلیم کا نعرہ فی الحال کارگر نہیں ہو سکتا۔ عام طور پر وہی والدین اپنے بچوں کو اردو ذریعۂ تعلیم کے مدارس میں داخل کرواتے ہیں جو بے حد غریب ہیں اور انگریزی اسکولوں کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے یا پھر بچہ ہندی یا صوبائی سرکاری زبان میں تعلیم حاصل کرے گا کہ ملازمت کے حصول میں آسانی ہو —— اگر کسی بچے کا ذریعۂ تعلیم انگریزی، ہندی یا پھر کوئی علاقائی زبان ہے تو ہونے دیجیے کہ اس کے والدین اردو نہیں جانتے، اگر مسلمان ہیں تو انھوں نے قرآن مجید پڑھا نہیں یا اپنے بچے کو سنجیدگی کے ساتھ پڑھایا نہیں۔ ابتدائی تعلیمی مراحل میں قرآن مجید کا درس اور عربی زبان کے رسم الخط سے واقفیت اردو سے واقفیت کا بنیادی ذریعہ بنتے ہیں۔ ہمارے بزرگوں نے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم ہی سے اپنا تعلیمی سفر شروع کرتے تھے اس کے بعد ہی اسکول میں داخل ہوتے تھے۔ آج یہ سب کچھ کہاں اور اب یہ اتنا آسان بھی نہیں لیکن آج یہ تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ ایسے گھرانوں میں جہاں بچے انگریزی، ہندی یا کسی اور زبان کے ذریعۂ تعلیم حاصل کر رہے ہیں وہاں رضاکارانہ طور پر اردو کے قاعدے تقسیم کیے جائیں۔ گھر گھر میں اردو قاعدوں کی مفت تقسیم کا اہتمام ملکی سطح پر اردو زبان سے واقفیت اور قربت کا سبب بنے گا۔ یہ ایک مؤثر ذریعہ ہے جو ابتدا میں مایوس کن ہو سکتا ہے لیکن اس کے نتائج بے حد خوش کن ہوں گے۔

# لوری نامہ

علامہ سیماب اکبرآبادی [۱۸۸۰ء — ۱۹۵۰ء] کی ایک نایاب کتاب "لوری نامہ" ۱۹۱۷ء میں آگرہ سے شائع ہوئی تھی۔ ۱۶ صفحے کے اس کتابچے میں چھوٹی چھوٹی ۱۸ لوریاں شامل ہیں۔ علامہ نے بچوں کے لیے نثر و نظم میں خاصہ تخلیقی کام کیا۔ ان کی نظموں کے ضخیم مجموعے "سازو آہنگ" میں کئی چھوٹی بڑی نظمیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بچوں اور بچیوں کے لیے کئی کتابیں تصنیف کیں۔

۶

عربی جوش رگوں میں ہے تیری — ہاشمی خون نسوں میں ہے تیری
نسل میں اپنی حجازی ہے تو — مردِ میدان ہو غازی ہے تو
جوش آتا ہی تو گھٹتا ہی نہیں — پاؤں میدان سے ہٹتا ہی نہیں
دے عمرؓ کا تجھے انصاف خدا — جوشِ خالدؓ کا عطا ہو بیٹا
کرے اللہ تری عمر دراز — تو پڑھے خانۂ کعبہ میں نماز

(۹)

لو میرے ننھا کو آتی ہے نیند — سونے کا پیغام لاتی ہے نیند
ننھا ہے میرا بڑا پہلوان — ننھے پہ میرے خدا کی امان
سچ بولتا ہے یہ ننھا مرا — ہے جھوٹی باتوں سے بیزار سا
جھوٹ اور چغلی سے بچتا ہے یہ — کتنا سمجھدار بچہ ہے یہ
لیتا ہے پہلے خدا کا یہ نام — کرتا ہے پھر ہیں جو کرنے کے کام
پڑھنے سے یہ جی چراتا نہیں — کھیل اور کود اس کو بھاتا نہیں
ہوگا بڑا جب یہ ننھا مرا — اس کو ملے گا بڑا مرتبہ
اسلام کے کام آئے گا یہ — دنیا کی محفل سجائے گا یہ
ہو میرے ننھا پہ فضلِ خدا — جگ جگ جئے یہ مرا لاڈلا
آجا ری نندیا تو آ کیوں نہ جائے — ننھا کو میرے سُلا کیوں نہ جائے
آتی ہوں بی بی آتی ہوں میں — ننھا کو آکر سُلاتی ہوں میں

۷

(۱۰)

اے میرے جانی اے میرے پیارے — آنکھوں کی ٹھنڈک دل کے سہارے
ٹھنڈی ہوائیں آنے لگی ہیں — پیغامِ راحت لانے لگی ہیں
دیتا ہے لوری گھڑیال سو جا — رات آگئی ہے اے لال سو جا
قرباں دنوں پر راتوں کے صدقے — میں تیری میٹھی باتوں کے صدقے
تو ہی ہمارے دل کا سہارا — ماں کی جوانی ابا کا پیارا
جب لائے گا تو دولت کما کر — دیگا ہمارے ہاتھوں میں لاکر
سکھ تیرا ہم کو مولا دکھائے — تجھ کو نگاہِ بد سے بچائے

(۱۱)

رات آگئی چمکے تارے — خاموش ہیں چشمے سارے
اب پھیل گئے اندھیارے — سو جا اے میرے پیارے
ہاں باہیں ڈالے سو جا
اے اللہ والے سو جا
اللہ تیرا والی ہے — جو دنیا کا مالی ہے
نیند آنکھوں میں ڈالی ہے — وہ تیرا رکھوالی ہے
تو اُس کے حوالے سو جا
اے اللہ والے سو جا

فون نمبر ۳۲۷۸۴

# انجمن ترقی اردو پاکستان

تاریخ ...۲..جولائی سنہ ۱۹۶۰ء

اردو روڈ کراچی-۱

شفیقی و مکرمی۔

تسلیم۔ آپ کا خط پہنچا تو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز یکایک مل جائے، آپ نے دفعتاً خط و کتابت بند کر دی تھی جس سے مجھے خیال ہوا کہ میں نے اپنے خط میں شاید کوئی ایسی بات لکھ دی جو آپ کی ناراضی کا باعث ہوئی۔ کئی بار چاہا کہ پوچھوں مگر آپ کا پتہ مجھے معلوم نہ تھا۔ دلی سے دو ایک خط آپ نے لکھے ان پر نمبر ہوٹل یا ایسا ہی کچھ نام لکھا ہوا تھا۔ ظاہر ہے یہ پتہ عارضی تھا۔

چند مہینے ہوئے نقوش میں آپ کا مضمون سیرت نگاری پر پڑھا۔ آپ نے جو کچھ میری نسبت لکھا ہے اسے پڑھ کر میں حیران رہ گیا۔ آج تک میرے حاشیۂ خیال میں بھی یہ نہ آئی تھی کہ میرا شمار ان برگزیدہ ہستیوں میں ہوگا جو اردو نثر کے بانی اور رہنما ہیں۔ آپ نے مجھے جو مقام عطا فرمایا ہے میں اس کا مستحق نہیں۔ ہم عصروں کے محاسن و عیوب پرکھنے میں اکثر غلطی ہو جاتی ہے، بعض قدردانی و محبت کے جوش میں اپنے ممدوح کو عرش پر پہنچا دیتے ہیں اور بعض ایسی سختی سے نکتہ چینی کرتے ہیں کہ اسے تحت الثریٰ تک پہنچا دیتے ہیں۔ ہماری تنقیدوں کا فیصلہ آئندہ نسل کرتی ہے۔ اس کی مثال آپ کے سامنے موجود ہے کہ تیس چالیس سال کا عرصہ ہوا اردو کے عناصر خمسہ پر مضامین لکھے گئے۔ عناصر خمسہ سے مراد سید احمد خاں، حالی، شبلی، نذیر احمد اور آزاد ہیں۔ اکثر نقادوں نے شبلی کو اوروں پر فضیلت دی اور اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان کا نام اردو نثر کے بانیوں اور رہنماؤں میں نہیں آتا۔

آپ نے میرے بعض مضامین کو ہندی میں منتقل کرنے کی اجازت طلب کی ہے۔ آپ کو اس کا پورا حق حاصل ہے مجھ سے پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ کام آپ جیسا ادیب ہی خوش اسلوبی سے کر سکتا ہے۔ میرے لیے یہ امر باعث فخر ہوگا۔

اردو یونیورسٹی کا خیال مجھے دلّی ہی میں پیدا ہوا تھا میں چاہتا تھا کہ حیدرآباد میں جس طرح عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی ہے ویسی ہی ایک یونیورسٹی برٹش انڈیا میں قائم کی جائے۔ اس کام کا ابھی آغاز ہی تھا

کہ حالات میں ایسا تغیر ہوا کہ برٹش انڈیا بھارت اور پاکستان میں بٹ گیا۔ پاکستان آنے کے بعد پھر یاسی گڑھی میں ابال آیا مگر کچھ کام نہ چلا۔ اب جو پاکستان میں انقلاب آیا ہے تو کچھ امید بندھی ہے اور کام شروع کیا ہے۔ اس سلسلے میں میں نے سندھ کے بعض اضلاع کا دورہ بھی کیا۔ پنجاب کے دورے کا ارادہ تھا مگر اس میں معذور رہا۔ شاید آپ کو یہ معلوم نہ ہوگا کہ موتیا بند کے عارضے کی وجہ سے تقریباً آٹھ نو مہینوں سے لکھنے پڑھنے سے معذور ہوں۔ احباب کے خطوط آتے ہیں تو پڑھوا کر سن لیتا ہوں اور جواب لکھوا دیتا ہوں۔ ایک مہینہ ہوا کہ میری دائیں آنکھ کا آپریشن ہوا۔ یہ آپریشن ڈاکٹر منہاس نے کیا جو پہلے دلی میں تھے۔ یہ آپریشن کامیاب رہا لیکن ابھی پڑھنے کا کام کرنے کی ممانعت ہے۔ دوائیں استعمال کی جا رہی ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد ڈاکٹر مجھے عینک دیں گے پھر رفتہ رفتہ بصارت عود کر آئے گی۔

اس عمر میں بھی میں اردو یونیورسٹی کے لئے جدوجہد کر رہا ہوں اس کی ایک وجہ اور بھی ہے بھارت نے عثمانیہ یونیورسٹی سے جس بے دردی کا سلوک کیا ہے اس کا صدمہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ بھارت کا کیا بگڑتا اگر اس کی اقلیم کی حدود میں ایک ایسی یونیورسٹی بھی ہوتی جس کا ذریعۂ تعلیم ایک ملکی زبان ہے۔ اگر بجائے اردو کے کوئی اور دیسی زبان ہوتی تو کیا اسے بھی ایسی ہی بے دردی سے مٹایا جاتا؟ میں اس کا بدل اور عکس ہوا تو نعم البدل پاکستان میں قائم کرنا چاہتا ہوں۔ اگر یہ کام میں نہ کر سکا تو کوئی اور اللہ کا بندہ کرے گا۔ یہ یونیورسٹی بن کے رہے گی۔

آپ نے اپنے خط میں از راہ قدردانی میرے متعلق جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے میں اس کے لئے تہ دل سے ممنون ہوں اور مجھے فخر ہے کہ آپ جیسا صاحب نظر میرے متعلق ایسا خیال رکھتا ہے۔ یہ خط میں مشفق خواجہ سے لکھوا رہا ہوں۔ وہ اپنی شفقت سے میرا یہ کام کر دیتے ہیں۔ بظاہر خوشی سے کرتے ہیں مگر جو یہ بیگار دلاتا ہے نہ کہیں دل میں ضرور کہتے ہوں گے۔

خیر طلب

عالی

## عبدالحق بنام نثار احمد فاروقی

مولوی عبدالحق [پ: ۱۸۷۰ء ضلع میرٹھ - م: ۱۶ ۱۹۶۱ء کراچی] ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے بی اے کیا وہیں سرسید اور مولانا حالی سے مصاحبتیں رہیں۔ عثمانیہ کالج [اورنگ آباد] کے پرنسپل، جامعہ عثمانیہ [حیدرآباد دکن] کے صدر شعبۂ اردو مقرر ہوئے پچاس سال تک انجمن ترقی اردو کے سکریٹری رہے۔ ۱۹۳۸ء میں انجمن کا دفتر حیدرآباد دکن سے دہلی منتقل کیا۔ آزادی کے بعد ۱۹۴۷ء میں کراچی ہجرت کی اور وہیں انتقال کیا۔

بشکریہ نثار احمد فاروقی - دہلی



## ہوئی تاخیر تو......

چاند نے تاروں سے پوچھا
کتنی رات ہوئی بھائی؟
تارے آنکھیں میچ کے بولے
چلو یہاں سے ہٹ جائیں
اتنی دیر سے آئے ہو
ہم تو اب سو جاتے ہیں

تھوڑی دیر میں دیکھا تو
چاند اکیلا جاتا تھا
چال بہت ہی مدھم تھی
تھوڑا سا لنگڑاتا تھا

# پیش کش

محمد علوی

وقت کا ٹھنڈا پانی پینا
گھی والی روٹی کھانا!!
اپنے بستر پہ سو رہنا
ٹی وی سے جی بہلانا
اللہ میرے گھر آنا!!
میرے گھر میں چھپ جانا!!

## دعا

ایسا ہو بچوں کے بدن پر میل نظر نہ آئے
نئے نئے کپڑوں کی بو سے سارا گھر بھر جائے
اب کے عید کا دن آئے تو دودھ سویاں کھائے

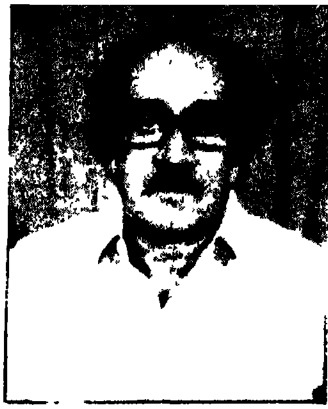
## ایک شام باغ میں

ننھے پودوں کے ہاتھوں میں رنگ برنگے جام
چھتنارے پیڑوں پہ گرتی چڑیوں کا کہرام
باغ، باغ میں حوض، حوض میں فوارے کا پیڑ
پتھر کی کرسی پر بیٹھی جلتی بجھتی شام

## وقت جہاں رک جاتا ہے

چار طرف بنجر میدان
برسوں پرانا ایک مکان
پہیوں کی کرسی پر بیٹھا
اک فالج کا مارا بوڑھا
اور اک لمبا سا دالان

۹۔ سمیر وہار سوسائٹی، سرکھیز روڈ، احمد آباد ۳۸۰۰۵۵



باقر مہدی
۱/ای، روی درشن، کارٹر روڈ، باندرہ بمبئی - ۴۰۰۰۵۰

# یادِ رفتگاں - پروفیسر مجتبیٰ حسین

میں حادثوں کی نوعیت اور ان کی فوری اثر خیزی کا اس دن سے قائل ہوں جب ۱۶ ستمبر ۱۹۴۷ء کو دہلی کے قریب مجھے چلتی ہوئی ٹرین سے زخمی کر کے پھینک دیا گیا تھا اور میں بچ گیا تھا اس حادثے نے میری زندگی ہی بدل دی تھی اور جب سے میں ہر قسم کے فرقہ وارانہ تشدد کا مخالف ہوں ـــــ مگر میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ ایک دن ایسا بھی میری زندگی میں ایک حادثے کی طرح آئے گا کہ میں ان کو یاد کروں گا جن سے سالہا سال پہلے ملاقاتیں تھیں ـــــ مجتبیٰ حسین سے آخری بار میں ۱۹۶۵ء کراچی بندرگاہ پہ ملا تھا وہ مجھے رخصت کرنے آئے تھے اور پھر ۱۹۶۷ء کے بعد خط و کتابت بھی بند ہو گئی۔ وقت کی گرد ہمارے تعلقات پہ ایسی پڑی کہ میں نے "اظہار" نکالا اور انھیں یاد بھی نہیں کیا تھا ـــــ ان کا ایک مضمون فرید جاوید کے بارے میں "الفاظ" کراچی میں پڑھا تھا مگر میں متاثر نہ ہوا ـــــ اور اب ـــ ان کی لاہور میں حادثاتی موت نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے میں واویلا کرنے کا عادی نہیں پھر بھی یادوں کے زخم ہرے ہو گئے اور ایک رک رک کے ٹوٹتی جڑتی فلم کی طرح مجھے وہ واقعات یاد آ گئے جن کو وقت نے ماند کر دیا تھا ـــــ!

---

ان کے بارے میں مجھے بہت کم معلوم ہے ان کی ایک کتاب "تہذیب و تحریر" میں لکھا ہے۔

نام ـــ سید مجتبیٰ حسین، پیدائش۔ یکم جولائی ۱۹۲۰ء بمقام سنجرپور (جونپور۔ یوپی) تعلیم۔ ایم۔ اے (اردو) الٰہ آباد ۱۹۴۵ء۔ مشاغل۔ تصنیف و تالیف، درس و تدریس، صحافت۔ تصانیف۔ انتظارِ سحر۔ انکار، تہذیب و تحریر اور ادب و آگہی ــ۔ اس کے بعد "نیم رُخ" جو میرے پاس نہیں ہے اور میری نظر سے بھی نہیں گذری۔! وہ "سراج الدولہ کالج" (کراچی) سے کب کوئٹہ یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہے مجھے اس کی خبر نہیں ہے ہاں کئی برس ہوئے "غالب نامہ" (کراچی) میں ایک تصویر ضرور دیکھی تھی جس میں وہ اپنی یونیورسٹی کے طالب علموں کے ساتھ موجود تھے ـــــ اور مجھے علم نہیں ہے کہ ان کی ناگہانی موت پہ پاکستانی اخبارات اور رسائل میں کیا شائع ہوا ہے صرف اتنا معلوم ہے یکم اپریل ۱۹۸۹ء میں لاہور میں ان کی حادثاتی موت واقع ہوئی تھی ـــ!

---

• سب سے پہلے میں نے ان کا ذکر ۱۹۴۵ء میں سنا تھا میں گورنمنٹ کالج فیض آباد میں ہائی اسکول کا طالب علم تھا اور وہ الٰہ آباد سے ایم اے کر کے آئے تھے اصل میں وہ میرے ایک عزیز کے چھوٹے بھائی تھے مگر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ "نگار" کے خاص لکھنے والے تھے اور نیاز صاحب ان کو بہت مانتے تھے دوسری اہم بات یہ تھی کہ فراق کو اچھی طرح جانتے تھے اتنا کہ "نقوش" نے اپنے "شخصیات نمبر" میں فراق کا خاکہ ان سے لکھوایا تھا (مگر بہت بعد کی بات ہے) میں نے انھیں دیکھا تھا شاید میرا ان سے تعارف بھی ہوا تھا مگر یہ نہیں یاد پڑتا کہ ان سے کیا بات ہوئی تھی اس وقت تک میں محسوں گورکھپوری کے افسانے اور ناول پڑھ چکا تھا مگر میری ان سے دوسری ملاقات ۵۰ء میں ہوئی جب میں پہلی بار الٰہ آباد آیا تھا اس وقت تک میرے افسانے بلونت سنگھ کے پرچے "فسانہ" اور میری غزلیں "شعاعِ اردو" (ڈاکٹر اعجاز حسین) میں شائع ہو چکی تھیں میں الٰہ آباد اپنے چھوٹے ماموں کاظم حسین کی شادی میں شرکت کرنے گیا تھا وہ اپنے بڑے بھائی مصطفیٰ حسین کی لڑکی کی شادی کی تقریب میں آئے تھے ان ہی دنوں تیغ الٰہ آبادی (جو بعد کو مصطفیٰ زیدی کے نام سے مشہور ہوئے) سے میری ملاقات ہوئی تھی وہ فراق صاحب سے ملنے گئے مگر مجھے نہیں لے گئے تھے میرے چھوٹے ماموں اور ان کے بھائی کی لڑکی کی شادی سے قرابت بڑھ گئی تھی شاید اپریل یا مئی ۵۰ء کا مہینہ تھا میرا ایک افسانہ "پھر زخم مہک اٹھے" آجکل (دہلی) میں ان ہی دنوں شائع ہوا تھا جس کا معاوضہ چالیس روپے تھا اور یہ "کثیر رقم" میں نے خلیل الرحمٰن اعظمی کی نذر کی تھی یہ میری خلیل کو آخری مدد کی کوشش تھی مجتبیٰ حسین نے

الٰہ آباد کے دورانِ قیام میں مجھے اپنی ایک طویل نظم بھی سنائی تھی یہ نظم شائع ہوئی یا نہیں، مجھے اس کی خبر نہیں ہے اتنا یاد آتا ہے کہ یہ نظم مثنوی کے فارم میں تھی شاید اس کا موضوع، عورت کی مظلومیت، تھا مجھے ان ہی دنوں ان کے ساتھ ٹرین کی ایک دوپہر یاد آتی ہے وہ انیس کے کسی مرثیے کے اشعار سنا رہے تھے ان کی ذہانت اور قوتِ یادداشت نے مجھے بہت متاثر کیا تھا ——— اور پھر ایک زمانہ گذر گیا میں انھیں تقریباً بھول گیا تھا انھوں نے "شعور" نکالا اور میں نے ان کے پرچے میں شرکت کی تھی میرے بڑے ماموں علی حسین زیبا ردولوی کا کلام بھی اس میں شائع ہوتا تھا (انجمن ترقی اردو ہند ان کی ایک کتاب وحید الٰہ آبادی شائع کر چکی تھی) میرے پاس آج بھی اس "شعور" کی ایک کاپی یادگار کے طور پر موجود ہے اس طرح بھول اور یاد کا سلسلہ ٹوٹ کے جڑتا رہا ہے۔

میرا پہلا مجموعہ "شہرِ آرزو" ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تو میں نے ان کی خدمت میں ایک جلد نذر کی تھی تمیم احمد (سلیم احمد کے چھوٹے بھائی) سے میری "مشرب" (حیدر آباد سندھ) اور "نئات رنگ" (کراچی) کے ذریعے واقفیت تھی انھوں نے اپنے پرچے "کارواں" کے پہلے شمارے میں مجتبیٰ حسین کا میرے مجموعے پر تبصرہ شائع کیا تھا جو میری ہمت افزائی کی پاکستان میں پہلی کوشش تھی اس تبصرے کے بعد میری اُن سے معمولی خط و کتابت ہوئی تھی آج اُن کا صرف ایک کارڈ میرے پاس موجود ہے اور اس سے خط و کتابت کی دھندلی یاد ہے ——— ! ہاں یہ تو بتانا بھول گیا کہ میرے مضمون "یگانہ آرٹ" (آجکل دہلی) کی اشاعت پر انھوں نے ایک خط لکھا اس خط کا ایک جملہ مجھے اچانک یاد آ گیا "اچھا کیا تم نے اس غریب پر مضمون لکھا" ——— جب ان کا "یگانہ" پر مضمون "نیا دور" (کراچی) میں شائع ہوا تو میں نے بھی انھیں تہنیت کا خط لکھا تھا (میرے پاس "نیا دور" کے جو پرچے تھے وہ میں نے وارث علوی کی نذر کر دیے ورنہ ان کے مضمون کا ایک اقتباس ضرور دیتا)۔ ان سے کراچی میں ۱۹۶۳ء میں انجم اعظمی کے ہمراہ ملنے گیا تھا اس "پہلی ملاقات" میں انھوں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ "تم نے عبدالعزیز خالد پر اتنا طویل مضمون کیوں لکھا؟" میں ایک لمحہ چپ رہا پھر میں نے کہا کہ خالد نے سوغات (بنگلور) کی بہت مدد کی تھی اور محمود ایاز کی فرمائش پر لکھا تھا میرا بہت دل چاہ رہا تھا مگر میں نے نہیں کہا کہ آپ نے بھی تو جوش کی تعریف میں لکھا ہے میں نیا نیا کراچی گیا تھا اور مقامی ادبی سیاست سے واقف نہیں تھا صرف دبی زباں سے اتنا ہی اپنے مضمون کے جواز میں کہا کہ "میرا مضمون خاصا تنقیدی ہے" ان سے اس بار زیادہ ملاقاتیں نہ ہو سکیں مجھے میرے بڑے ماموں علی حسین زیبا نے بتایا کہ مجتبیٰ حسین کا کمیونسٹ پارٹی (پاکستان) سے علاحدگی نامہ انھوں نے مقامی اخبارات میں شائع کرایا تھا اور وہ اب ادبی اور ثقافتی کام ہی کرتے ہیں ——— ! میرے ذہن میں ایک تصویر ابھرتی ہے میں جمیل الدین عالی سے ملنے ایک ریسٹورنٹ میں گیا وہاں مجتبیٰ حسین بیٹھے ہوئے تھے عالی اس زمانے میں صدر کے بہت قریب سمجھے جاتے تھے اور رائٹرز گلڈ کے "خالق" جانے جاتے تھے عالی ابھی آئے نہیں تھے اس لیے میں مجتبیٰ حسین کے پاس بیٹھ گیا اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں تھوڑی دیر بعد عالی اپنے طائفے کے ساتھ آ گئے اور بڑی رعونت کے ساتھ مجتبیٰ حسین سے مخاطب ہوئے بس مجھے ایک لمحے عالی کا تضحیک آمیز لہجہ کھٹکا مگر میں عالی کے ساتھ اوپری ائر کنڈیشنڈ کمرے میں چلا گیا۔ وہاں مجتبیٰ کا ذکر تک نہ آیا ——— جب میں کراچی اور لاہور کا چکر لگا کر آیا تو محمد علوی سے بمبئی میں ملاقات ہو گئی اور "نصرت" (لاہور) میں انھوں نے بمبئی کے بارے میں زیادہ اور میرے کراچی اور لاہور کے تاثرات کو نمک مرچ لگا کر شائع کرا دیا تھا بمبئی کے ترقی پسند (بیدی کے علاوہ) مجھ سے پہلے ہی خفا تھے یہ رپورٹ پڑھ کر اور نالاں ہو گئے میں نے مہندر ناتھ سے کہا بھی یہ "موزوں" کے نام سے شائع ہوئی ہے اور میری نہیں ہے مگر غلط فہمی کی ایسی ہی بنیاد ہوتی ہے یعنی بے سر و پا اس میں بھی مجتبیٰ حسین کا ذکر تھا۔

ایک سال سے زیادہ کا عرصہ گذر گیا میں لندن جانے کے خیال سے دہلی گیا وہاں شام لال کے پاس ٹھہرا ان دنوں وہ ٹائمس آف انڈیا کے مقامی ایڈیٹر تھے میں رشید حسن خاں سے ملنے جبلی ہوسٹل گیا وہ شدید بخار میں مبتلا تھے زیادہ دیر گفتگو نہ ہو سکی اس لیے میں ڈاکٹر محمد حسن کے پاس تھوڑی دیر کے لیے چلا گیا جب میری ٹرین دہلی پلیٹ فارم چھوڑ رہی تھی تو محمد حسن نظر آئے وہ شاید اپنے کسی عزیز دوست کو وداع کرنے آئے تھے مجھ سے بھی رخصتی سلام ہوا ——— میں لاہور سے ہوتا ہوا کراچی پہنچا اور اس بار مجتبیٰ حسین سے کئی تفصیلی ملاقاتیں ہوئی تھیں میں ان کے ساتھ جوش ملیح آبادی سے ملنے بھی دو تین بار گیا ایک مرتبہ شام کو جوش اکیلے بیٹھے ہوئے تھے بہت افسردہ تھے مجتبیٰ حسین سے ان کی خاصی بے تکلفی تھی ہم دیر تک ان کا کلام سنتے رہے وہ میرے ماموں علی حسین زیبا کے بھی دوست تھے غرض کہ جوش صاحب کی تنہائی دیکھ کر میری وحشت بہت بڑھ گئی مجتبیٰ نے مجھے ڈرایا کہ لندن میں اور بھی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا ——— ہمارا یہ معمول تھا کہ شام ہوئی اور اکثر ہم مجتبیٰ کے گھر پہنچ گئے کبھی کبھی حامد عزیز مدنی بھی آ جاتے اور ٹیکسی پر سوار ہو کر کراچی کی سیر کرتے کلفٹن یا کسی ریسٹورنٹ یا کسی پُرفضا مقام پر چلے جاتے۔ دیر تک کسی نہ کسی ادبی موضوع پر گفتگو ہوتی رہتی میں اور مدنی اکثر خاموش رہتے زیادہ تر گفتگو مجتبیٰ حسین کرتے وہ اقبال اور جوش کی عظمتوں کے اتنے قائل تھے کہ میرے خیالات کو آسانی سے ہدفِ ملامت بنا دیتے تھے اور پھر دیر تک خوش رہتے تھے انھوں نے میرے اعزاز میں اپنے کالج سراج الدولہ میں جلسہ بھی کیا تھا وہاں میں نے کئی نظمیں اور غزلیں خاص کر "چوپاٹی کی ایک رات" سنائی تھی۔ انھوں نے میری راجہ محمود آباد کے لڑکے سے کہہ کر دعوت بھی کرائی اور ہنس ہنس کر کہا کرتے تھے کہ میں انھیں IMPRESS نہ کر سکا میرا خیال ہے کہ مجتبیٰ حسین ہی کے مشورے سے

میں نے لندن جانے کا خیال ترک کر دیا تھا۔ وہ مجھے رخصت کرنے کئی گھنٹے پہلے آ گئے تھے لیکن میری کسمپرسی کا انھوں نے مذاق نہیں اڑایا وہ میرے سچے ہمدرد تھے چاہتے تھے کہ میں کہیں سکون سے بس جاؤں اسی لیے ان کو میری آوارگی پسند نہیں تھی اور کتنے دن گذر گئے آج بھی مجھے وہ لمحہ یاد ہے جب وہ مجھے رخصت کرنے کراچی کی بندرگاہ آئے تھے۔

میں نے اپنی نظموں کا مجموعہ "کالے کاغذ کی نظمیں" (جو شاہد علی خاں کی مدد سے شائع ہوا تھا) انھیں بھیجا تھا انھوں نے اس کی رسید بھی شاید لکھا تھا "یہ پہلے مجموعے سے بہتر ہے مگر ایسا نہیں ہے کہ کوئی اپنی زندگی ہی اس کے لیے تج دے"۔ محمود ایاز نے اس مجموعے پر تبصرہ کر کے میری بڑی ہمت افزائی کی تھی گو کہ "سب رنگ" کے ایڈیٹر نے میری نظم "وقت ماتم" پر مبصر کی رائے نہیں شائع کی تھی — خیر

میں نے کسی اخبار یا رسالہ میں پڑھا کہ وہ مالے سی من نار کے سلسلے میں لندن بھی تشریف لے گئے تھے۔ "اذکار" کے جوش نمبر میں بھی پڑھا تھا کہ وہ لندن میں کے ساتھ جوش صاحب سے آخری بار ملنے بھی گئے تھے مگر جوش صاحب اپنے کلام کو مس کر بھی گویا نہیں ہوئے مجتبیٰ کو جوش کا بہت سا کلام یاد تھا میں نے یہ بھی سنا کہ انھوں نے نیا دور (کراچی) میں پھر لکھنا شروع کر دیا تھا مگر میں ان کی تحریر سے محروم ہی رہا ۔! میں کتنے حادثوں سے بچ کر نکل آیا مگر وہ پہلے ہی حادثے کا شکار ہو گئے۔ ! سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی موت کا پرسہ دینے کہاں جاؤں ؟

[۲]

میرے پاس ان کے مضامین کے دو مجموعے ہیں "تہذیب و تحریر" اور "ادب و آگہی"۔ میں ان سے حسبِ حسبِ اقتباسات دوں گا تاکہ یہ پتا چل سکے کہ ان کی تنقیدی بصیرت کتنی تھی اور کس پائے کی تھی ؟

ان کی کتاب "تہذیب و تحریر" کے پہلے مضمون "ادب اور اعتبار" کے اقتباسات ملاحظہ ہوں ! :

——— "ادبی مفروضات اس آدمی کے لیے عین حقیقت ہیں جس کی عقل کند نہیں ہے جس کا دماغ بند اور محدود نہیں ہے اور جس کی حس صرف اخلاقیات کی پابند نہیں ہے۔ عرفی کا شعر ہے ؎

"رفتی تشنہ لبی دان بہ عقل جو نیست سار دلت فریب گر از جلوۂ سراب نہ خورد"

——— "ادب میں یہ بات کہ "یہ نہ دیکھو کہ کون کہہ رہا ہے بلکہ یہ دیکھو کہ کیا کہہ رہا ہے"، کچھ بہت زیادہ وقیع نہیں معلوم ہوتی ادب میں یہ دیکھنا اگر بہ ہے کہ کون کہہ رہا ہے ایک ہی بات شخصیتوں کے فرق سے بدل جاتی ہے"۔

——— "رہا یہ سوال کہ یہ اعتبار کیوں کر ہو یہ ادیب کی ہمت پر منحصر ہے اس کے شعور کی پختگی اور اس کی شخصیت کی بلندی کا امتحان اسی منزل میں ہوتا ہے اعتبار کی یہ آخری اور سب سے اہم منزل ہے"۔

مجتبیٰ حسین کے ان خیالات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر اعتبار پر ہمیشہ بحث و تکرار کے دروازے کھلے رہتے ہیں یہ بجائے خود ادب میں جمہوری اعتبار سے ایک مثال ہے۔

آج جب ہندوستان اور پاکستان میں مذہبی تنگ نظری بڑے پیمانے پر فروغ پا رہی ہے ان کے مضمون "ادب اور مذہب" کے چند اقتباسات قابلِ غور ہیں !

——— "مذہب اور ادب دونوں عقیدے بنتے ہیں اور عقیدہ دیتے ہیں مگر ادب مذہب کے برخلاف "پرستم" سے گذر کر "شکستم" کی منزل تک پہنچتا ہے ... ادب اخلاقیات کا یکسر جداگانہ تصور رکھتا ہے مذہب انسانی زندگی کا حاصل ہے ادب انسانی زندگی کی جستجو ۔ مذہب اور ادب کی آمیزش اور آویزش اتنی ہی پرانی ہے جتنا وہ انسانی شعور جو حرف اور صوت کی صورت میں پہلی بار منضبط ہوا تھا"۔

——— "یہی وجہ ہے کہ مذہب سے متاثر ہونے والا ادب مذہبی ادب کبھی نہیں بن سکا"۔

——— "اُس انیس میں جو مذہبی تھا اور اس انیس میں جو شاعر تھا ایک سمجھوتا ہو چکا تھا کہ ہم تمہارے مذہب میں دخل نہ دیں گے تم ہماری شاعری میں دخل نہ دو"۔

——— "یہ وارہ چراغ حرم و دیرینہ دارد ۔ ادب کی یہی بالغ نظری اسے معاشرے کی متعدد تحریکوں سے مربوط رکھتی ہے"۔

مجتبیٰ حسین کے یہ خیالات لا کھ "پارینہ" معلوم ہوں مگر آج جب مذہب ادب کی جگہ لیتا جا رہا ہے تو یہ افکار اس مسئلے پر دوبارہ غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں جس کو عقیدہ سمجھ لیا گیا ہے۔

ذوقِ سلیم پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں ... "ہر دور میں ذوقِ سلیم کی تعمیر و تشکیل کی بھی ایک مخصوص نوعیت رہی ہے مختلف عہد کے ذوقِ سلیم میں اختلاف رہا ہے میرامن قصہ چہار درویش لکھ کر اپنی زندگی بنا گئے لیکن آج اگر کوئی اس طرح قصہ چہار درویش لکھنے بیٹھ جائے تو اپنی زندگی بگاڑے گا رعایتِ لفظی کے پسند کرنے والے امانت کے ساتھ دفن ہو گئے" اسی طرح ایک عہد کے ادب اور ذوقِ سلیم میں آپس میں تصادم رہا ہے"۔

_____ "آج ہم سودا اور ذوق کے قصائد کو اس طرح نہیں پڑھتے جس طرح ان کے "شاہی زمانے" میں لوگ پڑھتے تھے اور نہ اس طرح آج پسند کرتے ہیں آج پڑھنے اور پسند کرنے کی "کیفیت" ہی بدل گئی ہے"۔

_____ "ادب میں ذوقِ سلیم زندگی کی برکتوں کا منحرف ہو کر پروان نہیں چڑھ سکتا۔ یہ پہلی اور آخری شرط ہے ..... اور شعر سنتے ہی چشم زدن میں اس کے تمام جذباتی، لفظی اور فکری متعلقات سامنے آجاتے ہیں اس کوندے کو اگر ہم وجدان ہی کہنا چاہتے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں مگر اس وجدان تک ہر شخص تربیت اور تہذیب، سعی اور اکتساب کے سہارے پہنچ سکتا ہے _____ اور یہ وجدان ہر شخص میں پایا جا سکتا ہے۔ ذوقِ سلیم کی منزل اگرچہ کڑی ہے مگر ایسی نہیں ہے جہاں تک کوئی راستہ نہ جاتا ہو اس لیے کہ جہاں تک کوئی راستہ نہ جاتا ہو وہ منزل ہی نہیں ہوتی"!

یہ مضمون ELITIST رویّے کے خلاف ہے ان کا لہجہ، استدلال کا توازن اور تحریر کی شفافی اپنے خیال کی پوری وضاحت کرتی ہے اور ترقی پسند تنقیدی کلیئے سے بچتی رہتی ہے۔

اپنے ایک مضمون "ہمارے ناقد اور عملی تنقید" میں لکھتے ہیں _____ "صرف نظریاتی تنقید اپنی تمام اہمیت اور افادیت کے باوجود ہماری تنقید نگاری کو آگے نہیں بڑھا سکتی ہے آج ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہماری تنقید ایک مقام پر آکر رک گئی ہے وہ بار بار چند ادبی مسائل بیان کر کے خاموش ہو جاتی ہے اسے نظریات کو پرکھنا نہیں آتا تنقید نگاری میں نظریات یا نظریاتی حیثیت سے اس وقت تک وقیع نہیں ہو سکتے جب تک یہ عملی تنقید کے ذریعے اپنی صداقت کی گواہی نہ دیں"۔

_____ "ہماری سب سے بڑی کوتاہی عملی تنقید کا فقدان ہے ہم نے نظریے تو پڑھ لیے مگر ہم نے اپنا ادب نہیں پڑھا اس کے بغیر تنقید نگاری اپنا اعتبار کھو بیٹھتی ہے عملی تنقید ہی ناقد کی بصیرت اس کے علم و فضل، اخذ و اکتساب اور صحیح پرکھ اور مذاق کی دلیل ہے"۔

اپنی ایک اور تنقیدی کتاب "ادب اور آگہی" میں نقاد کے رول پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں ... "ناقد کو قواعد داں، فلسفی، ادیب اور آخر میں ادب کا پرستار بننا پڑتا ہے ادب دشمنی کے ساتھ وہ جی ہی نہیں سکتا ناقد کی یہی ادب دوستی اسے قاری کی صف میں پہنچا دیتی ہے وہ دراصل وہی پرانا قاری ہے جو معاشرے کے ابتدائی دور سے داد اور توصیف کی منزلیں طے کرتا ہوا ناقد کی شکل میں ہم تک پہنچا ہے"۔ _____ "ناقد کا یہ شعور جہاں اسے ادیب اور قاری کے درمیان ایک مستقل حیثیت بخشتا ہے وہاں اس کے وجود کو دونوں سے الگ بھی کر دیتا ہے"۔ _____ "ادیب اور قاری کے درمیان وہ مصلح، رہنما، مفکر، مدبر، ترجمان، قاصد، سرپرست، تابع فرمان، عاشق، رقیب، خود پرست، خود شناس گم کردہ راہ، منافق اور دلّال سبھی طرح آ رہا ہے"۔ _____ "کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک سماجی عمل ہونے کے ساتھ ناقد کا ایک ادبی کردار بھی ہے جسے ادب ہی نے پیدا کیا ہے مگر یہ کردار کتابوں سے باہر رکھا گیا ہے"۔

_____ "اس کی خطا یہ ہے کہ اس نے اپنے پہلے "خالق" "ادیب" کے حکم سے سرتابی کی ہے اس کی یہ خطا بھی ہے کہ اس نے اپنے دوسرے "خالق" قاری کے حکم سے بھی سرتابی کی ہے اس لیے وہ ایک مستقل برزخ میں ہے اس کے لیے کوئی جنت ہے نہ جہنم۔ وہ دونوں کا ناقد ہے"۔ مجتبیٰ حسین کے ان خیالات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تنقید، قاری اور ادب کے مسائل پر کتنا غور و فکر کرتے تھے مجھے اس سے غرض نہیں ہے کہ آج ان کی تحریروں میں وہ دم خم نہیں ہے جو اس دور کے ترقی پسند اور جدید ناقدوں میں تھا ان کے لہجے میں شگفتگی آج بھی باقی ہے اور یہ ایک اہم بات ہے۔

آج جب کہ "اسلوبیاتی" کا شاخسانہ کھڑا کیا جا رہا ہے اور "جدیدیت" کو پھر سماجی اور معاشی ڈھانچے سے الگ کرنے کی دھن میں ایک اور "مغربی انداز" کی تنقید کو رواج دینے کی کوشش کی جا رہی ہے اس موقع پر مجتبیٰ حسین کے ایک مضمون "کچھ لہجے کے بارے میں" کا مطالعہ اس دور میں بھی مفید ہوگا وہ لکھتے ہیں ؎

"_____ ہاں اے کمیتِ فکر دکھا بانکپن کی چال | پریاں خجل ہوں ناف میں چل اس چلن کی چال
ہو بوئے گل کی سیر ہوائے چمن کی چال | دلدل کی جست، شیر کا حملہ، ہرن کی چال

ہاں شہسوارِ عقل طبیعت تھمی رہے
اکھڑے جو یہ سمند تو پڑی جمی رہے

اگر یہ بتایا جائے کہ یہ مرزا دبیر کے صاحب زادے مرزا اوج کا کلام ہے تو اس پر انیس کا دھوکا ہوتا ہے طرز یا اسلوب تو پایا جا سکتا ہے مگر مزاج اور شاعر کے تصورات نہیں اپنائے جا سکتے۔" ـــ "صرف اسلوب کی پختگی اور ایک مخصوص طرز کے باوجود شاعری کیوں نہیں ہو پاتی ـــ اور کون کون سے عناصر ہیں جو شاعری کو چمکاتے ہیں ـــ اور برے اسلوب کو نکھر و تاثر میں بدل دیتے ہیں۔ یہیں پہنچ کر ہم محسوس کرتے ہیں کہ الفاظ کے تحت بھی ایک آواز ـ ایک لہجہ ہوتا ہے جو ایک شاعر کے کلام میں اسلوب کی پختگی کے باوصف گھٹتا بڑھتا رہتا ہے..... "جتنا تاریخی شعور ہوگا اتنی ہی شاعری میں تکمیل، بلندی اور اثر پذیری ہوگی۔" "امی شخصیت کا دوسرا نام لہجہ ہے ... شاعری میں لہجہ کا پتہ بھی مسلسل مطالعے اور مختلف شاعروں کے کلام کو ان کے تاریخی پس منظر میں رکھ کر پڑھنے اور سمجھنے کے بعد ہی چل سکتا ہے۔" "لہجے کو پایا جانا" شاعر اور قاری دونوں کا امتحان ہوتا ہے۔" ـــ "نظموں میں یہی لہجہ کبھی دبیز ہو جاتا ہے کبھی اس میں قطعیت آجاتی ہے اور کبھی اشاریت کبھی یہ بانسری کی لے میں تبدیل ہو جاتا ہے اور کبھی چھوٹے اور درازی کی ضربوں میں آزاد نظم اور نظم معرّا میں لہجہ کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔"

یہ وہ مسئلہ ہے جس کی بحث بہت ہوتی ہے "لہجے" کے ذریعے کلام کی شناخت ـــ مجتبیٰ حسین کے خیالات سے اختلاف کیا جاتا ہے مگر تنقید تو نئے نئے در وا کرتی ہے کیا تھا؟ کیا ہے؟ اور کیا ہوگا؟ کبھی یہ بنیادی سوالات ایک دائرہ بناتے ہیں اور کبھی یہ ٹیڑھی لکیر بن جاتے ہیں اسی لیے تنقید کبھی "آخری" نہیں ہوتی ـــ!

اس زمانے میں یعنی ۱۹۵۰ء کے آغاز میں "غزل کے مسئلہ" پر رد و قدح ہوئی تھی "تہذیب و تحریر" میں اس پر چار مضامین ہیں، تغزل کیا ہے؟ کیا غزل کی اہمیت ختم ہو چکی ہے؟ ـ دورِ حاضر اور غزل، اور حالی اور ترکِ غزل ـ یوں تو یہ چاروں مضامین قابلِ مطالعہ ہیں مگر میں صرف تغزل کیا ہے؟ کے چند اقتباسات دوں گا تاکہ یہ پتا چل جائے کہ وہ کتنی گہرائی اور بلندی سے اپنے موضوعات کو تحریر کرتے تھے اور ان میں ان کا تنقیدی ذہن کہاں تک رسائی کرتا تھا ـ!

"ـــــــ دراصل یہ ایک جنسی جذبے اور کشش کے اظہار کا نام ہے اس جذبے اور کشش میں جتنی شدت، خلوص اور شائستگی پائی جائے گی تغزل اتنا ہی رچا اور نکھرا ہوا ہوگا" ـــ "تغزل کی اساس جنس اور اس کے تمام متعلقات پر ہیں۔"

"در دلِ ما غمِ دنیا غمِ محبوب شود　　　بادہ گر خام شود پختہ کند شیشۂ ما

یہ "شیشہ" وہی تغزل ہے جس میں ڈھل کر ہر رنگ اور ہر نوع کے مضامین محبوب کا رنگ و روپ اختیار کر لیتے ہیں۔" "بعض شاعروں نے تو غزل کہی ہے مگر تغزل سے ہٹ کر ... تغزل اور غزل کی یہ کشمکش اور جدائی موجودہ دور میں زیادہ نمایاں ہو چلی ہے حالاں کہ دونوں جسم اور روح کے مانند ہیں۔" "جدید عشقیہ نظموں کے "مزاج" اور "تغزل" کے اس مزاج میں جو غزل کی مقبولیت نے صدیوں میں تعمیر کیا ہے فرق ہے معاشرے کے تغیر اور تبدل، عشقیہ ماحول کے اختلاف اور انقلاب نے جدید عشقیہ نظموں کو ایک نیا مزاج دیا ہے جو بسا اوقات تغزل کی گرفت سے باہر ہے ... تغزل کی اساس مخصوص روایات، علامات اور ایک مخصوص عاشقانہ انداز پر ہے یہ اپنی تمام تر وسعتوں اور گہرائی کے باوجود صنفِ غزل سے بے پرواہ نہیں ہو سکتا۔" ـــ "جوش کی عشقیہ نظمیں ہمارے ادب کا بہترین سرمایہ ہیں مگر ہر جگہ ان میں تغزل کی کھوج سعی لاحاصل ہوگی .... غنائی شاعری کو تغزل کا مترادف ٹھہرانا زیادتی ہوگی۔"

مجتبیٰ حسین نے غزل کے مسئلے پر نہایت عمیق طرح سے غور کیا ہے اور ان کے نازک اور متصادم نکات پر باریکی سے تنقید کی تھی آج ہندوستان کی مختلف زبانوں میں غزل کا رواج ہو گیا ہے اور نو دولتیہ طبقہ اس کے فروغ میں سب سے آگے ہے وہ غزل اور تغزل کی نزاکتوں سے ناواقف ہے اور اس کے شعرا بھی فلمی دنیا میں "جگہ" نہ پانے کی وجہ سے اس میں پیش پیش ہیں جیسا کہ قرۃ العین حیدر نے اپنے ایک انگریزی مضمون میں لکھا ہے کہ ان کی غزلوں کا سنجیدہ شاعری میں کوئی مقام نہیں ہے اصل تو ترنم اور مسرت کی تلاش میں غزلوں کے کیسٹ فروخت ہو رہے ہیں گانے والوں اور گانے والیوں کو اردو زبان تک نہیں آتی ہے جاگیردارانہ دور میں مجرے کا رواج تھا اور آج اس کی جگہ غزلوں کے کیسٹ نے لے لی ہے ـ!

[۳]

مجتبیٰ حسین نے عملی تنقید میں خاکہ نگاری اور تنقید کے سنگم سے بھی کام لیا ہے، آرزو لکھنوی سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "ایک شخص نے میری ساری توجہ اپنی طرف کھینچ لی ـــ وہ خاموش ـــ گم سم، بے نیاز بیٹھا ہوا تھا سر پہ دو پلی ٹوپی، جسم پر شیروانی، چہرے پہ متانت اور حلم، کبھی کبھی آنکھوں میں کہیں کہیں چنگاریاں سی ـــ میں نے اسے دیکھا اور خاموشی سے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ بدستور اسی بے نیازی کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ عجیب و غریب بے نیازی تھی ـــ اس میں تکبر و نمود نہیں تھی۔ ایک شفقت اور سپردگی سی تھی ـــ "مرنجاں مرنج" کی ایک کیفیت سی تھی۔ یہ بے نیازی علم کا وقار اور سنجیدگی، زندگی کی گہرائی اور دردمندی لیے ہوئے تھی۔" یہ ۱۹۴۸ء کے آرزو صاحب کی ایک خوبصورت تصویر ہے۔ اب ان کی شاعری کے بارے میں مجتبیٰ کی رائے سنیئے ـ! "ہم ان الفاظ

کی اینٹ بھی کہیں سے کھسکا ہیں سکتے انھوں نے بڑی محنت سے خون پسینہ ایک کرکے جس سلیقے سے ایک لفظ کے اوپر دوسرا لفظ جمایا ہے وہ ایک ماہر صناع کا کام تھا اس سلسلے میں انھوں نے ٹھیٹھ لفظوں سے بڑا کام لیا ہے ان کی شاعری کی فضا، سنگ و خشت کی فضا ہے اس فضا میں ایک قسم کے کھردرے پن اور بے رخی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن اگر ہم زاویہ کے لیے غزل کی مروجہ نفاست اور تکلفات سے منہ موڑ لیں تو یہی فضا پُرخلوص جذبات سے بوجھل ہوجاتی ہے "۔ مجتبیٰ نے آرزو کے چند اشعار بھی لکھے ہیں دو ایک یہاں نقل کیے جاتے ہیں ؎

دفعتاً ترک تعلق میں بھی رسوائی ہے — الجھے دامن کو چھڑاتے نہیں جھٹکا دے کر

جوشش جنوں میں وہ ترے وحشی کا چینا — بندھا پنے ہاتھ سے در زنداں کیے ہوئے

دو تند ہواؤں پر بنیاد ہے طوفاں کی — یا تم نہ حسیں ہوتے یا میں نہ جواں ہوتا

جاتے کہاں ہو دل سے نگاہوں کو موڑ کے — تصویر نکلی پڑتی ہے آئینہ توڑ کے

کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی — جھوم کر آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی

"غزلوں میں خالص اردو کبھی کبھی سپاٹ ہوجاتی ہے مگر یہی گیتوں میں جان ڈال دیتی ہے"۔ مجتبیٰ کے ان مضامین کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ قاری کے دل و دماغ کو ان شعراء کے مطالعے کی لگن پیدا ہوتی ہے اور نقاد کا یہ ایک اہم فرض ہے کہ اس کے مضامین پڑھنے والوں کو اور پڑھنے اور سوچنے کی دعوت دیں۔

مجتبیٰ نے اکبر الہ آبادی پر مختار زمن کا مضمون ایک خط کی صورت میں لکھا ہے ادب لطیف کے سالنامہ ۱۹۸۸ء میں اکبر الہ آبادی پر مختار زمن کا مضمون "آج کا شاعر" شائع ہوا ہے [وارث علوی کو مختار زمن کا اسلوب نگارش بہت پسند ہے] اس لیے میں نے سوچا ماہا ماہ پرانے مضمون کے اقتباسات نقل کردوں تاکہ پتا چل جائے کہ وہ اکبر سے پوری واقفیت رکھتے تھے "اکبر کے کلام میں موضوع اور اسلوب کی ہم آہنگی اس طرح پائی جاتی ہے کہ اردو کے چند گنے چنے شاعروں کو چھوڑ کر یہ فن مفقود ہے "۔ "اکبر میں قوت تعمیر بے پایاں ہے ان کی نظمیں اس کی گواہ ہیں۔ یہ تعمیر کرنے کی قوت ظرافت نگار شاعر کے لیے بے حد ضروری ہے تعمیر کے حوصلے میں ہی ظرافت ابھرتی ہے۔ اکبر کی بہت سی نظمیں بہت سے اشعار بہت سی تضمینوں میں یہ "ہنر" پایا جاتا ہے "۔

"بُردور کا جلوہ" اکبر کی شاعری انھیں خواص کی صف سے ہٹا کر عوامی زندگی کی طرف لے جاتی۔ لیکن اکبر "عوامی زندگی" کا سہارا لینے کے باوجود اس میں شریک نہ ہو سکے۔ وہ "بذریعہ اصلاح خواص" "اصلاح عوام الناس کرنا چاہتے تھے"۔ "بات یہ ہے کہ اکبر کی شاعری میں بھی ایک "ملّا" چھپا بیٹھا ہے ــــ یہ "ملّا" مذہبی اتنا نہیں ہے جتنا اسیائی اور ماضی پرست ہے "۔ ــ "اکبر کا ملّا اقبال کے ملّا کے مقابلے میں کم خطرناک ہے۔ اس لیے کہ اس کے پاس فلسفہ اور حکمت کی سپر نہیں ہے۔ وہ نئے علوم و فنون سے فائدہ اٹھا کر انھیں کی جڑ کاٹنے کی کوشش نہیں کرتا ؎

کس بہ آموخت علم تیر از من — کہ مرا عاقبت نشانہ نکرد

اکبر کا ملّا "عاقبت نشانہ نکرد" کی ذہنیت سے مبرا ہے ــ وہ رسم و رواج ــ اور وضعداری کا مارا ہوا ہے۔ وہ ذرا سادہ لوح ہے "راسپوٹین" نہیں ہے "۔ کہنا یہ ہے کہ ہمیں آج بھی اکبر کی ضرورت ہے جو پہلے والے اکبر کی طرح نہ ہو ــ جو سماج کی موجودہ حالات کی قلعی کھول سکتا ہو.. ہمیں اس قدرت کلام کی ضرورت ہے.... طنز و ظرافت کی آج بھی ضرورت ہے .. ہم روتی ہوئی دنیا کو ہنسا کر اس میں نئی جان پیدا کرسکتے ہیں مگر ہم میں وہ کس بل نہیں ہے جو اکبر میں تھا ــ ہماری زبان لکنت کرتی ہے ــ اور جب ہم ہنسنے لگتے ہیں تو چہرہ بگڑنے لگتا ہے"ــ یہ مختصر مضمون اکبر الہ آبادی کی شاعری پر کلیدی تنقید کا درجہ رکھتا ہے افسوس ہے کہ اس کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ مجتبیٰ کے ایک پُرلطف مضمون کے چند اقتباسات دیکھیے تو یہ معلوم ہوگا کہ وہ یک رخے نہیں تھے ان کی نظر دوسرے اور تیسرے درجے کے شاعروں پر بھی تھی ظریف لکھنوی پر بہت کم نقادوں نے توجہ دی ہے اس شاعر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

" ــــ ظریف کانگریسی تحریک سے متاثر تھے اسی لیے اکبر کے مقابلے میں وہ زمانے کے تغیرات کو قبول کرنے پر زیادہ آمادہ ہیں جہاں تک اکبر کی شاعری کا تعلق ہے وہ ظریف سے کہیں زیادہ وسیع اور برتر ہے مگر اکبر کی شاعری کی یہ وسعت اور برتری ان کے نقطۂ نظر کی رہین منت نہیں ہے ان کے نقطۂ نظر نے ان کی شاعری کو اس قدر صدمہ پہنچایا ہے کہ آج ان کے بہت سے ظریفانہ اشعار مضحکہ خیز بن کر رہ گئے ہیں "۔

ــــ "ظریف نے تمام دور از خیالی اور مضحک موضوعات کو تضحیک کا نشانہ بنایا ہے .... لیڈری کا خبط، سرکاری اعزاز کی ہوس، جاہ پرستی کا زعم باطل الیکشن کی بدحواسیاں، اچھل کود، ہوس ــ زندگی کے ان ظاہری پہلوؤں پر انھوں نے کڑی نکتہ چینی کی ہے ..." ظریف کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

۔ مادرِ ہند کی قسمت میں لہو پینا ہے — یونہی غم کھانا ہے مر مر کے یونہی جینا ہے
نہیں ممکن ہے وہی جج بھی ہو، لیڈر بھی بنے — حکمرانی بھی کرے قوم کا اسٹیڈر بھی ہے
اور گاندھی کی نہ پوچھو ہے وہ اک مردِ فقیر — فاقہ کش قوم کی گویا ہے مجسم تصویر

——— اور ظریف کے کلام کے نمونے بھی پیش کیے ہیں آج بھی ظریف کا کلام بیشتر مزاحیہ شعراء سے بہتر ہے شرط گہرے مطالعے اور بصیرت کی ہے ——!

[۴]

اُردو فکشن پر بھی مجتبیٰ کی نظر بڑی فکر جیز ہے "ادب اور آگہی" میں چھ مضامین اور "آگ کے دریا" پر ایک مختصر تبصرہ شامل ہے۔

(۱) افسانوں کی پریاں (۱۹۶۱ء) (۲) اردو ناول کا ارتقاء (تحریر ۱۹۴۵ء) (۳) اُردو افسانہ نگاری کے رجحانات (۱۹۶۱ء) (۴) پریم چند (۱۹۴۵ء) (۵) جانِ عالم (۱۹۵۳ء) (۶) اعمال نامہ (۱۹۵۲ء) (۷) آگ کا دریا (۱۹۶۰ء) ——— میں چند مضامین کے اقتباسات دوں گا تاکہ مجتبیٰ حسین کے انداز، رویّہ کے پھیلاؤ کا پتا چل سکے۔ "افسانوں کی پریاں" ——— اس مضمون میں ایک جگہ وہ ورڈ سورتھ کا حوالہ دیتے ہیں

HEAVEN LIES ABOUT US IN OUR FANCY, GATES OF THE PRISON HOUSE BEGIN TO CLOSE UP ON THE GROWING BOY'

"ہمارے بچپنے میں آسماں ہمارے تصوّر میں ہوتا تھا اور بڑے ہوتے ہی زنداں کے دروازے ہم پر کھلنے شروع ہو جاتے ہیں۔"

اس اقتباس کے بعد وہ رقم طراز ہیں ——— "زندگی چھوٹے چھوٹے قبیلوں یا چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں سمٹی ہوئی تھی تاجدار کا تخیل "ظلِ الٰہی" کے بدلے "ظلِ سبحانی" تھا آبادی اتنی گھنی اور با شعور نہیں تھی۔ جب شام ہو جاتی تو کوئی پراتم بڈھا مزے لے لے کر جن پریوں کی کہانیاں سناتا اور سب ہمہ تن متوجہ گھٹنوں سا کرتے۔ تاروں بھرا آسمان، وسیع، نیلگوں، لامحدود، ان کے سروں پر خیمہ کا کرتا ہیبت ناک اور گھنے جنگل ان کے ارد گرد پُراسرار سائیں سائیں کیا کرتے، الاؤ کی روشنی، بڈھے قصّہ خواں کا دھندلا دھندلا چہرہ اور اس کے گرد سر دوزں کا ہجوم، تاریکی کے پس منظر میں عجیب سماں پیش کرتے ——" "ہم ان کہانیوں کو محض خرافات اور لغو داستانوں کا نمونہ کہہ کر نہیں ٹال سکتے یہ ذہنِ انسانی کی تاریخ ہیں" —— "ان تمام کہانیوں کے افراد کی صرف ایک کمزوری ہے اس کا نام عورت ہے —— عورت آئی نہیں کہ اس نے انھیں مخبوط الحواس بنا دیا" —— "انسانی نفسیات کے آثار چڑھاؤ سے جو ناول ڈرامے اور افسانوں میں جان ڈالتے ہیں یہ داستانیں تقریباً خالی ہیں" —— "مرزا غالب "بوستانِ خیال" کے مترجم خواجہ امان سے یہ کہانیاں بڑے شوق سے سنتے اور جا بجا مختلف علوم کی اصطلاحوں کی تشریح بھی کرتے جاتے" —— "اور اس دلچسپ مضمون کی آخری سطر بھی بڑی اچھی ہے" "یہ زندگی کی طلسمی فضا سے ہی ہیں اسی لیے ان میں زندگی کا طلسم ہے اور یہ زندہ ہیں" —— "لیعنی افسانوں کی پریوں ہی نے سائنس فکشن کو جنم دیا ہے —— اپنے دوسرے مضمون "اُردو ناول کا ارتقا" میں لکھتے ہیں ——

" ——— سرشار دراصل اردو میں کسی مصنف کا نام نہیں ہے بلکہ ایک منزل کا نام ہے جہاں تھکے ماندے مسافر آرام کرتے ہیں جس کی تلاش میں قافلے چلتے ہیں" ——— "ان کا ایک اسلوب ہے تیز طرار، رواں دواں، ان کے جملے ان کے فقرے ان کے حروف اس قدر حرکت سے معمور ہیں کہ دوڑتے نظر آتے ہیں اتنی زندگی ان میں بھری ہوئی ہے کہ وہ ایک جگہ رک ہی نہیں سکتے انھوں نے شاہی لکھنؤ کے آخری دور کے تمدن کو ہمیشہ کے لیے اپنی کتاب میں زندہ کر دیا" —— پورا "فسانہ آزاد" کسی نکتہ کا حامل نہیں ہے سرشار چاہے ترکی کا ذکر کر رہے ہوں یا کسی اور جگہ کا، مگر لکھنؤ ہر جگہ ہر موقع پر چھایا رہتا ہے" —— "خوجی بھی ہماری اَرکی تصویر نہیں ہیں وہ ہم آپ میں شامل بھی ہے مگر ہم سے علاحدہ بھی ہے جیسے زندگی ہم میں شامل بھی ہے اور ہم سے علاحدہ بھی ——"

"امراؤ جان ادا" پر خورشید الاسلام کا طویل مقالہ حرفِ آخر ہے پھر بھی مجتبیٰ حسین کی رائے سننے کے لائق ہے —— "اس ناول میں طوائف نہ صرف ایک سماجی علامت ہے بلکہ وہ معصومیت کا المیہ بھی بن جاتی ہے۔ یہاں معصومیت اغوا کی جاتی ہے بیچی جاتی ہے مجروح کی جاتی ہے اور آخر میں بھلا دی جاتی ہے اس طرح جبر و ستم کی بڑی علامت بن جاتا ہے ——"

" —— دراصل صحیح معنوں میں اردو میں اگر کہیں ناول ملتے ہیں تو وہ پریم چند کے یہاں ان میں شک نہیں کہ ان کے ناولوں کی فضا اکھڑی اکھڑی سی معلوم ہوتی ہے اور وہ بعض نازک مراحل سنبھال نہیں سکے ہیں مگر سب کچھ کہنے کے بعد ان کے ناول شاید اب تک اردو کا سب سے قیمتی سرمایہ ہیں" —— "مجتبیٰ نے فیاض علی کے مقبول عام ناول "شمیم" اور دوسرے ناول "انور" کا بھی ذکر کیا ہے سجاد ظہیر کے ناول "لندن کی ایک رات" اور کرشن چندر کی "شکست" کا بھی تفصیلی ذکر ہے اس وقت تک عزیز احمد کا ناول "گریز" اور عصمت کا "ٹیڑھی لکیر" شائع نہ ہوئے تھے البتہ عصمت کا "ضدی" شائع ہو چکا تھا اور مجتبیٰ کی رائے اس بارے میں اچھی نہیں تھی

مجتبیٰ کا یہ مضمون ان کی ابتدائی کوشش ہے مجھے علم ہے کہ خورشید الاسلام اور خلیل الرحمان نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں نہایت فکر خیز مضامین لکھے تھے اور اختر رائے پوری نے بہت کمسنی میں ادب اور زندگی کے مسئلہ پر مضمون لکھا تھا مجتبیٰ ان لوگوں سے کم ذہین اور طباع نہیں تھے جو ان کے متعدد اقتباسات سے ظاہر ہو جاتا ہے اپنے ایک مضمون "اردو افسانہ نگاری کے رجحانات" میں سعادت حسن منٹو کے بارے میں یہ رائے بڑی معنی خیز ہے۔ "اُن کے افسانوں میں معاشرے کا مطالعہ "یک طرفہ" اور کچھ سطحی سا ہو کر رہ جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے انسان کو صرف "جسم" سمجھا ہے ــــــ منٹو آدمی کو برہنہ دیکھنے کے عادی ہیں فن کار کے لیے آدمی کو اس طرح دیکھنا کبھی کبھی ناگزیر ہو جاتا ہے مگر آدمی کو مستقل برہنہ دیکھنا شاید فن کاری کے علاوہ بیماری بھی ہے" اس مضمون کے آخری جملے آج بھی اہم ہیں "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے افسانہ نگار ایک خلا میں لکھ رہے ہیں جہاں آدمی کا گذر نہیں جہاں کسی آدمی کی آواز نہیں آتی اداس ہوائیں بولتی ہیں.. مگر نہیں بولتا تو آدمی۔ وہ بے چارہ چپ ہے دیکھیے کب ہمارے افسانہ نگار اس مہر سکوت کو توڑتے ہیں جو انھوں نے اپنے زمانے کے آدمی کے لبوں پر لگا رکھی ہے" یہ وہی زمانہ ہے جب میں نے پاکستان کے بارے میں کہا تھا ؎

ہر طرف پھیلی ہے یہ کیسی گہری تاریکی کیسے رگ رگ میں خموشی کا اندھیرا۔؟

۔ یہ ایوب خان کی آمریت کا زمانہ تھا

جب مجتبیٰ حسین کا تبصرہ "آگ کا دریا" پر شائع ہوا تھا تو ایک ہنگامہ سا ہوا تھا شاید قرۃ العین حیدر اس وقت تک لمٹی نہیں آئی تھیں ــــ تبصرے کے چند اقتباسات دیکھیے۔!

"ــــــ میں نے قرۃ العین کے ناول کو دونوں لحاظ سے پڑھا۔ مروجہ انداز میں عام طور سے جو اچھے ناول لکھے جاتے ہیں اُس لحاظ سے بھی اور اِس لحاظ سے بھی کہ اس میں ایک نئے قسم کا تجربہ کیا گیا ہے اس کا خاص کردار "وقت" ہے جیسا کہ بتایا گیا ہے نیا تجربہ تو اس میں مجھے کوئی نہیں ملا "فیڈ اِن اور فیڈ آؤٹ" کی سیدھی سادی تکنیک پر اس ناول میں عمل کیا گیا ہے اس کے سوا جو کچھ فنی تجربہ یا نیا پن اس ناول میں ملتا ہے وہ صرف اتنا کہ ایک ہی نام کے کردار مختلف تاریخی ادوار میں آتے رہتے ہیں اور کہیں کہیں ان کے عمل میں اشتراک اور اتحاد کا ایک شائبہ سا پایا جاتا ہے سو یہ چیز اتنی نئی نہیں جتنی باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے"

"ــــــ اس میں شک نہیں کہ قرۃ العین حیدر کی تحریر میں بڑی جان، شعریت، دل سوزی، حوانائی اور تازگی ہے لیکن اپنے شدید داخلی تاثر کی وجہ سے یہ تحریر نہ اتنے زیادہ صفحات کی متحمل ہو سکتی ہے نہ ناول میں آنے والے ہر موقع کو سنبھال سکتی ہے اس میں یکسانیت ہوتی ہے جذبے کی ایک ہی سطح بار بار ملتی رہتی ہے جو سوچنے کی صلاحیت کو بڑی حد تک ختم کر دیتی ہے ایسی تحریر اپنے تمام خلوص کے باوجود تقریباً آٹھ سو صفحات کے ضخیم ناول کے لیے شاید زیادہ موزوں نہیں ہے"

"ــــــ چمپا یا چمپک غالباً اس ناول کا سب سے فکر انگیز کردار ہے خود گوتم کا کردار اس کے گرد گھومتا رہتا ہے"

"ــــــ خیال ہوتا ہے کہ چمپک کہیں ہندوستان کی روح تو نہیں ہے جو مختلف حکمرانوں کی "باندی" بنی رہی ہے پھر یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ کہیں یہ علامتی عورت تو نہیں جو تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف رول ادا کر چکی ہے ۔ ماں، طوائف، عشق بازوں کا کھلونا ــــ جو پہلے بھی تنہا تھی اور آج بھی تنہا ہے"

"ــــــ قرۃ العین حیدر کی غالباً سب سے بڑی طاقت ہی لکھنؤ ہے اس لیے کہ اس لکھنؤ میں ہندوستان کی تہذیب کے حسین ترین عناصر سمٹ آئے تھے اور یہاں آکر کچھ اور بھی نکھر اٹھے تھے"

"ــــــ سرور، سرشار اور رسوا کے بعد قرۃ العین لکھنؤ کے تمدن کی سب سے بڑی ترجمان ہیں ان کا لکھنؤ اگرچہ نیا لکھنؤ ہے مگر اس کو پیش کرتے وقت ان دونوں لکھنؤ میں بے آہنگی کی جگہ ایک تاریخی تسلسل کے حسن کا احساس ہوتا ہے ــــ قدیم اور جدید ایک مضبوط تہذیبی رشتے میں پرو دیے جاتے ہیں یہ بڑی بات ہے"

"ــــــ آگ کا دریا ناول کے اعتبار سے ناکام ہے لیکن اس کی ناکامی بڑی عظمت کی حامل ہے یہ ایک بڑے پیمانے کی کوشش ہے جو کامیابی اور ناکامی دونوں سے بلند ہے اس میں تاریخ کے اہم باب کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا گیا ہے اور تاریخ کے سارے حسن کو سمیٹ کر لفظوں میں بھر دیا گیا ہے لفظ خود زندہ رہتے ہیں اس لیے کہ وہ تہذیب کا سب سے اہم مظہر ہیں"

یہ تبصرہ شائع ہوئے ۲۹ برس گذر گئے ہیں آج بھی یہ قابل مطالعہ ہے مجتبیٰ حسین کا عمومی رویہ ہمدردانہ اور تنقید معروضانہ ہوتی تھی وہ بے حد بلیغ تنقیدی نظر رکھتے تھے اس لیے نہیں کہ سارے کلاسکی فارسی اردو ادب پر ان کی نظر تھی بلکہ ان کی شخصیت میں بڑا تنوع تھا اور اس لیے کہ وہ یک رخے



## نشتر خانقاہی

◆

اس طرح ہر مرحلہ، نامعتبر میرا ہوا
پاؤں گویا دوسروں کے تھے، سفر میرا ہوا

اس کا سناٹا غضب تھا، اس کا ہنگامہ غضب
دشت کب میرا ہوا تھا، کب نگر میرا ہوا

اک متاعِ سخت جانی تھی سو وہ بھی چھن گئی
کھیت جنگل میں، نہ آبادی میں گھر میرا ہوا

یوں لگا جیسے میں آوازوں کے اک جنگل میں ہوں
جب کبھی شہرِ خموشاں سے گزر میرا ہوا

موسمِ گل کیا گیا، چیزوں سے پہچانیں گئیں
زخم بے تشخیص، پتھر بے شرر میرا ہوا

کون شہرِ غم میں دے گا داد اس کردار کی
کل جو تھا سفاک دشمن چارہ گر میرا ہوا

دوستو! اوقاتِ بیکاری کو فرصت مت کہو
وہ جو پل خالی ہوا، مر کر بسر میرا ہوا

◆

یہ ارضِ بے بہا، اس رت میں بنجر ہو گئی شاید
گلِ زرخیز میری، نذرِ صرصر ہو گئی شاید

سلیقہ صارفینِ شہر سے سیکھوں معیشت کا
کہ رائج اب یہاں تہذیبِ دفتر ہو گئی شاید

بھٹکتے پھر رہے ہیں، شہر میں بیٹے کسانوں کے
تقاوی، کھیت کی قیمت سے بڑھ کر ہو گئی شاید

تعلق اپنے گھر سے ہے، نہ ہمسائے سے رغبت ہی
طبیعت اب زمانے سے مکدر ہو گئی شاید

یہاں سب اپنے اپنے دائروں میں قید ملتے ہیں
یہ پابندی تو اس بستی میں گھر گھر ہو گئی شاید

تشدد کی خبر وجہِ تاسف تک نہیں بنتی
مری حالت تو اب پہلے سے بدتر ہو گئی شاید

گھرانے کتنے ہی مجبور دیکھے کوچ کرنے پر
یہ ہجرت خاندانوں کا مقدر ہو گئی شاید

◆

دیکھا نہیں، دیکھے ہوئے منظر کے سوا کچھ
حاصل نہ ہوا، سیلِ مکرر کے سوا کچھ

برسوں سے ہے معمورۂ بازارِ غریباں
یہ شہر نہ تھا جس میں ترے گھر کے سوا کچھ

کس حال میں اس شوخ سے وابستہ ہوا دل
سوغات میں دینے کو نہیں سر کے سوا کچھ

وہ غزونشینی ہے نہ ہے شہر نوردی
باقی نہ رہا، ہجر میں بستر کے سوا کچھ

کیوں گرد سی اڑتی ہے یہ ہر لحظہ رگوں میں
کیا جسم کے اندر نہیں صرصر کے سوا کچھ

پھولوں سے بدن ڈوبتے دیکھے گئے ہر بار
اس بحر میں تیرا نہیں پتھر کے سوا کچھ

کرتے بھی طلب کیا کہ یہاں دستِ عطا میں
دینے کو نہ تھا جنسِ میسر کے سوا کچھ

● محلّہ بھاٹان، کھور، یوپی



جمیل زبیری
ب - ۱۳۲، بلاک ۱، گلشنِ اقبال کراچی (پاکستان)

# دردِ لادوا

تھانیدار نے اپنے وردی پوش سپاہیوں کو گاڑیوں میں سوار ہونے
کی تعداد میں کھڑا کر کے اُن کا معائنہ کیا اور سب کو سختی سے اپنے پورے
پیٹوں کو اندر بھیج کر اور سینہ نکال کر اٹینشن کھڑے رہنے کی تاکید
مگر وہ خود بھی اپنی اس تاکید پر عمل کرنے سے قاصر تھا۔ سب گاڑیاں
کراچی کی رائفلوں کو کندھوں پر رکھ کر سلوٹ کیا۔ اور جب اس طرح
اگر وہ اپنی گاڑیوں میں اس علاقے سے گزرتے تو گھروں سے علم رو
حال لوگ بوٹ ملا کر گولیوں کی سنسناہٹ اور آتش زنی سے زیادہ
گاڑیوں کی آوازوں سے سہم گئے۔
چوک میں پہنچ کر سپاہی رک گئے اور تھانیدار نے لاؤڈ سپیکر پہ
اعلان کر کے ماتحت سے کہا
"آپ لوگ بالکل نہ ڈریں نہ گھبرائیں، ہم آپ کی حفاظت کے لئے
آئے ہیں ہم اس چوک میں خیمے لگا رہے ہیں اور جب تک حالات بالکل
ٹھیک نہیں ہو جائیں گے ہم رات دن یہیں رہیں گے۔ اور آپ کی حفاظت
کرتے رہیں گے۔"

لاؤڈ سپیکر سے بار بار اعلان ہوتا رہا۔ محافظوں کی آوازیں سن کر
ڈر سے سہمے ہوئے لوگ آہستہ آہستہ اپنے گھروں سے نکلنے لگے اور چوک پر
جمع ہونے شروع ہو گئے۔ جب کافی مجمع ہو گیا تو تھانیدار نے اپنی گرجدار
آواز میں کہا "ہم لوگ آپ کی دیکھ بھال کے لئے آئے ہیں۔ اور کچھ دن اسی
علاقے میں رہیں گے اور کوئی گڑبڑ نہیں کرے گا اگر کسی نے گڑبڑ کی یا باہر
سے کوئی گڑبڑ کرنے آیا تو ہم گولی چلانے پر مجبور ہوں گے۔"
لوگوں نے بڑی احسان مندی سے اپنے محافظوں کو دیکھا جو اپنے
بھاری جسموں کو لے کر بڑی مشکل سے دوڑ سکتے تھے۔
تھانیدار کی آواز لاؤڈ اسپیکر پر پھر اُبھری۔ ہم چونکہ سارا وقت
بیدار رہیں گے اس لئے آپ لوگوں کو چائے کھانے پینے کا بندوبست
کرنا ہوگا۔
چائے، انڈے، ڈبل روٹی ناشتے کے لئے، پھر دوپہر کا کھانا،
شام کی چائے اور پھر رات کے کھانے کا آپ لوگ مل جل کر بندوبست کریں
تاکہ ہم اپنی ڈیوٹی اچھی طرح انجام دے سکیں یاد رہے کہ ہمیں بہت سخت ڈیوٹی
دینی ہے راتوں کو بھی جاگنا ہے۔"
یہ اُن لوگوں سے کیا مانگ رہے تھے جو خود دو، دو وقت کے
فاقے سے تھے۔ مگر نہیں تو ہر حالت میں محافظوں کی خدمت کرنی تھی کیونکہ
اس بستی کے مکینوں پر قیامت ٹوٹنے کو کچھ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ ابھی
دھوئیں کے رنگوں سے خون رِس رہا تھا۔ ابھی تو مرنے والوں کی بوری لاشیں
بھی نہیں اٹھی تھیں۔ انہوں نے دیکھا تھا کہ حملہ آور قریب کے پہاڑ سے
ہی تو آتے تھے حملہ آوروں نے مسجد سے اعلان ہونے کا انتظار
کیا تھا اسی اسی مسجد سے جہاں سے اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہوا کرتی تھیں۔
وہ سیکڑوں کی تعداد میں تھے آگے والا دستہ بندوقوں سے گولیاں چلا
رہا تھا پیچھے لوگ کنستروں سے مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا
رہے تھے اور خوشی میں حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکال رہے تھے۔
مکینوں کے سینوں کو چھلنی کر کے مکانوں کو جلا کر وہ مٹھے بازار میں
داخل ہو گئے اور نعرے لگاتے اور دکانوں کو آگ لگاتے ہوئے آگے
بڑھتے رہے لوگوں کے چیخنے چلانے رونے اور سسکنے کی آوازیں آسمان
تک بلند ہونے لگیں۔
آگ اور خون کی یہ ہولی جاری رہی، بے بس بچے، مرد اور عورتیں تڑپتے
رہے، زخمی ہو کر تڑپتے سب آگ میں جھلستے رہے، انسانی جسم کے
جلنے کی بو پوری فضا میں پھیل گئی۔ قیامت سی ہو گئی۔ محافظوں کو اطلاع
دی گئی مگر ان کا ایک ہی جواب تھا۔ یہ تمہاری لڑائی ہے تم خود ہی لڑ کر
ایک دوسرے کو مار دو ہم کیا کر سکتے ہیں ہمیں جب تک گولی چلانے کا حکم
اوپر سے نہ ہو ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ مگر جب موت کے منہ میں جانے والوں
نے پتھروں سے اپنا بچاؤ کرنے کی کوشش کی تو محافظوں نے انہیں پر گولیاں
چلا دیں، آنسو گیس پھینکی۔ اور انہیں گڑبڑ کرنے والوں پر قابو بھی تو پانا تھا۔
کافی انتظار کے بعد فوج کے دستے نمودار ہوئے اسی مسجد سے
پھر اعلان ہوا قتلِ عام بند ہوا فوجیوں نے تمام لوگوں کو اُن کے گھروں
میں بند کر دیا اور باہر نکلنے والے ہر شخص کے لئے ایک گولی مقرر کر دی
پھر آہستہ آہستہ رات نے اپنی سیاہ چادر پورے علاقے پر پھیلا
دی۔ ذرا سکون ہوا تو گریہ و زاری اور کراہوں کی آوازیں دھیمی پڑ گئیں
مگر ساری رات گولیاں چلنے کی آوازیں فضا میں گونجتی رہیں۔
اس بستی سے کچھ دور ایک اور بستی تھی۔ جہاں موت بکتی تھی۔ ہر گلی
میں رہائش کرائی بڑی رگڑا رگڑ کر چاقوؤں اور چھریوں سے جسم کو لہو
لہان کر کے مارنے والی اور گولیوں کی بوچھاڑ سے یکلخت جسم کو چھلنی
کرنے والی۔ جب موت کے ان بیوپاریوں کو اس مذموم کام سے روکنے
کی کوشش کی گئی تو موت کے عفریتوں نے اپنا کام اور بھی تیز کر دیا اور
جگہ جگہ بدل بدل کر اپنا خونی رقص جاری رکھا۔ آس پاس کی دوسری بستیوں
میں پھیل گئے اور لوگوں کی جان و مال کے محافظ موت کے ان عفریتوں
کی حفاظت کرتے رہے۔ لیکن ساتھ ہی بستی کا ایک فرشتہ صفت انسان
کام کرتا رہا اسے مختلف بستیوں میں دیکھا گیا۔ وہ ہر جگہ موجود تھا۔ وہ صبح بھی
شام بھی اور ساری رات، جب لوگوں پر شدید حملہ ہو جاتا وہ تب بھی
اسی طرح مصروف نظر آتا۔ لوگ اسے پہچاننے لگے تھے اور اسے
زندگی کا واحد سہارا سمجھنے لگے تھے۔ وہ بھوکوں کے لئے کھانا لاتا، زخمیوں
کی مدد کرتا، لاشیں اٹھاتا اور سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے لوگوں کو
گرم کپڑے مہیا کرتا۔
ان علاقوں میں پاس پاس کئی مسجدیں تھیں۔ ہر مسجد کے مینار سے
پر چار چار لاؤڈ اسپیکر نصب تھے۔ جس طرح ان لاؤڈ اسپیکروں
سے ایک ساتھ اذان کی آوازیں فضا میں اتنے زور سے گونجتی تھیں
کہ آپس میں ٹکرا کر صرف ایک شور بن جاتی تھیں اور ان آوازوں پر لبیک
کہنے والے تک اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے تھے۔
ان دنوں اِن مسجدوں کے لاؤڈ اسپیکروں سے بار بار آوازیں
بلند ہونے لگیں۔ "وہ آ رہے ہیں۔ وہ آ رہے ہیں۔ اپنا بچاؤ کریں
اُن آوازوں کے بعد سے خوف و دہشت پھیل رہی تھی جس سے بہت لوگ جو دو
تین دن بعد اپنے گھر والوں کے لئے کھانے پینے کا سامان لینے نکلے
تھے پھر لوٹ کر ٹوٹے ہوئے مکانوں میں اپنے زخمی پریشان حال بھوکے
بے حال بیوی بچوں کو لے کر دبک جاتے تھے اور ان کی سلامتی اور
اس قہرِ انسانی سے نجات کی دعائیں مانگنے لگے تھے۔ ان دعائیں
مانگنے والوں میں سب ہی لوگ شامل تھے۔ خواہ وہ کوئی بھی تھے کہیں
سے بھی آئے تھے۔
چوک میں محافظوں کے خیمے لگنے کے بعد یہ دہشت ناک
اعلانات بند ہو گئے لوگوں نے سنا کہ مسجدوں سے اُن موذنوں اور
پیش اماموں کو پکڑ کر بند کر دیا گیا ہے۔ جہاں ان سپاہیوں کے
خیمے لگے تھے اسی چوک کے ایک نکڑ پر ایک چھوٹا سا مکان جس کا زیادہ
تر حصہ حملہ آوروں نے آگ لگا کر تباہ کر دیا تھا۔ اس گھر کا مالک
جو قسمت آزمائی کے لئے اس بستی میں کسی دور سے آ کر رہا تھا اس
آگ میں جل کر خاکستر ہو گیا تھا اور ساتھ ہی اس کے دو چھوٹے
بچے ایک لڑکا ایک لڑکی بھی انہیں شعلوں کی نذر ہو گئے تھے
اس کی بیوہ اُس دن سے اب تک اسی گھر کے ایک کونے میں پڑی
آسمان کو تکا کرتی تھی کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے۔ جب
لوگ ان محافظوں کے لئے کھانا لے کر آتے تھے تو اس کے حال پر

باقی صفحہ ۲۹ پر دیکھئے

# کمار پاشی

منظر میں پس منظر رکھ دے
وحشت کے بیچ سمندر رکھ دے
باہر خطرہ ٹہل رہا ہے
خود کو گھر کے اندر رکھ دے
دشمن کہیں سے آ سکتا ہے
ہر رستے میں پتھر رکھ دے
اب تو مسیحا بھی کہتا ہے
تیغ تلے اپنا سر رکھ دے
اسی میں تیری خیر ہے پاشی
صحرا میں جا کے گھر رکھ دے

رات کے بعد وہی رات کا گھیرا نکلا
ظلم کے شہر میں سورج بھی اندھیرا نکلا
کس سے فریاد کروں کون ہے سننے والا
جب مرے شہر کا حاکم ہی لٹیرا نکلا
سو گئے ہم تو اجالے بھی سیہ پوش ہوئے
ہم نہ جاگے تو کہیں بھی نہ سویرا نکلا
اجنبی بن کے میں تا عمر پھرا ہوں پاشی
آشنا کوئی نہ اس دہر میں میرا نکلا

ہم شہر میں پہلی سی وہ شہرت نہیں رکھتے
اب یعنی کسی سے بھی عداوت نہیں رکھتے
یاروں سے لڑا کرتے ہیں ہم ٹوٹ کے اکثر
گھر والوں سے الفت کی روایت نہیں رکھتے
خوش کیسے رہا کرتے ہیں ہنگام طرب میں
وہ لوگ کہ جو درد کی دولت نہیں رکھتے
اب ہم کو اجڑنے کا کوئی خوف نہیں ہے
دیوار نہ در اور کوئی چھت نہیں رکھتے
آسائشیں دنیا کی بڑی چیز ہیں پاشی
کیا حرج ہے تھوڑی سی جو غیرت نہیں رکھتے



۱/۳۳۲۰، دہلی گیٹ، نئی دہلی۔۲



شوکت حیات

ڈاکٹر جابر ہوسین، ہندر رو، پٹنہ ۸۰۰۰۰۶ (بہار)

# مکوڑا

کئی دنوں سے وہ مستقل طیش میں تھا۔

سنہرے مستقبل کے خواب دیکھتا ہوا وہ شہر کے لئے روانہ ہوا تھا تو اس کے والد نے اسے زندگی کی بلندیوں تک پہنچنے کی دعائیں دیتے ہوئے کہا تھا۔

"خدا تمہیں اونچائیوں تک پہنچائے بڑا آدمی بنائے ... اپنے حفظ وامان میں رکھے ...!"

اس نے دیکھا کہ یہ کہتے ہوئے اس کے باپ کی اداس آنکھیں دور کسی دھندلے میں کھو گئیں۔ بہت روکنے پر بھی ان میں آنسو ڈبڈبا گئے تھے۔ جب اُنہوں نے اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا تو اس نے محسوس کیا کہ ان کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اس نے بہت خاموشی سے دیکھا کوئی ردِ عمل اس کے چہرے پر نہیں تھا۔ بس ایسا لگ رہا تھا کہ اندر دل کی بہت گہرائی میں کوئی علامت سیلاب سے بیٹھ گئی ہے ۔۔۔ لیکن یہ تو اس کا معمول بن چکا تھا۔ اندر دل کی علامت زندہ ہوتا اور پھر نمودار ہو جاتی۔

شہر آکر اسے احساس ہو رہا تھا کہ حسن اونچائیوں تک اس کے والد اسے پہنچانا چاہتے تھے، اس کے لئے بہت نیچے جانا پڑتا ہے۔ دوستوں نے اسے پستیوں سے سمجھوتہ کرنے کا مشورہ دیا لیکن یہ اس سے ممکن نہ ہوا۔ یہ دیکھ کر اسے بڑی وحشت ہوتی کہ یہاں گمرد راور تنگ تھلگ پڑے ہوئے آدمی کو بڑی آسانی سے شہر ہڑپ کر جاتا ہے۔ اسے ڈارون کے اسٹرگل فار اگزسٹنس کے نظریے سے شدید نفرت ہو گئی۔

علم حیات کے پیریڈ میں جب ڈارون کا نظریہ پڑھایا جا رہا تھا تو اگر وہ طاقت ور کی بات سوچتے سوچتے اس کے دماغ کی رگیں دُکھنے لگیں تھیں۔ اچانک اس نے پروفیسر سے سوال کر دیا تھا

"یہ ٹھیک ہے کہ انسانی ارتقا میں اسٹرگل فار اگزسٹنس کا بڑا کار فرما رہا ہے جیسے زمین میں بیج بونے کے بعد جتنے پودے اُگتے ہیں، وہ سب زندہ رہنے کے لئے آپس میں زبردست جدوجہد سے دوچار ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانا شروع کرتے ہیں اس لڑائی میں جو کامیاب ہو جاتے ہیں، وہ زندہ رہتے ہیں باقی مر کر ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہم لوگ اس کے انسانی پہلو پر غور کریں۔ دوسروں کا حصہ ہڑپنا اور کمزوروں کو مار کیا جدوجہد ہے؟"

کلاس کے طلبا آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے تھے۔

پروفیسر اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا وہ اس کا دہکا کہے بول رہا تھا۔

"جناب! یہ تھیوری غیر انسانی ہے اور یہ ثابت کرتی ہے کہ انسانی ارتقا کی بنیادیں کتنی خود غرض، وحشیانہ اور غیر انسانی ہیں .. جیسے کا یہ مطلب تو نہیں کہ دوسروں کو ہلاک کیا جائے ... ؟"

پروفیسر نے کہا۔

"یہ سائنس کی کلاس ہے اور یہاں انسانیت اور اخلاقیات کا جائزہ لینا ہمارا کام نہیں ..."

"جناب! سائنس کو انسانیت سے الگ کیسے کیا جا سکتا ہے"

"اگر سائنس کی کلاس میں ایسے سوال پیدا ہوں تو بہتر یہ ہے کہ انسان مسجد میں اذان دے، یا مندر میں گھنٹا بجائے یا پھر مدر ٹریسا کی طرح کوڑھیوں کی خدمت کرے ..."

پروفیسر نے جھلا کر کہا۔

پوری کلاس میں قہقہہ گونج گیا۔ اس نے کہا

"جناب! یہ ارتقا ایک حقیقت ہے لیکن غیر انسانی حقیقت ہے۔"

پیریڈ ختم ہونے کی گھنٹی بج گئی۔ اس روز طلبا اور طالبات کے درمیان اس کی یہی بات موضوعِ گفتگو رہی۔

بچپن میں وہ بہت کچھ سوچتا تھا۔ حوصلے بلند تھے اس کی حیثیت ایسے پرندے کی ہو گی جس کی ایک ذرا سی حرکت سے پوری مشین کے کارگزاری کا رُخ بدل جائے گا۔ جوان ہونے کے بعد شہر پہنچ کر اسے اپنی بےبضاعتی کا احساس ہو رہا تھا۔ تمام ولولے دم توڑنے لگے تھے۔

اس نے افسانہ نگار ساتھیوں کی کہانیوں میں باپ دادا کی حویلی کے انہدام کا رونا سنا تو اس کا غصہ پھر اُبل پڑا شروع ہو گیا۔ اس نے کہا کہ اب یہ بات دُکھ نہیں پہنچاتی کہ باپ دادا کی حویلیاں منہدم ہو رہی تھیں دُکھ کی بات یہ ہے کہ اس کی جگہ پر تو دو نئی اونچی اونچی عمارتیں تعمیر کر رہے ہیں

اسے یاد آیا کہ شہر آنے کے بعد وہ آسمانی چھت کے نیچے سونے کے لئے ترس گیا تھا۔ شہر کے درمیان جس اصطبل نما کمرے میں رہنے کے لئے اسے جگہ ملی تھی، وہاں کی کچی چھتیں بھی کرائے پر لگی ہوئی تھیں۔ ایک کمرے میں چار لڑکے رہتے تھے۔ کمرے کے اندر وہ باہر کی دنیا کی منزل نہیں پہنچی تھی اس نے سوچا کہ سارا ملک سڑ چکا ہے۔

شہر آکر وہ پرانی باتیں بھول گیا تھا۔ کبھی کبھی اسے لگتا کہ اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں۔ جو بڑے بوڑھے تھے وہ گاؤں کی حویلی میں پڑے تھے۔ اس کی طرح جو جوان تھے وہ پہاڑوں کی چوٹیوں سے زمین کا جائزہ لینے میں مصروف تھے۔ اس کی یادوں سے کسی کا کوئی سروکار نہیں رہا تھا۔ وہ تنہا تھا جس کا ماضی اور مستقبل سے رشتہ کٹ چکا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ حال کے سنگلاخ راستے پر لہو لہان ہوتا ہوا وہ اپنے آپ سے بھی بے تعلق ہوتا جا رہا تھا۔ اسے آئینے سے وحشت ہونے لگی۔ اس کا کوئی چہرہ نہیں رہ گیا تھا وہ جب بھی آئینے کے سامنے کھڑا ہوتا، اندر ہی اندر دیکھنے لگتا وہ اپنی اس حالت سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتا۔

بہت دنوں سے اس نے گھر پر چٹھی بھی نہیں لکھی تھی۔ اس کے والدین جو اپنی جیبوں کے دانوں کے لئے اسے کب سے ترس کھاتے آئے تھے۔ بار بار خط لکھ رہے تھے۔ اس کے والد اس کی اونچائیوں نے اپنی ہی زندگی کی گُدڑ جوڑ سے بھولے تھے۔ اور راہ بچائیاں ..

رسوائی کے خیال ہی سے اس کا دم گھٹنے لگتا۔ کسی نے اس کے ہاتھوں میں والد کا خط تھما دیا۔

اب اس کے لئے مجبوری تھا کہ وہ پڑھائی چھوڑ کر نوکری ڈھونڈے گاؤں کا چھوٹا سا مکان بھی گروی رکھا جا چکا تھا۔ بے روزگاری دور کرنے کی خصوصی اسکیم کے تحت پانچ ہزار اسامیوں کا اشتہار اس کے سامنے تھا تنخواہ پانچ سو روپے۔ کچھ دنوں کے بعد خلاف توقع اس اسکیم سرکاری اور عارضی نوکری کے لئے جب اسے محکمۂ امداد باہمی کی طرف سے تقرری کا پروانہ ملا تو تنخواہ کے خانے میں پانچ سو کے بجائے چار سو روپے درج تھے۔

منتخب اُمیدواروں کو ایک ہفتے کی کو آپریٹیو ٹریننگ ملی تھی اور پھر دیہاتوں میں پوسٹنگ۔ ٹریننگ کیمپ میں ایک دبلے پتلے انسٹرکٹر کی باتیں سن کر اسے لگا کہ کسی نے اس کے سر کے بال پکڑ کر پوری قوت سے اسے جھنجھوڑ دیا ہو۔

"سچ پوچھئے تو" آپ تمام لوگوں کو اس ملازمت کا بائیکاٹ کرنا چاہیے تھا۔ لیکن کیا کیجئے گا آپ لوگ اپنے حالات میں اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ ..."

پہلے دن کی ٹریننگ لے کر جب وہ واپس ہو رہا تھا تو اس کے ذہن میں انسٹرکٹر کے یہ جملے بار بار گونج رہے تھے۔

"مغرب اتنے طرب سر ہولا کر بغاوت پر آمادہ ہو جائیں، اسی لئے ساری دنیا میں کوآپریٹیو سوسائٹی کی بنیاد رکھی گئی ہے اور ہمارے یہاں بھی۔"

"بھوک، جہالت اور غریبی اس ملک کی مذہبی مجبوریاں ہیں۔"

ٹریننگ کے آخری دن اس کے ساتھیوں نے اسے شاید پہلی بار ہنستے ہوئے دیکھا۔ کوآپریٹیو کے سکریٹری اور سابق وزیر نے زیر سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان گاؤں میں بستا ہے۔ گاؤں پر ملک کی ترقی کا انحصار ہے اور امید ہے آپ لوگ اپنی محنت سے ملک کی روپ ریکھا بدل دیں گے۔

وہ بے اختیار ہنسنے لگا۔ واپس آتے ہوئے اس نے چند ساتھیوں سے کہا۔

"ہم آگ ہیں ... اور ہمیں ...!"

"لعنت ہے!"

"شیم ... شیم ...!"

سبھوں نے کہا۔

"تو ہو جائے مظاہرہ ...!" اس نے نعرہ لہرانا چاہا۔ لیکن اسے لگا جیسے سیاہ اور کھردرے ہاتھوں نے اس کے اٹھتے ہوئے ہاتھوں کو سختی سے روک دیا ہو۔ بہت کوشش کے باوجود بھی اس کے ہاتھ نہیں اٹھے۔

"ارے! تم رک کیوں گئے ...؟"

"تم تو گھوتے کے نام پر گالیاں ...!"

"آں ... آں ...!" اس کا سر چکرانے لگا۔ ہونٹوں پر گھسی گھسی ہلکی سی ہنسی ابھر آئی۔ وہ خاموش ہو گیا۔

اس کے ساتھیوں نے دیکھا کہ وہ سہمے سہمے قدم اٹھاتا ہوا ہال سے چلنے لگا تو اس کی آنکھیں ڈھونڈنے لگی تھیں۔ جیسے کچھ غائب ہو گیا ہو۔

"تمہارے جیسا دلیر آدمی بھی رو سکتا ہے ...؟"

"تم رو بھی سکتے ہو ... ؟"

وہ لا جواب سا پیچھے مڑے بغیر بڑھتا گیا۔

اس کے گاؤں میں نوکری کی خبر پہنچی تو اس کے والد کا خط آگیا کہ اس کی شادی کی تاریخ طے کر لی گئی ہے۔ جو نقد ملے گا اس سے اس کی بہنوں کی شادی کا انتظام کیا جائے گا۔

اس کا سر گھومنے لگا۔ اسے غصہ آنے لگا۔ اسے یاد آیا، اس دن بھی اسے غصہ آگیا تھا جب والد کے مرنے کی سی حالت کا تار ملا تھا اور اس نے تار کے جواب میں خط لکھا تھا۔

"میں نہیں آسکتا کیوں کہ آمد و رفت کا ..."

سچ مچ والد مر گئے ہوتے تو آمد و رفت پر روپیہ برباد کرنے سے کیا حاصل ... اور انہیں جینا ہوگا تو یوں بھی بچ سکتے ہیں ... اس کے پہنچنے سے صورت حال میں کیا تبدیلی ہو جاتی ...

معاً اسے محسوس ہوا کہ وہ لوہا ہو گیا ہے۔ اپنے آپ سے اسے اجنبیت کا گمان ہوا ... اس حد تک ذلیل اور غیر انسانی انداز میں وہ سوچ سکتا تھا ... اس نے بہت دیر تک خود کو دیکھا۔ اصال یقیناً وہ وہ نہیں رہا تھا ... شہر آکر بہت حقیر ہو گیا تھا ... اسے اپنے آپ سے گھن آنے لگی ...

"حرامزادے!"

اس نے خود کو گالی دی۔

"تیرے ... کوڑے ...!"

"کس کو گالی دے رہا ہے یار ...؟"

اس کے روم پارٹنر نے جاگتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں ...!"

"خواب دیکھ رہا تھا ...؟ تو بہت خواب دیکھتا ہے ...!"

روم پارٹنر کی ان باتوں سے بے خبر وہ الجھن میں مبتلا رہا۔ اس کے ساتھی نے اسے ہدایت کی۔

"سینے اور سر پر ہاتھ رکھ کر مت سویا کرو۔ آدمی ڈراؤنے خواب دیکھتا ہے ...!"

اس نے دوست کی باتوں کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ بار بار والدین اور چھوٹے بھائی بہنوں کے چہرے نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ والد کی بوڑھی لاٹھی کھٹ کھٹ کرتی ہوئی اس کے چاروں طرف حصار سا تانے جا رہی تھی۔ اس کے لئے سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا۔ اس کے رستے ہوئے بچے دھیرے دھیرے جوان ہوئے اور اس کا خون چوسنے کے لئے لمبے لمبے دانت نکالتے ہوئے اس کی طرف بڑھے۔ خوف سے اس کا چہرہ زرد پڑنے لگا۔

اس کے رستے ہوئے بچے بڑھتے بڑھتے وہ ساک حلنگ بھیم ہو گئے اور اس کا خون چوسے ...

اس کے رستے ہوئے بچوں کے لمبے لمبے دانت اس کی گردن تک آ پہنچے۔ وہ خوف سے چیخ اٹھا۔ آس پاس والے لڑکے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

"منع کیا تھا ناکہ سینے پر ہاتھ رکھ کر مت سویا کرو ... ڈراؤنے خواب دیکھتا ہے اور ہم سب کی نیند خراب کرتا ہے ...!"

وہ پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ اس نے چاروں طرف سے چادر لپیٹ لی۔ شادی سے چھٹکارا پانے کی کوئی راہ اسے نہیں سوجھ رہی تھی۔ خیالوں میں اپنے آپ سے لڑتے اور لہولہان ہوتے ہوئے صبح ہو گئی۔

صبح دس بجے وہ اٹھا تو اس نے منہ ہاتھ دھونے کے بعد سب سے پہلے والد کو صرف ڈیڑھ سطروں کا خط لکھا۔

"میں شہر آکر بہرا ہو چکا ہوں۔ کاش آپ بھی ...!"

خط کو پوسٹ کرنے کے بعد وہ ہانپتا ہوا کمرے میں آیا۔ اپنی کھاٹ کا تھر میں گر گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے سوچا کہ اس طور سے اس نے شادی کے مسئلے کو فی الحال ٹال دیا ہے لیکن اصل مسائل ... اس کا اطمینان زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا ... اسے چاروں طرف سے اس کے رستے ہوئے بچے گھیرے میں لئے رہتے تھے۔ اس کے اندر کوئی کہہ رہا تھا کہ وہ بھاگ رہا ہے۔

معاً کہیں دور سے ممی اسٹرائک کی آواز کورس کی شکل میں ابھری اور دھیرے دھیرے قریب آکر اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"آپ لوگ چنگاریاں ہیں ... دھیان رکھئے کہ شعلہ بننے سے پہلے آپ لوگ بجھا نہ دئیے جائیں ...!"

اس نے آنکھیں کھولیں ... اطراف کا جائزہ لیا۔ اگلے ہی لمحے وہ ذہن پر زور دیتے ہوئے آواز پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

عزیز تمنائی

## عکس

❁

میں سوچتا تھا کہ میں ہی میں ہوں
مگر جو دیکھا
ہر ایک چہرے پہ خول میرا ہے
میری ہی آتما کی کرنیں
ہر ایک دل میں سما گئی ہیں
ہر ایک پیکر میں میرے قالب کا ہو بہو عکس ہے
مجھے کیا پتہ تھا ورنہ
میں وقتِ تخلیق مانگتا کوئی اور چہرہ
خودی کے اظہار کا کوئی اور ہی ذریعہ

یہ شیشہ گر کی دُکاں ہے
اور اتفاق سے کوئی سنگ ہاتھوں میں آبھی جائے
تو کرچی کرچی میں عکس میرا ہی منہ چڑائے
طلسم ٹوٹے تو کیسے ٹوٹے !

۲۴۔ ویپری ہائی روڈ، مدراس۔۳۰۰۰۶

یٰسین افضال

## جال

❁

سہما سہما
آنکھ کا بھوکا
چھریرے جسم کا اجلا کبوتر
دانہ چگنے
اُڑ کے اپنے تنگ چھجے سے
کسی کے صحن میں آیا ہوا ہے
دانوں کے بھٹکے ہوئے
اک جال میں خود پھنس گیا ہے
حرص کا اجلا کبوتر
پر سمیٹے جیسے آدھا چاند
سورج کے نکلنے پر بھی
نیلے آسمان کے ایک کونے پر
کہیں دبکا ہوا ہے
روشنی سے اس کے پر جلنے لگے ہیں

۲۔کے۔ ۱/۷، ناظم آباد، کراچی (پاکستان)

احمد سہیل

## میں تمہاری ہتھیلیوں میں زندہ رہوں گا

❁

میں تمہاری ہتھیلیوں پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں
مجھے معلوم ہے
شام کی گلی سے جنازہ گذرے گا
انجان مردے اس کو کندھا دیں گے
تمھاری آنکھوں میں دھویں کے بادل ہیں
جو روح نہیں بن سکتے

مری روح
تمھارے جسم میں اُگ آئے گی
مگر روح کے پودے کو
درخت بننے سے پہلے
تمہاری انگلیاں چاٹ جائیں گی

بادل زمیں پر آکر
پھر اڑ گیا
چاندنی زمین پر پہلے سے موجود تھی
نیندیں
چاندنی کے ساتھ تحلیل ہو گئیں

اور سنگھار کرتی لڑکیاں
چکنی مٹی سے چہروں کو پوتیں گی
درختوں کے پتے
میرا نوحہ گاتے ہوئے
بادل کے ساتھ اُڑ جائیں گے
اور میں
زمین پر مر کے بھی نہ مر سکوں گا
میں تمھاری ہتھیلیوں میں زندہ رہوں گا

3614, ROX PALACE CT. SAN JOSE, CA 9512 (U S.A )



حامدی کاشمیری

سعود منزل، باغ گام، میر اکاباد، شالیمار، سرینگر (کاشمیر)

# عصری آگہی

ایک بڑے فنکار کی پہچان یہ بھی ہے کہ وہ نہ صرف اپنے عہد کے حالات و واقعات سے گہرے طور پر متاثر ہوتا ہے، بلکہ وہ ان حالات و واقعات اور ان سے تشکیل پذیر معاصرت کی آگہی بھی پیدا کرتا ہے، یعنی وہ معاصر صورت حال کا احساس ہی نہیں کرتا، بلکہ اس کا ادراک بھی کرتا ہے، وہ اس پر بس نہیں کرتا، بلکہ ایک بڑے دانشور کی طرح اس صورت حال کا تجزیہ بھی کرتا ہے اور اس کے بارے میں شخصی ردّ عمل کو تفکیری انداز میں پیش بھی کرتا ہے، اس طرح سے وہ اپنے عصر کی پیداوار ہوتے ہوئے بھی اس سے ماورا ہو کر اس پر مفکرانہ اور ناقدانہ نظر بھی ڈالتا ہے، شیکسپیئر، ورڈس ورتھ، غالب اور ایلیٹ اس کی مثالیں ہیں۔

وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ ملکی اور بین الاقوامی سطحوں پر تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں، اور ان تبدیلیوں کے نتیجے میں حالات کے نہج اور نوعیت کی بنا پر مختلف تاریخی ادوار تشکیل پاتے ہیں، ہمارے ملک میں، بیسویں صدی کے اوائل کا دور قومی بیداری، اقتصادی بدحالی، عالمی جنگ کی تباہ کاری، مغربی تہذیب کی میکانکیت اور جذبۂ انقلاب سے ایک مخصوص مزاج کی آئینہ داری کرتا ہے، اس کے بعد تقسیم وطن اور حصول آزادی کے بعد کا دور، سیاسی افراتفری، فرقہ وارانہ فسادات، جلاوطنی اور مایوسی کے حالات و کوائف سے عبارت ہے، ظاہر ہے، دونوں ادوار ایک ہی صدی کے زائیدہ ہو کر بھی اپنے جداگانہ خواص رکھتے ہیں، یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ قدیم زمانے میں تاریخی ادوار طویل وقفوں پر محیط ہوتے تھے، اس لئے کہ تبدیلیوں کی رفتار سست تھی، لیکن آج کے زمانے میں جب کہ تبدیلی برق رفتار ہو گئی ہے، ادوار کی عمر بھی خاصی گھٹ گئی ہے، چنانچہ اب کسی دور کی میعاد زیادہ سے زیادہ ایک دہے کی رہ گئی ہے۔

شاعر کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ اپنی شخصیت کو ہمہ جہت بنانے کے لئے اپنے عصر کی آگہی پیدا کرے، وہ اپنے زمانے کے بدلتے حالات کا پوری ذہنی بیداری کے ساتھ سامنا کرتا ہے، وہ اپنے عہد کے حقائق سے ٹکراتا ہے، اور اپنے داخلی ردّ عمل کو لفظ و پیکر میں ابھارتا ہے اور اپنی عصری آگہی کا فیضان عام کرتا ہے۔ عام لوگوں کے لئے اپنے عصر کا شعور پیدا کرنا ممکن نہیں، وہ اس کی حقیقتوں سے متاثر تو ہوتے ہیں، لیکن اس کی اصل حقیقت سے بے بہرہ ہوتے ہیں اس لئے کہ وہ اس کا کوئی مفکرانہ اور تجزیاتی مطالعہ نہیں کر سکتے، لازماً وہ زندگی اور کائنات کے دیگر اہم پہلوؤں مثلاً عم، اقدار، مرگ، زوال اور کائنات کی طرح، روح عصر کی تفہیم سے بھی عاری ہوتے ہیں، اور اس کے لئے وہ "دیدہ بینائے قوم" یعنی شاعر سے رجوع کرتے ہیں، سوال یہ ہے کہ کیا روح عصر کی مصوّری ہی شاعر کا کام ہے، اس سوال کا جواب دینے سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ روح عصر سے کیا مراد ہے، اپنے عہد کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی عناصر کے نتیجے میں زندگی اور کائنات کے بارے میں جو مربوط آگہی پیدا ہوتی ہے، وہ روح عصر کہلاتی ہے، شاعر دانشورانہ ذہن رکھتا ہے، جس کی بدولت وہ عصریت سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے، اس طرح سے ہر دور کے فنکار کی حیثیت عصریت سے تشکیل پذیر ہوتی ہے، لیکن یہ بات ذہن نشیں رہے کہ کسی دور کی معاصرت اس دور کی حقیقت کے بجائے اس کا التباس بھی ہو سکتی ہے، اگر شاعر حقیقت اور التباس میں فرق نہ کر سکے تو اس کی دیدہ وری مشکوک ہو جاتی ہے، وہ اپنے دور کے مروجہ خیالات کے دائرے میں مقیّد ہو کے رہ جاتا ہے، ہوتا یہ ہے کہ ہر عہد کے اپنے میلانات، ترجیحات اور تعصّبات بھی ہوتے ہیں جو وقتی مصلحت یا فیشن سے صورت پذیر ہوتے ہیں، اور جوں ہی وہ دور گزر جاتا ہے، اور نیا دور آتا ہے تو نئے دور کی حیثیت ماقبل کے دور کی عصری آگہی کو قصۂ پارینہ قرار دیتی ہے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ خود بھی حقیقت آشنا ہونے کے بجائے التباسی ہو سکتی ہے، ترقی پسندی کے دور میں، اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق شاعری کے انقلابی، رجزیہ، خارجی اور مقصدی کردار کو فروغ ملا، لیکن جدیدیت کی آمد پر یہ متروک قرار پایا، اور خود جدیدیت قدرِ مطلق ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی، تحریک آزادی کے عروج کے زمانے میں جوش کی انقلابی شاعری کا طوطی بول رہا تھا، لیکن حصولِ آزادی کے بعد وہ ماضی کا حصّہ بن کے رہ گئی

پس ظاہر ہوا کہ عصری آگہی کی مصوری ہی شاعر کی عظمت اور دوام کی ضامن نہیں ہو سکتی، شاعر کا یہ کام نہیں کہ وہ اپنے عصر کے سماجی، سیاسی یا تہذیبی انقلابات یا ہنگامہ آفرینیوں ہی کو اپنا موضوع بنائے، جیسا کہ جوش کے علاوہ بیشتر ترقی پسندوں نے کیا۔ یا محض عصری شعور ہی پر تکیہ کرے، جو ہنگامی نوعیت کا ہو سکتا ہے، جیسا کہ اکثر جدید شعراء کر رہے ہیں۔ شاعر کو دراصل عصری شعور کے حوالے سے ایک متضاد صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ عصری حقیقتوں کا ادراک کر کے بھی ان سے ماورا ہو جاتا ہے، وہ گرد و پیش کے حالات کو چشم نگراں سے دیکھتا ہے، لیکن تخلیق شعر کے عمل میں داخلی سرچشموں سے رجوع کرتا ہے، وہ اس کے برعکس کشمیری شاعر شیخ العالم کی مانند غار نشینی یا میر تقی میر کی طرح دریچہ بند حجرہ نشینی کے باوجود خارجی زندگی کی تبدیلیوں پر نظر رکھتا ہے، دونوں صورتوں میں، بہرحال، یہ حقیقت ہے کہ تخلیقی عمل میں علم و خبر کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی، تخلیقی عمل ایک پیچیدہ داخلی عمل ہے، جو ناقابل فہم اسرار کا درجہ رکھتا ہے، شاعر عصری شعور کو داخلی شخصیت کی دیگر ترکیبی قوتوں مثلاً لاشعور، احساس تخیل اور جمالیاتی حس سے ہم آمیز کر کے اس کی تقلیبی بازیافت کرتا ہے، نتیجے میں جو شاعری خلق ہوتی ہے، وہ عصری آگہی سے بہرہ ور ہونے کے باوجود اور بھی بہت کچھ ہوتی ہے، وہ آفاقیت کے عناصر سے مالا مال ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ شیکسپئر، کولرج، ورڈس ورتھ اور غالب اپنے ادوار کی آگہی کے ساتھ ساتھ آفاقی صورت حال پر محیط ہیں، اور صدیاں گزرنے کے باوجود نئے ذہن کے لئے معنویت اور جاذبیت رکھتے ہیں۔

قدیم دور سے جدید دور تک مختلف شعراء کے یہاں عصری آگہی کی تخلیقی بازآفرینی کے دلچسپ اور متنوع نمونے ملتے ہیں، چند اشعار میر کے ملاحظہ کیجئے، جو ان کے عہد کے آشوب کی مصوری کرتے ہیں، لیکن انھوں نے اسے شخصیت کے دیگر ترکیبی عناصر سے آمیز کر کے اسے آفاقی معنویت سے ہم کنار کیا ہے۔ :

دھوپ میں جلتی ہیں غربت وطنوں کی لاشیں  ترے کوچے میں اگر سایۂ دیوار نہ تھا

وہ دشت خوفناک رہا ہے مرا وطن  سن کر جسے خضر نے سفر سے حذر کیا

ہیں مکان و سرا و جا خالی  یار سب کوچ کر گئے شاید

لگی ہیں ہزاروں ہی آنکھیں ادھر  اک آشوب ہے اس کے گھر کی طرف

معاصر عہد میں بھی شعراء کے یہاں عصری آگہی پوری شدت کے ساتھ ملتی ہے، وہ ایک زندہ حرکی اور تاثر پذیر وجود کی طرح اپنے عہد میں سانس لے رہے ہیں اور معاصر صورت حال کا عذاب سہہ رہے ہیں، لیکن ساتھ ہی وہ معاصرت کی سطح سے بلند ہو کر ماورائیت کی رفعتوں کو چھوتے ہیں نتیجے میں ان کے اشعار ایک مخصوص عہد کے زائیدہ ہونے کے باوجود لازمانی ہیں: ۔

شب کون تھا یہاں جو سمندر کو پی گیا  اب کوئی موج آب نہ موج سراب ہے  [ بانی ]

کھو گئے دشت غم میں آخر کار  ہم سفر اس کے نقش پا کی طرح  [ عزیز قیسی ]

کچھ دور پر بگولوں کی افواج ہیں کھڑی  کوئی بھی شہر میں نہیں کس کو خبر یہ دوں  [ شہر یار ]

مرنے کا ڈر، جینا دوبھر لگتا ہے  کیا بتلائیں دن ہیں بڑے عذابوں کے  [ محمد علوی ]

ختم ہوا ہر خواب تماشا، راکھ ہوا ہر شہر صدا  دہشت سے ہر سو تنہائی کا ہو تے ہیں ہم بیدار کہاں  [ کمار پاشی ]

آئینہ در آئینہ عکس سکوت  تہہ بہ تہہ پر ہول منظر دیکھیے  [ سلطان اختر ]

بقیہ صفحہ ۳۶ سے چہرہ آج — جدیدیت اور اس کے بعد

اس علامی کی ہوئی روشن ڈھال کی تلاش میں ہے۔ جب تک یہ ڈھال ہمارے پاس نہیں ہم ایک فن پارے کے سامنے کھڑے ہو کر بُت بن جانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم دنیا کی تشخیص یا انسانی شناخت سے الگ ہٹ کر سال بیلو کے کردار آگن ہارن کی طرح صرف یوں کہہ سکتے ہیں کہ: "آخر میں تمہیں پتہ چلتا ہے کہ غور و فکر کے بل بوتے پر تم اپنی روح اور زندگی کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر تم غور و فکر کرنا شروع کر دیتے ہو تو تشفی کے انعام کے طور پر تمہیں یہ دنیا دی جاتی ہے۔"



## مدحت الاختر

کوئی اگر میرا ہوتا
میں کتنا اچھا ہوتا

تم پہ نچھاور کر دیتا
کاش یہ جگ میرا ہوتا

دنیا مجھ کو کیا سمجھے
تم نے ہی سمجھا ہوتا

ق

کپڑے تو بدلے ہوتے
شیشہ تو دیکھا ہوتا

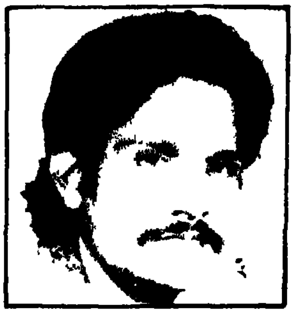
شاید آج وہ آجائے
اتنا تو سوچا ہوتا

ق

ہونٹوں پر ہوتی مسکان
آنکھوں میں سپنا ہوتا

کاش پلٹ آتے وہ دن
ہاتھوں میں بستہ ہوتا

● ناگو دام، کامٹی، ڈسٹرکٹ ناگپور (مہاراشٹر)



## شہپر رسول

کسی کے سر کی بلندی پہ آفتاب تو ہو
کہ اس سفر میں کوئی میرا ہم رکاب تو ہو

سر برِ خامۂ شہرت مری کتاب تو ہو
قبول اُن کو مرا لفظ انتساب تو ہو

شکست و فتح کا سودا نہیں مجھے کوئی
مگر غنیم کی تیغِ ہنر پہ آب تو ہو

خموش بیٹھے ہیں وہ بھی، سو میں بھی چپ چپ ہوں
کسی کے پاس کسی بات کا جواب تو ہو

نئے چراغ جلاؤں گا ہر قدم پہ میں
مگر پرانے اندھیروں کا کچھ حساب تو ہو

فریب کھانے کی جرأت ہمارا ورثہ ہے
نہیں ہے بحرِ حقیقت نہ ہو سراب تو ہو

◆

مرا درد اُن سے سوار ہے مری جاں جتنے شگاف ہیں
ادھر آنکھ اٹھا کے نہ دیکھیے، انھیں سات خوں بھی معاف ہیں

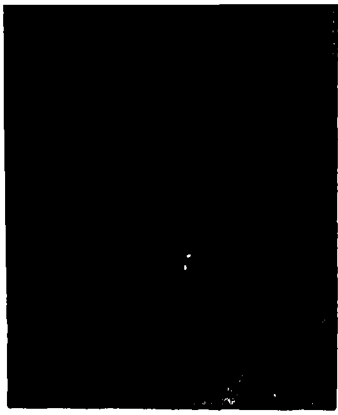
کئی نام مجھ میں سمائے تھے، کئی شہر میں نے بسائے تھے
کئی نام میرے حریف ہیں، کئی شہر میرے خلاف ہیں

مرے حرفِ دل سے نہ راہ کر، مگر اس طرف تو نگاہ کر
کہ یہ آنکھیں طالبِ دید ہیں، کہ یہ پاؤں وقفِ طواف ہیں

وہ حلیف اہلِ زبان کے، وہ شریک وصفِ بیان کے
ہیں نثار جن پہ فصاحتیں، کئی شین ہیں کئی قاف ہیں

وہ گئے دنوں کے معاملے، انھیں کیسے دل سے جدا کریں
مرے شہپر آج بھی سرخ ہیں، ترے ہاتھ آج بھی صاف ہیں

● ۵/۷۔اے، کچہری روڈ، بردیا لبکا مارکیٹ، علی گڑھ (یوپی)



مرزا حامد بیگ
شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج، سیٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی (پاکستان)

# سانڈنی سوار

میں نے جو کچھ اپنے مرحوم باپ کی زبانی سُنا، اُسے والدہ مرحومہ کی آنکھوں سے دیکھا۔

قبلہ والد صاحب جہاں حقیقت احوال میں اُلجھ کر رہ جاتے، وہاں میری والدہ محترمہ لقمہ دیتیں اور چونکہ مجھے ہمیشہ سے دوسروں کی آنکھوں دیکھی کا بیان مسحور کرتا چلا آیا ہے، اس لئے کسی اِس بات سے غرض نہیں تھی کہ کہاں میری صحتی ماں خاموش رہیں اور کہاں کہاں میرے باپ نے غلط بیانی سے کام لیا۔

کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ، مجھے اس سے کچھ غرض نہیں۔ بیان دلنواز ہے اور کہانی مرغوب۔

کہنے والے نے کہا ہے کہ پیرو مرشد بعد نماز مغرب اپنے مدرسے میں درس دے رہے تھے۔ مدرسہ کیا تھا، دل بیٹھنے اور سر لیٹنے کا ایک بہانہ تھا۔ چند رسے چھپر کے نیچے قبلہ کے رُخ پر ایک بھاری چٹان کو کاٹ کر منبر بنا لیا گیا تھا۔ جس کے عین اوپر مٹی کا ایک دیا ٹمٹماتا تھا۔ فرش پر گھاس پھوس کی تہہ جمی تھی۔ جس پر اعلیٰ حضرت کے علاوہ کئی چار لوگ بیٹھتے، جو ہمہ تن گوش رہتے۔

پیرو مرشد نے منبر سے ٹیک لگا کر اپنی ایک ٹانگ کو سامنے کی سمت پھیلا رکھا تھا اور رہایت سے نکلی یہ بیان فرما رہے تھے علم کا ایک دریا موجزن تھا، جس کے کناروں کی کہیں اور چھور نہ ملتی تھی۔ ایسے میں دروازے پر دستک ہوئی اور دس بارہ جوان بلا اجازت اندر داخل ہوئے۔ ایک کے بعد ایک سر جھکائے ہوئے۔ سب سے آگے اونچی دستار اور بھاری جُبّے میں ملبوس ایک دراز قد نوجوان تھا۔ جو خاموشی کے ساتھ ایک طرف ہو کر بیٹھ رہا۔ پھر باقی جوان آئے اور رہایت ادب کے ساتھ اس کے پیچھے صف بستہ کھڑے ہو گئے۔

دیئے کی مدھم روشنی میں نوواردگان کے چہرے مہروں سے اُن کی پہچان مشکل تھی، البتہ اُن کی جوانی اُس منگے اندھیرے سے جھلکی پڑتی تھی۔ حضرت صاحب نے اپنی ٹانگ کو سمیٹ لیا اور اُلتی پالتی مار کر سیدھے ہو کر بیٹھ رہے۔ اونچی دستار والے جوان نے گردن کی ہلکی سی جنبش کے ساتھ اپنے پیچھے صف بستہ ساتھیوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ جہاں جہاں کھڑے تھے وہیں دوزانو ہو گئے۔

اعلیٰ حضرت نے شاید یہ سوچ کر کہ ایک دوسرا عالم اُن کا بیان سُن رہا ہے، بہایت محتاط انداز سے اپنی گفتگو جاری رکھی اور زیر بحث مسئلے کی گتھیاں سُلجھاتے ہوئے گھڑی کی گھڑی درس روکا اور دستار والے جوان کی طرف متوجہ ہوئے

"خوش آمدید۔ آپ نے اپنی آمد اور مسلک سے مطلع نہیں فرمایا۔ نہ تو اپنا تعارف کروایا اور نہ ہی آمد کا سبب بتایا۔"

اونچی دستار والے نوجوان نے کچھ بھی نہ کہتے ہوئے جھکا کر کہا

"جی، بس ویسے ہی آ گیا تھا۔ آپ کا انداز کرنے۔"

اعلیٰ حضرت نے دریافت فرمایا

"اور آپ کا نام؟"

"جی، مجھے یوسف کہتے ہیں۔"

"یوسف۔"

حضرت صاحب کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ "یوسف۔ یوسف کیا؟"

وہ زیرِ لب بڑبڑائے اور دیوار سے ٹیک لگاتے اور اپنی ٹانگ کو دوبارہ سامنے کی سمت پھیلاتے ہوئے طالب علموں سے فرمایا،

"اُس کی اونچی دستار اور بھاری جُبّے پر نہ جاؤ۔ یہ تو یوسف ہے"

کہنے والے نے کہا ہے کہ اس کے بعد اعلیٰ حضرت نماز عشاء تک مسائل کا بیان فرماتے رہے اور ان جوانوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ نماز کے فوراً بعد اعلیٰ حضرت نے سب کو اُٹھ جانے کی اجازت دے دی

میں ہمہ تن گوش تھا کہ میرے والد مرحوم نے کھنکھار کر قہقہہ لگایا اور فرمایا۔

"بیٹا، اُس کا نام یوسف تھا جاہل، ایک عالم کی شکل میں آ گیا تھا۔ اس نے علماء کے لباس کی توہین کی۔ پہلے اعلیٰ اور قبلہ صرف عالموں کو سمجھتے تھے۔"

میں سُنتا رہا اور اپنے گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا رہا۔ اُس وقت مجھے یوسف پر ترس آ رہا تھا اور میرے والد مرحوم اُسے بُرا بھلا کہتے ہوئے تاریخ کا کوچہ نہیں رہے تھے۔ پھر یکلخت میرے باپ نے زور سے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

"دوسری بار پیرو مرشد نے اُس کا سامنا ہوا تو اعلیٰ حضرت جنگل میں اپنی گھوڑی کے لئے گھاس کاٹ رہے تھے۔ تف ہے اس دنیا کے نظام پر کہ اپنے وقت کا بہت بڑا عالم اپنے مبارک ہاتھوں سے گھاس چھیل رہا ہے اور وہ، جس کے سینے میں شکم بھرا ہے، حکومت کر رہے ہیں۔ حیف صد حیف۔

ایسے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک گھڑ سوار سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا اُس نے چہرے پر نقاب باندھ رکھا تھا اور اس کے لباس پر گرد جمی تھی۔ وہ گھوڑے سے اُترا اور بغیر سلام دعا کے اور بغیر ادب و آداب کا لحاظ کئے بغیر کہنے لگا

"میرے گھوڑے کی زین کے ساتھ ایک گائے کی کھال لٹک رہی ہے جس میں ایک لاکھ درہم ہیں۔ اُس کے عوض تم میرا گھوڑا دو میرا جوڑا ہے اور مجھے اس کی حاجت نہیں۔ تم مجھے اپنا لوٹا بدل لو۔ یہ گھاس کا گٹھا مجھے دے دو اور یہ ایک لاکھ درہم تم لے لو۔"

جانتے ہو پیرو مرشد نے جواب میں کیا فرمایا؟ اعلیٰ حضرت نے حقارت سے کہا۔

"تو گو کہ دستار سے اُلجھا ہے۔ تیری کمر سے بندھی تلوار سلگتی ہے۔ کیا تو سمجھتا ہے کہ میں تجھے نہیں جانتا۔ میں جانتا ہوں اور بہت اچھی طرح جانتا ہوں چلا جا۔ تجھے تو بات تک کرنے کا سلیقہ نہیں۔"

یہ سُن کر گھڑ سوار نے اپنے چہرے پر سے نقاب اُتار پھینکا، ماتھے پسینہ پونچھا اور چپ چاپ کھڑا رہا۔ اعلیٰ حضرت کے قربان جائیے۔ آپ نے اُسے خوب پہچانا تھا۔ وہ جاہل یوسف ہی تھا۔ جو کچھ دیر تو اسی طرح خاموش اور گم سم کھڑا رہا، پھر گھوڑے پر بیٹھ کر ہوا ہو گیا۔

جب اعلیٰ حضرت گھاس کا گٹھا سر پر اُٹھائے اپنے آستانے پر پہنچے تو پتا چلا کہ وہ ادھر آیا تھا اور گائے کی کھال جس میں پورے ایک لاکھ درہم بھرے تھے۔ ان کی چوکھٹ پر پھینک گیا ہے۔

کسی نے مشورہ دیا کہ لوٹ مار کے مال کو پاک کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اسے اعلیٰ حضرت کے قائم کردہ مدرسے پر لگا دیا جائے تاکہ علم کی روشنی پھیلے اور جہالت مٹ جائے۔ سو یہی کچھ ہوا۔

قبلہ والد صاحب یہ فرما کر خاموش ہو گئے۔

کہنے والے نے کہا ہے کہ مدرسۂ عالیہ تو قائم ہو گیا لیکن مفلوک الحال طالب علموں کی حالت زبوں ہی رہی۔

زمانے بیت گئے۔

اب اعلیٰ حضرت بہت ضعیف ہو گئے تھے اور اپنے حجرے سے باہر کم نکلتے تھے۔ ایک روز مدرسے کے صدر دروازے پر ایک سانڈنی سوار رُکا، جو سرپٹ دوڑتا ہوا آیا تھا اور اعلیٰ حضرت سے ملاقات کا خواہاں تھا اور یہ کام کچھ اتنا آساں نہ تھا۔

کہنے والے کہا ہے کہ وہ دراز قد سانڈنی سوار کبھی لاکھوں میں ایک رہا ہو گا، لیکن اس وقت اُس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے اور سر کے بال باہم جڑ کر ایک ہو گئے تھے۔

سانڈنی سوار کون تھا اور کہاں سے آیا تھا۔ اس کی کسی کو خبر نہ تھی ہر وہ جس کی سمت نظر بھر کر دیکھتا، اُس کی کایا پلٹ کر رکھ دیتا

باقی صفحہ ۲۹ پر دیکھئے



## شائق مظفرپوری

پھر نہ آئے گا کبھی پیار کا موسم شاید
بیٹھ جائے گا مجھے لے کے یہی غم شاید

تجھ سے ملنے کی سزا کاٹ کے جینا ہوگا
خود سے بچھڑے ہیں تو پھر مل نہ سکیں ہم شاید

اپنے اشکوں سے ہر اک داغ تمنّا دھولیں
ہم سے ہوگی نہ یہ پتھر کی زمیں نم شاید

کیوں امیدوں کا سہارا ابھی گراں ہے مجھ پر
میرا ایمں مجھ سے ہوا جاتا ہے برہم شاید

یونہی آنکھوں میں نہ اشکوں کا سفر جاری ہے
دل کے آنگن میں ہے احساس کا ماتم شاید

● ۱۱۹۔ اولڈ پرولیہ روڈ، ذاکر نگر، جمشید پور



## محبوب راہی

وہ سارے شہر میں رسوا بہت ہے
اگرچہ آدمی اچّھا بہت ہے

جہنّم کی ضرورت کیا ہے آخر
عذابوں کو تو یہ دنیا بہت ہے

بڑے اخلاص سے ملتا ہے مجھ سے
مجھے اس شخص سے خدشہ بہت ہے

ملا ہے نیکیوں کا پھل مجھے بھی
اسے چکھا بھی ہے کڑوا بہت ہے

ذرا سی چھاؤں، تھوڑا سا اُجالا
ہمارے واسطے اتنا بہت ہے

مری نسبت وہ کتنا خوش گماں تھا
ملا مجھ سے تو پچھتایا بہت ہے

ترا ہر روپ ہم پہچانتے ہیں
تجھے اے زندگی جھیلا بہت ہے

● پوسٹ آفس بارسی ٹاکلی ۴۴۴۴۰۱، ڈسٹرکٹ آکولہ (مہاراشٹر)



## اسلم عمادی

اندھیروں سے ہم تنگ آئے بہت
کہ ہیں ان میں پوشیدہ سائے بہت

ہواؤں میں ویسے بھی موسم نہ تھا
درختوں نے پتّے ہلائے بہت

تری زلف میں سانپ پوشیدہ ہیں
ہمیں واہمے سرسرائے بہت

سمندر بھی ویران، صحرا بھی خشک
ستارے مگر جھلملائے بہت

جو اسلم ہمارے مقابل رہے
وہ دشمن ہمیں یاد آئے بہت

● ۱۰-۳-۳-۲۰۲/۹، ہمایوں نگر،
حیدرآباد ۵۰۰۰۲۸



شفق
کبرگنج، سہسرام - ۸۲۱۱۱۵ (بہار)

# ویڈیو کوچ

وہ ایک پرانی بس تھی

حادثات زمانہ اس کی باڈی کو بے طرف، رنگ و روغن سے محروم کر دیا تھا۔ کھڑکیوں کی چادریں پیچھے کی طرف سے زنگ خوردہ ہو کر مڑ رہی تھیں۔ اکثر کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ چکے تھے اور ان کی جگہ لکڑی کے تختے جڑ دیے گئے تھے۔ سامنے سے ہونے والے کئی ایکسیڈنٹ نے اس والے حصے کو بے رونق کر دیا تھا۔ ونڈ اسکرین کا ایک تہائی حصہ غائب تھا۔ ڈرائیور کے سامنے والا حصہ ٹوٹ کر کرچی کرچی ہوا جا رہا تھا۔ ٹائروں کی گرشاں گھس گئی تھیں اور جگہ جگہ گینس اور پیوندوں کے داغ نمایاں تھے۔

اندر کی حالت بڑی عجیب تھی۔ ایک طرف دو دو آدمیوں کی سیٹیں، دوسری طرف کھڑکیوں سے لگی ہوئی لمبی سیٹ اور درمیان میں کٹ رہ گئی۔ دو نشستوں والی سیٹوں کی پشت پر دھاتی پلیٹوں میں اور سب کا آئی پی لکھا ہوا تھا۔ اس بس کی سب سے نمایاں چیز وہ بڑا سا ویڈیو تھا جو ڈرائیور کے عقب اور مسافروں کے سامنے لگا ہوا تھا۔

بس دیر سے بھری ہوئی تھی۔ مرد سیٹوں پر قیمتی کپڑوں میں ملبوس اطراف بے فکری سے سگریٹ کا دھواں اڑا رہے تھے۔ کھڑے ہونے والوں میں زیادہ تعداد آفسوں میں کام کرنے والے کلرکوں کی تھی۔ پیچھے کی طرف کالج اور اسکول کی لڑکیاں، استانیاں اور دفتروں میں ملازم عورتیں اور لڑکیاں تھیں۔ زیادہ بھیڑ بھی اسی حصے میں تھی کیونکہ ہر ایک کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ جب کھڑے ہو کر ہی سفر کرنا ہے تو لوگوں کے درمیان جگہ کا انتخاب کیا جائے۔ بس کی گرمی اور بس کی حبس تو مل ہی جائے گی۔ بس کی چھت پر سرد اور چلچلاتی دھوپ اطراف سے نئے ستم ڈھا رہی تھی گویا دوسرے مسافر ایک خاموش تحریک کر رہے ہیں۔

کچھ دیر بعد حاجی جی کے پیچھے سے ایک اور ادھر کے تھیلے سمیت باہر کا اور پھر گاڑی نے سلوٹنگ کرنا شروع کی۔ ہوا کا اندازہ کرنے لگا اور مطمئن ہو کر کنڈکٹر سے کنڈکٹرے باتیں کرنے لگا۔ پھر دونوں ساتھ ہی بس پر سوار ہو گئے۔ حاجی صاحب نے اپنا سامان ٹھکانے پر رکھا اور کنڈکٹر نے سفر کا تھیلا گلے میں ڈال کر ٹکٹ نکال لیا۔

مسافروں میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔ جیسے بس چلنے والی ہے، وہ صبح گھر سے کھا کر نکلے تھے اور دن بھر ایک دو پیالی چائے ہی نصیب ہو سکی تھی۔ پیٹ کی اینٹھن انہیں جلد گھر پہنچنے پر مجبور کر رہی تھی اور گھر دور تھا۔ ویڈیو سیٹ والے مسافر قریب اور روشن آنکھوں سے خیالوں میں گم کھڑے ہونے والوں کے ہونٹ مسلسل ہل رہے تھے۔

"تو شرما گئی، میرا ماہے لڑکا اچھا ہے خاندان اچھا ہے اب سوچنے کا رہ ہے۔"

"ہم ہیں بنگلہ، اسکوٹر، فریج، ٹی وی کے علاوہ پچاس ہزار پھر چارشیاں ہم اور آپ جانتے ہیں کہ"

"یار آج سالے صاحب نے بڑی زبردست پلائی، خواہ مخواہ جھگڑا ہو گیا۔ میں نے پیمانے کو اٹھایا لیا، مگر وہ پارٹی ہے۔"

"سچ تم نے کیسا لیا تھا؟"

"لیتا کیا خاک، سالے نے سعادتی اتنی کرائی کہ رس کم ہو گیا تھا ورنہ۔" پھر اس کا لہجہ بہت مدھم ہو گیا۔

"نہیں وہاں بھی بات نہ ہو سکی۔ میں فرمائش پوری نہیں کر سکتا۔ ابھی بیٹے سونا کو ٹیوٹر ٹیوشن کروا رہا ہوں، وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے تو پھر"

"تم چاہو تو میرا فائل آگے بڑھ سکتا ہے، کوشش کرو یار۔"

"میں تو کوشش کر ہی رہا ہوں مگر وہ سیتارام بہت ناوہ طرف دولت جاتا ہے۔ سالے یا ساب۔"

کالج اور اسکول کی لڑکیاں چاؤں چاؤں کر رہی تھیں، قہقہے لگا رہی تھیں پھر کن انکھیوں سے لڑکوں کی طرف دیکھتیں، دوپٹہ بار بار درست کرتیں اور ادھر ادھر نظروں کے تیروں سے گھائل ہوتیں۔ مگر بڑی عمر کی لڑکیاں اور عورتیں ایک آدھ بات کے بعد چپ ہو جاتیں جیسے تھک گئی ہوں یا باتوں کا اسٹاک ختم ہو گیا ہو۔ وہ سیٹ پر بیٹھے ہوئے اپنے شوہر کو گھورتیں پھر زیر لب بڑبڑانے لگتیں۔

سب کے سامنے سوال رہے تھے کنڈکٹر ٹکٹ وصول کر رہا تھا۔ اچانک لڑکوں نے شور مچایا

"ویڈیو اسٹارٹ کرو۔"

کنڈکٹر نے پہلے تو ان کی طرف دھیان نہیں دیا مگر جب شور زیادہ بڑھا تو مجبوراً وہ ویڈیو کے پاس گیا۔ سوئچ آن کیا مگر اسکرین پر صرف لکیروں کا جال لگا رہتا رہا۔ اس نے کئی منٹ تک کوشش کی پھر سوئچ آف کر دیا

"ویڈیو خراب ہے۔"

لڑکوں نے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے اپنی گردنیں نیچی کر لیں۔ کنڈکٹر ٹکٹ دیتا ہوا لڑکیوں کے قریب پہنچ گیا۔ ایک آدمی کی زیادتی نے ترتیب بگاڑ دی۔ اور بعض لڑکیوں کو مرادیں مل گئیں۔ گداز جسموں کا لمس، زلفوں کی خوشبو اور جوانیوں کی وادیاں

ڈرائیور کی سیٹ والا دروازہ کھلا اور معصوم چہرے والا گورا چٹا نوجوان ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ کر اور گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔ اس نے کئی بار کوشش کی مگر بس گھرگھرا کر رہ گئی۔

"بیٹری ڈاؤن ہے۔" اس نے خلاصی کی طرف دیکھا اور جلدی سے نیچے اتر کر آدمی دھکا لگانے لگے۔ اس نے بس کے مسافروں سے بھی استدعا کی۔ پچھلی طرف سے کوئی ذرا اتنا کر دے ہو سکے لیکن ختم کرنا نہیں چاہتے تھے۔ بس چلا یا رکی رہی بہتر ہے رکی ہی رہے۔ اگلے دروازے سے کچھ لوگ نیچے اترے دھکا لگایا گیا اور بس گھرگھرا کر اسٹارٹ ہو گئی۔

سب کو معلوم تھا کہ ڈرائیور ریہرسل کا تربیت یافتہ ہے۔

بس پڑاؤ سے نکلی تو سڑکوں پر سعید بستی مشتعل ہجوم با ساتھ جیسے پنڈال کاؤنٹ نے تحریب کاری میں مصروف تھا۔ آدمی چل رہے تھے۔ گاڑیاں چل رہی تھیں مکان چل رہے تھے اسکولیں ایسٹ اور جھونپڑوں سے بھری ہوئی تھیں اور دماغ حیران و پریشان حکم کے منتظر تھے مگر حکم دینے والا شاید خود بھی منتظر تھا۔

ڈرائیور بڑی احتیاط اور مہارت کے ساتھ بس کو وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ شام نے رات کا لباس پہن لیا۔ شہر ختم ہو گیا، کنارا سڑک ختم ہو گئی اور پتلی بل کھاتی ہوئی سڑک شروع ہو گئی جس میں اندھے موڑ تھے دونوں طرف گہری کھائیاں اور سڑک میں بڑے بڑے گڈھے۔

کچھ دیر بعد مسافروں کے کان کھڑے ہونے شروع ہوئے۔ ڈرائیور دانستہ بس کا ایک سائڈ کچی سڑک پر رکھ رہا ہے جس سے شدید جھٹکا محسوس ہو رہا تھا۔ پوری بس تھرتھرا رہی تھی۔ اندھیرا ہو جانے کے باوجود اس نے ہیڈ لائٹس نہیں روشن کی تھی۔ کنڈکٹر نے بتایا ہیڈ لائٹس کے بلب فیوز ہو گئے ہیں مگر آپ فکر نہ کیجئے۔ ڈرائیور اعلیٰ تربیت یافتہ ہے۔ اس لیے ملک اتنی نے اس کا تقرر کیا ہے۔ آپ دیکھئے کہ بڑھتے ہوئے اندھیرے کے ساتھ بس کی رفتار بھی بڑھتی جا رہی ہے آپ سب بہت جلد منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے۔

گڈھوں میں پہیہ جاتا تو زبردست دھچکے کے ساتھ بیٹھے ہوئے مسافر اچھل پڑتے اور کھڑے ہوئے مسافر لڑکھڑا جاتے ایک دوسرے کا سہارا لیتے۔

بس کے پچھلے حصے میں لوہے کا وہ راڈ بھی نہیں تھا جس کا وہ سہارا لیتے۔ لہٰذا انہیں اپنے پاس کھڑے لوگوں کا ہی سہارا لینا پڑتا۔ دل چاہتا یا نہ چاہتا۔ اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں ان لوگوں کے لیے یہ سہارا غنیمت تھا جن کو کھڑے کھڑے ہی سفر کرنا ہے تو کسی نہ کسی کا سہارا لینا ہی تھا۔ بس اسٹارٹ ہوتے ہی بس میں خاموشی چھا گئی تھی۔ چہکنے والی لڑکیاں بھی چپ تھیں

دھچکا لگتا تو سسکیاں چیخیں اور سسکیاں بلند ہو جاتیں اندھا دھچکے کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے یہ سسکیاں ویسے بھی کبھی کبھی سنائی دے جائیں مگر کوئی کوشش لیتا کہ وہ اپنے ہمسفر اور سہارے کو مضبوطی سے تھامے رکھے لیکن کہ پریشان تھے۔

بس شاید مضافات سے گزر رہی تھی۔ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی مضبوط پہاڑوں کی قطاریں پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ رجانے سارے مسافر سیدھے سر کیوں تھے۔ مگر بس تیل میں تھا یا کوئی خوف کہ سرِ شام ہی سے گھروں میں بند ہو گئے تھے۔

مسلسل جھٹکوں، دھچکوں اور جھٹکوں نے مسافروں کو بُرا حال کر دیا تھا۔ بس کی رفتار ہر لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ انہیں اندازہ تھا کہ بس اب اس جنگل سے گزر رہی ہے جہاں خطرناک موڑ ہیں، چڑھائیاں اور نشیب ہیں اور جہاں آئے دن حادثے ہوتے رہتے ہیں۔ کیونکہ سڑک انتہائی خطرناک ہے۔

اندھیرے میں بس کی تیز رفتاری نے پہلے انہیں وہم اور پھر خوف میں مبتلا کر دیا۔ جھٹکے اور شدید ہو گئے تو انہوں نے چیخ کر ڈرائیور سے آہستہ چلنے کو کہا، شاید اس نے سنا نہیں یا توجہ نہیں دی، کیونکہ گزرنے والے بس کو دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔ دھیرے دھیرے بند ہونٹ کھلنے لگے۔ مسافروں کا حال بیان کرنے لگے۔ احتجاج کا شور بس کی گھڑگھڑاہٹ سے ہم آہنگ ہو کر تیز ہو گیا۔ دھچکے بڑھ گئے۔ چیخیں بلند ہونے لگیں۔ قوت برداشت جواب دے گئی۔ راڈ پر گرفت کمزور ہوتی گئی اور وہ لڑکھڑا کر گرنے لگے۔ خوف عفریت کی طرح ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ منزل پر پہنچنے کا تصور دم توڑنے لگا۔ جنگل گھنا ہوتا گیا۔ اندھیرا گہرا ہوتا گیا۔ چیخیں سب کے پردے پھاڑنے لگیں۔ بس کی رفتار اپنی انتہاؤں پر پہنچ گئی اور وہ دھماکے کے منتظر ہو گئے۔

ایسے وقت میں دفعتاً انہیں یاد آیا

اس نے ہوائی جہاز اڑانے کی تربیت لی تھی۔

## بقیہ صفحہ ۱۸ —— دردِ لادوا

رحم کھا کر اسے کچھ نہ کچھ دے جاتے تھے۔ اس کا دماغ بالکل ماؤف ہو چکا تھا۔ اسے نہ تو دن کا پتہ تھا نہ رات کا۔ وہ کبھی کبھی اٹھ کر اینٹیں جمع کرتی اور انہیں ایک دوسرے کے اوپر چنتی رہتی تھی یا وہ اپنے بچوں کو پکارتی رہتی تھی۔

محافظوں کو ابھی تک وہاں اس کی موجودگی کا پتہ نہ تھا۔ آج رات اس کے گریہ اور بلک بلک کر رونے کی آوازیں شاید ان کے کانوں تک پہنچ گئیں۔ اس نے ایک سپاہی کو حکم دیا وہ جا کر دیکھے یہ آوازیں کدھر سے آ رہی ہیں۔ انہی آوازوں کے سہارے سپاہی ڈھونڈتا ہوا اس تک پہنچ گیا۔ رات کے اندھیرے میں اسے پکڑ کر اٹھایا تو اس عورت کے رونے اور بلکنے کی آوازیں اب چیخوں میں بدل گئیں۔

محافظ کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اسے کس طرح چپ کرائے اور اس نے ایک زور دار طمانچہ اس کے گال پر رسید کیا۔ وہ زمین پر گر پڑی۔ چیخوں کی آواز بند ہو گئی۔ وہ اسے اسی طرح چھوڑ کر محافظ کے پاس واپس آیا اور بتایا کہ چیخوں کی آواز کہاں سے آ رہی تھی۔

وہ اس آواز کو بند کر آیا ہے ابھی وہ اپنی بات پوری بھی نہ کر پایا تھا کہ چیخوں کی آواز پھر سے گونجی۔ شاید اس نے ایک موٹی سی گالی اسے دی اور کہا کہ تو کیسا مرد ہے کہ تجھ سے ایک معمولی سی عورت کی چیخیں بند نہیں کرائی جا سکیں۔

اس کے بعد وہ خود تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس آواز کی سمت چلا اور اس عورت کے قریب پہنچ گیا۔ وہ اب بھی اسی طرح بلک بلک کر رو رہی تھی اور چیخ چیخ کر اپنے بچوں اور اپنے شوہر کو پکار رہی تھی۔ اندھیرا اور گہرا ہو گیا تھا۔ درختوں کے پتے ساکت تھے۔ یہ وحشی سکوت کسی آنے والے طوفان کا پتہ دے رہی تھی اس سکوت میں چیخوں کی آواز اور بھی تیز سنائی دے رہی تھی۔ محافظ اس کی طرف آہستہ آہستہ ٹٹولتا ہوا بڑھتا گیا۔ پھر وہ زور سے چیخا اور اس عورت سے بالکل قریب پہنچ کر اسے گھسیٹ کر دبوچ لیا۔

آسمان پر ستارے آنکھیں جھپکا کر زمین پر بسنے والے درندوں کو حیرت سے تک رہے تھے۔ اسی وقت دور افق سے ایک ستارہ ٹوٹا اور خلا میں گم ہو گیا۔ اور چیخوں کی آواز ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی۔۔۔

## بقیہ صفحہ ۲۶ —— سانڈنی سوار

طبیعتوں کو دنیاوی آفات اور دلوں کو مکروہ خواہشات سے آزاد کر دیا۔ مدرسے کے طالب العلموں کو اس سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ قرب وجوار کی آبادی اسے دیکھنے کی خواہش میں بلکان ہو رہی تھی اور وہ خود اعلیٰ حضرت سے ملاقات کی خواہش میں بغیر کھائے پیئے وہاں تین دن اور تین راتیں رہا۔

مدرسے کی انتظامیہ کے بہت کھانے، کھانے اور دھتکار سے ریگ زدہ لشکر سے مس نہ ہوا تو اعلیٰ حضرت اپنے حجرے سے تشریف لائے۔ اور سانڈنی سوار کو مدرسے کے صحن میں بلا کر صدر دروازہ مقفل کر دیا۔

جب اعلیٰ حضرت نے سانڈنی سوار کو اور سانڈنی سوار نے اعلیٰ حضرت کو دیکھا تو دونوں دیر تک باہم کے دھندلکوں میں کھوئے رہے اور چپ چاپ ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ باہر صدر دروازے پر لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے تھے اور کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ آخر کار اعلیٰ حضرت نے سانڈنی سوار کی بے باک نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے فرمایا۔

"جاؤ بھائی اپنا کام کرو۔ یہاں طالب العلم بستے ہیں"۔

اعلیٰ حضرت نے صرف اتنا کہا اور اپنے حجرے کی طرف نکل گئے۔

سانڈنی سوار نے نظر بھر کر مدرسے کے صحن میں مفلوک الحال زرد رُو طالب علموں کو درس میں منہمک دیکھا اور نہایت درد بھری آواز میں بولا

"میں تو چلا ـــ تم اپنی فکر کرو۔"

اتنا کہہ کر وہ صدر دروازے کی چوکھٹ پر گرا اور دم توڑ گیا۔

کہنے والے نے کہا ہے کہ وہ سانڈنی سوار خود ہی تھا جو بھیس بدل کر طالب علم بن کر آیا تھا۔ جب اسے دھتکار دیا گیا پھر وہ ڈاکو بن گیا اور جب آخری بار آیا تو موت بھی اس کے اختیار میں تھی۔

اعلیٰ حضرت اپنے حجرے میں تشریف فرما تھے اور مدرسے کے وسیع و عریض صحن میں صدر دروازے کے قریب سانڈنی سوار پڑا تھا۔ درس کے اختتام تک اس کی موت کا کسی کو بھی علم نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ حجرے کے قریب چند طالب علم اس طرف آئے اور اسے وہاں سے اٹھایا۔ ایک طالب علم نے ڈرتے ڈرتے صرف اتنا کہا۔

"صاحبو ـــ یہ تو اعلیٰ حضرت سے بھی بازی لے گیا"

میری صحنی ماں بھی اسی نتیجہ پر پہنچی تھی البتہ والد صاحب نے ہمیشہ اس سے اختلاف کیا۔ ان کے خیال میں ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اسے بیچ کر گائے کی کھال میں سی کر دھوپ میں ڈال دیا جاتا تاوقتیکہ اس کی ہڈیاں کڑکڑا اٹھتیں۔ مدرسہ عالیہ کا صدر دروازہ کہاں اور وہ لعین کہاں

کہنے والے نے کہا ہے کہ مدرسے کا صدر دروازہ اس وقت تک نہ کھولا گیا، جب تک سانڈنی سوار کو نہایت عجلت میں وہیں دفن نہ کر دیا گیا۔ قرب وجوار کی آبادی بہت دنوں تک گومگو کے عالم میں رہی۔ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے کچھ پتہ نہ چل سکا۔

کہنے والے نے کہا ہے کہ مدرسے کے صدر دروازے پر ایک مریل سانڈنی اب بھی اپنے سوار کا انتظار کر رہی ہے۔

مکمل ہندوستان کا تصور اُردو اور ہندی کے بغیر ممکن نہیں



## کرشن موہن

شہرِ عرفاں میں کوئی جانے بھی
اب تو ہم ہو گئے پرانے بھی

تجھ کو تیرا خدا بھلا . میٹھا
تج دیا مجھ کو دیوتا نے بھی

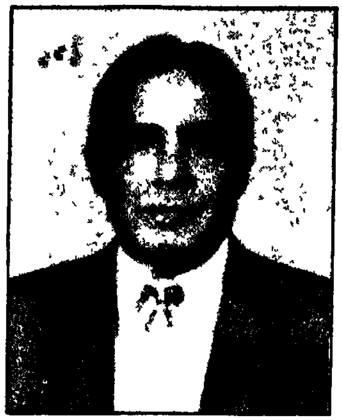
آج دیوانہ ہے اُداس بہت
کوئی آیا نہیں ستانے بھی

بے حسی نے بکھیر ڈالے ہیں
میرے خوابوں کے تانے بانے بھی

شب کو شوقِ وصال پہلو میں
فکرِ فرقت مرے سرہانے بھی

میرے حالات نامساعد ہیں
دل شکن ہیں ترے بہانے بھی

۱۵۸، پٹنا گلی، آئی۔ پی ایکسٹینشن
دہلی ۱۱۰۰۹۲



## بخش لائلپوری

طلوعِ فکر کا ہر معرکہ گذر بھی گیا
ذرا سی آنچ سے رنگِ نمو اتر بھی گیا

یہ کون مسندِ اہلِ سخن پہ بیٹھا ہے
زباں بھی گنگ ہوئی حرفِ معتبر بھی گیا

پناہ مانگی تھی یخ بستگیٔ موسم سے
چڑھی وہ دھوپ کہ اب سایۂ شجر بھی گیا

منافقانہ نظریات کا بہاؤ تھا
کہ جس میں ڈوب کے ہم کیا، ہمارا گھر بھی گیا

قفس نصیب نے اب کے وہ قید کاٹی ہے
دل و دماغ سے احساسِ بال و پر بھی گیا

کہا یہ کان میں کیا، سرپھری ہواؤں نے
ہمارے ذہن سے اہلِ ستم کا ڈر بھی گیا

337, STAINES ROAD, HOUNSLOW,
MIDDLESEX, LONDON, (U.K.)

## باقر نقوی

یہ کیا کہ حق ہو کسی کا مگر کسی کو ملے
شجر لگائے کوئی اور ثمر کسی کو ملے

کرم ہے سب پہ مگر کامیاب کوئی نہیں
فضا کسی کو ملی بال و پر کسی کو ملے

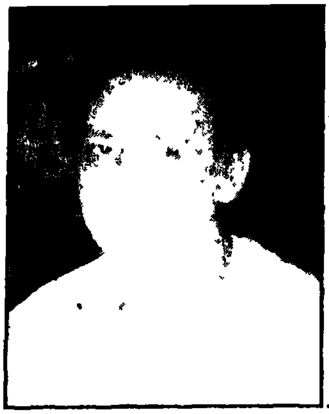
عجیب حال ہے اس دَور کے مکینوں کا
ملے ہیں بام کسی کو تو در کسی کو ملے

ہے رہبروں سے کہیں معتبر مرے نزدیک
وہ سنگ میل جو وقتِ سفر کسی کو ملے

مری اُداس شبوں کا سلام کہہ دینا
وہ ماہتاب سا چہرہ اگر کسی کو ملے

عروسِ ماہ بھی سو جائے پھر بھی نہ اٹھے
خدا کرے کہ نہ ایسی سحر کسی کو ملے

41, THE CROSSWAYS HESTON, MIDDLESEX TW5 OJJ



ندا فاضلی
۱۰۳- امر اپارٹمنٹ، ڈانڈا پاڑہ - ۱ کھار (ویسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۵۲

# دیواروں کے بیچ

قسط نمبر ۶

بڑا گڈھ میں دیکھتے ہی دیکھتے کئی چھوٹی بڑی دوکانیں کھل گئی ہیں۔ ٹین اور لکڑی کی بنی دوکانیں۔ ہر دوکان کی پیشانی پر کوئی بورڈ چسپاں ہے۔ بسم اللہ ہوٹل، غریب نواز ٹیلر، ربّانی شربت، مولا علی تندور۔۔۔۔ ان دوکانوں کے ساتھ بچوں کے لکڑی کے گھوڑے ہاتھی اور بڑے آہنی جھولے بھی میدانوں میں نصب ہیں۔ گھروں میں ایندھن کی سہولتیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ زیادہ تر لوگ تندور سے روٹیاں لگواکر وہیں سے کباب یا سالن خرید لاتے ہیں۔ ہر گھر میں پکنک کا سا ماحول ہے۔ سورج ڈھلتے ہی ان دکانوں کے ارد گرد، لالٹینوں یا گیس کی روشنی میں اچھے خاصے لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ تاش، شراب، ہاتھا پائی اور قوّالی روز کا معمول ہیں۔ ضرورتوں نے ہر شئے کی قیمتوں کو دوگنا چوگنا کر دیا ہے۔ کچھ دن سے ایک ٹینک بھی بالٹیوں کے حساب سے پانی فروخت کرنے لگا ہے۔ یہ سارا کاروبار مہاجروں کے لیے بھوپال کے رہنے والوں نے پھیلایا ہے۔ نولا سانپ کا شکار کرتا ہے، سانپ چھپکلی پر منہ مارتا ہے، چھپکلی جھینگر کو خوراک بناتی ہے اور جھینگر مکھی سے پیٹ بھرتا ہے۔ زندگی ہی زندگی کی خوراک ہے۔

راستوں میں بجلی نہیں ہے۔ شہر جانے والے احتیاطاً شام سے پہلے گھر لوٹ آتے ہیں۔ جنھیں بس وقت پر نہیں ملتی انھیں ضرور دیر ہو جاتی ہے۔ اندھیروں میں چوریاں اور مار پیٹ عام ہیں۔ چھینا جھپٹی سے دولت کی مساوی تقسیم کا عمل زوروں پر ہے۔ لیکن اس میں وہی زیادہ لٹ رہے ہیں۔ جنھیں خود لوٹنے والوں میں شامل ہونا چاہئے۔

یہ راستہ ہے یہاں راستے کی منطق ہے  تلاش سب کو ہے موقع کی بات ہے ساری
کوئی پھسلتا ہے کوئی پھلانگ جاتا ہے - جو آگے بڑھتا ہے دو چار کو گراتا ہے

آئے دن کی شکایتوں کی روک تھام کے لیے اب ایک پولس چوکی بھی قائم ہو گئی ہے۔ لیکن سُرخ صافے اور خاکی وردیاں پولس چوکی پر کم اور بوڑاہے کی دوکانوں پر زیادہ دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی لمبی لمبی مونچھوں اور چوڑی چوڑی بھوپالی گالیوں کی ہیبت سب پر طاری ہے۔ آبادی کے ساتھ کچھ دادا قسم کے لوگ بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ پولس والے انہیں سے بستی کی خیریت پوچھ کر سرکار کو امن و امان کی رپورٹیں بھیجتے رہتے ہیں۔ ان داداؤں میں ایک گوالیار کا بھی ہے۔ وہ جب بھی ندا کو آتے جاتے دیکھتا ہے تو کسی دوکان سے بھی کچھ اٹھا کر اُسے دے دیتا ہے۔ جمیل فاطمہ کو جب اس کا علم ہوتا ہے تو وہ ندا کی خوب خبر لیتی ہیں۔ اسے ڈانٹ کے بعد اب جو چیز ملتی ہے اسے راستے میں ہی ٹھکانے لگا دیتا ہے۔

راتوں کی وارداتیں کم ہونے کے بجائے اب زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ ہر روز شکایتیں درج کرائی جاتی ہیں۔ لیکن ان کا کوئی حل نکلنے کے بجائے لٹے شکایت کرنے والے پریشان کئے جاتے ہیں۔ بار بار چوکی پر بلائے جانے کی مصیبت سے بچنے کیلئے اب مصیبت زدہ ہر آفت کو خدا کی حکمت اور اپنی قسمت سمجھنے لگے ہیں۔

"دانے دانے پہ کھانے والے کا نام لکھا ہوتا ہے۔ قسمت میں نہیں ہوتا تو ہاتھ کا نوالہ بھی منہ تک نہیں آتا۔ بی بی ہاجرہ کے آنسو، حضرت یعقوبؑ کے غم، ایوب علیہ السلام کے صبر اور حسینؓ کی پیاس جیسی مثالوں کے رومالوں سے دُکھوں کے آنسو پوچھے جاتے ہیں۔ خدا مدتوں سے دُکھوں کے ذریعے اپنے بندوں کی آزمائش کرتا ہے۔ دوسروں کو ستانے والے بھلے ہی کچھ روز خوش ہولیں۔ جنّت کی دائمی خوشیوں پر تو پریشان روحوں کے نام کی نشانیاں ہیں۔"

انھیں پریشان لوگوں میں لنگی کُرتا اور خشخشی داڑھی والے ایک بزرگ بھی ہیں۔ سب انھیں صوفی صاحب کے نام سے پکارتے ہیں۔ سنا ہے جہاں سے یہ آئے ہیں وہاں ان کی درزی کی دوکان تھی۔ لُٹی ہوئی دوکان سے دو مشینیں بچا کر اپنے ساتھ لے آئے ہیں۔ انھیں پر تھوڑی بہت سلائی کر لیتے ہیں۔ بابو نے

بیلے انھوں کے ساتھ کام شروع کیا تھا۔ لیکن کام کی کمی کی وجہ سے یہ سلسلہ زیادہ دن تک نہیں چل سکا۔۔

ان کے گھر میں ڈھلتی ہوئی عمر کی بیوی کے ساتھ دو کم عمر لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔ آس پاس سے کپڑے لاکر سیتے ہیں اور مشکل سے گزارہ کرتے ہیں۔ اُن کا لڑکا اکثر گھر کے چکّر کاٹا رہتا ہے اور جمیل فاطمہ ہمدردی کے طور پر ہر بار اسے کچھ نہ کچھ پیسے کے لیے تھما دیتی ہیں۔ لڑکی جوان ہے۔ شادی کی عمر سے دو چار قدم آگے نکل چکی ہے۔ گھر کے حالات دیکھ کر اب وہ بھی کام میں ہاتھ بٹانے لگی ہے۔ لڑکی کافی تر طرار ہے۔ اس کی وجہ سے کئی نئے گراہک پیدا ہو گئے ہیں۔ سِلے ہوئے کپڑوں کو اب بھائیوں کے بجائے وہ خود ہی گھروں میں پہنچانے لگی ہے۔ جب سے صابرہ نے (لڑکی کا نام) یہ ذمّہ داری سنبھالی ہے نہ کبھی ادھار ڈوبا ہے اور نہ گاہک سلائی کی اجرت پر بحث کرتے ہیں۔ ماں صابرہ کے اس طرح بے برقع ہونے پر ناخوش ہے لیکن باپ اور بھائی بہت خوش ہیں۔ صابرہ کی اس تجارتی صلاحیت نے سارے گھر پر اس کا رعب جما دیا ہے۔ وہ کپڑے بھی رنگ بھڑک کے پہننے لگی ہے۔۔۔!

اس کے بارے میں اِدھر اُدھر کئی باتیں ہوئی ہیں۔ لیکن باپ کی نمازیں ان پر دھیان نہیں دیتیں۔ کچھ دنوں کے بعد ایک دن اچانک صابرہ بیمار پڑ جاتی ہے باہر آنا جانا بند ہو جاتا ہے۔ گھر کی دوادارو سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ تو ماں اُسے لے کر شہر چلی جاتی ہے۔ شہر کے ہسپتال میں صابرہ تو اچھی ہو جاتی ہے۔ لیکن ماں کو سفید بالوں کے بڑھاپے میں ایک اور بچّے کی ماں بننا پڑ جاتا ہے۔ اب صابرہ دو کی جگہ تین بھائیوں کی بہن بن گئی ہے۔ صوفی صاحب صابرہ کے ننھے بھائی کو گھر کے سامنے لئے بیٹھے رہتے ہیں۔ اور ہر آنے جانے والے کو خدا کی عظمت کا کرشمہ دکھاتے رہتے ہیں۔۔۔۔ اس کا نام انھوں نے اللہ بخش رکھا ہے۔۔۔

اس خدائی کرشمے نے صوفی صاحب کو زیادہ ہی اللہ کے قریب کر دیا ہے۔ پہلی سی بات تو اب نہیں ہے لیکن جو بھی تھوڑی بہت مزدوری ملتی ہے وہ لڑکے ہی کر لیتے ہیں۔ صوفی صاحب گھر کے کھلے میدان میں اذان دیتے ہیں۔ دیر دیر تک وظیفہ پڑھتے ہیں۔ رات کو دیر تک خاموش گھومتے ہیں۔ ایک دن خواب میں ایک بزرگ اُن سے اپنی تنہائی کی شکایت کرتے ہیں تو وہ کچھ دُور پر ہی کسی پرانی ویران قبر پر ڈیرہ جما لیتے ہیں۔ ان کے بیوی بچّے انھیں پاگل سمجھ کر بھولے ہوئے ہیں۔ مزار کی صفائی کرنا، چراغ روشن کرنا اور اگربتی سلگانا ان کے معمول میں شامل ہیں۔۔۔ اسی گمنام قبر کے پاس ایک صبح وہ مرے ہوئے ملتے ہیں۔ ان کو اسی قبر کے پاس دفنا دیا گیا ہے۔ اس واقعہ نے بستی میں ان کے کئی عقیدت مند پیدا کر دیے ہیں۔ ہر دن مزاروں پر پھول اور پیسے نظر آنے لگتے ہیں۔ صابرہ کے بھائی نے پیسوں کے لیے ایک پیٹی رکھ دی ہے اور صبح شام مزاروں کی صفائی کرنے آتا ہے۔

گوالیار کا وہ مہاجر دادا بشیر جو ذرا عاصلی کو کسی بھی دوکان سے کوئی چیز اٹھا کر دے دیتا تھا، جیل سے کسی بڑے جرم سے بری ہو کے آیا ہے وہ اپنی بحالی کو صوفی صاحب کی دین سمجھتا ہے۔ اس نے جیل سے آتے ہی مزار کے اِرد گرد ایک لوہے کے تاروں کا احاطہ بنوا کر اوپر چھپّر تان دیا ہے۔ احاطے کے باہر فقیر جمع ہونے لگے ہیں۔

صوفی صاحب کے اس نیک دل پجاری سے صابرہ کی شادی ہو جاتی ہے شوہر بھی صابرہ کے گھر میں رہنے لگا ہے۔ بڑا لڑکا اب اپنا زیادہ وقت مزار کی دیکھ بھال میں گزارتا ہے۔ اس نے داڑھی بڑھا لی ہے اور پینٹ قمیص کی جگہ اب وہ لنگی اور کرتا پہنتا ہے۔ چھوٹے بھائی کو بشیر نے ایک چھوٹی دوکان کھلوا دی ہے۔۔۔ صوفی صاحب خدا سے قریب ہو کر بھی گھر سے دُور نہیں ہیں۔

پانی کی قلت اور شدید گرمی پریشان کیے ہوئے ہے۔ آئے دن کوئی نہ کوئی گھر میں بیمار رہتا ہے۔ باری باری سب بیمار ہو چکے ہیں۔ ندا کے بعد اب چھوٹے بھائی سلیم کی باری ہے وہ دن بہ دن دُبلا ہوتا جا رہا ہے۔ بھوک کم ہوتی جا رہی ہے اور پیاس بڑھ گئی ہے۔ بابو شہر سے دوائی لاتا ہے لیکن کوئی افاقہ ہونے کے بجائے حالت اور بگڑ رہی ہے۔۔۔ جمیل فاطمہ کو چپ سی لگ گئی ہے۔ بچوں کی پڑھائی کے نقصان کے ساتھ ان روز روز کی بیماریوں نے انھیں بوکھلا دیا ہے۔۔۔۔ وہ رات کو دیر تک ورانڈے میں ٹہلتی ہیں یا جانماز بچھا کر نماز پڑھتی ہیں۔ بستی میں سب اپنی اپنی آسمانی سلطانی سے جوجھ رہے ہیں۔ کون کس کی خبر لیتا ہے۔۔۔ اجنبیوں میں شناسائیاں پیدا کرنا ان کے مزاج کے خلاف ہے۔ گوالیار کے حالات مرتضیٰ حسن کے خط کے مطابق ابھی پہلے جیسے ہی ہیں۔ ابھی تک وہ سرکاری گاڑی ہی میں آفس آتے جاتے ہیں۔ پاکستان سے آئے ہوئے شرنارتھی ہر خالی جگہ کو بھر چکے ہیں۔ شہر میں ہر دوسرے تیسرے دن کرفیو لگ جاتا ہے"۔ جمیل فاطمہ گھبرا کر دہلی میں اپنے ماں کے گھر جانے کا ارادہ کرتی ہیں۔ بڑی بہن اور ماں سامان تیار کرتی ہیں۔ بابو کو روپئے دے کر ریل کے ٹکٹ منگانے کو

بھیج دیا جاتا ہے ۔۔ ٹکٹ آجاتے ہیں ۔

لیکن مرتضیٰ حسن کا حافظہ سارے کیے دھرے پر پانی پھیر دیتا ہے ۔ دلی میں اب کوئی نہیں ہے ۔ ان کی ماں اور دیگر رشتے دار پاکستان چلے گئے ہیں ۔ پاکستان میں وہ کس شہر میں ہیں ، کس حال میں اس کا کسی کو علم نہیں ہے ۔ یہ خط پڑھتے ہی ان کا سر چکرا جاتا ہے ۔ وہ جہاں کھڑی ہوتی ہیں ۔ وہیں سہارا لے کر بیٹھ جاتی ہیں ۔ بڑی بہن جو سلیم کے پاس بیٹھی پنکھا جھل رہی ہے ۔ ماں کی طرف دیکھ کر ڈر سی جاتی ہے ۔ وہ فوراً اٹھ کر ان کے پاس آجاتی ہے اور ان کے ٹھنڈے ہوتے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر گرم کرتی ہے ۔ کافی عرصہ کے بعد آج انھیں پھر سے دورہ پڑا ہے ۔ آنکھیں کھلی ہیں ، لیکن جسم میں کوئی حرکت نہیں ہے ۔ وہ اسی حالت میں دو ڈھائی گھنٹے رہ کر ہوش میں آتی ہے ۔ چہرہ زرد ہے آنکھیں ویران ہیں ۔

سلیم کی طبیعت آج کچھ زیادہ ہی خراب ہے ۔ اس کے سانسوں کی رفتار تیز ہوتی جا رہی ہے ۔ صبح سے اس نے کچھ کھایا نہیں ہے سلیم ندا فضلی کا بیٹے نما بھائی ہے ۔ ان دونوں میں دوستی بھی زیادہ ہے ۔ بڑی بہن بڑی ہونے کے ناطے جب دیکھو حکم چلاتی ہیں اور بڑے بھائی اپنے دوستوں میں اس کی شرکت پسند نہیں کرتے وہ اچھے اکیلے پن کو گھر کے باہر کے ہم کے بہتر یا سلیم کے ساتھ ہی بانٹتا ہے ۔

ندا کا گھر کا نام مُقتی ہے ۔ بڑی بہن اور بڑا بھائی اسے اسی نام سے پکارتے ہیں ۔ لیکن سلیم اسے بھائی جان کہتا ہے ۔ جو اسے اچھا لگتا ہے ۔ اس کے منہ سے بھائی جان سن کر اُسے اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگتا ہے ۔

آج اُس نے سوتی صاحب کے مزار پر سلیم کے لیے دعا بھی مانگی ہے ۔ وہ مزار سے اس کے لیے پھول بھی لایا ہے لیکن پھول اور دعا کچھ کام نہیں آتے ۔ اور وہ جمیل فاطمہ کے زانو پر سر رکھے بڑی بہن کی ، مانی نیس شریف گنتے ہوئے ایک ہچکی کے ساتھ ہمیشہ کے لیے بہت دور چلا جاتا ہے اس کے مرنے کا دکھ ندا کے دل میں اس طرح گھر کر لیتا ہے کہ وہ سوتے جاگتے اس کے بارے میں سوچتا رہتا ہے ۔ سلیم کو قریب کے قبرستان میں دفن کیا جاتا ہے ۔ جمیل فاطمہ دن بھر خاموش رہتی ہیں لیکن رات کو جب سب سو جاتے ہیں اور چاروں طرف گونجتی ہوئی انسانی آوازیں خاموش ہو جاتی ہیں تو وہ اپنے اور خدا کے درمیان خدا کا کلام رکھ کر جا نماز پر دیر تک روتی رہتی ہیں ۔ سلیم کے حصے کا دودھ اور کپڑے مہینوں پابندی کے ساتھ خیرات کیے جاتے ہیں وہ مرنے کے بعد بھی گھر کے افراد میں شامل رہتا ہے اور پھر ماں کے دل میں داغ بن کر چھپ جاتا ہے ۔ قیامت کے روز اسی داغ کی خوشبو سے پھوٹتے بچے ، جو ہوش سنبھالنے سے پہلے مر جاتے ہیں ، اپنی ماؤں کو پہچانیں گے ۔۔۔۔

مرتضیٰ حسن گوالیار سے ایک ہفتہ کی چھٹی پر آئے ہوئے ہیں ۔ گاندھی مرڈر کا پلان گوالیار میں تیار ہو کر تکمیل کو پہنچ چکا ہے ۔ تیس جنوری ۱۹۴۸ء کو برلا مندر میں ، ہندوستان میں مسلمانوں کے بے آواز حادثات کے خلاف اٹھنے والا ہاتھ ، رام کو رحمان کے روپ میں پہچاننے والے دن رات ، ہمیشہ کے لئے ایک دُبلے پتلے ادھ ننگے ستر برس کے ہاتھ کو بے گولیوں سے جلا کر راکھ کر دیے گئے ہیں گاندھی کے قتل کی خبر ریڈیو سے نشر ہوئی تھی ۔ خبر میں قتل کی تصدیق کی گئی تھی لیکن قاتل کا نام نہیں بتلایا گیا تھا ۔ مسلمانوں میں اس ادھوری خبر نے دہشت پیدا کر دی تھی ۔ جمیل فاطمہ نماز میں قاتل کے مسلمان نہ ہونے کی اپنے خدا سے دعا مانگی ۔ ریڈیو میں خدا کے حکم کو ٹالنے کی سکت کہاں ۔ قاتل کا نام کافی تاخیر سے ہندو بتایا گیا تھا ۔ مسلمانوں نے چین کا سانس لیا ۔ مسلمانوں کے اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے کو اس حادثہ نے کچھ اور دور کر دیا ہے ۔ مرتضیٰ حسن کے آتے ہی سارے رکے ہوئے کام شروع ہو رہے ہیں ۔ بھوپال شہر میں کئی بڑے چھوٹے مکان دیکھے جاتے ہیں ۔ کہیں ملکی غیر ملکی کا سوال ہے ، کہیں شیعہ سنی کا اختلاف ہے اور کہیں بھاؤ تاؤ میں بات اٹک رہی ہے ۔ قیمتیں فرمانوں کی انگلی تھامے چل رہی ہیں کئی دن کی دوڑ دھوپ کے بعد ادھورا بنا مکان ، کسی تنگ سی گلی میں کرایے پر لے لیا جاتا ہے ۔ مکان کا مالک ، مکان کی تعمیر ادھوری چھوڑ کر پڑوس کے پاکستان میں منتقل ہو چکا ہے ۔ ایک بیوہ اور دو چھوٹے لڑکے اس ادھورے مکان سے زندگی پوری کر رہے ہیں ۔ نیچے کے حصے میں وہ مقیم ہیں ۔ اوپر ایک سامنے پیروں کی کھلی جگہ ہے جس کے ایک کونے میں بنا دروازے کا ایک کمرہ ہے ۔ [ باقی آئندہ ]

---

اپنے خطوں پر پتے اُردو میں لکھیئے ، اس عملی تحریک کو کامیاب بنایئے

---

# دھنک رنگ

## محمود عالم

کیا خبر تھی وہ مرا رختِ سفر لے جائے گا
ایک ہی جھونکا ہوا کا بال و پر لے جائے گا

جانے پھر ہوگا کہاں پر ختم یہ اندھا سفر
وقت کا سیلاب ہر اک رہ گزر لے جائے گا

گھر یہیں رہ جائیں اس کی کوئی صورت کیجئے
اب کے یہ سیلاب سب دیوار و در لے جائے گا

اک پرندہ جس کی آنکھوں میں لہو کا عکس ہے
دور تک اس حادثے کی وہ خبر لے جائے گا

یوں بھی وہ احسان فرمائے گا مجھ پہ ایک روز
خوشنما منظر مجھے دے گا، نظر لے جائے گا

● سعیٔ اردو، گورنمنٹ کالج، مالیر کوٹلہ (پنجاب)

## شفق سوپوری

ہر سمت وبال ہجرتوں کا
یہ دشت سیال ہجرتوں کا

انجان نگر میں رہن کرنا
اور اس پہ ملال ہجرتوں کا

اس بار اکیلا جائے گا تو!
یہ مژدہ سنبھال ہجرتوں کا

ہر لمحہ صلیب آشنا ہے
ہر سال ہے سال ہجرتوں کا

کس سمت اچھالے گا لہو تو
ان قتل و قتال ہجرتوں کا

● ریاض منڈیکیٹ اقبال مارکیٹ سوپور کشمیر

## شناور کرت پوری

لفظ ہونٹوں سے نکل کر رائیگاں ہو جائیں گے
سچے قصے بھی سماعت پر گراں ہو جائیں گے

بھاگتی جائیں گی ذہنوں سے یقیں کی سرحدیں
لوگ خود اپنے لئے وہم و گماں ہو جائیں گے

مست خوشبو کو ٹٹولیں گے سرِ شاخِ ثمر
شگفتہ پھول جب نذرِ خزاں ہو جائیں گے

پھیل جائے گی فرازِ سر پہ خاکِ سرزمیں
اگلے وقتوں میں یہ ذرّے آسماں ہو جائیں گے

آسمانوں پر یہ تحریریں اٹھا لی جائیں گی
یہ مقدس لفظ کاغذ پر دھواں ہو جائیں گے

● ہیرا واچ کمپنی، بسی کرت پور، ضلع بجنور، یوپی

## عاصم شہنواز شبلی

رات کے پیڑ پر دھواں ٹھہرا
سرخ پانی پہ آسماں ٹھہرا

اپنے ہی شہر میں مہاجر سا
سر پہ یہ کیسا امتحاں ٹھہرا

زندگی ہے سراب کی صورت
ہر قدم پر یہی گماں ٹھہرا

لے گیا جو بھی چاہے دعائیں لے جائے
یہ فقیروں کا آستاں ٹھہرا

اک زمانہ ٹھہر گیا عاصم
جس جگہ میں رکا، جہاں ٹھہرا

● ۱۲۔ ڈاکٹر ام اسحاق روڈ، کلکتہ

## ظفر رانی پوری

خوشی غم کی علامت ہو گئی ہے
ہنسی رونے کی صورت ہو گئی ہے

خود اپنے آپ سے میں لڑ رہا ہوں
مجھے خود سے بغاوت ہو گئی ہے

اضافے غم میں ہوتے جا رہے ہیں
خدا کی خاص برکت ہو گئی ہے

خلا میں دیکھتا رہتا ہوں اکثر
مری کیوں ایسی حالت ہو گئی ہے

میں اب اندر ہی اندر ٹوٹتا ہوں
خموشی میری فطرت ہو گئی ہے

● دیہی ادبی امراللہ اردو لائبریری، غمات، نگر، رانی پور، ضلع سیوان

## شجاع فرخی

وقت کا عمل سورج آج اور کل سورج
زندگی کی بھٹی میں تو بھی جل پگھل سورج
برف کے علاقہ میں آتشیں غزل سورج
نور دے مٹھاسوں کا روشنی کے پھل سورج

روشنی سبھی کی ہے
سب کے ساتھ چل سورج

● ۱۸۔ دمار جیب رجنسی، جہانگیر آباد بھوپال ۱ ۔۔۔



صدیقی عالم
۱/ایچ/۳، ہاتھی بگان روڈ، کلکتہ-۷۰۰۰۱۴

تجزیہ

# جدیدیت اور اس کے بعد

ادب میں جدیدیت کا آغاز اس وقت ہوا جب انسان کے لائحۂ عمل نے اس کے بیرون کی جگہ اس کے باطن میں داخل ہونا شروع کر دیا۔ ادب، یا فن کے کسی بھی شعبے میں اس وقت تک جو فارم رائج تھا۔ آئزک نیوٹن کے متوازن اور میکانیکی دنیا میں اس کا ارتقا ممکن ہوا۔ البرٹ آئنسٹائن کی دنیا میں اس کا ٹھہرنا ممکن نہ ہو سکا۔ یہ فارم ٹوٹ گیا اور تب ہی سے اس کے ٹوٹنے کا عمل جاری ہے۔

یہ نفسیاتی نظریہ ہے کہ انسان کا لاشعور ہی اس کا اصلی اور آخری چہرہ ہے۔ اس فارم کے ٹوٹنے کا پہلا دور تھا جو ایک نئے فارم کی شکل میں ڈھل کر سامنے آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پراؤسٹ کی "دورِ گذشتہ کی یادیں" ہمیں اس اندرونی، نیم تاریک نیم روشن دنیا کے خوابناک ماحول میں لے جانے کی طرف پہلا تجربہ تھا جو بعد میں "شعور کی رو" کی نام نہاد تکنک کی شکل میں رو پذیر ہوا۔ ایسا کیوں ہوا اور ادب کی سالہا تحریکیں کیوں اسی طرح کی تکنک سے وابستہ نہیں اور اسی فارم کے اندر جو تجربات ہوئے وہ نا وقت کیوں محض فلسفیانہ نظریات میں تبدیلیوں کے مرہونِ منت رہے، اس کا ایک سیدھا سادا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ بیرونی دنیا کے خد و خال، جن سے یہ تحریکیں وابستہ تھیں یا نا آمدہ چہرہ مستعار لیتی تھیں، سائنس کی ایجادات کے باعث اپنی اہمیت کھونے کے دور تک نہیں پہنچ پائے تھے۔ سائنس کی سب سے جدید دریافت یہ ہے کہ اس نے ٹھوس مادّے سے واپس لوٹنا شروع کر دیا ہے۔ ایسے لمحوں میں جب بیرونی سہارے انسان سے چھینے جا رہے ہیں انسان نے اپنی وجود کے نقطۂ نظر سے کائنات کی تشریح و توضیح کی طرف قدم بڑھانا شروع کر دیا ہے۔ مگر انسان کا وجود آئس برگ کے اس ٹکڑے کی طرح ہے جس کے آٹھ میں سے سات حصّے پانی کے اندر ہوتے ہیں۔ "شعور کی رو کی تکنک نے ان سات حصّوں کو سطحِ آب پر لانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ ٹکڑا اتنا ضخیم ہے۔ جس میں اتنا عظیم بحران ہے، اور اس کا پگھل کر خود کو "لازوال سمندر" میں ضم کر دینے کا عمل اتنا حیرت انگیز ہے کہ بعد میں جو تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے وہ ان سات حصّوں کی نفی کرتی ہے۔ اس ضمن میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ "روشنی کے بیمار کُن لازوال ماول ہوتے ہوئے بھی، بقول ورجینیا وولف، زندگی گرفت میں آنے سے منکر ہے"۔ یہ پوری سچائی کو سامنے لانے سے قاصر ہے۔ آرنلڈ کیٹل نے اسی نظریہ کی توثیق کی ہے جب یولیسس کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں "تصوراتی وابستگی کے بیجا طریقہ کار کے خلاف جو جواز پیش کیا جاتا ہے وہ محض یہ نہیں کہ یہ پیچیدہ اور تاریک طریقہ ہے اور بعض اوقات ناقابلِ فہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ بلکہ حقیقتاً یہ تصورات کا ایک چھوٹا جالا بنانے کے درپے ہوتا ہے۔ ایک ایسا جالا جو جدید علم النفس کے تمام دوسرے پیٹرن کی مانند ہی کسی سچائی میں اپنی بنیاد نہیں رکھتا جس کا یہ دعویٰ کرتا ہے۔"

دراصل "شعور کی رو" کی تکنک کا استعمال مکمل تصویر کھینچنے کے لیے تھا۔ لیکن دنیا روز بروز اتنی تیزی سے بدل رہی تھی کہ پرانے بت ٹوٹتے جا رہے تھے یہاں تک کہ ہم جب آج کے ادب کے بارے میں سوچتے ہیں تو ہمارے ذہن میں کوئی واضح تصویر ابھر کر سامنے آنے سے معذور ہوتی ہے، نقشے میں کوئی خانہ ایسا نظر نہیں آتا جس کے گرد سرخ لکیر ڈال کر اسے نقشے سے الگ دکھا سکیں۔ ادب کی سب سے جدید صنف مختلف النوع تجربات سے عبارت ہوتے ہوئے بھی۔ یہ تجربات کسی رُخ کی نشاندہی نہیں کرتے کیونکہ جدید ذہن سرے سے اس "رخ" سے منکر ہے۔ عصرِ نو کے تجربات اتنے وسیع، ناقابلِ فہم اور سریع الرفتار ہیں کہ کسی ایک شکل میں ٹھہر نہیں پاتے۔ اس لیے عصرِ نو کے ادیب کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ آزمودہ سہاروں کو پرے ڈال دیں اور روایتی تمثیل سے رہبری کریں۔ وہ حالات کیا ہیں جو ایسے بن گئے ہیں کہ اب انہیں تاریخ کے صفحات تک لے جانا بھی ناممکن نظر آ رہا ہے۔ وہ حالات یہ ہیں کہ آج کا انسان ٹوٹ چکا ہے۔ انسان کی اجتماعی شناخت ختم ہو چکی ہے۔ سائنس اور فلسفے نے انسان کے جو سانچے ڈھالے تھے وہ غلط ثابت ہوئے ہیں۔ آج انسان کے ساتھ کیا کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ بیوروکریسی نے اس کا کس بل نکال دیا ہے۔ سماجی نظام نے اسے محض ایک فرد بنا رکھا ہے۔ معاشی ناآسودگی،

نسلی تعصبات اور ان کے دلی تاثرات، سیاسی ناانصافی، جنگ و امن کی رسہ کشی، ان چیزوں نے اسے گدھ کی طرح نوچنا شروع کر دیا ہے۔ آج کی دنیا میں کچھ بھی مقدس نہیں رہا۔ جیسا کہ W.B. YEATS کو اس کا تجربہ ہوا ہے:

THINGS FALL APART, THE CENTRE CAN NOT HOLD,
MERY ANARCHY IS LOOSED UPON THE WORLD

اس انارکی میں صرف ایک چیز متعین ہو پائی ہے وہ یہ کہ [جب تک یہ مفروضہ غلط ثابت نہ ہو جائے] کہ کائنات کا مرکز ہی نوع انسان اور اس کا ذہنی نظام ہے۔ اور۔ انسان وہ نہیں جو بظاہر نظر آتا ہے جس طرح کہ یہ کائنات بھی وہ نہیں جو ہمیں نظر آتی ہے یا جس کی تشکیل کا تعین، سائنس، فلسفہ یا مذہب کرتے ہیں۔ اس طرح انسان ایک ایسی کائنات کے مرکز میں کھڑا ہے جو ٹوٹ کر بکھر چکی ہے اور اس کے ساتھ انسان کا اپنا تصوراتی نظام بھی نئی جہتوں میں منقسم ہو گیا ہے اس انتشار کو قید کرنے کے لیے جو ادب ظہور پذیر ہوا اس کی زبان کا اس کی مناسبت سے اس انتشار کا شکار ہونا لازمی تھا۔

یہاں یہ سوال اٹھتا ہے آیا موجودہ ادب یا جدید ادب ایک پیچیدہ نظام سے ابھری ہوئی اور اس کی مناسبت سے ایک پیچیدہ صنف سخن ہے؟ [تکنیک ٹی ایس ایلیٹ اس لفظ کو جن معنوں میں استعمال کرتا ہے، HEURISTIC ہے]۔ آیا ہم کائنات کی وسعت کو ایک فرد واحد کی ذات میں سمو سکتے ہیں؟ کیا یہ محض ایک آلہ ہے جس کے ذریعے صرف احساسات کی گہرائیوں کو پایا جا سکتا ہے یا پانا چاہیے؟ ہارٹ کرین ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "یہ ایک انتہائی خطرناک مسئلہ ہے جو آج ایک شاعر کو درپیش ہے —— ایک ایسی دنیا جو ایک سڑتے ہوئے معاشرے سے انسانی اقدار کی ازسر نو تعمیر کی طرف لوٹ تعمیر پذیر ہے کہ اب بہت کم اصطلاحات اور معیار ایسے بچے ہیں جو باقی رہ گئے ہیں سوائے ٹھوس اور مستحکم تاثرات ہوں کہ کسی روحانی بے یقینی کا احساس نہ ہو۔"

لیکن پوری انسانی تاریخ اور پوری دنیا کو نفی کر دینے کے بعد انسان کے پاس کیا باقی رہتا ہے کہ وہ از سر نو کسی چیز کی تعمیر کر سکے۔ کیا جدید ادب اس سفر سے شروع ہو کر ایک قدم بھی آگے بڑھنے کا اہل ہے؟ اور اگر جدید ادب اپنے اندر بہت سارے حیرت انگیز امکانات بکھار رکھتا ہے تو اس نے کس طرح کی دنیا اپنے لیے ڈھالی ہے؟ کیا اس دنیا کو سمجھنے کے لیے ہمیں احساس کی ایک نئی جہت قائم کرنی ہوگی؟ تقابلی مطالعے سے اس بات کا تھوڑا بہت اندازہ ہوتا ہے کہ اس نئی جہت کو جدید ادب کے تمام نمائندہ ذہنوں نے محسوس کیا ہے جس کے سامنے وہ خود بے بس ہوتے نظر آتے ہیں۔ یہیں یا تو انھوں نے ٹی ایس ایلیٹ کی روش اختیار کی ہے اور سمبالزم میں پناہ لیتے ہوئے یہ کہا ہے GENINE POETRY CAN COMMUNICATE BEFORE IT IS UNDERSTOOD یا ہرمن ہیس کی طرح الفاظ کو اظہار کے بجائے نقاب پوشی کا ذریعہ سمجھا ہے۔ WORDS ARE MASKS

اب تک میں نے جدیدیت اور مابعد الجدیدیت کے تاثرات سے جو بھی بحث کی ہے اس کا تعلق کسی نہ کسی طرح وجودیاتی مسائل سے ہے۔ بظاہر یہ وہی پرانا جھگڑا ہے جسے قدیم ادب میں ادب اور زندگی کے نام سے اور جدید ادب میں فن اور عمل کے نام سے پیش کیا جاتا ہے۔ مگر یہ اس سے پرے ہے۔ احساب حسن اپنا مضمون RADICAL INNOCENCE میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس سے اعتراف کرتے ہیں کہ ناول کے نقاد دراصل فن اور عمل، تصورات اور حقائق، نظام اور بدنظمی کے مابین تحلیل ہوتی ہوئی سرحدوں کا احاطہ کرتے ہیں، یعنی ان جہتوں کا جہاں انسان کا ایک طرح کا حسابی نظام دوسری قسم کی حسابی نظام سے وابستہ ہوتا ہے۔ یوں ہم لاشعوری طور پر ایک طرح کے VERTIGO میں داخل ہوتے ہیں جس کا احساس حسن کو اندازہ ہے۔ RONALD SUKENICK اپنے مضمون "ناول کی روایتوں" میں جارحانہ انداز میں اس پوری بدنظمی کو اسی کے سے انداز میں بیان کرتے ہیں کہ ایک ناول نگار اسے احساس کے ابلتے ہوئے دھارے کو اپنے قلم میں مقید کرتا ہے اور اس عمل میں وہ ہر چیز کو چکنا چور کرنے کے درپے ہوتا ہے جو اس کے احساس کے دھارے کو ابلنے سے روک دے، چاہے یہ بجائے خود ناول ہی کیوں نہ ہو اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ یہ ناول ہی ہوتا ہے۔

ظاہر ہے ہمارا ناول نگار ناول لکھتے وقت خود اس ناول کی نفی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اگر یہ اس کے احساس کے دھارے کے ابلنے میں مزاحم ثابت ہو اور یہی واقعہ ادب کی دوسری اصناف کے ساتھ بھی ہے۔ یعنی جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری نظم خود ہمیں وہ بات کہنے سے روک رہی ہے جو ہم کہنا چاہتے ہیں تو ہم اس نظم کو توڑ کر بکھیر دیتے ہیں، اپنے افسانے کو مسخ کر ڈالتے ہیں، ہم خود اپنے قاری سے منہ پھیر کر چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور یقیناً اس کے لیے ہمیں کوئی قصوروار نہیں ٹھہرا سکتا۔

میڈوسا [یونانی دیومالا کا ایک دہشتناک کردار] کے اندر ایسی علمی طاقت تھی کہ جو بھی اس پر نظر ڈالتا وہ پتھر کا ہو جاتا۔ پرسیس اسے ایک ڈھال میں جس پر صیقلی آئینے کی طرح چمک رہی تھی بالواسطہ طور پر دیکھ کر اپنے آپ کو تقریباً بدلنے سے بچاتا ہے۔ اور اسے موت کے گھاٹ اتارتا ہے۔ شاید مابعد الجدیدیت

[باقی صفحہ ۲۴ پہ دیکھیے۔]

# دھنک رنگ

## سلیم انصاری

بدن دریدہ ہوں یا روشکستہ پا ہوں میں
کہ جیسے اپنے بزرگوں کی بد دعا ہوں میں
وہ شخص تو کسی اندھی سرنگ ایسا ہے
اور اس سے زندہ نکلنے کا راستہ ہوں میں
یہ بھول جاؤ کہ تم مجھ کو بھول جاؤ گے
کبھی تو تم سے ملوں گا کہ حادثہ ہوں میں
وہ ہمسفر ہی نہیں مانتا مجھے اپنا
یہ جانتا ہوں مگر ساتھ چل رہا ہوں میں
مری شناخت مرا چہرہ گر بھی کر نہ سکا
سلیم اتنی بلندی سے گر پڑا ہوں میں

● ۵۵۹، موتی نالہ، جبلپور ۴۸۲۰۰۲

## محمد مختار وفا

کسی طرح تو میسر ہو کچھ سکوں اب کے
گذر بھی جائے سروں سے یہ موج خوں اب کے
حیات قرض ہے مجھ پر جہاں پناہوں کا
تو کیوں نہ پیرہن جاں اتار دوں اب کے
پھر اس کے بعد کا منظر نہ کچھ دکھائی دے
رکھوں سنبھال کے پلکوں پہ خواب یوں اب کے
قریب آ گئی ہجرت کی آخری منزل
رگوں میں دوڑ رہا ہے ترا فسوں اب کے
یہ مرحلہ ذرا دشوار ہے وفا پھر بھی
خود اپنے آپ سے اپنی کہوں سنوں اب کے

● اسسٹنٹ بینک آف انڈیا، ستا برانچ، ستا (بہار)

## منصور اعجاز

میں اِدھر اور وہ اُدھر کچھ سوچتا رہ جائے گا
فیصلہ ہوگا نہیں پھر فاصلہ رہ جائے گا
نیند تو اچھے برے سب خواب لے کے جائے گی
حسن کی آنکھوں میں خالی رت جگا رہ جائے گا
عشق کو اظہار کی راہیں نہیں مل پائیں گی
خواب گونگے شخص کا پھران کہا رہ جائے گا
رہ گذر چوراہے، گلیاں، موڑ دھڑکن سسکیاں
حادثوں کی گرد میں سب کچھ دبا رہ جائے گا
روپ رنگ منصور یہ شعر و ادب یہ شہرتیں
سب فنا ہو جائیں گے بس اک خدا رہ جائے گا

● رسد اسٹوڈیو، روپ مال ۱، ۵۴۴ (مہاراشٹر)

## عطاءُ الرحمان طارق

نہیں رنگ کوئی بھی آثار میں
سمندر کا پانی ہے دیوار میں
لیے شاخِ زیتون منقار میں
پرندہ گرا آ کے راڈار میں
خجل مجھ کو ہونا تھا دربار میں
خطا بھی ہوئے سر تو گدھار میں
شرن لینے آیا تھا اوتار میں
کمنڈل گوایا ہری دوار میں
نہ ملنے الگ بات ہے یار میں
فضا آسمانی ہے سرشار میں

● ۹۴ ناظمہ منگلہ حبیب سرکل سٹی ۳۰۱۱

## صابر زاہد

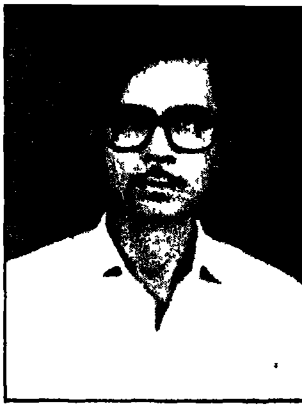
ہوا سے ابر میں کب برچھیاں نہیں کھلتیں
نمو کی رت کے سوا سیپیاں نہیں کھلتیں
حصارِ رنگ سے آگے بھی اک جزیرہ ہے
وہیں چلو کہ نئی بستیاں نہیں کھلتیں
لہو سے چاند رچائیں گے ظلمتِ شب میں
ہمیں بھی ضد ہے اگر بیڑیاں نہیں کھلتیں
ہمارے زخم ہیں گو کل کسک ہے جی کی
ہماری تان پہ کیوں گوپیاں نہیں کھلتیں
وہ جاں گداز سا منظر ہے اب کہاں زاہد
کھلے ہیں زخم مگر تتلیاں نہیں کھلتیں

● ۲۔۳۔ شمسی بیٹھک، حل گاؤں (مہاراشٹر)

## ساجد حمید

کوئی لمحہ شگفتہ ساز تلاش
حرف ساں زیست کا جواز تلاش
کعبۂ دل ہنوز ویراں ہے
زائر چشم بے نیاز تلاش
خامشی بے صدا نہیں ہوتی
روح کی چپ کا آج راز تلاش
عشق گمنام ہی نہ رہ جائے
دل کی دھڑکن رہِ دراز تلاش
دھیرے دھیرے قدم بڑھا یوں ہی
نغمۂ جاوداں کو باز تلاش

● رینج فاریسٹ آفیسر۔ نمبر ۱۴ نہرو نگر، ساگر (کرناٹک)



مراٹھی: آنند یادو
اردو: سلام بن رزاق
۱۱/۹، ایل۔ آئی۔ جی، ونوبا بھاوے نگر، کرلا (ویسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۷۰

# آدی واس

شانتا میری چچیری بہن ہے۔ وہ مجھ سے دس بارہ برس بڑی ہوگی۔ لڑکی کے پیدا ہوتے ہی بے چاری بیوہ ہو گئی تھی۔ اس کی اکلوتی بیٹی کا نام لکشمی ہے جو حال ہی میں قریب کے پاس کے گاؤں میں بیاہی گئی ہے۔ شانتا وڈیلوں میں تب ہے جو پاس کے گاؤں کے پاس ہی ہے۔ کچھ تو قریب بیاہ ہے میں شانتا کا یہی مقصد تھا کہ جب بھی اس کا جی چاہے وہ آسانی سے بیٹی کو اپنے گھر لا سکے۔ شانتا کے والدین تو مدت ہوا سورگ باش ہو چکے تھے۔ اس کا کوئی سگا بھائی بھی نہیں تھا۔ تیاگ نے دیہات کے اس گھر کے پاس کافی جگہ خالی پڑی ہوئی ہے۔ شانتا اکثر کہتی۔

"تم ہی اب اس پر ایک چھپر ڈال دو آخر کو تم میرے چھوٹے بھائی ہو۔ گھر میں چراغ ہی جلتی رہے تو ماما کی یاد تازہ رہے گی۔ بس کبھی کبھی آکر میری خبر پوچھ لیا بھائی کے ناطے کبھی بھاؤ بیج پر آکر آرتی اتار لیا۔ کبھی تیج تہوار پر روکھی سوکھی چکھ لیا۔ بس اتنی سی حسرت ہی تو ہے میری۔" دونوں بھائی ہمارے آبائی گاؤں میں کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ میں ملازمت کے لیے گاؤں سے دور ایک شہر میں رہتا ہوں۔ میرے بھائیوں سے شانتا کی کچھ کم ہی بنتی رہتی ہے۔ البتہ مجھ سے سال دو سال میں ملاقات ہو جاتی ہے۔ تین تین چار چار برس گزر جاتے ہیں میں شانتا سے نہیں مل پاتا۔ کبھی کبھی آبائی گاؤں دو تین روز کے لئے ضرور چلا جاتا ہوں۔ مگر وہاں سے شانتا کے گاؤں جانا پڑے تو بڑا جال پڑتا ہے۔

شانتا کا گاؤں ہمارے گاؤں سے پانچ ایک میل کے فاصلے پر ہے۔ ملک کو آزاد ہوئے کتنے برس گزر گئے ہیں کتنے پنج سالہ منصوبے بنے۔ گاؤں سدھار اور سڑک سدھار اسکیمیں بنیں مگر شانتا کے گاؤں جانے کیلئے جو ایک پرانی قدیم کچی سڑک ہے سو آج بھی ویسی ہی ہے۔ اس میں کوئی سدھار نہیں ہوا۔

ہمارے آبائی گاؤں میں کافی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ کئی سوسائٹیاں بن چکی ہیں۔ ڈیری فارم اور ہائی اسکول بن گیا ہے۔ زراعت میں ترقی ہوئی ہے۔ زراعت کرنے کے نئے اوزار، نئے بیج بھی دستیاب ہیں۔ ٹی وی کا رواج عام ہوا اور ریڈیو، پھر مجھ جیسے نوجوان تعلیم حاصل کرنے کے بعد آس پاس کے شہروں اور قصبوں میں نوکریاں کرنے لگے اور ہم جیسے نوجوانوں کے ذریعہ گاؤں میں شہروں اور قصبوں کی تہذیب بھی داخل ہوئی اور اب ایسا لگتا ہے جیسے گاؤں بھی صاحب بن گیا ہے۔

مگر یہ کتنے تعجب کی بات ہے کہ شانتا کا گاؤں ہمارے گاؤں سے صرف پانچ میل کے فاصلے پر واقع ہے تاہم اُسے کسی بھی قسم کی تبدیلی چھو تک نہیں گئی۔

البتہ کسی طرح بیل گاڑی وہاں تک جا سکتی ہے۔ مگر اس کا بھی کچھ ٹھکانہ نہیں۔ اس کے گاؤں جاتے ہوئے اکثر میں نے ایک آدھ بیل گاڑی کو کسی گڈھے میں چاروں شانے چت پڑے دیکھا ہے۔ اس کے گاؤں جانے کے لئے یا تو بیل گاڑی کی سواری کیجیے یا پیدل مارچ۔

مجھے اب پیدل چلنے کی عادت نہیں رہی۔ اس لئے شانتا کے گاؤں پیدل جانا اور پیدل واپس آنا میرے لئے ایک دشوار مرحلہ ہے۔ اس لئے میں جب بھی شانتا کے گاؤں جانے کا قصد کرتا ہوں تو ایک ٹوٹا سا سائیکل کا انتظام کر لیتا ہوں۔ اس طرح سفر کم تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔ کسی سپتل سی ... کی مالو میں سائیکل اگر رپٹ بھی گئی تو کوئی خاص چوٹ نہیں لگتی۔ کیونکہ جھاڑ کے نیچے اور ... سے دو دو بار سوار ہو گئے ڈھیر سے ڈھیر سے پیڈل مارتے ہوا کھاتے آگے بڑھتے چلے گئے۔ ڈھلوان پر سائیکل خود بخود چلنے لگتی ہے۔ چڑھائی پر سائیکل سے اتر کے اور رستان کشاں سائیکل ہاتھ میں پکڑے پیدل چلنا پڑے۔ اس کے بعد بھی اگر قسمتی سے کسی پگڈنڈی پر کوئی کانٹا چبھ جائے تو پنکچر آگیا تو سائیکل ہاتھ میں پکڑے پیدل چلتے ہوئے اپ کو کوسنا پڑتا ہے۔ انہیں سب مصیبتوں کے سبب اس کے گاؤں جانا نہیں ہوتا۔

ویسے شانتا مجھے بہت پیاری ہے اسے اس بات پر بڑا دکھ ہے کہ اس کا بھائی پڑھ لکھ کر صاحب بن گیا ہے۔ وہ دل سے چاہتی ہے کہ میں اس کے گاؤں جاؤں، اس سے بولوں، اس کا مہمان ہوں اور اسے بھاؤ بیج کے دن ... آرتی اتروا لوں۔ اس کی اسی بے لوث چاہت اور بار بار کے اصرار پر میں تقریباً چار برس کے بعد اس کے گاؤں جا رہا تھا۔ بھاؤ بیج سے ایک روز پہلے میں دوپہر کو روانہ ہوا۔ دن ڈوبتے ڈوبتے اس کے گاؤں پہنچ گیا۔ سائیکل نے کہیں دغا نہیں دی اس لئے سفر آرام سے کٹ گیا۔

گاؤں برسوں پہلے جیسا تھا اب بھی ویسا ہی دکھائی دے رہا تھا۔ سر تا سر مٹی اور کچی اینٹوں سے بنے ہوئے مکانات۔ پتا نہیں کیسے پھوس کے چھپر پڑے ہوئے تھے۔ اس کی نچلی دیواریں ... اور ان پر ہاتھوں سے تھاپے ہوئے اپلے۔ ... سال بھی شانتا کے گھر میں روشنی سے ٹوٹ پھوٹ اور مرمت ہوتی رہتی۔ بارش کے تھپیڑوں سے ڈھے جانے والی کچی دیواروں کی لپائی ہوتی۔ ان کی حفاظت کے لئے گھاس اور کرٹے کے بنے ہوئے چھپر۔

شانتا کا گھر بھی تقریباً ایسا ہی تھا۔ سامنے سیلر کے بیچ شانتا کا بوڑھا اکلوتا بیل بندھا ہوا تھا جس کے جسم پر صرف ہڈیاں رہ گئی تھیں۔ پتا نہیں شانتا نے کس مقصد کے تحت رکھ چھوڑا ہے۔ سامنے گھاس کے تنکے پڑے ہوئے تھے۔ چند تنکے اس کے پیروں میں الجھے ہوئے تھے۔

لکشمی دہلیز میں بیٹھی برتن مانجھ رہی تھی۔ برتن کا پانی کافی گدلا گیا تھا۔ وہ بار بار اسی پانی میں برتنوں کو کھنگال رہی تھی۔ مجھ پر اور میری سائیکل پر نظر پڑتے ہی وہ اسی کالے گدلے پانی میں اپنے ہاتھ ڈبوتی ہوئی اٹھ کر اندر بھاگ گئی۔

چند لمحوں بعد ہی شانتا دروازے میں دکھائی دی۔ وہ غالباً چولہے کے پاس سے اٹھ کر سیدھی باہر کو دوڑ آئی تھی۔ مٹی پر جھوٹے رنگ کی ایک میلی سی تنگ دھوتی جو گھٹنوں تک چڑھی ہوئی تھی۔ کمر کے گرد مضبوطی سے کسا ہوا کاشٹا جس سے رانوں کا بیشتر حصہ کھل گیا تھا۔ سر پر ساتیل کے کھچڑی بال جو سر پر اوڑھے پھٹے پلو کے چھیدوں میں سے باہر نکلے پڑ رہے تھے۔ چہرہ آگ کی تمازت سے تپتا ہوا۔ جسم کے بعض حصوں پر آگ سے جلنے کے داغ، پسلیوں پر جھاڑ جھنکار گھاس پھوس کی خراشوں کے بلے جلے نشان، جیسے گرگٹ کی پیٹھ پر ہوتے ہیں۔ وہ سوکھی ٹہنیوں جیسے خشک ہاتھوں کو اپنے کمر پر رکھے دروازے میں کھڑی تھی مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے سوکھے چہرے پر رونق آگئی۔ تپاک سے بولی۔

"آجا — آجا — میں کبھی تیا نہیں اس سال بھی آتا ہے کہ نہیں۔ گھر سے کب چلا تھا؟"

"اس سال تو آنا ہی تھا۔ چار سال سے ناغہ ہو رہا تھا۔"

"ہاں — چار سال ہو گئے تجھے دیکھے ہوئے۔ سوچ رہی تھی کہیں اس سال بھی کوئی بہانہ نہ کر دے۔"

میں مسکرا دیا۔ ہاتھ پاؤں دھونے کے لئے دروازے میں آیا۔ کچی مٹی کے مکانات ٹیکریوں کی طرح ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر خیال ہوا جیسو کے سروں جیسے ان مکانوں میں لوگ جیو مٹوں ہی کی طرح لیتے ہوں گے سے جاسے۔

منہ ہاتھ دھو کر میں اندر گیا۔ دروازے سے دہلیز پار کر کے جوں ہی اندر قدم رکھا، کھٹ سے دہلیز کی چوکھٹ کا اوپری حصہ سے ٹکرایا اور میرا سر جھن جھنا کر رہ گیا۔

"جھک کر۔ ذرا سنبھل کر۔ جھک کر۔ دروازے میں یوں گردن اٹھا

ر داخل نہیں ہوتے ۔"

عرصہ ہوا میں گاؤں کے مکانوں میں داخل ہونے کا دستور بھول چکا تھا۔ اِن گھروں کی نسا دروازوں میں گردن جھکا کر ہی داخل ہوا جاتا ہے۔ ماتھے کو رگڑتے ہوئے میں نے اپنے جھولے سے تولیہ نکالا اور منہ ہاتھ پونچھنے لگا۔ پونچھتے پونچھتے جب میں نے ذرا سا گردن گھما کر اس دروازے کو دیکھا تو مجھے دروازہ مندر کے اندر والے دروازے کی طرح ایک دم پست اور چھوٹا لگا۔ دھیر کی جو کھٹ کے لئے یہاں اونچی لکڑیاں تک دستیاب نہیں۔ اسکیموں لوگوں کے مکانوں کی طرح چھوٹے چھوٹے پست قد دروازے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ پتا نہیں کیوں کر جی لیتے ہیں یہ لوگ۔

سر میں اب بھی تھوڑی تھکاہٹ ہو رہی تھی۔ لکشمی بنئے کی دکان سے چائے کی پتی اور شکر لے آئی تھی۔ شانتا نے چولہے پر ایک پرانی پتیلی میں پانی رکھا اور چولہا سلگانے لگی۔ سوکھے ڈنٹھلوں اور اُپلوں کے دو چھوٹے ٹکڑوں سے وہ چولہے میں آگ دینے کی کوشش کر رہی تھی نا ہیں ان میں سے کسی پھیر میں ہی تھی کہ پورا برانڈا دھوئیں سے بھر گیا۔ برانڈے کے دروازے کے پاس ہی کمبل بچھا کر میرے لئے بیٹھک سا دی گئی تھی۔ میں اسی گھبراتے دھوئیں میں وہاں بیٹھ گیا۔ شانتا نے کپ ساسر نکالی۔ چار برس پہلے بھی یہی کپ اور ساسر تھی۔ اب ان کا رنگ میلا ہو گیا تھا۔ ساسر کی کیتلی الٹی تھی۔ چار برس پہلے بھی دھوئے ہوئے کالے موٹے کپڑے سے شانتا نے چائے چھانی اور اس کپڑے کو اسی طرح دوبارہ برتن میں ڈال دیا۔ اسی چائے کی پتی کو بار بار کھولا کر چائے بنانے کی اس کی پرانی عادت غالباً اب بھی قائم تھی۔ چائے سے کپ چھلک چکا تھا اور ساسر بھی لبالب بھر گئی تھی۔

"لے۔ چا۔ پی۔"

اس نے دونوں ہاتھوں سے کپ ساسر کو تھاما اور میرے سامنے لاکر رکھ دیا۔

"امی جائے، یہ جو ساسر کی چائے ہے یوں گولس۔ لکشمی تو کپ کی چائے پی لے۔"

میرے پاس خاموش بیٹھی ہوئی لکشمی نے کہا۔ وہ شرما کر بھوئی ٹرنی ہوگئی۔

"نہیں مجھے نہیں چاہیے۔ میں چا نہیں پیتی۔"

اس نے چوٹھے میں پھونکتے ہوئے کہا۔ پتا نہیں لکشمی کیوں شرما رہی تھی۔ مگر مجھے اس کا شرمانا اچھا لگا۔ مجھے لگا جیسے اُن سیدھی سادی عورتوں کے نزدیک خاطر داری کا یہ بھی ایک طریقہ ہو۔

"شانتا، کپ کی چائے تو پی لے۔"

"ارے اپلے۔ جھیکل کے کان جتنا تو کپ ہے۔ کیا اتی چا سے ہی پینے لگا۔"

نہیں شانتا، یہ بہت زیادہ ہے۔"

"چار چھ برس کے بعد ایک بار تو آتا ہے۔ بس یہ اتی چا بھی پینے کا۔ چا اور بھی ہے۔ تو پوری پی لے۔"

شانتا ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ میں اس کی خوشی کا خیال کرتے ہوئے چائے پی رہا ہوں۔ اس کا خیال تھا جیسے ناشتہ کھانا پیٹ بھر کر کھایا جاتا ہے ویسے چائے بھی چھک کر پیا جانا چاہیے۔

چائے پینے کے بعد میں لکشمی سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ وہ ہر سوال کا جواب صرف "ہوں"، "ہاں"، "نہیں" دیتی اور چپ ہو جاتی وہ بار بار ملا وجہ شرما رہی تھی۔ بیچ بیچ میں شانتا سے بھی باتیں ہوتی رہیں۔ گھنٹے بھر بعد دونوں رسوئی میں چلی گئیں اور شام کے کھانے کی تیاری میں جٹ گئیں۔

"آج شمی دلہے کھانا تیار ہونے تک ذرا مندر کا چکر لگا آ۔"

شانتا کی آواز آئی۔ میں نے سوچا چلو اسی بہانے اُس گھٹن سے باہر نکلنے کا موقع مل گیا۔ میں فوراً تیار ہو کر باہر نکل آیا۔

گاؤں میں بجلی آ گئی تھی۔ دور سڑک کے کنارے پر ایک بجلی کا کھمبا دکھائی دے رہا تھا جس میں لگا ہوا گول لالٹین مریضانہ قسم کی روشنی پھینک رہا تھا۔ مگر بیشتر گھروں میں مٹی کے تیل کے دیئے ہی جل رہے تھے۔ بعض مکان تو اب بھی اندھیرے میں غرق تھے۔ بجلی گاؤں میں آ گئی تھی مگر گھروں میں بجلی لینے کے لئے لوگوں کے پاس روپیہ نہیں تھا۔ گاؤں اور گاؤں والوں کی حالت دیکھ کر لگتا تھا اس گاؤں میں ابھی سکے کا رواج شروع ہی نہیں ہوا ہے۔ سوکھے سا کھے چہرے، میلے ہوئے ہاتھ پاؤں۔ کوکنی میں لقش کے لوگ اپنے اپنے گھروں کے دروازوں و سائڈوں میں کھوئے کھوئے چپ چاپ بیٹھے دکھائی دے رہے تھے۔ کولہوں میں بھیسی لنگوٹیاں باندھے مرد ننگی ناکوں والے ننگ دھڑنگ علیل بچے سردی کے دن تھے مگر اُن کے ننگے جسموں پر گویا موسم کا کوئی اثر ہی نہیں تھا۔ سونڈل کے بلّوں کی طرح ادھر سے اُدھر بھاگتے ہوئے کوئی کھیل کھیل رہے تھے۔ ماروتی کا مندر شاہ تھا۔ مندر کے قریب ہی پیپل کے پاس ایک بجلی کا لٹو جل رہا تھا۔ وہیں گھٹنے سیوں میں سکوڑے کچھ لوگ بندروں کی طرح بیٹھے تھے۔ بیچ بیچ میں چلم بھی چل رہی تھی۔ دن بھر کی تلخی اور جسم کی کڑواہٹ کو زائل کرنے کے لئے چلم کے کش لگا رہے تھے جس سے منہ مزید بدمزہ ہو رہا تھا۔ میں خاموشی سے مندر میں داخل ہوا۔ ماروتی کو نمسکار کیا اور بھاری قدموں کے ساتھ واپس آ گیا لگتا تھا گاؤں کی آبادی چار برس پہلے جتنی تھی آج بھی اتنی ہی ہے۔ بھوک اور فاقوں نے عورت اور مرد کی قوت افزائش کو بھی متاثر کیا ہے۔ عورتوں کو تین تین چار چار برسوں میں بچے ہوتے اور جو ہوتے وہ بھی ناقص نگہداشت کے سبب کسی نہ کسی بیماری سے مر جاتے۔ نہ پیٹ میں روٹی نہ تن پر کپڑا۔ وقت پڑے پر مناسب دوا دارو بھی نہیں۔ ایسی صورت میں اُن کے زندہ رہنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔

میں اندھیرا گہرا ہونے سے پہلے مندر سے لوٹ آیا۔ ہاتھ پاؤں دھو کر کھانے کے لئے بیٹھا۔ ایک پیتل کی تھالی میرے آگے کی گئی۔ باپ کے وقت کی اس پر رکھ دی گئی تھی۔ شانتا نے کھانا پروسا۔ باپ تقریباً چالیس برس پرانا ہوگا۔ جس کا نیل ختم ہو چکا تھا مگر شانتا کے گھر میں وہ اب بھی آثارِ قدیمہ کی کسی نایاب تختی کی طرح نہ صرف رکھا ہوا تھا بلکہ اس کا استعمال بھی ہو رہا تھا گویا اس گاؤں کے گھر گھر پھیلے اندھیرے کو ناپنے کا وہ ایک مخصوص پیمانہ ہو۔

تھالی جس میں کھانا پروسا گیا تھا۔ بیسیوں جگہ سے دبی پچکی ہوئی تھی۔ شانتا کے ہاتھ کی روٹیاں ہتھیلیوں جتنی موٹی اور توے جتنی چوڑی تھیں۔ تین روٹیاں موڑ کر اس نے تھالی میں ایک طرف کو رکھ دی تھیں۔ تھالی کے بڑے حصے میں تور کی دال سرخ مرچوں والی آمٹی تھی اور باقی تھالی بھات سے بھری ہوئی تھی۔ عام طور پر اتنا کھانا میرے لئے دو تین روز کے لئے کافی ہو سکتا تھا۔ چنانچہ کٹوں لب بھرا ہوا ایک گلاس بھی اس نے لاکر رکھ دیا۔ میں اس کی ایک ایک حرکت دیکھ رہا تھا۔ جب سب چیزیں پروس چکی تو بولی۔ "دوپہر سے تھکا ماندہ آیا ہے۔ پیٹ بھر کر کھانا کھا۔"

وہ اپنی عادت کے مطابق جی جان سے میری خاطر کر رہی تھی شانتا میری بھوک کا موازنہ اس کسان کی بھوک سے کر رہی تھی جو دن بھر کھیت میں سخت محنت کرنے کے بعد کسی وجہ سے دوپہر کے کھانے سے محروم رہ جائے اور شام کو بے اختیارانہ روٹیوں پر ٹوٹ پڑے میں نے بڑے سکون لہجے میں کہا۔

"شانتا ایک ادھ تھالی بھی تو دے دے۔"

"اب تھالی وقالی کس لئے۔ دوپہر سے بھوکا ہے۔ تکلف مت کر پیٹ بھر کھا۔ اس گھر میں آدھا پیٹ کھانے کا رواج نہیں ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے شانتا، یہ کھانا تو میری تین چار دن کی خوراک ہے۔ تیرے گھر میں تکلف کیسا۔ مگر میں اس کا ایک چوتھائی بھی نہیں کھا پاؤں گا۔ شہر گاؤں میں رہتے ہوئے میری بھوک ہی ختم ہو گئی ہے۔"

میرے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا لیکن پھر بھی اصرار کرتی رہی۔ مگر میرے بہت کہنے سننے پر آخر دونوں مان گئیں۔ مگر ان کے گھر میں مزید تھالی کہاں تھی۔ تھالی کے نام پر مٹی کی دو سینیاں بڑھا دی گئیں۔ میں نے اُنہیں میں بھات اور روٹیاں نکال کر رکھ دیں۔

"اب تم لوگ بھی کھانا کھا لو۔"

"نہیں رے بابا، برسوں بعد اس گھر میں کسی مرد نے کو کھانا پروسنے کا موقع ملا ہے۔ تیرا ہاتھ دھلانے کے بعد ہم کو کھائیں گے۔ تو پہلے کھا لے۔"

مجبوراً میں نے کھانا شروع کیا۔ روٹی کا پہلا نوالہ توڑ کر آمٹی میں ڈبویا اور جوں ہی آگے منہ میں رکھا ایسا لگا جیسے منہ میں چنگاریاں سی بھر گئی ہوں۔ آمٹی بے حد تیکھی تھی۔ پہلے لقمے کے ساتھ ہی ہچکی آ گئی۔ ہچکی آئی اور پھر آتی ہی چلی گئی۔ پانی پیا۔ پانی پینے کے بعد بھی کمبخت رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

"شانتا، تھوڑا سا گڑ دے۔ ہچکی۔"

"کیوں رے، آمٹی تیکھی ہے کیا؟"

"نہیں آمٹی تیکھی نہیں ہے دراصل تیکھا کھانے کی عادت میری چھوٹ گئی ہے نا۔"

میں نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔

"دستا، یہ سب شہر گاؤں کا اثر ہے۔ ابھی برکت سے جی کر کیسا چلے گا رے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے گڑ کی ڈلی دی۔ میں نے اُسے منہ میں ڈالا اور چھاچھ کے ساتھ آمٹی اور بھات حلق سے اتارنے لگا۔ تھالی کا کچھ ناپ جاتا تو شانتا اور بھی خوش ہوتی۔ میں نے پانی کے گھونٹ لے کر تھالی کا سارا بھات ختم کر دیا۔ البتہ آمٹی خاصی بچ گئی۔

رات میں نیند بھی ٹھیک سے نہیں آئی۔ ویسے شانتا نے بچھونا

کے مطابق میرے بستر کو کافی آرام دہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ نیچے ایک دری بچھا کر اس پر ایک نرم گدڑی ڈال دی گئی تھی اور اوڑھنے کے لئے ایک دوسری گدڑی پاس پڑی تھی۔ دونوں ماں بیٹی ایک چٹائی پر الگ سے چادر بچھا کر ایک طرف کو لڑھک گئی تھیں۔ کچھ دیر میں اُن کے میٹھے خراٹے سنائی دینے لگے۔ وہ تو سو گئیں مگر مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ بستر میں کوئی نئے کھٹمل ... تھی شانتا نے بارود کے عسل خانے میں دو تین دیگیاں بھاپ کے نیچے اٹھا کر رکھی تھیں۔ غالباً اُن ہی خوشبو اور بسو گرد اڑ کر ... تھے پورے جسم میں رہ رہ کر کھجلی ہو رہی تھی میں آنکھیں کھولے پڑا رہا۔ گاؤں پر ایک عجیب خاموشی طاری تھی کہیں سے کوئی آواز نہیں۔ میں رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔

صبح ہوئی۔ چھاؤ تیج کا دن طلوع ہوا۔ شانتا نے المونیم کے ایک بڑے سے تسلے میں پانی گرم کیا تھا۔ مارچ کا موسم ... میں ختم ہوا تھا۔ ندی کا ... لالا پانی خوب تپایا گیا تھا۔ میں نے چولہے کے جلتے ہوئے ... رات کا ... منہ دھویا اور غسل کے لئے بیٹھا۔ گرم پانی ... کر دو تین بالٹی پانی تیار کیا گیا تھا۔ میں نے کہا۔

"اب تم لوگ جاؤ میں نہا لوں گا۔"

"ایسے کیسے نہا لے گا۔ چھاؤ تیج کا غسل ہے۔ تیری مالش ہو گی۔ کپڑے اتار۔"

لکشمی تیل گرم کرے شانتا کا لہو ... کی حرارت سے تپا ہوا تھا۔

لکشمی تیل گرم کرنے اندر چلی گئی۔ مجھے صرف ایک چڈی پر غسل کے لئے بیٹھنا پڑا۔

اچانک کچھ سوچ کر میں نے بلند آواز سے لکشمی کو مخاطب کیا "لکشمی! تیل زیادہ گرم مت کر۔ مجھے ٹھنڈا تیل ہی اچھا لگتا ہے۔"

لکشمی کنکنا تیل لے کر باہر آئی اور دونوں ماں بیٹی میرے دونوں طرف کھڑی ہو گئیں۔ ہاتھ پاؤں، سر اور پیٹھ پر چپا چپ تیل چپڑ کر اس زور سے میری مالش کرنے لگیں کہ میری ایک ایک ہڈی چٹ چٹ بولنے لگی۔ شانتا نے سر پر بھی تیل ڈالا اور دونوں ہاتھوں سے گھسا گھس سر کی مالش کرنے لگی۔ میں بھی بند آنکھیں کئے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ ان کے یہاں کا یہی معمول تھا۔ سوچا۔ جو کرتے ہیں کرنے دو۔ اب اگلے تین چار برسوں تک کون آتا ہے۔ جب میں تیل اور پسینے میں چپچپا گیا تب شانتا بولی۔

"دستا! یہ کیا ہے رے! تیرے سر کے بال تو جھڑ رہے ہیں۔ کوئی دوا دارو کیوں نہیں کرتا ... اچھا نہیں ہوتا۔ تھوڑے دن میں تو بالکل ہی گنجا ہو جائے گا۔"

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ میرے سر کے لگ بھگ آدھے بال اکھڑ کر شانتا کی دونوں ہتھیلیوں اور انگلیوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ پیٹ میں عجیب سا ... پیدا ہو گیا۔ ... کر کے ... چپ چاپ بیٹھا رہا۔ لکشمی بھی میرے بازوؤں اور پیٹھ پر تیل کی مالش کر رہی تھی۔ ٹھنڈی چھاؤں میں پلا ہوا میرا کپاس جیسا نرم اور پلپلا بدن ایک عرصے بعد ان دونوں کے ہاتھ لگا تھا۔ وہ اسے رگڑ رگڑ کر ایک ہی دن میں پتھر جیسا سخت بنا دینا چاہتی تھیں۔ اپنے کھردرے ہاتھوں کے مضبوط لمس سے انہیں تو اس میں جان پھونک دینا چاہتی تھیں۔ ان کے اوبڑ کھابڑ ہاتھوں میں سختی تھی مگر اس سختی میں بھی ... محبت کی رو بھی تھی ... مگر پاکیزہ محبت سے میرا رواں رواں بھیگ گیا۔ ... محبت کی خاطر میں سب کچھ برداشت کر سکتا تھا۔ کڑک دھوپ، تپتا ہوا پانی۔ انہوں نے میرے جسم کو میرے اپنے لائے ہوئے صابن سے کسی ڈھور کی طرح رگڑ رگڑ کر دھویا مگر تیل اس قدر چپڑا ہوا تھا ... دھونے سے بھی بدن پر چکنائی پوری طرح اتر نہیں سکی۔

انہوں نے ایک مٹی کی چار پائی ... کر کے میرے لئے چھاؤ تیج کی تھالی تیار کی۔ میں اس پر ... بیٹھ گیا۔ اور شانتا سے بولا۔

"شانتا اب سب سے پہلے ایک پیالی چائے ... اس کے بعد آرتی کرو گی۔"

"اچھا، اچھا۔ شانتا ... مجھے چائے کی سخت طلب ہے۔"

شانتا ... آرتی ہوئی چائے تیار کر رہی تھی۔ تب لکشمی نے آرتی کی تھالی ... اور اس میں ... رکھ اور مٹی ... جلا کر دیا۔ چھاؤ تیج کی پوری تیاری ہو گئی تھی۔ میں چائے پیتے پیتے سب دیکھ رہا تھا۔ شانتا باتیں کرتے کرتے آرتی کی تھالی سجا رہی تھی۔ میں ... چائے پی رہا تھا۔ پھر اس نے آرتی کی تھالی اٹھائی اور میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ ایک ہاتھ سے ... اپنے آنچل کو سر پر ... رہا تھا۔ اس نے پہلے تلک لگایا سر پر چاول کے دانے ڈالے اور میرے چہرے پر سے آرتی اتارنے لگی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پیسوں کا پاکٹ جیب میں نہیں تھا۔ پاکٹ غالباً میرے بیگ میں رہ گیا تھا۔ میں نے شانتا کے لئے نو واری ایک ساڑی خریدی تھی۔ لکشمی کے لئے ایک ... اور ... بھی تھا۔ ... دیئے تھے۔ کچھ نقدی آرتی کے وقت تھالی میں بھی ڈالنی تھی اور میری ساری چیزیں اسی بیگ میں پڑی رہ گئی تھیں۔ میں نے سوچا آرتی کے درمیان اٹھنا ٹھیک نہیں ہے۔ جب آرتی ختم ہو جائے گی تب اٹھ کر وہ سب چیزیں ان کے حوالے کر دوں گا۔ مگر میرا تعلیم یافتہ ذہن جو کچھ سوچ رہا تھا وہ ریت رواج کے مطابق نہیں تھا۔ لیکن میں اس وقت اس کے علاوہ اور کیا سوچتا۔ شانتا آرتی اتارتے ... بدبدا رہی تھی ... بلا ... آئے ...

میری آنکھوں کے سامنے آرتی کی تھالی پھرتی رہی۔ اس کی آنچ میں اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا۔ چار پانچ دفعہ تھالی گھوم چکی۔ پھر بھی تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ پھرتی رہی، پھرتی رہی۔ شانتا کی بدبداہٹ جاری تھی۔ ...

... اس کی تھالی ختم ... میں اٹھ پا رہا تھا۔ بالآخر مجبوراً میں نے ہمت کر کے کہا۔ "شانتا! در اصل ... میں چھاؤ تیج کا نذرانہ لایا ہوں وہ تھیلی ہی میں رہ گیا ہے۔" میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہو گیا مگر شانتا کی آرتی کی تھالی دیکھتے دیکھتے اب بھی اوپر نیچے گردش کر رہی تھی۔ اس کا جاپ بھی زیر لب جاری تھا۔ آرتی کی تھالی کا رکنا اس میں کچھ حرارت پڑا شاید اسے کھانا آتا ہے۔ اس لئے اس نے تھالی کی گردش جاری رکھی۔ آخر میں نے چھاؤ تیج کا لفافہ ڈال دیا۔ لکشمی اپنی بڑی بڑی آنکھوں کے سامنے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ شانتا تھالی اور ... لے کر چلی گئی اور پکوان کے سامنے تھالی رکھ کر واپس آئی۔ اس کے چہرے پر ایک ... طمانیت کی جھلک صاف دیکھی جا سکتی تھی۔

اب دیوالی کی مٹھائی پروسی جانے لگی۔ تھالی میں جب کرجیاں ڈالی گئیں تو ایسا لگا تھالی میں مٹی کے سخت ڈھیلے ڈالے جا رہے ہوں۔ ... ساندگا، شانتا کے ... دیوالی کا پکوان تھا اس نے ... کر ... سا بنایا تھا۔ بس مارہ لونڈی کے لڈو بھی بنانے کی کوشش کی تھی مگر وہ چٹخ گئے تھے۔ اس نے تھالی میں لڈو کے نام پر اسی چورے کو ڈالتے ہوئے کہا "لے جلدی میں لڈو بھی ٹھیک سے نہیں بن سکے۔"

میں نے ... ہوئے لڈو اس کے حوالے کئے۔ انہیں دیکھتے ہی بولی۔

"دیکھو یہ کیسے مٹی کے ڈھیلوں کی طرح انہیں گوندھ کر بنایا ہے۔ میرے ہاتھوں میں تو کس ہی نہیں ہے۔"

برآمدے میں بیٹھ کر کھانا کھاتے کھاتے میں نے باہر نگاہ ڈالی جھاڑ کے نیچے بندھا ہوا بوڑھا بیل کل دن ڈوبتے جس طرح بیٹھا تھا آج بھی ویسا ہی بیٹھا ہوا دکھائی دیا۔ مکھیاں اسی طرح بھنبھنا رہی تھیں۔ اس کے ... کے نیچے گوبر بھی اسی طرح پڑا ہوا تھا۔ تھکا ہارا ہونے کے بعد بھی اس نے اٹھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

"شانتا! لگتا ہے بیل تھک کر بالکل ہی ڈھانچہ ہو گیا ہے۔"

"بوڑھا ہو گیا ہے وہ۔ اب اس میں کوئی دم نہیں ہے۔"

"پھر اسے رکھا کیوں ہے؟"

"تو کیا بیچ دوں۔؟ میرے 'دالیا' کے ہاتھوں کا بیل ہے وہ۔ اسے بیچنا اپنے دالیا کو بیچنے جیسا ہے۔ کھیت سے تھوڑا سا چارا آ جاتا ہے۔ جب تک زندہ ہے کھا کے پڑا رہے گا۔ موت آئے گی تو گردن ٹیک دے گا۔"

شانتا کا سوچنا بڑا ہی ٹھیک اور درست تھا۔ میں نے اس کے جذبے کو ٹھیس پہنچانا مناسب نہیں سمجھا۔ اس لئے چپ رہ گیا۔

شانتا نے جو کرجیاں (گجوریاں) بنائی تھیں۔ اوپر سے تو سخت تھیں مگر اندر سے ان میں خوب مسالہ بھرا ہوا تھا۔ میں کرجیاں کھاتے ہوئے جھاڑ کے نیچے بیٹھے بیل کی پرلی طرف دیکھنے لگا۔

گاؤں کے مرد اور عورتیں حسب معمول ندی سے پانی لا رہے تھے۔ چھاؤ تیج گاؤں تھا اس کے ... تو اکثر مرد عورتیں ندی پر ہی غسل کر کے اپنے موٹے جھوٹے کپڑے دھو کر کاندھے پر ڈالے چلے آتے تھے۔ ان کے سروں کا مٹکوں اور کمر پر پانی سے بھرے برتن تھے۔ ندی کافی فاصلے پر تھی۔ اتنی دور سے پانی لا کر گھر میں گرم کر کے غسل کرنا ان کے لئے کافی جھنجھٹ کا کام تھا۔ اسی لئے ندی ہی پر ٹھنڈے پانی سے نہا کر چھاؤ تیج کا تہوار منانا ان کے لئے زیادہ آسان تھا۔ بیشتر لوگوں کے چہروں پر تہوار کا کوئی جوش نہیں تھا۔ لگتا تھا جیسے مہابھارت کے پانڈو بن باس میں دیوالی منا رہے ہوں۔ شانتا اور لکشمی اس منحوس گاؤں سے نکل پائیں گی کبھی؟ یہ سوچ کر میرا دل ...

ایک نامعلوم اداسی سے بھر گیا۔

مجھے ایک گھنٹے کے اندر اندر روانہ ہونا تھا میں نے بات چھیڑی۔

"شانتا! تیری آدھی سے زیادہ تو عمر یہاں نکل گئی۔ اب اس گاؤں میں کیا رکھا ہے۔ یہ سب کسی کو بیچ باچ کر میرے ساتھ چل۔ وہاں باپو کا گھر ویران پڑا ہے۔ اس کی جھاڑ پونچھ کر کے وہیں پڑی رہ۔ ہم بھائی لوگ بھی تیری مدد کیلئے موجود ہیں۔ وہاں تجھے کام بھی مل جائے گا۔"

"مارے بابا! آدھی چھوڑ کے ساری کے پیچھے بھاگوں گی تو رہ آدھی رہے گی نہ ساری۔ تو ہے ٹھیک ہے میں اسی میں خوش ہوں۔"

"مگر یہ بستی تو بڑی اجاڑ ہے۔ رام راون کے زمانے میں جیسی رہی ہوگی ویسی ہی آج بھی ہے۔ ذرا بھی ترقی نہیں ہوئی یہاں۔ لوگ بندروں جیسے اور مکان کھنڈروں کی مانند۔"

"دوستا! ہمارا جنم انہیں لوگوں کے بیچ میں گزرا ہے رے۔ تو اس گاؤں میں جا کر بڑا پڑھ لکھ کر آدمی ہو گیا ہے۔ تیری بات الگ ہے۔ تو کہیں بھی رہ سکتا ہے۔ مگر ہم تو ایسا نہیں کر سکتے۔ قسمت نے تو کچھ دیا ہے اسے مٹایا نہیں جا سکتا۔ جس گائے کا دودھ پیتے ہیں اس کے گوبر پر ناک بھوں چڑھانا ٹھیک نہیں۔ گاؤں کے اتنے سارے لوگ یہاں رہتے ہیں پھر مجھے ہی کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔ گاؤں گندہ ہے، چھوٹا ہے مگر گاؤں کے لوگ کھلے من کے ہیں چاہنے والے ہیں۔ ان سب کو کیوں کر چھوڑ سکتی ہوں میں۔ جیسا بھی ہے اپنا گھر ہے۔ باغ ہے۔ باغ میں چار جھاڑ ہیں۔ پھل پھلواری نہیں دیتے مگر بیٹھنے کے لئے چھاؤں تو ہے۔ جڑیں بہت گہری ہیں وستا! انہیں اکھاڑنا آسان نہیں۔ میں یہاں بہت مزے میں ہوں۔ کبھی کبھی ادھر آ جا رہ۔ تیرے آنے سے لگتا ہے پیارا پورا میکا میرے پاس آ گیا ہے۔ اچھا لگتا ہے۔"

اس کی آواز بھیگ گئی۔ جیسے اس کے بہت بھیتر کہیں کچھ پگھل رہا ہو۔ لکشمی اپنی ماں کی پرچھائیں کی طرح چپ چاپ بیٹھی تھی۔ میرے آنے کی خوشی کہ وہ اپنے میکے آئی تھی۔ مگر وہ زیادہ تر خاموش ہی رہی۔ اپنا ماموں صاحب ہے یہی بات اس کیلئے اطمینان کا باعث تھی۔ اور وہ اسی میں خوش تھی۔ ماموں کو نظر بھر کر دیکھنے میں اسے ایک گونہ مسرت کا احساس ہو رہا تھا۔ میں بھی چپ ہو گیا۔

ماں بیٹی کے بہت انکار کرنے کے باوجود میں نے دس روپے کا ایک نوٹ لکشمی کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ اور سائیکل باہر نکالی۔

"اب اجازت دو۔"

"اگلے سال بھی اسی طرح آ جانا۔ گھر میں سب سے کہہ دینا یہاں سب کشل منگل ہے۔"

"اچھا۔" میں سائیکل پر سوار ہو گیا۔

"گاؤں کے لڑکے مجھے اور میری سائیکل کو ایک عجوبے کی طرح دیکھ رہے تھے۔ میں گاؤں کے باہر نکل کر سڑک پر آ گیا بستی گاؤں کی جانب بڑھنے سے پہلے میں نے مڑ کر گاؤں پر ایک الوداعی نگاہ ڈالی۔ وہی مٹی کے کچے مکانات، وہی بڑا سا پتھر بلا میدان جس میں دور تک کوئی متنفس دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سوکھے مارے درخت، اور ندی کے کنارے ہرے بھرے سبزی کے کھیت۔ کھیتوں کے ایک طرف اونچی نیچی کالی چٹانوں کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے ہزاروں برس پہلے وجود میں آنے والی یہ چٹانیں کبھی کبھی انسانوں کا روپ دھار کر گاؤں کی گلیوں میں پرچھائیوں کی طرح چل پھر رہی ہیں۔ گاؤں کے لوگوں میں اور ان چٹانوں میں کچھ ایسی ہی مماثلت تھی۔ ابھی اس قطعۂ زمین کا آدی واسی ختم نہیں ہوا ہے۔

مجھے لگا میں صرف شانتا کا نہیں اس پورے گاؤں کا مہمان تھا۔ اب واپس لوٹ رہا ہوں۔ نئے ترقی یافتہ سنسار کی جانب اس گاؤں کو چھوڑ کر۔ جس میں میرے اپنے موجود ہیں۔ جن کا وجود میرے وجود سے الگ ہو کر بھی الگ نہیں ہے۔ البتہ ایسا لگا میرے وجود کا ایک حصہ پیچھے رہ گیا ہے یا بچھڑ گیا ہے۔ اور میں آگے بڑھ رہا ہوں۔ بچھوں کر میں تعلیم یافتہ ہوں۔ لیے اکیسویں صدی میں قدم جو رکھنا ہے۔

بقیہ صفحہ ۱۶ پروفیسر مجتبیٰ حسین

نہیں تھے۔

جوشؔ پر ان کے خط نما مضمون کا ذکر ضروری ہے اس لیے کہ مجتبیٰ بغیر جوشؔ کے حوالے کے رہ نہیں سکتے یہ نہیں کہ ہر وقت وہ جوشؔ کی شاعری کا ذکر کرتے ہوں مگر انھیں اندازہ تھا کہ جوشؔ کا مقابلہ سر ڈاکٹر محمد اقبال سے بہت کیا جاتا ہے اور اس کا خاص ذکر کیا جاتا ہے کہ جوشؔ کا کلام فلسفہ سے خالی ہے ——— وہ لکھتے ہیں ——— !

"——— یہ بھی صحیح ہے کہ کوئی ایسی فکر جس کا ڈانڈا مابعد الطبیعاتی فکر سے مل جائے ان کے یہاں نہیں ہے۔ لیکن فکر سے خالی ہو کر کوئی شاعر ایسی جیتی جاگتی تصویریں نہیں پیش کر سکے گا جو ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں فردوسی کے شاہنامے میں کون سی فکر ملتی ہے؟ ....... فردوسی کی فکر تہذیبی فکر ہے۔ اس کے کردار ایران کے تہذیبی کردار ہیں ... یہ کردار بھی ہیں اور شاعری بھی ہیں .... یہی تہذیبی فکر جوشؔ صاحب کے کلام میں ہے جو مابعد الطبیعاتی مسائل میں نہیں بلکہ اس برصغیر کے سینے پر چلتے پھرتے، لڑتے جھگڑتے عشق کرتے اور پھانسیوں کے تختے پر چڑھتے آدمیوں کی شکل میں ملتی ہے . .. شاعری یوں بھی کی جاتی ہے کہ آدمی ایک خیال ہے اور شاعری یوں بھی کی جاتی ہے خیال خود آدمی ہے جوشؔ صاحب کے یہاں مؤخر الذکر قسم کی شاعری ہے۔"

——— افسوس ہے کہ وہ جوشؔ کی شاعری پر کوئی کتاب نہ لکھ سکے ——— !

[۵]

آج اردو تنقید ہند و پاک میں بڑے دشوار گذار مرحلے سے گذر رہی ہے ہندوستان میں زبان کے بقا کا مسئلہ درپیش ہے یہاں بھی کوئی اہم نقاد نہیں ہے جس کے مضامین بڑے شوق اور غور و فکر کے منتظر ہوں پاکستان کا حال مجھے کم ہی معلوم ہے اس لیے میں نہیں کہہ سکتا کہ وہاں کا کیا حال ہے؟

اختر حسین رائے پوری سے محمد علی صدیقی تک اور کلیم الدین احمد سے وارث علوی تک کی کتابیں تنقیدی ادب کی جدید تاریخ مرتب کرتی ہیں اور میں سمجھتا ہوں اس میں ایک باب مجتبیٰ حسین کا بھی ہے۔

# دھنک رنگ

## مبارک انصاری

کل تک طوفان کی صورت جو جزر و مد میں تھا
آج وہ لمحہ ترے چہرے کے خال و خد میں تھا
سوچتا ہوں کس طرح حد سے تجاوز کر گیا
ایک سناٹا جو میری ذات کے مرقد میں تھا
یہ ترے قدموں کا تھا اعجاز جو ٹوٹا طلسم
ورنہ میں کھویا ہوا اس کائناتِ بد میں تھا
آج اس کے جسم میں سارا سمندر جذب ہے
وہ جزیرہ جو ہمیشہ پانیوں کی زد میں تھا
آرزوئیں اور تمنائیں بھی اپنے حد میں تھیں
اے مبارک جن دنوں میں جسم کی سرحد میں تھا

● محلہ سرہ پور، گورکھپور (یوپی)

## راوی اللہ والا

درپن دیکھا کرتا ہوں
کیا کیا سوچا کرتا ہوں
بادل برسا کرتے ہیں
میں بھی رویا کرتا ہوں
آنکھوں میں بینائی ہے
جلوے دیکھا کرتا ہوں
دنیا ایک پہیلی ہے
من میں بوجھا کرتا ہوں
رستوں میں کھو جاتا ہوں
گھر میں ڈھونڈا کرتا ہوں

● ماچ پور واسی والا کما دنڈ مکان نمبر ۲/۴۴۳ احمد آباد

## وقار طاہری

گھر میں قید رہوں لیکن خوشبو پا لیتی ہیں
رات گئے تک کچھ پریاں مجھ کو آ لیتی ہیں
چھپرے کی دیوار پہ بیٹھی دو پاگل چڑیاں
پہلے اگل دیتی ہیں موتی پھر کھا لیتی ہیں
دو آنکھیں مصروف تجسس کر لیتی ہیں مجھے
جانے کن نا نون بانون میں الجھا لیتی ہیں
میں قائم رہتا ہوں خس و خاشاک نہیں رہتے
لاکھ ہوائیں تیز سہی میرا کیا لیتی ہیں
بے خوابی سے خواب کا سودا کرتی ہیں یہ وقار
یادیں تو مٹی دے دے کر سونا لیتی ہیں

● ۹۹۰/۲۲۳۔ اے نالہ روڈ، حمس گنج، کانپور

## ملک زادہ جاوید

پرندے رہے رہ گزر میں سدا
بدلتے ہیں موسم سفر میں سدا
مری بے لباسی پہ مت مسکرا
نکلتے ہیں پتے شجر میں سدا
بلندی پہ نظریں جمائے ہوئے
وہ رکھتا ہے خود کو خبر میں سدا
کوئی وقت طے کر ملاقات کا
میں رہتا نہیں اپنے گھر میں سدا
نہ جانا ادھر تم کبھی دن ڈھلے
بھٹکتی ہیں روحیں کھنڈر میں سدا

● ۶۔ پروفیسر فلیٹس، ماہو گنج، لکھنؤ (یوپی)

## راشد احمد راشد

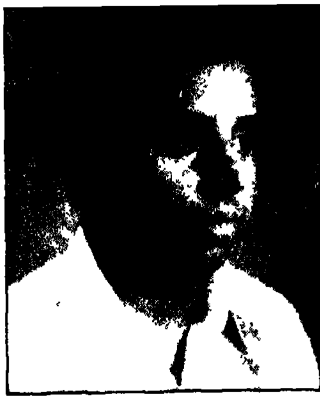
مہکتی رہتی ہیں دن رات یوں مرے گھر میں
ڈھلی ہوں جس طرح یادیں ہوا کے پیکر میں
نہ آنسوؤں سے مٹا ہے نہ مٹ سکے گا کبھی
جو حرف حرف لکھا ہے مرے مقدر میں
چرائے گا کوئی کیا در کھلا ہی رہنے دو
رکھا ہی کیا ہے غموں کے سوا مرے گھر میں
بظاہر آپ نے بے حس سمجھ لیا لیکن
چھپی ہوئی کئی چنگاریاں ہیں پتھر میں
نجانے کون سا موسم ہے ان دنوں راشد
کہ پھیلتی ہے سویرے سے تیرگی گھر میں

● مکان نمبر ۵۱۴-۱-۱۹، امڈا بازار، حیدرآباد (اے پی)

## خالد علوی

دیئے جلے ہیں مگر دور تک ہوا بھی نہیں
کسی کو پاسِ تعلق یہاں ذرا بھی نہیں
یہ آرزو بھی کہ ہر شام اپنے گھر جاؤں
یہ علم بھی کہ کوئی راہ دیکھتا بھی نہیں
وہ خواب جس سے مرے رتجگے عبارت ہیں
دوبارہ دیکھ لوں اس کو یہ سلسلہ بھی نہیں
اسی کے بوجھ نے مجھ کو پیمبری دی ہے
مرے وجود سے جو درد کچھ سوا بھی نہیں
چراغ جاں کو جلائے رکھو کہ باقی ہے
وہ قرضِ تیرگی اب تک ادا ہوا بھی نہیں

● اے۔ ۲۹۵، ڈیفینس کالونی، نئی دہلی




شبیر ہاشمی

۳۵۲، نیو وارڈ، مالیگاؤں (ناسک) ۴۲۳۲۰۳


# گمانے گشت

اٹیشن تک پہنچتے پہنچتے اُس کا دم پھول چکا تھا سارا بدن پسینے میں شرابور ہو چکا تھا گیٹ پر کھڑے کھڑے اُس نے ایک نظر ڈالی تو بکنگ آفس کے سامنے ہال میں انسانوں کا گھنا جنگل اُگا ہوا تھا۔ ٹکٹ لینے والوں کی لمبی لمبی قطاریں اُسی لمحہ سٹیشن تک پہنچنے کی ساری تھکن اُسے اپنے اندر رینگتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ مردہ قدموں سے چلتا ہوا ایک قطار میں کھڑا ہو گیا، ہر آدمی اپنی باری کا منتظر۔ ہاتھوں میں دبا ہوا چھوٹا سا بریف کیس اُس نے اپنے قدموں میں رکھا اور جیب سے رومال نکال کر پسینہ خشک کرنے لگا۔ گھڑی میں ۹ بجے ہیں چند لمحوں کا معاملہ اور بس والی لوکل نکل رہی ہے تو وقت پر آفس پہنچنا محال، اور آفس وقت پر نہ پہنچے تو پھر صاحب کی کرسی سے اس کی کرسی تک آگ کا دریا۔

"آدمی کو اب اتنا احساس بھی نہیں ہونا چاہئے۔ سروس کے ساتھ تو یہ سب لگا ہی ہوا ہے"

"میں نے تو ابھی کل ہی وعدہ کیا تھا کہ — لیکن حالات پر کس کا بس چلتا ہے"

"کتنے مسائل جھیلتے ہیں"

"مگر مجھے آج ہر حال میں وقت پر آفس پہنچنا چاہیئے۔"

"لیکن کس طرح، کیا ٹیکسی؟ ٹیکسی کے بارے میں تو سوچنا ہی فضول ہے۔ آج تو دوستوں سے نظریں چرانے کی اذیت سے بھی گزر رہا ہے"

وہ اپنی جگہ کھڑا کھڑا نے جیبی سے پہلو بدل رہا تھا۔

"سالا اب یہ سروس چھوڑ ہی دینی چاہیئے"۔ جھنجھلاتے ہوئے ذہن نے سرگوشی کی۔ "مگر روز روز کی یہ دوڑ بھاگ کوئی حد بھی ہے؟ اچھا خاصا آدمی کولہو کے بیل کی طرح"

"سروس چھوڑ دیں تو"؟

"مر نہیں جائیں گے! کیا ساری دنیا سروس ہی کرتی پھرتی ہے؟ پھر بھی کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا نا"

"بزنس!"

"بزنس تو یار اچھی چیز ہے۔ آزادی ہی آزادی اور پیسہ ہی پیسہ! کھلی فضا میں سانس لینے کا تجربہ کتنا دلکش ہوگا۔"

"لیکن بزنس کے لیے پیسہ تو —؟

"ہاں سالا سب رونا تو یہی ہے۔"

"چلو صاحب آگے بڑھو"۔ کسی نے پیچھے سے اُسے تقریباً دھکیلتے ہوئے کہا

"اوہ، ہاں۔" اُس نے دیکھا کہ آگے والے آدمی اور اُس کے درمیان کئی آدمیوں کی جگہ خالی ہو چکی تھی۔

"سوری!" اُس نے اپنے پیچھے والے آدمی کی طرف معذرت اچھال دی۔

"میری ہی طرح سب جلدی میں ہیں" اُس نے سوچا۔ قدموں میں پڑا اپنا بیگ اُٹھایا اور خالی جگہ پُر کرنے کے لئے لپک پڑا۔

"صاحب پورے ملک میں نوکر شاہی کی طرح پھیل چکی ہے"۔ اُس نے اپنے پیچھے والے آدمی کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

"اب یہی دیکھئے کہ یہ مانو ٹکٹ بانٹ رہا ہے یا خیرات تقسیم کر رہا ہے"

لیکن پیچھے والے آدمی نے اُس کی بات کا جواب دینا شاید ضروری نہیں سمجھا۔ اُس کا چہرہ سپاٹ، کھردرا، بے زار۔

وہ کھسیانا سا ہو کر آگے دیکھنے لگا

"جلدی کریں بھائی۔" اُس نے دبی دبی سی آواز میں بے ارادہ ہانک لگائی اب کوئی صورت نہیں مگر میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں نے تو پوری کوشش کی تھی کہ —

اُس کی بے چینی بڑھتی رہی۔

کھسکتے کھسکتے وہ کھڑکی تک پہنچ ہی گیا کھڑکی میں اُس نے ایک سو کا نوٹ ڈالتے ہوئے کہا۔

"ایک گرانٹ روڈ ریٹرن"

"دو روپے کھلے دیجئے صاحب" کھڑکی نے کہا

"کھلے پیسے تو نہیں ہیں"۔ اُس نے اپنی جیب ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"پھر ذرا بازو ہٹ جاؤ"۔ کھڑکی نے بڑی بے مروتی سے کہا

"چلو بھی جلدی کرو"۔ پشت کی جھنجھلاہٹ اُسے کھڑکی سے بھی زیادہ بے رحم معلوم ہوئی۔

اچانک اُسے یاد آیا کہ اُس نے بیگ میں ایک دو کا نوٹ بھی دیکھا تھا اُس نے بیگ میں جلدی جلدی جھانکا۔

چٹ چٹ کی ہلکی سی آواز پیدا ہوئی۔

اور وہ حیران رہ گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بیگ کو گھورنے لگا بیگ نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔

"کیا یہ بیگ میرا ہی ہے؟" اُس نے بیگ کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔

"بیگ تو میرا ہی ہے۔ وہی رنگ، وہی جگہ جگہ لگی ہوئی خراشیں"

"ہاں بیگ تو میرا ہی ہے"

"پھر یہ کاغذات کیا ہوئے؟" "اور یہ نوٹوں؟"

"کسی نے بیگ بدل تو نہیں دیا۔ یا بے خیالی میں میں نے ہی کسی اور کا بیگ اُٹھا لیا ہو لیکن وہ میری جانب سے کس کس طرح گیا کبھی یہ بیگ پیچھے والے کا تو نہیں؟"

اُس نے پیچھے دیکھا تو سارا منظر ساکت تھا۔ ہر چہرے سے حیرت چپکی ہوئی اور ہر آدمی اُسے گھور گھور کر مشکوک انداز سے دیکھ رہا تھا۔ وہ پسینے میں بہا گیا۔ اُسے سارے بدن پر چیونٹیاں سی چلتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ صورت حال کی نزاکت کا اندازہ کرتے ہی وہ بوکھلا گیا جھٹ پٹ بیگ بند کر کے وہ قطار سے باہر نکل آیا۔ اور تیز تیز قدموں سے ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف دوڑا۔ اُس نے ٹھیک اُسی وقت یہ محسوس کر لیا تھا کہ اُس کے قطار سے نکلتے ہی کچھ اور لوگوں نے بھی قطار چھوڑ دی تھی اور اُس کے پیچھے آنے لگے تھے۔

"تو کیا وہ مجھے لوٹ لیں گے؟"

اگر وہ واقعی مجھے لوٹنے کے لئے آ رہے ہیں تو پھر وہ مجھے جان سے بھی مار سکتے ہیں۔

میں نے اُن کا کیا بگاڑا ہے۔ یہ تو دیوانگی ہے۔

"ڈھیر سارے روپیوں کی نمائش تو کسی کو بھی دیوانہ بنا سکتی ہے" دوسری کس کی آواز تھی؟ اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھنا چاہا۔

"پیچھے مڑ کر مت دیکھو" اس طرح تم مشکوک بنتے جاؤ گے۔ اُسے اپنے اندر ایک گونج سی سنائی دی۔

"یہ تو نصیحت ہے؟"

"اوہ، جلدی کرو رے بیوقوف آدمی!"

یہ کون مجھے ہدایتیں دے رہا ہے۔ اُس نے کن انکھیوں سے اپنے پیچھے دیکھا تو ایک سایہ اُسی کی طرح تیز تیز چلتا ہوا دکھائی دیا۔

"یہ کون ہے؟ کیا میں کسی جال میں پھنس گیا ہوں۔ کسی کا آلۂ کار بن رہا ہوں"

"پیچھے کون ہے؟" اُس نے ایک دفعہ مڑ کر دیکھنا چاہا تو پھر سرگوشی ابھری۔

"مڑ کر مت دیکھو۔" لہجے میں کرختگی اور سرد مہری نے اُسے خوفزدہ کر دیا۔

"یہ کون ہے؟ میں کس جال میں پھنس گیا ہوں۔ پیچھے تو کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ گر پیچھے کوئی نہیں تو پھر وہ سایہ کس کا تھا؟

"میرا سایہ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن میرا ہی سایہ مجھے کس طرح ڈانٹ پھٹکار سکتا ہے۔"

اُس نے ایک ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور بیٹھتے ہوئے ڈرائیور سے کہا "سیدھے چلو"

"بگڑ گئے ابھی اور ایک گونج سی سنائی دی۔

بیگ اب تک اس کے ہاتھوں میں پھنسا ہوا تھا۔ ٹیکسی میں اس نے فرش پر رکھتے ہوئے ذرا سا حرج ہو رہا تھا۔ بیگ پر اس کی نگاہیں گڑی ہوئی تھیں۔ کیا واقعی یہ بیگ میرا ہی ہے۔" اور اگر بیگ میرا ہی ہے تو پھر اس میں سے ڈھیر سارے روپے کہاں سے آگ گئے۔ میرے آفس کے سارے کاغذات کیا ہوئے۔ بیگ ضرور کسی کے بیگ سے تبدیل ہو گیا ہے۔ لیکن — کس کے کہاں ؟ اسے یاد آیا کہ رات اس نے بیگ کھولا تھا اور سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔

"پھر یہ سب کیا ہے ؟ کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں ؟"

"نہیں خواب ہرگز نہیں — اور ، سارا روپیہ چوری کا ہوا تو — ؟"

وہ کانپ گیا

شاید اسی نے ذرا رم اس کے کھلے ہوئے بیگ میں اتنے سارے روپے کی مالش پر بھی کسی نے کچھ نہیں کہا۔ ایک ملازم نہیں۔

"کیا وہ سب گونگے تھے یا ان کی قوت گویائی سلب ہو چکی ہے کہ وہ صرف دیکھ تو سکتے ہیں لیکن ردعمل کا اظہار نہیں کر سکتے ؟"

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟"

تو پھر کیا وہ سب چور تھے ؟ یا ان کے ساتھی ؟ اسے یاد آیا کہ اس کے قطار سے نکلتے ہی کچھ اور لوگوں نے بھی قطار چھوڑ دی تھی اور اس کے پیچھے لگ گئے تھے۔ اس نے گھوم کر ٹیکسی کے پچھلے شیشے سے باہر دیکھا ایک ٹیکسی بڑی تیزی سے پیچھے چلی آ رہی تھی۔

"یہ لوگ اب تک میرا پیچھا کر رہے ہیں۔" وہ گھبرا گیا۔

"ڈرائیور ذرا تیز چلو بھائی" "تم تو بیل گاڑی ہانک رہے ہو۔"

"صاب آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ؟" ہم تو سترّ کی رفتار سے جا رہے ہیں"

اس نے ڈرائیور کی بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔

کیا وہ مجھے مار ڈالیں گے ؟

"اگر یہ بیگ ان کا ہے تو اسے واپس کرنے میں مجھے اعتراض کیوں ؟

"پھر میرا بیگ ؟

کیا وہ میرا بیگ بھی اتنی آسانی سے مجھے دے دیں گے ؟" اور اگر یہ بیگ ان کا ہے تو انہوں نے مجھے اسٹیشن پر ہی کیوں نہیں روکا ؟"

نہیں یہ بیگ ان کا نہیں ہو سکتا ، تو پھر کس کا ہو سکتا ہے"؟

"یہ بیگ میرا ہی ہے"

"تو پھر بھاگ کیوں رہے ہو"؟

"میں کہاں بھاگ رہا ہوں"

اس کا جی چاہا کہ ایک بار پھر ان لوگوں کا دیدار کرے کتنی باتیں بل میں آسان ہونے والی ہیں۔ اس نے سوچا کہ ٹیکسی میں بیگ کھول کر دیکھ لے مگر خالی نہیں اور ڈرائیور بھی تو — اس کی نیت خراب ہونے میں کتنی دیر لگے گی۔

"کہاں چلنا ہے صاب ؟ ڈرائیور کی آواز ابھری

"اوہ ! ہاں ! وہ چونک پڑا۔ کھڑکی سے پہلی مرتبہ باہر دیکھا تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ بہت دور نکل آیا ہے

"مجھے کہاں جانا چاہیے ؟"

ایک بار بیگ کو پھر سے دیکھنا بھی ضروری ہے۔

آپ نے بتایا نہیں صاحب — کہاں جائیں گے ؟" ڈرائیور کی آواز میں بے چینی تھی۔

"ہاں ، ہاں ، دیکھو وہ آگے پارک آ رہا ہے مجھے وہیں اتار دینا۔"

اس نے ایک بار پھر مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا ، پیچھے آنے والی ٹیکسی کا دور دور تک پتہ نہیں تھا اسے بہت خوشی ہوئی۔ اب اگر وہ اس طرف آئے بھی تو انہیں اندازہ نہ ہو سکے گا کہ میں پارک میں اتر گیا ہوں۔ اور وہ آگے نکل جائیں گے۔ وہ ٹیکسی سے اتر کر بڑی تیزی سے پارک میں داخل ہوا اور ایک ذرا افتادہ گوشہ تلاش کر کے بیٹھ گیا۔ بیگ اب بھی اس کے ہاتھوں میں دبا ہوا تھا۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر چہرے کا پسینہ خشک کیا۔

مجھے یہاں بیگ کھول کر دیکھ لینا چاہیے۔

اس نے آس پاس نظریں دوڑائیں قریب ہی ایک شخص دکھائی دیا جو پوری طرح اس کی جانب متوجہ تھا۔

یہ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہا ہے۔

کیا میری نگرانی ہو رہی ہے ؟

کہیں یہ پولیس کا آدمی تو نہیں ؟ لیکن پھر اسے اس خیال پر وہ خود ہی ہنس پڑا

"بھلا پولیس کو کیا خبر ؟ — پھر میں نے چوری کب کی ہے ؟"

"اگر چوری نہیں کی ہے تو پھر بھاگ کیوں رہے ہو ؟"

"میں کہاں بھاگ رہا ہوں ؟"

"کیا یہ بیگ تمہارا ہے ؟ ہاں ، ہاں یہ بیگ میرا ہی ہے اور اس کے اندر کے نوٹ — ؟

"نہیں یہاں بیگ کھولنا مناسب نہیں وہ شخص تو اب تک مجھے گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔ مجھے یہاں سے اٹھ جانا چاہیے کوئی اور گوشہ دیکھتے ہیں لیکن کیا میری یہ حرکت اس آدمی کی نظروں میں مجھے مشکوک نہیں بنا دے گی۔ اور اگر یہ پولیس کا آدمی ہوا تو صرف مشتبہ حرکات کے سبب ہی مجھے دھر لے گا۔ — پھر میں اپنے پاس ان نوٹوں کی موجودگی کا کیا جواز پیش کر سکوں گا ؟ — — نہیں مجھے یہیں بیٹھے رہنا چاہیے۔

"وہ غنڈے کہیں یہاں تک نہ پہنچ جائیں۔ پھر ان کا کیا مقابلہ ؟ بے موت مارا جاؤں۔

اس خیال کے آتے ہی وہ کانپنے لگا۔

"یہاں سے اٹھ جانا ہی بہتر ہے۔ لیکن جاؤں گا کہاں ؟

"آفس ؟ اس حالت میں آفس جانا بھی خطرے سے خالی نہیں۔ اس وقت میری ہر حرکت مشتبہ بنانے کیلئے کافی ہے۔ وہاں تو میں اپنی صفائی بھی ٹھیک طرح سے پیش نہیں کر سکوں گا اور بے کچھ مجرم بن جاؤں گا۔ اس حالت میں گھر جانا ہی مناسب ہے۔

"گھر — ؟ گھر پر بیوی سے کیا کہوں گا وہ سوالات کر کے میرا دماغ چاٹ جائے گی

"اس وقت گھر جانا ٹھیک نہیں ہے۔"

نہیں گھر جانا ہی ٹھیک ہے آخر مجھے کسی سے کچھ کہنے سننے کی کیا ضرورت ہے ؟

"گھر تو یہاں سے کافی دور ہے۔ میں فضول اس طرف چلا آیا مجھے پہلے ہی گھر کی طرف نکل جانا تھا"

اب پھر ٹیکسی پکڑنی ہوگی۔ پیسہ آخر تک چلنے والی رقم خواہ مخواہ ٹیکسی کی نذر ہو رہی ہے۔

"تو کیا پھر پیدل ؟ — اتنی دور — ؟ یا پھر بس ؟

"نہیں اس وقت بس یا پیدل دونوں مناسب نہیں۔ کسی گوشہ میں بیٹھ کر دیکھ لوں تو پھر — ؟" — "نہیں ٹیکسی ہی ٹھیک ہے۔"

ایک ذرا حالات کے اس بھنور سے نکل جانے کی دیر ہے۔ پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

"کیا ٹھیک ہو جائے گا ؟" سوال کی گونج اسے اپنے وجود کے اندر سنائی دی مگر اس سوال کا اس کے پاس شاید کوئی جواب نہ تھا۔

"وہ آدمی تو مجھے اب تک گھور رہا ہے ؟"

"وہ مجھے اس طرح کیوں گھور رہا ہے ؟"

وہ پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ اس نے پھر جیب سے رومال نکالا اور چہرے کو خشک کرنے لگا

"مجھے یہاں سے فوراً نکل جانا چاہیے۔

کہیں یہ آدمی میرا پیچھا نہ کرے لیکن اسے کیا پتہ کہ میرے بیگ میں کیا ہے ؟

مجھے بس ذرا نارمل رہنا چاہیے۔ میں نے تو چوری نہیں کی۔ اب اگر میرا بیگ نوٹوں سے بھرا ہوا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے ؟

"تو یہ نوٹ تمہارے نہیں ہیں ؟"

ہاں مجھے اعتراف ہے کہ یہ نوٹ میرے نہیں ہیں۔"

"پھر انہیں واپس کر دو۔"

جب میں نہیں جانتا کہ یہ رقم کس کی ہے تو کیسے واپس کروں۔ کوئی سامنے آئے تو واپس کر دوں گا"

کیا ان درختوں اور جھاڑیوں کے حوالے کر دوں۔

بحث کا یہ انداز اسے خود بھی عجیب سا لگ رہا تھا۔

اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری نیت ٹھیک نہیں اور تم رقم واپس کرنا نہیں چاہتے۔

نہیں غلط ہے اور کسی کو میری نیت پر شبہ کرنے کا کیا حق — مجھے ان نوٹوں سے کوئی سروکار نہیں — کوئی سامنے ہو تو۔

"تو پھر بھاگ کیوں رہے ہو ؟"

میں کہاں بھاگ رہا ہوں

لیکن میرا یہاں زیادہ رکنا بھی ٹھیک نہیں۔ اسے اپنے اندر ایک گونج سی سنائی دی۔

"اگر وہ غنڈے کسی طرح یہاں پہنچ گئے تو … حالات — پھر تو میری جان بھی جا سکتی ہے۔"

وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ اور تیزی سے پارک سے باہر نکل گیا۔

گھر پہنچا تو بیوی حیران سی رہ گئی۔

"کیا ہوا — ؟ اس نے حیرت سے پوچھا" آپ نے اتنی جلدی واپس …

لیکن کچھ کہے سنے بغیر اپنے کمرے میں داخل ہو کر اس نے دروازہ بند کر لیا۔

کیا ہوا ؟ اسے اپنی بیوی کی گھبرائی ہوئی آواز پھر سنائی دی

"کچھ نہیں" اس وقت تم مجھے پریشان مت کرو۔ اس نے چیخ کر کہا۔

اس نے جیب سے چابی نکالی۔ چور نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا چٹ چٹ کی ہلکی سی آواز کمرے میں گونجی۔ اور وہ کھلے ہوئے بیگ کو گھورنے لگا۔ جس میں اس کے آفس کے سارے کاغذات سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔

✱

# نقد و نظر

## میرا کھویا ہوا ہاتھ
[افسانے]

### سلطان سبحانی

رام لعل کی رائے میں "سلطان سبحانی نئی فکر اور نئی تحریک کے
ب قابل اعتماد ہمراز کا نام ہے جو تخلیقی اظہار کے لیے خود کو شاعری
ہ آرٹ تک محدود نہیں رکھتا بلکہ افسانہ نگاری کے ذریعے بھی اجزائے
ا بیان کرنے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔" یہ بیان ملک کے نامور
یب کی جانب سے سلطان سبحانی کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف نامہ بھی
ہ۔ علاوہ سلطان سبحانی بیک وقت کئی حوالوں سے پہچانے جاتے
ا۔ وہ ایک آرٹسٹ ہے جو رنگوں کے توسط سے اپنے فکری اور حسی
بار کو معنی خیز اشاریت سے معمور کرتا ہے۔ وہ شاعر ہے جو اپنے
ر کے احکامات کی تعمیل میں حکم نامہ کی تخلیق اس طرح کرتا ہے کہ
بدات اور واردات کے پُرتاثر اظہار سے قاری کے ذہن و دل کو
گرفت میں لے لیتا ہے۔ وہ ایک کامیاب افسانہ نگار ہے جو خوبصورت
یہ اور استعاراتی اسلوب کے ذریعہ واقعہ نگاری کو معنی کے نئے
لامات سے روشناس کرتا ہے۔

"اجنبی نگاہیں" (مطبوعہ ۱۹۷۸ء) "راستے بھی چلتے ہیں" (مطبوعہ
۱۹۸۶ء) ان کے افسانوی مجموعے ہیں جو کردار نگاری، موضوعات کے
ع اور پُرتاثر بیانیہ کے سبب ادبی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھے
ۓ اور اب ان کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ "میرا کھویا ہوا ہاتھ" شائع
ہے۔ افسانوں کا یہ مجموعہ نہ صرف سلطان سبحانی کی فکری اور فنی
لندی کا بہترین نمونہ ہے بلکہ ان کے افسانوی سفر کے تدریجی ارتقاء
نمازبھی ہے۔

اس کتاب کا پہلا افسانہ "میرا کھویا ہوا ہاتھ" ہے ہاتھ کی گمشدگی
ت کے استحصال کا بہترین استعارہ ہے جسے موجودہ عہد کی خود غرضی
ضمیر کے خلاف شدید ردعمل کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس
ن کا موضوع، کردار نگاری، کہانی کا علامتی اور استعاراتی اسلوب
شرے میں رو بہ عمل منافقانہ رویوں اور عصری عذابوں کو کھردری
ئی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ افسانے پر آخری لمحے تک افسانہ نگار
مضبوط گرفت ہے جس نے افسانے کو بے حد متاثر کن بنا دیا ہے
یہاں افسانہ نگار کی زندگی سے بامقصد وابستگی کا بھی احساس
دلاتی ہے۔

"دھنستی ہوئی زمین" جنگلوں کے ازلی سلسلوں، تباہ کاریوں
ہولناکیوں کا نوحہ ہے۔ "سیاہ آب آتش پا" انسان کی آرزو مندیوں
زندگی کے بے کنار سمندر میں اس کی تنگ دامانی کو ایک منفرد زاویۂ
وسے متعارف کرتی ہے۔ "میں ایک چھپتا ہوا دائرہ" "حق کا بے باکانہ
راور اس کا غیر معمولی تسلسل، "گلابی موسم کی سیڑھی" "اپنے زانو پہ اپنا
لمحے کا خوبصورت استعاریہ ہے ان افسانوں کے مطالعہ کے بعد
الور صدیقی کی رائے بلاشبہ دیانت دارانہ معلوم ہوتی ہے کہ
سے ساتھ۔۔۔ سلطان سبحانی کے یہاں عجیب دہر خند کیفیت
نی ہے۔ وہ مسرتوں کو حاصل کرنا ہی نہیں چاہتا بلکہ اسے تقسیم
کرنے کا آرزومند بھی ہے۔"

"چابک بدستِ الم" اس کتاب کا دوسرا بڑا افسانہ ہے۔ یہ کہانی مذہبی جنون کے پس منظر سے ابھرتی ہے۔ مذہبی جنون کی تاریخ، لیکن اس کی پیدا کردہ لعنت، سفاکیت اور جبریت آج بھی روزِ اول کی طرح پُرتشدد، ہیبتناک، اور تباہ کن ہے۔ اس افسانے کو اس خوبی کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے کہ قاری افسانہ نگار کی پیدا کردہ فضا کا ایک حصہ تصور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ پاکستان کے نامور افسانہ نگار رشید امجد نے کہا "جیسے یہ افسانہ میں نے لکھا ہے۔"

"میرا کھویا ہوا ہاتھ" کے تمام افسانے ہمارے عہد کے حقیقی مسائل کو کھردری سچائی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ "زندگی کی سنگ دلی، اس کے دکھوں اور مسرتوں، اس کی آرزوؤں، خوابوں اور حسرتوں کے درمیان ہم سلطان سبحانی کو ایک باضمیر، حساس، خوددار اور خودشناس ادیب کی حیثیت سے گزرتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ جو ہر افسانے میں اپنے باطن کی اس سچائی اور دوستی کی تلاش میں سرگرداں ہے جس کی بازیافت میں ہماری دائمی مسرت پوشیدہ ہے۔

ضخامت ۱۲۸ صفحات، قیمت تیس روپے۔
پتہ: ادارہ ہم زبان، ۱۹۳۰، ایم، ایچ، بی، کالونی مالیگاؤں، (مہاراشٹرا) [شیر ملک شیبی]

## آخری زمین
[ناولٹ]

### منظر الزماں خان

منظر الزماں خان کے ناولٹ "آخری زمیں" کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مصنف نے اپنے موضوع سے پورا پورا انصاف کیا ہے۔ میرے خیال میں "آخری زمیں" علامتی، تجریدی اسلوب سے عبارت۔ اردو ناولٹ نگاری میں غالباً پہلا مکمل، منفرد اور کامیاب تجربہ ہے۔ اس سے قطع نظر ناولٹ لکھنا میرے نزدیک تنے ہوئے رستہ پر ننگے پاؤں چلنے کے مماثل ہے، جس کے ایک جانب افسانہ کی گہری کھائی ہے تو دوسری جانب ناول کا متواج سمندر لہٰذا ناولٹ نگار کے لیے پھونک پھونک کر قدم رکھنا ضروری ہو جاتا ہے، بصورتِ دیگر توازن بگڑ سکتا ہے۔ یہ کام اس وقت اور بھی دشوار ہو جاتا ہے جب موضوع کا رشتہ بھی نازک قسم کا ہو۔ بہرحال منظر الزماں خان نے علامتی اور تجریدی انداز میں اپنے وقت کے آشوب کو جس طرح گرفت میں لینے کی سعی کی ہے وہ متاثر کن ہے "آخری زمیں" کی ہر نئی زمیں اُس کرب کو دوچند کر دیتی ہے جو ہر سطح کے استحصالی رویوں اور حریت کے تحت DISTORTED SELF کی صورت میں پیدا ہو جاتا ہے دراصل زمیں کی علامت اس ناولٹ میں پیار کی طرح ہے اور ہر چھلکا اترنے پر اس کے نیچے سے ایک نئی زمیں برآمد ہوتی ہے جو فی الحقیقت پہلی زمیں کا بدلا ہوا روپ ہے، (ازلی و ابدی زمیں) اور یہ زمیں ہر مرتبہ ایک نئے قسم کا چہرہ کا بھی لگاتی ہے۔ "آخری زمیں" کی مختلف زمینوں کو اس خطۂ ارض کے مختلف سیاسی و معاشرتی SYSTEMS اور مختلف نظریات کی علامت کے طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ "سردار" کی علامت (جس کو سانپ ڈسنے کے بعد سانپ ہلاک ہو جاتا ہے) میں زہر، ریاکاریاں، منافقتیں، دوہرے معیارات ظلم و استحصال، فرد کی خودی کو مسلسل مسخ کر رہے ہیں اور وہ FACELESS ہوتا جا رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی روح میں سڑن بھی پیدا ہو رہی ہے جو اس کی بیمار روح کا اعلامیہ بھی ہے۔ منظر الزماں خان کا ناولٹ "آخری زمیں" کے مطالعے کے دوران اس بات کا احساس بھی ہوتا ہے کہ سردار کی صورت میں کارفرما طاغوتی طاقتوں کے خلاف بغاوت کرنے کی رمق بھی فرد کے اندر موجود ہے جو ایک خوش آئند بات ہے لیکن "دسویں" زمیں ایک طرح سے خوابوں کی زمیں ہے اور خواب ہی سچ کا جوہر ہیں۔ اجتماعی لاشعور کا روپ ہیں، ساری تخلیقیت اور قوت کا منبع ہیں۔ ان کے سوتے خشک ہو جائیں تو پھر سب کچھ بانجھ ہو کر رہ جائے۔ سو خوابوں پر پہرا بٹھا دینے سے تمام امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ آخری باب میں خوابوں کو جلتے ہوئے دکھایا گیا ہے جو مکمل CHAOS کی نشاندہی کرتے ہیں مگر دوسرے حوالے سے دیکھیں تو کہا جا سکتا ہے کہ جلتے ہوئے خوابوں کی راکھ سے نئے خواب ققنس کی صورت پیدا ہوں گے اور ایک نئے دور کا آغاز ہوگا کہ یہ سلسلہ جب تک زمین ہے چلتا رہے گا مگر دھار جو ایک ابدی خواب ہے، سراب ثابت ہوتا ہے اور یہ چیز انسانی ارادوں اور امیدوں کی لایعنیت پر ایک گہری طنز بھی ہے۔ "آخری زمیں" چوں کہ ایک علامتی تجریدی ناولٹ ہے لہٰذا اس پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی جا سکتی ہے اور اسے مختلف زاویوں سے پرکھا جا سکتا ہے۔ میں منظر الزماں خان کو اس انتہائی مشکل موضوع پر اس قدر مکمل اور کامیاب ناولٹ لکھنے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

قیمت ۳۰ روپے۔ ملنے کا پتہ شب خون کتاب گھر ۳۱۳ رانی منڈی الٰہ آباد۔ شعر و حکمت ۸۹۷-۹-۱۱ ریڈ ہل حیدرآباد
[سلیم آغا قزلباش۔ پاکستان]

## جنگ اور محبت کے درمیان
[شاعری]

### انیس انصاری

"جنگ اور محبت کے درمیان" انیس انصاری کا نیا مجموعۂ کلام ہے۔ اس سے قبل ان کا پہلا شعری مجموعہ "تشنہ سراب" شائع ہو چکا ہے۔ زیرِ نظر مجموعے میں آزاد اور پابند نظمیں بھی ہیں اور متفرق غزلیں اور محبت بھی اس کا پیش لفظ پاکستان کے مشہور نقاد محمد علی صدیقی نے لکھا ہے اور اختتامیہ خود شاعر نے جس میں اس نے اپنے شعری معتقدات اور جنگ، محبت اور زندگی کے بارے میں اپنے نظریات پر روشنی ڈالی ہے۔ پیش لفظ میں محمد علی صدیقی نے انیس انصاری کے جذباتی اور فکری محرکات کا گہرائی سے جائزہ لیا ہے اور ان عوامل کی نشاندہی کی ہے جس سے انیس انصاری کی شاعری کا تانا بانا تیار ہوا ہے۔ اس مجموعے میں شامل نظموں کو پڑھ کر یہی

[باقی صفحہ ۲۴ پر دیکھیے]

# مکتوبات

**سلیم شہزاد** ــــــ ۳۲۳، مگلوار وارڈ، مالیگاؤں

"شاعر" کے شمارہ ۸ اور ۹ (جلد ۶۰) میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا مقالہ "اردو املا اور لسانیات" جسے انھوں نے "زیر تحریر" میں تحریر کیا ہے بغور دیکھا۔ مطالعہ کے بعد چند باتیں واضح ہوئیں اور چند وضاحت طلب نظر آئیں جنھیں یہاں پیش کر رہا ہوں، "شاعر" کے آئندہ شمارے میں انھیں شائع کر دیں تاکہ دوسرے قارئین بھی ان مطروحہ پہلو پر سوچیں اور توضیح اور تشریح سے میرے اور (شاید) ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب کے خیالات کی وضاحت ہو سکے۔

لسانیات اور زائد حروف کے ضمن میں آپ فرماتے ہیں کہ ز ذ ظ اور ض لکھنے میں چار حروف ہیں لیکن ان کی آواز ایک ہے اسی طرح س کی آواز پر ث اور ص کی، ہ اور الف کی آوازوں پر بالترتیب ح اور ع کی آوازوں کا قیاس کر لیا گیا ہے گویا یہ ایک ہی آواز کی مختلف تحریری شکلیں ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ز ذ ظ اور ض۔ صرف چار حروف ہی نہیں بلکہ چار مختلف اصوات PHONEMES بھی ہیں۔ ماہر صوتیات ڈاکٹر نارنگ ان کو چار مختلف ARTICULATION سے یقیناً ادا کر لیتے ہوں گے پھر روایت اور ترجیح کے نام پر انھیں ایک دوسرے سے جدا خیال کرنا کیا معنی؟ فناف یہ تو فطری طور پر ایک دوسرے سے متغائر اصوات ہیں ہی، ان تمام آوازوں کو (س، ث اور ص وغیرہ کے ساتھ) ایک دوسرے کا متبادل کہنا مناسب نہیں /ز/ /ر/ ہے اور /د/ /ر/ /ڑ/ /ظ/ /ز/ کا بدل نہیں اور /ذ/ /ض/ ہی تلفیظی یا صوتی لحاظ سے /ز/ /ر/ صوت کی بظاہر مماثل صوت کی قائم مقامی کر سکتی ہے۔ آپ ان چاروں کو (ث اور خصوصاً ص کو بھی) اگر مختلف ڈھنگ سے ادا کرنے پر قادر نہیں تو یہ آپ کی مجبوری ہے جسے ایک اصول کے طور پر کسی طرح قبول نہیں کیا جا سکتا۔ آپ بتاتے ہیں کہ صوتیات سائنس ہے جس کا کام آوازوں کی حقیقت کو جاننا ہے پھر آپ خود اس اصول کو (آپ کے خیال میں) اہم صوت فونیموں کی حقیقت جاننے کے لیے کیوں نہیں بروئے کار لاتے؟

ہمزہ کو "روایتاً" آپ حروف تہجی میں شامل کر لیں لیکن اس کی حیثیت فونیم کی سی کبھی نہیں رہی جب کہ حروف تہجی میں صرف فونیم شامل کرنے چاہئیں مانند صوت علامات جن کی فہرست کو بے جا طویل کرنا مناسب نہیں (نون غنہ، ہائے دو چشمی اور یائے مجہول بھی انھیں علامات بے صوت میں آتے ہیں)

آپ کی حروف تہجی کی فہرست کی آخری سطر میں (ہ ھ ء ی ے) پتا نہیں آپ نے کیسے انیسواں حرف شمار کیا ہے، ہمزہ کو یا یائے مجہول کو۔ ویسے عربی میں صرف اٹھائیس حروف ہیں، ہمزہ کو شامل کر لیں تو یہ انتیس ہو سکتے ہیں مگر ہمزہ عربی میں بھی کوئی حرف یا فونیم نہیں بلکہ الف کا قائم مقام ہے (مسئلہ، مسائل، مسئول)۔ "اصلاً" کے متعلق یہ عرض ہے کہ /ا ب ت ج د ر س ش ک ل م ن و ہ ی/ تو ہندی اور فارسی میں بھی موجود ہیں پھر یہ آواز اصلاً عربی کی کیسے ہو سکتی ہے؟ اردو میں اصلاً /ث ح خ ذ ص ض ط ظ ع غ ف ق/ عربی بلکہ سامی یا عبرانی حروف شامل ہیں۔ اسی طرح /پ چ گ/ کو اصلاً فارسی نہیں کہہ سکتے کیوں کہ یہ اصوات ہندی میں موجود ہیں /ژ/ کو البتہ فارسی الاصل کہا جا سکتا ہے کیوں کہ یہ عربی یا ہندی میں نہیں پایا جاتا۔ اسی طرح /ٹ ڈ ڑ/ اصلاً ہندی آوازیں ہیں۔

حروف تہجی کی شناخت فونیم کی شناخت کے اصول پر کی جاتی ہے (صوتیوں کے آزاد تبادل کا اصول یاد کیجئے) جس کے مد نظر نون غنہ، ہائے دو چشمی، ہمزہ اور یائے مجہول کو حروف تہجی میں شامل نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ فونیم نہیں /ن/ سے آپ کوئی لفظ نہیں لکھتے۔ ہ اپنے اصل یا بالعموم صوتیہ کو الجھانے والی صوت ہے۔ فونیم نہیں /ھ/ /رھ/ /بھ/ کی ایک تحریری شکل ہے اور لسانیات تحریر سے زیادہ تقریر یا تکلم سے بحث کرتی ہے /تھا/ آپ نہیں لکھتے /تہا/ لکھتے ہیں /ھ/ کی صرف /ب پ/ وغیرہ کو ہکاریت دینے کے لیے مستعمل ہے۔ نارنگ صاحب کا صفر نشان سمجھنا چاہیے (یہ صفر نشان کا اصول کیا واقعی نارنگ صاحب کا ہے؟) /ے/ سے /کھی/ /ار/ صوتیے (معروف) کی مجہول معروف طویل صوت کی علامت ہے، مد اب خود فونیم نہیں اور ہمزہ تو مسئلہ مسائل وغیرہ میں آپ الف کی جگہ استعمال کرتے ہی ہیں اس طرح اردو میں ۳۵ (پینتیس) حروف تہجی ہوتے ہیں جن کی اصوات ایک دوسرے سے جداگانہ نوعیت کی حامل ہیں۔

یائے دو چشمی، نون غنہ، ہمزہ اور یائے مجہول کو حروف تہجی میں شامل کرنے کے اصول سے تو مد (ــــ) کو بھی ان کی فہرست میں شامل کرنا پڑے گا کیوں کہ /ے/ کی طرح مد بھی /ا/ کو /آ/ بنانے میں استعمال کی جاتی ہے /آ/ اگر /ا/ کو /ا/ رہنے دے تو مانی؟ اس کا آزاد استعمال اور کیا ہے؟ صفر (یہ واضح کر دوں کہ یائے مجہول یا ہائے دو چشمی وغیرہ کو اوپر جو میں نے دو ترچھی لکیروں کے درمیان لکھا ہے تو وہ اس لیے کہ وہ نمایاں رہیں۔ انھیں فونیم سمجھ کر یہ لکیریں نہیں کھینچی گئی ہیں)

اضافت کے باب میں آپ کے اصول ۲ (الف اور واؤ کے بعد اضافت یائے سے ظاہر کی جائے گی) میں آپ ترمیم کے بعد یائے اور ہمزہ دونوں کو قابل قبول قرار دیتے ہیں (صدائے دل / صدا ے دل) لیکن ہونا چاہیے (روایتاً یا اصولاً) کہ الف کے بعد حرف ہمزہ اور کسرہ سے (صداء دل) اور واؤ کے بعد یائے اور ہمزہ سے (بوئے گل) اضافت ظاہر کی جانی چاہیے کیوں کہ عموماً الف پر ختم ہونے والے الفاظ کے آخر میں (عربی الاصل ہونے کے سبب) ہمزہ موجود ہوتا ہے اردو میں جسے اضافت کے علاوہ لکھا نہیں جاتا، (ہوا، انتہا، علا) مگر اضافت کی صورت میں ہمزہ کو تحریر میں جگہ ملنی چاہیے۔

نارنگ صاحب نے اردو کے اعرابوں کا فقرہ استعمال کیا ہے جس کی داد کے وہ مستحق ہیں، اعراب جمع کا صیغہ ہے اور بطور جمع ہی مستعمل بھی ہے، پھر یہ "اعرابوں" کیا بلا ہے؟ اس سے قطع نظر پیش والی اصوات کے متعلق جو الٹے پیش کی بحث آپ نے کی ہے اسے بھی واو مجہول کے صفر نشان میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ سیدھا پیش یعنی روایتی پیش ہی معروف آواز کے اظہار کے لیے برقرار رکھا جائے کیوں کہ صفر نشان اصول کے مطابق تو بغیر پیش والا واؤ مصوتے کا حامل لفظ واو مجہول کی صوت ادا کر ہی رہا ہے۔ اعراب کا استعمال اگر صوتی تعلیمی ضرورتوں کے پیش نظر ہے تو ٹھیک ورنہ ابھی ضرورتوں کو بیس سے زیادہ الٹے یا سیدھے پیش کے لکھا ہے اور آپ نے اسے واو معروف کی صوت میں پڑھ بھی لیا ہے۔ یعنی ناگزیر حالتوں کے علاوہ اعراب تمام کے تمام صفر نشان اصول کے تحت آ سکتے ہیں۔

ہمارے طریقے سے پڑھائی پر لسانیات کو اب اعتراض کرنا چاہیے۔ زبان کی بلکہ صحیح زبان کی تعلیم کا مقصد زبان کی فطری آوازوں کی تعلیم ہے جو لسانیات کی فونکس کو بروئے کار لائے بغیر ممکن نہیں۔ ابتدائی درجوں میں اگر معیاری فونکس کے ذریعہ تعلیم دینا ممکن نہیں تو یہ کہاں ضروری ہے کہ گھر کے الف بے آپ بتائیں جسے لکھی ہوئی صورت میں پڑھنا بھی مشکل ہو گھر پڑھانے کا آسان طریقہ "گ ھ ر /ر/ گھر" ہے اس میں چاہے صوتیے متحرک استعمال ہوتے ہوں لیکن متعلم ان کی اصل آواز سے فوراً متعارف ہو جاتا ہے۔ گاف دو چشمی ہے زبر سے "ر" گھر ایک سے کم نہیں جس میں صوتیے تو خیر کہیں سنائی نہیں دیتے مشکل الفاظ ضرور دیعار کرتے معلوم ہوتے ہیں۔

آزمایش یا آزمائش "تقریر سے زیادہ تحریر کا مسئلہ ہے۔ لسانیات صحیح تلفظ واضح کر دیتی ہے جسے اگر لکھا جائے تو ممکن ہے عجیب روایتی شکل سامنے آئے اس لیے املا میں تحریر کی روایتوں کا پاس کیا جاتا ہے اور رکھا جائے گا تاوقتیکہ (اس عرصہ کو تاوقتہ کو کبھی نہیں لکھا گیا کیوں کہ یہ تحریر کی روایت نہیں) لسانی سائنس کے مطابق اصل اصوات کو ان کی سائنسی شکلوں میں لکھنا رائج ہو جائے جس کا امکان ابھی کہیں نظر نہیں آتا۔

لسانیات اور سیاست کی سرحدیں قائم کر کے نارنگ صاحب نے یہ بات تو درست کہی ہے کہ اردو کے تعلق سے اگر عربی اور فارسی کے اثرات کا ذکر آتا ہے تو ہندی یا دیوناگری کا ذکر بھی لامحالہ آئے گا جو اردو کے ہند آریائی زبان ہونے کے ناطے غیر فطری نہیں مگر ایک آواز کی مختلف شکلوں (ز ذ ظ ض) کا داویلا مچانے میں کسی دیوناگری سیاست ہی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ جب آپ کی زبان کی اصوات کا بڑا حصہ سامی اصوات پر مشتمل ہو تو انھیں دیوناگری میں تبدیل کرنا تو سیاسی حربہ کہلائے گا جس سے آج کل کے ماہرین لسانیات اپنا دامن بچاتے دکھائی نہیں دیتے۔

**فرمان فتح پوری** ــ سی ــ ۲۸، بلاک ۱۳، ڈی گلشن اقبال ــ کراچی

شاعر کے دوبارہ پرچے ملے، اس سے پہلے اقبال نمبر بھی موصول ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے کہ شاعر کی روایت کو بطریق احسن قائم کیے ہوئے ہیں۔ اردو کو آپ لوگوں نے یوپی میں بھی سنبھالا، دلی سہارا کیا کہ شاعر اور شاعر کے خانوادے نے اس سلسلے میں بہت کام کیا ہے۔

**حنیف نقوی** ــ شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی (یوپی)

شاعر کے شمارہ نمبر ۳ میں امیر مینائی کے خط کا جو عکس شائع ہوا ہے وہ امیر کے خط میں نہیں، اول تو امیر زیادہ تر اپنے کسی بیٹے یا شاگرد یا دفتر کے منشی سے خط لکھواتے تھے۔ ثانیاً اس خط کے آخر میں تو خود یہ لکھا ہوا ہے کہ ماسٹر یہ مدرسہ دلی پتہ لکھا ہوا ہے (اس وقت شاعر کا یہ شمارہ پیش نظر نہیں ورنہ اصل عبارت نقل کرتا) جو اس کے نقل ہونے کی دلیل ہے۔ تعجب ہے کہ آپ نے اس طرف توجہ نہیں دی۔

**اظہر افسر** ــ ۲۳-۲-۳، مغل پورہ، حیدرآباد ۲۰ (آندھرا پردیش)

شمارہ نمبر ۳ میں عتیق حنفی مرحوم کے بارے میں پڑھ کر بے اختیار آنسو نکل آئے۔ ان سے آخری ملاقات غالباً دسمبر ۱۹۸۰ء میں دلی میں ایکسٹرنل سروسیز کے دفتر میں ہوئی تھی۔ ہزاروں فن کاروں کو پیدا کر کے ہم

اٹھنے والا اسٹیج پروگرام کے لیے ایک بالکل ہی نئے چہرے کو اپنا تعارف دے رہا تھا۔ اس دن دیر تک گفتگو رہی۔ ہیدری توہیدری وہ سنسکرت کے بھی ماہر تھے، دہلی کے کئی پنڈتوں کو وہ صحیح تلفظ سے اشلوک پڑھا سکتے تھے۔ خیر! وہ گئے، ایک دن ہم بھی جانے والے ہیں۔

**حمید سہروردی** ۔ صدر شعبۂ اردو، کے۔ ایس۔ کے، کالج، بیدر ۴۰۰۲۲۴

شاعر کے شمارہ نمبر ۳ میں شامل کلام حیدری صاحب کا افسانہ اوراق (لاہور) میں بھی شائع ہوا ہے۔ عتیق حنفی مرحوم پر کیری گیجرا اور غزلیں خوب ہیں۔ آپ نے حلقۂ یاراں دو میں پتے لکھنے کی مہم شروع کردی ہے۔ دیکھیے کس حد تک کامیابی ہو سکتی ہے۔

**فاروق شفق** ۔ جی۔ ۱۸۵، دھان کھیتی، گارڈن ریچ، کلکتہ

شاعر کے شمارہ نمبر ۳ اور ۴ موصول ہوئے۔ شمارہ نمبر ۲ خاصی تاخیر کے ساتھ موصول ہوا۔ مجموعی طور پر مجھے شمارہ نمبر ۳ زیادہ پسند آیا یعنی اس کا حصۂ نظم خاص قابل ذکر ہے۔ "نساء نامۂ حدید" کے تحت مرحوم عتیق حنفی کا سوانحی اشاریہ نہ صرف صداقت اعتراف ہے بلکہ ایک نوع کا تعزیتی اظہار بھی ہے۔ میں رشید کی نظمیں اور عرفان صدیقی کی غزلیں حاصل شمارہ کہی جا سکتی ہیں۔ نیز مسعود کے نام عیاث احمد گدی مرحوم کے مختصر سے خط سے گدی جیسے بیر مخلص، سیدھے سادھے، نیم خود توڑ دالے اور گوشہ نشین قسم کے ادیب کی مجبوریوں کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ ہمارے آج کے بہت سے اچھے اور معتبر شعرا اور افسانہ نگار کسی حد تک نقادوں کی عدم توجہی ان کے غرور اور نخوت کا شکار رہے، یہ گدی کے لفظ لفظ سے آشکارہ ہے۔

**شاہد کلیم** ۔ دودھ کٹورہ، آرہ ۱-۳۰۲-۸ [بہار]

آپ نے شاعر میں چھپنے والی تخلیقات کے معیار پر ہمیشہ ہی توجہ دی ہے۔ شمارہ نمبر ۳ میں یعقوب راہی کی غزل کا مطلع ملاحظہ فرمائیے:

ہر بار صبر و ضبط کو تحسین رہاں کیوں

ہر بار ہے سطور میرا امتحاں کیوں

دوسرا مصرع بحر سے خارج ہے۔ اسی طرح حسن عباس رضا کی غزل کا تیسرا شعر دیکھیے:

یہی بہت ہے کہ وہ شہر خواب سے گذرے

اب اس سے زیادہ کسی سے سوال کیا کرنا

لفظ "زیادہ" بروزن "شادہ" استعمال ہوا ہے جو غلط ہے۔ ان کے دوسرے شعر کا پہلا مصرع دیکھیے: ع

ہمیں اس کی جدائی عزیز رکھتی ہے

"ہمیں" کے بعد لفظ "تو" شاید کتابت ہونے سے رہ گیا ہے۔

از راہ کرم شعری حصہ پر توجہ دیجیے۔ لفظوں کے انتخاب میں بھی سختی سے کام لیجیے۔ شاعر کی تخلیقات، قاری کو حظ اٹھانے کا موقع فراہم کرتی ہیں۔

**شیخ سلیم احمد** ۔ ۱۵۔ بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی ۱۳

آپ کی ادارت میں شائع ہونے والا شاعر کا تیسرا شمارہ ابھی پڑھ کر ختم کیا ہے۔ آپ تیسرے مورچے کے امام ثابت ہو رہے ہیں جس کی میں اکثر تبلیغ کیا کرتا ہوں۔ جس تیسرے میں کوئی سایہ نہیں آپ اسی کی دو کاں سجا کر بیٹھے ہیں۔ یعنی حنفی میں کیا رکھا ہے؟۔ ہم انھیں ٹمس کا شلا جیجے مگر آپ نے کیا زور دار خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ انھیں چہروں اور آوازوں کی بھیڑ سے ابھرنے والی ایک منفرد شعری آواز قرار دے دیا جو بالکل درست ہے انصاف اور حق پرستی کی للکار ہے۔ تیسرا مورچہ اسی للکار کا لقب ہے جس کے اماموں میں آپ بھی شامل ہیں۔ شاعر کے تیسرے شمارے سے اس بیان کی تائید میں کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

خورشید سمیع کا مضمون "نئی شاعری کے پیچ و خم" لیجیے۔ بہت خوبصورت مضمون ہے اور جدید شاعری پر کاری ضرب ہے۔ دوسرا مضمون مہدی جعفر کا "کہانی یا افسانہ" کے نام سے شامل ہے جو جدید افسانے کی حمایت میں ہے۔ اب خود فیصلہ کیجیے کہ آپ تیسرے مورچے میں شامل ہیں کہ نہیں؟۔

اس شمارہ کا افسانوی سیکشن بھی خوب ہے۔ کلام حیدری کا افسانہ "لیسٹ کی حیوانی" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ محافظ حیدر کا افسانہ کشمکش پڑھ کر تیرہویں صدی کے ناول نگار ڈکامیرن کے شہرۂ آفاق ناول کا شیو کی یاد آجاتی ہے۔ دراصل اس ناول نے مغربی فکشن پر گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ اس عہد کے چرچ اور رہبانیت کے خلاف لکھے گئے اس ناول کی جھلکیاں آج بھی یورپ اور امریکہ میں بنیے جاری ہلکی پھلکی پورنوگرافی میں ملتی ہیں۔ یہ افسانہ بھی اس کی عکاسی کرتا ہے۔

شعری حصہ میں عرفان صدیقی اور عبداللہ کمال کی غزلیں پسند آئیں۔ دو شعروں کا لطف آپ بھی میرے ساتھ اٹھائیے۔

مری نے پھول رنج گہر نکلتا ہے

جو ملتِ موج افشا آہوں سر نکلتا ہے [عرفان صدیقی]

رقم پلکوں پر صبا اور دمسطر کاش

عمر بھر اس کی صدائی کے سمندر کا شنا [عبداللہ کمال]

ندا فاضلی کی خود نوشت "دیوار دل کے بیچ" ایک نیا اسلوب ہے جو اس صنف کو ناول کے قریب کر دیتا ہے جو بہت دلچسپ بھی ہے۔

شاعر کے دو شمارے موصول ہوئے، تاخیر سے نئے مگر خوب ہیں۔ ندا فاضلی کی خود نوشت دلچسپ ہے۔ انھیں مبارکباد دیجیے۔

**منظر الزماں خاں** [حیدرآباد]

شاعر کا شمارہ نمبر ۳ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موصول ہوا۔ خورشید سمیع نے نئی شاعری کے پیچ و خم کا اچھا اور معتدل تجزیہ پیش کیا ہے۔ عتیق حنفی ہمارے اچھے اور ذہین شاعروں میں سے ایک تھے۔ بنام شاعر کے تحت ان کی غزلیں پڑھ کر جی خوش ہو گیا۔ یہاں بھی نئے اردو میں پتہ لکھنے کی تحریک شروع کی ہوئی ہے۔ اصل مسئلہ لوگوں کو اس کے لیے تیار کرنا ہے۔

**خالد عیاری** [دربھنگہ]

شاعر کے کئی شمارے دیکھنے کا اتفاق ہوا، بہت مکمل اور بھرپور ادبی رسالہ ہے۔ آپ کے رسالے کے ذریعہ اردو کے جائز حقوق کی آواز جو اٹھائی جا رہی ہے وہ قابل ستائش اور قابل عمل ہے۔ ہم آپ کے ان اقدامات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

**شبیر احمد انصاری** ۔ [دہلی]

## بقیہ صفحہ ۴۵ نقد و نظر

احساس ہوتا ہے کہ شاعر نے زندگی کی داخلی اور خارجی کشمکش کو اپنی سانسوں میں جس طرح محسوس کیا ہے اس کے شاعرانہ اظہار کی مرئی صورت یہ کتاب "جنگ اور محبت کے درمیان" ہے۔ اس کتاب کی پہلی نظم کا عنوان بھی یہی ہے اور شاعر کے لمحاتی تحیر، اندرونی کشمکش اور زندگی کی قدروں کے تحفظ کا اعلان نامہ بھی۔

انیس انصاری نے زندگی کو اس کی پوری کلیت کے ساتھ قبول کیا ہے اور اس کے سارے منظر نامے میں ایک شاعر کے موقلم سے رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے کلام میں الفاظ و معانی کی ہم آہنگی ان کی فکری دیانت داری سے عبارت ہے جس کے عمدہ نمونے "تصویر کو پتھر نہ مارو"، "شہر محصور میں خواب کا"، "زندگی وصل ہے"، اور "تمہارے ہجر کا صدمہ" جیسی نظموں میں ملتے ہیں۔ "تمہارے ہجر کا صدمہ" دس مصرعوں کی ایک چھوٹی سی نظم ہے مگر فنکارانہ بُنت اور تاثرات کی مرکزیت کی وجہ سے خاص طور سے قابل ذکر ہے

تمہارے وصل میں رنگوں کا جو تماشہ تھا

تمہارے ہجر میں اتنے ہی درد شامل ہیں

رسارے رنگ تمہارے تھے وصل میں جانم

رسارے درد کا حامل ہے اک تمہارا غم

ان اشعار میں وصل کی لذت سے زیادہ اس محرومی کا درد شامل ہے جس کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کے لیے ہم بہت پہلے کہہ چکے تھے

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

اس مجموعے میں انیس انصاری کی ۶۳ غزلیں بھی شامل ہیں جن میں جگر کاوی تو بہت ہے مگر سیاکاری نہیں ہے جس کی وجہ سے ایسے اشعار کم ہیں جن سے پڑھنے والے کو دل کی گرہیں کھلتی ہوئی محسوس ہونے لگیں یا کم از کم فکری سطح پر ذہن کو متاثر کر سکیں تاہم جہاں بھی رکھ رکھاؤ پر شاعر کی گرفت مضبوط ہے وہاں ایسے خوبصورت اشعار بھی خلق ہو گئے ہیں

یہ زخم تم سے ملے ہیں لیکن کبھی شکایت نہ کر سکے ہم

نہ کوئی قاتل تمہارا جیسا، نہ کوئی دلبر تمہارا جیسا

یہ جنگ ویسے بھی محترم ہے، ایسے میں تنہا لڑوں گا لیکن

شکست ممکن نہیں رہے گی اگر ہو ساتھ تمہارا جیسا

ہوئے کا اک لمس تھا تمہارا کر گیا کندن وہ

ڈر لگتا ہے مڑ کر دیکھوں اور پتھر ہو جاؤں

زبان و بیان کی خامیاں اس مجموعے میں کچھ زیادہ ہی ہیں جنھیں معمولی توجہ سے دور کیا جا سکتا تھا کہ خود احتسابی شاعری کی اولین شرط ہے۔ کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں جنھیں اگر اس مجموعے میں شامل نہ کیا جاتا تو اس کتاب کی قدر و قیمت اور زیادہ ہو جاتی۔ مثلاً بوڑھی ماحشہ، معلی اعظم ثانی، ماہر کھانا کھاؤں گی جاناں، تم سے پیار کریں گے لیکن اگلے موسم کی خوشبو وغیرہ۔ بوڑھی ماحشہ (یعنی زمین) کے متعلق اتنا ہی اشارہ کافی ہوگا کہ ہر قوم اور مذہب میں زمین کو محترم سمجھا گیا ہے۔ ہندوستان میں دھرتی ماں کا لفظ ہی اس کے تقدس کا مظہر ہے اس لیے زمین کو بوڑھی ماحشہ سے مخاطب کرنا میرے نزدیک نامناسب تھا۔

کتاب کا نام "جنگ اور محبت کے درمیان" شعری تخلیق کے مقابلے میں کسی ناول کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ سرورق بھی کچھ زیادہ متاثر نہیں کرتا مگر طباعت خوش گوار ہے۔ یہ امر یقیناً باعث مسرت ہے کہ انیس انصاری (آئی۔ اے۔ ایس) نے اپنی بے حد و بے شمار سرکاری مصروفیتوں کے باوجود اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کی شمع کو بھی روشن رکھا اور خود کو اپنی شاعری کے حوالے سے ظاہر کرنے ہی میں آسودگی محسوس کی۔ مجھے امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کتاب کی پذیرائی ہوگی۔

صفحات: ۲۲۴ صفحات۔ قیمت: چالیس روپے۔ پتہ: مکتبہ دین و ادب، امین آباد لکھنؤ۔

[ذکی انصاری]

Regd. No. MH-B.Y.W. 311 [redacted] Price: Rs. 5

THE 'SHAIR' (MONTHLY) BOMBAY 400 009

60 Years of Publication ✱ (Publishing Date 27-28) ✱ Issue No 6 1989 ✱ Telephone No 359904

Registered with the Registrar of Newspapers at R N No 14482/57


شاعر

# بشیر بدر



| | |
|---|---|
| نام | ○ سید بشیر بدر |
| وطن | ○ کانپور |
| پیدائش | ○ ۱۵ فروری ۱۹۳۵ء |
| والدین | ○ سید محمد نظیر مرحوم، سیدہ عالیہ بیگم مرحومہ |
| اہلیہ | ○ ڈاکٹر سیدہ راحت بدر [عقد ثانی] |
| تعلیم | ○ بی۔ اے ۱۹۶۷ء |
| | ایم۔ اے ۱۹۶۹ء |
| | پی۔ ایچ۔ ڈی ۷۲۔۱۹۷۱ء [مسلم یونیورسٹی علی گڑھ] |
| ملازمت | ○ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی [ابتدائی چند سال] |
| موجودہ | ○ صدر شعبۂ اردو میرٹھ کالج |
| ملازمت | ○ میرٹھ یونیورسٹی [میرٹھ] |
| تصانیف | ○ اکائی [شعری مجموعہ] ۱۹۶۹ء |
| | امیج [شعری مجموعہ] ۱۹۷۳ء |
| | آزادی کے بعد اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۸۱ء |
| | بیسویں صدی میں اردو غزل ۱۹۸۱ء |
| | آمد [شعری مجموعہ] ۱۹۸۵ء |
| | تمہارے لئے [ہندی] ۱۹۸۵ء |
| | اجالے اپنی یادوں کے [ہندی] ۱۹۹۰ء |
| اسفار | ○ امریکہ [چار بار] پاکستان [دو بار] دبئی، شارجہ، ابوظہبی، بحرین، قطر اور مسقط وغیرہ |

عمل
جینت پرمار

تحریر و ترتیب
افتخار امام صدیقی

● اکہرا اکہرا جسم، استواں چہرے پر نمایاں عینک، دانتوں میں سبھی مسکراہٹوں کے پس منظر میں گوشت پوست کا ایک متحرک قہقہہ، وعدے، خوب صورت جملے، لطیفے اور ان کے ہفت رنگ تناظر۔ کبھی پسپائی تو کبھی مزاحمت، حرفی، لفظی صف بندی مسلسل ذہنی تناؤ کا شکار رہی کامیابی کا راز۔ ایک دنیا کو جی لینے کے خواب اور فلک ہو جانے کے طریق کو ہمہ وقت روشن رکھنے کی دلی کوششیں مسلسل کہ کوئی لمحہ رائیگاں نہ جائے۔ شخصیت اور شاعری کے تضادات میں سانسیں لینے والا ہر ایک کا موضوع سخن، مکالمہ مکالمہ کبھی خوشی دعا، کبھی بددعا، شاعری، مشاعرے اور شہرتوں کا ایک تاریخی مگر متنازعہ کردار۔ غزل میں مخصوص لفظیات و تہذیب کی گئی شعری کائنات غیر معمولی، منفرد، نام کے بطن سے شعر نہیں اسلوب شعر سے نام اور شخصیت کی پہچان۔ عصری شاعروں کے اسلوب کا تغیر و تبدل، رسائلی و کتابی شعراء کو مشاعرہ پڑھنے کا حوصلہ، ناشاعروں کو مشاعرے کا سیاہ ترین شاعر بنانے کا ہنر، مشاعرے کی نشریہ و بیانیہ شاعری کو پہلے روایتی، پھر جدید اور اب جیکٹی شاعری کی نمولوگی۔ ذرائع ابلاغ کی اہمیت ...

بشیر بدر

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

سے یادگار اعجاز صدیقی مرحوم کم

اشاعت کے ۶۰ واں سال

# شاعر

علمیہ ادبیہ و تنقیدیہ ماہنامہ

جلد ـــــ ۶۰
شمارہ ـــــ ۷

فون: ۳۵۹۹۰۴

مدیر
افتخار امام صدیقی

●

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت :- ۴ روپے

زرِ سالانہ ۵۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۶۰ روپے

تاعمر خریداری ۱۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے ◆ ممالک غیر سے ۳۵۰ روپے

ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصرالادب، بمبئی سینٹرل پوسٹ آفس پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶، بمبئی ۴۰۰۰۰۸


# فکرِ امروز



آپ کہہ سکتے ہیں کہ غزل میں درس و پیام کی گنجائش نہیں، غزل میں صرف لطیف اشاراتِ حسن و عشق اور نازک کنایات وصل و فراق ہی بیان کیے جا سکتے ہیں۔ میں جواباً التماس کروں گا کہ اول تو یہ فیصلہ ہی درست نہیں، کولہو کا بیل اگر اپنی محدود حدودِ گردش سے باہر نکل آئے تو وہ کھیتوں اور میدانوں کی وسعتوں میں بھی گرم رفتار ہو سکتا ہے۔ محدود موضوعاتِ غزل اگر نظر انداز کر دیے جائیں اور خیال کو وسیع کیا جائے تو غزل میں درس و پیام کی بے حد گنجائش ہے اور اگر گنجائش نہیں ہے تو غزل کو اس زمانے کی جنسِ مردود اور دور از کار شے سمجھ کر بالائے طاق رکھ دیجیے، نظمیں کہیے جن میں جذبات نگاری کے لیے بیش از بیش گنجائش موجود ہے۔ برج بھاشا کی شاعری میں پہلے دوہے تھے پھر چوپائی، چھند، سورٹھا کا وجود ہوا۔ جب برج بھاشا ترقی کر کے اردو بنی تو غزل کی تخلیق ہوئی۔ اب اس ارتقائی زمانے میں نظم کا رواج ہوا۔ ایک شاعر کے لیے نظم و غزل مثنوی اور مسدس، سب برابر ہیں۔ پھر آپ نظمیں کیوں نہیں کہتے؟ ـ

۲۱ ستمبر ۱۹۳۷ء خطبۂ صدارت
مشاعرۂ "روحِ ادب" متھرا۔ شاعر (آگرہ)
ستمبر ۱۹۳۸ء

—سیماب اکبرآبادی

# دوسرے ٹانک صحت کی تصویروں میں ظاہری رنگ بھرتے ہیں
# سنکارا تندرستی کی حقیقتوں کو سیاہ و سفید کے روپ میں واضح کرتا ہے



## سنکارا — حاملہ خواتین کے لیے الکحل سے پاک بے ضرر ٹانک
## فارماکولوجیکل ریسرچ کے نتیجے

حاملہ ماؤں کی حیثیت میں اپنے لیے آپ ایک ٹانک کی ضرورت کو سمجھتی ہیں، لیکن کون سا؟ سب ہی ٹانک یکساں نظر آتے ہیں سب ہی ٹانک اچھی صحت سازی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اگر آپ الجھ رہی ہیں تو ماہرین کی رائے جانیے۔

سنکارا لیجیے۔ الکحل سے پاک، زندگی بخش لازمی عناصر، جڑی بوٹیوں اور تمام ضروری وٹامنز کا نادر مرکب جو حمل کے دنوں میں خون کی کمی دور کرنے کے لیے سائنٹفک تحقیقات سے مفید ثابت ہو چکا ہے۔ ان ریسرچ کرنے والے ماہرین پر آپ اعتماد کر سکتی ہیں۔ جو حمل اور اس کے دوران پیدا ہونے والی کمیوں کے بارے میں کوئی جانتے ہیں۔

### حمل کے دنوں میں خون کی کمی (انیمیا) کی شکایت!

خون کی آکسیجن پہنچانے کی صلاحیت میں کمی کو ہی ڈاکٹر صاحبان انیمیا کی وجہ بتلاتے ہیں۔ آئرن، وٹامن بی ۱۲ اور فولک ایسڈ کی عمومی کمی یا ان میں سے کسی ایک جز کی کمی انیمیا کا سبب ہوتی ہے۔ یہ شکایت دورانِ حمل میں اکثر ہو جاتی ہے اور تقریباً چالیس سے اسّی فی صد تک ہندوستانی عورتیں زمانہ حمل کے نصف آخر میں کسی نہ کسی شکل میں اس شکایت میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔

### سنکارا کیسے مدد کرتا ہے۔ ایک طبی رپورٹ!

ایل۔ ایل۔ آر۔ ایم میڈیکل کالج، میرٹھ میں ڈاکٹر سُشما رستوگی نے ساٹھ حاملہ خواتین پر سنکارا کے اثرات کا طبی جائزہ لیا۔ ان خواتین کو بارہ ہفتے تک سنکارا دیا گیا، جس کے نتیجہ میں تمام زیرِ تجربہ خواتین کی صحت بہتر پائی گئی اور ان کو مختلف عوارضات سے چھٹکارا بھی ملا۔ ان خواتین میں ہیموگلوبن کی مقدار میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ عام حالتوں میں ۲ء۹ ملی گرام سے ۶۹ء۱۱ ملی گرام فی صد تک اور پیچیدہ صورتوں میں ۸ء۱ ملی گرام سے ۱۰ ملی گرام فی صد تک۔ اس مدت میں سنکارا لینے کے نتیجے میں خون کے سرخ ذرات اور خون میں آئرن کی مقدار میں بھی اضافہ پایا گیا۔

سائنٹفک تحقیقات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سنکارا حمل کے دنوں میں بہت آسانی سے اور جلد جزوِ بدن بن جاتا ہے، جب کہ دوسرے آئرن والے ٹانکوں سے قبض، دست یا قے جیسی شکایات پیدا ہو جاتی ہیں۔

### بہتر نتائج کے لیے نادر فولادی فارمولا

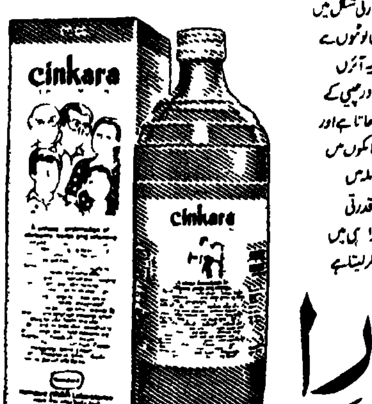
سنکارا بہتر کام کرتا ہے، کیوں کہ یہ خود بہتر بنایا جاتا ہے۔ اس کے نادر اجزائے ترکیبی میں آئرن اپنی سب سے زیادہ قدرتی شکل میں موجود ہے، جو جڑی بوٹیوں سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ آئرن آب کوثر، گلاب اور چینی کے قوام میں پیش کیا جاتا ہے اور اسی لیے دوسرے ٹانکوں میں موجود آئرن کے مقابلہ میں سنکارا میں شامل قدرتی آئرن کو قدرتی انداز ہی میں جسمِ انسانی قبول کر لیتا ہے۔

### گھر بھر کی صحت کے لیے ہر موسم میں

گھر کے ہر فرد کے لیے سنکارا کے بہت سے فائدے اور استعمال کے بہت سے ضروری مواقع ہیں جیسے:

- عام کمزوری اور نقاہت میں
- تھکا دینے والی ورزش کے بعد
- وٹامنز کی کمی میں
- بچہ کو دودھ پلانے کے دنوں میں ماؤں کے لیے
- وزن کی کمی میں
- تغذیہ کی معمولی کمی میں
- استحالہ کی زیادتی میں
- بیماری کی شدت میں
- کام کے بعد کی تھکن میں
- طلباء کی ذہنی اور عقلی نشوونما میں۔

آج ہی اسے گھر میں سنکارا لائیے۔




لازمی بنیادی عناصر، وٹامنوں اور جڑی بوٹیوں کا نادر مرکب

# سنکارا
مشہور عالمی ٹانک — ہر موسم میں سب کے لیے

ہمدرد

HTA-828

# ترتیب




شمارہ نمبر ۷ — جلد ۶۰
۱۹۸۹ء

سرورق
ہم رقص

عملے
سلطان سبحانی


## محفلِ اپنی — کچھ شاعر کچھ آپ کے متعلق

شاعر کا یہ ۷واں شمارہ قارئین کی نذر ہے۔ شمارہ نمبر ۸ بھی متعقب ہے۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے شاعر کے شمارے شائع ہو رہے ہیں — ۱۹۸۹ء کے چار شمارے اور زیرِ تکمیل ہیں اور جلد جلد شائع ہوں گے۔ ۱۹۹۰ء کا افتتاحی شمارہ بھی زیرِ ترتیب ہے۔ پھر ایک خاص نمبر "اقبال نمبر — ۲" اور کئی موضوعاتی عام شمارے اور موضوعاتی خاص نمبر۔

شاعر اپنی عمر کے ساٹھ سال مکمل کرنے والا ہے۔ ادبی رسائل کی ایک تاریخ ساز روایت مزید مستحکم ہو رہی ہے۔ آزاد ہندوستان کی تاریخ کی ترتیب میں شاعر بھی شامل رہے گا۔ ایک مسرت آمیز خیال ہے مگر اس میں بے شمار دکھ بھی شامل ہیں۔

قارئین! شاعر کا ہر شمارہ ایک خصوصی شمارہ ہوتا ہے۔ اس کے مشمولات اور اندازِ پیش کش سے آپ کو اندازہ ہو ہی رہا ہے۔ محدود صفحات میں زیادہ سے زیادہ معیاری و متنوع مواد کی سمائی صرف اور صرف شاعر کا خاصہ ہے۔

شاعر ایک غیر تجارتی اور خالصتاً علمی و ادبی جریدہ ہے۔ اردو والے یہ بہ خوبی جانتے ہیں۔ اب اس غیر معمولی روایت کو محفوظ کرنا اور اس کے تسلسل کو برقرار رکھنے کا کام بھی تمام اردو والوں ہی کا ہے کہ یہ رسالہ کسی فرد، جماعت، گروہ یا کسی ادارے، صوبے یا اکاڈمی کا رسالہ نہیں ہے، یہ تمام اردو والوں کا رسالہ ہے، پوری اردو دنیا کا رسالہ ہے۔ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اردو شعر و ادب کے قارئین کا رسالہ ہے۔ آپ شاعر کے لیے کیا عملی و تعمیری کام کر رہے ہیں؟۔

ندا فاضلی کی خود نوشت "دیواروں کے بیچ" کو بے حد پسند کیا جا رہا ہے۔ اس شمارے سے مشہور افسانہ نگار جوگندر پال کا ناولٹ "خواب رَد" قسط دار پیش کیا جا رہا ہے —— بہت جلد منفرد افسانہ نگار سریندر پرکاش کا ناول "فسان" بھی شاعر میں پیش کیا جائے گا۔ شاعر میں کچھ اور معنوی تبدیلیاں اور تجربے متوقع ہیں۔ شاعر کو زیادہ سے زیادہ تازہ کار اور LIVE بنانے کی کوشش جاری ہیں۔ شاعر کو آپ کی قلمی معاونت تو حاصل ہے لیکن ضرورت ہے کہ آپ اپنے اس پسندیدہ ادبی رسالے کیلئے زیادہ سے زیادہ خریدار، تاعمر خریدار اور اشتہارات فراہم کریں۔ آپ شاعر کے لیے وسائل پیدا کیجیے ہم آپکے ذوق و وجدان کو اعلیٰ ترین معیار دیں گے۔ واضح رہے کہ شاعر کا ہر شمارہ تخلیقی شمارہ ہوتا ہے اور نئے نئے تخلیقی جہانوں کی دریافت ہمارا اولین مقصد۔ [ادارہ]

# عروضِ اشعار

معنفۂ رشید الدین محمد الوطواط

یہ تصنیف برٹش میوزیم لائبریری لندن کے اصل مسودہ شمارہ ۲۹۸۰۰۵ کے دوسرے حصّہ میں موجود ہے (اوراق ۴۲ تا ۴۵) آغاز ایک مختصر دیباچہ سے ہوتا ہے۔ اسی تصنیف کا ایک حصّہ برٹش میوزیم کے اصل مسودہ موجودہ شمارہ ۱۶۸۰۰۸ میں بھی پایا جاتا ہے (اوراق ۴۸ب تا ۴۹الف) (دونوں نسخوں میں کہیں کہیں فرق ہے) اس کا شمار فن عروض کی فارسی زبان کی قدیم ترین تصانیف میں ہو سکتا ہے۔

یہ منظوم بحریں مندرجہ بالا نوٹ کے ساتھ جناب محی الدین صاحب بی اے (بیرسٹر ایٹ لا) نے معاصر مومن گزٹ کما چہ میں اشاعت کے لیے بھیجی تھیں جو ناظرینِ شاعر کی دلچسپی اور طالبانِ فن کی معلومات کے لیے بشکریہ مومن گزٹ شایع کی جاتی ہیں —— ایڈیٹر

## بحرِ ہزج سالم[1]

ہزج را گر تمام ارکان ہمی خواہی از و بگذر  بگیر این قطعہ را یاد و بکن این وزن را از بر

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن  زہے با فر یزدانی زہے فرزند پیغمبر

## ہزج مسدس مقصور

چہار بحر ہزج خرم شود دل  شود آسانی جانہا بحاصل

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیل  چنیں تقطیع کردش مرد کامل

## بحرِ ہزج نوع دیگر

در بحر ہزج ساز تا خیر  خالی ز حساب آخرش گیر

مفعول مفاعلن مفاعیل  اے پاک دل خجستہ تدبیر

## بحرِ ہزج نوع دیگر

چو کفوف شود بحر ہزج ہست دل افروز  بدیں طرز بود دبیت کہ گفتیم بیاموز

مفاعیل مفاعیل مفاعیل مفاعیل  خوشت باد ہمہ عمر بہت باد ہمہ روز

## بحرِ ہزج اخرب

وزن ہزج اخرب از نیست میسر  ہر چند بخوانیش بود خوشتر و بہتر

مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن  ای رایت اقبال ز رای تو منور

## بحرِ ہزج نوع دیگر

در بحر ہزج زحاف بسیار آید  دیں وزن ہمہ ترانہ را کار آید

مفعول مفاعلن مفاعیلن فع  در تقطیعش ہمہ پدیدار آید

## بحرِ ہزج اخرب

جاناں ہزج اخرب ہست بغایت خوش  تقطیع کنش زیں سان آ و ز خوشت برکش

مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن  ہم جانی و ہم جاناں ہم دلبر و ہم مہوش

## بحرِ رمل مثمن مقصور

خوشتر است از بحرہا بحر رمل اتفاق  بیش باشد طبعہا سوئی نظمش اشتیاق

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات  اے تو آراستہ صدر خراسان و عراق

## بحرِ رمل مشکول

رملی کہ ہست خوشتر مشکول در زبانہا  برین نظم دلفریبش بغدا کنند جانہا

فعلات فاعلاتن فعلات فاعلاتن  زعمت زنند عشاق ہمیشہ داستانہا

## بحرِ رمل مخبون

رمل مخبون ماہست لطافت بکمال  چو کہ بر سنت تقطیع چنیں کن مہ و سال

فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلات  اے مبارک قدم خوش سخنی فرخ سال

---

[1] یہ منظوم قطعات غلط در غلط شایع کئے ہوئے تھے۔ مگر شاعر میں حتی الامکان ان کو صحیح کر کے شایع کیا جا رہا ہے۔ ایڈیٹر

## بحر رمل نوع دیگر

چون ز شش رکن رمل یافت نظام ، هست تقطیعش ازین گونه تمام
فعلاتن — فعلاتن — فعلات بسحر گاه شو ز خانه بجام

## بحر رجز مثمن سالم

بحر رجز را اگر تمام ارکان بخواهی در سخن بی ایچ شک تقطیع او چو پر همت زگو زکن
مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن ، هر روز بخت نو شود از گردش چرخ کهن

## بحر جبن وطن

جبن مطلعست در بحر رجز بهر بتان ، مفتعل نظم خوش شد مرا راحت روح و کام دل
مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن ای رخ نگار من زهره : مهر و مه خجل

## بحر سریع

بحر سریع است خوش و دلربا جمله ارکانش بود جانفزا
مفتعلن مفتعلن فاعلات هر چه بخواهی بعبادت خدا

## بحر منسرح مطوی

منسرح از بحر هاست خوشتر و بهتر بنام وزن خوشش هر دو من راحت و قیت کام
مفتعلن فاعلات مفتعلن فاعلات مطرب برد و بساز ساقی به پیش آر جام

## بحر منسرح نوع دیگر

منسرح است ای پسر چو نیک بدانی رکن مزل در و شد ست نهانی
مفتعلن فاعلات مفتعلن فع ، گردد معلوم چون بذوق بخوانی

## بحر خفیف

خوشتر از بحرهاست بحر خفیف وزن او اصل مثنوی لطیف
فاعلاتن مفاعلن فعلن کل شیئ من اللطیف ظریف

## بحر مضارع اخرب

چون پرسم از مضارع اخرب ز تو نشان تقطیع او چنین کن و در حال دو زبان
مفعول فاعلات مفاعیل فاعلات ای روشن از جمال تو خورشید و آسمان

## بحر مضارع نوع دیگر

نوعی است از مضارع بار کهنه اخرب تقطیع او چو کردی گردد سخن مهذب
مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن ای مه رخ نگار ای دلبر شکر لب

## بحر مقتضب

بحر خوب مقتضب است من نیک یعجب ست فاعلات مفتعلن از بحور منتخب است

## بحر مجتث مخبون سالم

بحر مجتث از ان طبعها شتاب کنند گز دهن شبه لولو خوشاب کنند
مفاعلن فعلات مفاعلن فعلات چنین کنند چو تقطیع او صحاب کنند

## بحر متقارب مقصور

چو اندر تقارب نهی پا درون به تقطیع وزنش چنین کن برون
فعولن فعولن فعولن فعول زهی دولت را فلک رهنمون

## بحر مجتث نوع دیگر

نظم را بعد ازین بحر مجتث گزین یاد کن بعد ازین بحر مجتث گزین
فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن آمد این وزن خوب اندرین آزمین

## بحر طویل

بحر طویل آید بسی شعر از نازی بمیان بود ارکان چو تقطیش سازی
فعولن مفاعیلن فعولن مفاعیل زهی دولت را با فلک حال دمسازی

## بحر مدید مطبوع

از مدید ار وزن خوش باز یابی گاه خوی پر برد بر شتابی
فاعلاتن فاعلاتن فعولن گر چنین دانی همی بر صوابی

## بحر بسیط

بحر بسیط شنو گر عاشق سخنی تقطیع او بعبث الا چنین بکنی
مستفعلن فعلن مستفعلن فعلن ای زلف دلبر من بربند و بر شکن

## بحر کامل

چو بحر کامل او قد طرف سخن هر رکن او بگه عروض چنین بکن
متفاعلن متفاعلن متفاعلن شو او دولت تازه چمن نو کن

## بحر وافر

ز وافر گر همی طلبی نشانی سر دگر بره همیشه در فشانی
مفاعلتن مفاعلتن فعول بزرگ زمین و نادره زمانی

## نامهای پانزده بحور شعر

گوییند نامهای پانزده بحر خنک کن تارهان شود به زبان
چون طویل است چون مدید و بسیط وافر و کامل و هزج پس از آن
رجز است و رمل پس از شش وزن پس سریع است و منسرح تو بدان
پس خفیف و مضارع از پس او کین دو وزنست بس خوش و آسان
مقتضب باشد آنگه و مجتث متقارب پس از همه اوزان



[left margin, vertical:] ابتدائیہ: ... شاعر مطبوعہ جنوری ۱۹۲۹ء کے شمارے ... ادارہ

❀ اردو کے قدیم ادبی رسائل میں وافر علمی و ادبی مواد کا بیش بہا خزینہ دفن ہے اس طرف ہمارے ثقہ محققین اور نئے ریسرچ اسکالرز نے کم توجہ دی ہے ۔ چند ایک ادبی رسائل کے اشاریوں تک ہی یہ کام محدود رہا ہے ۔ ان قدیم رسائل کا اپنا ایک چہرہ ہے اور اپنی بھرپور شخصیت بھی۔ ان میں ایک جہان آباد ہے ۔ شاعر (آگرہ) کی فائلوں میں ایسے بے شمار جہان پوشیدہ ہیں ۔ شاعر کی فائلوں سے گاہے گاہے نوادرات کی اشاعت



## کمال احمد صدیقی

◆

کچھ آپ کا در بدل گیا ہے
کچھ میرا بھی سر بدل گیا ہے
کچھ ذہن پہ بوجھ ہے زیادہ
کچھ مے کا اثر بدل گیا ہے
کیا گذری بتائیں بھیڑ میں کیا
چہرہ نہیں، سر بدل گیا ہے
کچھ راہبروں کی سازشیں ہیں
کچھ طرزِ سفر بدل گیا ہے
اس باغ کو کھا گئی ہے آندھی
ہر ایک شجر بدل گیا ہے
ساقی، مرا ظرف یاد رکھنا
پیمانہ اگر بدل گیا ہے
تنہائی سے دم نہیں الٹتا
یہ تو نہیں، گھر بدل گیا ہے
ہرچند حقیقتیں وہی ہیں
اندازِ نظر بدل گیا ہے
کچھ فن کے تقاضے اور ہیں اب
اسلوبِ ہنر بدل گیا ہے
تم کیوں نہ بچے کمال صاحب؟
ہر اہلِ نظر بدل گیا ہے!

◆

آپ جس کا ذکر کرتے ہیں، وہ اک دیوانہ تھا
وہ کمال!۔ اک انقلابی شعر تھا، افسانہ تھا
اس وفا ناآشنا سے میرا بھی یارانہ تھا
میری شیدائی تھی وہ اور اس کا میں دیوانہ تھا
یہ ہمارے عہد کے بارے میں لکھا جائیگا
جھوٹ اخباروں کی خبریں، سچ ہر اک افسانہ تھا
میکدے کے بعد اب لگتا نہیں ہے جی کہیں
آپ کہتے ہیں جسے جنّت وہ اک ویرانہ تھا
ہر جگہ انساں کا خوں ہے، ہر جگہ بارود ہے
خندقیں اب ہیں وہاں پہلے جہاں میخانہ تھا
قاتلوں کے ڈر سے کل شب اس طرح پہرا دیا
ایک میں تلوار تھی، ایک ہاتھ میں پیمانہ تھا
شیشہ لے کر دستِ ساقی سے، بھرا ساغر کمال
میکدے میں امتحانِ جرأتِ رندانہ تھا

◆

یہ ذکر آینہ سے صبح و شام کس کا ہے؟
جو گنگناتے ہو ہر دم، کلام کس کا ہے
بھرے ہوئے ہیں سبھی، صرف ایک خالی ہے
اگر یہ میرا نہیں ہے تو جام کس کا ہے
جو اہلِ ظرف ہیں پیاسے وہی ہیں محفل میں
یہ دور کس کا ہے، یہ انتظام کس کا ہے
ہمارے نام پہ کیا کیا نہیں ہوا ہے یہاں
ذرا پتہ تو چلاؤ نظام کس کا ہے
یہ انقلاب کے نغمے کبھی سناتا تھا
قصیدہ گو سے یہ پوچھو، غلام کس کا ہے
تمھارے راز جو افشا ہوئے ہیں دنیا پر
نہیں یہ کام تمھارا تو کام کس کا ہے
نشاں، سراغ نہ ہو، یہ تمھارا طرزِ خاص
یہ قتلِ عام مگر طرزِ عام کس کا ہے
کمال نے جو پڑھا وقتِ قتل مقتل میں
سُنا ہوا سا لگا، وہ کلام کس کا ہے

● بلاک نمبر ۴/پ جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی ۱۱۰۰۶۷



اقبال مسعود

معرفت روزنامہ ندیم، قمر منزل، ندیم روڈ، بھوپال - ۴۶۲۰۰۱

# بشیر بدر

مرزا تقی میر نے کہا تھا ؎

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام — آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

اور سلیم احمد کا خیال ہے کہ میر نے یہ شعر نہیں بلکہ آیت لکھ دی ہے۔ آیت شاید اس لئے کہ میر نے اس شعر میں پوری کائنات کو دیکھا، سمجھا اور محسوس کیا ہے۔ اور نہ صرف دیکھا سمجھا اور محسوس کیا ہے بلکہ دکھایا، سمجھایا اور محسوس بھی کرایا ہے۔ میر کے اس شعر میں ادراک و احساس کی جو سمت نظر آتی ہے وہ انتہائی نازک اور پر پیچ تخلیقی مرحلے سے گزرنے کے بعد ہی میسر آسکتی ہے۔ نازک اور پر پیچ اس لئے کہ فنکار عمل تخلیق میں روایت سے جدّت اور جدّت سے ایک نئی روایت پیدا کرتا ہے اور اس عمل میں فنکار کبھی روایت کے گھیرے سایہ میں گم ہو کر سورج کی روشن کرنوں سے محروم ہو جاتا ہے اور کبھی جدّت کی تلاش میں ایسے تپتے صحرا میں پہنچ جاتا ہے جہاں دھوپ کی تمازت اس کی شخصیت کو جھلس کر رکھ دیتی ہے۔ اس طرح دھوپ کی آفتوں اور سایہ کی مہربانیوں میں رہتے ہوئے اُس سے دامن بچا کر نکل جانے کا نام تخلیقی فن ہے۔ میر نے جس طرح اپنے شعر میں پوری کائنات کو محسوس کیا ہے اس میں تخلیق کا یہ نازک عمل بھی شامل ہے۔ جدید اردو عہد میں یہ شرف ڈاکٹر بشیر بدر کو حاصل ہے۔ اور وہ ان خوش نصیب شعراء میں سے ہیں جنھوں نے اپنے شعری سفر کے ۲۵ - ۳۰ سال کے اندر فن کی ان بلندیوں کو چھو لیا جہاں تک رسائی کے لیے بعض بزرگ شعراء ہنوز دشت امکاں میں اپنا پہلا نقش پا بھی ثبت نہیں کر پائے۔

موضوعات کا تنوع۔ ڈکشن کی ندرت، علامات کی تازگی۔ امیجری کا حسن۔ اظہار خیال پر فنکارانہ دسترس اور سہل ممتنع نے ان کو اپنے عہد کا منفرد و ممتاز شاعر بنا دیا ہے۔ بشیر بدر نے اپنے ابتدائی مجموعوں امیج اور اکائی سے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا لوہا منوالیا تھا مگر آمد تک آتے آتے ان کے اندر کا مصوّر شاعر اس طرح ابھر کر سامنے آگیا کہ اُردو کے سب سے سخت ناقد ڈاکٹر محمد حسن کو بھی یہ کہنا پڑا کہ "غزل گو کی حیثیت سے بشیر بدر کی صلاحیتوں پر ایمان لانا کفر ہے۔"

بشیر بدر احساسات اور نازک جذبات کے شاعر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا شعری سرمایہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ غزل کا نام سن کر ممکن ہے کچھ لوگ روایت پرستی کا الزام لگائیں تاہم روایت پرستی یا جدیدیت کا تعلق طرز احساس سے ہے نہ کہ ہیئت سے اور ڈاکٹر بشیر بدر کا طرز احساس آج کا طرز احساس اور مستقبل کا اشاریہ ہے آج کے طرز احساس میں اگر ہم ہندستان کا اور اضافہ کرلیں تو ان کی فکری اور فنی صلاحیتوں تک ہماری رسائی آسان ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آج کا طرز احساس ہے کیا۔ یہ دراصل صدیوں پر محیط انسانی احساس و ادراک کے سفر کا نتیجہ ہے اس کی تشکیل میں ہر ملک، قوم اور نسل نے حصّہ لیا ہے۔ یہ جغرافیائی حدود اور لسانی حد بندیوں سے آزاد ہے اس میں ہومر سے آج تک کی تمام بیدار اور حسّاس روحیں شامل ہیں۔ یہ انسان کی مشترکہ میراث ہے۔ کائنات کی کشف آور تعبیر ہے احساس کی اس آفاقی اور عالمی سطح سے ملی ہوئی دوسری سطح ہے جسے قومی سطح کہا جاتا ہے۔ اس سطح پر احساس کی صورت گری میں قوموں کے مخصوص حالات نمایاں حصّہ لیتے ہیں اور یہی حالات احساس کی آفاقیت کے لئے لباس فراہم کرتے ہیں بشیر بدر کی شاعری میں ملکی حالات، فسادات، تہذیب و تمدن کی پامالی، اقدار کی شکست، سیاسی رسّہ کشی اور ۲۰ویں صدی کی پیچیدگیاں سب نے پس پردہ رہ کر شعری پیراہن اختیار کر لیا ؎

خوبصورت اداس خوف زدہ — وہ بھی ہے بیسویں صدی کی طرح

ملازمتیں لوگ نہیں ہیں جو کہیں بھاگ سکیں — روز انسانوں کا سیلاب بڑھا جاتا ہے

[illegible] — زندگی ہم نقادوں سے کیا لے گئی

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

میری شہرت سیاست سے محفوظ ہے
یہ طوائف بھی عصمت بچا لے گئی

جی بہت چاہتا ہے سچ بولیں
کیا کریں حوصلہ نہیں ہوتا

خدا ہم کو ایسی خدائی نہ دے
کہ اپنے سوا کچھ دکھائی نہ دے

چمن پر جب گری بجلی قیامت ہو گئی برپا
نشیمن جل گئے کتنے چمن والوں سے مت پوچھو

مکاں کے ساتھ وہ آنگن بھی جل گیا جس میں
مہکتے پھول لیے پھولوں میں تتلی سوتی تھی

ان اشعار میں ہماری اسی شہری تہذیب اور صنعتی دباؤ کی جو عکاسی ہے اس کی صورت گری میں شاعر کی ذات بھی شامل ہے جو بشیر بدر کے پورے شعری سرمایہ کا خاصہ ہے۔ عدم تحفظ کا احساس ماضی کی بہترین روایت جو آہستہ آہستہ معدوم ہو رہی ہے۔ یہ سب ان کے وجود کا حصہ نظر آتے ہیں۔

بشیر بدر کی شاعری نے گزشتہ سو سالوں کے دوران اپنے ہم عصر شعرا اور نئی نسل پر گہرے اثرات مرتب کیے اور بقول بعض اب یہی راہ ادب کی مستند راہ قرار پائی۔ ان کی ایک غزل جس زمین میں ہند و پاک کے شعرا نے زبردست طبع آزمائی کی خاصے کی چیز ہے۔

اب ہوئی داستاں رقم بابا
انگلیاں ہو گئیں قلم بابا

آہٹیں چلمنوں سے پوچھتی ہیں
قید کب تک رہیں گے ہم بابا

کاغذی جوئے شیر لاتے ہیں
اپنا تیشہ یہی قلم بابا

سب سے پہلے تو غزل کی ردیف 'بابا' متوجہ کرتی ہے۔ بڑا ظلم ہوگا اگر اس غزل کو قنوطیت اور رجائیت کے عام پیمانوں سے ناپا جائے۔ یہاں دیکھنا یہ ہے کہ داستان رقم، انگلیاں قلم، کاغذی جوئے شیر اور قلم کو تیشہ بنا لینے کے جذبے نے ان شعروں کو کس طرح شعلہ بداماں بنا دیا ہے۔

بشیر بدر کی شاعری میں بنیادی عنصر کی تلاش اگر کی جائے تو وہ ہے محبت۔ ان کی پوری شاعری اسی ایک لفظ کے ارد گرد گھومتی ہے اور یہ جذبہ ان کے یہاں اس قدر وسیع صورت اختیار کر لیتا ہے کہ مکمل کائنات ان کی گرفت میں آ جاتی ہے:

دل محبت دین دنیا شاعری
ہر دریچے سے تجھے دیکھا کریں

گلابوں کی طرح دل اپنا شبنم میں بھگوتے ہیں
محبت کرنے والے خوبصورت لوگ ہوتے ہیں

بشیر بدر کی مکمل غزلیں ایک خاص کیفیت کی ترجمان ہوتی ہیں اگرچہ کچھ لوگ ان کو غزل مسلسل بھی سمجھ سکتے ہیں مگر ایک کیفیت کی غزل میں کسی تسلسل کی تلاش بے معنی سی چیز ہے۔ تسلسل نظم کی مزاج ہے اور غزل سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ایک کیفیت کی غزل کثرت سے وحدت پیدا کرتی ہے جب کہ نظم صرف خیال ہی کو لے کر آگے بڑھتی ہے۔ ایک کیفیت کی غزل بیک وقت ہجر و وصال دونوں حالتوں کا ذکر کر سکتی ہے اور اس میں تضاد بھی پیدا نہیں ہونے دیتی۔ غزل کی یہ ہم آہنگی باطنی کیفیت سے پیدا ہوتی ہے۔ جہاں غزل میں یہ باطنی عنصر نہ ہو وہاں مضامین کا تضاد ابھر کر سامنے آ جاتا ہے اور غزل کو بے کیف بنا دیتا ہے۔ بشیر بدر کی شاعری باطنی اظہار اور کیفیت سے کبھی خالی نہیں ہوتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں مضامین کے تضاد کے باوجود ایک ہم آہنگی باقی رہتی ہے۔

بھٹک رہی ہے پرانی دلائیاں اوڑھے
حویلیوں میں مرے خانداں کی خوشبو

سنا کے کوئی کہانی ہمیں سلاتی تھی
دعاؤں جیسے بڑے پاندان کی خوشبو

وہ عطردان کا لہجہ مرے بزرگوں کا
رچی بسی ہوئی اردو زباں کی خوشبو

گلوں پہ لکھتی ہوئی لا الٰہ الا اللہ
پہاڑیوں سے اترتی اذان کی خوشبو

چرواہا بھیڑوں کو لے کر گھر گھر آیا رات ہوئی
تو پنچھی دل تیرا پنجرا پنجرے میں جا رات ہوئی

سرخ سنہرا صافہ باندھے شہزادہ گھوڑے سے اترا
کالے غار سے کمبل اوڑھے جوگی نکلا رات ہوئی

سیاہیوں کے بنے حرف حرف دھوتے ہیں
یہ لوگ رات میں کاغذ کہاں بھگوتے ہیں

کسی کی راہ میں دہلیز پر دیئے نہ رکھو
کواڑ سوکھی ہوئی لکڑیوں کے ہوتے ہیں

چمکتی ہے کہیں صدیوں میں آنسوؤں سے زمیں
غزل کے شعر کہاں روز روز ہوتے ہیں

ریت بھری ہے ان آنکھوں میں آنسو سے تم دھو لینا　　کوئی سوکھا پیڑ ملے تو اس سے لپٹ کے رو لینا
اس کے بعد بہت تنہا ہو جیسے جنگل کا رستہ　　جو بھی تم سے پیار سے بولے ساتھ اسی کے ہو لینا
کچھ تو ریت کی پیاس بجھاؤ جنم جنم کی پیاسی ہے　　ساحل پر چلنے سے پہلے اپنے پاؤں بھگو لینا

کہاں تک مثالیں دی جائیں کہ بشیر بدر کے تینوں مجموعوں کی بیشتر غزلوں کا رنگ ہے۔ ان کے کلام میں یہ صرف ایک کیفیت ہے بلکہ ہم عصر احساس کی رجحانی بھی ان کی شاعری میں احساس کی اس صورت گری پر پشکن کا یہ قول یاد آتا۔ ہر کسی بچے کیلئے یہ کب ضروری ہے کہ جب اس کے دانت نکلیں تو وہ اپنی ماں کا سینہ ہی کاٹ ڈالے پشکن کا یہ قول روایت کو یکسر مسترد کرنے کے لیے ہے اور بشیر بدر نے اس کو اپنی شاعری میں اس طرح برتا ہے کہ ماضی کی شکست و ریخت کے باوجود اس کا احترام جمالیاتی یادوں کی شکل میں ابھر کر آتا ہے لیکن مستقبل کی تمام تر پیچیدگیوں اور حال کی کشمکش پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ وہ لکیر کا فقیر بنے بغیر اس پر آگے سفر کرتے ہیں اور اس دوران ایسے ایسے شعر لکھے ہیں کہ شاعری نگینوں کے جڑنے کا فن بن جاتی ہے۔ بہزاد مانی اور جاپانی مصوری کی یہ ایک باریک تفصیلات اور امیجری کو انھوں نے اس طرح شاعری میں اتارا ہے کہ یہ فن یہ انداز بشیر بدر ہی کا حصہ بن کر رہ گیا ہے۔ اردو غزل میں پہلی بار ایسی امیجری استعمال کی گئی ہے مثلاً یہ شعر

ہنسی معصوم سی بچوں کی کاپی میں عبارت سی　　ہرن کی پیٹھ پر بیٹھے پرندے کی شرارت سی

اس میں ریاست کی آبادیوں سے دور ایسے کی کیفیت اور ہرن کی پشت پر پرندے کی بھیڑ بھاڑ سے معصوم بچے کی شرارت کی عکاسی نئی لگتی ہے۔

یا پھر بڑے شہروں میں سرمایہ داروں اور لیڈروں کی غربا پرستی کا ڈرامہ ۔

وہ جیسے سردیوں میں گرم کپڑے دے فقیروں کو　　لبوں پر مسکراہٹ تھی مگر کیسی حقارت سی

شہری اور دیہاتی زندگی کی خارجی اور داخلی کشمکش :

اس میں ایک بھی بیل ایسی نہیں جو دیہاتی پرندے کے پر باندھ لے　　جنگلی آم کی جان لیوا مہک جب لائے گی واپس چلا جاؤں گا

دریا کے کنارے دھیرے دھیرے زرد شام نے سانولی اور پھر سیاہ ہوتی ہوئی ۔

ان گنت کالے کالے پرندوں کے پر ٹوٹ کر زرد پانی کو ڈھکنے لگے　　فاختہ دھوپ کی ریل پہ بیٹھی رہی رات کا ہاتھ چپ چاپ بڑھتا گیا

بڑے شہروں کی آبادی اور قدیم اور جدید تہذیب کی تصادم آرائی، بے وقت جانے پر گھر والوں کا چونکنا۔ زندگی کی دوڑ میں خوابوں کی شکست، بچوں کے لیے کہانی نہ ہونا۔ دیسی سڑک پر سے دھول اڑاتی لاری کا سفر ختم ہو جانا۔ انتظار میں دروازوں پہ دیے رکھنا۔ اخلاق، وفا، چاہت کا قیمتی کپڑوں کی طرح اوڑھنا اور اس طرح کے سیکڑوں موضوعات کو نئے تکان شعری حصہ بنانے کا فن بشیر بدر کا کمال ہے اگرچہ ابتدا میں انھوں نے سرخ مچھلی۔ ناف میں پھول ران پر تھلی۔ تلیاں۔ زنگ آلود چمچے۔ زرد کتا۔ جیسی تشبیہیں اور تمثیلیں استعمال کی تھیں جو قاری کے ابلاغ کا مسئلہ بن جاتی تھیں اگرچہ بعد میں بھی بشیر بدر نے اجنبی الفاظ اور غیر شعری تراکیب کا استعمال ترک نہیں کیا مگر وہ اس طرح شعر کا حصہ بن کر سامنے آتی ہیں۔ استعاراتی معنویت اور الفاظ کے صوتی آہنگ میں اجنبی نہیں لگتیں۔

ہنس پڑی شام کی اداس فضا　　اس طرح جائے کی پیالی ہنسی

بشیر بدر کی شاعری اور لہجہ قدیم اور جدید تمام شعرا سے الگ اور منفرد ہے۔ ان کی غم انگیزی اور لفظوں کا برمحل، نامعنی اور بھرپور استعمال مصرعوں کا سجیلاپن اور برجستگی ان کے عہد کے لکھنے والوں میں عنقا نہیں تو خال خال ضرور ہے۔

بشیر بدر کے یہاں احساس جس سطح سے بات کی جاتی ہے وہ میر کے اس شعر ہی کی طرح ہے کہ "لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام" ۔ یہ احساس اپنے گرد و پیش کے حالات سے پیدا ہوتا ہے اور کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بشیر بدر اپنے گرد و پیش کو اپنے پورے وجود میں اتارنے کے بعد شعر کہتے ہیں۔ گفتگو کرتے ہیں اور تنقید لکھتے ہیں اور اس وقت اس طوفانی فضا اور باطنی کشمکش کو دوبارہ زندہ کر دیتے ہیں۔ ——————
—————— جس سے گزر کر وہ یہاں تک پہنچے ہیں۔ احساس کے لیے نازک لمحات میں کسی کا اپنی رحمی روح کو صدیوں کی تھکی ہوئی آواز سے ہم رشتہ دیکھنا دکھوں کی دھوپ میں چھاؤں کی ٹھنڈک کو قریب کرنا ہے۔ بشیر بدر کی شاعری ماحول کی تپتی دھوپ میں چھاؤں کی راحتیں دریافت کرنے میں سرگرداں ہے اور انھیں معنی میں وہ RELEYANT اور نشاط انگیز ہے۔ ✱

# مٹھی بھر غزلیں

محبتوں میں دکھاوے کی دوستی نہ ملا
اگر گلے نہیں ملتا تو ہاتھ بھی نہ ملا

گھروں پہ نام تھے، ناموں کے ساتھ عہدے تھے
بہت تلاش کیا کوئی آدمی نہ ملا

تمام رشتوں کو میں گھر پہ چھوڑ آیا تھا
پھر اس کے بعد مجھے کوئی اجنبی نہ ملا

بہت عجیب ہے یہ قربتوں کی دوری بھی
وہ میرے ساتھ رہا اور مجھے کبھی نہ ملا

خدا کی اتنی بڑی کائنات میں میں نے
بس ایک شخص کو مانگا مجھے وہی نہ ملا

ہر اک چراغ کی لو ایسی سوئی سوئی تھی
وہ شام جیسے کسی سے بچھڑ کے روئی تھی

نہا گیا تھا میں کل جگنوؤں کی بارش میں
وہ میرے کاندھے پہ سر رکھ کے خوب روئی تھی

قدم قدم پہ لہو کے نشان کیسے ہیں
یہ سرزمین تو میرے آنسوؤں نے دھوئی تھی

مکان کے ساتھ وہ آنگن بھی جل گیا جس میں
مہکتے پھول تھے پھولوں میں تتلی سوئی تھی

خود اس کے باپ نے پہچان کر نہ پہچانا
ابھی جو پچھلے فسادوں میں لڑکی کھوئی تھی

اسی قبیلے کا اب آخری چراغ ہوں میں
کہ جس کے دل میں محبت خدا نے بوئی تھی

غزلوں کا ہنر اپنی آنکھوں کو سکھائیں گے
روئیں گے بہت لیکن آنسو نہیں آئیں گے

وہ دھوپ کے چھپر ہوں یا چھاؤں کی دیواریں
اب جو بھی اٹھائیں گے مل جل کے اٹھائیں گے

جب ساتھ نہ دے کوئی آواز ہمیں دینا
ہم پھول سہی لیکن پتھر بھی اٹھائیں گے

کہہ دو یہ سمندر سے ہم اوس کے موتی ہیں
دریا کی طرح تجھ سے ملنے نہیں آئیں گے

بدن کے سارے مراحل میں روح پیاسی تھی
اسی لیے وہ مجھے اجنبی سی لگتی تھی

بچھڑ کے تجھ سے کوئی بیس چار روز کے بعد
جو لڑکی ملی وہ بھی تیری جیسی تھی

ہوس کی آگ کو آنسو نے کر دیا سیراب
وہ بن کے آئی تھی عورت، ذرا سی بچی تھی

اسے یہ شوق تھا ہر رات اک نیا ہو بدن
دلال اب کے جو لایا اسی کی بیٹی تھی

ہمارے ہاتھوں میں اک شکل چاند جیسی تھی
تمہیں یہ کیسے بتائیں وہ رات کیسی تھی

مہک رہے ہیں مرے ہونٹ اس کی خوشبو سے
عجیب آگ تھی بالکل گلاب جیسی تھی

کسی نے رات حویلی کی کھڑکیاں کھولیں
قدیم عہد کی کوئی کتاب جیسی تھی

اسے ہمیں سب تھے، مری ماں، بہن بھی، بیوی بھی
سمجھ رہا تھا جسے میں وہ ایسی ویسی تھی

تمہارے گھر کے سبھی راستوں کو کاٹ گئی
ہمارے ہاتھ میں کوئی لکیر ایسی تھی

بشیر بدر

---

سلو بانو ہزار سالہ ایک تہذیبی قول ۔ مکمل عورت وہی ہے جو صبح کی پوتر پوجا کی طرح سار ہو
شام کے سائے میں جامنوں اور آموں کے باغ میں ساتھ کھیلنے والی بہن، دھوپ کے کھیتوں
میں ساتھ تپنے والی چنچل ساتھی اور رات کی سیج پر ویشیا ہو ۔ میں نے شاید اسی خیال
کو کسی دوسرے کردار کی زبان میں بیس سال پہلے کہا تھا۔

بلا کے رات کا رس رنگ شش بنائی تھی
سویرے لوگوں سے کہتی تھی دیوتا مجھ کو

(بشیر بدر)

باوضو ہو کے بھی چھوتے ہوئے ڈر لگتا ہے　دل مرا دل نہیں، اللہ کا گھر لگتا ہے
بن ترے ساتھ ستاروں سے گزر سکتا ہوں　کتنا آسان محبت کا سفر لگتا ہے
مجھ میں رہتا ہے کوئی دشمنِ جانی میرا　خود سے ملتے ہوئے تنہائی میں ڈر لگتا ہے
یہ بستی کبھی آباد نہیں ہو سکتی　کسی مظلوم کی آہوں کا اثر لگتا ہے
زندگی تو نے مجھے قبر سے کم دی ہے زمیں　پاؤں پھیلاؤں تو دیوار میں سر لگتا ہے

پتھروں میں تو پلکوں کی کماں رکھے ہیں　ان کی کیا بات ہے پھولوں کی زباں رکھے ہیں
ہم تو آنکھوں میں سنورتے ہیں وہیں سنوریں گے　ہم نہیں جانتے آئینے کہاں رکھے ہیں
قاتل بھی اسی روز سے شرمندہ ہیں　ہم بھی خاموش بہت اپنی زباں رکھے ہیں
کبھی ریت کا ساحل نہیں ہونے دیتے　ہم نے محفوظ وہ قدموں کے نشاں رکھے ہیں
من میں پوسیدہ ہے بچپن کی محبت اپنی　اب مرے گھر کے وہ دروازے کہاں رکھے ہیں

ان اک ماں کی رِدا ہے سر پر یہ چادر رکھنا　دروازے کی راکھ بھی گھر ہے مٹھی میں یہ گھر رکھنا
ہوئی ٹوٹی دیواریں مرے زخمی کاندھے ہیں　چاندنی رات میں نصب کر آیا ان پہ اپنا سر رکھنا
کاغذ پر میں لکھوں گا وہ کاغذ جل جائے گا　تتلی پر تیزاب چھڑکنا پھولوں پر خنجر رکھنا
... ہے تاروں کی لڑی سی صندل اور سیندور مانگ　رہے کلائی سدا کھنکی کانچ کے زیور رکھنا
... کیا تھا پیار کروں گا، پیاری ہے اپنی دھرتی　میں جب جاؤں مرے تن پر ماٹی کی چادر رکھنا

دل کی دہلیز پہ یادوں کے دیے رکھے ہیں　آج تک ہم نے یہ دروازے کھلے رکھے ہیں
ہم پہ جو گذری بتانا نہ سنائیں گے کبھی　کتنے خط اب بھی ترے نام لکھے رکھے ہیں
اس کہانی کے وہ کردار کہاں سے لاؤں　وہی دریا ہے وہی کچے گھڑے رکھے ہیں
آپ کے پاس خریداری کی قوت ہے اگر　آج سب لوگ دکانوں میں سجے رکھے ہیں

سب تارا سنے آئینہ خانے ہو گئے　رات روشن ہو گئی دن بھی سہانے ہو گئے
اس حویلی کے اجڑنے کا مجھے افسوس ہو　سینکڑوں بے گھر پرندوں کے ٹھکانے ہو گئے
... ہے کہ میں نے اس کو پہچانا نہ ہو　اب اسے دیکھے ہوئے کتنے زمانے ہو گئے
... کمروں سے آئینے اٹھا کر پھینک دو　بے ادب یوں ... میں ہم برے ہو گئے
... یہ آنسو پیار کی توہین تھے　اس کی آنکھوں سے گرے موتی کے دانے ہو گئے
... پیاسے پرندے آئیں گے کس کے لیے　جھیل کو سوکھے ہوئے کتنے زمانے ہو گئے

میں غزل کہوں میں غزل پڑھوں، مرے فن کو حسن و خیال دے
مرا غم ہی ہے مری ملکیت، مرے دل کو رنج و ملال دے

سبھی چار دن کی ہے چاندنی، یہ ریاستیں یہ وزارتیں
مجھے اس فقیر کی شان دے کہ زمانہ جس کی مثال دے

ہمیں دیکھ کر یہ ہوس زدہ بھی مثالِ برف پگھل پڑیں
اسے ایسا حسن و جمال دے مجھے ایسا عشق و جلال دے

مری صبح ہے ترے سلام سے میری شام ہے تیرے نام سے
ترے در کو چھوڑ کے جاؤں گا، یہ خیال دل سے نکال دے

مرے سامنے جو پہاڑ تھے سبھی سر جھکا کے چلے گئے
تجھے چاہیے تو یہ عروج دے جسے چاہے تو یہ زوال دے

ترے مجھ وں کے خلوص سے بڑی روٹیاں یہ کمائیں گے
ترے ناقدوں نے اٹھا لیے لیا ابھی ہنس کے انکو بھی مال دے

بڑا لطف ہے انھیں بھوکوں کو تکم ... باندھ کے سو رہوں
مجھے مال مفت حرام ہے مجھے دے تو رزق حلال دے

سبھی رسم میں، سبھی دولتیں، سبھی چاہتیں، سبھی عظمتیں
دل و جان سے مجھ کو قبول ہیں جو تو میری جھولی میں ڈال دے





جوگندر پال
۲۴ مسہ آئی انکلیو، کالکاجی نئی دہلی - ۱۱۰۰۱۹

# خوابِ رَو

قسط نمبر ۱

## محمد علی صدیقی کے نام

تم نے مجھ سے کہا، دیکھو، ذرا ادھر بھی تو دیکھو
میں نے جو سر اٹھایا تو دیکھتا رہ گیا۔

✿

یہ لکھنؤ ہے۔

ملک کی تقسیم پر جب لکھنؤ کے مہاجرین کراچی چلے آئے تو ذرا سنبھلتے ہی انھوں نے یہاں بھی وہی امین آباد کا چوک کھڑا کر لیا۔ ویسے ہی یہاں بھی چھ سات راستے ٹیڑھی میڑھی کیے اِدھر اُدھر سے بیک وقت آ داخل ہوتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ساری دنیا اِدھر ہی چلی آ رہی ہے۔ امین آباد میں آخر تل دھرنے کو جگہ نہ رہی اور مہاجرین امین آباد کے گرد و پیش بسائے جانے لگے، اور اس طرح ہوتے ہوتے پورا لکھنؤ آباد ہو گیا، صرف پرانا شہر ہی نہیں، نئے شہر کے بطن سے پیدا ہو کر نیا نویلا شہر بھی نواح میں اسی کھلواڑ کا سماں باندھنے لگا۔ کہتے ہیں کہ لوگ آتے جاتے رہتے ہیں مگر مقامات ہمیشہ وہیں مقام کیے رہتے ہیں، مگر یہاں تو مہاجرین دل ہی دل میں شہر کا شہر اٹھا لائے، کوئی اپنے گھر کی اینٹیں، کوئی جوں کا توں پورا گھر، کوئی ساری گلی، کوئی گلی سے باہر تیز تیز چلتی ہوئی سڑک —— جو بھی جس کے دل میں سما پایا، اور پھر جب کراچی پہنچ کر اُن کی سانس میں سانس آئی تو انھوں نے اپنے دلوں سے اینٹ اینٹ سارا شہر برآمد کر لیا۔ خدا جانے جہاں یہ شہر واقع تھا وہاں اب کیا رہ گیا ہوگا، یہاں تو اس کی یکسی کا یہ عالم ہے کہ کوئی کراچی کی سیر کو آئے تو اس سے بار بار پوچھا جاتا ہے، کراچی میں لکھنؤ دیکھا؟

رات کے آخری پہر جب امین آباد کی خاموش سڑکوں پر رنگ برنگی بتیوں سے آسیبی جگمگ ہو رہی ہوتی تو گھروں کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں لوگ اگ

ایسے سروں پر دراز گہرے خواب میں بدستور چوک کے دھکم دھکا میں طواف کر رہے ہوتے۔ شروع شروع میں تو منوا چوکیدار خوف و استعجاب سے سڑک پر لاٹھی مار کر آس پاس کی چکاچوند میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہ جاتا —— سارا چوک تو خالی پڑا ہے، اس اللہ ہو کے عالم میں میں کس سے ٹکرا جاوت ہاں؟ —— اور بھی تعجب کی بات یہ ہے کہ تھوڑے ہی دنوں میں اُسے واقعی سبھی لوگوں کی پرچھائیاں نظر آنے لگیں، اور پھر جو ہوا وہ یہ کہ منوا چوکیدار کو صرف چور دور نہ دکھتے، ہاں، یہ لوگ ہو بہو دکھنے لگے جو خواب کے راستے چوک میں نکل آئے ہوتے۔

"ارے بھیا، میرے اوپر کیوں چڑھ آوت ہو؟" اس رات پہلے تو منوا چوکیدار کسی سے ٹکرا کر اچھل کے پیچھے ہٹ گیا اور پھر جو چکاچوند دیکھا کہ یہ تو اپنے ہی دیوانے مولوی صاحب ہیں تو وہ بڑے ادب سے گویا ہوا۔ "سلاماں لیکم مولبی ساب۔"

"وعلیکم السّلام، منوا۔" دیوانے مولوی صاحب نے ذرا سا رک کر جیب سے دو کا نوٹ نکالا اور اسے منوا چوکیدار کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"سکریا، مولبی ساب۔ اللہ آپ کا سایہ ہمیشا ہمرے سروں پر کائم رکھے!" ابھی منوا چوکیدار 'آمین' کہہ کر اپنے ہاتھوں کی انگلیاں چوم ہی رہا تھا کہ دیوانے مولوی صاحب یہ جا وہ جا۔

"یہ یہ کیسے ہو سکت ہے منوا چاچا؟" چائے والے عزیزو نے چائے کی پیالی منوا چوکیدار کی طرف بڑھا کر پوچھا۔

بڑھیا، نہ ہوسکت ہے تو ہمرے پاس یہ دو کا نوٹ کدھر سے آرہے ہے؟"

منوا نے اسے دو کا نیا نوٹ نکال کر دکھایا۔

"کا پتہ، وہ کوئی بھوت ووت ہے ہے؟"

"بھوت ووت بھی ہے تو کا؟ ہمرے دیوانے مولبی ساب ہی تو ہاں۔

"منوا چوکیدار چائے کی چسکی بھرنے کے لئے ذرا ٹھہر گیا۔ اوروں کو چھوڑو اجیو، ہم نے تو تم کو بھی پیچھے بجار کی تریہ جاتے دیکھا۔"

"پر ہم تو اس وکھت کھاب کھرگوش کے مجے لوٹت رہن چچا۔"

"ہاں ایسے ہی تو ہووت ہے۔ سب لوگ گھر میں سووت سووت سڑکوں پر نکل آوت ہاں۔"

"تمری اُلٹی کھلٹی باتیں ہمری سمجھ سے باہر ہیں چچا۔ لوگ اگر سچ مچ سڑکوں پر پہنچے ہووت ہیں تو ہیں وراں کو بھی چائے کا دھندا کھولے رکھوں۔"

"دلوانے مولبی ساب تو ہر روح بھڑ میں سایہ دکھت ہیں اجیو۔"

"کمال کی باتیں سناوت ہو چچا۔"

دیوانے مولوی صاحب کا اصلی نام نواب مرزا کمال الدین ہے مگر وہ گھر باہر دیوانے مولوی صاحب کے نام سے ہی مشہور ہیں اور اپنا یہ نام سننے کے اس قدر عادی ہوچکے ہیں کہ کوئی انھیں نواب کمال الدین کہہ کر پکارے تو وہ یہی سمجھیں کہ پکارنے والے کو ان کی شناخت میں دھوکا ہوا ہے۔ دوسرے مہاجرین نے تو اپنی دانست میں کراچی میں ایک اور لکھنؤ بسا رکھا ہے مگر دیوانے مولوی صاحب کا حال ہے کہ وہ بدستور اپنے اسی پرانے لکھنؤ میں آباد ہیں۔ پہلے پہل تو بعض احباب نے انھیں سمجھانا چاہا کہ وہ وہاں سے یہاں آچکے ہیں مگر لکھنؤ میں بھی دیوانے مولوی صاحب کا یہی معمول تھا کہ لکھنؤ سے باہر جاتے تو جب تک لوٹ نہ آتے انھیں چین نہ آتا۔ وہ جہاں بھی جاتے انھیں لکھنؤ سے لکھنؤ ہی جانا ہوتا تھا۔ ان کی بیوی اچھی بیگم کا کہنا ہے کہ کراچی پہنچ کر ابھی ہم دم بھی نہ لے پائے تھے کہ ہمارے دیوانے مولوی صاحب کی رٹ شروع ہوگئی کہ واپس لکھنؤ چلو، اور کوئی بھلا آدمی پوچھ لیتا کہ اب لکھنؤ میں کیا رکھا ہے، تو فوراً جواب دیتے لکھنؤ!

"لو کر لو بات!" اچھی بیگم اپنا تبصرہ جاری رکھتے ہوئے بتاتی ہیں۔ "ہمارے نیچے یہاں، اقارب یہاں، جان پہچان والے یہاں۔ لکھنؤ میں تو صرف ایک لکھنؤ ہی باقی رہ گیا تھا، وہاں کیا ہم جھک مارنے جاتے، مگر دیوانے مولوی صاحب کو کون سمجھاتا، وہ تو اسی لیے وہاں جانا چاہتے تھے کہ ایک لکھنؤ ہی میں ان کا لکھنؤ ہے اور جہاں لکھنؤ وہاں وہ۔"

"تو پھر آپ ہمارے مولوی صاحب کو یہاں روکنے میں کیسے کامیاب ہوئیں؟"

"آپ کے دیوانے مولوی صاحب میری سن لیں تو انھیں دیوانہ کون کہے"، دیوانے مولوی صاحب کو یہ نام ان کی اچھی بیگم نے ہی دے رکھا ہے۔ اسی لیے غیروں کے منہ پر بھی اپنا یہی نام پاکر وہ انھیں اپنے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ "وہ تو خیر گزری بھائی، ہم لکھنؤ نہ لوٹے: لکھنؤ ہی یہاں چلا آیا۔"

"لکھنؤ ہی یہاں چلا آیا؟"

"ہاں، اور کیا، خاکستر تو ہو ہی چکا تھا، جتنا بچا کھچا رہ گیا ہمارے پیچھے پیچھے یہیں آن پہنچا۔ اتنی سی صورت نکل آئی تھی کہ کیا مجال، امین آباد کے کچھ حصّے سے بازاری بھی زیادہ دکھے۔ دیوانے مولوی صاحب نے دوڑ کر اسے گلے لگا لیا اور زار و قطار روتے رہے۔"

"پھر! بیگم صاحبہ؟"

"باقی کا قصہ تو یہاں ہمارا سارا لکھنؤ جانتا ہے۔ ٹوٹے پھوٹے امین آباد پر از سرِ نو بہار آنے لگی۔ پہلے شاخ پھوٹی، پھر وہ، اور پھر اتنی، جتنی تھیں، اور یوں ہمارا لکھنؤ جوں کا توں نظر آنے لگا، بلکہ اپنے آپ سے بھی چوکھا۔"

"پھر کیا ہمارے دیوانے مولوی صاحب نے واپسی پر کبھی اصرار نہ کیا؟"

دیوانے کی دیوانے ہی جانیں۔ اب یہ حالت تھی کہ ہم لوگ جب کبھی کہہ دیتے جانیے، ذرا ہو آئیے، اپنے باپ دادا کی قبروں پر فاتحہ پڑھ آئیں، تو فوراً جواب دیتے آپ نے دماغ گھاس چرنے چھوڑ رکھا ہے؟ کیا آپ کی اطلاع کے مطابق ہمارے آباد اجداد کی قبریں ولایت میں واقع ہیں؟ ——— ارے بھئی، فاتحہ ہی تو پڑھنی ہے۔ آؤ ابھی جاکے پڑھ آتے ہیں ——— میں سٹپٹا جاتی تو وہ ذرا ڈھیلے ہوکے کہتے، میری اچھی بیگم، ہمارا آبائی قبرستان کتنی دور ہے؟ دو گلی چھوڑ کے نظیرآباد کی پشت پر یہ چھوٹے ماموں کا مقبرہ اور یہاں سے دائیں طرف بس اتنی ہی دور جتنی دور تک آپ پتھر پھینک سکیں، یہ ہمارا آبائی قبرستان ——— اب میں ان کی منت سماجت کر رہی ہوتی، ہماری طبیعت ناساز ہے دیوانے مولوی صاحب۔ آج ہمیں نہیں جانا ہے، مگر وہ اپنی بات پر اڑ جاتے کہ دشمنوں کی طبیعت ذرا ناساز بھی ہے تو کیا؟ ثواب کا کام ٹالنا بھی گناہ سے کم نہیں۔"

اچھی بیگم کا یہ بھی کہنا ہے کہ دیوانے مولوی صاحب سارے لکھنؤ کو دیوانہ قرار دیتے ہیں ——— عجب وقت آن پڑا ہے! اپنے ہی شہر میں رہتے بستے کے باوجود ہر کسی کو یہی لگتا ہے کہ دیارِ غیر میں سانس باندھے جیے جا رہا ہے۔

"ارے میاں" وہ دور و نزدیک کے گھروں میں باری باری سمجھانے جاتے ہیں۔ "اللہ سے رجوع کرو اور پانچوں وقت نمازیں دل لگا کر پڑھا کرو۔ اس سے بڑھ کے کیا عذاب ہوگا کہ اپنے ہی گھر میں ہمہ وقت محسوس ہوتا رہے ہم کہیں اور بیٹھے ہیں؟"

"مگر مولوی صاحب ــــ"

"نہیں مولوی صاحب، اگر مگر سے کام نہ چلے گا۔ سارا شہر جب ایک ہی ساتھ سے دو چار ہو تو معاملے کی نوعیت بڑی سنجیدہ ہوتی ہے۔ کیا پتہ ہم سبھی اہلیان شہر کو کسی سابقہ گناہ کی پاداش میں قہر خدا کا سامنا ہو؟"

"مگر سنیے تو مولوی صاحب ــ"

"میں کیا سنوں میاں، آپ سنیے اور فی الفور اللہ پاک سے رجوع کیجئے"

کراچی کے لکھنؤ میں بسے ہوئے لوگوں کو سترے بہترے دیوانے مولوی صاحب کی باتیں سچی بھی لگتی ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ اگر یہ قہر الٰہی نہیں تو پھر ایسا کیوں ہے جیسے ہے۔ اس طویل مدت میں یہاں لکھنؤ کا پورا نقشہ بیس میں بسا لینے کے باوصف انھیں اپنے اندر ہی اندر یہ احساس کیوں کھائے جاتا ہے کہ وہ اپنے ہی گھروں میں اغیار کے مانند رہ رہے ہیں۔

نہیں کہ مہاجرین نے معاشی ترقی نہ کی ہو، معاشی طور پر تو بعض اعتبار سے نہ صرف سندھیوں بلکہ دوسرے مقامی پاکستانیوں سے بھی بازی لے گئے ہیں اور محنت اور حکمت عملی سے صوبائی اور قومی سطح پر تجارت، کارخانہ داری، سرمایہ کاری اور نوکرشاہی میں برابر حاوی ہوتے چلے گئے ہیں، اتنے حاوی ہو گئے ہیں کہ لکھنؤ کے راستے ہر جانب سے کراچی میں کچھ اس طرح کھل گئے ہیں کہ تھوڑے تھوڑے فاصلوں ہی پر میرٹھ، مراد آباد، ملیح آباد، اعظم گڑھ یا الٰہ آباد جا پہنچیے۔ چار پانچ برس پہلے دیوانے مولوی صاحب کا چچیرا بھائی ہندوستانی لکھنؤ سے ان سے ملنے آیا تو اسے حیرت سے اپنا دماغ اڑتے ہوئے محسوس ہونے لگا

"قبلہ مولوی صاحب کیا عرض کروں؟ مجھے تو معلوم ہو رہا ہے ہمارا اصل لکھنؤ دراصل یہیں واقع ہے، اور آپ نے ہمارے یہاں سے ہجرت نہیں کی شاید ہم ہی لوگ یہاں سے وہاں چلے گئے" دیوانے مولوی صاحب کے چچیرے بھائی نے پیپے بجتے پر داد طلب کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا

"ہم کہیں سے کہیں نہیں آئے برادر" دیوانے مولوی صاحب کو کھٹکا ہوا کہ ایک دو رہا گل سے پالا پڑ گیا ہے۔ "آپ جانا ہو تو رسٹ کا کام ہو ماسے جیسے آپ کا۔ وہی ایک مقام دو مقامات پر واقع نہیں ہوتا۔ ہمارا لکھنؤ واحد لکھنؤ ہے۔ کسی دوسرے لکھنؤ کو تسلیم نہیں کرے۔ آیا سمجھ میں؟" انھوں نے اپنے بیان کو زعفرانی زردے کا پان پیش کرنے کے لیے اس کی طرف اپنی چاندی کی ڈبیا بڑھائی۔ "اور سنیے، ممکن ہے شاید آپ کو حیرت ہو برادر، اگر آپ میری سچائی کو جھٹلائیں نہیں گے، مقامی لوگ بھی دراصل معاملے سے عبارت ہوتے ہیں۔ یقین نہ ہو تو منہ کھول کر دکھاؤں،

یہ دیکھیے۔ ارے حضت اور ہر ــــ آکر دیکھیے یہ نکلے ہیں نواب آصف الدولہ کی ٹھمری کی، مچل رہی ہوئی ہے ــ ہہ ہا ہہ ــــ ہہ ــــ

## ۲

کراچی کے مہاجرین کو یہی مشکل درپیش ہے کہ ایسے مقام سے عبارت ہونے کے باوصف مہاجرت پر مجبور ہو گئے اور ان میں سے اکا دکا تو صدمے سے پاگل ہو کر اپنے ذہنی تناؤ سے نجات پا گئے مگر جو پاگل نہ ہوئے وہ بھی بوکھلائے ہوئے ہیں کہ نواب آصف الدولہ کی ٹھمری کو سائیں بلھے شاہ کی کافیوں کے طرز میں جینے پر کیسے ترتیب دیں، جیسے یہ بھی ہے دو جداگانہ سروں کی پرامن ہم آہنگی تو ان کی باہمی ترتیب و تہذیب ہی سے ممکن ہے۔ سارنگی اور چمٹا بذات خود کتنے ہی کارگر کیوں نہ ہوں، ان کے جدا جدا سروں کے ناگہانی اجتماع پر یقیناً تصادم اور فساد کے شور ہی کا گمان ہوگا۔ برصغیر کی آزادی اور تقسیم کی ٹریجڈی میں تو یہ شور دبا رہا، تاہم اس ہمہ گیر ٹریجڈی کے بعد جب یہ اور پولیس کے ضوابط کا انعقاد ہونے لگا اور مہاجرین کے پاؤں جمنے لگے تو یہ شور و شغب واضح طور پر سنائی دینے لگا۔ ابھی سالوں میں نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ مقامی اور غیر مقامی شہریوں کے فسادات اور شور و شغب کے سوا اور کچھ سنائی نہیں دیتا، اور جہاں خاموشی طاری ہوتی ہے وہاں معلوم ہوتا ہے کہ کسی بھی لحظہ دھماکے سے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔

لکھنؤ کے نواب اصلاً نواب ہوں یا بطور تذکرہ، وہ بہرحال فطری نواب ہوتے ہیں، اتنے بردبار اور راسخ، کہ آپ بے شک انھیں پل صراط کی راہ پر ڈال کر جو، آپ کوئی آسان سا راستہ اختیار کریں وہ پھر بھی آپ سے پہلے منزل پر پہنچ کر آپ کی پذیرائی کی رسم ادا کر چکے ہوں گے، پھر آپ خواہ ہاتھوں میں بم لیے ان پر حملہ کو دوڑے ہوں، ان کے قریب پہنچ کر ان کی مسکراہٹوں پر رکھ رکھ کر آپ از خود ڈھیلے پڑ جائیں گے اور وہ بڑے تحمل سے آپ کے ہاتھوں سے بم لے کر اسے ایک کونے میں ڈال دیں گے اور آپ کو اطمینان سے اپنے ساتھ بٹھا کر مشورے، مصالحت کی دعوت دیں گے گویا آپ لڑنے بھڑنے کی بجائے اسی لئے آئے ہوں۔

مگر بی ایک بات سے کیسے بچے، حمدو؟" دیوانے مولوی صاحب کا بڑا بیٹا نواب مرزا اپنی دلہن چاند بی بی کو پیار سے چندو کہہ کے مخاطب کرتا ہے وہ ان اہلیان لکھنؤ کا معتمد اعلیٰ ہے اور جوتوں کے ایک بڑے کارخانے کا مالک جہاں کم سے کم سو سندھی اور کئی ایک پٹھان اور پنجابی کاریگر کام کرتے ہیں "حریف مخالف بھی استدلال سے کام لے، تب نا" وہ بستر پر ذرا سیدھا ہو جانا چاہتا ہے۔ "اب میرے کارخانے کے عملے ہی کو لے لو۔ پانچ دس کو چھوڑ کر سبھی نااہل اور کام چور ہیں۔ بھول چوک سے کبھی کسی کو موقوف کرنے کی دھمکی دیتا ہوں تو نوٹس دیے بغیر ہڑتال پر چلے جاتے ہیں۔" (باقی آئندہ)



## مصحفؔ اقبال توصیفی

◆

چشم و گوش پہ پہرے ہیں
اندھے ہیں سب۔ بہرے ہیں

دُکھ کی آنکھیں نیلی ہیں
دُکھ کے بال سنہرے ہیں

نقش ابھی ہے خام ترا
رنگ بھی تیرے گہرے ہیں

میرا کوئی نام نہیں
جانے کتنے چہرے ہیں

معنی پر کوئی قید نہیں ،
لفظوں پر کیوں پہرے ہیں

دھیان کے رس میں ڈوبے لب
بوسہ بوسہ چہرے ہیں

اشکوں کی بارش ہوگی
دُکھ کے بادل گہرے ہیں

گھر کا رستہ بھولے مصحفؔ
اک ہوٹل میں ٹھہرے ہیں

◆

ایک غم ہے اسے اپنا جانیں ،
اب کسی اور کو کیا پہچانیں ،

ہم کو برباد کر آباد بھی کر
جھوٹ اس انداز سے کہہ۔ سچ جانیں

خواب دیکھیں نئے سر سے تیرے
پھر ترے دھیان کی چادر تانیں

دل کے بازار کا نقشہ تھا عجیب
چاند نکلا تو کھُلیں دو کانیں ،

چھیڑتے ہیں اسے خود ہی مصحفؔ
اس کی باتوں کا بُرا بھی مانیں

● ۱۲-۲-۳۱۰ مرادنگر حیدرآباد ۲۸



## اخترؔ لکھنوی

پھر بند ہوائیں ہوئیں ، پھر بے خبری ہے
اس وقت نہ جانے کہاں شوریدہ سری ہے

اس شہر کی سب سے بڑی خوبی یہی دیکھی
جو شخص ہے اس میں ہنرِ کم نظری ہے

جو چہرہ بدلنے میں بہت طاق رہے ہیں
اب ایسے بھی لوگوں سے مری ہمسفری ہے

گھر والو بہت ہنس لئے اب یہ بھی تو سوچو
بس ختم ہمیں پر تو نہیں دربدری ہے

اب یہ ہے کہ پتّہ بھی ذرا سا کہیں کھڑکا
ہم شب زدگان سمجھے کہ بادِ سحری ہے

● ریڈیو پاکستان کراچی (پاکستان)



وزیر آغا

۵۸ سول لائنز، سرگودھا، (پاکستان)

# کھلونے!

میرے لیے اس حیاتِ مختصر کا ہر سال ایک کھلونے کی طرح ہے جس کے ساتھ میں پورے تین سو پینسٹھ دن کھیلتا ہوں پھر جب میرے ہاتھوں میں نئے سال کا ایک نیا نکور کھلونا تھما دیا جاتا ہے تو میں پرانے کھلونے کو پرے پھینک دیتا ہوں۔ لیکن کیا واقعی!

کیونکہ ہر کھلونا دراصل ایک خواب ہے اور خواب سے دست بردار ہونا کسی ذی روح کو بھی پسند نہیں۔ بچے کبھی تو محض اضطراری طور پر ہی پرانا کھلونا پھینک کر نئے کی طرف لپکتے ہیں۔ اکثر و بیشتر وہ دوبارہ اپنے پرانے کھلونے کو سینے سے چمٹا لیتے ہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں کہ پرانا کھلونا شکستہ ہو کر شاید عزیز تر ہو جاتا ہے۔ میں نے پورے تین سو پینسٹھ دن پچھلے برس کے شکستہ کھلونے کے ساتھ گزارے ہیں یا شاید اس نے میرے ساتھ گزارے ہیں۔ ہم دونوں ایک ساتھ لڑکھے ہیں، ایک ساتھ ہم نے گائے ہے، ڈھول بجائے ہیں، آنسو بہائے ہیں، لگاہے چھک چھک کرتے دوڑے ہیں، لگاہے چھم چھم کرتے ناچے ہیں۔ جتنے چرکے اس ایک سال میں مجھے لگے ہیں وہ سب کے سب اس بے چارے نے اپنے سینے اور چہرے پر جھیلے ہیں اور جتنے روگ اس کے اندر جمع ہو گئے تھے وہ سب کے سب مجھے لگ گئے ہیں۔ سال تو ایک ایسا دن ہے جس کے تین سو پینسٹھ چہرے ہیں۔ کیا یہ سب چہرے میرے اپنے چہرے نہیں ہیں؟ ــ برگلٹس نے کہا تھا کہ ہر روز ایک "نیا سورج" طلوع ہوتا ہے۔ اسے کہنا چاہئے تھا کہ ہر روز ایک "نیا چہرہ" طلوع ہوتا ہے بلکہ یہ کہ ہر دن بجائے خود ایک چہرہ ہے ــ ملائم، روشن، بے داغ! لیکن شام ہوتے ہوتے یہ چہرہ لہولہان ہو کر داغ داغ اجالے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

نئے کھلونے کی کوئی شخصیت نہیں ہوتی۔ اس کا نیا نویلا پن ہی اس کا سب سے بڑا عیب ہے۔ نیا کھلونا اس کورے کاغذ کی طرح ہے جس سے آپ کوئی بھی کام لے سکتے ہیں۔ آپ چاہیں تو اس سے ڈاک کا ایک لفافہ بنا لیں، چاہیں تو اس پر اپنی کسی انتہائی عزیز ہستی کو محبت کے دو حرف لکھ بھیجیں اور چاہیں تو اس پر روز کی جمع تفریق والے معمولات چسپاں کر دیں۔ لیکن ایک بار آپ اس سے جو سلوک کریں گے اسی سے اس کی شخصیت کے سارے نقوش بھی متعین ہوں گے۔ اس کے بعد یہ بے داغ، بے نام اور بے چہرہ کاغذ کا ٹکڑا نہیں کہلائے گا بلکہ لفافہ، رقعہ یا ڈائری کا نام پائے گا۔ کھلونا ننھے منے ہاتھوں میں جا کر ہی اپنی شخصیت کی تعمیر کرنے میں کامیاب ہوتا ہے ورنہ وہ دکان میں پڑے اپنے جیسے ہزاروں کھلونوں میں سے ایک ہے اور یہ ننھے منے ہاتھ! ــ ان میں سے ہر ہاتھ ایک شاخ ہے جو کسی نہ کسی بدن سے پھوٹی ہے اور یہ بدن! ــ اس بدن کی ایک اپنی شخصیت، اپنا نام اور اپنا چہرہ ہے، اس کی ایک اپنی نسل، اپنا گھر اور اپنا مزاج ہے۔ بعض بچے امیر گھرانوں میں پیدا ہوتے ہیں لہٰذا ان کے ہاتھوں میں ابھی کھلونے آ ہی چکے کہ پھسل بھی جاتے ہیں۔ بعض بچے غریب گھرانوں کے چشم و چراغ ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں جب کوئی کھلونا آتا ہے تو ہاتھ کے ساتھ اس طور چپک جاتا ہے جیسے یہ اس کی توسیع ہو۔ بعض بچے پرلے درجے کے تخریب کار ہوتے ہیں۔ شاید گھر میں اکلوتے ہونے کے باعث وہ بگڑ جاتے ہیں یا زیادہ ہونے کے باعث مجروح انا سے لیس ہوتے ہیں۔ زیادہ محبت ہو یا زیادہ نفرت، دونوں سے بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ سو جب بچے بگڑ جاتے ہیں تو ان کے ہاتھوں میں بھی توڑنے پھوڑنے کی جبلت جاگ اٹھتی ہے۔ خیر، صورت کوئی بھی ہو اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جب کوئی کھلونا بچے کے قبضۂ قدرت میں آتا ہے تو وہ اس پر اپنے اندر کی ساری گھٹن، نفرت، محبت با آسانی خرچ کر ڈالتا ہے اور یہ کھلونا؟ ــ یکایک یہ کھلونا کپڑے یا لوہے یا ربڑ یا پلاسٹک کی بنی ہوئی شے نہیں رہ جاتا بلکہ باقاعدہ سانس لینے، ہنسنے، رونے، بگڑنے یا پیار کرنے لگتا ہے۔ بچے کا ہاتھ جادوگر کا ہاتھ ہے۔ اس کے ہاتھ کے پہلے

ہی لمس سے بے جان کھلونے میں جان پڑ جاتی ہے اور طرفہ تماشہ یہ ہے کہ جب اس میں ایک بار جان پڑ جاتی ہے تو پھر وہ ایک جاندار ہی کی طرح جذبات کا اظہار بھی کرنے لگتا ہے۔ متخیلہ کے زور پر بے جان شے کو جاندار بنانا بچّے کا امتیازی وصف ہے۔ آج کل کے کھلونا بنانے والے چابی اور بیٹری اور ریموٹ کنٹرول کی مدد سے کھلونوں کو گھماتے، دوڑاتے اور نچاتے ہیں۔ یہ عمل بچوں کے ساتھ صریحاً زیادتی ہے کیونکہ ایسا کرنے سے بچوں کے ہاں متخیلہ کا عمل دخل رک جاتا ہے۔ پرانے زمانے کے کھلونا بنانے والے بخوبی جانتے تھے کہ انھیں کھلونوں میں مصنوعی طریق سے جان ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ بچّہ خود ہی بآسانی کھلونوں کو ذی روح بنا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ دیکھتے کہ کھلونا ملتے ہی بچہ اس سے دوستی کا ایک رشتہ قائم کر لیتا ہے، اس سے محبت بھری باتیں کرتا۔ کھلونا اگر گڈی یا گڈا ہوتا تو اس کا بیاہ رچاتا، اگر تھانیدار ہوتا تو اس سے ڈاکوؤں کی پٹائی کراتا، اگر وہ بھالو ہوتا تو اس کے ساتھ ناچتا اور وہ خوبیٔ قسمت سے بندر ہوتا تو پھر اپنے ہمزاد سے مل کر اسے بے پناہ خوشی ہوتی اور وہ اس کی معیت میں نئی نئی شرارتیں اختراع کرتا چلا جاتا مگر جب سے خودکار کھلونوں کا چلن عام ہوا ہے، بچّے کی حیثیت تخلیق کار کے بجائے ایک تماشائی کی ہو گئی ہے۔ اب اس کا کام صرف اتنا ہی رہ گیا ہے کہ وہ ہاتھ بڑھا کر کھلونے کا بٹن دبا دے اور پھر کھلونے کو ناچتے، دوڑتے، ڈھول بجاتے یا قلابازیاں لگاتے دیکھتا چلا جائے۔ اس سے کھلونا اور کھلاڑی دونوں کی آزادی سلب ہو گئی ہے۔ کھلاڑی کی اس طور کہ اب وہ کنارے پر بیٹھا کھیل کو بس دور ہی دور سے دیکھتا ہے۔ میدان میں اتر کر سچ مچ کے کھلاڑی کا روپ نہیں دھار سکتا اور کھلونے کی اس طور کہ اب اس کی حرکات متعیّن ہو گئی ہیں۔ وہ اب محض ایک یا چند ایک حرکات کے تابع ہو گیا ہے جب تک اس کی چابی یا بیٹری زندہ ہے وہ محض چند مخصوص حرکات کا مرتکب ہوگا۔ اس کے بعد وہ خاموش ہو جائے گا۔ پرانے زمانے کے کھلونے چابی یا بیٹری کے مرہونِ منت نہیں ہوتے تھے۔ وہ تو بچّے کے گرم ہاتھوں کی حرارت میں پگھلتے تھے یعنی باقاعدہ حرکت کرنے لگتے تھے اور عمرِ عزیز بچّے کی رفاقت ہی میں بسر کر دیتے تھے۔ بعد ازاں جب بچپن کی عمرِ طبعی اپنے اختتام کو پہنچتی تھی تو وہ بھی راہیٔ ملکِ عدم ہو جاتے تھے۔

مجھے کھلونے اچھے نہیں لگتے لیکن جب بچّے کھلونوں سے کھیل رہے ہوں تو بہت اچھے لگتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ بچّے تو کھلونوں سے کھیلتے ہیں اور ہم بچّوں سے۔ شاید زندگی بھر انسان کے ہاں کھلونوں سے کھیلنے کی جبلّت تر و تازہ ہی رہتی ہے۔ آخر بچّے کھلونے ہی تو ہیں! جب ہم ان سے کھیلتے ہیں تو واپس اپنے بچپن میں پہنچ جاتے ہیں۔ جبھی تو ہماری حرکات و سکنات میں بچّے کی سی معصومیت، بے تکلفی اور انہماک پیدا ہو جاتا ہے۔ ہم بچّے سے اسی کی توتلی زبان میں بات کرتے ہیں اور بچّے کی غیر ارضی دنیا کو (جو اس کے متخیلہ کی پیداوار ہے) حقیقی قرار دے لگتے ہیں۔ تب ہم بچّوں کے ساتھ مل کر کھلونوں کے رہن سہن، ان کے دکھوں، خوشیوں، لڑائیوں، شادیوں اور مقدمہ بازیوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ لیکن سارا نہیں! کیونکہ بچّہ جب کھلونوں سے کھیلتا ہے تو انھیں واقعی ذی روح سمجھتا ہے۔ دوسری طرف ہم جب بچّے کے ساتھ مل کر اس کے کھلونوں سے کھیلتے ہیں تو ہمہ وقت ہمیں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ ہم فقط بچّے کو خوش کرنے کے لیے یہ ناٹک کر رہے ہیں لیکن خود ہمارے اندر کھلونوں سے کھیلنے والا جو "بچّہ" چھپا بیٹھا ہے وہ زندگی کے دیگر گھمبیر معاملات میں کھیل کی جبلّت کا اسی طرح مظاہرہ کرتا ہے جس طرح کہ ایک سچ مچ کا بچّہ! مثلاً آپ نے دیکھا ہوگا کہ اکثر لوگ روپیہ پیسہ جمع کرنے کے معاملے میں بالکل بالک بن جاتے ہیں۔ جتنا روپیہ وہ جمع کر لیتے ہیں یا مزید جمع کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی انھیں قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔ اس سے کم یا بہت کم رقم سے بھی وہ ایک خاصی اچھی زندگی گزار سکتے ہیں لیکن وہ تمام وقت روپیے سے کھیلتے ہیں تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ان کے اندر چھپا ہوا بچّہ روپیے کو بھی ایک کھلونا ہی سمجھتا ہے۔ حالانکہ روپیہ محض ایک "ذریعہ" ہے حاصل نہیں ہے جب کہ کھلونا "حاصل" ہے ذریعہ نہیں ہے۔ بچّہ جب کھلونوں سے کھیلتا ہے تو اس کے پیش نظر لطف اندوزی کے سوا اور کوئی مقصد نہیں ہوتا لیکن جب کوئی بالغ روپیہ جمع کرتا ہے تو اس لیے کہ وہ اس "قوت" سے زندگی کی آسائشیں خرید سکے۔ اب اگر اس نے روپیے کی مدد سے زندگی کی جملہ آسائشیں حاصل کر لی ہیں لیکن وہ پھر بھی روپیہ جمع کرنے کی بیماری میں مبتلا ہے تو اس کا مطلب سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ اب اس کے لیے روپیہ ذریعہ نہیں رہا بلکہ کھلونا بن گیا ہے۔ بس سارا بگاڑ اسی سے پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ کھلونا ابتدا میں بھی کھلونا تھا اور دمِ آخر تک بھی محض کھلونا ہی رہے گا جب کہ روپیہ ابتدا میں ذریعہ تھا مگر اب کھلونا بن گیا ہے۔

کھلونوں کو ذی روح بنانا تخلیق کاری کا مظاہرہ کرنے کے مترادف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی ابتداً مٹی کے ایک کھلونے ہی میں روح پھونکی تھی اور وہ متحرک ہو گیا تھا۔ بچّہ صحیح معنوں میں تلمیذ الرحمان ہے کہ ہمہ وقت کھلونوں ایسی بے جان اشیا کو زندوں کی صف میں لانے کی سعی کرتا ہے۔

[باقی صفحہ ۲۴ پر دیکھیے]



## لطف الرحمان

آج تک بہکا ہیں باہر سے دیوانہ ترا
حوصلے میری نگاہوں کے ہیں پیمانہ ترا

رات بھر شبنم کی آنکھوں سے سحر کی مانگ میں
میں جسے لکھتا رہا وہ بھی تھا افسانہ ترا

یہ ترے دریا سلامت، یہ ترے بادل بخیر
لٹ رہے ہیں خم پہ خم ثابت ہے میخانہ ترا

آنسوؤں کی آب جو حائل ہے ورنہ الاماں
میری نظروں کا شرر، آنکھوں کا خس خانہ ترا

دل میں دھڑکن کی طرح، سانسوں میں خوشبو کی طرح
اب خیالوں میں بھی کب آتا ہے وہ آنا ترا

اوّل اوّل وہ تمازت دوپہر کے دشت کی
آخر آخر اپنی نظروں کو جھکا جانا ترا

شہر بھر کے ہاتھ میں پتھر تھے، اس کے باوجود
میرے حق میں فیصلہ اتنا شجاعانہ ترا

ریزہ ریزہ کر گئی پتھر کو بھی شبنم کی چوٹ
ہائے کس دل سے مگر وہ مجھ کو سمجھانا ترا



## رحمن جامی

ہو گئے جب ترے ہمراز یہ صورت کر لی
ہم نے ہر بات پہ چپ رہنے کی عادت کر لی

اور کیا کرتے محبت کے سوا ہم تجھ سے
کچھ نہ سوجھا تو خود اپنے سے عداوت کر لی

دیکھتے رہ گئے ہم چھنتا ہوا حق اپنا
اور ہر شخص نے خود اپنی ہی خدمت کر لی

اب نہیں ہم کو نصیحت کی ضرورت ناصح
خود ہی بگڑے تھے بہت خود ہی ہدایت کر لی

اس کو سچ جان کے اب تک ترے وعدے پہ جیے
اک فسانہ تھا جسے ہم نے حقیقت کر لی

کیا پتہ تھا کہ یہی چھیڑنے گی دشمن
ہائے انجانے میں کیا ہم نے حماقت کر لی

منہ نہ لگ اب مرے اے سلسلۂ تنہائی
آج تک میں نے بہت ہی تری عزت کر لی

کاٹ دی تو نے ہر اک بات ہماری جامیؔ
تجھ سے اب ہم نہیں بولیں گے یہ نیت کر لی



## دیپک قمر

نظر آیا نہ کوئی بھی اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا
وہاں پہنچے تو اپنے آپ کو بھی بے نظر دیکھا

یہ دھوکا تھا نظر کا، یا فرشتہ سبز چادر میں
کہیں صحرا میں لہراتا ہوا اس نے شجر دیکھا

کہیں پہ جسم اور پہچان دونوں راہ میں چھوڑ آئے
خود اپنے آپ کو ہم نے نہ اپنا ہم سفر دیکھا

بنے کیا آشیاں، تازہ ہوا نہ پیڑ کے جھرمٹ
کسی اڑتے پرندے نے نئے یگ کا نگر دیکھا

لگے تھے آئینے چاروں طرف شاید محبت کے
نظر کے سامنے تھا بس وہی ہم نے جدھر دیکھا

زمیں کی سیج پر سائے کی چادر اوڑھ کر سویا
کسی بنجارے سیلانی نے رستے میں ہی گھر دیکھا

کبھی ہم ڈوب جائیں گے اسی میں سوچتے ہر دم
ہمارے دل نے جب دیکھا خیالوں کا بھنور دیکھا

احمدیہ بلڈنگ، ماتارپور روڈ، بھاگل پور ۲
۳/۷/۲۰-۸ ۔۷۔۱۱۲۔ الحرا بل کالونی، مراد کالونی حیدر آباد ۲۸
۱۸۵/ ابو لین۔ میرٹھ ۲۵۰۰۰۱



حمید سہروردی

صدر شعبۂ اُردو، شرنبسی کے ایس، کے کالج، بیدر-۴۳۱۱۲۲

# خواب در خواب

اس نے دیکھا

اور میں نے بھی دیکھا۔

دونوں کی نظریں ایک ہوئیں۔

درمیان میں کوئی نہیں تھا۔

اردگرد کوئی نہیں۔

کوئی نہیں تھا مگر کسی کے ہونے کا شدید احساس پیدا ہو چکا تھا۔

اس نے دیکھا تھا کہ آنکھیں خواب ہوتی ہیں۔

اور میں نے دیکھا تھا کہ آنکھیں بہت کچھ بولتی ہیں۔

طویل وقفے، طویل وسوسوں کو جنم دینے کا موجب ہوتے ہیں۔

اس نے دیکھا۔

اور میں نے بھی۔

درمیاں کوئی نہیں تھا۔

پر کسی کے ہونے کا احساس شدید ہو گیا تھا۔

آنکھیں زبان بن گئی تھیں۔ درمیان کوئی نہیں تھا۔

اس کی آنکھیں شاعروں کی دھڑکنیں تھیں۔ جب آنکھیں جھکتی تھیں تو ایک محشر برپا ہوتا تھا اور اٹھتی تھیں تو زندگی کی دھڑکنیں۔

اُس نے اس کے سوا، اور کچھ نہیں کہا تھا کہ آنکھیں خواب ہوتی ہیں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں خوش آئند خواب ہی دیکھا تھا۔ بجز اس کے کہ وہ حقیقت تھی اور خواب تک، سفرِ حیات کا حوالہ تھا۔

ایک چاند اپنا سفر پورا کر کے چلا گیا۔

شیریں نے اتنا ہی کہا تھا کہ چاند دن پورے کر لیتا ہے تو، ادھورے خواب آگے بڑھ کر مکمل ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

میں نے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ چاند بدلیوں میں سے ہٹتا ہوا نمایاں ہونے لگتا ہے تو رات کا شدید احساس ہونے لگتا ہے۔

میری بات سن کر شیریں کی پلکیں جھک گئیں۔ اس نے پہلی بار زبان سے کہا کہ ہر مرد، مرد ہونے پر ہی فخر کرنے لگتا ہے۔ پر وہ یہ نہیں جانتا کہ چاند پورا ہو کر بھی ادھورا ہی رہ جاتا ہے۔

چاند ہم دونوں کے سروں پر تھا اور ہم دونوں آمنے سامنے شیریں نے اپنی آنکھیں، ڈوپٹہ سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ وہ دن بھی گزر گئے جب ابتدا، درمیان اور آخر سب کچھ اب صرف ابتدا ہی ابتدا ـــــ

حالانکہ مرد کو یہ سوچنا چاہئے کہ عورت کو عورت ہونے پر فخر ہے۔ نظروں کے سامنے پھیلے ہوئے اور نمایاں ہوتے ہوئے، تمام کے تمام مظاہر میں عورت ایک زبردست استحکام رکھتی ہے اور اگر مرد کو مرد ہونے پر فخر ہے اور عورت دوسرے درجے میں آئے گی تو بھی اسے ان باتوں سے منحرف نہیں ہونا چاہئے کہ وہ عورت کے بغیر ایک نامکمل وجود ہو کر رہ جائے گا۔ مگر تم سلطان، تم اور تمہارے ساتھی مرد اپنے وجود کو نامکمل سمجھتے ہی نہیں۔ اور پھر ادھر اُدھر سرگرداں رہتے ہیں۔ مگر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اپنی ساری توانائی کو یوں نظرانداز کرتے ہو کہ تمہیں سب کچھ مل گیا ہے.... تھوڑی دیر رکو اور غور کرو۔ تمہارے بغیر اور تم میرے بغیر کیا ہو؟ اور تمہارے اور میرے سر پر چاند، جو بدلیوں میں سے ہو کر ہماری میانی کو تیز تر کر رہا ہے کس طرح پہچان بنا لیتا ہے۔ اور پھر تمہاری تمثیلی، استعاراتی اور علامتی گفتگو.. کبھی غور بھی کیا ہے؟

تم نے ٹھیک کہا۔ کس نے کہا کہ مرد اپنے مرد ہونے پر فخر کر کے عورت کو دوسرے درجے تک لے آتا ہے۔ شاید یہ تمہارے ذہن کی کوتاہی اور احساس کے محدود ہونے کا نتیجہ ہے۔ ورنہ ان تمام مظاہر میں تم بھی اتنی ہی اہم ہو، جتنا کہ مرد ـــــ تم نے کہا ہے تو سوچو، جب تک عورت اپنے وجود کو اپنے اعتماد سے پُر نہیں کر لیتی، تب تک اسے کوئی وجود، یعنی مرد

ریزہنس کر سکا۔ عورت تو خود کو مجازی زبان میں رنگ لینا چاہتی ہے۔ مرد کو اس سے کوئی لمحہ بچا نہیں سکتا کہ وہ عورت کو اس لمحے میں حیات دے یہ مرد کی عالی ظرفی ہوئی۔ تم تو اب سبھی جگہ ہو۔ مرد کے شانہ بشانہ تم اگر خفا نہ ہو تو کہوں — فلم کے اشتہارات ہوں کہ ٹی۔ وی کے اشتہارات تم ہی تم ہو۔ پھر مرد کو کیوں ناحق بدنام کرتی ہو۔ میں نے کہا نا کہ تم ہر وقت تحفظ چاہتی ہو۔ اور اسی تحفظ نے مرد کے حوصلوں کو بلند کر دیا — تم تاریخ کے اوراق پر نظر ڈالو، تم نے سلطنتوں کو سہارا دیا ہے، تم نے غیر معمولی ذہن کی اولاد کو جنم دیا ہے۔ مگر پھر بھی وہی غیر یقینی — کیوں — کس لیے؟

شیریں، تم اپنی ذات کو استحکام بخشو — پھر کوئی ایسا لمحہ نہیں آئے کہ تم خود کو بے سہارا سمجھو — میں اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ بس میں اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا وہاں سب کچھ تھا۔ لیکن میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا —

شیریں کے چہرے پر ہلکی ہلکی اداسی تول رہی تھی۔ شیریں بھی کیا کرتی! ایک دن اس نے اپنی آنکھوں کو کاجل سے سجائے، ہاتھوں کو مہندی سے سنوارے پورے شریر پر اپنے ہونے کا احساس دلانے آئی تھی۔ اور میں نے کہا تھا کہ تم اب پوری معشوق لگ رہی ہو۔ شیریں ایک لمحے کے لئے شرمائی اور خاموش بیٹھی رہی۔ کچھ تو کہا ہوتا۔ کچھ نہ کہا — میں کہتا رہا تھا کہ ہاں شیریں! تم مرد کے سامنے ہونے کے احساس کے ساتھ ہی جسم ہی جسم بن جاتی ہو — مرد کے سامنے تم عورت ہی عورت کیوں نہیں، اور پھر مرد کے شانہ بشانہ چلنے کا ارادہ رکھتی ہو — ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ تم جسم بھی ہو اور ذہن بھی — تو پھر تمھارا وہ احساس ہی ختم ہو جائے۔

شیریں کی آنکھیں سرخ ہو گئیں —

نہیں تم غصہ نہ ہو — میری باتوں پر غور کرو۔ خاموشی سے دور ہونے کی کوشش نہ کرو۔ میں نے کوئی ایسی بات کہی ہو کہ تمھارے لئے ناقابل برداشت ہو تو میں تم سے یہی کہوں گا کہ تم بھی اسی طرح سوچتی ہو، جو عام طور پر عورت کے بارے میں سوچا جاتا ہے۔ کیا میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ تم بھی صرف جسم ہی جسم بن کر رہنا چاہتی ہو — ؟

کیا تم بھی چاند کی طرح دور ہوتی جا رہی ہو ؟ یاد رکھو! چاند تو مکمل ہوتا ہے مگر عورت کبھی مکمل نہیں ہوتی۔ تم ناراض ہو جاؤ گی مگر سچ کا کوئی انت نہیں شیریں نظریں اٹھاؤ — میری طرف دیکھو — میں تمہیں ناراض نہیں کرنا چاہتا — میں اور تم ایک فریب سے دوسرے فریب تک محدود رہنا چاہتے ہیں، تو یہ بھی ممکن نہیں۔ میں شعوری طور پر فریب کو برداشت کر لوں گا۔ کیا تم فریب ہی فریب بن کر رہنا پسند کرو گی — ؟

شیریں کی آنکھیں چاند کا سفر نامہ تو ہو سکتی ہیں مگر وہ عورت بن کر اپنے وجود کو کیسے سنبھال سکتی ہے ؟

شیریں میں تمھیں عورت ہی عورت بھی رہنے کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں۔ ذرا سوچو تم عورت بن کر ہی معشوق اور ماں بن سکتی ہو صرف معشوق بنے رہنا کسی بھی عورت کو قبول نہیں۔ تم مرد کے ساتھ وہاں تک جانا چاہتی ہو، جہاں تک صرف مرد ہی جا سکتا ہے۔ شاید تم پر میری باتیں ناگوار گزر رہی ہوں —

شیریں خاموش تھی — اور — اور میں بھی خاموش ہی رہا۔

لگتا ہے کہ چاند بھی خاموش ہے اور ساری کائنات کے مظاہر بھی خاموش ہیں۔ اور اپنے آپ کو مستور ہی رکھنا پسند کرتے ہیں۔

شیریں کی نظریں اٹھی تھیں۔ وہ بہت بولی رہی مگر سارے لفظ دھیرے دھیرے ماضی کا ورثہ بنتے چلے گئے۔ ماضی جو حال اور مستقبل پر پوری طرح حاوی اور جاری رہتا ہے۔ کیا شیریں ماضی بن کر بھی آج تک حال کی سرگرمی اور مستقبل کا سہارا بن سکتی ہے۔

شاید کہ ہاں — شاید کہ نہیں

ایک دن میں نے بھی سوچا کہ ماضی سے کون سا رشتہ — رشتہ تو شیریں سے ہے۔ مگر کون سا۔ ؟ شیریں تو دور بہت دور چلی گئی ہے شیریں نے ایک دن کہا تھا کہ تمھارے اور میرے درمیان رشتہ کیوں نہیں ہو سکتا — ؟

میں نے بھی اس کی بات پر پورا زور دے کر کہا تھا۔ ہاں میرا اور تمھارا رشتہ ہو سکتا ہے لیکن تم ہی آزادیٔ نسواں پر ساری توجہ صرف کر رہی ہو۔ یہ ضرور ہے کہ ہر عمل کے حدود ہوتے ہیں۔ سوچو آدمی یعنی مرد ہو کہ عورت اپنی ریکھاؤں سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ ہر ایک کی اپنی اپنی ریکھائیں، ان کا تقدس اور احترام ہو سکتا ہے، تم خود سوچو جب سیتا دیوی لکشمن ریکھا عبور کر گئیں تو ایک ہنگامی باب وا ہو گیا —

پھر میں نے خود اپنے آپ سے سوال کیا کہ شیریں اور میرے درمیان رشتہ کیوں نہیں بن سکا؟ صرف ماضی کا ورثہ کیوں بن کر رہ گئے ہم دونوں — ہر وقت اضطراب — گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا — کیوں میں سوچتا ہوں کہ رشتہ کیوں نہیں بن سکا ؟۔

شیریں نے کہا تھا۔ تم نے اس طرف توجہ ہی نہیں دی اور اب شیریں ماضی کا ورثہ بن کر رہ گئی ہے۔

## تصوّر کرتپوری

بیادِ ماضی ہیں اب نوحہ خوانیاں کیا کیا
دکھا گیا ہمیں دریا روانیاں کیا کیا
کہیں پہ خاک نشیمن کہیں پہ سوختہ گل
بہار چھوڑ گئی ہے نشانیاں کیا کیا
خود اپنے سوزِ دروں میں ہی جل کے خاک ہوئیں
چراغِ خانہ کی صورت جوانیاں کیا کیا
طریقہ یہ بھی ہے شاید جراحتِ دل کا
بڑھا کے تو نے سنائیں کہانیاں کیا کیا
ہزار زاویے پنہاں تھے اک جھلک میں تری
بتا رہا ہے زمانہ نشانیاں کیا کیا

● سیالکوٹ (پاکستان)

## سیّد معراج جامی

رات جیسے بھی ہو بسر ہو گی
جاگ جائیں گے جب سحر ہو گی
کس کو دیکھیں گے، دیکھ کر مجھ کو
آئینہ ہو گا اور نظر ہو گی
میرے لہجے میں کچھ نیا پن ہے
میری پہچان صوت پر ہو گی
ہم غریبوں کی کون سنتا ہے
آپ کی بات معتبر ہو گی
وقت اپنا گزار کر سمجھا
داستاں اتنی مختصر ہو گی

● آر۔۲۔۵، سیکٹر ۱۵۔بی، بفرزون نارتھ کراچی

## نیاز حسین لکھویرا

ساری بستی نکل پڑی گھر سے
لوگ مرنے لگے ہیں پھر ڈر سے
کاش ہم تم کچھ اس طرح سے ملیں
جیسے دریا ملے سمندر سے
ایک گل رو کی فرقتوں کے طفیل
ہم بھی اب ہو گئے معطر سے
اتنی گھمبیر بے سکونی تھی
شہر والے سکوں کو ترسے
خواہشیں بے لگام ہیں اپنی
پاؤں نکلے ہوئے ہیں چادر سے

● ۱۲۱۷۔ایس، سمن آباد، لاہور

## افتخار اجمل شاہینؔ

مجھے تو یہ جہاں اچھا لگا ہے
یہ نیلا آسماں اچھا لگا ہے
کشاکش درمیاں پیہم ہے جاری
حقیقت سے گماں اچھا لگا ہے
جہاں پر رنگ آمیزی ہوئی ہے
وہ جز و داستاں اچھا لگا ہے
یہ دنیا راس کب آئی مجھے بھی
ترے دم سے جہاں اچھا لگا ہے
ضرورت بھی مکینوں کی رہی ہے
کبھی خالی مکاں اچھا لگا ہے

● فلیٹ نمبر ۴، احمد اپارٹمنٹ۔ ایس۔ڈی۔۲۴ بلاک ایم نارتھ ناظم آباد کراچی ۳۳

## سیّد احسن شیرازی

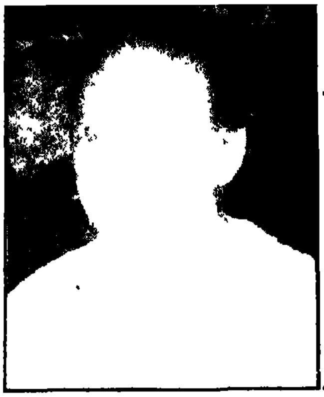
صحرا کو گلال بانٹتا ہوں
موسم کے دُلار کی ہوا ہوں
افکار کے بے خزاں خزینے
کاغذ کی غذا بنا رہا ہوں
بے بام و دَر سماعتوں کو
لفظوں کا مآل بانٹتا ہوں
راتوں کی دبیز تیرگی میں
سورج کا وقار مانگتا ہوں
ہونے ہی کو ہوں طلوع آخر
بادل کے بدن میں کھولتا ہوں

● ۱/۲ عباس پور، براہ ہڑپہ، ضلع ساہیوال (پاکستان)

## شفیق احمد شفیق

اک لفظ میرے منہ سے رکا کا نکل گیا
چہرے کا رنگ اس کے اچانک بدل گیا
جتنے بھی تھے جمود کے آثار مٹ گئے
خورشیدِ وقت شعلے کچھ ایسے اگل گیا
میری مخالفت میں وہ کچھ کہہ رہا تھا آج
دیکھا جو مجھ کو بزم میں چپ چاپ ٹل گیا
شہرہ تھا جس کی نرم دلی کا چہار سُو
وہ دیکھتے ہی دیکھتے پتھر میں ڈھل گیا
پھر کس کی چیخ ابھری سرِ شاہراہ آج
پھر کون کس کو آج اچانک کچل گیا

● ڈی ٹی ۱۸/۱ ہاشمن آباد، فیڈرل بی ایریا کراچی ۳۸



ندا فاضلی

۱۰۳ - امر اپارٹمینٹ ۔ ڈانڈ پاڑہ - ۱، کھار (ویسٹ) بمبئی ۵۲ ۴۰۰۰۰

# دیواروں کے بیچ

قسط نمبر ۷

بڑا گڈھ کے معاملے میں یہاں پانی اور روشنی کی سہولت ہے۔ لیکن زندگی کا ڈھرا وہی مسافرانہ ہے۔ گھر کا سارا سامان بندھا ہوا ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ تھوڑے وقت کے لیے باہر نکالی جاتی ہے اور استعمال کے بعد پھر سے صندوق یا گٹھری میں محفوظ کر دی جاتی ہے۔ چھوڑے ہوئے گھروں میں دوبارہ بسنے کی امید ہر دل میں روشن ہے۔ یہاں دیواروں پر چھت ضرور ہے لیکن نہ مٹی میں مانوس خوشبو ہے اور نہ پتھروں اور ارد گرد کے درختوں سے شناسائیاں ہیں۔ ستارے، ہوائیں پرندے، دیواریں چھتیں سب کاغذ پر چھپی تصویروں کی طرح ساکت ہیں۔ ہر طرف اجنبیت کا احساس حاوی ہے۔ اس سکوت کو توڑنے کے لیے، دوپہر کے وقت نیچے کے مکان کی بیوہ کبھی اوپر آجاتی ہے۔ اور دیر تک اپنے ماضی کو دہراتی ہے۔

"مرنے والا (اس کا شوہر) نومسلم تھا۔ وہ ہندو سے مسلمان ہوا تھا۔ اس کے گھر والے ہماری شادی کے خلاف تھے لیکن اس پر اسلام کا عشق چڑھا کہ مذہب کے ساتھ اس نے موروثی جائداد کو بھی ٹھکرا دیا۔ آج وہ جائداد ہوتی تو اس مصیبت میں کام ہی آتی۔ مذہب تو انسان کا ہوتا ہے۔ اینٹ، پتھروں میں ذات پات کہاں ہوتی ہے۔ وہ جب تک جیا باپ اور بھائی اس سے نہیں ملے۔ ہاں اس کی چھوٹی بہن، شادی سے پہلے تک راکھی کے دن چھپ چھپ کر آتی تھی۔ وہ راکھی پر اپنے ہاتھ سے اللہ کاڑھ کر لاتی تھی اور بھائی کے ہاتھ پر باندھتی تھی .. پہلے بچے، الطاف کی پیدائش پر بہن کے ساتھ اس کی ماں بھی آئی تھی۔ وہ جب تک رہی بیٹے کے گھر نہ پانی پیا نہ کچھ کھایا۔ پوتے کو اٹھا اٹھا کر بار بار دیکھتی رہی۔ جاتے وقت اپنے بیٹے سے بولی "تیرے گھر، تیرے تا کی آتمانے جنم لیا ہے۔ جیسے جی وہ تجھ سے بھلے ہی خفا رہا ہو لیکن مرنے کے بعد آیا تیرے ہی دوارے۔ آنکھیں، ناک، پیشانی سب اسی جیسی ہیں"۔ دونوں بچے باپ کی طرح پکے مسلمان ہیں۔ مسلمان کے کوکھ سے بھلا ہندو کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ سنا ہے اس کا بھائی اس کی قبر سے مٹھی بھر مٹی لے کر گنگا میں بہا آیا ہے۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔ قیامت کے روز وہ قبر سے اٹھے گا تو مسلمان ہی کی طرح، گھر کے سامنے ایک بڑی سی پرانی حویلی میں مرتضی حسن کے دوست سہا مجددی رہتے ہیں۔ وہ بھوپال کی با اثر شخصیتوں میں ہیں۔ شاعر ہیں اور غالب کی ایک شرح کے مصنف بھی۔ دُبلے پتلے تین فٹ سے بھی کچھ کم قد کے ہیں پیچھے سے کسی کم عمر لڑکے کی طرح لگتے ہیں۔ سامنے سے چہرے کی جھریاں، جوش، نیاز، فانی، مانی جائسی وغیرہ کی ہم عصریت کا سراغ دیتی ہیں۔ انھیں دیکھ کر پرانی فلموں کا ایک بونا کیریکٹر آرٹسٹ ڈکو یاد آجاتا ہے۔ کالی سرج کی چھوٹی سی شیروانی، علی گڈھ کاٹ کے پائجامے میں ملبوس، ہاتھ میں چھڑی، منہ ہر وقت گلوری سے لال، آواز میں منمناہٹ، باتوں میں دہات کی جگمگاہٹ۔ شادی شدہ ہیں۔ بیوی ان کی جسامت سے چوگنی اور قد سے تقریباً دوگنی ہیں، پڑھی لکھی ہیں محلہ کے بچوں کو شوقیہ اردو پڑھاتی ہیں۔

سہا صاحب اپنے قد و قامت سے کہیں زیادہ رنگین مزاج ہیں۔ مجرے سننے کا رئیسانہ شوق بھی ہے، اور انگور کی بیٹی سے شاعرانہ دوستی بھی ہے۔ نشے کے جھونک میں کبھی لہراتے ہیں تو سارا آسمان اپنے چھوٹے ہاتھوں پر اٹھا لیتے ہیں۔ بیوی کا اسلام برداشت کی حد تک شوہر کا احترام کرتا ہے لیکن جب نشہ اس مذہبی وفاداری پر حاوی ہونے کی کوشش کرتا ہے تو میاں بیوی کی جسامت کا فرق ابھرتا ہے اور شوہر زبردستی اٹھا کر مچان پر بٹھا دیے جاتے ہیں۔ سہا صاحب آسمان اور زمین کے درمیان خود کو معلق پا کر گھبرا تے ہیں اور پھر مسلسل کئی بار معافی مانگ کر اس عذاب سے پیچھا چھڑاتے ہیں۔ بیوی ان سے بہت پیار کرتی ہیں۔ .. اور بات کہ اس پیار کو کبھی دوسے تین ہونے کی توفیق نہیں ہوئی۔

گلی میں ان پر جملے کسنے والے محلے کے لڑکوں میں ندا بھی شامل ہے۔ لیکن جب وہ مرتضی حسن سے ملنے گھر آتے ہیں تو غالب کے شعروں کی بہ دار

میں ایسے الجھے ہوئے ہوتے ہیں کہ کسی کو پہچان کر بھی نہیں پہچانتے۔ چھوٹے سے منہ میں بڑا سا پان رکھے وہ جبڑے گھما گھما کر غالب کی عظمت کا گن گان کر رہے ہیں۔

سال کے وسط میں بچوں کا اسکول میں داخلہ مشکل ہے لیکن والدہ بضد ہیں۔ سہا صاحب مرتضیٰ حسن کو لے کر انسپکٹر کے پاس جاتے ہیں۔ انھیں دیکھتے ہی وہ اور اس کے آفس کا سارا عملہ احترام میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ انسپکٹر ان کے لیے اپنی کرسی چھوڑ کر کھڑا ہوتا ہے۔ اور سہا صاحب کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر وہاں عزت سے بٹھا دیتا ہے۔ وہ حکم کے انداز میں بچوں کے اڈمیشن کے لیے کہتے ہیں اور بغیر کسی جانچ کے ندا اور اس کے بڑے بھائی اسکول میں داخل کر لیے جاتے ہیں۔ جو کام کئی دنوں سے ٹل رہا تھا، دو جملوں کی سفارش سے ہو جاتا ہے

ندا اسکول جانے لگا ہے۔ ماں بہت خوش ہیں۔ ایک ہی دن میں نئی نئی کتابیں خریدی جاتی ہیں لیکن نیا ماحول، نئی کتابیں، جو پڑھایا جاتا ہے وہ سر سے گزرتا جاتا ہے۔ دوسرے طلبہ آدھے سے زیادہ کورس ختم کر چکے ہیں۔ اور ندا ابھی کتابوں کے ابتدائی اوراق سے بھی کوسوں دور ہے۔ سوال کچھ جواب کچھ۔ استادوں کی جھڑکیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ ہم جماعتوں کو کلاس میں ہنسنے ہنسانے کا ایک موضوع مل گیا ہے۔ پورے اسکول میں جہاں قدر چغتائی کے علاوہ کوئی دوسرا شناسا نہیں ہے۔ وہ بھی گوالیار سے یہاں آئے ہیں۔ جمیل فاطمہ سہ ماہی امتحان کے نتیجے سے پریشان ہو کر انھیں بلاتی ہیں۔ وہ آتے ہیں اور حسب وعدہ اسکول میں ندا کے نگراں بن جاتے ہیں۔ لیکن وہ سالانہ جلسے میں پیش کیے جانے والے ڈرامہ اور گیت میں اتنے مصروف ہیں کہ نگراں کو نگرانی کا خیال ہی نہیں آتا۔ ایک دن اسکول میں ملتے ہیں تو اپنے ساتھ ریہرسل روم میں لے جاتے ہیں اور شمع کے موضوع پر ایک ڈیڑھ صفحہ کے مکالمے لکھا دیتے ہیں۔ اس میں شمع کو زندگی کی روشنی کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

سالانہ جلسے کے اسٹیج پر یہ سارے مکالمے، ہاتھ میں جلتی ہوئی موم بتی رکھ کر ندا ڈرامائی انداز میں دہراتا ہے۔ آدھے سے زیادہ مکالموں کی ادائیگی ٹھیک ٹھاک ہوتی ہے لیکن جب گھلتا ہوا موم ہاتھ پر رکھی ماچس کی خالی ڈبیا سے پگھل کر ہتھیلی کو جلاتا ہے، تو وہ گھبرا جاتا ہے۔ جلن سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں، آواز میں درد بھر آتا ہے۔ مکالمے جیسے تیسے ختم ہوتے ہیں لیکن مجمع ان آنسوؤں اور آواز کی غمگینی کو اس کا آرٹ سمجھ کر اور زیادہ تالیاں بجاتا ہے۔ وہ انعام کی کتابیں لے کر گھر آتا ہے، لیکن درد کے مارے ساری رات کروٹیں بدل بدل کر کاٹتا ہے۔ ہاتھ کے پھپھولے زخم بنتے ہیں اور زخم کئی دن تکلیف دیتے ہیں۔ دوسرے دن چغتائی صاحب گھر آ کر ندا کی تعریف کرتے ہیں تو ماں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جگمگانے لگتے ہیں۔ اس جلسے کے بعد ماسٹر چغتائی کی سفارش امتحان میں پاس تو کروا دیتی ہے لیکن نئی کلاس میں بھی پہلی سی دقتیں موجود ہیں۔

اسکول میں ندا کا جی اچاٹ رہنے لگا ہے۔ وہ اسکول جانے کے بجائے ادھر ادھر بھٹکنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کے بعد اس بھٹکاؤ میں مکان کے نیچے والی بیوہ کا بڑا لڑکا الطاف اس کا ساتھی ہے۔ وہ بھی ندا کے اسکول ہی میں ہے۔ عمر اور تجربہ میں ندا سے چار پانچ سال بڑا ہے۔ گورا چٹا اور تندرست بدن کا ہے۔ اسکول میں جھگڑا کرنے کے جرم میں وہ اکثر کلاس کے باہر ہونے کی سزا پاتا رہتا ہے۔

اس کی صحبت سے ندا پر پہلی بار وہ راز بے نقاب ہونے لگے ہیں جن کو جاننے کے لیے قدرت نے ایک خاص عمر کی پابندی عائد کی ہے۔ وقت سے پہلے ان رازوں کی آگاہی نے ندا کو اپنی عمر سے زیادہ بڑا کر دیا ہے۔ ایک نئی دنیا اس کے سامنے پھیل رہی ہے۔ حیرت و لذت کے انوکھے رنگوں سے رنگی ہوئی یہ دنیا اعصاب میں چکا چوند پیدا کر رہی ہے۔ اس انکشاف نے اس کی چال ڈھال اور بول چال میں تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ لڑکیوں کے جسم روپوش خزانے بن گئے ہیں جن میں سونا چاندی ہیرے موتی نہ جانے کیا کیا بھرے ہوئے ہیں۔ رات دن ان دیکھی دولتوں کے سراغ لگائے جاتے ہیں۔ پتے ٹھکانے معلوم کیے جاتے ہیں اور اسی تگ و دو میں صبح سے شام ہوتی رہتی ہے۔ اس مسلسل تلاش کے اخراجات نے ماں کے پرس میں رسائی حاصل کر لی ہے۔ پرانی داستانوں کے کرداروں کی طرح دونوں دن بھر بھٹکتے ہیں اور اسکول کے ختم ہونے کے وقت تھک تھکا کر لوٹتے ہیں۔ انتظار کے لمحے ہوٹلوں میں گزارے جاتے ہیں۔ ان لمحوں کی طوالت کو چائے اور سگریٹوں سے چھوٹا کیا جاتا ہے۔ اس تلاش یا انتظار کا ابھی کوئی خاص نام نہیں ہے۔ رقابت کا جذبہ بھی ابھی نہیں ابھرا ہے۔

الطاف عمر کی بڑائی کا ہر جگہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ ندا کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ وقت سے پہلے انوکھے رازوں کا ہمراز ہے الطاف کی شہر میں ایک

ادھیڑ عمر کے دوکاندار سے بھی دوستی ہے۔ وہ اسے اپنے رشتے کا چچا بتاتا ہے لیکن بھتیجے کے رشتے کی بے تکلفی دو ہم عمر جیسی ہے۔ وہ جب بھی ان کی دوکان میں جاتا ہے ادھر ادھر ہاتھ چلاتا رہتا ہے اور چچا ہنس ہنس کر اس کے بازو یا گردن پر داڑھی اور دانت گڑا کر اسے اس کی شرارتوں سے روکتے ہیں۔ الطاف کی اچھل کود سے اکثر ان کے بدن کے کسی حصے میں درد ہونے لگتا ہے۔ ان کی کراہوں پر الطاف کو رحم آجاتا ہے اور اندر کمرہ میں جاکر وہ مالش کر کے انھیں اس درد سے نجات دلاتا ہے۔ ندا کو ایک بزرگ کے ساتھ اس قسم کی بے تکلفی بے ہودگی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن وہ ندا کی باتوں کو بچکانہ سمجھ کر ہنسی میں اڑا دیتا ہے۔ ادھیڑ عمر کا وہ آدمی الطاف کے گھر بھی آتا رہتا ہے۔ ان کے گھر میں کچن کا سارا سامان اسی کی دوکان سے آتا ہے۔ وہ پڑوس کی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھ کر آتا ہے اور عشا کی نماز کے بعد رخصت ہوتا ہے۔ پنج وقتہ نمازوں کے ساتھ ایک بیوہ اور دو بچوں کی مدد کر کے بھی وہ اپنی عاقبت سنوار رہا ہے۔

سورج غروب ہو رہا ہے۔ شہر میں چاروں طرف پھیلی ہوئی مسجدوں کے میناروں سے اذاں طلوع ہو رہی ہے۔ جمیل فاطمہ اور بڑی بہن بولتے بولتے اچانک خاموش ہو کر سروں پر دوپٹہ رکھ لیتی ہیں اور اذان کے ختم ہوتے ہی ہاتھوں کو دعا کے لیے پھیلا دیتی ہیں۔ یہ دعائیں منھ ہی منھ میں پڑھی جاتی ہیں۔ عربی الفاظ قرأت کے لحن میں ایک عجیب پراسرار آہنگ کی تعمیر کرتے ہیں۔ یوں لگتا ہے آسمان کی نیلاہٹیں مہربان ہوتی جارہی ہیں اور ساری زمینیں صوفیوں کی خانقاہیں بنتی جارہی ہے۔ ہر طرف فضا میں سرمئی سنجیدگی طاری ہے، جیسے مفتوح علاقے میں فاتح فوج کا پھیلاؤ۔ رات اور شام کے درمیان کا یہ وقفہ ایک بڑی سی کالی چیل کی طرح، اپنے دونوں پنکھ پھیلائے، آہستہ آہستہ خلاؤں سے زمین کی طرف اتر رہا ہے۔ اس کی چونچ سے چاند کرن کرن باہر نکل رہا ہے۔ ندا ایک کونے میں اداس بیٹھا ہے۔ وہ آج صبح ہی سے گم سم ہے۔ روز روز کی اس کی شکایتوں نے ماں کو پریشان کر دیا ہے۔ انھوں نے ہر بچے کے ساتھ خود کو اس طرح وابستہ کر لیا ہے کہ ان میں سے کسی کی ذرا سی غلطی بھی کئی دنوں تک ان کو افسردہ کر دیتی ہے۔ وہ بنا کچھ بولے اندر ہی اندر ریت کی دیوار کی طرح ڈھنے لگتی ہیں گویا پیار میں ڈانٹ پھٹکار سے جی کا بوجھ ہلکا کر لیتی تھیں۔ لیکن اب ان کے مزاج میں نئی تبدیلی ہوئی ہے۔ اب انھیں جب کسی کی بات بری لگتی ہے تو ہونٹ خاموش رہتے ہیں اور چہرہ زرد پڑتا جاتا ہے اور اس حالت میں کچھ دیر رہنے کے بعد بیمار پڑ جاتی ہیں۔ یہ بیماری بھی عجیب ہوتی ہے۔ کھانا پینا چھوٹ جاتا ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں صرف پانی سے خشک ہوئے گلے کو تر کیا جاتا ہے۔ فاقے سے نقاہت بڑھتی ہے اور اٹھنا بیٹھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بڑی بہن سرہانے بیٹھ کر، علاج کے طور پر، قرآن کے صفحوں سے چہرہ بار بار ہوا کر رہی ہے۔

اذان کی آواز سے ان کی آنکھیں کھلی ہیں۔ ادھر ادھر دیکھ کر وہ اٹھتی ہیں اور وضو کرنے کے لیے نل تک جانے جانے چکرا کر فرش پر سر کے بل گر جاتی ہیں۔ بہن دوڑ کر انھیں اٹھاتی ہے۔ چھوٹے بہن بھائی رونا شروع کر دیتے ہیں۔ سر سے خون جاری ہے۔ انھیں اٹھا کر بستر پر لٹا دیا جاتا ہے۔ وہ بے ہوش ہو گئی ہیں۔ برف کا ایک بڑا سا ٹکڑا کپڑے میں رکھ کر خون روکنے کے لیے زخم پر رکھا جاتا ہے۔ بڑی بہن آنکھوں میں آنسو بھرے دعا پر دعا پڑھ رہی ہیں۔ (باقی آئندہ)

بقیہ صفحہ ۱۷ کھلونے

بچے کے بعد شاعر تلمیذ الرحمان ہے کہ اس کے ہاں ہوا گنگناتی ہے۔ پتھر قلابازیاں لگاتے ہیں، چاند بادل کے گھونگھٹ میں چھپ جاتا ہے اور ستارے خوشی سے ناچنے لگتے ہیں۔ گویا زندہ کھلونوں کی ایک پوری دنیا آباد ہو جاتی ہے۔

یار لوگ "ادب برائے ادب" کے قائل ہیں مگر میں "کھلونا برائے کھلونا" کا قائل ہوں۔ میرے نزدیک کھلونا ذریعہ نہیں ہے بلکہ اپنا ایک خود کفیل مثبت وجود رکھتا ہے۔ آخر اتنی بڑی اربوں کھربوں سال پہلے نور پر پھیلی ہوئی کائنات اگر محض ایک کھلونا ہے تو اس لیے نہیں کہ اس کے ذریعے کوئی ماورائے کائنات مقصد حاصل کیا جائے بلکہ محض اس لئے کہ اس کو دی روح حاصل کر اس سے کھیلا جائے۔ میرا خیال ہے کہ صوفی یا ویدانتی اس سلسلے میں قطعاً ناکام ہے کیوں کہ وہ یا تو اس کائنات کی نفی کر دیتا ہے یا پھر اسے حصول معرفت کا محض ایک ذریعہ سمجھتا ہے اور شاعر پوری طرح کامیاب ہے کیونکہ وہ کھلونے کو اپنی ہی برادری کا ایک رکن نامزد کر کے اس کے ساتھ کھیلنے چلے جانے کو ایک بہت بڑی سعادت سمجھتا ہے بلکہ بعض شاعر تو اس سے بھی ایک قدم آگے نکل جاتے ہیں جب وہ اپنے آپ کو ایک کھلونا جان کر خود سے کھیلنے لگتے ہیں۔ ایسے محترم شعراء کے نام اور پتے کسی بھی ہسپتال کے شعبۂ حادثات کے رجسٹر سے بآسانی حاصل کیے جا سکتے ہیں۔



ظفر ہاشمی

راتوں کے تن بدن میں جب سنسناہٹیں تھیں
تو منجمد لہو میں بھی کپکپاہٹیں تھیں

تنہائیوں کے لب پر اپنی ہی دھڑکنوں سے
کچھ مسکراہٹیں تھیں، کچھ گنگناہٹیں تھیں

اک دھند کی ندی جب سیلاب لے کے آئی
تشنہ لبوں میں کتنی ہی تھرتھراہٹیں تھیں

سورج کا گرم پانی شبنم کے منہ میں آیا
سبزوں کے ریشے ریشے میں پھڑپھڑاہٹیں تھیں

جب جھیل کے کنارے باہم ملے کبھی تو
مرغابیوں میں منظر کی کسمساہٹیں تھیں

اپنے حصار سے جب خوابوں کا عکس ٹوٹا
بزم نجوم و مہ کی بھی جھلملاہٹیں تھیں

ایسے ظفر بھی چھایا جادو شب بدن کا
پرچھائیاں، صدائیں، مخمور آہٹیں تھیں

● بڑی دھنکڈی ورکرز فلیٹس، بشٹوپور، جمشید پور ۸۳۱۰۰۱



پرنپال سنگھ بیتاب

پوشیدۂ باطن جو مری نوحہ گری ہے
بدنام زمانہ فقط آشفتہ سری ہے

پیکر نہ تھا اس سنگ میں کوئی کسی صورت
اور موردِ الزام مری بے ہنری ہے

چل پاؤں کی زنجیر مرے ساتھ ابھی کچھ اور
شاید ابھی باقی مری کچھ دربدری ہے

دنیا تجھے دیکھا ہے بہت جانا بھی لیکن
وابستہ مرے نام سے کچھ کم نظری ہے

انسان تھا میں زرد تھی رنگت مری لیکن
جس نے مجھے جھٹلایا وہ اک سبز پری ہے

موسم بھی وہی آب و گیاہ اور سبھی کچھ
اس بار درختوں پہ یہ کیا بے ثمری ہے

بیتاب روایات کے وہ نخل کہاں ہیں
تا حدِ نظر ریگ ہے، بے ثمری ہے

● وی سی / گورنمنٹ کوارٹرس، گاندھی نگر، جموں توی ۱۸۰۰۰۴



شاہد کلیم

خود بخود دیوارِ زنداں آہنی ہو جائے تو
اور اس میں قید میری زندگی ہو جائے تو

گمشدہ منزل کا کوئی عکس مل جائے گا کیا
اس اندھیرے میں اچانک روشنی ہو جائے تو

اپنی دنیا کا نہ جانے کیا رہے گا رنگ و روپ
گونگے بہرے پتھروں کی بندگی ہو جائے تو

بے پناہی کا عجب عالم رہے گا اور کیا؟
آدمی کے خوں کا پیاسا آدمی ہو جائے تو

کون سا عالم رہے گا شور و غل کے شہر میں
ہر طرف بس خامشی ہی خامشی ہو جائے تو

ہر شکایت، ہر خلش جاتی رہے گی اے کلیم
دشمنوں کے ساتھ اپنی دوستی ہو جائے تو

● دودھ کٹورا، آرہ ۸۰۲۳۰۱ (بہار)



شکیلہ رفیق
۱۷۵/۳ سی پی ۔ برار سوسائٹی ۔ کراچی

# خواب، گلاب اور آگ

فہمیدہ نے گڈو کے گیلے بالوں میں آڑی مانگ نکال کر بال اچھی طرح جما دیئے ہیں اور دفتر سے آئے ہوئے تھکے ماندے ابرار سے کہا ہے "اے جی! آج بازار جا کر گڈو کو بیل گاڑی اور غبارہ ضرور دلا دینا۔ کئی دنوں سے ضد کر رہا ہے۔"

ابرار اپنی بیوی کی سادگی پر اپنے آپ میں ہنس دیا ہے جو خلائی دور میں بچے کو بیل گاڑی دلوا کر مطمئن اور خوش ہے۔ چپکے سے ہنسنے کے سوا وہ کر بھی کیا سکتا ہے، کہ ـــ وہ خود بھی تو بیل گاڑی سے آگے جانے کی سکت نہیں رکھتا اور ـــ یہ سکت بھی اس نے اپنی کوئی ضرورت روک کر ہی حاصل کی ہے۔

اس نے بیوی سے ایک پیالی چائے مانگی ہے اور فہمیدہ نے ایک ہی پیالی چائے بنائی ہے تاکہ صبح دو پیالیاں چائے بنا سکے۔ چائے پینے کے بعد ابرار نے ایک ہاتھ سے گڈو کی کلائی اور دوسرے ہاتھ سے اپنی جیب تھامی ہے، جس میں صرف بیل گاڑی اور غبارے کے پیسے ہیں۔

اور ـــ وہ گھر سے نکل گیا ہے۔

---

بانسری والے نے رات جاگ کر گزاری ہے دن بھر شدید گرمی اور حبس کے باوجود وہ بانسریوں کو خوبصورت رنگوں سے سجاتا رہا ہے اور رات کو جو اس نے ٹوٹی ہوئی کمر جوڑنے کی کوشش میں خود کو تخت پر گرا کر ٹانگیں سیدھی کیں تو ـــ گرم ہوا نے اس کے عارض سرخ اور آنکھیں انگارہ کر دیں۔ پھر بھی وہ علی الصبح اٹھ گیا ہے اور اپنی مخصوص جگہ پر جانے کی تیاری کر رہا ہے۔ بوڑھی ماں نے چینی کے پیالے میں، جس کی کگر کئی جگہ سے ٹوٹی ہوئی ہے اسے چائے دی ہے اور ساتھ میں دو پاپے، جو اس کی مالی حالت کی طرح نرم پڑ چکے ہیں۔ اس نے نرم پاپوں کو چائے میں بھگو کر حلق سے نیچے اتار لیا ہے، بانسریوں کی ٹوکری کھونٹی سے اتار کر کندھے پر لٹکا لی ہے اور ـــ وہ گھر سے نکل گیا ہے۔

---

کفن کا لٹھا بیچتے بیچتے اور پیسے کی تنگی سے اکتا کر بشیر نے اپنی دکان پر عورتوں کے ریشمی کپڑے بھی بیچنے کا ارادہ کر لیا ہے گھر والوں کو جب اس نے ریشمی تھان دکھائے تو وہ سب گلنار ہو گئے۔ کش کش کرتے ریشمی تھان ان کے مستقبل کی طرح جگمگا رہے تھے۔

اس کپڑے کی طرح حالات بھی اب سرسراتے ہوئے میرے قابو میں آ جائیں گے، اس کی بہن نے فیروزی تھان پر ہتھیلیاں پھیرتے ہوئے سوچا ہے۔ رنگ برنگے ریشمی تھانوں نے افرادِ خانہ کی آنکھوں میں بھی رنگ بکھیر دیئے ہیں۔

بشیر نے رات کے بچے ہوئے سالن کے ساتھ گھی میں سکی روٹی کھائی ہے، تمام سامان سوزوکی پک اپ میں رکھے ہیں۔
اور وہ ـــ بیٹے کے ساتھ گھر سے نکل گیا ہے۔

---

روبی کی شادی کا مسئلہ طے ہو گیا ہے۔ ایک عرصے سے اس کی شادی کا مسئلہ صرف جہیز نہ ہونے کے سبب اٹکا ہوا تھا۔ پھر باپ نے ماں نے، بھائی نے، حتیٰ کہ خود روبی نے ملازمت کی اور چار سال کی کوششوں کے بعد خریدار کے حسبِ مرضی جہیز اکٹھا کر لیا اور آج جہیز کی سب سے اہم یعنی زیورات کی خریداری کرنی ہے اور اس کے بعد جہیز کی تکمیل ہو جائے گی۔ ماں نے پچیس ہزار کی رقم پرس کی سب سے اندرونی جیب میں رکھ لی ہے، باپ نے حسبِ عادت دودھ کا ایک گلاس پی لیا ہے، روبی نے شاپنگ بیگ کاندھے سے لٹکا لیا ہے، بھائی ٹیکسی لے آیا ہے۔

اور — وہ سب گھر سے نکل گئے ہیں۔

---

بیگم احسان کے گردے میں کئی روز سے درد ہے اور گذشتہ رات تو انھوں نے تڑپتے ہوئے گزاری ہے اسی لیے آج ان میں قطعی ہمّت نہیں کہ وہ دفتر جا سکیں۔ بیگم احسان! جنھوں نے بیوگی کی چادر کو بڑے سلیقے سے اوڑھا ہے اور اس چادر تلے انھوں نے بیس سال کا طویل عرصہ گزار دیا ہے۔ اب ان کے تینوں بچّے بڑے ہو چکے ہیں۔

درد کی حالت میں بیگم احسان نے گردے کو دبا کر ہمیشہ یہ تسلّی دی ہے کہ بیٹے کے ملازم ہوتے ہی وہ اس کا علاج کرائیں گی اور نوکری چھوڑ دیں گی اور اب — یہ بات یقینی ہو گئی ہے کہ آنے والے دن کے طلوعِ آفتاب کے ساتھ ان کا بیٹا اپنی ملازمت کا آغاز کر دے گا۔ اس طرح ان کی موجودہ ملازمت کا یہ آج آخری دن ہے۔ انھوں نے بائیں ہاتھ سے گردے کو دبایا ہے اور اس سے کل تک کی مہلت مانگ لی ہے۔

ناشتے کے بعد انھوں نے پرس اٹھایا ہے،

اور — وہ گھر سے نکل گئی ہیں —

---

شہر کی تمام رونقیں اپنے عروج پر ہیں اور ہر فرد اپنی دنیا میں گم اور مگن ہے۔ ابرار نے گڈو کو غبّارہ اور بیل گاڑی دلا دی ہے۔ جو بہت خوب صورت ہے چھوٹی سی بیل گاڑی میں پلاسٹک کے بیل، پلاسٹک ہی کے انسانوں کو کھینچ رہے ہیں۔ گڈو بیل گاڑی اور غبّارہ پا کر از حد مسرور ہے اس کا چہرہ گلاب کی مانند کھلا ہوا ہے۔ ابرار نے ایک ہاتھ سے اس گلاب چہرے کی کلائی تھام لی ہے اور دوسرے میں بیل گاڑی پکڑ لی ہے۔ وہ سڑک پار کرنا چاہتا ہے تاکہ سامنے سے جانے والی بس میں سوار ہو سکے۔ گڈو کچھ نہیں دیکھ رہا۔ اس کی نظریں صرف اور صرف باپ کے ہاتھ میں تھمی بیل گاڑی پر جمی ہیں اور .... اس کا چہرہ گلاب ہوتا جا رہا ہے۔

بانسری والا بازار کے اپنے مخصوص کونے اور مقرّرہ جگہ پر پھٹی اور خستہ دری کا ٹکڑا بچھا کر بیٹھ گیا ہے۔ بانسریوں کا تھیلا اپنے دائیں جانب رکھ کر اس نے اس میں سے ایک خوبصورت سی بانسری نکال لی ہے۔

اور اب — وہ مدھر لے میں بانسری بجا رہا ہے۔

بشیر کی دوکان میں ہنستی مسکراتی لڑکیاں اور خواتین موجود ہیں، سرسراتے ہوئے ریشمی تھان ان کو بہت پسند آئے ہیں، دام چکائے گئے ہیں

اور اب — وہ رقم کی ادائیگی کے لیے بڑے بڑے نوٹ پرس سے نکال رہی ہیں۔

روبی کی ماں نے پچیس ہزار کے زیورات خرید لیے ہیں روبی اور اس کے تمام گھر والے گرمی کی شدّت کے باعث پسینے میں نہا چکے ہیں پچیس ہزار کی رقم نکل جانے کے بعد پسینہ یوں بھی زیادہ بہہ جاتا ہے۔

اور اب — وہ سب ایک اسنیک بار میں بیٹھے فالودہ قلفی کی ٹھنڈک سے ذہن و دل کو بھی ٹھنڈا کر رہے ہیں۔

بیگم احسان کے گردے کا درد آپ ہی آپ کم ہو گیا ہے اور اب وہ آنے والے خوش گوار کل کے تصوّر میں گم روزانہ سے زیادہ لگن سے کام میں مصروف ہیں کہ اچانک ہی ..

ایک انتہائی زوردار اور خوفناک دھماکے سے در و دیوار لرز اٹھے اور گردے کے درد کے ساتھ بیگم احسان خود بھی ختم ہو گئی ہیں۔

اور اب — وہاں ایک میز اور چند فائلیں رہ گئی ہیں جن کا کام مکمل ہو چکا ہے۔

روبی کی ماں کے ہاتھ میں تھما ہوا فالودہ قلفی کا گلاس کرچی کرچی ہو کر روبی کے جسم کے جا بہ جا بکھرے ٹکڑوں میں پیوست ہو گیا ہے اور اس کا باپ بیٹے کے جسم سے بہتے ہوئے لہو کو سمیٹ کر دوبارہ مردہ جسم میں ڈالنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔

اور ماں — دھوئیں کے بھنور بیچ چکرانی سب کو تلاش کر رہی ہے

بشیر کی دوکان کی ہنستی مسکراتی لڑکیوں کی آنکھیں دھوئیں اور آنسوؤں سے بھر گئی ہیں۔ پرس ان کے ہاتھ سے اڑ کر دور جا گرا ہے سرسراتے ریشمی تھانوں نے ان کے مردہ جسم کو ریشمی کفن میں لپیٹ دیا ہے۔

اور اب — وہاں قبرستان جیسا سنّاٹا ہے۔

بانسری والے کے پرخچے اڑ گئے ہیں اس کے جسم کے چیتھڑے سامنے والی دیوار کے ساتھ جا کر چپک گئے ہیں اور بانسری کی مدھر لے، دھماکے کے شور کے ساتھ گڈمڈ ہو کر فضا میں گم ہو گئی ہے۔

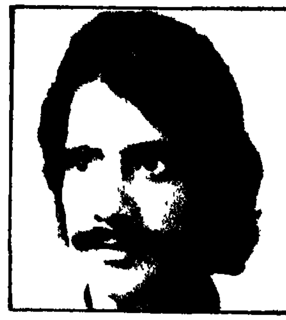
اور اب۔ وہاں صرف بانسریوں کے ٹوٹے ٹکڑے لڑھک رہے ہیں۔

سڑک کے کنارے ابرار یوں ہی کھڑا رہ گیا ہے اس کے ہاتھ میں بیل گاڑی جوں کی توں تھمی ہوئی ہے۔ گڈو اور غبّارہ منظر سے غائب ہو گئے ہیں اور سامنے ابرار کی حیرت زدہ آنکھیں اور کھلا منہ رہ گیا ہے۔

اور —

وہ پاگل آنکھیں جنونیوں کی مانند گڈو کا گلاب چہرہ ڈھونڈ رہی ہیں۔

نظام الدین نظام

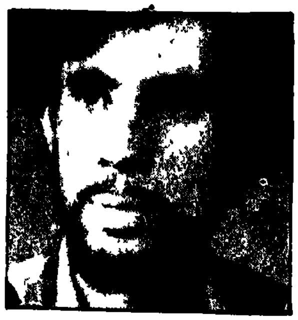


## برائے فروخت

یہ میرا فن
یہ مرقعے مری مہارت کے
متاعِ فکر کی منہ بولتی یہ تصویریں
لہو میں خوابوں کے ڈوبی ہوئی یہ تعبیریں
مرے ضمیر کی قاتل، شعور کی آقا
مرے مزاج کی دشمن، حریف اصولوں کی
ضرورتوں سے ابھرتی ہوئی یہ تحریریں
قلم کو فاحشہ میں نے کیا تو جنمی ہیں
کہ جن کی زندگی اولادِ بے پدر جیسی
جو میرے عہد کے معیار کے مطابق ہیں
سجائے بیٹھا ہوں
آؤ، خریدنے والو
یہ میرا فن
یہ مرقعے مری مہارت کے۔

● ۹۴۔ بی۔ اے۔ ویرانی مارگ، تیسرا مرلہ، روم ۱۱، ممبئی ۸

سلیمان خمار



## آزاد غزل

لمس کے پہاڑ پر کھڑا ہوں میں
رگوں میں خوں برف سنسناتی دیکھتا ہوں میں
ترے بدن دھنک کی میٹھی روشنی
رات بھر نظر سے بوند بوند پی چکا ہوں میں
پکارا تھا کسی نظر صدا نے کچی عمر میں
سو آج تک اُسی کے ساتھ ساتھ چل رہا ہوں میں
کبھی تو میری ذات پر سوال کا جواب تھی ترے لئے
آج خود سوال بن گیا ہوں میں
مجھ سے بے تعلقی کا ڈھونگ کر رہا ہے تو
تجھے بھلا چکا ہوں     یہ فریب دے رہا ہوں میں
قریب و دور ہم نفس کوئی نہیں
کس کو ڈھونڈتا ہوں میں
کوئی نہیں خمار اس جہاں میں جسے ہم اپنا کہہ سکیں
فضول سب کو اپنا کہہ کے جان دے رہا ہوں میں

● آفس ڈپٹی ڈی۔ پی۔ ایل بیجاپور ۱۰۱ ۵۸۶

جینت پرمار



## ایک ایبسرڈ شام

سمندر
سورج کی لہروں میں
خود کو ڈوبتے دیکھ رہا ہے
یا سمندر
ڈوب رہا ہے
خالی صراحی میں
دور کنارے پر سورج
سُرخ رومال بھگوتا ہے
ہاتھ پکڑ کر بوتل کھولتی ہے مجھ کو
ایک ہی سانس میں پی جاتی ہے
آنکھ میں ڈوب رہی ہے
منظر کی کھڑکی
اور ستاروں کا آکاش
رگوں میں تیرنے لگتا ہے
روشن دان سے چاند کے ٹکڑے
چپکے سے گھر میں گھستے ہیں
کھونٹی پر لٹکا فانوس
میز کے خانے سے
کھول کے ماچس کی ڈبیا
سلگاتا ہے
دیا سلائی!

● اے/۴۳ ایبالی فلیٹ، سرکاوارڈ، شاہ پور، احمد آباد ۱۰۰۰ ۳۸

# مکتوبات

**رضا احمد ادیب۔** ۲۰/ان اٹائپ۔ آوٹر سرکل روڈ، جمشید پور، بہار

حیران ہوں کہ "شاعر" میں اتنا مواد، مضامین اور اتنی اچھی کہانیاں آپ لوگ کس طرح پیش کر پاتے ہیں۔ خدا نظرِ بد سے شاعر کو محفوظ رکھے۔

پچھلے چند برسوں سے کہانیاں پڑھ پڑھ کر بیزار اور بور ہوتا رہا ہوں لیکن شمارہ نمبر ۲ میں "پورب کی حیونی" (کلام حیدری) پڑھ کر مسحور ہوں اور فکرمند ہوں کہ اس جادو سے نکلنے کی کیا صورت ہوگی۔ ابھی اس کہانی کا سحر ختم ہوئے بھی نہیں پایا تھا کہ شمارہ چار میں رتن سنگھ کی کہانی "ایک گاتھا" شائع ہوئی۔ یہ کہانی نہیں ایک اعلان ہے کہ اردو میں کہانی کی بازیافت ہوگئی "ایک گاتھا" کہانی نہیں آج کی زندگی کا ایک حصہ ہے جسے زندگی سے نچوڑ کر صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا گیا ہے۔ تخیل اور تجربہ کا اس قدر حسین و خوبصورت امتزاج بہت دنوں کے بعد کسی کہانی میں بھری سطروں سے گزرا۔ لیکن کہانی رتن سنگھ اور "تصویر" گربچن سنگھ کی۔ اتنی بڑی غلطی کیسے ہوگئی[1]؟ شمارہ نمبر ۳ میں "نارمل ڈیلیوری" (فیروز عابد) مطبوعہ کہانی ہے۔ سالنامہ ادبِ لطیف ۸۸ء میں شائع ہو چکی ہے۔

شمارہ نمبر ۴ میں "کرنی اور بھرنی" (انور عنایت اللہ۔ کراچی) کلائمکس پر یعنی مندرجہ ذیل پیراگراف پر ختم ہونا چاہیئے تھا۔

"تھوڑی دیر کے بعد دو سائے چپکے سے کوٹھی سے باہر آئے جب توقع کار میں چابی لٹک رہی تھی۔ دونوں نے کار کے دروازے آہستہ سے بند کئے۔ چند لمحوں کے بعد کار اسٹارٹ ہوئی اور پھر پلک جھپکتے قیامت کی رفتار سے بڑے پھاٹک سے باہر نکل گئی۔

دور سے رات کے سناٹے میں گھڑی نے کہیں تین بجائے۔ قریب ہی کسی مرغے نے بانگ دی اور کوٹھی کے نیم تاریک ڈرائینگ روم میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کسی نے چپکے سے ٹیلیفون کا رسیور اٹھایا اور ایک نمبر ملایا۔ کمرے میں روشنی نہیں کی۔

"ہائے شمو ـــــ تمھیں زیادہ انتظار کرنا تو نہیں پڑا۔؟

"ہاں ہاں ـــــ دفان ہوئے ـــــ

قیامت کی تیزی سے بھاگے تھے جیسے ان کے تعاقب میں شیطان ہو۔ اطمینان رکھو۔ زیادہ دور نہ جاسکیں گے۔ بریک میں نے بالکل بیکار کر دیے تھے۔ "خدا حافظ۔!"

مزید واضح کر کے انھوں نے کہانی کا مرڈر کر دیا ہے۔

**عالم خورشید۔** ڈی۔ اے۔ آفس (پی)، پٹنہ۔ ۸۰۰۰۰۱ (بہار)

شاعر کے بارے میں اپنی رائے کیا لکھوں۔ آجکل تو ہمارے یہاں ادب کا یہ حال ہے کہ یہاں صرف ادیب اور فن کار تو شاید گنے چنے لوگ ہیں ورنہ کوئی روایتی ادیب ہے کوئی ترقی پسند ادیب تو کوئی جدید۔ اس طرح رسالوں کی بھی پابند پالیسیاں ہیں۔ تمام لوگ اپنے گروپ کی تعریف اور دوسروں کی برائیوں میں اپنی صلاحیتیں ضائع کر رہے ہیں۔ اس ماحول میں ادب کہاں جا رہا ہے کسی کو فکر نہیں۔ ایسے میں شاعر ہی ایک ایسا واحد رسالہ ہے جسے دیکھ کر امید پیدا ہوتی ہے۔ اس کے دامن میں تمام لوگوں کے لیے جگہ ہے اور یہ ہر طرح کے گروپ ازم، مصلحت سے اوپر اٹھ کر ایمانداری سے صالح اور صحت مند ادبی فضا بنانے میں مشغول ہے۔ کاش! دوسرے رسائل بھی اس سے سبق حاصل کرتے۔ اب کیا کیا جائے کہ 'شاعر' کے شمارہ نمبر ۵ جلد نمبر ۶۰ میں بھائی ساجد حمید کا ایک خط شائع ہوا ہے جس کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ 'شاعر' کی اس خوبی کو عیب میں شمار کرتے ہیں۔

حالانکہ ادھر کے شمارے بہت زیادہ پسند نہیں آئے۔ شاید اس کی وجہ اقبال نمبر کے سلسلے میں بے پناہ مصروفیت ہو۔ مگر ان دنوں آپ کا اداریہ بہت زیادہ اپیل کر رہا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آپ کے جملوں کی نشتریت میں لگاتار اضافہ ہو رہا ہے۔ بہت دنوں سے آپ کی غزلیں پڑھنے کو نہیں ملیں امید ہے توجہ دیں گے۔

**رفیق اعظم۔** نزد اندرا انگلش اسکول، محلہ رتن پورہ ادھا ٹولی، چھپرا (بہار)

شاعر کے شمارہ ۴ میں م۔ ناگ کی کہانی "گھروندہ" پڑھ کر کافی لطف آیا م۔ ناگ سے مستقبل میں بہت سی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں لیکن اس کے برعکس شاہ نواز قریشی نے مایوس کیا۔ ان کی کہانی "اور سقراط مر گیا" کا خاص مقصد قاری تک پیغام پہنچانا ہے ورنہ وہ کہانی کو وہیں پر ختم کر دیتے جہاں سے شروع کرتے ہیں۔ پہلے پیراگراف میں جو CYNICISM ہے وہ آخر میں آکر تحلیل ہو جاتی ہے کیونکہ کہانی کار کے لئے فن کا مقصد اصلاح ہے آخری پیراگراف اگر کہانی کار نے نہ جوڑا ہوتا تو کہانی میں معنویت بڑھ جاتی۔ اور کہانی کا مقصد سقراط کے مر جانے کی وجہ سے حل ہو چکا ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ موجودہ دور ناامیدی کا دور ہے جہاں کسی طرح کے بھی IDEALISM کا پروان چڑھنا ناممکن لگتا ہے۔

وزیر آغا کی تینوں نظمیں پسند آئیں۔ خاص کر نظم "ہوا سے کہنا" جب پڑھ رہا تھا تو سلطان اختر کا ایک شعر ذہن میں آگیا۔

ہرا تجر نہ سہی خشک گھاس رہنے دے ــــ زمیں کے جسم پہ کوئی لباس رہنے دے

---

[1] ادارہ شاعر اس تکنیکی غلطی کے لیے ہر دو قلم کاروں سے بے حد معذرت خواہ ہے۔

حمید الماس اور تنہا تماپوری کی نظمیں بھی اچھی ہیں۔

محمد علی صدیقی کا مضمون "اردو افسانہ اور پاکستانی معاشرہ" پڑھ کر مایوسی ہوئی۔ مضمون میں پاکستانی معاشرہ کی کوئی ٹھوس تصویر نہیں ابھرتی ہے۔ مصنف نے IRWING HOWE کے حوالے سے D.H.LAWRENCE کو QUOTE کیا ہے اور اسے پاکستان کے بعض جدید افسانہ نگاروں اور ادیبوں پر صادق فرمایا ہے مگر مصنف نے یہ بتانے سے نہ جانے کیوں احتراز کیا ہے کہ وہ کون کون سے افسانہ نگار اور ادیب ہیں جو اس بیماری کے شکار ہیں D.H.LAWRENCE نے مذہب سے انحراف کرنے کی کوشش کی تھی اور RELIGION OF FLESH کی پیروی کی تھی کیا یہ لوگ بھی؟۔ دوسرے صرف لیو کا یچ کا حوالہ دے کر جدیدیت کو سرے سے رد کر دینا جائز نہیں ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جس مضمون کا مقصد سماجی مورّخ کی مدد کرنا ہو وہ قاری کے لئے وقت کی بربادی ہے۔

**صدف جعفری**۔ معرفت بی۔ایم۔ایچ اسکول۔ ۲۶ ذکریا مسجد کلکتہ ۷۳

"شاعر" کے شمارہ ۵ میں جرعات کے تحت یہ بات یہ کہی گئی ہے کہ۔ اردو عوام (جی ہاں، خواص نہیں) یکجہتی اور پوری اکائی کے ساتھ اردو کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں!" ـــ اور آپ (یعنی دردمندان اُردو) ان کی رہنمائی کے لیے شاعر اور دیگر تمام اُردو اخبارات و رسائل کے ذریعے ان تک پہنچ رہے ہیں، ــ اجی جناب! پہنچئے اور ضرور پہنچئے، ہمیں یقین ہے کہ اُردو عوام آپ کو خوش آمدید کہنے کے لیے دامے درمے، سخنے تیار ملیں گے۔ صرف شرط اتنی سی ہے کہ یہ "آمد" مخلصانہ اور بے غرضانہ ہو۔ ورنہ مختلف عنوانوں سے اُردو کا "کاسہ" لیے پھرنے والے "خیر خواہوں" کی عوامی کوچے میں کبھی کمی نہیں رہی۔

خطوں میں پتے اُردو میں لکھوانا بلا شبہ ایک اچھی تحریک ہے۔ لیکن ہم لوگ اُردو میں پتہ لکھنے سے گریز اس لیے کرتے ہیں کہ خط کی منزل کہیں ردی کی ٹوکری نہ بن جائے۔ معمولی خط کے رَد کر دیئے جانے پر کوئی دعویٰ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں، اگر ہم اُردو والے ذرا حوصلہ سے کام لیں اور کچھ "اقتصادی بوجھ" برداشت کریں تو بات یقیناً مؤثر انداز میں بن سکتی ہے، وہ اس طرح کہ مختلف علاقوں میں چند اُردو دوستوں کا ایسا گروپ تیار ہو جائے جو ایک دوسرے کو رجسٹرڈ خط لکھا کرے اور وقفہ وقفہ سے بذریعہ منی آرڈر روپئے، دو روپئے بھیج دیا کرے۔ ایسا کرنے سے اُردو والوں کے درمیان باہمی رفاقت بھی بڑھے گی اور ایک سطح پر "اُردو تحریک" کو بامعنی زندگی مل جائے گی۔ رجسٹرڈ خطوں اور منی آرڈروں کو محکمۂ ڈاک قبول کرنے پر مجبور اور رَد کرنے سے معذور ہے۔

**محمد ظفر اللہ خاں**۔ ہاوس نمبر ۸۲-۲-۵، گولہ خانہ بیدر ۵۸۵۴۰۱ (کرناٹک)

اُردو کش کے اس دور میں تند ہواؤں کے مقابل جو چراغ آپ نے روشن کر رکھا ہے وہ لائق صد تحسین ہے۔

مہاراشٹر میں اُردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دینے کے متعلق اور خطوط پر پتے اُردو میں تحریر کرنے کے بارے میں آپ اردو والوں کو جو توجہ دلواتے رہتے ہیں وہ بھی قابلِ آفریں ہے۔

آندھرا پردیش اور کرناٹک میں دیرینہ مطالبہ ہے کہ اُردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دیا جائے۔ اسکولوں میں اُردو مدرسین کی مخلوعہ جائیدادوں کو پُر کیا جائے۔ انتخابی فہرست رائے دہندگان اُردو میں شائع کی جائیں۔ کرناٹک میں تو گورنر نے ہمدردانہ غور کا وعدہ کیا تھا۔

آپ نے اُردو کو معاش سے جوڑنے کی فکر انگیز بات کی ہے۔ کاش ایسا ہو جائے۔ خود اُردو والے اپنے بچوں کو اُردو مدرسوں میں پڑھائیں۔ معیارِ تعلیم کو بلند کیا جائے۔ مردم شماری میں مادری زبان اُردو لکھوائیں بجلی کھاتے، حسابات مادری زبان میں لکھیں۔ تمام یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اُردو مضمون اختیاری ہی سہی پڑھانے کا انتظام ہو۔ سرکاری مراسلت بھی اُردو میں ہو۔ غرض سفینہ چاہیئے بحر بیکراں کے لئے بمصداق ایسے تمام میدانوں کا جائزہ لیا جائے کہ جہاں اُردو کا عملاً نفاذ ممکن ہو سکے۔ ادارے بے لوث ہوں۔ رقابتیں ختم ہوں۔ گروہ بندیاں ختم ہوں۔ سرکاری ذرائع ابلاغ کی ہندوستانی زبان سہل بنائی جائے۔ شاعر اور ہمدرد ایجوکیشن ٹرسٹ یا دیگر اداروں کے تعاون سے ہندوستان گیر سروے کیا جائے۔ غیر اُردو داں حضرات کو اُردو سکھانے کا انتظام ہو CIIL سے اس کا تعاون حاصل کیا جائے۔ محترم شاعر کی تعداد اشاعت کو بڑھانے کے لیے جامع منصوبہ بند طریقے اپنائیے گا۔

---

**اُردو لکھیئے۔ اُردو بولیئے۔ اُردو پڑھیئے**

---

# قاموس الادب

مؤلف
ایس۔ جالب مظاہری

جناب ایس جالب مظاہری فی زمانہ اُردو زبان و ادب کی تعلیم و تدریس سے تعلق رکھنے والے ان معدودے چند اساتذہ میں سے ہیں، جو کسی ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ کئے بغیر راہبانہ سنجیدگی و ریاضت کے ساتھ اپنے کام میں منہمک رہتے ہیں۔ انہوں نے اپنی عمر عزیز کی چار سے زائد دہائیاں زبان وادب میں صرف کی ہیں۔ وہ میڈیا اور پبلسٹی کی دنیا سے قطعی کنارہ کش ہوکر، قواعدِ نظم و نثر کی تحقیق و تدقیق اور زبان کے ماخذات و لواحقات کی تلاش و جستجو میں مصروف رہے، جس کے نتیجے میں ان کی اہم تالیفات "رموزِ نظم" "اصلاحِ تلفظ" "ممتاز القواعد (فارسی)" اور "مطائبات شبلی" منظرِ عام پر آچکی ہیں۔

جالب مظاہری صاحب کا شمار علامہ سیماب اکبرآبادی کے ارشد تلامذہ میں ہوتا ہے۔ ایک صاحبِ فن شاعر، ادیب اور عالم سے آج کی نسل واقف نہیں لیکن جو لوگ شعر وادب کے طالب علم ہیں اور کلاسیکی ادب کے غواص ہیں وہ جالب صاحب کے نام اور کام سے بخوبی واقف ہیں۔ پُرانے ادبی رسالے میں جالب صاحب کے ارشحاتِ قلم بکھرے پڑے ہیں۔ علامہ سیماب کی ایک معرکہ آرا طویل نظم 'موحّد اعظم' نے علمی و ادبی اور شعری و مذہبی دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ علامہ پر کفر کے فتوے صادر کیے گئے تھے۔ اس وقت کے تمام چھوٹے بڑے اردو جریدے اس نظم کی اشاعت و مباحث سے بھرے رہتے تھے لیکن اس نظم کے خلاف ایک بہت بڑے محاذ کا علمی جواب نہایت ہی مدلل اور عالمانہ انداز میں جالب صاحب نے قسط وار شاعر (آگرہ) کے کئی شماروں میں اس معیار کے ساتھ دیا تھا کہ اس وقت کے جیّد علما و فصحا نے انھیں داد و تحسین سے نوازا تھا۔

جالب مظاہری صاحب کے علمی و ادبی کارنامے اور تدریسی خدمات غیر معمولی ہیں۔ ان کے بے شمار تلامذہ ملک اور بیرون ملک اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں انھوں نے ایک فعال کردار ادا کیا ہے اور کر رہے ہیں۔ فلم انڈسٹری میں بیشتر غیر اُردو داں لوگوں کو جالب صاحب ہی نے اُردو زبان کی تعلیم دی ہے۔

اُردو، فارسی اور عربی کے مکتبی اسکالرز تو بے شمار ہیں لیکن جالب صاحب جیسے جیّد عالم و فاضل اب خال خال ہی رہ گئے ہیں۔ اپنی ایک مخصوص سیرت و مزاج کے ساتھ عمر کی تمام دھوپ کا سفر طے کر رہے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب جالب صاحب کی حالیہ پیش کش ہے۔ قاموس الادب ایک منفرد و وقیع اور گراں قدر علمی کارنامہ ہے۔ ویسے تو بادی النظر میں یہ ایک لغت کا حکم رکھتی ہے لیکن دراصل یہ لفظ و معنی کی بہتری لغتوں سے یکسر مختلف ایک ادبی انسائیکلوپیڈیا ہے۔

اس کتاب میں اُردو کے نثری و شعری ادب کے ممکنہ لوازمات بحدِ استقصا جمع کر دیے گئے ہیں۔ یہ لوازمات خواہ قواعد کی رو سے ہوں خواہ تلمیحات و حوالہ جات محاورات اور اُن کے استعمال یا اسما و اشیا کی رو سے ہوں، ان کی تشریح و ترسیل بڑی دقتِ نظر سے کی گئی ہے۔ ابواب کی ترتیب، حوالے کی سہولت کو مدِ نظر بہ اعتبار حروفِ تہجی رکھی گئی ہے، کہ ہر حرف کے باب میں ممکنہ ادبی معلومات کی یکجائی ممکن ہوسکے۔ مثلاً: "ہ" کے باب میں ہفت عجائباتِ عالم بھی شامل ہیں اور ہفت خواں اور اس کے متعلقات بھی۔ 'ن' کے باب میں نثر و نظم کی جملہ اقسام بہ اعتبارِ ہیئت اور بہ اعتبارِ مضمون مثالوں کے ساتھ دی گئی ہیں۔ 'ع' کے باب میں عبادت گاہوں کا تذکرہ بھی ہے اور عروض کی نسبت تفصیلات بھی۔ اسی طرح 'س' کے باب میں 'سواریاں' جن کا ذکر ادبی حکایتوں اور مثنویوں میں آیا ہے اور 'ز' کے باب میں زیورات کی انواع و اقسام یا 'ص' کے باب میں صنائع بدائع کی جزویات۔ الغرض ہر حرف کے ضمن میں کثیر الجہات ادبی علائق کے ساتھ کما حقہٗ انصاف کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب بڑی احاطہ کُن اور اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہو گئی ہے۔ ایک ایسی قابلِ مطالعہ کتاب جو اردو کی ہر لائبریری کے لیے ضروری ہے۔ اُردو اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے شعبۂ اردو اساتذہ اور اُردو کے تمام طلبا کے ساتھ اُردو کے نئے شعرا و ادبا کے لیے بھی ناگزیر ہے بلکہ اسے ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں کے اُردو نصاب میں شامل ہونا چاہیئے کہ معلومات کا ایسا خزینہ موجودہ نصابی کتابوں میں موجود نہیں ——— ضخامت: ۴۱۶ صفحات قیمت: پچاس روپئے

طبع اوّل ۱۹۸۷ء — ملنے کا پتہ: ۴۴/۱۴۷، اکابخ والا بلڈنگ، تیسرا منزلہ، روم نمبر ۲۲، مولانا آزاد روڈ، بمبئی ۸ ...۴۰۰

**عبدالاحد ساز**

## نقد و نظر

## ماہنامہ اُردو ادب لندن

لندن سے شائع ہونے والا سنجیدہ و فکری ادب کا نمائندہ رسالہ اُردو ادب ہر ماہ پابندی کے ساتھ جہازی سائز میں شائع ہو رہا ہے۔ سید معین الدین شاہ کی ادارت میں شائع ہونے والے اس جریدے میں اُردو دنیا کے مشاہیر قلم کاروں کی تازہ نگارشات شامل ہوتی ہیں پوری دنیا میں قائم اُردو کی نئی بستیوں سے رابطے کا ایک موثر ذریعہ اُردو ادب ہے۔

پتہ 10, WESTGATE TERRACE, LONDON SW10, 9BJ – TEL: 01 – 370 1356

## مخفی تنقید و تحقیق

[ادب کا ایک مخفی مطالعہ]

تنقید کے مختلف دبستان ہیں جو شخصیت و فن کی تفہیم میں معاون ہوتے ہیں لیکن مخفی تنقید و تحقیق OCCULT LITERARY CRITICS & RESEARCH ایک نیا دبستان تنقید ہے۔ مخفی علوم سے کسی شخصیت کی تہوں اور پرتوں میں اتر کر اس کے فکری رویّوں کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر احسن آرزو کی یہ کاوش اُردو تنقید میں ایک اضافہ ہے۔

مخفی تنقید و تحقیق [۱۹۸۹ء] میں ۹ مضامین شامل ہیں: علم نجوم کی مختلف شاخیں اور ہمارے شعراء۔ امیر خسرو: فلک الافلاک کا شاعر۔ اقبال کا خواب: انجم شناس ترکی۔ زاہد حنا: ستارہ عطارد اور برج میزان کی ادیبہ۔ قاضی عبدالودود کی پیدائش اور سیرت و شخصیت: مخفی قوتوں کی روشنی میں۔ سخنہائے گفتنی: مولانا امتیاز علی عرشی کا اسم گرامی۔ رنگین دہلوی اور ان کا فراموش قطعہ: تاریخ وفات خود۔ اور اقبال کا تصوّر زماں: ترسیل کی ناکامی۔ شامل ہیں۔ —— ضخامت: ۱۴۶ صفحات۔ قیمت ۴۴ روپئے۔

پتہ: ول نفا پبلی کیشنز، شاہ جمعہ، سہسرام ۸۲۱۱۱۵ (بہار)

## رشتے ٹوٹنے کا موسم

ما بھی دھیرے چل [۱۹۷۱ء] اور برگ آتش سوار [۱۹۸۳ء] کے بعد ممتاز شاعر مصوّر سبزواری کا تیسرا شعری مجموعہ رشتے ٹوٹنے کا موسم فروری [۱۹۸۹ء] شائع ہو گیا ہے۔ اس میں ۵۴ غزلیں اور ۸ نظمیں شامل ہیں۔ کچھ حدیث کے کچھ اپنے بارے میں کے تحت شاعر کا دیباچہ بھی کتاب میں شامل ہے شعری مجموعوں کی بھیڑ میں ایک نمایاں کتاب مصوّر سبزواری کی شاعری میں لہجے کی پراسراریت، نئے نئے تخلیقی جہانوں کا ایک سلسلہ الفاظ و پیکریت کی تجسیم کاری اور ایک عمر کی گونج، قابل مطالعہ ہے۔ یہ پٹے ہوئے راستوں کی شاعری نہیں ہے۔ —— ضخامت: ۱۳۶ صفحات۔ قیمت: چالیس روپئے۔

پتہ: نصرت پبلی کیشنز، امین آباد، لکھنؤ (یوپی)

## سہ ماہی فکر و نظر علی گڑھ

[ابوالکلام آزاد نمبر]

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا ترجمان 'فکر و نظر' علمی و ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اس مجلّے نے اگست ۱۹۸۹ء میں اپنا ایک خاص شمارہ ابوالکلام آزاد پر مختص کیا تھا۔ اس میں ۱۸ علمی و تحقیقی مضامین مشاہیر کے تحریر کردہ شامل کئے گئے ہیں۔ آخر میں 'نقش آزاد' کے تحت کتابیات آزاد دیا گیا ہے جسے محمد ضیاء الدین انصاری نے نہایت ہی عرق ریزی کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ مولانا آزاد پر ادبی رسائل کے خاص نمبروں میں 'فکر و نظر' کا یہ خصوصی شمارہ نہایت ہی سنجیدہ اور فکری مطالعے کا حامل ہے۔ اس کے مدیر شہریار اور مدیر معاون: محمد صابر ہیں۔

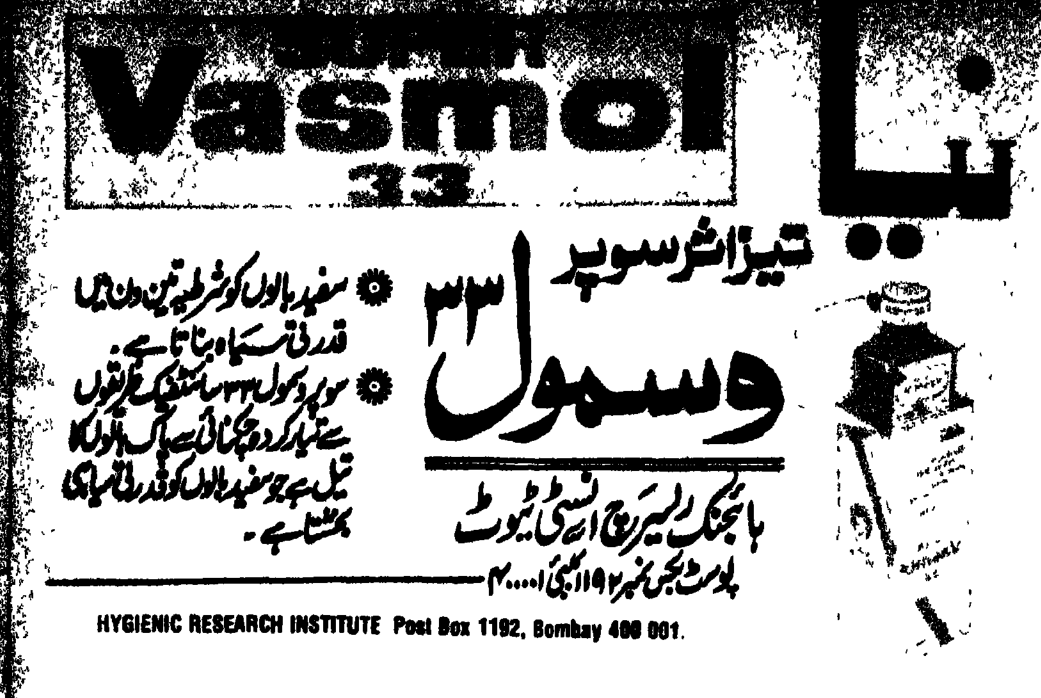
ضخامت: ۲۱۰ صفحات۔ قیمت: ۲۰ روپئے قیمت سالانہ بیس روپئے فی شمارہ ۵ روپئے۔ پتہ: فکر و نظر، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (یوپی)

## گلوں کے رنگ

پاکستانی افسانہ نگار عصمت رضوان کے ۲۱ افسانوں کا اوّلین مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ اس کا پیش لفظ احمد ہمدانی نے قلمبند کیا ہے۔ "عصمت رضوان کے افسانے زندگی کی تصویریں بھی ہیں اور اس کی موثر تعبیریں بھی۔ ان کا ہر افسانہ روز مرّہ زندگی سے پھوٹتا نظر آتا ہے۔ لیکن ان کی نظریں مقصد سے زیادہ اس کے پس منظر اور پیش منظر پر جمی رہتی ہیں۔ وہ زندگی کے واقعات کو دیکھتی ہی نہیں بلکہ انھیں سوچتی اور سہتی بھی ہیں۔ ان کا یہ رویّہ واقعات کے چہرے سے ظاہر کی گرد صاف کر کے واقعات کے پس پشت کار فرما حقیقت کا تماشا کراتا ہے۔

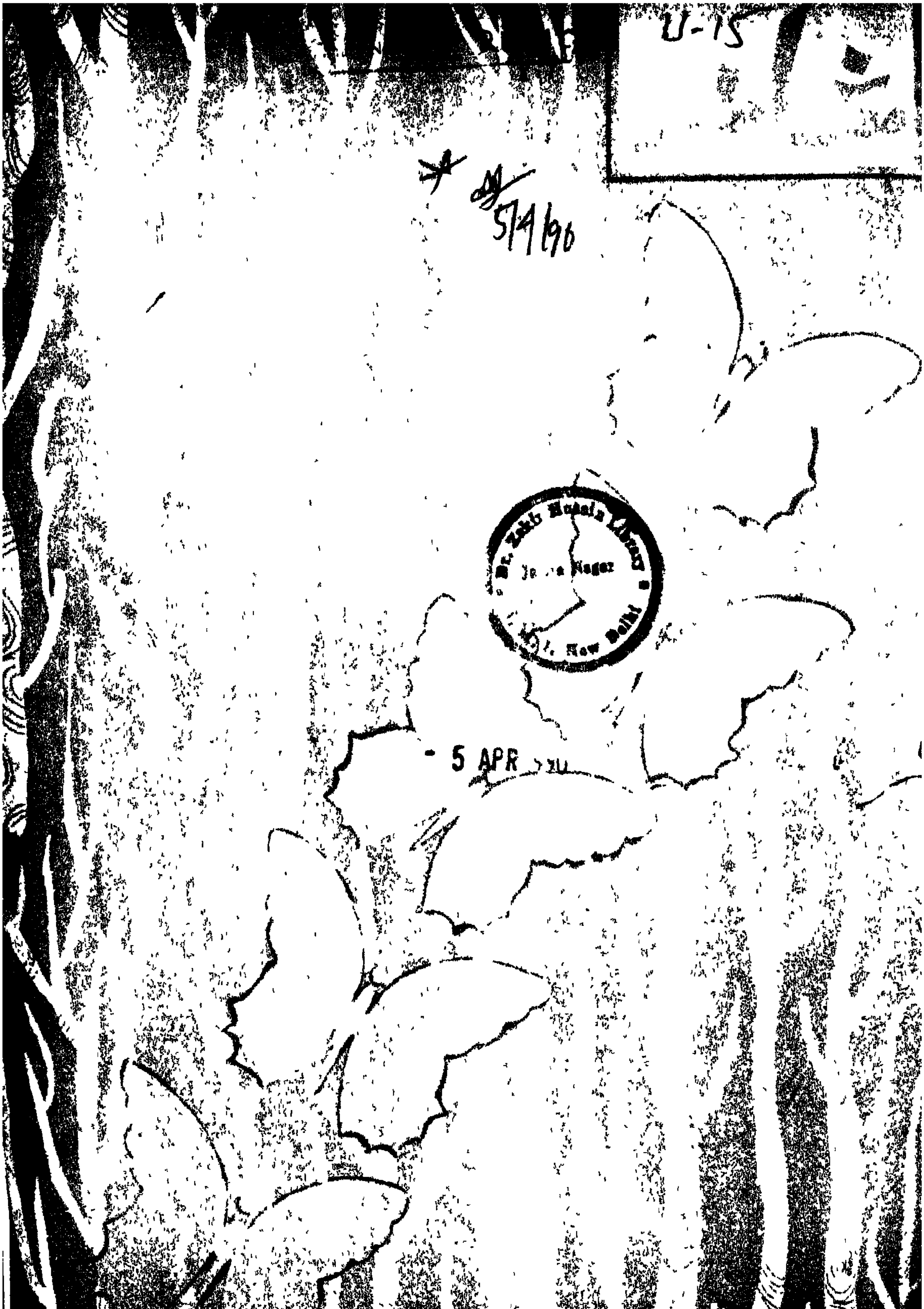
ضخامت: ۱۴۰ صفحات۔ قیمت: چالیس روپئے۔ پتہ: ۲۱۰/۹ دستگیر کالونی، فیڈرل، بی، ایریا، کراچی ۳۸ (پاکستان)

## کتب و رسائل


Vasmol
33
نیا
تیز اثر سوپر
وسمول ۳۳
سفید بالوں کو شرطیہ تین دن میں قدرتی سیاہ بناتا ہے۔
سوپر وسمول ۳۳ سائنٹفک طریقوں سے تیار کردہ چکنائی سے پاک بالوں کا تیل ہے جو سفید بالوں کو قدرتی سیاہی بخشتا ہے۔
ہائیجنک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹۲ بمبئی ۴۰۰۰۰۱
HYGIENIC RESEARCH INSTITUTE Post Box 1192, Bombay 400 001.


IT'S JUST NOT EXCELLENT, IT'S
253
EXCELLENT
NO. 253
EXCELLENT
PLAYING CARDS
T.M.R.No.176412
METRO PLAYING CARD CO.
Metro Estate, Bombay-400 029. • TEL :

Regd. No. MH-B.Y.W. 31.1
THE 'SHAIR" (MONTHLY) BOMBAY-400 008
60 Years of Publication ❋ *(Publishing Date 27-28)* ❋ Issue No 7 1989❋ Telephone No 359904
Registered with the Registrar of Newspapers at R N No 14482/57





# فکرِ امروز



"مگر مشکل یہ ہے کہ غزل کی دروبست محدود ہے۔ غزل میں قافیے اور ردیف کی پابندی ہے۔ اگر مصرعۂ مطرحہ کا قافیہ "گلستاں" اور ردیف "کے لئے" ہے تو ہر شاعر مجبور ہے کہ "گلستاں" کے قوافی پر شعر کہے۔ آشیاں، باغباں، آسماں، خزاں وغیرہ قوافی ممکن نہیں کہ فکر کے وقت ذہن و خیال میں پیدا نہ ہوں۔ اگر آشیاں کے لئے کوئی شاعر نظم کرتا ہے تو وہ تمام خیالات جو ابتدائے تخلیقِ شاعری سے اب تک آشیاں کے متعلق موزوں ہوتے رہے ہیں فطرتاً اس کے ذہن میں بھی آئیں گے۔ یہ ہے قافیے کی پابندی کا نقص۔ اگر غزل میں قافیے، ردیف کی پابندی نہ ہو تو خیال کو وسعت مل سکتی ہے یا پھر شاعر کی تخیل اتنی بلند اور ارفع ہو کہ وہ اس قافیے کے ساتھ کوئی نیا خیال نظم کر سکے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے اور ایسے شاعر جو قدیم متداول قوافی کے ساتھ کوئی نئی تخیل پیش کر سکیں گو اب بھی ہندوستان میں موجود ہیں مگر بہت کم ہیں اس لئے یا تو ان شعراء کو تخلیق بلند اور ندرت آفریں بنانے کی کوشش کرنی چاہئے یا غزل کہنا چھوڑ دینا چاہئے۔

شاعر ستمبر ۱۹۳۸ء

**سیماب اکبرآبادی**


# شاعر

اشاعت کا ۶۰ واں سال

جلد ــــ ۶۰
شمارہ ــــ ۸

فون ۳۵۹۹۰۳

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت:- ۴ روپے

زرِ سالانہ ۵۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۶۰ روپے

تاعمر خریداری ۱۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے ◆ ممالک غیر سے ۳۵۰ روپے

ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب، بمبئی سینٹرل پوسٹ آفس، پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶، بمبئی ۴۰۰۰۰۸

# ترتیب




شمارہ نمبر ۸ - جلد - ۶۰
۱۹۸۹

سرورق: خزاں بہار
عمل: سلطان سبحانی




# اُردو مادری زبان اور ہماری خواتین

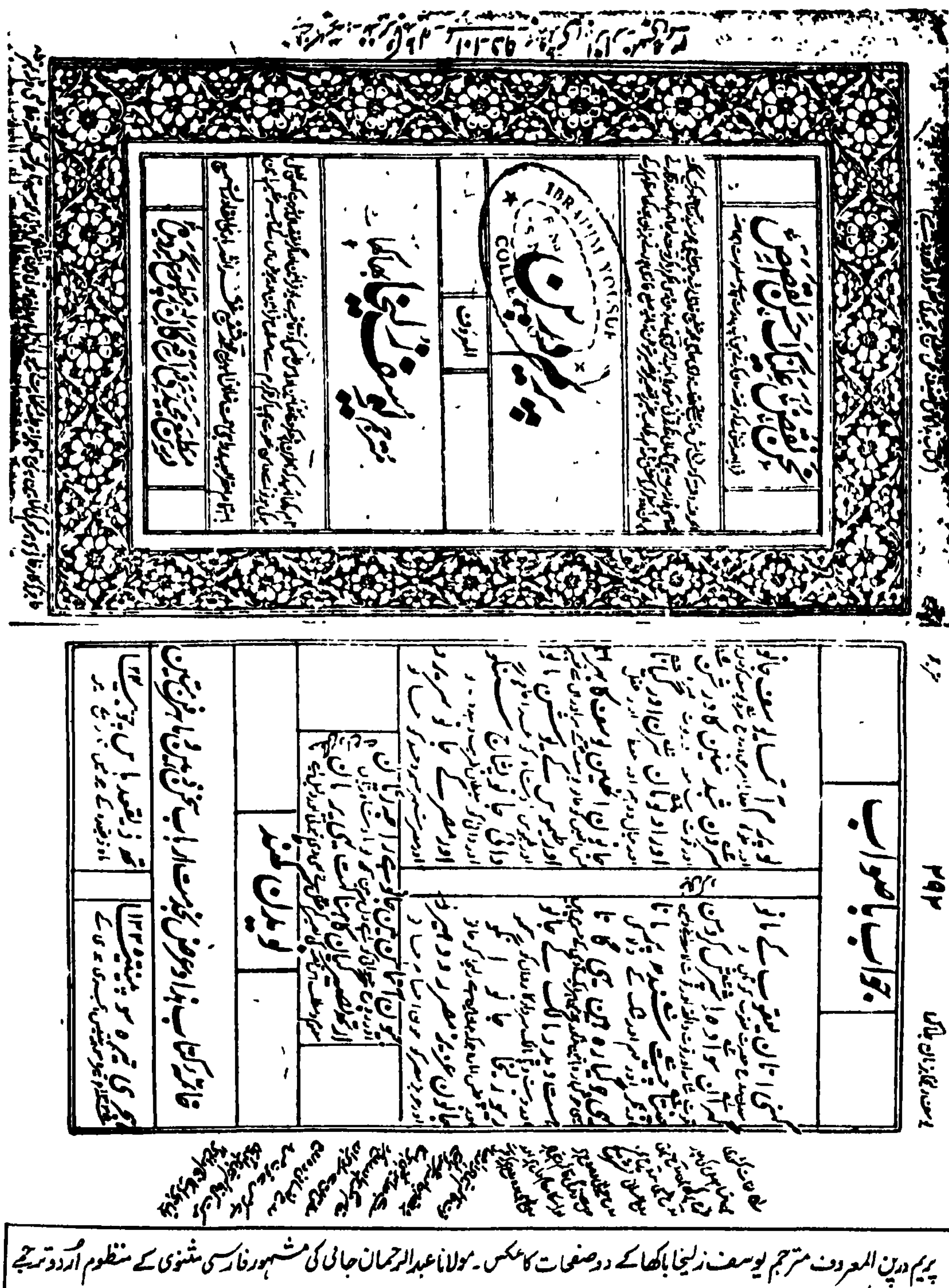
کسی بچے کو اس کی مادری زبان میں تعلیم دلوانا ایک بنیادی نکتہ ہے کہ ہر بچہ وہی زبان آسانی کے ساتھ بول سکتا ہے، سمجھ سکتا ہے جو اسے اپنی ماں کے ہونٹوں سے حرف حرف اور لفظ لفظ ملی ہے۔ عام طور پر جب اردو مادری زبان کی بات کی جاتی ہے تو اس کے مخاطب کون ہوتے ہیں یہ معلوم نہیں ہو پاتا۔ آزادی کے بعد وہ نسل ختم ہو گئی یا ہو رہی ہے جنھوں نے اُردو کو ذریعہ تعلیم بنایا تھا کہ اس وقت اُردو کا چلن تھا لیکن جو نسل اب بوڑھی ہو چلی ہے ان میں کتنوں نے اُردو پڑھی تھی، یہاں بات خواتین کی ہو رہی ہے اور بطور خاص مسلمان خواتین کی کہ یو پی، بہار، راجستھان، گجرات وغیرہ مسلم گھرانوں کی لڑکیوں کو تعلیم تو ہندی ہی میں حاصل ہوئی، انھوں نے بھی اپنے بچوں کو ہندی پڑھائی ماسوا قرآن مجید کے درس کے۔ جو کسی صوبے کی زبان وہی عام گھرانوں کی مادری زبان! مادری زبان میں تعلیم کا نعرہ لگانے والے نادانستگی میں کسی ہندی یا علاقائی زبانوں کے لئے اُردو والوں سے سفارش تو نہیں کر رہے؟

کیا روزمرہ یہ دیکھنے میں نہیں آتا کہ ماں نے اگر ہندی یا کسی اور علاقائی زبان میں تعلیم حاصل کی ہے اور بچہ انگریزی کے ذریعے تعلیم حاصل کر رہا ہے تو ماں اور بچے کے درمیان کتنے ہی مسائل اٹھ کھڑے ہوتے ہیں؟ کیا بچے کو ٹیوشن دینے کا رجحان عام نہیں ہو رہا ہے؟ ہندو گھرانوں کو تو جانے دیجئے، مسلم گھرانوں میں اب ایسی کتنی مائیں رہ گئی ہیں جو اُردو جانتی ہیں؟ مادری زبان کا رشتہ تو باپ سے بھی جڑتا ہے تو اب کتنے ایسے لوگ رہ گئے ہیں جنھوں نے اُردو میں تعلیم حاصل کی تھی؟ ہندوستان میں ناخواندگی کا اوسط کم نہیں ہوا ہے۔ اقتصادی مسائل میں ہر فرد گھرا ہوا ہے اور پورے ملک کا ماحول یوں بن گیا ہے کہ بس روپیہ کمایا جانا ہے جس طرح بھی ممکن ہو۔ اس تگ و دو میں کوئی معیار اب برائے نام ہی رہ گیا ہے، لہٰذا تعلیم کا حصول برائے معاش کی روح بھی کچھ اور ہو گئی ہے۔

ہماری خواتین کا ذریعہ تعلیم اب کون سی زبان ہے؟ کیا شادی شدہ جوان لڑکیوں کو اُردو میں تعلیم حاصل ہو سکی، کیا اس نوعیت کے سروے کئے گئے ہیں؟ پورے ملک میں اُردو کی درس و تدریس کا کوئی مکمل ضابطہ بن سکا ہے؟ کوئی تعلیمی و تربیتی نظام قائم ہو سکا ہے؟ نہیں کچھ بھی نہیں۔ پھر محض مسائل پر گفتگو اور مسلسل تکرار کا حاصل؟ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۵ء تک اُردو کے بارے میں جو کچھ کہا جاتا رہا ہے، جس طرح کے مسائل کا ذکر ہوتا رہا ہے وہ اپنی جگہ موجود ہیں مگر وقت بہت آگے نکل گیا ہے۔

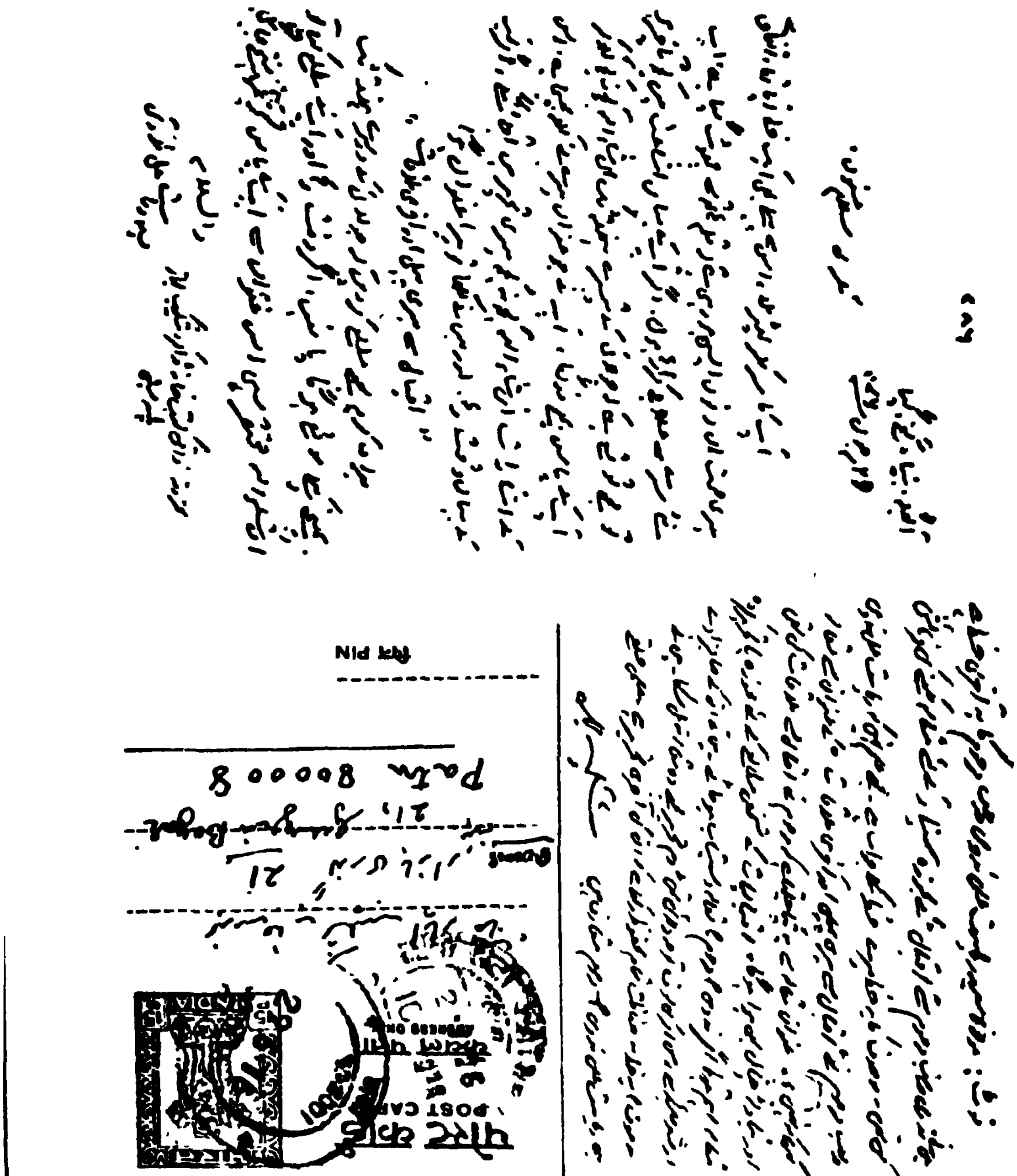
• مادری زبان کا مفہوم جو بھی ہے اسے آج کے تناظر میں دیکھے بغیر محض عادت ذہنی کے تحت لکھتے، بولتے اور لکھتے بیٹھے رہنے سے اُردو کے ابتدائی تعلیمی مسائل حل نہیں ہوں گے۔

افتخار امام



پریم درپن المعروف مترجم یوسف زلیخا باکھا کے دو صفحات کا عکس۔ مولانا عبدالرحمان جامی کی مشہور فارسی مثنوی کے منظوم اردو ترجمے کو محمد نصیر نے باکھا زبان میں منظوم کیا تھا۔

بشکریہ۔ ابراہیم یوسف [بھوپال]




مولانا سید ریاست علی ندوی مرحوم کا یہ خط ڈاکٹر شکیب ایاز (پٹنہ) کے شکریہ کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے۔ خط کی پشت پر ڈاکٹر صاحب نے جو نوٹ درج کیا تھا اس کا عکس بھی دیا جارہا ہے۔ ریاست علی ندوی مرحوم سید سلیمان ندوی کے شاگرد رشید تھے۔ انجم مانپوری کے انتقال کے بعد رسالہ ندیم (گیا) کے مدیر ہوئے۔ آپ کی کتابیں ندوہ سے شائع ہو چکی ہیں۔ اسلامی تاریخ پر غائر نظر تھی "سسلی کی تاریخ" ان کی معرکہ آرا تصنیف ہے۔



## مظفر حنفی

◆

اگرچہ رات .بتانے کو داستاں ہے بہت
مجھے کوئی نہیں سنا کہ خوفِ جاں ہے بہت

وہ آرزو نہ رہی بال و پر جو ہاتھ آئے
کدھر اڑان بھروں میں کہ آسماں ہے بہت

وفاشعار، خلوص آشنا، غیور انسان
ہماری جان کو یہ تہمتِ گراں ہے بہت

کسی کو یاد کیا جائے جاگنے کے لئے
سکوتِ دشت نہ ٹوٹے تو اک اذاں ہے، بہت

میں ایک لالۂ صحرائے بے بضاعت ہوں
جہاں جہاں بھی ہوا ہے، مرا نشاں ہے بہت

یہ احتیاط مرے واسطے قیامت ہے
کہ نقشِ پا کے لئے گردِ کارواں ہے بہت

مری تساخت، مری کج کلاہیاں ہی تو ہیں
کلاہِ کج سے مظفر مرا زیاں ہے بہت

◆

آدھی رات، کھلی کھڑکی، بے نور مکان، ہوا
پردوں کی چیرہ دستی پر بداوسان، ہوا

چند سپاہی، ڈھیروں لاشیں، کچھ سہمے مزدور
گھور اندھیرا، پھٹتا بادل، قبرستان، ہوا

گل بل کلبل امتحان کا کمرہ بچوں سے
برفیلا موسم، پنچھی، چٹیل میدان، ہوا

اپنا آنگن اپنے پن سے عاری ہو جیسے
جیسے پردیسی کرنیں، جیسے مہمان ہوا

گلشن گلشن سنتے تھے، کل دیکھ لیا جاکر
کچھ مرجھائی کلیاں، مٹھی بھر بے جان ہوا

مٹی سوندھی ہو جاتی ہے میری قربت سے
میں آوارہ بادل ہوں، میری پہچان ہوا

تنکے کی مانند اڑا کر پھینکا آج کہاں
یار مظفر! کل تک تھی اپنی رتھ بان ہوا

◆

اس نے ہم کو جھیل، ترائی اور پہاڑ دیے
ہم نے ان سب کی گردن میں پنجے گاڑ دیے

زنجیروں میں جکڑی اس منہ زور ہوا نے پھر
توڑ دیے کھڑکی دروازے، پردے پھاڑ دیے

ہم سمجھے تھے تم ہی شاید درد کا درماں ہو
تم نے بھی کچھ بھاشن بانچے، خطبے جھاڑ دیے

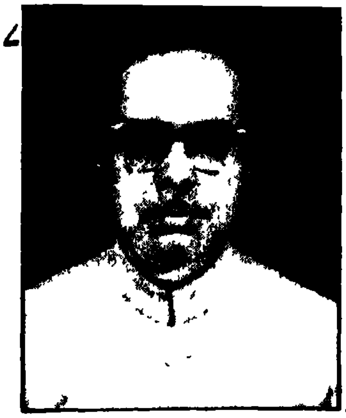
شبنم شبنم موتی بو کر آشا بیٹھی تھی
لشکر آیا، کھیت جلائے پیڑ اکھاڑ دیے

ریت بھری نہروں کو دیکھو، بہنا بھول گئیں
نفرت کی آندھی نے کتنے شہر اجاڑ دیے

ہم تو گیلی ریت تھے جس کو روندا جاتا تھا
اس نے بھی کچھ نقش بنائے اور بگاڑ دیے

لاشیں گڑتی ہیں، مٹی میں ارماں ملتے ہیں
یار مظفر! سپنے کیوں مٹی میں گاڑ دیے

● ۲۵۸۔ ٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵



**محمد انصار اللہ**

۴/۵۸۵، سرسید روڈ سرسید نگر، علی گڑھ - ۲۰۲۰۰۱

# ضرب الامثال اور مخزنِ امثال

یہ سمجھنا کہ کہاوتوں یا امثال کا تعلق عوامی یا ادبی طبقہ سے ہے خود کو شدید مغالطہ بلکہ دھوکے میں مبتلا کرنا ہے۔ حقیقت بقولِ مولانا ذکاء اللہ یہ ہے کہ

> "ضرب المثلوں کا ادب منشور الادب ہے۔ افکار و دانش و بینش کا خلاصہ، خردمندوں کے بازو کا تعویذ دانشمندوں کا افسون و جادو، ارکانِ سلطنت کا دستور العمل، آگاہی کا کارنامہ، جمہورِ انام کے لیے پیرِ خرد کا نوشدارو، عشرت و غم کے مسموموں کا تریاقِ فاروق۔" (فلسفۂ امثال ص ۱۶)

امثال کسی قوم کے بہترین افراد کے بہترین تجربات کا بہترین خلاصہ ہوتی ہیں۔ امثال چونکہ تجربے اور عمل سے وجود پاتی ہیں، وہ قابلِ عمل بھی ہوتی ہیں۔ یہیں سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ انسان نے جب پہلی بار تجربہ یا عمل کیا ہوگا، اسی زمانے میں پہلی مثل کی بنیاد قائم ہو گئی ہوگی۔ اس تجربے کے بار بار عمل میں آنے اور اس کے ذکر کیے جانے کے نتیجے میں پہلی مثل وجود میں آئی ہوگی۔ امثال سے کسی قوم کے زمانۂ حال میں سوچنے، سمجھنے اور عمل کرنے کے انداز ہی کا پتہ نہیں چلتا بلکہ ان سے زمانۂ ماضی میں اس قوم کی روایات بلکہ فتوحات کی بھی فی الجملہ عکاسی ہوتی ہے۔

امثال زبانِ خلق پر جاری ہوتی ہیں اور مشہور ہے کہ ؏ زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

اس کو خلق ہی نہیں، خالق کی آواز خیال کرنا چاہیے۔ غور کیجئے تو اندازہ ہوگا کہ بیشتر ضرب الامثال انسانی زندگی کے لیے عمدہ لائحۂ عمل فراہم کرتی ہیں اور ان میں سے اکثر میں خدائی احکام سے مطابقت پائی جاتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ امثال کے واضعوں کا تعین عموماً نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کے مضامین صاف صاف بتا رہے ہیں کہ ان کا تعلق خدا کے برگزیدہ بندوں کی اس جماعت سے ہے جو ہر زمانے میں انسانیت کو نیکی کی راہ دکھاتے رہے ہیں۔

جس طرح پھولوں کے ڈھیر سے اس حد تک اور اس نوع کی خوشبو میسر نہیں آسکتی جس حد تک اور جس نوع سے عطر کا ایک ننھا سا قطرہ ذہن کو معطر کر دیتا ہے، اسی طرح کسی قصہ، تجربے یا تاریخی واقعے کے بیان سے انسان کے ذہن و شعور پر وہ تاثر مرتب نہیں ہو سکتا جو ایک مثل سے ہوتا ہے۔ اہلِ حکمت نے انسان کے ظاہر ہی نہیں باطن کے حالات کی بھی تفتیش کے بعد امثال سے وہ فوائد حاصل کئے ہیں، جو طولانی تقریروں، داستانوں اور تاریخ کے اسباق سے بھی حاصل نہیں ہو سکتے۔ سچ ہے کہ جو کام سوئی کر سکتی ہے وہ تلوار سے ہرگز ممکن نہیں۔

مختلف زمانوں اور حالتوں میں مختلف لوگوں کے تجربے مختلف رہے ہیں، اس لیے سچ ہونے کے باوجود مثلوں میں بعض اوقات متضاد مطالب کا بھی بیان ہوا ہے۔ عملی زندگی میں اس نکتہ کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ ہر کام کا ایک وقت اور ہر بات کا ایک محل ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر مثل ہر موقع پر، ہر شخص کے لئے سچی اور قابلِ عمل بھی ہو۔

مثل ایک مدت کے تجربوں کا نچوڑ ہوتی ہے۔ اس میں جن لفظوں کا استعمال ہوتا ہے، وہ بھی پرانے ہو چکے ہیں۔ عوامی زبان نسبتاً زیادہ طویل عرصے تک اپنی اصل سے مطابق رہتی ہے۔ امثال کی زبان میں قدامت کا جو رنگ پایا جاتا ہے، اس نے اکثر کو اس دھوکے میں مبتلا کر دیا ہے کہ ان کی زبان عوامی ہوتی ہے۔ محض قدامت کسی زبان کے عوامی ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

امثال میں کسی تجربے یا عمل کا خلاصہ بیان ہوتا ہے۔ ان پر دریا کو کوزے میں بند کر دینے کی بات صادق آتی ہے۔ اس لحاظ سے مثل کو انتہائی جامع اور مانع ہونا چاہیئے۔ مثل عام طور سے دو یا دو سے زائد کلمات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ وہ ایک جملے (مفرد یا مرکب) پر بھی مشتمل ہوتی ہے لیکن اپنی ترکیب کے

لحاظ سے وہ جملے سے مختلف ہوتی ہے۔ کوئی جملہ بغیر فعل کے مکمل نہیں ہو سکتا لیکن مثل میں کسی فعل کا شامل ہونا لازم نہیں بلکہ شاید فعل کے محذوف ہونے کو بھی مثل کا حسن قرار دیا جا سکتا ہے مثلاً :

- آم کے آم، گٹھلیوں کے دام
- اندھا ملّا، پھوٹی میّت
- اپنا دام کھوٹا تو پرکھا کو کیا دوس
- اونٹ کی چوری نہریں نہریں

امثال میں صرف ضروری الفاظ لائے جاتے ہیں۔ وہ حشو و زوائد سے پاک اور اختصار کا بہترین نمونہ ہوتی ہیں۔ امثال میں ہر لفظ برمحل اور نگینہ کی طرح جڑا ہوا ہوتا ہے۔

ایک مدت تک استعمال کی خراط پر اُترنے کے بعد کوئی فقرہ مثل بن پاتا ہے اور جب وہ ہر قسم کی تراش خراش کے بعد مثل بن جاتا ہے تو نہایت محکم اور مضبوط ہوتا ہے۔ اس میں کسی قسم کے تصرّف اور تغیّر یا ترمیم کی معمولاً ضرورت نہیں ہوتی بلکہ بعض وقت اس میں تبدیلی اسے بگاڑ دینے کے مرادف ہوتی ہے۔ اسی لیے قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ :

• "امثال میں تبدیلی اور تغیّر جائز نہیں ہے بلکہ جس طرح سُنی گئی ہیں، اسی طرح استعمال کی جاتی ہیں"۔

(فلسفۂ امثال ص ۶)

مثال کے طور پر ایک مثل ہے: "آگے دوڑ پیچھے چوڑ"۔ تقریباً سبھی پرانی کتابوں میں "چوڑ" نہ کہ چھوڑ لکھا ہوا ہے۔ شیخ امام بخش صہبائی نے اس کی وضاحت کی ہے کہ:

• "ظاہرا چَوڑ کہ جیم فارسی مفتوح اور واؤ ساکن اور رائے ہندی سے مستعمل ہے۔ اصل میں چھوڑ جیم فارسی مضموم مخلوط الہا سے تھا"

(رسالہ قواعد صرف و نحو اردو ص ۲۱۷)

مولوی محمد نجم الدین نے اس بارے میں لکھا ہے:

• "مخفف چھوڑ کا ہے یا چوڑ چپٹ کا قائم مقام ہے" (نجم الامثال)

اہلِ علم نے جب امثال کو تحریراً محفوظ کیا تو ان کی ساخت اور ہیئت کی محافظت کی بھی ذمہ داری لی چنانچہ مذکورہ مثال سے ظاہر ہے[1] لیکن جس دنیا میں ہم بستے ہیں، اس میں ہر چیز کی عمر مقرر ہے۔ افراد کی طرح کلمات اور اقوام کی طرح جملوں اور فقروں کے لیے بھی موت بہرحال مقدّر ہے۔ اس دنیا میں کسی چیز، کسی بات کو بھی قرار نہیں۔ تغیّر اور تبدّل اس کا مزاج ہے۔ امثال بھی اس کلیّے سے مستثنیٰ نہیں رہ سکتیں۔

یہ کائنات ارتقا پذیر ہے۔ انسان کا علم بھی تبدیلیوں سے برابر دوچار ہے۔ اس کے تجربوں کا انداز اور مزاج بھی بدلتا رہتا ہے۔ ان تجربوں کے پیش کش کے طریقے بھی بدستور نہیں رہ گئے ہیں۔ وقت نے خود انسان کو نسلوں اور قوموں میں تقسیم کر دیا ہے۔ قوموں کی زبان، ان کا مزاج اور اندازِ فکر بھی مختلف ہو گیا ہے۔ ہر قوم کی مثلیں اور کہاوتیں بھی الگ الگ ہو گئی ہیں۔ ارتقائے عالم کے جبر کے نتیجے میں وہ حالات آج نہیں ہیں جو کل تھے۔ جو معاملات آج درپیش ہیں وہ کل نہیں ہوں گے۔ گذشتہ کل کی بہت سی چیزیں آج ازکار رفتہ ہو گئی ہیں۔ آئندہ کل کیا سامان ہوگا آج اس کا تصوّر بھی ممکن نہیں۔ کل کی بہت سی مثلیں آج نقش و نگار طاقِ نسیاں ہو چکی ہیں۔ کل جو امثال وجود میں آئیں گی آج ان کا مذکور بھی امکان سے باہر ہے۔ گذشتہ کل کی جو کہاوتیں آج رائج اور باقی ہیں وہ آج کے حالات، آج کی ضرورتوں اور آج کی بول چال کے مطابق ڈھلتی جا رہی ہیں۔ یہ تبدیلی ہی دراصل ان کی بقا و زندگی کی ضامن ہے۔ آئینِ نو سے ڈرنا اور طرزِ کہن پہ اَڑنا موت کو دعوت دینے کے مرادف ہے۔

اپنے مطالب اور ان کے اظہار کے معیار کے اعتبار سے مثلوں کی دو قسمیں ہیں :

---

[1] مولوی سید احمد دہلوی نے "آگے دوڑ پیچھے چوڑ" (ایک کام تمام نہیں ہوا کہ دوسرا شروع کر دیا) اور "آگے دوڑ پیچھے چھوڑ" (ہوسِ بیجا) کو الگ الگ دو ضرب الامثال کی حیثیت دی ہے (فرہنگِ آصفیہ جلد ۱ صفحہ ۲۰۷) اور مرتبین اردو لغت (ترقی اردو بورڈ، کراچی) نے حرفِ ثانی الذکر صورت کو اختیار کیا ہے (جلد ۲ صفحہ ۲۷۹) لیکن صحیح پہلی ہی شکل ہے۔

(الف) وہ کہ جن کا تعلق خواص سے ہے اور (ب) وہ جو خاص و عام دونوں کے لیے ہیں۔ اوّل الذکر کو ممتاز کرنے کے لیے "نادرہ" کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ عربی میں نادرہ سے وہ الفاظ مراد لی جاتی ہیں جن میں استعارہ نہ ہو لیکن اُردو میں اس مفہوم کی پابندی نہیں کی گئی ہے۔ یہاں اس پابندی کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اپنی اصطلاحوں کے مفاہیم اور محلِ استعمال میں اُردو آزاد ہے۔ اُردو میں نادرہ وہ مثلیں ہیں جو صرف خواص کے زبان زد ہوں۔ عام مثلیں اِن کے برخلاف خاص و عام دونوں کی زبانوں پر جاری ہیں۔

خواص اپنی زبان کے بارے میں بہت محتاط ہوتے ہیں لیکن ساری احتیاط کے باوجود عوامی کلمات ان کی زبان میں بھی داخل ہوتے رہتے ہیں۔ اہلِ ایران کی فارسی میں بھی ہماری زبان (اردو) کے بعض کلمے زمانۂ قدیم سے جاری ہیں۔ ہندوستانیوں کی فارسی میں شامل ہو جانا تو ان کے لیے آسان تر تھا۔ امثال میں اس کی مثالیں بہت موجود ہیں۔ ان دخیل الفاظ کی وجہ سے امثال کی دلچسپی ہی نہیں معنویت اور اہمیت میں بھی بہت اضافہ ہوگیا ہے مثلاً:

عقل چہ کتی ست کہ پیش مرداں باید ‏ ‏ ‏ ‏ عاشقاں را در جہاں لنگی بس است

فارسی را ٹنگری تو زم کہ لنگڑی شود ‏ ‏ ‏ ‏ زر نیست، عشق ٹیں ٹیں

وقت کے ساتھ عام کہاوتوں میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں، ان کی بھی دو مثالیں درج کی جاتی ہیں:

| بہ عہدِ اورنگ زیب | بہ زمانۂ شاہ عالم ثانی |
|---|---|
| ○ موڈ مونڈایا اور اولے پڑے | ○ سر منڈاتے ہی اولے پڑے |
| ○ قاضی نیاو نہ کریں گے تو گھر نہ جان دے گا | ○ قاضی نیاو نہ کرے گا گھر تو آنے دے گا |
| (عوارفِ ہندی) | (خزینۃ الامثال) |

بہادر شاہ ثانی کے وقت یہ مثلیں اس طرح رائج تھیں:

○ سر منڈاتے اولے پڑے ○ قاضی انصاف کریگا تو گھر میں نہ آنے دے گا ○ (رسالۂ قواعدِ صرف و نحوِ اردو)

ان مثالوں سے زبان کی بتدریج تبدیلی کی غمازی ہوتی ہے اور یہ صورتِ حال لسانیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے لائقِ توجہ ہے۔

تفصیلاتِ بالا سے ظاہر ہے کہ امثال میں نہایت آسان، عام فہم لفظوں کا استعمال ہوتا ہے، لیکن اس سے یہ خیال نہ ہونا چاہیے کہ ان میں بات کو بالکل سیدھے سادے انداز سے کہہ دیا جاتا ہے۔ دراصل مطالب کی میں کشش کا انداز ہی امثال کے قبولِ عام کا سبب ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں

(الف) استعارہ کا استعمال: اس میں خوبی یہ ہوتی ہے کہ وجہِ شبہ کئی چیزوں سے حاصل ہوتی ہے مثلاً ع صدا طوطی کی سنتا کون ہے نقار خانے میں اس میں قوی اور پُرزور کے مقابلے میں ضعیف اور لطیف کے نہ پوچھے جانے کی بات کہی گئی ہے اور وجہِ شبہ کئی چیزوں سے ظاہر ہے۔ (ب) مجاز کی کسی صورت کا لانا اور جس جگہ یہ دونوں شکلیں نہ ہوں، فقرہ خواہ کتنا ہی جاذبِ توجہ اور معنی خیز ہو مثل کا اطلاق اس پر نہیں ہوگا۔

ہر مثل اپنے لفظوں کے اصل معنی کے اعتبار سے مربوط اور بامعنی ہوتی ہے۔ بعض امثال کے ظاہری معنی میں بھی عمومیت کا پہلو ہوتا ہے لیکن ہر مثل کا ایک موردِ خاص ہوتا ہے اور جب اس پر وہ مثل وارد ہوتی ہے تو اس کے مفہوم کا صحیح لطف حاصل ہوتا ہے۔

مثالیں موزوں بھی ہو سکتی ہیں اور غیر موزوں بھی۔ موزوں امثال کبھی ایک شعر اور عموماً ایک مصرع کی صورت میں ہوتی ہے۔ غیر موزوں سے مراد نثری امثال ہیں جو دو یا دو سے زائد کلموں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ مختصر ترین امثال کی کچھ مثالیں یہ ہیں:

| | | |
|---|---|---|
| ○ چکنا گھڑا | ○ اٹھاؤ چولھا | ○ اندھوں کا ہاتھی |
| ○ اندھے کی بٹیر | ○ تیرے منہ چھمی | ○ جوگی کا کے میت |

نثری امثال جب کسی قدر طویل ہوتی ہیں تو وہ مسجع بھی ہوتی ہیں، مقفیٰ بھی اور سادہ بھی۔ ان کی مثالیں اس طرح ہیں:

مسجع: ‏ ‏ اونٹ بوڑیں، بھیڑ تھاہ لے۔ اندھا ملا بھوٹی مسیت

مقفیٰ ‏ ‏ چھبری نے دودھ دیا، پر مینگنی بھرا۔ من چنگا تو کٹھوتی گنگا

مسجع مقفیٰ : اگوں دوڑ ، پچھوں چوڑ ۔ تانت باجا ، راگ بوجھا

سادہ : بھوئیں پڑا آسمان چاٹے ۔ بلّی کے بختوں ، چھینکا ٹوٹا

تمام امثال میں خواہ وہ کسی قسم کی ہوں رذائل کی تفضیح اور فضائل کی تحسین کا عمل قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے اور اس سے مقصود جیسا کہ کہا جا چکا انسانی معاشرے کی فلاح و بہبود کا حصول ہے معاشرے میں اکثریت عوام کی ہوتی ہے اس لیے امثال کے لیے لازم ہے کہ وہ مقبولِ عوام ہوں کسی بھی قول پر اس وقت تک ضرب المثل کا اطلاق نہیں ہو سکتا جب تک اسے قبولِ عام بلکہ رواجِ عام کی سند حاصل نہ ہو جائے۔ اس مقام پر یہ ذکر بھی دلچسپی کا باعث ہوگا کہ امثال کا استعمال عورتوں کی زبان سے زیادہ ہوتا ہے۔ امثال کو لونا وہ خوب جانتی ہیں۔

دنیا کی سبھی زبانوں کی طرح ہماری زبان اردو میں بھی امثال کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے شمالی ہند میں پایۂ تخت دلّی رہا ہے۔ اس شہر کو ہماری تہذیبی تاریخ میں مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس شہر سے متعلق بہت سی مثلیں رائج ہیں مثلاً :

○ دلّی دور ہے ○ گھوڑوں کو دلّی کتنی دور ○ دلّی کی دیوالی ، منہ چکنا پیٹ خالی ○ دلّی کی بیٹی ، متھرا کی گائے کرم پھوٹے تو باہر جائے

جیسے جیسے دوسرے مقاموں کو تہذیبی اعتبار سے اہمیت حاصل ہوتی گئی ، اُن سے متعلق بھی ضرب الامثال رواج پاتی گئیں مثلاً :

دکھ گئے نہ اہور سے اور رہے چندیری چھالے

ایک دلچسپ حقیقت یہ بھی ہے کہ ہماری زبان اردو کے جو قدیم ترین فقرے محفوظ رہ گئے وہ بھی ضرب المثل ہی ہیں یعنی :

○ بونوں کا چاند بالا ہے ۔ ○ جو مُنڈا سا باندھی سو پاین پسری

ساتویں صدی ہجری / تیرہویں صدی عیسوی کے اوائل میں نقل کی جانے والی ان امثال نے ہماری زبان کی اصل صورت کو محفوظ کر لیا ہے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ ہندستان میں آنے کے بعد مسلمان صوفیہ اور اکابر نے یہاں کی زبان کو اس کی ساری لطافتوں اور نزاکتوں کے ساتھ اختیار کر لیا تھا مسلمان صوفیوں کی منظوم عشقیہ داستانوں میں ، جن کا اس زبان میں ایک طویل سلسلہ ہے ، امثال کا بڑی خوبی اور بے ساختگی کے ساتھ استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ یہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ امثال کی زبان جاہلوں اور نچلے طبقے کے لوگوں کی نہیں تھی بلکہ شرفا ، امرا اور سلاطین کی زبانوں پر بھی یہ مثلیں جاری تھیں۔ گجرات کے نام بر آوردہ سلطان محمود بیگڑھ کے بارے میں کہ جس کا زمانہ نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی کے وسط کا تھا مشہور ہے کہ ایک موقع پر اس نے کہا تھا :

نیچی بیری ، سب کوئی جھوری

یہ اور اس قسم کی بہ کثرت امثال عام و خاص کی زبانوں پر جاری چلی آتی تھیں۔

ضرب الامثال کو جمع کر کے ، ان کے مفہوم کو بھی قلمبند کر دینے کی طرف سب سے پہلے عالمگیر اورنگ زیب کے آخر زمانے میں مارہرے کے مشہور صوفی بزرگ شاہ برکت اللہ پیمی کو توجہ ہوئی۔ شاہ صاحب نے دو سو سے زائد امثال کو جمع کر کے تصوّف کے معاملات و مسائل کی روشنی میں فارسی میں ان کی شرح لکھی اور اپنے رسالے کو عوارفِ ہندی کے نام سے موسوم کیا۔ ایک نسخے کے کاتب نے اسے "شرح امثلۂ ہندی" بھی کہا ہے۔

یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ پیمی کے بعد بارہویں صدی ہجری / اٹھارہویں صدی عیسوی کے خاتمہ تک اس کام کی طرف پھر کسی شخص نے توجہ نہیں کی لیکن تا حال اس زمانے کی ایسی کوئی اور کاوش ہمارے علم میں نہیں آسکی ہے۔

انیسویں صدی عیسوی کے پہلے ہی سال میں جب کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا ، لکھنؤ کے سید حسین شاہ حقیقت نے عربی ، فارسی اور اردو تینوں زبانوں کی مثلوں کو بہ اعتبارِ حروفِ تہجی ایک رسالے کی صورت میں مرتب کیا۔ اس رسالے کا نام خزینۃ الامثال ہے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ مولف نے اس رسالے کا دیباچہ اُردو زبان میں لکھا ہے۔ اُس دیباچے میں ہے کہ :

" ایسی کتاب جو مجمعِ امثال ہو نظر نہیں آئی "۔

قراین اس حق میں ہیں کہ حقیقت کی رسائی پیمی کے رسالے تک نہیں ہو سکی تھی۔ اُس نے امثال کا جمع کر دینا ہی کافی سمجھا اور ان کے مطالب کو قلمبند نہیں کیا۔ حقیقت کے رسالے میں تینوں زبانوں کی تقریباً دو ہزار مثلیں مندرج ہیں۔ اس رسالے کو مولف کے بیٹے سید محسن علی محسن موسوی نے بعض اضافوں کے ساتھ چھپوا دیا تھا۔ اسی مطبوعہ کتاب کا عکس مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد نے ۱۹۸۶ء میں شائع کر دیا ہے۔

انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں شیخ امام بخش صہبائی نے جب اپنا رسالہ[1] قواعدِ صرف و نحوِ اردو مرتب کیا تو اس کے آخر میں انھوں نے بھی ایک باب ضرب الامثال سے متعلق شامل کیا۔ صہبائی کے پیشِ نظر امثال سے متعلق مذکورہ دونوں کتابیں نہیں تھیں۔ انھوں نے اردو کی قریب سوا تین سو کہاوتیں فراہم کیں اور لکھا کہ :

"جو مثل کہ معنی اس کے ظاہر اور قابل توجیہ کے نہ ہوں گے، اس کو لکھ کر قلم کو مقصدِ اظہارِ معنی کا نہ ہوگا اور باقی کے معنی بھی لکھ لیے جاویں گے۔"

صہبائی نے یہی نہیں کیا کہ امثال کی تشریح کر دی، بلکہ بعض مثلیں جو قصہ طلب تھیں اُن سے متعلق قصہ کو بھی مختصراً تحریر کر دیا ہے، اس طرح صہبائی نے کام کو آگے بڑھایا ہے۔ صہبائی کی کتاب میں امثال کا متن کئی مقاموں پر اول الذکر دونوں کتابوں کے اندراج سے مختلف بھی ہے۔ یہ اختلاف زمانی اور مکانی فرق کے سبب سے ہو سکتا ہے اور یہ فرق امثال کے تدریجی ارتقا کا مظہر بھی ہے۔ انیسویں صدی کے نصف اوّل کی نثری تصانیف کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے اس اعتبار سے بھی صہبائی کے اس رسالے کو اہمیت حاصل ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد جب اہلِ وطن کچھ سنبھلے تو ماضی کی طرف خیال گیا اور اپنے قدیمی سرمائے کو محفوظ کرنے کی فکر ہوئی۔ روہیلکھنڈ لٹریری سوسائٹی بریلی نے اپنے مطبع سے چھپوا کر ۱۸۶۸ء میں کالی چرن نامی ایک شخص کی کتاب "امثالِ ہندی" کو دو حصوں میں شائع کیا۔ اس کتاب میں امثال کو بہ اعتبار حروفِ تہجی مرتب کیا گیا ہے لیکن اُن کی شرح نہیں کی گئی ہے۔

اینگلو عربک اسکول دہلی کے ریاضی کے استاد مولوی محمد نجم الدین نے اردو زبان دانی کے سلسلے میں کئی کتابیں لکھیں۔ اُن میں پانچویں کتاب "نجم الامثال" ہے اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۸۷۶ء میں نکلا تھا۔ کتاب مقبول ہوئی اور اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا۔ کہا گیا ہے کہ :

"اردو زباندانی کا پانچواں حصہ موسوم بہ نجم الامثال جس میں پیشتر ۳۶۸ ضرب الامثال تھیں، اب کی دفعہ ایک ہزار اور زیادہ کی گئی ہیں۔"

دیباچہ میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ "کوئی جامع کتاب" موجود نہیں تھی، اس لیے مؤلف نے اس کا بیڑا اٹھایا۔ طبعِ ثانی میں امثال کے قصے بھی لکھے گئے ہیں۔ بعض محاورے جو پہلے ایڈیشن میں شامل ہو گئے تھے، نکال دیے گئے اور اب اس میں "خالص مثلیں رکھی گئی ہیں"۔ مؤلف نے اپنے ماخذ کا پتہ نہیں دیا ہے لیکن امثال اور ان کی تشریح میں جو لکھا گیا ہے وہ بڑی حد تک صہبائی کی تحریر سے مطابق ہے اور اس بارے میں شبہ نہیں معلوم ہوتا کہ صہبائی کا رسالہ اس کتاب کے بنیادی ماخذ میں سے ایک ہے۔

مرزا محمد مرتضیٰ عاشق لکھنوی عرف مچھو بیگ نے بھی اسی سال میں "بہارِ ہند" کے نام سے ایک کتاب شروع کی جسے "معدن لغات و مخزنِ اصطلاحات و گنجینۂ محاورات و مثل" کہا گیا ہے۔ اس کتاب کا پہلا حصہ جو حرف الف سے شروع ہونے والے الفاظ و فقرات پر مشتمل ہے مطبعِ شوکتِ جعفری لکھنؤ سے ۱۸۸۹ء میں چھپ کر شائع ہوا۔ یہ کتاب ایک قسم کی لغت ہے جس میں امثال کے معنی بھی درج کر دئے گئے ہیں اور ہر ایک کے واسطے سند میں شعر بھی نقل کیا گیا ہے۔

شمس العلما مولوی محمد ذکاء اللہ نے اپنے عالمانہ انداز سے امثال کی طرف توجہ کی اور دو رسالے "فلسفۂ امثال" اور "منتخب الامثال" کے نام سے ترتیب دیے۔ پہلے رسالے کے دیباچے میں امثال کی حقیقت اور اہمیت سے بحث کی گئی ہے۔ پھر مختلف حروفِ تہجی کے تحت ترتیب وار عنوان قائم کر کے مختلف یوروپی زبانوں مثلاً انگریزی، فرانسیسی، اسپینی، پرتگالی وغیرہ، کئی ایشائی زبانوں جیسے یونانی، عربی، فارسی، چینی وغیرہ اور متعدد ہندوستانی زبانوں بنگالی، اردو، تمل، تیلگو، پنجابی وغیرہ کی امثال جمع کی ہیں۔ دوسرے رسالے میں بھی مختلف زبانوں کی مثلیں اکٹھی کی گئی ہیں۔ دونوں رسالوں میں ملا کر امثال کی تعداد ساڑھے چار ہزار سے اوپر ہو جاتی ہے۔ یہ دونوں رسالے یکجا مطبعِ مجتبائی دہلی سے ۱۸۹۸ء میں چھپے تھے۔

مولوی ذکاء اللہ کے اِن رسالوں کے مطالعے سے بعض بہت دلچسپ باتیں سامنے آتی ہیں مثلاً :

حرف الف سے شروع ہونے والی مثلیں نو سو سے زائد ہیں، پھر ب سے ۲۶۵، د سے ۲۵۶، اور ر سے ۲۵۲ ہیں۔ حرف ی سے ایک بھی نہیں ہے۔ ط سے ۲، ض سے ۸، ظ سے ۹، ل سے ۱۴، ف سے ۱۵، ہ سے ۱۶ ہیں۔

---

[1] اس رسالے کے بارے میں تفصیلات کے لیے دیکھیں "صہبائی۔ ایک مختصر تعارف"

عنوانوں میں آدمی سے متعلق ۱۵۱ مثلیں ہیں، کلیات سے متعلق ۱۰۲، جھوٹ سچ کے بارے میں ۹۰، دولت اور متعلقات سے ۸۵، ازدواجی اور ساس بہو کے رشتوں سے متعلق ۸۴، اور اللہ تعالیٰ سے متعلق صرف پچاس مثلیں ہیں۔

حیوانات میں کتے کے بارے میں ۷۵، گدھے سے متعلق ۴۷، گھوڑے کی ۲۸ اور متفرق ۳۴ مثلیں ہیں۔ امثال سے متعلق اب تک جتنی کتابیں راقم کی نظر سے گزری ہیں ان میں سب سے زیادہ علمی اور نتیجہ خیز مولوی ذکاءاللہ کے یہی دونوں رسالے ہیں۔

سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ بیسوی صدی کے عشرۂ چہارم کے آخر میں دہلی کے دو خواجہ صاحبان نے اپنے اپنے طور پر امثال سے متعلق قصّوں کو قلمبند کیا۔ پہلی کتاب "قصص الامثال" خواجہ محمد ناصر حسن قادری کی ہے جو برقی پریس دہلی میں غالباً ۱۹۲۷ء میں چھپی تھی۔ دیباچے میں لکھا ہے کہ:

"ڈھائی سو سے اوپر کہاوتیں جن کے متعلق قصّے کہانیاں وغیرہ بڑی تلاش و محنت سے بہم پہونچائی ہیں، یہ ان کا مجموعہ ہے اور قصص الامثال کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔"

اس میں مولّف نے یہ اطلاع بھی دی ہے کہ انھوں نے بارہ ہزار سے زاید ہندوستانی کہاوتیں اپنی ایک کتاب "درّ الامثال" میں جمع کی ہیں لیکن وہ کتاب ہماری نظر سے نہیں گزری اس لیے اس کے بارے میں کچھ کہنا ممکن نہیں۔

دوسری کتاب "قصہ طلب ضرب الامثال" کے نام سے خواجہ محمد عبدالمجید دہلوی نے مرتّب کرکے مکتبہ جامعہ دہلی سے ۱۹۳۸ء میں چھپوائی۔ اس میں اُٹھہتّر مثلوں سے متعلق حکایتیں قلمبند کی گئی ہیں۔

ضرب الامثال کو جمع کرکے مرتّب کرنے کا سلسلہ آج بھی جاری ہے چنانچہ جناب وارث سرہندی کی کتاب جامع الامثال ۱۹۸۶ء میں مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں عربی، فارسی اور اردو کی ایسی مثلیں جمع کی گئی ہیں، جو پڑھے لکھے اُردو داں طبقے میں رائج ہیں۔ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اب تک یہی سب سے جامع کتاب ہے۔ اس میں امثال کی تشریح بھی کی گئی ہے۔ اور جو تفصیلات بیان کی گئیں، ان کی روشنی میں اس کتاب کو سب سے جامع تسلیم کرنا ممکن نہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ ضرب الامثال سے متعلق اور بھی بہت کتابیں مختلف انداز سے لکھی گئی ہوں گی لیکن یہ بات افسوسناک ہے کہ خزینۃ الامثال سے جامع الامثال تک شاید کسی بھی کتاب میں ماخذ کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ امثال کی تعداد میں اضافہ کرنے کے شوق میں عموماً اس پہلو پر بھی نظر نہیں رہی ہے کہ جس فقرے کو مثل کے نام پر داخلِ کتاب کیا جا رہا ہے، وہ فی الواقع مثل ہے بھی یا نہیں۔ مخزن الامثال غالباً وہ آخری کتاب ہے جس میں اس پہلو پر نگاہ رکھی گئی ہے۔

## مخزن امثال

یہ کوئی باضابطہ اور مربوط تصنیف نہیں ہے۔ دانا دیال مہرشی شیو برت لال ورمن صاحب نے اپنے خویش جناب گوری شنکر لال اختر کی فرمائش سے "ضرب الامثال کے ظہور کے اسباب" لکھے تھے جو بالاقساط رسالہ "ستارام" میں چھپتے رہے۔ جناب اختر نے ان کو اپنے مقدمے کے ساتھ یکجا کرکے، اس مجموعے کا نام "مخزن امثال" مقرر کیا۔ افسوس ہے کہ رسالہ ستارام کا فائل ہمیں دستیاب نہیں ہو سکا اس لیے اس مجموعے کے سالِ تصنیف کا تعیّن بھی ممکن نہیں، ہوا لیکن اس بنا پر کہ مہرشی جی نے فروری ۱۹۳۹ء میں چولا چھوڑا تھا اور جناب اختر کا کہنا ہے کہ ان کے علم میں ایسی کوئی دوسری کتاب نہیں ہے یہ خیال کیا گیا ہے کہ دہلی کے دونوں خواجہ صاحبان سے پہلے یہ کام مہرشی جی نے کیا تھا۔

اختر صاحب نے بتایا ہے کہ ضرب الامثال سے متعلق چھوٹی چھوٹی کتابیں بازار میں فروخت ہوتی رہتی ہیں۔ ان ہی چھوٹی چھوٹی کتابوں کو دیکھ کر اختر صاحب کے ذہن میں مذکورہ فرمائش کا خیال پیدا ہوا ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کتابیں مہرشی جی کی نظر سے بھی گزری ہوں۔ انھیں کو اس مخزن امثال کا بنیادی ماخذ سمجھنا چاہیے۔ افسوس ہے کہ اُن میں سے کسی ایک کا نام بھی اختر صاحب نے نہیں بتایا۔

مہرشی شیو برت لال ورمن نے ہندوستان میں مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک، اور بیرونِ ملک امریکہ سے جاپان تک کا سفر کیا تھا۔ وہ فنا فی العلم اور صاحبِ نظر تھے۔ عام و خاص سب کے ساتھ ان کے معاملات تھے۔ وہ بہت کثیر المطالعہ اور ذہین شخص تھے۔ بے شمار ضرب الامثال اُن کے حافظے میں محفوظ تھیں۔ ایک مدّت کے تجربے، مشاہدے اور غور و فکر کے بعد شعوری طور پر صوفیوں اور سنتوں کی روش کو انھوں نے اختیار کیا تھا جو اپنے عقیدتمندوں کو بہترین انداز سے تعلیم و تربیت دیتے رہتے تھے۔ مہرشی جی اس نکتے سے بخوبی واقف تھے کہ نثر و نظم میں بلاغت اور دلکشی پیدا کرنے کے لیے تلمیحات اور ضرب الامثال کے استعمال سے بہتر کوئی صورت نہیں ہے۔ اُن کی شاید ہی کوئی تصنیف ایسی ہو جس میں جا بجا ضرب الامثال کا صرف نہ ہوا ہو، چنانچہ اختر صاحب کی مذکورہ فرمائش کو بخوبی پورا کر دیا

(باقی صفحہ ۲۸ پر دیکھیے)



سرشار بلند شہری

# دوہے

مسجد کے مینار سے اڑا کبوتر ایک
سچ ہے پیارے سائیاں تیرے روپ انیک

○

گاؤں، ندی! چنچل ہوا! ہوا میں تیرا پیار
ہوا سے ماٹی میں بنے رنگ رنگ آکار

○

من ہے کُٹی فقیر کی من میں جو بس جائے
بس وہ ہی راجہ بنے نت نت موج اڑائے

○

دو نیناں لہرائیں گے سات دھنک کے رنگ
اک دن رہ کر دیکھئے کسی فقیر کے سنگ

○

ہل کے پیچھے میں چلوں میرے پیچھے مور
مور کے پیچھے آئے جو اس کے من میں چور

○

سایہ اپنی دیہہ شستانے کو دے
پتھر مارو پیڑ کو پھل کھانے کو دے

○

ہم تم سبھی مہمان ہیں نام خدا کا لیں
ایدن کی چوری کریں دان سوئی کا دیں

○

دودھ پیئے تو تن بڑھے گھی کھائے تو دھیان
اس کی مہما ہووے تو سمے بڑا بلوان

○

گھ بس ڈیرا کال کا نہ آٹا نا دال
میں ہر کو کیسے بھجوں گھی کا دیوا بال

○

جگ ماٹی کے ڈھیر پہ بیٹھا ہوا فقیر!
دونوں آنکھیں موند کے خود کو کہے امیر!

○

رستے میں اک پیڑ پر پنچھی بول گیا
پنچھی کی آواز سے جیون ڈول گیا

○

پگ پگ پر پگڈنڈیاں لہرائیں بل کھائیں
بانکے بانکے اجنبی ملیں بچھڑتے جائیں

○

پنگھٹ کی شو بھا گئی موسم ہوئے اُداس
پنچھی پتھر بن گئے تک تک تیری آس

○

اونچی نیچی گھاٹیاں کہیں کہیں ٹھہراؤ
جیون کے اتہاس پر سپنوں کا پربھاؤ

○

کھلی ہوئی اس قبر میں سویا ہوگا کون؟
سویا ہوگا کوئی تو رویا ہوگا کون؟

○

آؤ قبرستان میں بیٹھیں گے کچھ دیر
بات کریں گے بار سے روئیں گے کچھ دیر

○

کوئل آم کی ڈال پہ بیٹھی شور مچائے
پھول آیا پھل آگئے اک تم ہی نہیں آئے

○

سانجھ سمے دیپک ہنسے دیپک سنگ پتنگ
بن ساجن کیسے ہنسوں نہیں تہارو سنگ ●

نہ تو میرا ساجنا نا میں تیری کوئے
مکھ دیکھے پیت ہے کون کسی کا ہوئے

○

پتھر میں چنگاریاں لکڑی میں بھی آگ
اپنی چونچ بڑھائیو سوچ سمجھ کے کاگ

○

پہلے تو من بھر دیا سُن سُن میٹھے گیت
آج سمجھ میں آئی ہے بنجارے کی پیت

○

میں سوداگر پریم کا پریم جو لے تو بول
پر یہ گانٹھ میں باندھ لے پریم پریم کا مول

○

گھر کا تالا توڑ کے چور سبھی لے جائے
مکھ پہ تالا ہوئے تو چور کھڑا پچھتائے

○

کون جلے یہ بادری اُٹھ اُٹھ بیٹھی ہوئے
جیتا تلک آشا بندھی پیا میں گے کھوئے

○

ندی کے تٹ پر کون ہے پچھڑا یار نہ ہوئے
جس کارن پاگل ہوا وہی پیار نہ ہوئے

○

اپنے گھر بیٹھے رہو کہیں نہیں ہے کوئے
کھولو من کی کوٹھری یا میں کوئی بھوئے

○

وقت بہت مصروف ہے تھوڑا وقت نکال
اک دو ساعت کے لئے اپنا آپ سنبھال

○

وقت بڑا چالاک ہے وقت کے ساتھ چلو
سارے دن چلتے رہو ساری رات چلو

○

سونے کے سَو روپ ہیں سچ ہے پرجمان
وہ سونا کس کام کا جس سے ٹوٹیں کان

○

کج فہمی کا دائرہ آگے بڑھتا جائے
نعل لگائیں سمند کو مینڈکی پاؤں اٹھائے

● ۲۸۔ جیو پیڑہ چال، دھودیستور روڈ، احمدآباد ۱



شرون کمار ورما

۱۸۰/۱۱، کرجا لسبات، امرتسر-۱۴۳۰۰۱ (پنجاب)

# کانٹوں پر چلتے لوگ

وہ آج جلد ہی آگیا ہے۔ اس کے گھر کی طرف آتے ہوئے ایک دوست کے اسکوٹر پر۔

اسکوٹر بھی مزے دار سواری ہے۔ جیسے کرسی پر بیٹھے اُڑے جا رہے ہوں کار نہ سہی، آدمی کے پاس کم از کم اسکوٹر تو ہو، ایسے بڑے شہر میں۔ کناٹ پیلس سے شنکر روڈ کی ہلکی سی چڑھائی پھر راجندر نگر کی طرف اترائی۔ شارٹ کٹ، بس تو ادھر اُدھر چکّر لگا کر گھنٹہ بھر بعد پہنچتی ہے، وہ بھی اگر وقت پر مل جائے تو ——

لفٹ کے لیے شکریہ ادا کر کے وہ گلی میں داخل ہو گیا ہے۔ گلی کے آخری سرے پر وہ ایس ایس ٹین شیٹ' کی چھت والا کوارٹر ہے جس کے ایک کمرے میں وہ رہتا ہے —— نہیں، رہتے ہیں۔ وہ اور اس کی ٹائپسٹ بیوی۔ کمرے میں، دائیں دیوار سے لگا وہ پلنگ ہے، جو جہیز میں آیا تھا اور جس کی نواڑ کھینچ کھینچ کر اتنی کمزور ہو چکی ہے کہ اب ٹوٹنے لگی ہے —— سسرال سے آنے والی تقریباً ہر چیز اپنا رنگ و روپ کھو چکی ہے۔ اس پلنگ کے نیچے بانس کی ایک چارپائی ہے۔ رات کو وہ یہ چارپائی باہر کھینچ لیتے ہیں۔ بائیں کونے میں اینٹوں پر پیٹی رکھی ہے، جس میں سردیوں کے بستر، گرم کپڑے اور کچھ ایسا ہی سامان بھرا ہے۔ دو ٹرنک اور ان پر خستہ حال اٹیچی کیس۔

ان کے کوئی بچہ نہیں ہے۔ اس لیے نہیں کہ دونوں میں سے کوئی اس قابل نہیں، بلکہ اس لیے کہ انھوں نے پیدا ہی نہیں کیا۔ یہ فیصلہ انھوں نے فیملی پلاننگ کے لمبے چوڑے اشتہار یا گھٹیا ڈرامے دیکھ کر نہیں، اپنی تنخواہ اور گھریلو بجٹ کو مدّنظر رکھ کر، سوچ بچار کر کیا ہے۔ اس مسئلہ کو لے کر تو نہیں، البتہ پلنگ اور اٹیچی کیس کو لے کر میاں بیوی میں کبھی کبھی من مٹاؤ ہو جاتا ہے۔ ڈھیلی نواڑ پر لیٹے لیٹے جب کمر درد کرنے لگتی ہے تو انھیں ڈنلپ گدّے کا خیال آتا ہے۔ اس پر وہ کہتی ہے۔ اگر تم باہر جائے اور سگریٹ پینا چھوڑ دو تو ہم اتنے پیسے بچا سکتے ہیں —— وہ بیوی کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے —— میں تو پہلے ہی بہت کم پیتا ہوں —— سال بھر ایسا کر کے دیکھ لیا، گدّا لینے گئے تو قیمت دوگنی ہو چکی تھی، اب یہ بھی میرا قصور ہے —— بات بیوی کی سمجھ میں آجاتی ہے لیکن کمر کا درد کم نہیں ہوتا، ناراضگی بھی ایک دم دور نہیں ہوتی، وہ منہ پھیر کر پڑ رہتی ہے۔ اس سے بھی قیمتوں میں اضافہ نہیں رکتا۔

اسے کمرے میں پہنچنے کی جلدی نہیں ہے —— اس لئے وہ ٹہلتا ہوا چل رہا ہے۔ گلی کے بچے ٹھنڈے مشروب کی بوتلوں کے ڈھکنوں سے کھیل رہے ہیں بے ڈھنگی، وہ سڑک پر 'پیپسی سافٹ ڈرنکس' اور 'نیشنل فوڈز' نام کی دو کانوں کے سامنے سے شور لاتے ہیں۔ گھروں میں پُرانے ریڈیو سیٹ پوری آواز سے فلمی گیت اچھال رہے ہیں —— "گوری سنر ماؤنا' ہم سے کہہ دو ذرا —— رات کیسے کٹی، بات کیا کیا ہوئی"۔ قسم کے چٹخارے دار گیت نہ ہوں تو ان ڈربہ نما کوارٹروں میں بند کنواریاں پاگل ہو جائیں —— بریسر لگر کے یہ سیلٹی والو نہ جانے کتنے حادثوں اور بدنامیوں سے بچائے ہیں ان زرد رنگ کے کوارٹروں کو۔

بچے شور مچا رہے ہیں، لڑ رہے ہیں، ریڈیو کھڑکھڑا رہے ہیں، لوہے کی سلاخوں کے پیچھے پیاسی آنکھیں نجات چاہتی ہیں۔ عورتوں نے انگیٹھیاں سلگا کے لئے دروازوں کے باہر رکھ دی ہیں۔ دھواں ہوا کے اشارے پر ہے۔ کام سے لوٹے، تھکے ماندے مرد، گلی میں پڑی چارپائیاں توڑ رہے ہیں، پیلی ہو چکی بنیانیں میلے تہمد اور دھانگیے، کھانسی، گالیاں، شکایتیں۔ اور پھر آخر میں ہلدی مرچ سے رنگی ادھ مری بیویاں۔

اس کے کمرے کا دروازہ بند ہے: تالا لٹک رہا ہے۔ اس کی بیوی ابھی تک نہیں آئی —— وہ ایک موٹی سی گالی دیتا ہے —— نہ جانے کیسے۔ نہ جانے کیوں —— ایک چابی اس کی جیب میں ہے —— وہ انگلیوں سے اُسے محسوس کرتا ہے —— سرد، جامد اور سخت —— جیسے بیوی کی انگلی پکڑ لی ہو۔ وہ پریشانی سے ہاتھ جیب سے نکال لیتا ہے —— بند دروازہ اور اس کے پیچھے ٹھنڈا اندھیرا، اداسی اور تنہائی۔

وہ واپس ہو لیتا ہے —— دو عورتیں دھوئیں کو لے کر لڑ رہی ہیں ایک کی انگیٹھی کا دھواں، دوسری کے گھر میں جا رہا ہے۔ وہ انگیٹھی اٹھا لینے کے لیے تکرار کر رہی ہے۔ پہلی اُسے ہوا کا رُخ بدلنے کے لئے کہتی ہے۔ کچھ نوجوان

دور کھڑے ہنس رہے ہیں۔ اب مورچہ ان کے شوہروں نے سنبھال لیا ہے۔ گالیاں، دھمکیاں ــــ دھواں ہوا کا رُخ بدلتے ہی، رُخ بدل لیتا ہے۔ جھگڑا ٹھنڈا ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔ وہ نوجوان مایوسی سے سڑک کی طرف چلے جاتے ہیں۔

سڑک پر ٹریفک کا شور ہے۔ بھیڑ ہے۔ آدمی، ہارن، شور، حادثے۔ کہاں چلا جائے وہ، کیا کرے، عورتیں تھیلے لئے شام کو لگنے والی منڈی میں سستی سبزی بھاجی خریدتی پھر رہی ہیں ــــ مول تول، تکرار، جھگڑا۔ نہ کپڑوں کا خیال نہ اپنا ہوش۔ ایڑیاں میلی اور پھٹی ہوئی، لباس رنگوں کی تمیز سے عاری۔ کیسی عورتیں ہیں یہ ــــ اُس کی بیوی ــــ اب تو وہ بھی اپنی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتی، خود سے لاپرواہی اچھی نہیں ہوتی ــــ وہ سن کر اَن سنی کر دیتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ ایک عرصے سے وہ اپنی بیوی سے نہیں ملا ــــ کیا وہ سچ مچ میاں بیوی ہیں ــــ!؟ وہ دکھ سے سوچتا ہے ــــ ایک ہپّی جوڑا اپنے میں مست اس کے قریب سے گزر گیا ہے ــــ وہ ہپّی کیوں نہ ہو جائے۔ یعنا ممکن ــــ نہ کوئی رشتہ، نہ ذمہ داری نہ کوئی بوجھ۔ ایل۔ ایس۔ ڈی ــــ

وہ فٹ پاتھ پر کھڑا ہے اور خود کو شہر کی بھیڑ سے الگ محسوس کر رہا ہے۔ ہر صبح وہ اور اس کی بیوی اس جگہ تک ساتھ ساتھ آتے ہیں۔ اس کے بعد ان کی راہیں جدا ہو جاتی ہیں۔ وہ روٹ نمبر ۱۵ لیتا ہے اور اس کی بیوی روٹ نمبر ۱۵ ــــ وہ مسکرا دیتا ہے۔

"کیا بات ہے! آج تو مسکرا رہے ہو؟" اس کا پڑوسی پوچھتا ہے۔

وہ کچھ نہیں کہتا ــــ کیا بتاتا وہ تو رو دیا تھا۔ سڑکوں پر اسی طرح رویا جاتا ہے ــــ وہ سڑک پار کر جاتا ہے ــــ اب کیا کرے ــــ گھر جلدی آنا بھی مصیبت ہے ــــ چائے کا کپ، سگریٹ اور ایک پان ــــ وہ اس خواہش کا گلا گھونٹ دیتا ہے، جیسے ناجائز اولاد ہو ــــ ڈنلپ میٹرس ــــ ڈھیلی نواڑ، کمر درد ــــ وہ گاندھی میڈیکل اسٹور کے سامنے جا کھڑا ہوتا ہے۔ نوجوان مالک اسے پہچان کر مسکراتا ہے ــــ "بھائی صاب، اتنی دوائیں مت کھایا کرو ــــ کمر درد اور نیند کی دوا دے دو، چھوٹے سے لفافے میں ــــ اور سلیقے سے پیک کی گئی دوائی لے کر وہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ پیکنگ خوبصورت ہوتی جا رہی ہے۔ وہ بیوی کی صورت یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے اور حیران ہوتا ہے کہ وہ جانا پہچانا چہرہ آنکھوں کے سامنے اجاگر نہیں ہو رہا ہے ــــ سامنے خوبصورت سائن بورڈ آ جاتا ہے۔ 'دی ٹیسٹ'، THE TASTE اچھا نام ہے ــــ اس کی زبان پر چائے کا ذائقہ جاگتا ہے ــــ وہ تیزی سے آگے نکل جاتا ہے ــــ یہ عیاشی وہ نہیں کر سکتا۔

بیوی دفتر سے آ جائے تو چائے گھر پر ہی پئیں گے ــــ وہ ایک عرصے سے سوچ رہا ہے کہ کسی شام کناٹ پلیس کے کسی شاندار ریستوران میں چائے پی جائے اندر جانے اور باہر آنے میں کتنا مزہ ہے۔ گیٹ مین کا سلیوٹ مہکتی ہوئی چائے، ایک آدھ ڈش، ایرکنڈیشنڈ ہال اور آرام دہ سیٹ ــــ لیکن اس کی بیوی دفتر سے سیدھی ریستوران نہیں آتی ــــ جلبہ جو تھکا ہوتا ہے گھر آ کر دوبارہ نکلنے کی سکت نہیں رہ جاتی۔ انگلیاں درد کرتی ہیں، سر بھاری ہوتا ہے۔ پھر دوبارہ بسوں کے دھکّے ــــ وہ بھی صرف چائے کے لیے ــــ اس بات پر میاں بیوی میں تکرار ہو جاتی ہے ــــ وہ کہتا ہے چائے پینے کے لیے قیمتی لباس، میک اپ، اور ٹیکسی کی ضرورت نہیں ہوتی ــــ ایک بے نیازانہ ایٹی ٹیوڈ چاہیئے ــــ وہ جواب دیتی ہے ــــ اس نے یہ سب کبھی نہیں مانگا ــــ نہ میک اپ کرتی ہے، نہ قیمتی لباس پہنتی ہے ــــ اس بات پر بھی جھگڑا ہوتا ہے ــــ اس کے اندر کا مرد زخمی ہو کر وار پر وار کرتا ہے ــــ اور اس کے اندر کی عورت، مرد کی غلامی کے خلاف پُرزور احتجاج کرتی ہے ــــ وہ کروٹ بدل کر ڈھیلے پلنگ پر سو جاتا ہے ــــ وہ چارپائی پر کروٹیں بدلتی رہتی ہے ــــ ظالم مرد اور مظلوم عورت ــــ نائٹ سروس کے ہوائی جہاز ان کے کوارٹر کے اوپر سے گزرتے رہتے ہیں۔

وہ 'دی ٹیسٹ' سے آگے نکل جاتا ہے۔ چھوٹا پریوار سُکھی سنسار کا رنگین، جہازی بورڈ، نیون سائن کے لشکارے، ایک نئے پانچ ستارہ ہوٹل کی تعمیر کا اشتہاری بورڈ ــــ جیون بیمہ کا لمبا چوڑا سائن بورڈ ــــ جیون کو دو مضبوط ہاتھوں نے ہولے سے پکڑ رکھا ہے ــــ وہ پھر مسکراتا ہے یا شاید روتا ہے ــــ زندگی قیمتی چیز ہے ــــ اپنا اور اپنے پریوار کا بیمہ کرائیے ــــ آج کی چھوٹی بچت کل کی بڑی رقم ــــ آٹے، دال کے بعد بچتا ہی کچھ نہیں، پھر یہ سب؟ اسی کروڑ آبادی کے اس ملک میں کتنے لوگ بیمہ کرا پاتے ہیں، کتنے لوگ کچھ بچا پاتے ہیں۔ پھر یہ سب تماشہ یہ جھوٹ کیوں؟ ــــ اس کا جی چاہتا ہے تمام بورڈ اکھاڑ کر پھینک دے ــــ لیکن سامنے تھانہ ہے ــــ وہ عجیب بے بسی اور مایوسی محسوس کرتا ہے ــــ آسمان کی طرف دیکھتا ہے ــــ آکاش میں بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے ہیں ــــ مت سنئے، پیارے پیارے روپ دھار رہے ہیں ــــ اسکوٹر، کار ــــ ٹی۔ وی۔ وی۔ سی۔ آر۔ بنگلہ ــــ لان پھول، بچے ــــ بھری پُری ڈائننگ ٹیبل۔ مکھن۔ شہد، پنیر، ڈبل روٹی، پھل مرغ، مچھلی، انڈے ــــ وہ ہنسنے لگتا ہے ــــ واپس ہو لیتا ہے ــــ 'دی ٹیسٹ' میں ریڈیو بج رہا ہے ــــ ان سٹ 'ون سی' میں تکنیکی خرابی پیدا ہو گئی ہے ــــ پہلے بھی ایسا ہو چکا ہے ۲۳ کروڑ روپئے کی لاگت کا اے۔ ایس ایل۔ وی ڈھائی منٹ کے بعد بیکار ہو گیا تھا۔ دوسرا راکٹ بھی سمندر میں جا گرا تھا۔

ستّر کروڑ کا تماشہ — پینے کا پانی، بجلی سنکٹ، گرتے ہوئے پل، اسپتال، بیڈ، دوائیاں — کتنے مسائل حل ہو جاتے اگر یہ تماشہ نہ دیکھا جاتا — ہیضہ، گیسٹرو انٹرائٹس — ہزاروں اموات — ایک ہوائی جہاز، سرخ، ہری، نارنجی بتیاں جھلملاتا پرواز کر رہا ہے — شاید کوئی وزیر غیر ممالک کے دورے پر جا رہا ہے — وہ گاؤں کیوں نہ لوٹ جائے — مدّت ہوئی اس کے دادا کا دادا شاید اس کا بھی دادا روزی کی تلاش میں گاؤں سے شہر آیا تھا — وہ بھی تو ایک قصبے سے نوکری کرنے یہاں آیا ہے — لیکن اس بھیڑ میں اب راستہ ہی نہیں ملتا ہوائی جہاز دور نکل گیا ہے۔

بیکار کے چکّروں اور سوچوں نے اسے تھکا دیا ہے۔ وہ لوٹ آیا ہے۔

تالا اس کا منہ چڑا رہا ہے۔ وہ موٹی سی گالی دیتا ہے — نہ جانے کیسے نہ جانے کیوں تالا کھول کر اندر داخل ہوتا ہے۔ صبح کے ناشتے کے برتن میز پر پڑے ہیں۔ مینٹل پیس پر رکھی گھڑی بند ہے۔ کئی دن سے بند ہے۔ اس نے بیوی سے کہا تھا چابی دینے کے لیے — اس نے تھکی، السائی آواز میں اس سے کہا تھا۔ تم ہی دے دو چابی — وہ گھڑی کو چابی دینے کے خیال سے بڑھتا ہے پھر ارادہ بدل دیتا ہے — وقت تو بہر حال گزر ہی رہا ہے۔ یا شاید انھیں گزار رہا ہے

تالا بند کر کے وہ پھر فٹ پاتھ پر آ گیا ہے — کیا کرے، کہاں جائے۔ سامنے ایک بس آ کر رکتی ہے۔ چند سواریوں کے بعد اس کی بیوی بس سے اترتی ہے۔ وہ اس تصویر کی مانند لگتی ہے، جس کے رنگ پھیکے پڑ چکے ہوں۔ کینوس چیخ گیا ہو۔ وہ سر جھکائے، چپّل گھسیٹتی چلی آ رہی ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ اس کی ایک چپّل ٹوٹ گئی ہے اور اسے چلنے میں تکلیف ہو رہی ہے۔ وہ لپک کر اُسے سہارا دیتا ہے۔ کھانے کا خالی ڈبّہ اس کے ہاتھ سے لے لیتا ہے۔

وہ مسکرانے کی ناکام کوشش کرتی ہے۔ ایک نئی سوزوکی بریکیں عین اُن کے قریب چیختی ہیں۔

"رومانس گھر جا کر جھاڑنا —" کار والا یہ کہہ کر کار آگے لے جاتا ہے پیچھے رہ جاتی ہے کڑواہٹ، بے چارگی اور غصّہ

وہ کواڑ کا دروازہ کھولتا ہے۔ اس کی بیوی جا کر بستر پر ڈھیر ہو جاتی ہے کل بھی اس کی یہی حالت تھی۔ پرسوں بھی ایسے ہی — وہ اس سے آگے یاد نہیں کرنا چاہتا۔ دکھ ہوتا ہے — وہ کرسی میں دفن ہو جاتا ہے۔ پاؤں میز پر پھیلاتا ہے۔ برتن گرتے ہیں۔ دیر تک چھناکا گونجتا رہتا ہے۔ وہ چپ چاپ، بے جان سے پڑے رہتے ہیں۔ کمرے میں اب بوجھل خاموشی ہے۔ وہ اندھیرے میں بیوی کے انگلیاں چٹخانے کی آواز سنتا ہے۔ اس کے اپنے اندر بھی کچھ چٹخنے، ٹوٹنے لگتا ہے۔

"بتّی جلا لو" وہ آہستہ سے کہتا ہے

وہ نہیں اٹھتی۔ وہ دوبارا نہیں کہتا۔ وہ اٹھ کر اندھیرے میں لباس بدلنے لگتی ہے — وہ اسے دیکھتا رہتا ہے — اندھیرے میں ڈوبتی، ابھرتی کچھ لکیریں — کبھی اس کے بدن میں مہک تھی — اسے کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا — کرسی کی پشت پر ہولے ہولے سر مارتا رہتا ہے۔

وہ کسی انجانے خوف سے ڈر جاتی ہے۔ کہتی ہے:

"آج پھر بس میں جگہ نہیں ملی — کھڑے کھڑے آنا پڑا — لوگ —"

"مردوں میں ذرا بھی گریس نہیں رہی —" وہ شکایتی لہجے میں کہتا ہے

"لوگ خود غرض ہو گئے ہیں —"

وہ اب بتّی جلا دیتی ہے۔

"تم کب آئے —"

"تمہاری ترقی کا آرڈر آ گیا —" اسے ایک دم خیال آتا ہے۔ کہ وہ خود کس قدر کمینہ ہو رہا ہے، خود غرض اور لالچی — "کیا کہہ رہی تھیں تم —" بات بدل کر پوچھتا ہے۔

"کچھ نہیں —"

وہ آنکھیں موند لیتا ہے۔

وہ چائے بنا لاتی ہے سستی پتّی، جس میں نہ خوشبو ہے نہ ذائقہ وہ چائے کے ساتھ کچھ کھانے کی خواہش کو پھر دبا دیتا ہے — کسی گناہ کی طرح — وہ چائے پینے لگتا ہے۔ وہ اپنا پاؤں دباتی ہے لیکن اسے یہ نہیں بتاتی کہ بس میں ایک بدتمیز نے جان بوجھ کر اس کی چپّل پر جوتا رکھ دیا تھا اور چپّل ٹوٹ جانے پر بے حیائی سے ہنسا تھا — یہ کون سا جذبہ ہے — کس پیاس کی تڑپتی ہے۔

پیالیاں دھو کر وہ کھانا بنانے لگتی ہے۔ وہ ایک جاسوسی ناول لے بیٹھتا ہے — دھوکا۔ زنا۔ قتل۔

وہ کھانا لے آتی ہے — پتلی سی دال، آم کے اچار کی پھانک اور روٹیاں — وٹامنز۔ فیٹس — پروٹینز — کھانا کھا کر وہ پھر ناول پڑھنے لگتا ہے۔ وہ چیزیں سنبھال رہی ہے — برتن صاف کرتی ہے — کم روشنی کے بلب میں پڑھا نہیں جاتا — آنکھیں دُکھنے لگتی ہیں۔ وہ ناول رکھ دیتا ہے کھڑکی سے آسمان کا چھوٹا سا ٹکڑا نظر آ رہا ہے۔ شاید آسمان کے کسی حصّہ میں چاند نکلا ہے۔ چاندنی کا غبار سا ہے — جانے چاند، آکاش میں کس رخ نظر کرتا ہے کہ اس کی کھڑکی سے کبھی دکھائی نہیں دیتا

کام سے فارغ ہو کر اس کی بیوی، نڈھال سی اپنی بانسی چارپائی کی طرف بڑھتی ہے۔ وہ اس کی طرف پیاسی نظروں سے دیکھتا ہے اور ایک طرف ہٹ کر اس کے لیے بستر پر جگہ بناتا ہے۔ وہ اپنی چارپائی پر لیٹ جاتی ہے

(باقی صفحہ ۲۸ پر دیکھئے)



## ظفر گورکھپوری

چلتی ہوا سے کرتے پیار اوروں کی طرح
اپنے طور کہاں تھے یار، اوروں کی طرح

موجوں کے بے رحم تھپیڑے کھاتا کون؟
ہم بھی اتر جاتے جو پار اوروں کی طرح

ایک گلی کے موڑ سے دیکھی کُل دُنیا
ہم نہ لگا پائے بازار اوروں کی طرح

کس دروازے جاتی مجرم سچّائی
ہم بھی جو کر دیتے انکار اوروں کی طرح

آنگن کی مٹّی سے اپنا رشتہ تھا
پھاند نہ پائے ہم دیوار اوروں کی طرح

اک سمجھوتہ کر لینے کی دیر تھی، بس
ہم بھی بچا لیتے گھربار اوروں کی طرح

بس اتنا کہ دیر سے ہم پہچانے گئے
سر پہ نہیں رکھی دستار اوروں کی طرح

ساری دنیا جیت کے گھر میں رکھ لیتے
ہم نے نہیں اپنائے شعار اوروں کی طرح

---

علم و دانش کی صدی میں کیا ہوا
اک خدا تھا آدمی میں کیا ہوا

تیرگی بے رحم تھی، سفاک تھی
یہ بتاؤ روشنی میں کیا ہوا؟

کاغذی شخصیتوں کی فصل ہے
وزن تھا دانشوری میں کیا ہوا

ریت کے طوفاں سے چھٹکارا نہیں
کیا بتائیں ہم، ندی میں کیا ہوا

اشک زخمی ہو کے نکلے آنکھ سے
روح کی بارہ دری میں کیا ہوا

پیڑھی پیڑھی بھوگتا ہے اس کا پھل
جانے کس سے سادگی میں کیا ہوا

کتنا جاں لیوا ہے سمتوں کا شعور
کیف تھا اک گمرہی میں، کیا ہوا

آپ کے جانے سے کیا ہو جائے گا
آپ کی موجودگی میں کیا ہوا

شعر لکھّے، خواب کچھ دیکھے ظفر
اور ہم سے زندگی میں کیا ہوا

---

رہنما، دانشور و فنکار، سب
سب سے مل آئے ہیں، دنیادار سب

شیر حیوانوں کا تنہا بادشاہ
اس قبیلے کے مگر سردار سب

بستیاں اجڑیں، لٹیں، ہو جائیں خاک
اپنے اپنے گھر کے پہرہ دار سب

داغ، دھبّے سب کے پیراہن پہ ہیں
کیا مزے کی بات، عزّت دار سب

کس کو فرصت، اینٹ رکھّے اینٹ پر
ڈھونڈتے ہیں سایۂ دیوار سب

کیوں ہوا کے سر پہ تہمت تھوپیے
آگ پھیلانے کے ذمّہ دار سب

رات کا یہ کون سا انداز ہے
سب کے سب سوئے ہیں اور بیدار سب

بیش قیمت سا لگے اک ایک پل
اور کبھی محسوس ہو بیکار، سب

اک دیئے کی آخری ہچکی کے ساتھ
بجھ گئے میرے در و دیوار، سب

● الف ۲/۲ یو میونسپل کالونی، دیونار، ممبئی ۴۰۰۰۴۳



جوگندرپال
۴۰۲ منداکنی، انکلیو، کالکاجی، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۹

# خواب رو

قسط نمبر-۲

"آپ انھیں منہ ہی نہ لگایا کریں" چاند بی بی اسے مشورہ دیتی ہے۔"کام تو ہو ہی جاتا ہے۔"

"کیسے ہو جاتا ہے؟ اتنا بھی نہ کروں تو میرا بوریا بستر گول کردیں۔ کہتے ہیں 'کارخانہ جیسے آپ کا ہے، ہمارا بھی ہے — نہیں چندو، محاورے کے طور پر نہیں' وہ سچ مچ یہی سمجھتے ہیں۔ ان کا بس چلے تو وہ نواب مرزا کو کارخانے ہی سے بے دخل نہ کریں، شہر بدر بھی کر کے دم لیں۔"

"اس روز روز کی جھک جھک سے تو یہی اچھا ہے آپ کارخانہ ہی بند کر دیں۔"

"بند کر دیں تو جائیں کہاں؟ — ہم نے بھی تو پاکستان بنایا ہے، بلکہ ہم ہی نے بنایا ہے۔"

چاند بی بی اپنے شوہر کو اس قدر پریشان پاکر اس کے سرہانے آبیٹھتی ہے اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگتی ہے۔

"جو بھی دلیل دو چندو، اُن کا ایک ہی ٹکسالی جواب ہے کہ ہم مقامی ہیں۔"

"دیکھیے، آپ تو ہر صبح پاکستان چلے جاتے ہیں۔" نواب مرزا کا کارخانہ لکھنؤ اور اس کے گردونواح میں مہاجروں کے سیٹیلائیٹ قصبوں سے دور ایک مقامی علاقے میں واقع ہے۔"خدانخواستہ آپ کے دشمنوں کو۔۔۔۔"

"میری فکر مت کیا کرو چندو، میں جہاں بھی ہوتا ہوں، اپنے گھر ہی میں ہوتا ہوں۔"

"ہہ ہاہہ — ہہا —" نواب مرزا کا وکیل بھائی اسحٰق مرزا اپنے بڑے بھائی کی باتیں سن کر اکثر اپنی ہنسی نہیں روک پاتا ہے۔

اسحٰق مرزا کراچی میں پیدا ہوا تھا اور یہیں پڑھا لکھا تھا۔ کراچی یونیورسٹی سے قانون کی ماسٹرز ڈگری حاصل کر کے اس نے اپنے گھر والوں کی کڑی مخالفت کے باوجود ایک سندھی لڑکی سے نکاح کر لیا تھا۔ اسی زمانے سے اپنے آپ کو لکھنؤ بدر کر کے وہ اپنی فیملی کے ساتھ سندھیوں کی ایک پرانی بستی میں رہ رہا ہے۔ شادی کے بعد دو ڈھائی سال اس نے اپنے لوگوں کا منہ تک نہ دیکھا۔ پھر جب اس تک خبر پہنچی کہ اس کی جدائی میں اچھّی اماں کو غش آتے رہتے ہیں تو وہ لکھنؤ آنے جانے لگا اور اب تک اس کا معمول ہے کہ بیوی بچّوں سمیت ہفتے کی سہ پہر کو یہاں چلا آتا ہے اور رات کا کھانا کھا کر لوٹتا ہے۔

اسحٰق مرزا کو اپنی باتوں پر ہنستے پاکر نواب مرزا چڑ جاتا ہے۔

"اس میں چڑنے کی کیا بات ہے بھائی جان؟" اسحٰق مرزا اپنی رائے کے اظہار کا کوئی موقع جانے نہیں دیتا۔"ہم لکھنؤ والوں کی — میرا مطلب ہے آپ لکھنؤ والوں کی، کیونکہ میں تو یہیں کا ہوں — آپ کی مشکل دراصل یہی ہے کہ آپ گھر سے باہر نہیں نکلتے۔"

"کیا الٹی سیدھی ہانکے جا رہے ہو اسحٰق؟" بھابی بھلا اپنے دیور کو ٹوکنے کا موقع کہاں کھوتی ہیں۔"میرے میاں بے چارے تو سارا دن گھر سے باہر بتا دیتے ہیں۔ کہیں شام ڈھلے گھر لوٹ آتے ہیں تو جان میں جان آتی ہے۔ تمھاری سسرال کی قوم — پتہ نہیں — کیوں ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔"

"پرانی بستیوں میں نل سے پانی ہی نہیں آتا چاند بھابی۔" اسحٰق کی یہ عادت اس کے بھائی اور بھابی کو ایک آنکھ نہیں بھاتی کہ جو منہ میں آئے بول دیتا ہے۔"وہ لوگ آپ کے پیچھے پڑنے کے لئے ہاتھ کیونکر دھوئیں گے؟ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ ان سے ایک جان ہو کر رہیں۔"

"نہ بھائی!" اپنی بھابی کو ذرا چنک کے مسکرا کر بولتے پاکر اسحٰق ہمیشہ لطف اندوز ہوتا ہے۔"ہم نے ایک تہیں جوان سے یک جان ہونے کو دے دیا ہے۔"

"دیکھو بھابی — اور بھائی جان، آپ بھی سوچئے — ہم کیوں کر حق بجانب ہیں کہ ان کی زمین اور جھونپڑے انھیں کے پیسوں سے خرید کر اپنے لکھنؤ اور ملیح آباد بسا لیتے ہیں؟ لکھنؤ کے پہلو ہی میں ملیح آباد میں دونوں بھائیوں

کے ماموں حکیم جمال الدین نے ایک بہت بڑی حویلی تعمیر کرا رکھی ہے ـــــ

اسحٰق نے اپنا بیان جاری رکھنے کے لئے منہ بدستور کھولے ہوتا ہے لیکن اس کا بھائی اسے روک دیتا ہے۔ "ٹھہرو! خرافات مت بکو۔ یہ کیا نکتہ پیدا کیا ہے کہ ہم انھیں کے پیسوں سے ــــــ"

نکتہ پیدا ہو ہی گیا ہے بھائی جان، تو تفصیلات پر آپ خود ہی غور کر لیجئے۔ میں تو موٹے طور پر یہی سمجھتا ہوں کہ مسلمان کی کمائی پر ہر حاجت مند کا حق ہوتا ہے۔ یہی نہیں، مسلمان کا شیوہ یہ بھی ہے کہ جہاں بھی رہنا نصیب ہو، وہیں کا ہو کے رہے۔"

"آپ بجا فرما رہے ہیں قبلہ مولوی صاحب"۔ نواب مرزا ظلم کیسے سہار کیسے رہیں؟ "مگر آپ کے وعظ کی مار سے ہمارا گھر ٹیکے لگا ہے۔ آپ کے ان سگے سمدھیوں کے یہاں تو سوکھا پڑا ہوا ہے، پھر انھیں کیوں سے آپ اسی رحمت سے محروم رکھے ہوئے ہیں؟"

اُن کی بحث کے دوران اکثر دیوانے مولوی صاحب اچانک کہیں سے وارد ہو جاتے ہیں۔ پچھلی بار بھی جب دونوں بھائیوں نے تلواریں میان سے کھینچ رکھی تھیں، دیوانے مولوی صاحب اسی وقت کہیں باہر سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے نظر آئے۔

" آہا! خوش آمدید، چھوٹے نواب صاحب۔" دیوانے مولوی صاحب شاید سوچ رہے تھے کہ ان کے ساتھ بیٹھ جائیں، یا پہلے بازار سے خرید کردہ اشیاء کا جھولا اپنی اچھی بیگم کو تھما آئیں؟

"السلام علیکم، ابّا جان۔"

"وعلیکم السلام، بیٹے۔ ہم راستے بھر یہی سوچتے رہے کہ کچھ بھولے ہوئے ہیں۔ تمھیں دیکھ کر یاد آیا ہے آج تمھارے لکھنؤ آنے کا دن تھا۔"

"اسی لئے حاضر ہو گیا ہوں، ابّا جان۔"

"بھئی اسحٰق، کچھ بھی کہو تم ہو بڑے بدقسمت۔ لکھنؤ کے ہو کے بھی سیکڑوں میل دور کراچی میں رہ رہے ہو۔"

جواب میں اسحٰق ہمیشہ کے مانند مسکرا دیا۔

"دیکھو یہ کیا ہے؟" انھوں نے جھولے سے ایک بہت بڑا پکا ہوا آم نکالا اور اسحٰق مرزا کی طرف بڑھا دیا۔ "لیو، کھاؤ، خاص ملیح آبادی ہے۔"

اسحٰق مرزا کے منہ میں آم کا ذائقہ گھلنے لگا مگر ہاتھ میں لیتے ہی وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ "یہ تو مٹّی کا ہے!"

"خالص ملیح آبادی ہے۔" دیوانے مولوی صاحب ہنسنے لگے۔ "جیسل مارکیٹ سے مٹّی کے پھل والے سے لایا ہوں۔" دیوانے مولوی صاحب نے فیصلہ کیا کہ پہلے تھیلا اندر دے ہی آئیں۔ "میں ابھی آتا ہوں۔"

"لیجئے بھائی جان، یہ ملیح آبادی آم کھائیے۔" دیوانے مولوی صاحب کو منہ موڑتے پا کر اسحٰق گویا ہوا۔ "انھیں کھا کے دکھائیے تو جانوں۔ منہ میں مٹّی ہی مٹّی جائے گی۔"

" ارے چھوٹے بھائی، کھانا کسے ہوتا ہے؟ دیکھ دیکھ کر ہی ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔"

"نہیں، بھائی جان، پیٹ بھرے بغیر چارہ نہیں۔ آپ کو عجیب نہیں لگتا۔ ہم کھاتے یہیں کے آم ہیں مگر ہمارا دل صرف ملیح آبادی کے مٹّی کے آموں سے بہلتا ہے۔"

"کلچر، اسحٰق میاں! تم کیا جانو، کلچر کا کیا ذائقہ ہوتا ہے۔"

چاندنی بی بھی چند لمحے پیشتر چپکے سے اُن کے ساتھ آ بیٹھی تھی۔ اُن کی باتوں سے بور ہو کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اسحٰق بھائی، تمھاری دلہن کی زبان سے اچھی امّاں کو وحشت ہوتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے بیزار بیٹھی ہوں گی۔" پھر کچھ خیال آنے پر اُس نے ایک دم چیخ کر پوچھا۔ "ہائے اللہ، بچّے کہاں ہیں؟ کسی کی آواز سنائی نہیں دے رہی۔"

"جہاں بھی گئے ہیں بھابی، جانے دو۔" اسحٰق مرزا اپنی بھابی کو ڈرا سا پا کر ہنس دیا۔ "میرے تینوں بچّے تو آپ کے یہاں آتے ہی اس لئے ہیں کہ باہر کھیلنے کو پوری ایک مربّع زمین مل جاتی ہے۔ ایک بار میرا چھٹکا اپنی ماں سے کہنے لگا، ہمارے پاس کھیلنے کے لئے اتنی بڑی گراؤنڈ کیوں نہیں؟ اُس کی ماں کو بس اتنے پر ہی غصّہ آ گیا اور وہ اُسے پیٹنے لگی، گویا اس لئے، کہ اپنا بیٹا ہے تو کیا؟" وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ "اس کا باپ مُوا مردار تو لکھنوی سائیں ہے ــــ ہہ ہہ ہا ــــ ہہ! ــــ"

چاندنی بی بھی ہنستے ہوئے اندر کے کمرے کی جانب ہو لی۔

"دقت یہ ہے اسحٰق۔" نواب مرزا ابھی تک تیر چلّے پر چڑھائے ہوئے تھا۔ "کہ تم کلچر کو کھانے پینے اور موج اڑانے کی کوئی شے سمجھتے ہو۔"

"بلکہ بھائی جان، آپ بھی تو ابھی ابھی کلچر کے کسی ذائقے کا ذکر کر رہے تھے۔" اسحٰق مرزا کو اپنے بڑے کو اِس موضوع پر مشتعل کرنے میں مزہ آتا تھا۔ "لیکن چھوڑیئے، میں آپ کو اپنے ایک پنجابی پڑوسی فقیر بابو کی باتیں سناتا ہوں۔ اُس کی بیوی بھی سندھی ہے۔ کہا کرتی ہے، مرے مرد کو کچھ نہیں آتا، مگر جیسے ہی جھولے لالن گاؤنا شروع کر دیتا ہے بھائی سائیں، تو فقیر بادشاہ معلوم ہونے لگتا ہے ــــ نہیں! ــــ فقیر بابو بڑی انکساری سے ہنس دیا کرتا ہے ــــ یہ تو بھئی سندھی ہے۔ مجھے جھولے لالن گانا بھی کہاں

آتا ہے؟ — پھر وہ خاص میری طرف منہ پھیر لیتا ہے — نواب اسحٰق ہم سے تو جتنی چاہو، انگریزی کلچر کرالو۔ پر کچھ بھی کہہ لو، انگریزی کلچر سب سے بڑا کلچر ہے۔ تم چھوٹے چھوٹے پھول دیکھ کر خوش ہو جاتے ہو، ذرا گوبھی کا پھول اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر سونگھو۔ اللہ کی قسم، یار کا چہرہ سمجھ کے منہ مارنے لگو گے — نہیں، بھائی نواب، خدا کے لئے تم چپ رہو۔ منہ کھولتے ہو تو ہم ڈرنے لگتے ہیں کہ ہمارے اُردو کے ہر جملے میں کم سے کم دس غلطیاں نکل آئیں گی۔ میں اُسے بتاتا ہوں کہ ہمارے ہیں ہماری اُردو کہو، وہ جھٹ جواب دیتا ہے، ارے بھائی میرے، سیدھی سی بات ہے۔ میں بولوں گا تو ہمارا اُردو، اور میری سدھن بولے گی تو ہماری اُردو، پر تمہاری اردو — نہیں، تمہارے اُردو — نہیں — کیا بتایا ہے تم نے؟ — ہاں، تمہارے اُردو سے ہمیں اتنا خوف معلوم ہوتا ہے کہ خاص اُردو والوں سے بات کرتے ہوئے ہم اپنی بات بھول جاتے ہیں اور اں کی طرح بس اُردو ہی اُردو بولنے کا جتن کئے جاتے ہیں۔ سناؤ اصل بات اندر ہی رہ جائے تو اُردو بولتے چلے جانے سے کیا فائدہ؟

"آخر تم کہنا کیا چاہ رہے ہو اسحٰق میاں؟"

"یہی بھائی جان، کہ بات کہیں اندر ہی پھنسی رہ جائے تو خوبصورت زبان بولنے سے کیا فائدہ؟ سچ پوچھیں تو مجھے اپنی زبان خراب کر لینے میں چنداں مضائقہ نہیں۔"

## ۳

نواب اسحٰق مرزا غلط کہتا ہے کہ کراچی میں اگر ملیح آباد کے آم کھانا چاہیں تو منہ میں مٹی ہی مٹی بھر آتی ہے۔ یہیں ملیح آباد میں دیوانے مولوی صاحب کے سالے حکیم معزالدین نے ہزار کیمیائی تجربے کر کر کے یہ معجزہ کر دکھایا ہے کہ اپنی حویلی کے پچھواڑے کراچی کی دھرتی پر ملیح آبادی آم کے پیڑ ہی پیڑ کھڑے کر دیے ہیں جن پر موسم بے موسم بور پھوٹتا ہی رہتا ہے۔

حکیم صاحب کا خاندان اللہ کے فضل سے خوب لمبا چوڑا ہے، چھ بیٹے، اور بیٹوں کی جوان جہان، بیٹیاں اتنی کہ حساب کرنے پر ہر بار چند ایک گنتی میں آنے سے رہ جائیں۔ اس پر بھی کوئی نہ کوئی کوکھ ہر وقت بھری رہتی ہے۔ حکیم صاحب کا سب سے چھوٹا بیٹا، ہاشم علی، سعودی عرب میں کام کرتا ہے مگر اس کا کنبہ بھی حکیم صاحب کے یہاں اسی حویلی میں مقیم ہے۔ حویلی اتنی بڑی ہے کہ سارے جہان کا ہی بھی بس آئے تو تھوڑی نہ پڑے۔ حکیمن کو سوائے حکیم صاحب کی زوجیت کے حکمت کا کوئی کمال حاصل نہیں، مگر یہی کمال کیا کم ہے، حکیم صاحب کا سارا مال و متاع — اور اولاد، حکمت کے سارے نسخے حکیمن ہی سنبھال کر رکھتی ہے، اسی لیے حکیم صاحب جب ذرا موڈ میں ہوتے ہیں تو حکیمن کو بڑی بے ساختگی سے صندوقچی کہہ کر بلا لیتے ہیں۔ وہ صندوقچی ہی تو ہے جو ہندوستان سے مہاجرت پر ملیح آباد کی جدی حویلی کا نقشہ سنبھال کے یہاں لے آئی۔ وہ بڑے فخر سے بتایا کرتی ہے، حکیم صاحب نے تو اس وقت ہدایت کی تھی کہ جائداد کے سارے الم غلم کاغذات یہیں وکیل صاحب کے پاس چھوڑ جاؤ۔ چھوڑ آتی تو یہ چمتکار ہونے سے رہ نہ جاتا؟ وہاں سے یہاں چلے آنے پر جوں کے توں اسی حویلی میں رہ رہے ہیں۔

"ہاں بھئی صندوقچی، آپ واقعی بجا کہتی ہیں۔"

حکیم صاحب ذرا پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے ہیں تو حکیمن کو پوچھے بغیر پتہ چل جاتا ہے کہ وہ اپنی چھڑی ڈھونڈ رہے ہیں، یا ٹوپی، یا اٹھنے سے پہلے پان کا ایک اور بیڑا کلّے میں رکھنا چاہتے ہیں۔ "آپ ٹھیک ہی تو کہتی ہیں۔ جس دن ہم اپنی اس حویلی میں آباد ہونے کو آئے اسی دن ہمارے باپ دادا کی حویلی کی روح یہیں پرواز کر آئی۔

"ہاں، اور کیا؟" حکیمن اپنے میاں کو پان کا بیڑا پیش کرتے ہوئے جواب دیتی ہے۔ "روح یہاں آگئی تو وہاں کیا رہ گیا ہوگا؟ — مٹی کا ڈھیر!"

دیوانے مولوی صاحب جب پہلی بار یہاں آئے تو ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ "ارے بھئی حکیم صاحب، کیا خوب! اس بوڑھی کھوسٹ حویلی پر کون سا نسخہ آزمایا ہے، از سر نو دلہن دکھنے لگی ہے۔" "ہم سے اپنا لکھنؤ نہ چھوٹے ہے، وگرنہ ہم یہیں آ بسیں۔"

"آ بسیے نا، دیوانے مولوی صاحب۔"

"دیوانے مولوی صاحب حکیمن سے چھیڑ خانی ہی اسی لئے کرتے ہیں کہ ان کے منہ سے اُن کی دیوانگی کا اعلان ہو اور ایسا ہو پانے پر اُن کی ٹوپی کا پھندنا جھوم جھوم کر اُن کے کانوں کی لووں پر آ گرتا۔

"آ تو بسوں حکیمن، مگر حکیم میاں نے دوا دارو کے بہانے کوئی زہریلی جڑی بوٹی ہاتھ میں تھما دی تو — ؟"

"تو کیا، دیوانے مولوی صاحب۔" صندوقچی جیسے آپ ہی آپ کھل کر انھیں باطن کی جھلک دے گئی ہو۔ "حکیم صاحب کے پاس تریاق بھی تو ہے۔"

لکھنؤ والوں کی زبان میں ملیح آباد لکھنؤ سے یہی کوئی ڈیڑھ ہاتھ پری واقع ہے مگر "خدا کی پناہ" اچھی بیگم کہا کرتی ہے۔ اتنا اجاڑ راستہ ہے بڑے بھیا، کہ دل میں ہول اٹھنے لگتا ہے۔

(باقی آئندہ)



## احمد کمال پروازی

ہماری تشنہ لبی آج بھی نقاب میں ہے
مگر وہ نہر کا پانی بڑے عذاب میں ہے

کوئی بھی چیز بکھرنے کے فن سے آتی ہے
یہ زلزلہ بھی مری بات کے جواب میں ہے

اندھیرے غم کی کوئی شام کم نہیں ہو گی
تمہاری آنکھ کا کاجل مرے حساب میں ہے

ذرا سی ناؤ نے دریا سنبھال رکھا ہے
تمھارے بعد بھی اک پنکھڑی گلاب میں ہے

اندھیرے وقت میں تو بھی چراغ کیا دیتا
ترا پتہ بھی مری گم شدہ کتاب میں ہے

● ۲۲ مالوا اسٹیل فیکٹری، توپ خانہ روڈ۔
اوجین ۴۵۶۰۰۶



## رؤف جاوید

میرا تو دوست ہے مری محفل نہیں ہے تو
تو سنگِ میل ہے مری منزل نہیں ہے تو

معلوم کیا تجھے مری ہستی کی تلخیاں
میری طرح سے پیار کا بسمل نہیں ہے تو

چاہت مری الگ ہے مگر پھر بھی پاس بیٹھ
ایسا نہیں کہ پیار کے قابل نہیں ہے تو

مٹتا نہیں خیال ترا، میں کہیں رہوں
یہ مانتا ہوں راہ میں حائل نہیں ہے تو

دل کی کتاب تیرے لیے لکھ رہا ہوں میں
لیکن برائے نام بھی مائل نہیں ہے تو

تنقید میری کرنے لگا سب کے ساتھ ساتھ
انصاف کیا کرے گا کہ عادل نہیں ہے تو

● بی ایچ۔ ای سب ڈویژن۔ سرونج ۴۶۴۲۲۸



## مرغوب علی

دل صحرا میں آہو بن کر آجاتے ہیں
بیتے لمحے آنسو بن کر آجاتے ہیں

بھولنے لگتا ہوں میں جب، جب بھی تجھ کو
جھونکے تیری خوشبو بن کر آجاتے ہیں

کچھ دن قطرے چھپ جاتے ہیں مٹی میں
اگلے موسم جگنو بن کر آجاتے ہیں

پیار کے رستے میں کانٹے کچھ لفظوں کے
کیوں تکرار کا پہلو بن کر آجاتے ہیں

پریم نگر کی دھرتی ہے شاداب سدا
نیچے! میں اور تو بن کر آجاتے ہیں

● ۴۹ دھرم داس۔ نجیب آباد ۲۴۶۷۶۳



قیوم راہی
اے-۲۰۰، بلاک-ڈی، نارتھ ناظم آباد-کراچی-۳۳ (پاکستان)

# منظر پس منظر

سہ پہر کا وقت تھا۔ میں چچی کے دو منزلہ گھر میں داخل ہوا۔ چچی سے ملے ہوئے بہت دن ہو گئے تھے۔ پھر مجھے معلوم ہوا تھا کہ غسل خانے کے چکنے فرش پر پاؤں پھسل جانے کی وجہ سے ان کی ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ میرا جی ان دنوں کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ گھبراتا رہتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ میرا اکلوتا بیٹا سعودی عرب جانے کے لئے پر تول رہا تھا۔ گھر کے تین افراد میں سے ایک فرد کم ہو جائے تو کیا حالت ہو جائے گی اس گھر کی۔ جب سے میں نے اس کے اس ارادے کے بارے میں سنا تھا میں ایک بے سکونی کی حالت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ ایسے میں کوئی محبت کرنے والی شخصیت مل جائے تو ڈھارس سی بندھ جاتی ہے۔ ایک طمانیت کا سا احساس ہوتا ہے۔ اس کی سنگت میں یوں لگتا ہے جیسے تیز دھوپ میں چلتے چلتے کوئی سائبان مل گیا ہو۔ چچی انہیں اوصاف کی حامل ہیں۔ میں کبھی کبھار ان کے پاس چلا جاتا ہوں۔

میں نے بڑے کمرے میں قدم رکھا۔ چچی لکڑی کے تخت پر اکیلی لیٹی ہوئی نہ جانے کس سوچ میں غرق تھیں۔

یہ گھر چچی کو ان کے مرحوم شوہر نے بنوا کر دیا تھا۔ ان کے تینوں بیٹے ماشاء اللہ برسر روزگار ہیں اور بال بچوں والے، ایک کا کنبہ گراؤنڈ فلور پر رہتا ہے باقی دو بیٹوں کی فیملیاں اوپر کی منزل میں رہائش پذیر ہیں۔ سب کے چولہے علیحدہ علیحدہ ہیں۔ دلوں کا حال خدا جانے۔

میں نے دیکھا، کمرے کے گرد آلود فرش پر حسب معمول کئی جگہ کاغذ دانتوں سے کترے گتے کے ٹکڑے، کیلے کے چھلکے، میلے کپڑے اور کچھ چیتھڑے بکھرے ہوئے تھے صوفوں کی گدیوں پر بچوں کے گندے کپڑے پڑے تھے۔ ایک کرسی کی پشت پر میلی تولیا لٹک رہی تھی۔ کھانے کی میز پر بہت سے جھوٹے برتن بے ڈھنگے پن سے جمع تھے۔ پیاز اور ترکاریوں کے چھلکے اور روٹی کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ ڈائننگ ٹیبل کے ارد گرد کرسیاں بھی بے ترتیبی سے رکھی ہوئی تھیں۔ قریب ہی فریج کی چھت پر دواؤں کی شیشیوں سے لے کر کتابیں کاپیاں اور نہ جانے کیا کیا الم غلم پڑا تھا۔ کمرے کی ایک دیوار پر پنسل سے بڑی بڑی ٹیڑھی میڑھی لکیریں بنی ہوئی تھیں۔ سیلنگ فین کی پنکھڑیاں بھی گرد سے اٹی ہوئی تھیں۔

میں نے آگے بڑھ کر چچی کو سلام کیا۔ وہ چونک کر اور کسی حد تک گھبرا کر بیٹھ گئیں۔ آنکھوں کو ہتھیلیوں سے مل کر انہوں نے مجھے غور سے دیکھا اور بولیں۔ جیتے رہو مبین میاں۔ اب کے تو بہت دنوں بعد ادھر کا خیال آیا۔ خیریت سے تو ہے۔

"جی ہاں اللہ کا شکر ہے۔ آپ سے ملنے کو جی چاہا۔ چلا آیا۔ یہ بھی سنا تھا کہ آپ کے ہاتھ میں فریکچر ہو گیا تھا۔ اب کیا حال ہے۔"

"اب تو ٹھیک ہوں، لیکن کبھی کبھی ہاتھ بری طرح دکھنے لگتا ہے۔"

میں نے چچی کا ہاتھ تھام کر دیکھا۔ معمولی سا ورم تھا۔ میں نے کہا "زیتون کے تیل کی مالش کراتی رہیئے۔ ضرور فائدہ ہوگا۔"

"ہاں ملتی تو رہتی ہوں، لیکن باقاعدہ نہیں۔ مجھ سے ٹھیک طور پر ملا بھی تو نہیں جاتا۔ تم سناؤ۔ دلہن کیسی ہیں۔ افتخار کا کیا حال ہے" چچی نے موضوع بدل دیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ افتخار ملازمت کے سلسلے میں ملک سے باہر جانے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔"

"کیوں، کیا موجودہ ملازمت پسند نہیں آئی۔"

"بات تو یہی ہے۔ اسے اس کی قابلیت کے لحاظ سے کمتر درجے کی ملازمت ملی ہے۔"

"میں تو کہتی ہوں۔ بلکہ یہ تو مثل مشہور ہے کہ گھر کی آدھی باہر کی ساری برابر ہوتی ہے"

"لیکن گھر کی آدھی ملے بھی تو"

صحن میں کسی کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ چچی اور میں نے ادھر دیکھا

ان کی منجھلی بہو جس کمرے میں ہم بیٹھے تھے اس کے دروازے تک آئی۔ اس نے ہمیں دیکھا بھی لیکن بولی کچھ نہیں۔ پھر وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔

چچی نے بتایا" سارا دن بس اپنے کمرے میں پڑی رہتی ہے ضرورت کے وقت ہی باہر نکلتی ہے۔ دماغ کا کوئی پیچ ڈھیلا ہو گیا ہے۔

میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ میں کسی کے اندرونی معاملات میں کبھی کوئی دخل نہیں دیتا ہوں۔ بس تھوڑا سا مسکرا کر میں نے پوچھا۔" یہ بچے کہاں ہیں۔ دکھائی نہیں دیتے"

یہاں تو زیادہ تر دوپہر ہی میں نظر آتے ہیں۔ مائیں سو جاتی ہیں۔ تو اوپر والے بچے بھی نیچے آجاتے ہیں۔ اور سب مل کر ساری دوپہر اودھم مچاتے ہیں۔ اس وقت تو اپنے کمروں میں یا اوپر کھلی چھت پر کھیل رہے ہوں گے۔

چچی کی آنکھیں نیند سے مچی مچی جا رہی تھیں۔

ایکا ایکی میں نے محسوس کیا کہ میرا یہاں من نہیں لگ رہا ہے۔ باتیں کر رہا ہوں لیکن اکھڑی اکھڑی کیفیت میں۔ ادھوری اور بے ربط سی باتیں۔ میں نے بائیں طرف کی دیوار پر لٹکا ہوا کیلنڈر دیکھا تو اٹھ کر وہاں چلا گیا۔ کیلنڈر کے بڑے سے آرٹ پیپر پر چٹیل میدان کے درمیان ایک شکستہ سا کچی منزلہ مکان اداس رنگوں کے جلو میں نظر آرہا تھا۔ اس پاس کوئی انسان، پرندہ، درخت کچھ بھی تو نہیں تھا۔ اور آسمان پر بھورے بھورے مٹیلے بادل چھائے ہوئے تھے میں دل ہی دل میں مصوّر کے فن کی داد دے رہا تھا کہ جس نے رنگوں کے امتزاج سے ایک ایسا منظر تخلیق کیا تھا جو گہرے تاثر کا حامل ہو گیا تھا

میں بڑے انہماک کے ساتھ کچھ دیر اس منظر کو دیکھتا رہا۔ پھر اپنی جگہ آن بیٹھا۔

چچی بار بار متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھے جا رہی تھیں گو یا انہیں کسی کا انتظار ہو۔ اسی دوران اوپر سے ایک بچہ یہاں آیا تو بولیں "ادھر آؤ بیٹے۔ تایا ابا کو سلام کرو" بچے نے پہلے مجھے اوپر سے نیچے گھورا پھر سلام کیا۔ اور جانے لگا۔

چچی بولیں" تمہارے ابا کیا کر رہے ہیں اوپر"

"لیٹے ہیں۔ شاید سو رہے ہیں" بچے نے جواب دیا۔

"جاگ رہے ہوں تو کہہ دو بمبئی تایا آئے ہیں اور اپنی امی سے کہنا دو پیالی چائے بنا کر بھجوا دیں"

"آپ کو تو معلوم ہی ہے میں زیادہ چائے نہیں پیتا ہوں۔ اور گھر سے پی کر بھی چلا تھا۔

"ایک پیالی میں کچھ نہیں بگڑ جائے گا۔ میں نے بھی نہیں پی ہے۔ تمہارے ساتھ پی لوں گی۔"

بچہ" دوڑتا ہوا اوپر چلا گیا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا بات کروں۔ چچی بھی نہ جانے کیا سوچ رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد انہوں نے پوچھا" تمہیں کسی شام کو فرصت ہو جائے گی"

"جی ہاں۔ ہو جائے گی۔ کوئی کام ہے آپ کو"

"ہاں ہے، کئی مہینے سے میری آنکھ میں بہت تکلیف ہے نظر پہلے سے کمزور ہو گئی ہے۔ عینک لگاتی ہوں تو سر بھاری ہو جاتا ہے۔ درد ہونے لگتا ہے"

اور میرے روبرو ایک دم چند ماہ قبل کا وہ منظر آگیا جب میں اس وقت رہا آیا تھا۔ چچی جان اسی تخت پر اسی جگہ بیٹھی اپنے ریشم جیسے نرم سپید بالوں میں کنگھا کر رہی تھیں۔ کہنے لگیں کافی دیر سے سر میں درد ہو رہا ہے۔ سوچا بالوں میں تھوڑا سا تیل ڈال کر کنگھا کر لوں شاید درد کم ہو جائے۔

چچی نے میرا ردّعمل جاننے کے لئے میرے چہرے کو پڑھا۔ انہیں اطمینان ہو گیا تو بولیں۔ تم کسی بھی دن جمعہ اور منگل کے علاوہ رات کو آٹھ بجے تک آجانا۔ تمہارے ساتھ ڈاکٹر کو دکھانے چلوں گی۔ وہ رات ہی کو بیٹھتا ہے۔"

"اچھی بات ہے میں پرسوں ہی آجاؤں گا۔"

"اللہ تمہیں خوش رکھے۔ بہت تکلیف ہے آنکھ میں۔"

"آپ بس تیار رہئے گا۔ میں پرسوں ٹھیک وقت پر پہنچ جاؤں گا"

"وہ تو مجھے معلوم ہے کہ تم وعدے کے سچے اور وقت کے پابند ہو۔" چچی نے مجھے احسان مندی کے انداز میں دیکھا۔ وہ شاید دل ہی دل میں مجھے مزید دعاؤں سے نواز رہی تھیں۔

پھر تھوڑا سا وقت خاموشی کی سان پر گزر گیا۔

دفعتاً مجھے لگا جیسے میں یہاں اب ایک منٹ بھی نہیں

(باقی صفحہ ۲۸ پر دیکھئے)

## محمد رفیع رضا

بات پہ اک قیاس لگتی ہے
فکرِ نو بے لباس لگتی ہے
زندگی مضطرب نہیں ہے اب
غالباً غم شناس لگتی ہے
ایسی صورت میں کیا کرے کوئی
آس ہی جب نراس لگتی ہے
صاف گوئی بُری لگی، شاید
دشمنی آس پاس لگتی ہے
بے سبب تو یہ ہو نہیں سکتا
کیوں انا بدحواس لگتی ہے

● روپ سنگار، مغل بازار، کیٹہار (بہار)

## جاوید ندیم

التفات اس کا بہ مقدارِ تمنا کب تھا
مانگنے کا ہی مگر مجھ کو سلیقہ کب تھا

صرف ایقان ہی ایمان رہا ہے اپنا
ہم نے پہلے بھی خدا کو بھلا دیکھا کب تھا

میں شجر ہوں تو امر بیل ہیں رشتے سارے
میرا ہو کر بھی وہ اک شخص کہ میرا کب تھا

زندگی تجھ کو ادا کرنا تھا ہر لمحہ خراج
اور حسرت کے سوا میرا اثاثہ کب تھا

عکسِ آئینہ ہے موجود کا مرہونِ کرم
میں عدم تھا تو جہاں میں مرا چرچا کب تھا

● نذرانہ تک روڈ، پونچھ

## جاوید اکرم

یقین سے بھی گئے احتمال سے بھی گئے
ہم اپنے عہد میں خواب و خیال سے بھی گئے

دعا کے ہاتھ کے خواہشوں کے دل ٹوٹے
جواب سے بھی گئے ہم سوال سے بھی گئے

بہت ہی مہنگا پڑا ان کو شوقِ ہمسفری
پلٹ کے آئے تو خود اپنی چال سے بھی گئے

بدن کو توڑ رہی ہے نئی رُتوں کی تھکن
یہ کربِ ہجر کے لمحے وصال سے بھی گئے

پلٹ کے جانے کی ہمت مہاجروں میں نہ تھی
وطن سے بھی گئے اہل و عیال سے بھی گئے

● ۱۲/۱۴۰ سول لائنز فتح گڈھ ۲۰۹۶۰۱

## ضمیر درویش

جو حائل ہے یہاں اس کو سفر ہونا بھی آتا ہے
ہمارے گھر کی دیواروں کو در ہونا بھی آتا ہے

غلط فہمی میں مت پڑنا ہمارے جھک کے ملنے سے
ضرورت پر ہمیں سینہ سپر ہونا بھی آتا ہے

یہ کہہ دینا شجر کاری نہ کر زہریلے پودوں کی
مزاجِ آبیاری کو تبر ہونا بھی آتا ہے

میں کچا راستہ ہوں اے مسافر سوچ لے مجھ کو
سفر ہونا بھی تردیدِ سفر ہونا بھی آتا ہے

خلوصِ دل سے مجھ کو فتح کرنے کے لئے آنا
میں قلعہ ہوں، مجھے شیشے کا گھر ہونا بھی آتا ہے

● گنبد والی مسجد، کرول، مراد آباد ۲۴۴۰۰۱

## فرید پربتی

بوئے گل محوِ بے کرانی ہے
رنگ گلشن کا داستانی ہے
بارشِ سنگ وادیوں پہ ہو
فصل پر قہرِ ناگہانی
اس جگہ تم نے مجھ کو چھوڑ دیا
جس جگہ سبزہ ہے نہ پانی ہے
اب سلامت مکان ہے نہ مکیں
کیا یہی تیری پاسبانی ہے
جانے کس سمت لے چلے گی مجھے
اک ہوا ساتھ بادبانی ہے

● سبکتگین دروازہ، رعنا وادی، سرینگر (کشمیر)

## واجد سحری

شعلہ سا بدن اس کا دریا سے بھی گہرا ہے
گہرائی میں دریا کی سب کچھ مرا ڈوبا ہے
آنکھوں کو بھی میں اپنی، اپنا نہیں کہہ سکتا
بینائی کا پردہ بھی بینائی سے ملتا ہے
احسان تو کیا کرتا انصاف ہی کر دیتا
اُس سے اُسے مانگا تھا مجھ سے مجھے چھینا ہے
جس کا لب و لہجہ بھی الفاظ بھی کڑوے تھے
وہ دل کا کھرا نکلا میں نے اسے پرکھا ہے
واجد نے ابھی دنیا دیکھی ہے ادھوری سی
دنیا کو مگر جنت، دوزخ کبھی کہتا ہے

● ی۔ ۲۸۔ طبیہ کالج قرول باغ، نئی دہلی ۵۔۔۔۱



ندا فاضلی

۱۰۳، ام اپارٹمنٹ، ڈانڈ پاڑہ، ۱۔ کھار (ویسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۵۲

# دیواروں کے بیچ

قسط نمبر ۔ ۸

"نوان کو مار ہی کے دم لے گا۔ تیری ہی حرکتوں نے ان کو اس حالت تک پہنچایا ہے۔ پردیس میں ان کے علاوہ ہمیں کون پوچھنے والا۔ خدا نخواستہ انھیں کچھ ہوگیا تو ہم کہاں جائیں گے۔" بولتے ہوئے اس کی آواز ڈوبنے لگتی ہے اور ان کہے الفاظ آنکھوں سے بہنے شروع ہو جاتے ہیں۔

ندا سہما ہوا، شام کے دھندلکوں میں کبھی بہن کے آنسو دیکھتا ہے کبھی بے ہوش ماں کی ساڑی پر خون کے دھبے دیکھتا ہے۔ اور اسی حالت میں بنا کچھ کھائے پیئے جہاں بیٹھا ہے وہیں سو جاتا ہے۔ نیند میں گوالیار کے گھر کے روشن دان میں کئی نسلوں سے بسی جنگلی کبوتروں کے مٹیالے پروں کے نئے بچے کو فرش سے ایک کالی بلی تاکتی ہے۔ کبوتروں کے لال دیدے اور بلی کی اندھیرے میں ٹارچ کے بلب جیسی چمکتی آنکھیں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہیں۔ روشنی سے روشنی الجھ کر ایک عجیب رنگ کی روشن لکیر بنا رہی ہے۔ اس روشن لکیر میں سے سا جسم کے دو ہاتھ باہر نکلتے ہیں۔ سانپ کی طرح رینگتے ہوئے وہ دونوں کٹے ہوئے ہاتھ آگے بڑھتے ہیں۔ ایک شیو کی مورتی کے پاس کھڑا ہو جاتا ہے اور رقص کرنے لگتا ہے اور دوسرا حالی مسجد کے وضو کے حوض میں اتر جاتا ہے۔ ٹھہرے ہوئے پانی میں ہلچل ہوتی ہے اور قطار میں رکھے ہوئے وضو کے بدھنے آپ ہی آپ چیخ کر ٹوٹ رہے ہیں۔

کالی بلی کا منہ سرخ ہے وہ مٹیالے پروں کے کبوتر کے بچے کو دانتوں میں دبائے ادھر ادھر گھوم رہی ہے۔ دونوں کبوتر بے بسی سے اس کے آگے پیچھے چکر لگاتے ہیں۔ بلی جہاں جہاں سے گزرتی ہے فرش پر خون کی بوندیں گرتی جاتی ہیں۔ محمد علی کا خون، ماں کے سر کا خون، گاندھی کی تصویر سے جھانکتا خون، باپو کی کھانسی کا خون، قربانی کے بکرے کا خون، ایک خون کئی صورتوں میں ابھر رہا ہے۔ ایک کے بعد ایک چہرہ ابھرتا ہے۔ سارے چہرے ندا کو گھیرے میں لیے ہوئے ہیں۔ باہر نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ خوف نے گلے میں آواز کو بے آواز کر دیا ہے وہ چیختا ہے لیکن بے سود۔ وہ اچانک نیند سے چونک کر اٹھتا ہے۔ سارے گھر والے سوئے ہوئے ہیں۔ ماں کے سر پر پٹی بندھی ہے۔ پٹی بیچ سے خون سے سرخ ہے۔ ہر طرف گہرا سناٹا ہے ... وہ دوبارہ سونے کی کوشش کرتا ہے لیکن نیند نہیں آتی۔ اس کا ذہن چکرا رہا ہے۔ وہ اس وقت اپنے آپ کو بہت اکیلا محسوس کرتا ہے۔ رات کا ڈیڑھ بج رہا ہے۔ وہ آہستہ سے کنڈی کھولتا ہے اور بنا کسی سے کچھ کہے سنے باہر نکل جاتا ہے۔ سردی کی سنسان رات ہے۔ وہ خاموش راستوں سے گزرتا ہوا سیدھا ریلوے پہونچ جاتا ہے۔

وہ پہلی بار اکیلا ریل میں سفر کر رہا ہے۔ بنا ٹکٹ۔ بلی کے منہ سے کبوتر کے بچے کو چھڑانے کے لیے۔ ریل کی کھڑکی سے گزرتے ہوئے ہر منظر کے ساتھ وہ تھوڑا تھوڑا بڑا ہوتا جا رہا ہے۔ سردی سے بدن ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ اسے گرم کرنے کے لیے جیسے ہی گاڑی کسی پلیٹ فارم پر رکتی ہے، وہ اچھل کے نیچے اتر جاتا ہے، ادھر ادھر ٹہلتا ہے اور چلتی گاڑی میں بھاگ کر واپس اپنی جگہ آکر بیٹھ جاتا ہے۔ مسافروں کی بھیڑ بڑھتی ہے تو سردی کی شدت میں بھی کمی آتی ہے۔ اسے نیند آجاتی ہے۔ صبح کو آنکھ کھلتی ہے تو وہ اپنے آپ کو کمبل میں لپٹا ہوا پاتا ہے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ گاڑی چل رہی ہے وہ ادھر ادھر حیرت سے دیکھتا ہے۔ قریب بیٹھی ہوئی ایک بڑھیا منہ میں چالیسہ پڑھتے ہوئے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے۔ اس کی اجنبی مسکراہٹ اپنائیت لیے ہوئے ہے۔ اسے لگتا ہے وہ دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں ...

رات بہت سردی تھی میں نے ہی یہ کمبل تمہیں اڑھا دیا۔ کہاں جا رہے ہو؟

گوالیار۔ اپنے گھر

وہ پھر سے اپنی عبادت میں کھو جاتی ہے۔ اسٹیشن پر ندا اترتا ہے۔ جانے پہچانے اسٹیشن نے اس کی تنہائی کو کم کر دیا ہے۔ وہ خود کو زیادہ محفوظ محسوس کرتا ہے۔ گاڑی چلنے تک وہ پلیٹ فارم ہی پر رہتا ہے۔ گاڑی کے چلتے ہی وہ پلیٹ فارم سے بڑھیا کی طرف ہاتھ ہلاتا۔ مسکراتے ہوئے وہ بھی جواباً ہاتھ ہلاتی ہے۔

وہ بڑھیا کون ہے، ندا نہیں جانتا۔ شاید وہ اجنبی بڑھیا بھی اگلے اسٹیشن تک اسے بھول جائے گی۔ لیکن چند لمحوں میں بنتے بگڑتے رشتے کی مہک بہت دیر تک ندا کے ساتھ رہتی ہے۔

دسمبر کی سرد رات۔ سڑکوں کے آوارہ کتے، ہوٹلوں کی بجھی ہوئی بھٹیوں کے گرد سمٹے سکڑے بیٹھے ہیں سردی نے ان کی آوازوں کو بھی ٹھنڈا کر دیا ہے، جب کوئی پاس سے گزرتا ہے تو وہ گردن گھما کر دیکھتے ہیں اور بنا کسی احتجاج کے دوبارہ گردن کو پیٹ کے قریب کر لیتے ہیں۔ اسٹیشن کے لال وردیوں کے قلی بیچ رستے پر پھٹے پرانے کاغذ، سوکھے پتے اور سوکھی ٹہنیوں کو اکٹھا کر کے آگ روشن کرتے ہیں اور ہاتھوں کو گرم کر کے چہروں پر لگاتے ہیں۔ آگ کی لپٹیں جب کم ہونے لگتی ہیں تو وہ فحش گالیوں سے ٹھنڈے ہوتے جسموں میں حرارت پیدا کرتے ہیں۔

ندا پل پار کر کے شہر کی طرف مڑ گیا ہے۔ اس کی دائیں جانب پھول باغ ہے اور بائیں طرف سیدھے رستے پر خواجہ خاتون کی درگاہ ہے۔ وہ درگاہ کو دور سے خاموشی سے سلام کرتا ہے۔ درگاہ کی جالی میں بندھے نیلے پیلے ڈورے اس کی آنکھوں کے سامنے پھیلنے لگتے ہیں۔ ان میں ہر ڈورا کسی نہ کسی منت کی علامت ہے۔ انھیں میں ایک ڈورا اماو کی ماں کا بھی ہے جو اس نے اپنے لڑکے کی تندرستی اور اس کے واپس گوالیار لوٹ آنے کے لیے باندھا ہے۔ لیکن بھوپال کے سرکاری ہسپتال کی ڈاکٹری رپورٹ نے اس کے مرض کو لاعلاج بتایا ہے اس کی اطلاع شاید اس کی ماں کو ابھی تک نہیں ہے جمیل فاطمہ بانو کی دیکھ بھال کے ساتھ اس کی ماں کو بھی مسلسل تحریراً ڈھارس بندھانے کی عادت میں مصروف ہیں۔ وہ اپنے چھوٹے لڑکے ڈبو کے ساتھ یہیں مقیم ہے۔ ڈبو کسی درزی کی دوکان پر کام کرتا ہے۔ پھول باغ کی مسجد کے مینار پر بلب ابھی روشن ہے۔ مسجد کے آگے اونچے اونچے سریوں والا غار ہے۔ اس میں ایک جالی دار کھڑکی کے پیچھے جنگل کا راجہ قید ہے ہر اتوار کو اس غار میں ایک زندہ بچھڑا اتارا جاتا ہے۔ ... اور شیر کی کھڑکی کھول دی جاتی ہے۔ راجہ اپنی پرجا کے ساتھ شیر اور بچھڑے کی اس بھاگ دوڑ کا نظارہ کرتا ہے۔ بچھڑا اپنی جان بچانے کے لئے ادھر ادھر ڈر کر بھاگتا ہے اور آخر کار شیر کے پنجوں کے نیچے آکر تماشائیوں کی تالیوں میں اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے۔ شیر اپنی مونچھوں پر لگے خون کو زبان سے چاٹتا ہوا، فاتحانہ انداز میں واپس چلا جاتا ہے۔

گوالیار کے دھندلے دھندلے مناظر نے ندا کو پہچان لیا ہے۔ چھوٹے بڑے پیڑ، بجلی کے تاروں میں اٹکی ہوئی پتنگیں، سڑکوں پر چوکیداروں کی طرح گھومتے ہوئے نندی بیل، ہوٹلوں کے تختوں پر تھکن اتارتی جگاریں، تانگوں میں جتے گھوڑوں کی گھنٹیاں۔ یہ سب جیسا انھیں چھوڑ کے گیا تھا اب تک ویسے ہی ہیں۔ یہ سب اپنی اپنی زبان میں اس سے باتیں کرتے ہیں۔ ان میں کچھ ندا کے ہم عمر ہیں اور کچھ بزرگ جیسے سفید گلابی رنگ کا بیل یا محل کے آگے رکھی زنگ لگی توپ، اسے اس وقت گھر سے باہر دیکھ کر حیرت بھری ناراضگی کا اظہار بھی کرتے ہیں۔

انھیں ماں کی اجازت کے بغیر اس کا اکیلے یہاں آنا مناسب نہیں لگتا۔ وہ شرمندہ ہو کر اپنی غلطی پر پچھتاتا ہے ماں کا اداس چہرہ اس کی آنکھوں میں بھیگنے لگتا ہے۔ چلتے چلتے اس کے پاؤں اچانک رک جاتے ہیں اور وہ پاس کی ایک پتھر کی بنچ پر بیٹھ جاتا ہے۔ چاروں طرف خاموشی ہے۔ اکا دکا سائیکل یا تانگوں کے گزرنے کی آوازوں سے خاموشی کسی بوڑھے آدمی کی طرح تھوڑا سا کھانستی ہے اور پھر چپ چاپ ہو جاتی ہے۔

پہاڑی کے پیچھے سے دن کا سورج نکل رہا ہے۔ ماں کی سر کی پٹی پر چپکے ہوئے خون کی طرح گلابی سورج، دھیمے دھیمے پہاڑی کے پتھروں پر بکھر رہا ہے۔ اس پہاڑی پر ایک درویش چھنگے شاہ کا مزار ہے۔ ان کے ہاتھ کی چھٹی انگلی نے انھیں اس نام سے مشہور کیا ہے۔ رات کا وقت ان کا ہر عضو جسم سے الگ ہو کر الگ الگ عبادت کرتا تھا اور صبح ہوتے ہی سب دوبارہ جڑ کر جسم بن جاتے تھے.... وہ دوسری جنگِ عظیم کے سپاہی تھے۔ جنگ سے لوٹنے کے بعد کچھ دن ماں کی قبر پر ڈیرا ڈالا پھر ادھر پہاڑی کی طرف چلے آئے۔ جب دیکھو پہاڑی پر ننگے پاؤں بھاگتے نظر آتے اور آسمان کی طرف منہ کر کے گالیاں بکتے ... جس دن سے پہاڑی پر گئے، آبادی میں واپس نہیں آئے۔ ہاتھ کی لکڑی بندوق بنا کر یوں ہی نشانہ باندھتے اور قہقہہ لگاتے۔

وہ گوالیار کے تیسرے راجہ کے زمانے کے درویش ہیں۔ ایک دن راجہ ادھر سے گزرتا ہے۔ یہ اسے دیکھ کر اپنی رمز میں آواز دیتے ہیں۔ راجہ سنی ان سنی کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔ درویش کے غصے کو رانی کے گلے میں پڑا ہیرا اپنے اوپر جھیل لیتا ہے۔ اس پر ایک سیدھا بال پڑ جاتا ہے۔ محل کے نجومی اسے

بدشگونی ٹھہراتے ہیں اور ہوتا بھی یہی ہے۔ ایک دن صبح اشنان کرتے ہوئے، تالاب کی سیڑھی سے اس کا پاؤں پھسلتا ہے اور دیکھتے دیکھتے رانی اور ہونے والے جانشین دونوں رخصت ہو جاتے ہیں۔ راجہ کے دربار میں اندھیرا چھا جاتا ہے۔ چڑھتی ہوئی عمر کئی جوان اور نوجوان رانیوں سے عمر مستعار لے کر بھی جب اس نقصان کی تلافی کرنے میں ناکام رہتی ہے تو تشویش بڑھتی ہے۔ کئی وید حکیم سونے چاندی اور جواہرات کو ادویات میں تبدیل کر کے، دولت اور وقت کی لڑائی میں راجہ سے وفاداری نبھاتے ہیں لیکن مدام وقت کے ہاتھ ہی رہتا ہے۔ ہر طرح سے مایوس ہو کر راجہ ایک دن پہاڑی پر آتا ہے اور درویش کی گایوں کو دردان کے روپ میں اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ یہ گائیں ایک رانی کی کوکھ سے جانشین کے روپ میں جنم لیتی ہیں۔ درویش کے مزار کا نام جھام انھیں گایوں کی برکت کی دین ہے۔ گایوں کی روایت کا سلسلہ تب سے اب تک جاری ہے۔ اس مزار پر کوئی نہ کوئی گلر فقیر ہمیشہ تکیہ جمائے رہتا ہے۔ اور عقیدت مندوں کی محرومیوں کو بیچتا ہے۔ ایم گانا ان فقیروں کا روحانی مشغلہ ہے۔ جس پر نہ سماج کی پابندی ہے نہ قانون کا دخل ہے

مرتضیٰ حسن کا دفتر کھلنے میں ابھی دیر ہے۔ ندا کی جیب پیٹ کی طرح خالی ہے وہ اِدھر اُدھر گھومتا ہوا اسکول کے راستے والے شیو مندر کے سامنے کھڑا ہے مندر کے اردگرد اب لوہے کا کٹہرا بنا ہوا ہے کٹہرے کے اندر پکا فرش اور فرش پر سیڑھیاں ہیں۔ باہر بھکاریوں کی قطار ہے لمبے بال اور سفید داڑھی والے پجاری کی جگہ اب اور کوئی مورتی کے پاس بیٹھا ہے۔ ہاتھ میں مورپنکھ لیے، سر جھکائے ہوئے مورتی وہی ہے پجاری بدل گیا ہے۔ آدمی گوشت پوست کا ہوتا ہے اور مورتی پتھر یا دھات کی۔ دونوں کی عمریں بھی اسی لحاظ سے کم زیادہ ہیں۔ بھگوان کی بنائی ہوئی مورت سے، آدمی کی بنائی ہوئی تخلیق زیادہ پائدار ہوتی ہے۔ نیا پجاری آرتی اتارنے کے بعد ندا پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالتا ہے اور پھر اپنی جگہ بیٹھ کر مندر میں آنے والوں کے چڑھاؤوں میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اس کے سامنے دو بڑے کنستر رکھے ہوئے ہیں۔ ایک مٹھائی کے لئے، دوسرا پیسوں کے لیے۔ مٹھائی اور پوریوں کی خوشبو سے فضا بوجھل ہے۔ بھکاریوں میں ہی خوشبو ان کی آوازوں کو تیز کرنے کا کام کرتی ہے۔ لگاتار گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ پجاری ندا کو دیکھ کر بھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ اسے یہ رویہ عجیب لگتا ہے۔ وہ آگے بڑھ کر پوچھتا ہے۔

"سنو! وہ جو ہر ہر مہادیو والے یہاں کے بابا ہیں، وہ کب آئیں گے؟"

"وہ اب یہاں نہیں آئیں گے۔"

"کیوں؟" وہ حیرت سے پوچھتا ہے۔

"ان کو شیو جی نے اپنے پاس بلا لیا ہے۔"

لیکن شیو جی کے پاس تو وہ پجاری کی طرف دیکھ کر جملہ ادھورا چھوڑ کر پوچھتا ہے، وہ کہاں ملیں گے، ان کا دیہانت ہو گیا ہے۔ وہ مسکراتے ہوئے جواب دیتا ہے۔

ندا کچھ دیر وہیں کھڑا شیو کی مورتی کو دیکھتا ہے اور بے دھیانی میں آگے بڑھ جاتا ہے۔ پرانے پجاری شاید بھول گئے تھے انھوں نے نئے پجاری کو ندا کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔

ندا ان سارے پھولوں کا اپنے ذہن میں حساب لگاتا ہے، جو تقسیم ملک نے اس سے چھین لیے ہیں۔ وہ سال کے ۳۶۵ دنوں کو چار سے ضرب دیتا ہے اور گزرے ہوئے وقت کو بے شمار کھوئے ہوئے گلابوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اتنے بڑے نقصان سے وہ اداس ہے۔ گلاب اور زخم میں کتنی مشابہت ہے خون اور گلاب میں کیسی مماثلت ہے۔ ۔۔ وقت اور انسان کے درمیان گلاب کا ہونا کتنا اہم ہے۔ اس کا ذہن الجھے ہوئے ریشم کی طرح الجھتا جاتا ہے۔ اپنی اداسی میں اسے شہر کچھ بدلا محسوس ہوتا۔

پرانے راستوں نے نئے نام اپنا لیئے ہیں۔ خالی میدانوں کو دیواروں اور دروازوں نے تقسیم کر دیا ہے۔ گوالیار کا ریاستی راج ختم ہو چکا ہے۔ گوالیار، بھوپال، اندور، جاورہ، کئی چھوٹی بڑی ریاستوں نے ایک دوسرے میں ضم ہو کر مدھیہ بھارت کا روپ دھار لیا ہے۔ لیکن باڑے پر مادھو راؤ سندھیا، کالے لوہے کے اسٹیچو کے روپ میں اسی طرح تلوار ہاتھ میں لیے منہ زور گھوڑے کے منہ پر لگام دیے بیٹھے ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہوا ہے، گھوڑے کے کھلے منہ کی خالی جگہ میں ایک جنگلی کبوتر نے گھونسلہ بنا کر افزائش نسل کا فطری عمل شروع کر دیا ہے۔ کبوتری انڈوں پر بیٹھی ہے اور کبوتر نیچے سے دانا دنکا چونچ میں بھر کر لاتا ہے۔ کبوتر سیدھا منہ میں بنے گھونسلے میں جانے کے بجائے اپنی پرواز کا پہلا مقام تلوار کے قبضہ کو بناتا اور پھر وہاں سے اڑ کر گھونسلے میں داخل ہوتا ہے،

پہلے اس اسٹیچو کی دن میں دو بار دھلائی ہوتی تھی۔ ہر ہفتہ موجودہ راجہ یہاں خود سر جھکانے آتا تھا۔ سنا ہے راجہ کے بت کی جگہ اب یہاں کوئی دوسرا اسٹیچو نصب ہونے والا ہے۔ کسی لیڈر کا بت اس کی تیاری میں کئی مزدور لگے ہوئے ہیں۔ ایک بت کی جگہ دو سرا بت . . سامنے پیپل کے نیچے بیٹھا ہوا فقیر ایلی مینیم کا ایک ٹیڑھا میڑھا کٹورا، ہاتھ میں پیسے کٹورے سے بجا کر لوگوں کو متوجہ کر رہا ہے۔ پہلے وہ سندھیا کا قصیدہ گو تھا اور کا نگریس سرکار کا دعا گو ہے۔ کٹورے سے بجتا ہوا کٹورا اس بازار کی پرانی پہچان ہے۔ (باقی آئندہ)

## بقیہ صفحہ ۱۲ ضرب الامثال اور مخزنِ امثال

اس کے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔

مہرشی جی نے زمانے کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا اور اس نیک مقصد کے لیے انھوں نے خود کو وقف کر دیا تھا لیکن جو اس نکتے سے غافل نہیں تھے کہ ع کارِ دنیا کسے تمام نکرد — اس لیے انھوں نے اپنی تعلیمات کے لیے اُس حلقے کو مرکز بنایا جس سے خود ان کا تعلق تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ انھوں نے دنیا کے تقریباً سبھی بڑے مذاہب سے واقفیت حاصل کر لی تھی لیکن اوّل جوتش بعدہٗ درویشی کے مصداق انھوں نے ہندوستانی معتقدات سے متعلق قدیم اور بنیادی سرمایے کی جدید دور کے تقاضوں کے مطابق تعبیر، توضیح اور تشریح کو مقصودِ زندگی بنا لیا اور اس موضوع سے متعلق بقول جناب موہن لال بیر "اس عہد کی مخصوص (MAZN) زبان اردو" میں صدہا کتابیں لکھ ڈالیں اور ہندوستان کے انگریزی طبقہ کے لیے خود اس زبان کو مقدّس بنا دیا۔ اس عظیم الشان کارنامے کے لیے مہرشی جی آج بھی بے نظیر و بے عدیل ہیں اور زمانے کی روش کو دیکھتے ہوئے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ آئندہ بھی اُن کا جواب پیدا نہیں ہو سکتا۔

مہرشی جی کے جن امتیازات کی طرف سطورِ بالا میں اشارہ کیا گیا ہے، وہی امتیاز اس "مخزن امثال" کا بھی ہے۔ بے شک یہ ایک مختصر رسالہ ہے لیکن اس مختصر میں نصف سے زائد وہ مثلیں ہیں جو دوسری کتابوں میں مندرج نہیں ہیں۔ اختر صاحب کی فرمائش تو محض اتنی تھی کہ مثلوں سے متعلق واقعات قلمبند کر دیے جائیں۔ مہرشی جی نے یہ اضافہ کیا کہ جہاں ضروری معلوم ہوا ہے، اُن کہاوتوں کی تشریح بھی کر دی ہے۔ ✻

---

لہ کہتے ہیں کہ مہرشی جی نے تین ہزار پانچ سو کتابیں لکھی تھیں (اسرار کامیابی ص ۱۴) ان میں سے کئی سوانسانوں کے مجموعے اور ناول ہیں۔ بعض کتابیں خالص علمی اور تحقیقی موضوعات سے متعلق بھی ہیں مثلاً "آریوں میں علم تحریر کا رواج"۔

## بقیہ صفحہ ۱۶ کانٹوں پر چلتے لوگ

"سنو — " وہ جذبات سے مغلوب لہجے میں کہتا ہے۔

وہ پاؤں دبا تی رہتی ہے۔ وہ ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے — اس کا ہاتھ ٹھنڈا ہے — لوہے کی چابی کی طرح۔

"سو جاؤ —" وہ مردہ سی آواز میں کہتی ہے: "صبح پھر کام پر جانا ہے۔"

"نیند نہیں آ رہی —"

وہ انگلیاں چٹخاتے ہوئے آہستہ سے کہتی ہے

"میرے بیگ سے نیند کی گولیاں لے لو — مجھے بھی دے دو — "

"گولیاں میرے پاس ہیں۔ " وہ ناراضگی سے کہتا ہے — اٹھ کر نیند کی گولیاں لیتا ہے۔ اور لیٹ کر نیند کا انتظار کرنے لگتا ہے۔

آکاش میں ہوائی جہاز کی آواز گونجتی ہے۔

"شاید ہمارے پوجیہ پرائم منسٹر دورے پر جا رہے ہیں۔"

چارپائی پر اس کی بیوی نیند میں بڑبڑاتی ہے۔

"بیگ یور پارڈن سر —" ✻

## بقیہ صفحہ ۲۳ منظر پس منظر

ٹھہر سکتا۔ میں کھڑا ہو گیا اور چچی سے رخصت چاہی۔ چچی بے دھیانی میں بولیں "جائے تو پی لیتے" پھر چچی لگا ہیں سیئے دبے دبے لہجے میں کہنے لگیں "اچھی بات ہے تمہیں دیر بھی تو خاصی ہو گئی ہے۔"

اور میں خدا حافظ کہہ کر باہر چلا آیا۔

باہر شام گہری ہو گئی تھی۔

اور سڑک سنسان تھی۔ ✻

# نقد و نظر

## دیوانِ غالب کامل
### تاریخی ترتیب سے

مرتبہ
**کالی داس گپتا رضا**

مرزا غالب جلد سے یہ متھک بن گئے ہیں۔ متھک کے متعلق تحقیق بش اس معاشرہ میں مستحسن متصور نہیں کی جاتی جو معاشرہ متھک کا واقع ہوا ہو کیوں کہ اس سے ایقان کے متزلزل ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ معاشرہ بھی متھک مزاج ہے اس کے باوجود ہمارے یہاں محقق پیدا ہوتے ہیں نہ صرف پیدا ہوتے ہیں بلکہ عام و خواص کے عقائد و تخیلات کی پر تعمیر و تشکیل تصاویر پر جو تنقید بھی کھینچتے ہیں۔ غالب اور کلامِ غالب کے بیں ہماری تذکراتی تنقید اور مبالغہ آمیز داستاں طرازی سے اگر کچھ مغالطے پیدا ہوئے تو وہ اس لیے غلط نہیں کہ یہ متھک سے وابستہ شخصیت کا مقدر ہوتا ہے۔

ان غالب یا ماہرِ غالبیات میں جناب کالی داس گپتا رضا ممتاز و منفرد مقام کے مالک ہیں۔ رضا صاحب کی شخصیت تحقیق، تخلیق اور تنقید کی تثلیث عبارت ہے۔ انھوں نے غالبیات میں ایک اہم اضافے کیے ہیں لیکن کام کے لیے انھیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا وہ ہے دیوانِ غالب کامل، تاریخی ترتیب سے۔ کسی شاعر کے کلام کی تاریخی تدوین کی اہمیت اس لیے ہے کہ اس طرح موصوف کی ذہنی نشو و نما، ذہنی و فکری ارتقا، خیالات میں دور بہ دور آنے والے تغیر و تبدل کا پتہ چلتا ہے جس سے اس کی شعری شخصیت اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ کلامِ غالب کی تاریخی تدوین کے ضمن میں مفتی انوار الحق، ڈاکٹر سید عبداللطیف، شیخ محمد اکرام وغیرہ کی کوششیں بھی تعریف و توصیف کی مستحق ہیں لیکن اس کام میں خاطر خواہ کامیابی رضا صاحب ہی کو ملی۔

اس دیوان کی اشاعت سے قبل رضا صاحب ۱۹۸۶ء میں دیوانِ غالب کے پہلے ایڈیشن (مطبوعہ ۱۸۴۱ء) کی عکسی اشاعت اور ۱۹۸۷ء میں دیوانِ غالب کے چوتھے ایڈیشن (مطبوعہ ۱۸۶۲ء) کی عکسی اشاعت اردو دنیا کے سامنے پیش کر چکے ہیں۔ غالب کے پہلے اور چوتھے ایڈیشن کی اہمیت کا سبب بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں "پہلا ایڈیشن نایاب ہے (ظاہر ہے کہ اس میں سب ایڈیشنوں سے کم شعر ہیں) اور یہ غالب کی مطبوعہ شاعری کے سفر میں پہلا قدم ہے۔ چوتھا اس لیے کہ اس میں سب ایڈیشنوں سے زیادہ شعر ہیں اور بنیاد تیسرے ایڈیشن کا وہ نسخہ ہے جو خود غالب نے اپنے قلم سے درست اور نظرِ ثانی کر کے اشاعت کے لیے دیا تھا۔"

زیرِ نظر دیوان کو کلیاتِ نظمِ غالب (اردو) بھی کہا جا سکتا ہے، جو نو ابواب میں منقسم مرتب کا مبسوط مقدمہ بھی شامل ہے جو اس کی قدر و قیمت میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ ان میں سب سے اہم توقیتِ غالب (مقدمہ کا باب شاعر ہی کے شمارہ ۷/۵/۲ میں شائع ہوا تھا)۔ توقیت CHRONOLOGY غالب کے عہد کا ایک ایسا منظر نامہ ہے جس میں ایک اہم تاریخی واقعات کی بھی نشان دہی ہو گئی ہے۔

اس دیوان کی اشاعت سے جہاں بعض مروجہ تصورات کی تصحیح اور چند غلط فہمیوں کا ازالہ ہو گا وہاں کلامِ غالب کے مطالعہ کے لیے نئے گوشے بھی سامنے آئیں گے۔ مفروضوں اور مبالغوں کی بنا پر جو متھ بنی ہوئی ہے اس کی حقیقت بھی سامنے آئے گی۔ مثلاً آزاد نے آبِ حیات میں لکھا ہے "تقریباً ۱۸۰۰ شعر کا ایک دیوان انتخاب ہے کہ ۱۸۴۹ء میں مرتب ہو کر چھپا۔" (صفحہ ۹۹) مگر اس دیوان کی رو سے دیوانِ غالب کا پہلا ایڈیشن اکتوبر ۱۸۴۱ء میں چھپا (صفحہ ۲۵) اور اس میں ۱۰۹۶ اشعار تھے (صفحہ ۲۷)۔ آبِ حیات ہی کے صفحہ ۶۲۱ پر لکھا ہے "ایک دفعہ مرزا بہت قرض دار ہو گئے۔ قرض خواہوں نے نالش کر دی جواب دہی میں طلب ہوئے مفتی صاحب کی عدالت تھی۔ جس وقت پیشی میں گئے یہ شعر پڑھا ؎

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

(چوتھے ایڈیشن میں لاوے گی چھپا ہے)۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں اپنی کتاب "غالب اور آہنگِ غالب" میں "تمام جہاں نما" کی ۲ جون ۱۸۴۷ء کی اشاعت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ میکفرسن نامی انگریز سوداگر نے مرزا پر دعویٰ دائر کر کے سو روپے کی ڈگری حاصل کر لی (صفحہ ۸۹) اس کے فٹ نوٹ میں لکھا ہے نیشنل آرکائیو آف انڈیا، نئی دہلی (اسی سے صاف ظاہر ہے کہ یہ واقعہ ۱۸۴۷ء کا ہے۔ دیوانِ غالب (کامل) کے مطابق یہ غزل ۱۸۲۱ء میں کہی گئی یعنی اس واقعہ سے ۲۶ برس پہلے۔ رضا صاحب لکھتے ہیں آزردہ ۱۵ جون ۱۸۴۴ء کو صدر الصدور مقرر ہوئے تھے۔ اس سے پہلے (شاید ۱۸۲۷ء سے) صدر امین تھے۔ صدر امین کو اب امین کہتے ہیں۔ اس کی اپنی عدالت نہیں ہوتی لیکن شعر نسخۂ بھوپال (حمیدیہ ۱۸۲۱ء) کے متن میں موجود ہے اس وقت غالب ۲۳-۲۴ سال سے زیادہ کے نہ تھے۔ واقعہ کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے جیسے شعر عدالت میں فی البدیہہ پڑھا گیا ہو۔ (صفحہ ۱۳) معلوم ہوتا ہے کہ مصنفِ آبِ حیات نے واقعہ کی صداقت کے ساتھ شعر کی صحت کا بھی خاطر خواہ خیال نہیں رکھا۔ مثال میں غالب ہی کے دو شعر دیکھیے ؎

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب — صفحہ ۲۲۸
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا — (کامل)

حسن دل سے کم غم زدہ رنجیر پا ہیں — صفحہ ۲۸۶
کپڑوں میں جوئیں بخیوں کے ٹانکوں سے ہوا ہیں — (کامل)

آبِ حیات میں پہلے شعر کے پہلے مصرعے میں "حیف" کی جگہ "ہائے" اور دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ ہے

"ہم غم زدہ جس دن سے گرفتار بلا ہیں"

چھپا ہے۔ آزاد کے مطابق پہلا شعر۔ مقطع۔ اسیری کا عطیہ ہے۔ رضا صاحب لکھتے ہیں "اسیری کا حادثہ مئی ۱۸۴۷ء میں پیش آیا اور جیل سے رہائی غالباً اگست ۱۸۴۷ء میں ہوئی (دیوانِ غالب کامل صفحہ ۱۱۱) اور یہ شعر ۱۸۲۱ء یا اس سے پہلے کا کہا ہوا ہے (صفحہ ۲۲۸) زمانۂ فکر کے ضمن میں رضا صاحب لکھتے ہیں "کلام کے زمانۂ فکر کے تعین کے لیے یہ قاعدہ اختیار کیا گیا ہے کہ اگر کسی واحد غزل کا ایک شعر بھی کسی قدیم ترین ماخذ میں پایا گیا ہے تو اس پوری غزل کو قدیم ادوار میں شامل کر لیا گیا ہے کیونکہ پوری غزل نہ کہی گئی ہو تو بھی اس کی اساس اس عہد میں رکھی گئی تھی یہیں ممکن ہے کہ اس غزل کے کچھ اشعار واقعی بعد کے کہے ہوئے ہیں مگر ایسے اشعار کی تعداد زیادہ نہیں" (صفحہ ۲۲)

دیوانِ غالب کامل، تاریخی ترتیب سے، کی اہمیت کا اندازہ تو اس کے خاطر خواہ مطالعہ کے بعد ہی ممکن ہو سکتا ہے مگر اس کی علمی و ادبی و قعت کا اندازہ ان آراء سے لگایا جا سکتا ہے۔ جناب مالک رام لکھتے ہیں "دیوانِ غالب (کامل) تاریخی ترتیب سے چھپا ہے جو ہر اعتبار سے ایک تاریخ ساز کام ہے۔" پروفیسر گیان چند کے لفظوں میں "اردو تدوین کی تاریخ میں آج تک کسی کے کلام کو اس طرح تاریخی ترتیب سے مرتب نہیں کیا گیا۔ ایک قدیم شاعر کے کلام کے تمام سالوں کو معلوم کرنا بے نظیر تحقیقی کارنامہ ہے۔" بقول جمیل جالبی "یہ دیوانِ غالب نہایت مفید اور اچھا کام ہے اور یقیناً غالبیات میں ایک اضافہ ہے۔"

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اس دیوان کی اشاعت سے کلامِ غالب کے مطالعہ کے لیے نئے گوشے سامنے آئیں گے ان میں فنی و فکری اور اظہار و اسلوب کی مقدم حیثیت ہے۔ مثال میں یہ دو شعر پیش کیے جا سکتے ہیں ؎

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ "اے لئیم
تو نے وہ گنجہائے گرانمایہ کیا کیے؟"

صفحہ ۲۹۹ اور یہ مطلع ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں — صفحہ ۳۱۳

اس دیوان کی رو سے پہلا شعر ۱۸۴۷ء اور ۱۸۴۸ء کے درمیان کہا ہوا ہے اور دوسرا ۱۸۵۲ء کا ہے۔ "توقیتِ غالب" کے مطابق اس وقت میں غالب کو نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ جیسے خطاب ملے (۴ جولائی ۱۸۵۰ء)، اپریل ۱۸۵۲ء میں زین العابدین خاں عارف کی وفات ہوئی اور ۴ مئی ۱۸۵۲ء میں مومن کا انتقال ہوا۔ یہ تو خارجی حالات ہیں۔ فنی نکتہ نظر سے پہلے شعر میں "مقدور ہو تو" کہا گیا ہے جب کہ دوسرے شعر میں تحیر کے ساتھ ایک بیان ہے۔ پہلے شعر میں فاعل "خاک" ہے جب کہ دوسرے شعر میں خاک فاعل نہیں رہا۔ فلسفیانہ نکتہ نظر سے ہو رہا ہے "خاک میں پنہاں ہو گئیں" وغیرہ وہ نکات ہیں جو غالب کے مزاج میں آئے تغیر کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جس میں حسرت اور تحیر کو بہ وجہ مقدم مقام میسر ہے۔

شاندار کام کی جاندار پیش کش کی نذر آ رہنے کے لیے کتابت کی کچھ غلطیاں موجود ہیں۔ رضا صاحب نے اس کے لیے ایک صحت نامہ جاری کیا ہے اس لیے یقین کیا جانا چاہیے کہ آئندہ اشاعت میں یہ غلطیاں نہیں ہوں گی۔ دیوانِ غالب کامل تاریخی ترتیب سے اور رضا صاحب کے متعلق مشفق خواجہ کی اس رائے "دیوانِ غالب ... کی طباعت سے اہلِ تحقیق کی بہت سی مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔ ہم سب کالی داس گپتا رضا پر فخر کرتے ہیں کہ ہمارے درمیان ایک ایسا شخص موجود ہے جس نے وہ کام کیے جو اداروں کے کرنے کے تھے" پر لبیک کہنے کو جی چاہتا ہے۔

ضخامت: چار سو صفحات، قیمت: ۱۹۰ روپے ————

پتہ: ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ، ۱۰ جولی بھون – ۱، ۱۰- نیو میرین لائنز، بمبئی ۲۰۰۰۲۰-

(رشید کافی قاسم)

# مکتوبات

**گوپی چند نارنگ** ۔ ڈی ۔ ۲۵۲، سروودیہ انکلیو، نئی دہلی ۱۷

شمارے کے مکتوبات کے کالم میں بعض حضرات نے خاکسار کے مضمون "اردو املا اور لسانیات" کے بارے میں اظہار خیال فرمایا ہے۔ ان کا شکرگزار ہوں، قطع نظر ذاتی تعریضات اور تعصبات کے جو کسی بھی نئے علم کے خلاف جھجتے ہیں، جو کچھ حضرات نے بعض نکات بھی اٹھائے ہیں جن کا جواب ضروری ہے۔

ممتاز شمیم صاحب نے اردو سے حقِ صوابدیت ادا کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ابو محمد سحر کے مضامین نے ماہرِ لسانیات کا چین و آرام چھین لیا ہے۔ انھوں نے مزید لکھا ہے کہ سحر صاحب کے جن مضامین کا ہے حوالہ دیا ہے، میں ان سے سرسری گزرتا ہوں۔ حضرت! میں نے تو صرف ایک مضمون کا حوالہ دیا ہے، آپ کو مضامین کا حوالہ کہاں سے مل گیا؟ شمیم بھی عالم بالا معلوم ہوتے ہیں۔ بعض لوگ محض خط لکھنے کے لیے خط لکھتے ہیں۔ ابو محمد سحر اگر لسانیات نہیں جانتے تو انھیں ٹانگ اڑانے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر وہ غلط بیانی سے کام لیں گے تو میں نہیں، کوئی تو گرفت کرے گا۔ علم کی دنیا میں کوئی بات حرفِ آخر نہیں ہوتی، اختلاف کا حق سب کو ہے لیکن دلیل کے ساتھ۔ لسانیات سائنس ہے، اگر خاکسار نے کوئی بات غلط کہی ہے تو اس کو ثابت کیجیے ورنہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ فضول رائے زنی سے کیا حاصل۔

انور میانی (گولا رکرناٹک) کا ممنون ہوں کہ انھوں نے بعض اہم نکات پر گفتگو کی ہے۔ حروفِ تہجی میں چار کا اضافہ فارسی میں ہوا، اس میں کوئی غلطی نہیں ہے۔ بے شک پ، چ، ژ اور گ، فارسی اور ہندی میں مشترک ہیں، لیکن فارسی حروف کو الگ لکھنے کا تقاضہ کرنا مناسب نہیں، اس لیے کہ یہ میرے موضوع سے خارج تھا۔ میرا موضوع اردو کے حروفِ تہجی تھا، فارسی اور عربی کے حروف نہیں۔ ان کی اس بات سے اتفاق ہے کہ ساکن اور موقوف ہم معنی نہیں ہیں کیوں کہ موقوف ٹھیکتی توڑنے کے لیے آتا ہے۔ "کوئی" کے وزن کی بحث میری نہیں ہے، غرض میرا بیان جیسے میرا مضمون دوبارہ دیکھیے، یہ اقتباس ہے، حوالہ موجود ہے، انور میانی صاحب نے اس کو نظر انداز کر دیا ہے کہ یہ تمام عبارت حاشیے میں ہے بحوالہ منظر علی سید (املا اور رسم الخط کے مسائل، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۸۵ء ص ۱۱) سو یہ سوال ان سے پوچھنا چاہیے۔ ویسے دو عروضی شاید یہ متفق ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر اخلاق اثر صاحب بھوپال نے کہا ہے کہ میرے معروضات کا اطلاق شکیل اردو کی نئی کتاب برائے درجہ اول (مطبوعہ این سی ای آر ٹی) میں دیکھی جا سکتی ہے۔ میں روایت کا احترام کرتا ہوں اور لسانیات سے بھی استفادہ کرتا ہوں۔ یہ طریقۂ تدریس وقت کا تقاضا ہے۔ اسے آزمایا جا رہا ہے۔ اخلاق اثر صاحب میرے اسی جو کوتاہیاں دیکھیں ان سے مجھ کو مطلع کریں، تاکہ اسے بہتر بنایا جا سکے۔

رفیق انجم صاحب (چھپرہ) کو اسلم حنیف (بدایوں) کے بارے معلوم ہو گیا ہو گا کہ خاکسار کسی کو کند ذہن نہیں سمجھتا، لیکن لوگوں کو بعض بحث بنا لیتے ہیں۔ جب بتایا اور ثابت کیا جاتا ہے کہ گھر پہنچے تو ان کے پیروں سے مٹی جھڑنے لگے گی تو پرستش کرنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے لیکن حق بات کہنا چاہیے خواہ کسی کو ناخوش گوار کیوں نہ ہو۔ پھر میں نے تو دونوں حضرات کا ذکر بھی گستاخانہ نہیں کیا ہے۔ اسلم حنیف کا یہ جملہ طعنہ بے "رشید حسن خاں اور ابو محمد سحر جس نظریات کو ہوا دے رہے ہیں، ان سے سوائے گمراہی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا اس لیے قارئین کو یہی ہدایت دی جا سکتی ہے ——— اسے گرفتار ابو بکر و علی ہشیار باش۔"

رہے نثار احمد فاروقی صاحب (نئی دہلی) تو وہ آج کل مجھ پر کچھ زیادہ ہی مہرباں ہیں۔ شاید وہ سمجھتے ہوں کہ رسالہ شانِ ہند میں لطیف الزماں خاں کا جو مضمون "دیوانِ غالب بخطِ غالب ۔ روداد اشاعت" شائع ہوا ہے، اس میں میرا کوئی ہاتھ ہو۔ جس سے چاہیں وہ تصدیق فرما لیں، اشاعت سے قبل میرے فرشتوں کو بھی اس کی خبر نہ تھی، رہی میں جانتا ہوں کہ لطیف الزماں خاں کون ہیں۔ شانِ ہند میں یہ طلوعِ افکار کراچی سے نقل ہوا ہے۔ عصری ادب میں بھی اس سے پہلے لکھا جا چکا ہے۔ ویسے اس میں نثار احمد فاروقی پر جو الزام لگائے گئے ہیں، وہ اخلاقی اعتبار سے اس قدر سنگین نوعیت کے ہیں کہ اگر وہ غلط ہیں تو نثار صاحب کو ان کا جواب دینا چاہیے۔ بہرحال قطع نظر اس کے اردو املا کے مسائل پر نثار صاحب جب بھی لکھیں یا جس جا ویں، ان کی علمیت کا میں احترام کرتا ہوں، لیکن لسانیات سے انھیں کچھ لینا دینا نہیں۔ انھیں وہ دن یاد ہوں گے جب وہ رشید حسن خاں کی عربی دانی پر معترض تھے اور ترقی اردو بیورو میں اردو املا کی نظر ثانی کمیٹی میں لگاتار تیس دن صبح سے شام تک شریک رہے اور مشورے دیتے رہے۔ آج دو لفظ حکما نے مزاج المومنین کے طور پر لکھ دیے تو ان کی رگِ حمیت پھڑک اٹھی (واضح رہے کہ رشید حسن خاں میرے رفیق کار ہیں اور میرا ان سے کوئی ذاتی اختلاف نہیں) مزید یہ کہ اِعراب (بالکسر الاول) کے مفہوم کے لیے جو اردو املا میں رائج ہے کسی اَعراب (بالفتح اول) سے رجوع کی ضرورت نہیں۔ ویسے علم اہلِ علم کی صحبت ہی سے آتا ہے اور خاکسار تو میرا پہلو زبان ہے۔ البتہ کچھ لوگ ایسے ضرور ہوں گے جو بطنِ مادر سے سیکھ کر آتے ہوں گے۔ اگر اردو حروفِ تہجی میں ہندی آوازوں کے ساتھ عربی اور فارسی آوازوں کا میل ہو سکتا ہے، میر تقی میر "جانہ چھیٹ" باندھ سکتے ہیں یا لوگ "امام" کے ساتھ "ارڈو" بول سکتے ہیں، اور نثار احمد فاروقی جیسے علمار "گلاب" کے ساتھ "جامن" کھا سکتے ہیں تو فارسی "ساخت" کے ساتھ عربی "لاحقہ یات" کا اضافہ کیوں گلے سے نہیں اترتا۔ پروفیسر عبدالعزیز میمن والی جو روایت نثار صاحب نے نقل کی ہے اس سے انھوں نے خود لیے کو لوارا ہے یا اپنے پاکستانی دوست لطیف الزماں خاں کو جھوں نے ان کے "رازوں" کو افشا کیا ہے۔ ایک ادیب جب اس سطح پر آ جاتا ہے تو وہ کسی دوسرے کا کچھ نہیں بگاڑتا خود اپنا ہی کچھ بگاڑتا ہے۔

**عبدالقوی دسنوی** ۔ صدر شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال ۔

"شاعر" دیر سویر سے برابر مل رہا ہے۔ اپنے ذوق کی چیزیں پڑھ لیتا ہوں، اور لطف اندوز ہو جاتا ہوں قسط وار چیزوں کی اشاعت سے لطف جاتا رہتا ہے۔ یہی حال "دیواروں کے بیچ" کا ہو رہا ہے — حالانکہ ماما فضلی صاحب کی تحریر نہایت دلچسپ ہے۔ بعض دوستوں نے بھی یہی شکایت کی ہے۔

اداریہ اچھا ہے لیکن اردو کی مصیبتیں کچھ اور بھی ہیں جو عام میں خود اردو والے اردو کے مخلص نظر نہیں آتے سب سے تمامتر تعلیم کا ہے۔ کہیں اردو پڑھانے کا انتظام نہیں ہے کہیں پڑھنے عنقا ہو رہے ہیں۔ جو لوگ اردو میں خط نہیں لکھ سکتے وہ اردو کیوں کر لکھیں گے جن کے گھروں میں اردو کے علاوہ دوسری زبان کے اخبارات یا رسائل آتے ہیں وہ اردو اخبارات اور رسائل کیوں پڑھیں گے؟

ہجوں کے سلسلے میں آپ نے تحریر کیا ہے۔

"ایک غیر ضروری حرف کے اسیر اردو والوں نے نہ جانے اس عمل کو ترک کر رکھا ہے؟"

یہ بات صرف ہجے کے لکھنے تک نہیں، اردو پڑھنے ۔ ہوتی ہے۔ لوگ اردو اس لیے نہیں پڑھ رہے ہیں کہ ان کا خیال ہے وہ اردو پڑھ کر کیا کریں گے؟ یعنی ملازمت کا مسئلہ اس سے حل نہیں ہو سکتا حالاں کہ مادری زبان سے محبت، اس کا جاننا اور زندگی کے ہر شعبے میں اس کا استعمال اس معاشی مسئلہ کو حل کرنے کے لیے نہیں کیا جاتا بلکہ زندہ قومیں مادری زبان کو اپنی زندگی کا اہم حصہ سمجھ کر رکھتی ہیں اور ترقی دیتی ہیں اکثر اردو والے شاید مادری زبان کی اہمیت اور قدر و قیمت سے ہی واقف نہیں ہیں۔ اس لیے بعض حلقوں سے رسم الخط کو بدلنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔

میرا اندازہ تو یہ ہے کہ اردو والوں کی ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو اردو کے نام سے ذاتی فائدے تو اٹھا رہے ہیں اپنے وجود سے اردو کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ایک ایسی تحریک کی ضرورت سخت ہے جو اردو والوں کے سامنے مادری زبان کی اہمیت، قدر و قیمت کو سمجھائے اور ان کے دلوں میں اپنی مادری زبان سے قدر جذبہ بیدار کرے۔ جب یہ صورت پیدا ہو جائے گی تو پتے بھی اردو میں لکھے جائیں گے، نام کی تختی بھی اردو میں ہوگی، دوکانوں کے سائن بورڈ بھی اردو میں ہوں گے، شادی اور دوسری تقریبات کے دعوت نامے بھی اردو میں ہوں گے۔ اردو اخبارات اور رسائل بھی خریدے جائیں گے۔ اردو دار المطالعہ اور کتب خانے بھی قائم ہوں گے اور اپنے بچوں کو لوگ اردو پڑھانے میں فخر محسوس کریں گے۔ اور تب کوئی طاقت اسے مٹانے کی ہمت نہیں کر سکے گی اور کوئی فرد اس کی مخالفت نہیں کر سکے گا۔ آپ مانیں یا نہ مانیں میرا فیصلہ تو یہی ہے۔

**رام لعل** ۔ شانتی نکیتن ۔ ڈی ۔ ۲۲۹، اندرا نگر لکھنؤ ۱۶

آپ نے لکھا ہے کہ آپ لوگوں نے مہاراشٹر میں اردو کو ثانوی سرکاری زبان مانے جانے کا مطالبہ کر دیا ہے۔ مبارک ہو۔ لیکن ہمارے طریقہ کار سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آپ لوگ تحریک کو خواص کے ساتھ عوام کے ذریعہ بھی طاقت ور بنائیں۔ عملی طور پر اردو تحریک کی جڑیں عوام میں گہری نہیں ہو سکی ہیں کئی مسئلوں کا آغاز کر دیا ہے مگر عملی سطح پر کامیاب نہیں اور یہ طے ہے آزادی کے بعد ہم نے کاغذ سے باہر پاؤں رکھا بھی ہے تو سیدھے حکومت کے دربار میں جس سے اردو کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکا ہے

اپنا اسکرپٹ قائم رکھنا ہے اور یہ کام عوامی سطح ہی پر ممکن ہو سکے گا — کانفرنسوں اور سیمیناروں سے نہیں۔"

آپ کی ان باتوں سے کون اختلاف کر سکتا ہے۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا آپ نے یہ کیسے لکھ دیا کہ "ہمارے طریقۂ کار میں فرق ہے"

کیا ہم نے ۱۹۸۵ء میں اردو اکادمی سے استعفیٰ نہیں دیا تھا اور اردو رابطہ کمیٹی قائم کر کے اتر پردیش کے بے شمار دیہات اور قصبات کے مسلسل پانچ سال تک دورے نہیں کیے؟ اور لاکھوں عوام کو ان کے اردو کے جمہوری حقوق کے لیے بیدار نہیں کیا؟ اور ان سے لاکھوں خطوط وزیر اعظم اور وزیر اعلیٰ اتر پردیش سے نہیں لکھوائے کہ وہ اپنا اردو کا الیکشن وعدہ پورا کریں! کیا آپ تک یہ اطلاع نہیں پہنچ سکی کہ چھوٹی جگہوں پر عوام کے اجتماع دو ہزار سے پچیس پچیس ہزار کے ہوتے جب کہ بڑے شہروں میں جہاں خواص رہتے ہیں ان کی تعداد ہمارے جلسوں میں سیکڑوں سے کبھی آگے نہ بڑھ سکی۔ اس جد و جہد میں ہمیں اتنی کامیابی تو ہوئی کہ یہاں اسمبلی میں اردو کا بل پاس ہو گیا جسے اب لیجسلیٹو کونسل (اپر ہاؤس) سے پاس کرانا باقی ہے۔

اگر اردو کامل قانون کا درجہ حاصل کر لیتا ہے تو یہ ہماری پہلی منزل کی کامیابی ہوگی۔ اور یہاں اردو رابطہ کمیٹی کے قیام کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ اگلے مرحلے پر کام کرنے کی ذمہ داری ماہرینِ تعلیم کی ہوگی جو چاہیں تو گجرال کمیٹی کے سفارشات کو مدنظر رکھ کر کوئی لائحہ عمل تیار کریں یا پھر اپنا کوئی فارمولا حکومت کے سامنے رکھیں جس سے دستور کی روشنی میں اردو میں بطور مادری زبان پرائمری سطح تک کی تعلیم یقینی ہو جائے۔

یہاں سہ لسانی فارمولا مہاراشٹر سے مختلف بنا دیا گیا ہے جس میں صوبے کی علاقائی زبانوں میں سنسکرت کو بھی شامل کر دیا گیا تھا۔ اور اردو کے لیے ٹیچروں کی سہولیات نہ دے کر صرف سنسکرت پڑھانے کی آسانیاں پیش کی جاتی رہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گزشتہ چالیس برسوں میں اردو کی نسلیں ختم ہو گئیں۔ اب ہمیں اردو سے محبت کرنے والوں کو اس بات پر راضی کرنا ہوگا کہ وہ اپنے بچوں کو اردو میں تعلیم دلانے کے لیے تیار ہوں۔ یہاں اس میں جو مشکلات حائل ہیں ان کا پورا اندازہ شاید آپ نہیں کر سکتے۔ جب کبھی ادھر آئیں تو لوگوں سے مل کر ان کے خیالات ضرور معلوم کر لیا کریں۔

مہاراشٹر میں آپ جس مہم پر جد و جہد کریں گے میں اور میرے ساتھی آپ کا ساتھ دیں گے۔ خدا کرے آپ اس مہم میں کامیاب ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کی کوششوں سے ہمیں بھی کچھ روشنی مل سکے گی۔

**عتیق احمد** ۔ آر/۱۹۵ بلاک ۱۵، دستگیر سوسائٹی، کراچی ۱۸ (پاکستان)

شاعر کے چاروں شمارے بہت خوب رہے۔ ضخامت کی کمی کا احساس نہیں ہوتا کہ مندرجات کے انتخاب میں آپ بھرپور توجہ دے رہے ہیں۔ شمارہ نمبر ۳ کے دونوں مضامین خیال افروز ہیں۔ یعقوب راہی کا مضمون بحث طلب نکات کا حامل ہے۔ محمد علی صدیقی کا مضمون تو یہاں بھی چھپ چکا ہے اور پڑھ بھی رکھا ہے۔ افسانوں کا معیار چاروں شماروں میں خاصا اچھا ہے۔ رتن سنگھ کا افسانہ حاصل مطالعہ ہے۔ بہت پسند آیا۔ کلام حیدری صاحب بھی حسب معمول اپنے رنگ میں یکتا رہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ باقی افسانے ناقابلِ توجہ ہیں

میری عام رائے یہی ہے جب سے اردو کہانی میں تجریدیت اور لایعنیت کا زور ٹوٹا ہے کہانی بحیثیت مجموعی برابر سہارا لے رہی ہے۔ معلوم نہیں جدیدیت پسندوں کے پرموشن کو یہ صورت حال کس قدر ناگوار گزر رہی ہے؟ کوئی ردعمل؟

**انور سدید** ۔ ۱۶۲۔ ستلج بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور ۱۸ (پاکستان)

ایک طویل عرصے کے بعد شاعر کے دو پرچے شمارہ نمبر ۳ اور ۴ ملے ہیں، میں نے عجیب سی خوشی محسوس کی جیسے آپ سے نصف نہیں پوری ملاقات ہو رہی ہو۔

ان دو پرچوں میں چند چیزیں نمایاں نظر آئیں:

اوّل: سلطان سبحانی کے سرورق جو بہت معنی خیز اور خوبصورت ہیں۔

دوم: حنیف ریماد کا کیری کیچر جو شاعر کی پوری شخصیت کو سطح پر ابھار دیتا ہے۔ میں حنیف کے فن کی داد دیتا ہوں کہ وہ ادیب سے نہ بھی ملے ہوں تو اس کے باطن کو اس کی تخلیقات سے دریافت کر لیتے ہیں اور پھر اس کو کیری کیچر کا بنیادی نقطہ بنا دیتے ہیں۔ انھوں نے عمیق حنفی سے ملاقات کرا دی۔

سوم: "آثار لفظ لفظ" کا سلسلہ بھی اچھا لگا۔ یہ خطوط چونکہ مصنف کے قلم میں پیش کیے جاتے ہیں اس لیے وہ کیفیت پیدا کرتے ہیں جو کاتب کے لکھے ہوئے خطوط سے مختلف ہوتی ہے۔

چہارم: "بازیافت" میں یہ عمل قدیم تصنیفات کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

میں اب شاعر کے یہ شمارے اطمینان سے پڑھوں گا۔ یوسف عثمانی، عبداللہ کمال اور سرمان صدیقی کی غزلیں تو میں نے ابتدائی ورق گردانی میں پڑھ لی تھیں۔

**نظیر صدیقی** ۔ مکان نمبر ۱۹۱۵، اسٹریٹ نمبر ۱۱، بہارہ آئی اسلام آباد

شاعر کا شمارہ نمبر ۳ اور ۴ ایک ساتھ ملے، خوشی ہوئی۔ آپ نے نیر مسعود کے نام غیاث احمد گدی کے ایک خط کا عکس شائع کیا ہے۔ کوشش کر کے نیر مسعود صاحب سے غیاث کے ناول نگاری پر مضمون لکھ کر شائع کیجیے۔ یہ ایک اہم کام ہوگا۔ نیر مسعود خود بھی اچھے ناول نگار ہیں۔

**مہدی پرتاب گڑھی** ـــــــ پرتاب گڑھ (یوپی)

ادھر آپ کے اداریوں میں بہت کاٹ آ گئی ہے۔ اتر پردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بن جانے سے اردو والے جس قدر مسرت کا اظہار کر رہے ہیں۔ ہندی پریس اس کی مخالفت میں اپنا زور صرف کر رہا ہے۔ ابھی تک یہ بھی واضح نہیں ہو سکا کہ کیا اردو کو پرائمری سطح پر پڑھانے کی بات آئے گی کیا اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہی رہے گی یا پھر غیر مسلم حضرات اپنے بچوں کو اردو سے روشناس کرائیں گے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اردو ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے ابتدائی درجوں میں پڑھائی جائے۔ اس کے لیے اردو والوں کو ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ ایک لائحہ عمل ترتیب دینا ہے۔ غیر اردو حلقے میں اردو کی جادو بیانی کو ثابت کرنا ہوگا۔ اردو میں پتے لکھنے کی مہم ایک مثبت قدم ثابت ہو سکتی ہے۔

شمارہ نمبر ۴ میں رئیس امروہوی کی غزلیں پسند آئیں، علش بڑودوی، ظہیر غازی پوری اور منصور سبزواری کی غزلیں بھی متاثر کرتی ہیں۔ ندا فاضلی کی خود نوشت کو ان کے مخصوص انداز بیان نے دل پذیر بنا دیا ہے۔

رتن سنگھ کا افسانہ "ایک گاتھا"، م ناگ کا "گھروندہ" اور شاہد لطیف کا "اور سقف ہوا بھر گیا" دل کو چھوتے ہیں۔

**شفیقہ فرحت** ۔ ۲/۱۴۲ پروفیسر کالونی ـــــ بھوپال

ساٹھ سال تک یہاں کبھی اردو ماہنامے کا اس باقاعدگی اور ایسی آب و تاب اور آن بان سے زندہ رہنا معجزہ ہے خصوصاً ایسے میں جب اردو کے قارئین کا دائرہ دن بدن سمٹتا جا رہا ہے۔

معیار کے متعلق کیا کہا جائے۔ صفِ اول میں اولین — جدت کے ساتھ اس کا قائم رکھنا مشکل ہے لیکن "شاعر" یہاں بھی سرخرو و کامیاب ہے۔

کئی مہینے کے پرچے سامنے ہیں۔ نظم۔ نثر۔ تحقیق۔ تنقید۔ خطوط۔ اداریہ ہر حصہ تفصیلی تبصرے کا مستحق ہے۔ اور اس کے لیے درکار ہے فرصت۔

سو ـــ وہ عنقا ہے۔

ندا فاضلی کی خود نوشت "دیواروں کے بیچ" خصوصیت سے بہت پسند آئی۔ جاندار اور طرح دار ہے اور ان کی شاعری کی طرح منفرد۔ اور مجتبیٰ کے "ذکر احوال یہ ہے" کا کہنا ہی کیا۔

**رفیع الدین ہاشمی** ۔ ۲۸ ـ ڈی، منصورہ، لاہور

شاعر کے دو شمارے موصول ہوئے۔ زیر نظر شماروں سے معلوم ہوا کہ اقبال نمبر اور حالیہ دو شماروں کے درمیان مزید کئی شمارے اور شائع ہوئے ہیں (ممکن ہے کہ آپ نے بھیجے ہوں مگر نہیں پہنچے)۔ کم سے کم صفحات میں زیادہ سے زیادہ تخلیقات اور ادبی نوادر کو جس انداز میں آپ پیش کرتے ہیں اس کی داد نہ دینا سخت بے انصافی ہے۔ یہ سلیقہ مندی جس لطافت اور فن کاری کی متقاضی ہے آپ ہی کا ورثہ اور حصہ ہے۔ اتنے کم حجم کا اس قدر متنوع اور جامع پرچہ اپنی مثال آپ ہے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

ندا فاضلی کی خود نوشت منفرد ہے اور دلچسپ بھی۔

شاعر کی نگارشات کا انتخاب پسند آیا۔ آپ زمانے کی نبض پہچانتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ ضخیم اور تخیم پرچوں کے مقابلے میں شاعر کی خواندگیت READIBILITY زیادہ ہے البتہ کتابوں پر تبصروں کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس طرف توجہ فرمائیے۔

**حفیظ آتش** ۔ بیمی کلاتھ امپوریم، مدار شفٹ پوسٹ، مرومہ

آپ کے خط کے ساتھ شاعر کے شمارے اور تازہ شمارہ بھی مل گیا۔ آپ لوگ واقعی قابلِ تحسین ہیں کہ شاعر نے دو چار سالوں میں حیرت انگیز ترقی کی ہے یوں تو شاعر کا شمار پہلے ہی سے اچھے ادبی پرچوں میں ہوتا رہا ہے مگر اب تو آپ لوگوں نے کمال ہی کر دیا۔ تازہ شمارے میں وزیر آغا کی تینوں نظمیں بہت اچھی ہیں وزیر آغا جہاں بہت بڑے نقاد ہیں شاعر بھی اتنے ہی بڑے ہیں۔

رتن سنگھ کی کہانی "ایک گاتھا" ہندو میتھالوجی کے پس منظر میں اپنا بھرپور تاثر دیتی ہے۔ م. ناگ کا "گھروندہ" ایک ایسی آواز ہے جو سب کو سنائی دینی چاہیے ایک درد ہے جو ہر حال محسوس کیا جانا چاہیے۔ میں نہیں کہتا کہ یہ صرف بڑے شہروں کا المیہ ہے آج کل تو اتنی ٹوٹ پھوٹ مچی ہے کہ ان کا اثر سب جگہ یکساں ہے۔

علش بڑودوی کی دونوں غزلیں خوب ہیں۔

# کتب و رسائل

## یہ لوگ

اس کتاب میں اردو کے کہنہ مشق ادیب، صحافی اور مترجم سری نواس لاہوٹی کے تحریر کیے ہوئے دس خاکے اور تین مضامین شامل ہیں۔ یہ خاکے قاضی عبدالغفار، پروفیسر حبیب الرحمٰن، پروفیسر طاہر علی خاں شیروانی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، مخدوم محی الدین، سری سری، دتش دھروویا لنکار، ڈاکٹر مادھا کرشن، ڈاکٹر راجیندر پرشاد، سوریکانت ترپاٹھی، مولانا محمد ستار، سجاد ظہیر اور ملام احمد مجور کے ہیں جس سے لاہوٹی صاحب کو قربت حاصل تھی یا جنھوں نے اپنی سیرت اور شخصیت سے انھیں متاثر کیا تھا۔ اس طرح یہ خاکے ذاتی تاثرات ہیں اور ان سے بعض ایسی باتوں کا پتہ چلتا ہے جن کا علم کسی اور ذریعے سے ممکن نہیں۔

ضخامت: ۱۰۹ صفحات۔ قیمت: ۲۵ روپے۔ ناشر: انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر، راؤز ایونیو۔ نئی دہلی ۲۔ ۱۱۰۰۰

## دریچۂ سیم سخن

کلاسیک کی روایات، نئی معنویت اور نئے طرز اظہار کے ساتھ رضا ابن فیضی کی منتخب غزلوں کا انتخاب عنقریب منظر عام پر آ رہا ہے۔ پتہ: فیضی پبلی کیشنز، مئو ناتھ بھنجن ۱۰۱، ۲۷۵ (یوپی)

## حرف برہنہ

عروضی اور فنی مسائل، نیز اردو میں کلاسیکی تنقید کے بعد معروف شاعر اور ممتاز نقاد پروفیسر عنوان چشتی کا تاریخ ساز کارنامہ "حرف برہنہ" جس میں اردو کے مشہور شاعروں اور ادیبوں کی ۲۱۔ اہم کتابوں کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ لے کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا ہے۔ اس کتاب میں پروفیسر عنوان چشتی کے وہ تجزیاتی، عروضی، لسانی اور فنی مقالے بھی شامل ہیں جنھوں نے ادبی و شعری حلقوں میں بڑی مقبولیت اور شہرت پائی ہے اور جنھوں نے اصلی اور نقلی شاعری کی پرکھ کا معیار قائم کر دیا ہے۔

اردو کے بڑے اور حق گو ادیبوں اور عالموں کی رائے ہے کہ آزادی کے بعد یہ کتاب شعری تنقید کی دنیا میں راہ گفتاری کی نئی روایت قائم کرتی ہے جس سے عام قاری سے لے کر شاعر، علم اور طلبا سے لے کر اساتذہ تک استفادہ کر سکتے ہیں۔ اچھی تنقید لکھنے اور اچھی شاعری کرنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ کیا آپ نے یہ کتاب پڑھی ہے؟ اگر نہیں تو آج ہی منگوائیے۔

یہ کتاب ہر شہر کے بک سیلر سے حاصل کی جا سکتی ہے یا براہ راست منگائیے۔

صفحات: ۱۸۴۔ قیمت: ۱۰۰/ روپے۔ رابطہ: اردو مسکن بی ۱۱ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵۔ ۱۱۰۰

## بدگشت بادبان

رمضان کی طرف تکادعا اور زندگی کی طرف پہلا قدم۔ "اجنبی نگاہیں" بلند ہوتے ہیں۔ "اور تیر بکھرا ہوا ہاتھ" کے بعد سلطان سبحانی کا تیسرا شعری مجموعہ شائع ہو رہا ہے۔

رابطہ: ہم دیاں پبلی کیشنز، ۱۹۴ ۔ ایم۔ بی۔ ایچ۔ کالونی مالیگاؤں (مہاراشٹر)

## انتخاب ۶

بنگلہ دیش کی سرزمین سے مستقل شائع ہونے والا اردو مجلہ جس کا چھٹا شمارہ جلد منظر عام پر آ رہا ہے۔ معیاری تخلیق جیالوں کا ایک ادبی سلسلہ۔ مدیر: ڈاکٹر حزیری۔ معاون: ایم نعیم۔

رابطہ: مرکز تخلیق ادب، ڈاکٹر ذکرالحق روڈ، سید پور۔ (نیلفاماری) بنگلہ دیش۔

## جوئے شیر

اردو کا پہلا ایک صنفی جریدہ سہ ماہی جوئے شیر صرف غزلوں پر مشتمل (بلا تخصیص مکاتب فکر) اپنی تخلیقات صرف غزلیں ارسال کریں۔ مدیر: عبداللہ کمال۔ معاون مدیر: عبدالاحد ساز۔ فی شمارہ ۱۵ روپے۔ سالانہ ۵۰ روپے (۴ شمارے)

پتہ: جوئے شیر، اجابہ وطن پبلی کیشنز پوسٹ بکس نمبر: ۴۷۴۹۳۔ اندھیری (ویسٹ) بمبئی ۵۸ ۴

## کتھا

آٹھویں دہائی کی نمائندہ مراٹھی کہانیوں کا انتخاب و ترجمہ۔ اس ایک دہائی میں مراٹھی میں کم و بیش ۴۲ ہزار کہانیاں شائع ہوئی ہیں۔ خالد اگاسکر نے اپنے وسیع مطالعے کے بعد انتہائی ژرف نگاہی سے یہ کہانیاں منتخب کی ہیں۔ اس کتاب میں شامل پیش لفظ "خالد اگاسکر کے وسیع مطالعہ اور تنقیدی بصیرت کا آئینہ دار ہے۔ اس میں انھوں نے ذہنی تعصبات سے پرے اردو اور مراٹھی کہانی کا ان کی کہانیوں کے حوالے سے بھرپور تجزیہ پیش کیا ہے اور ان کی سمتی، فکری اور نظریاتی اساس کو ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے تناظر میں دیکھنے کی سعی کی ہے۔ چار رنگوں میں دیدہ زیب سرورق، خوبصورت کتابت و طباعت۔ ضخامت ۱۲۸ صفحات۔ قیمت: اٹھارہ روپے۔

رابطہ: ۱۵ ۔ بی، بارہویں کھیت واڑی کراس لین پرا شیلم کیا وڈ گرانٹ روڈ، بمبئی ۴

## میراجی کی نظمیں

اردو شاعری کی داستانوی شخصیت میراجی کی پہلی کتاب عنقریب شائع ہو رہی ہے جسے تارہ کار شاعر مرعوب علی نے مرتب کیا ہے۔ ملنے کا پتہ: نصرت پبلشرز، امین آباد، لکھنؤ (یوپی)

## تذکرہ غیر مسلم نعت گو شعرا و شاعرات

متعدد کتابوں کے مصنف و مؤلف نور احمد میرٹھی، غیر مسلم شعرا و شاعرات کا ایک ایسا تذکرہ ترتیب دے رہے ہیں جس میں قدیم و جدید غیر مسلم نعت گو شعرا و شاعرات شامل ہوں گے۔ غیر مسلم شعرا اور اس موضوع سے تعلق رکھنے والے حضرات رابطہ قائم کریں۔

نور احمد میرٹھی ۳۵۰ ل ۸/۱ ، کورنگی، کراچی ۳۱، ۷۴۹ (پاکستان)

## ماہنامہ فکر و آگہی دہلی

بشیر بدر نمبر (دو ایڈیشن) کی بے پناہ مقبولیت کے بعد فکر و آگہی ۱۹۹۰ء میں ضخیم رفعت سروش نمبر شائع کر رہا ہے۔ رفعت سروش کی شخصیت اور فکر و فن پر ایک تنقیدی، تحقیقی اور علمی دستاویز۔

ڈاکٹر رضیہ حامد: ایچ ۶۵ بی سیکٹر ۲۲، نوئیڈا (یوپی)۔

## ماہنامہ سیپ کراچی

نسیم درانی کی ادارت میں شائع ہونے والا ضخیم شمارہ نمبر ۵۵ سالگرہ نمبر کے روپ میں شائع ہوا ہے۔ طویل و مختصر مضامین۔ ۳ خاکے یادیں۔ ۱۴ افسانے۔ ۱۷ شعرا کی ۹۲ نظمیں ۴۴ شعرا کی ۹۶ غزلیں شامل ہیں۔

ضخامت: ۳۰۹ صفحات۔ قیمت: ۳۰ روپے

سیپ پبلی کیشنز، پوسٹ بکس نمبر ۳۲۲۴، کراچی ۳۰

## تزکیہ

حمد، نعت اور دعا، شعری اظہار کے وہ پیرائے ہیں جو وصفات کا ذکر کرتے ہوئے مرکوز نظر مخصوص ہوتا ہے۔ یہ جو وسعت، گہرائی اور گیرائی پائی جاتی ہے اس کے آہنگ اور ادراک کی ہر صنعت کی توسیع مالیے کے بعد بھی پھر جیسے جیسے عقل و شعور ترقی کرتے ہیں، سرا وار تحمید اور منقبت کے اوصاف مزید کھلتے جاتے ہیں اور ان کے تعلق کا دامن وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ تزکیہ (۱۹۸۷ء) میں نہ صرف موضوع کے تنوع کو بلکہ اظہار و ہیئت کے تنوع کو بھی لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

سلیم شہزاد کے اولین شعری مجموعے "دعا" پرہستہ سے اچھی اور سچی شاعری کے قارئین کو متاثر کیا تھا۔ "تزکیہ" شعری لوازمہ ایک نہایت ہی مختلف و منفرد تازہ کار تخلیقی نمائندگی کرتا ہے۔

ضخامت: ۱۲۸ صفحات۔ قیمت: چالیس روپے

رابطہ: ۲۲۳ سنگوار وارڈ مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳ (مہا)

## مختلف

احمد کمال پرواری کی شاعری اپنی بیئتی روایت تقلید کے بجائے زمین اور زندگی کے کھرے تجربات ہے۔ کمال ہمارے دور کے ان قلیل ترین ناموں میں سے جس نے پوری دیانت داری، متانت فکر اور فن کے ساتھ وہ آج کی غزل کا ایک بامعنی حوالہ ہے۔ ابھی اس کا تخلیقی سفر ہے۔ وہ پُرجوش ہے نئے کرنوں کی تلاش میں سرگرداں۔ تازہ نو بہ نو کی جستجو میں ہمہ تن سرگرم "مختلف" (۱۹۸۸ء) اولیں شعری مجموعہ۔

ضخامت: ۶۴ صفحات۔ قیمت: ۳۰ روپے

اُردو مجلس، ۲۵۲ ۔ ای شالیمار باغ۔ دہلی ۵۲ ۱۱

## انکسار

"الحمد" (۱۹۸۳ء) کے بعد مظفر ایرج کا دوسرا مجموعہ شائع ہو گیا ہے (دسمبر ۱۹۸۸ء) اس میں غزلیں اور نظمیں ایک ایسی تخلیقی کائنات کا منظر نامہ ہیں جو مختلف بہت حد تک منفرد بھی۔ یہ شاعری قاری، ماقدر اللہ سامعین اور دور بیتے ہوئے گم شدہ جہانوں کا پتہ دیتی ہے۔ اور خوش ذائقہ شعری مجموعہ جو اچھی شاعری کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے ایک تحفہ ہے۔

ضخامت: ۱۲۸ صفحات۔ قیمت: پچاس روپے

پتہ: کہکشاں، نوگام، بی پورہ، سری نگر (کشمیر)

# شاعر



# انشاؔ لکھنوی

پ: صفر ۱۱۶۶ھ / ۱۷۵۲ء — مرشد آباد

م: ۳۰ رجمادی الثانی ۱۲۳۲ھ / ۱۹ رمئی ۱۸۱۷ء — لکھنؤ



کہیں نشاط کے تیور، کہیں غموں کے نشاں
ترے سخن میں تھیں رنگینیاں عجب پنہاں
تو وہ ہے جس نے کیا استوار اردو کو
ہے آج بھی تری ممنون صرف و نحوِ زباں

تحقیق
**اعجاز صدیقی مرحوم**

تلخیص و تدوین
**افتخار امام صدیقی**

انشاء اللہ خاں نام، ابن سید حکیم میر ماشاء اللہ خاں ... تعلیم و تربیت میں قرآن مجید کے علاوہ زبانوں میں عربی، فارسی کے علاوہ دیگر علوم میں مہارت پیدا کی۔ اردو، ہندی، ... پشتو وغیرہ زبانیں بھی سیکھیں اور ان پر دسترس ... میں والد کے ساتھ فیض آباد گئے۔ ۱۷ برس ... دیوان مکمل کیا۔ اپنی ذہانت، ذکاوت اور حاضر جوابی ... شجاع الدولہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ انشاء کو ... سپہ گری میں بھی مہارت حاصل کی تھی۔ ... شاعری میں اپنے والد سے اصلاح ... ہوئے۔

دو شادیاں کی تھیں، ایک عاشوری بیگم (م: ۱۲۱۳ھ) ... بیگم تھا (م: ۱۲۳۳ھ)۔ انشاء کی ۵ ... اللہ خاں، مرادی بیگم، سلطان بیگم، سید ...

... سے دہلی آ کر شاہ عالم آفتاب کے دربار سے وابستہ ... سال سے زیادہ نہیں ان دو برسوں میں دہلی کی اہل ... انشاء کی باغ و بہار شخصیت نے اپنا ... اپنی انفرادیت تسلیم کرا لی تھی۔ اکثر شعراء ... سودا کے ایک شاگرد مرزا عظیم بیگ ... [illegible]

... لکھنؤ میں مصحفی (پ: ۱۱۶۵ھ – م: ۱۸۲۴ء) سے ... معرکے رہے۔ اسی طرح قاتل، قتیل اور راسخ سے بھی ادبی معرکے ... نواب سعادت علی خاں کی ملازمت کے زمانے میں انشاء ... سب سے بڑا بیٹا نصیر اللہ خاں ۱۸ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا ... اس صدمے کو برداشت نہ کر سکے۔ نواب صاحب کی طرف سے ... پابندیوں نے بھی انہیں توڑ دیا تھا۔ مالی پریشانیوں اور بیٹے کے غم نے ایک باکمال شاعر، ادیب، انشاء پرداز، لطیفہ گو اور ... کو ۶۷ برس کی عمر میں سمیٹ دیا۔

## تصانیفِ انشاؔ

**کلیاتِ انشاؔ** (باہتمام مولوی نور حسین، مطبع مجتبائی اردو اخبار) طبع اول ۱۲۷۱ھ – ۱۸۵۵ء، طبع دوم ۱۲۷۶ھ – ۱۸۵۹ء (مطبع نولکشور لکھنؤ) طبع سوم ۱۳۱۴ھ – ۱۸۹۶ء (مطبع نولکشور لکھنؤ)۔

**کلامِ انشاؔ** (اردو کلام مرتبہ میرزا محمد عسکری، نظر ثانی مولوی محمد رحیم فاضل دیوبند، تصحیح ڈاکٹر عبد الستار صدیقی، مطبوعہ ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد) ۱۹۵۲ء۔

**دریائے لطافت** (اس کا سال تصنیف ۱۲۲۲ھ مطابق ۱۸۰۷ء ہے۔ اس فارسی کتاب کے دو حصے ہیں، پہلا حصہ اردو صرف و نحو کے متعلق انشاء کی تصنیف ہے اور دوسرا حصہ انشاء کے دوست مرزا قتیل نے عروض اور منطق کے متعلق تحریر کیا ہے) طبع اول: (مطبع آفتاب عالم مرشد آباد) ۱۸۵۰ء، طبع دوم (مرتبہ مولوی ...) [illegible]

(اردو ترجمہ: پنڈت دتاتریہ کیفی، مطبوعہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد) ۱۹۳۵ء – طبع چہارم (اردو ترجمہ مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی) ۱۹۳۹ء – طبع پنجم (اردو ترجمہ، انجمن ترقی اردو دہلی) ۸۸

**کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان** (سال تصنیف ۱۸۰۳ء ہے۔ رسالہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۵۲ء اور ۱۸۵۵ء میں شائع ہوئی لیکن اس میں بہت سی غلطیاں رہ گئی تھیں۔ مولوی عبد الحق نے اسے تصحیح کر کے انجمن کے رسالہ اردو کے اپریل ۱۹۲۶ء کے شمارے میں شائع کیا) طبع اول: (مطبع انجمن ترقی اردو اورنگ آباد) طبع دوم ۱۹۵۵ء (انجمن ترقی اردو کراچی)۔

**سلکِ گوہر:** ۱۹۴۵ء (مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی، اسٹیٹ پریس رامپور)

**انشاؔ کی دو کہانیاں:** ۱۹۷۱ء (مرتبہ سید ... اور انتظار حسین، مطبع مجلس ترقی ادب لاہور)

**انشاؔ کا ترکی روزنامچہ** ۱۹۸۰ء (مرتبہ نعیم الدین، ترقی اردو بیورو دہلی۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے ... پہلے ایک تعارفی مضمون "نیا دور" (لکھنؤ) اپریل ۱۹۶۰ء کے شمارے میں شائع کیا۔)

**مطر الرام فی شرح قصیدہ طور الکلام:** (... ا س کتاب ... کتب خانے ... ایک تعارفی مضمون ... [illegible]

# فکر امروز



".....ہندوستان پر اس وقت سیاست غالب ہے۔ شاعری اور سیاست دو مختلف چیزیں ہیں۔ سیاست ہمیں صرف عمرانی اور مدنی انتظام کا درس دیتی ہے لیکن وہ ہماری انسانی اور روحانی قوتوں کو بروئے کار لانے میں معاون نہیں ہوتی۔ لیکن شاعر کا نظریۂ حیات کچھ اور ہے۔ جب سیاست اپنا کام ختم کر چکتی ہے تو شاعر کا کام شروع ہوتا ہے۔ سیاست ایک ہیولیٰ بناتی ہے اور شاعر اس میں تناسب و توازن سے جان ڈالتا ہے۔ شاعر، تصویر کا روشن پہلو اپنی شاعری میں نمایاں کرتا ہے۔ وہ ملکی و قومی زندگی کی دشوار گذار منزلوں کی کارفرمائی سے ملک کو اطلاع دیتا ہے۔ جس منزل کی جستجو میں قافلے صدیوں بھٹکتے رہے ہیں شاعر ان منزلوں پر اپنے خیال کی شمعیں روشن کر کے رہروانِ منزل کی رہنمائی کرتا ہے۔ انسانیت، قومیت، عمرانیت اور مدنیت کے لاینحل عقدوں کو اپنے ناخن فکر سے کھولتا ہے۔ ان کا حل بتاتا ہے۔ قوم و ملک کے احساسات کو ابھارتا ہے۔ انھیں عزم و ہمت اور استقلال و ثبات کا درس دیتا ہے......"

عہد جدید کی تعمیر و تہذیب میں ادب اردو کا مکمل حصہ
مطبوعہ ماہنامہ "کنول" (آگرہ) ستمبر ۱۹۳۶ء

**سیماب اکبرآبادی**



# شاعر

اشاعت کا ۶۰ واں سال

بہ یادگار اعجاز صدیقی

ماہنامہ

جلد — ۶۰
شمارہ — ۹-۱۰
نمبر ۳۵۹۹۰۳

مدیر
افتخار امام صدیقی

●

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت :- ۵ روپے

زر سالانہ ◆ لائبریریوں سے
۵۰ روپے ◆ ۶۰ روپے

تاعمر خریداری ◆ معاونین سے ◆ ممالک غیر سے
۱۰۰۰ روپے ◆ ۱۰۰ روپے ◆ ۳۵۰ روپے

نامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب، بمبئی سینٹرل پوسٹ آفس، پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶، بمبئی ۴۰۰۰۰۸

# شاعر کے خصوصی شمارے، خاص نمبر اور مکمل فائل

## محدود تعداد میں دستیاب ہیں

شاعر نے ۱۹۷۵ء سے مقتدر ادبا و شعراء پر گوشے شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ یہ خصوصی شمارے کسی خاص نمبر سے کم نہیں۔ آج بھی ان شماروں کی قدر و منزلت برقرار ہے۔ مدتوں سے یہ شمارے دستیاب نہیں تھے۔ شاعر کے خاص نمبروں کی اپنی ایک تاریخی روایت ہے۔ کسی بھی قیمت پر ان نمبروں کی مانگ بدستور رہتی ہے۔ شاعر کے مکمل فائلوں کا مطالبہ و اصرار بھی شدید تر ہے۔ ۱۹۷۵ء تا ۱۹۸۷ء کے بعض خصوصی شمارے خاص نمبر اور مکمل فائل اب محدود تعداد میں دستیاب ہیں۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| گوشۂ غلام ربانی تاباں ۱۹۷۵ء | گوشۂ حسن الدین احمد ۱۹۷۶ء | گوشۂ عبدالعلیم نامی ۱۹۷۸ء | گوشۂ کالی داس گپتا رضا ۱۹۸۳ء |
| 〃 ابراہیم یوسف 〃 | 〃 سید حامد حسین 〃 | 〃 کوثر چاندپوری 〃 | 〃 اختر سعید خاں ۱۹۸۴ء |
| 〃 جوگندر پال 〃 | 〃 صالحہ عابد حسین 〃 | 〃 پریم وار برٹنی 〃 | 〃 عثمان عارف نقشبندی 〃 |
| 〃 راجندر سنگھ بیدی 〃 | 〃 سیماب اکبرآبادی 〃 | 〃 اظہر افسر ۱۹۷۹ء | 〃 حامدی کاشمیری ۱۹۸۶ء |
| 〃 اختر الایمان 〃 | 〃 جیلانی بانو ۱۹۷۷ء | 〃 سلام سندیلوی 〃 | انشائیہ پر خصوصی شمارہ 〃 |
| 〃 شمیم کرہانی 〃 | 〃 رام لعل ۱۹۷۸ء | 〃 میکش اکبرآبادی 〃 | اردو کی نئی بستیاں 〃 |
| 〃 عمیق حنفی ۱۹۷۶ء | 〃 قرۃ العین حیدر 〃 | 〃 گیان چند جین ۱۹۸۱ء | **فی شمارہ صرف ۵ روپے** |
| 〃 عصمت چغتائی 〃 | 〃 جاں نثار اختر 〃 | 〃 بشیر بدر ۱۹۸۳ء | |

## شاعر کے مکمل فائل

| | | |
|---|---|---|
| ۱۹۷۵ء | قیمت | ۵۰ روپے |
| ۱۹۷۶ء | 〃 | ۵۰ روپے |
| ۱۹۷۷ء | 〃 | ۸۰ روپے |
| [مع کرشن چندر نمبر ۲ اور ہم عصر اردو ادب نمبر] | | |
| ۱۹۷۸ء | 〃 | ۵۰ روپے |
| ۱۹۷۹ء | 〃 | ۵۰ روپے |
| ۱۹۸۰ء | 〃 | ۷۰ روپے |
| [مع خلیل الرحمان اعظمی نمبر ۸۰ء] | | |
| ۱۹۸۱ء | 〃 | ۶۰ روپے |
| [مع ایک شمارہ ۱۹۸۰ء کے نام اور افسانہ نمبر ۸۱ء] | | |
| ۱۹۸۲ء | 〃 | ۵۰ روپے |
| ۱۹۸۳ء | 〃 | ۸۰ روپے |
| [مع نثری نظم اور آزاد غزل نمبر ۸۳] | | |
| ۱۹۸۴ء | 〃 | ۵۰ روپے |
| ۱۹۸۵ء | 〃 | ۱۰۰ روپے |
| [مع گوشۂ یاس یگانہ چنگیزی اور آفسیٹ کا افتتاحی شمارہ] | | |
| ۱۹۸۶ء | 〃 | ۵۰ روپے |
| ۱۹۸۷ء | 〃 | ۵۰ روپے |

## شاعر کے کمیاب اور نایاب خاص نمبر

| | |
|---|---|
| خاص نمبر ۱۹۶۳ء | ۱۵ روپے |
| خاص نمبر ۱۹۶۵ء | ۱۰ روپے |
| افسانہ و ڈرامہ نمبر ۱۹۶۸ء | ۱۵ روپے |
| گاندھی نمبر ۱۹۶۹ء | ۱۵ روپے |
| ناولٹ نمبر ۱۹۷۱ء [۱۷ ناولٹ] | ۵۰ روپے |
| سالنامہ ۱۹۷۲ء | ۲۰ روپے |
| قومی یکجہتی نمبر ۱۹۷۴ء | ۲۰ روپے |
| ایک شمارہ ۱۹۸۰ء کے نام | ۱۵ روپے |
| افسانہ نمبر ۱۹۸۱ء | ۱۲ روپے |
| ہم عصر اردو ادب نمبر ۱۹۷۷ء | ۵۰ روپے |
| نثری نظم اور آزاد غزل نمبر ۱۹۸۳ء | ۵۰ روپے |
| آفسیٹ کا افتتاحی شمارہ ۱۹۸۵ء | ۱۱ روپے |
| یاس یگانہ چنگیزی نمبر مع ترانہ | ۲۰ روپے |

نوٹ * گوشہ والے شمارے، خاص نمبر اور مکمل فائل کی تعداد چونکہ محدود ہے اس لئے پہلے آرڈر وصول ہونے پر ان کی تعمیل کر دی جائے گی۔ محصول ڈاک، رجسٹری خرچ علاحدہ ادا کرنا ہوگا۔ آرڈر آنے پر مطلوبہ شمارے وی پی سے بھیجے جائیں گے گوشہ والے شماروں کیلئے فی شمارہ ۵ روپے کے حساب سے رقم بذریعہ منی آرڈر بھی بھیجی جا سکتی ہے۔ ایجنٹ حضرات زحمت نہ کریں۔

# ترتیب

## مقالات



## نظمیں



## کہانیاں



## غزلیں



## ناولٹ



## خودنوشت



## بساطِ سخن



## آثارِ لفظ



## جرعات



## نقد و نظر



## مکتوبات




شمارہ نمبر ۱۰-۹ ❁ جلد ۔ ۶۰
۱۹۸۹ء


# اردو تحریک کو عوامی تحریک بنائیے

ہم لوگ کل ہند اردو کانفرنسیں، صوبائی اردو کانفرنسیں، تعلیمی کانفرنسیں اور جانے کیا کیا کچھ نمائشی طور پر تو کرتے رہتے ہیں لیکن کیا ہم لوگوں نے منظم طور پر یہ طے کیا کہ پورے ہندوستان میں اردو تحریک کو عوامی تحریک بنانے کے لیے بنیادی عملی کاموں کا تعین اور اس کے نفاذ کی صورتیں کیا ہوں؟ مرکزی اور صوبائی کمیٹیاں اور ذیلی کمیٹیاں ان کاموں کو عملی شکل دینے اور رضاکارانہ طور پر ان کو جاری رکھنے کے لیے مقرر کی گئی ہوں؟ اردو کے مسائل کا ذکر اور مشوروں کے بجائے کوئی زبردست اجتماعی تحریک چلائی گئی ہو۔

ریاستوں میں دوسری سرکاری زبان بنائے جانے کے مطالبہ سے زیادہ ضروری ہے کہ ہم تمام اردو والے پوری یکجہتی اور اکائی کے ساتھ زندگی کے ہر شعبے میں اردو کو اپنے طور پر شامل کرنے کی کوششیں کریں، عام اردو داں طبقہ کا اعتماد حاصل کریں، انھیں اپنی تحریک میں شامل کریں اس طرح ہمارے مطالبات ازخود تسلیم کیے جائیں گے۔

اس تلخ حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیئے کہ ہم اردو والوں کے پاس کوئی عملی پروگرام نہیں ہے، کوئی اجتماعی خاکہ نہیں ہے۔ شخصی یا گروہی سطح پر جو کام بھی ہم کر رہے ہیں اس سے اردو کے مسائل اگر حل بھی ہوتے ہیں تو وہ مؤثر نہیں ہو پا رہے ہیں۔ اردو اکاڈمیوں، اداروں، انجمنوں، ترقی اردو بورڈ اور ایسے ہی دیگر تمام وہ ادارے جو سرکاری یا غیر سرکاری ہیں، اردو کے نام پر ہر طرح کی امداد لیتے رہتے ہیں، ان سے وابستہ افراد کو سوچنا چاہیئے کہ کہیں ہم خوش فہمیوں میں مبتلا تو نہیں؟ اردو کی خدمت کا دعویٰ کرنے والے اردو کے مصروف ترین لوگوں کو اب یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ مشاعرے، سمینارز، کانفرنسیں، جلسے وغیرہ اپنا وقار و معیار گم کر چکے ہیں۔ اب ان ذرائعوں سے اردو کی خدمت نہیں ہونے والی۔ اب ان میں نئی روح سمونے کی ضرورت ہے۔ ضرورت ہے کہ اب بے جان عوام کو ان اجتماعات میں پوری زندگی کے ساتھ مدعو کیا جائے، وہ تفریح یا ضرورت کے لیے نہیں بلکہ اردو زبان کے لیے اس کی ترویج و اشاعت کے لیے جمع ہوں۔

اردو کے با اختیار لوگ اپنے اپنے دائروں اور ذہنی تعصبات سے باہر آئیں اور اردو کے لیے کوئی ٹھوس پروگرام مرتب کیا جائے۔ پورے ہندوستان میں اس کو عملی طور پر نافذ کیا جا سکے۔

[illegible]

## قاضی عبدالودود بنام کالی داس گپتا رضا

قاضی عبدالودود [پ: ۱۸۹۶ء — م: ۱۹۸۴ء] کا ایک اہم خط جو ان کے مزاج و معیار کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

بشکریہ کالی داس گپتا رضا بمبئی

اب بھی آدمی کو بنا دیا۔ اگر ڈاکٹر [illegible] [illegible]
[illegible] نتائج [illegible]۔

ڈاکٹر [illegible] [illegible] اردو [illegible]
[illegible]
[illegible]۔

[illegible]
[illegible]

[illegible]

قاضی عبدالودود

[illegible]
[illegible]
[illegible]

# RAZA LIBRARY

RAMPUR U.P. (INDIA)

Ref. No. ________ Dated ________ 196

اردو میں بارہ سال کے اندر جو نوجوان لکھنے والے تحقیق و تنقید کی طرف آئے ہیں، اُن میں (جناب ڈاکٹر) نثار احمد فاروقی صاحب کا نام سرِ فہرست ہے۔ اُنھوں نے اپنی تحریروں سے مشرقی علم و ادب میں دلچسپی رکھنے والوں کو خاصا محظوظ کیا ہے۔

تحقیق و تنقید کے لیے وسعتِ مطالعہ، حسنِ ذوق اور محنت کی سخت ضرورت ہے، اور اگر ان میں سے کسی ایک چیز کی بھی کمی ہو، تو تحریر افادیت و جاذبیت سے محروم ہو جاتی ہے۔ فاروقی صاحب جدید و قدیم دونوں قسم کی تعلیم سے بہرہ ور ہیں، اور ان کے سامنے [illegible] کا ہزار سالہ تصنیفی معیار موجود ہے۔ اس لیے اُنھوں نے پوری کوشش کی ہے کہ جس عنوان پر بھی لکھیں اس کا حق ادا کریں۔ ان کے مقالات پڑھنے والے پر اُن کی تحقیق و تنقید کی صلاحیتوں کا اچھا تاثر قائم ہوتا ہے۔

زیرِ نظر مجموعے میں مختلف النوع موضوعوں پر مقالات شامل ہیں، جن سے مقالہ نگار کی وسعت و تنوعِ ذوق کا پتا چلتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مجموعۂ مقالات بھی اربابِ تحقیق و تنقید میں پسند کیا جائے گا۔

امتیاز علی عرشی

امتیاز علی خاں عرشی بنام نثار احمد فاروقی

مولانا عرشی پ: ۸ر دسمبر ۱۹۰۴ء م: ۲۵ر فروری ۱۹۸۱ء نے اپنے اس مکتوب میں نثار احمد فاروقی کی کتاب "دید و دریافت" [مطبوعہ ۱۹۶۴ء] کا ذکر کیا ہے۔

[بشکریہ: نثار احمد فاروقی دہلی]



## حسن نعیم

◆

ہر سمت دیکھتا ہوں کسی اور بام سے
صحرا ہے لالہ زار جنوں کے مقام سے

پڑھتا ہوں جو رقم ہے خطوط نگاہ میں
رکھتا نہیں غرض میں لبوں کے پیام سے

جرأت کہاں کہ اپنا پتہ تک بتا سکوں
جیتا ہوں اپنے ملک میں اوروں کے نام سے

رہتا تھا اک "فقیر" جو میری گلی کے بیچ
پردیس جا رہا ہے حکومت کے کام سے

جاؤ پلٹ کے دشت کراچی کے گھر نعیم
ہو نہ کوئی زہر غزالوں کے جام سے

◆

شب کی محفل میں ہے گم ماہ تمنا کب سے
ان ستاروں سے پریشان ہے دنیا کب سے

آ مرے پاس! مرے جذب کا محور بن جا
میں بھی اک غم سے ہوں آزردہ و تنہا کب سے

روز ایک صادق و منصف کو سزا ملتی ہے
روز ہوتا ہے یہی کھیل تماشہ کب سے

اب تو اس مہدئ موعود کو ظاہر کر دے
منتظر جن کی قیادت کا ہے بندہ کب سے

نہر کی سیر کراؤ، اسے اپنا کر لو
مست و آوارہ پھرا کرتا ہے دریا کب سے

◆

میں جنم جنم کا انیس ہوں، کسی طور دل میں بسا مجھے
کوئی رنج ہے تو عیاں نہ ہو، کوئی داغ ہے نو دکھا مجھے

یہ تمام سبزہ و آبجو، یہ تمام خیمۂ رنگ و بو
ترے جس خیال کا عکس ہیں، وہ خیال کر دے عطا

جنھیں حرف جاں کی خبر نہیں، وہ پڑھانے آئے کتاب جا
جنھیں کوئی علم و وفا نہ تھا، وہ سکھانے آئے وفا مجھے

میں نیاز مند جنوں سہی، مجھے عقل سے بھی ہے واسطہ
کسی خواب کی نہ جھلک دکھا، ترے پاس کیا ہے دکھا

تری گفتگو سے گماں ہوا، کوئی بات مری بھلی لگی
میں نعیم ہوں کہ حسن ہوں اب یہی بات پہلے بتا مجھے

● ٦، سی/ شالیمار، ایس وی۔ روڈ نونگروںگر دھیسر (ایسٹ)، ممبئی۔ ٦٨



نثار احمد فاروقی
پوسٹ بکس نمبر ۹۷۲۳، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

# قاضی عبدالودود اور امتیاز علی عرشی

قاضی عبدالودود اور مولانا امتیاز علی عرشی دونوں علم و تحقیق کے میدان میں بلند قامت اور منفرد شخصیتیں ہیں اختلافِ طبائع کے باوجود ان میں بعض خصوصیات مشترک بھی ہیں۔ قاضی صاحب کی نظر کلاسیکی اردو ادب پر بہت گہری ہے، وہ فارسی ادب کا بھی مطالعہ رکھتے ہیں، عربی کی انھیں تھوڑی سی واقفیت تھی، انگریزی ادبیات کا مطالعہ وسیع تھا، انھوں نے ابتدائی تعلیم دیسی انداز کی حاصل کی تھی پھر ۱۹۲۳ء میں انگلستان چلے گئے اور کیمبرج میں پڑھا، وہاں سات سال رہ کر آئے کل وقتی طور پر مطالعہ و تحقیق میں منہمک ہوگئے۔ انھوں نے جن موضوعات پر کام کیے ان میں اردو شعر و ادب، تذکرہ نگاری، لغت نویسی، آخر عہد مغلیہ کی تاریخ اور شعرا میں میر، سودا، انشا، مصحفی، غالب اور شاد عظیم آبادی کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ قاضی صاحب نے مختلف دانش گاہوں میں ڈاکٹریٹ کے لیے منظور کیے جانے والے بعض مقالات کا بھی تنقیدی جائزہ لیا اپنے عہد کے چند سر برآوردہ مصنفوں کی کتابوں پر بہت دقت نظر کے ساتھ عالمانہ تبصرے کیے اور تنقید و تحقیق میں اپنے اختیار کردہ معیار پر سختی سے کاربند رہے۔ انھوں نے بعض متون بھی مدون کیے جن میں قطعاتِ دلدار، تذکرہ مسرت افزا، قاطع برہان و رسائل متعلقہ، دیوانِ جوشش وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ بہار کی قدیم ادبی شخصیات کو روشناس کرانے میں بھی قاضی صاحب کی کوشش قابلِ اعتنا ہے۔ انھوں نے مارچ ۱۹۳۶ء میں رسالہ معیار بھی جاری کیا یہ جولائی ۱۹۳۶ء تک ہی شائع ہوسکا پھر بند ہوگیا۔ اس کے بعد معاصر دنیائے تحقیق میں ایک منفرد حیثیت لے کر ابھرا اور اس نے بھی خالص علمی و تحقیقی رسالے کے لیے ایک مثالی نمونہ پیش کیا۔

مولانا امتیاز علی عرشی کی تعلیم تمام تر مشرقی انداز پر ہوئی انھوں نے کسی کالج یا یونیورسٹی میں نہیں پڑھا۔ وہ عربی و فارسی بہت اچھی جانتے تھے۔ انگریزی سے بھی انھوں نے خاصی واقفیت پیدا کر لی تھی۔ ابتدا میں سنگر مشین کمپنی کی کوئی ملازمت کی تھی پھر ندوۃ العلماء کے سفیر بن کر بھی کچھ دنوں کام کیا ۱۹۳۲ء میں وہ کتب خانہ سرکاری ریاست رام پور کے لائبریرین مقرر ہوئے۔ یہاں سے ان کے علمی و تحقیقی سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ قاضی صاحب نے انگلستان کے کتب خانوں سے بھی استفادہ کیا تھا، پھر انھیں کتب خانہ خدا بخش جیسا مشرقی علوم کا خزانہ مل گیا جہاں ان کا بیشتر وقت مطالعہ و تحقیق میں گزرتا تھا۔ عرشی صاحب کو کتب خانہ رام پور سے پورا پورا فائدہ پہنچا۔ اس سے ملازمت کا تعلق تھا اس لیے وہ پابندی سے صبح دس بجے سے شام کے چار پانچ بجے تک اس کتب خانے سے مسلسل استفادہ کرتے تھے جس زمانے میں کرنل بشیر حسین زیدی رام پور کے چیف منسٹر تھے اس کتب خانے سے کتابوں کی اشاعت کی ایک اسکیم بنائی گئی جس کے تحت متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔

مولانا عرشی کا خاص ذوق نوادر کا تعارف کرانے اور ان کے متون ایڈٹ کرنے میں تھا۔ وہ تفسیر قرآن، حدیث، تاریخ، تذکرہ، سفرنامہ، دواوین، زبان اور لغت ان سب موضوعات میں دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے تفسیر سفیان ثوری کے چند اوراق اتنی دیدہ ریزی سے ایڈٹ کیے ہیں کہ مجلۃ المجمع العلمی العراقی میں تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر بہجت نے ان حواشی کو "مدہش" لکھا تھا۔ انھوں نے کنور پریم کشور فراقی کا روزنامچہ ایڈٹ کیا، مادرات شاہی کے نام سے شاہ عالم کا ہندی دیوان پیش کیا، انشاء اللہ خاں انشاؔ کی داستان رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی شائع کی، اردو زبان میں پشتو کے الفاظ کا جائزہ لیا، غالب کی فرہنگ مرتب کی یعنی غالب نے اپنی تحریروں میں جہاں جہاں کسی لفظ کے معنی یا استقاق سے بحث کی ہے ایسی سب عبارتیں یکجا کرکے انھیں کتاب کی شکل دے دی۔ تاریخ محمدی کی ایک جلد ایڈٹ کی اور اس پر حواشی لکھے تذکرہ دستور الفصاحت انھوں نے جس انداز سے پیش کیا وہ اردو میں تذکرے کی تدوین کا اولین نمونہ تھا۔ محمود شیرانی نے مجموعہ نغز کا متن تو بہت احتیاط سے تیار کر دیا ہے مگر اس پر حواشی انھوں نے بھی نہیں لکھے تھے۔

مگر عرشی صاحب کے وہ کام جنھوں نے ایک محقق اور مدوّن کی حیثیت سے انھیں شہرت عطا کی مرزا غالب ہی سے متعلق ہیں۔ انھوں نے مرزا غالب کا اپنے ہی کلام کا وہ انتخاب شائع کیا جو غالب نے نواب رام پور کو بھیجا تھا اور نوابان رام پور کے نام غالب کے خطوط ایک مفصل مقدمہ اور ضروری حواشی کے ساتھ شائع کیے۔ یہ دو کتابیں انتخاب غالب اور مکاتیب غالب اردو میں نہایت حسین اور دلکش طباعت کا نمونہ بھی تھیں۔ پھر انھوں نے مرزا غالب کا تمام اردو کلام جمع کیا جو "دیوان غالب نسخہ عرشی" کے نام سے معروف ہے اور یہ بھی ترتیب و تدوین کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

باقاعدہ مغربی تعلیم نہ ہونے کے باوجود عرشی صاحب مغربی اسکالروں کے معیار تحقیق سے باخبر تھے اور اپنی تالیفات میں ان پر عمل بھی کرتے تھے۔ قاضی صاحب کے مزاج کے برخلاف عرشی صاحب نے کسی معاصر کی تحریر پر کڑی نکتہ چینی نہیں کی۔ اگر انھیں کسی کی تردید بھی کرنا ہوتی تھی تو نہایت ملائم الفاظ اور پورے مشرقی اخلاق کو ملحوظ رکھ کر کرتے تھے۔ ان کی تحریروں پر جن حضرات نے تنقید کی اس کا عرشی صاحب نے کبھی جواب نہیں دیا۔ صرف مالک رام کے تبصرہ "دیوان غالب نسخہ عرشی" پر اپنا استدراک لکھا تھا۔ عرشی صاحب ایک وقت میں کئی مختلف موضوعات پر کام کرتے تھے۔ اور عربی مصادر سے بھی خوب فائدہ اٹھاتے تھے۔ اُن کے مطالعہ و تحقیق کے بعض میدان ایسے تھے جن میں قاضی صاحب کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

مولانا عرشی کے مدوّن کیے ہوئے متون یقیناً اردو میں مثالی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی ایڈیٹنگ کا معیار قاضی صاحب کی تدوین سے بہتر ہے قاضی صاحب اور عرشی صاحب کا باہم تعارف کب ہوا یہ میں قطعیت سے نہیں بتا سکتا مگر اپریل ۱۹۳۶ء کے "معیار" کی آخری سطروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عرشی صاحب کے کام سے باخبر تھے۔ انھوں نے "عالم ادب" عنوان کے تحت یہ اطلاع چھاپی ہے۔

> " رام پور اور غالب۔ مرزا غالب نے نوابان رام پور اور متوسلین ریاست کو جو خطوط لکھے تھے وہ محفوظ ہیں۔ اور ریاست کی جانب سے ان کا مجموعہ جلد شائع ہونے والا ہے۔ امتیاز علی عرشی منتظم کتب خانہ ریاست خطوط کے جمع و ترتیب کا کام انجام دے رہے ہیں۔" (ص ۱۳۶)

مکاتیب غالب کا پہلا ایڈیشن مطبع قیمہ بمبئی سے ۱۹۳۷ء میں طبع ہوا اس میں ۸۳ صفحات کا مقدمہ اور ۳۱۵ متن کے صفحات تھے۔ اسی کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۳ء میں مطبع سرکاری رام پور سے چھپا اس میں ۴۹۲ صفحات تھے تیسرا اور چوتھا ایڈیشن بالترتیب ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۶ء میں ناظم برقی پریس رام پور سے شائع ہوا اور ہر بار اس میں کچھ اضافے ہوتے رہے۔

قاضی عبدالودود نے "معاصر" جلد ۵ شمارہ ۲ (مارچ ۱۹۴۳ء) میں مکاتیب غالب پر تبصرہ کیا ہے اس کی دوسری قسط معاصر جلد ۵ شمارہ ۵/۶ (مئی-جون ۱۹۴۳ء) میں آتی ہے۔ تبصرہ خاصا طویل ہے اور اس کے آخر میں قاضی صاحب نے مولانا عرشی کو ان الفاظ میں داد دی ہے:

> " مکاتیب غالب اردو کی ان چند کتابوں میں ہے جن کا حسن ترتیب داد طلب ہے۔ جناب عرشی مرتب کے فرائض سے اچھی طرح واقف ہیں اور انھوں نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے فرائض کو ادا کیا ہے۔ ریاست رام پور نے مکاتیب غالب اور انتخاب غالب کی اشاعت سے اس بے اعتنائی کی جو کلب علی خان نے غالب کے ساتھ روا رکھی تھی باحسن الوجوہ تلافی کر دی ہے۔"

لیکن ان کلمات تحسین سے پہلے انھوں نے مکاتیب غالب کا تنقیدی جائزہ بڑی تفصیل سے لیا ہے اور اس کے مختلف نقائص کی طرف توجہ دلائی ہے۔ مثلاً:

(۱) عرشی صاحب نے مقدمہ میں لکھا تھا کہ نواب یوسف علی خاں نے غالب سے فارسی پڑھی قاضی صاحب نے اسے مشتبہ بتایا۔

(۲) عرشی نے اس سے انکار کیا کہ یوسف علی خاں ناظم نے کبھی مومن سے بھی اصلاح لی تھی۔ قاضی صاحب کا کہنا ہے کہ "مومن سے تلمذ کا ذکر انتخاب یادگار میں ہے اور یہ تذکرہ نواب کلب علی خاں کے حکم سے لکھا گیا ہے۔ امیر کے قول سے انکار دراصل نواب کلب علی خاں کے قول سے انکار ہے۔"

(۳) عرشی نے نواب کے شاگردِ مظفر علی اسیر ہونے سے بھی انکار کیا ہے۔ قاضی صاحب کہتے ہیں کہ "گو وہ یہ مانتے ہیں کہ نواب کے آخری کلام میں لکھنویت پائی جاتی ہے۔" (دیباچہ ص ۶۸)

(۴) عرشی نے لکھا کہ غالب کی پنشن جو اپریل ۱۸۶۰ء میں جاری ہوئی یہ نواب کی سفارش کا اثر تھا قاضی نے یوسف مرزا کے نام غالب کے خط کی یہ عبارت پیش کی ہے۔

"والئ رام پور کو اس پنشن کے اجرا میں کچھ دخل نہیں۔ بہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام"

اور پوچھتے ہیں کہ غالب کا قسمیہ بیان کیوں غلط سمجھا جائے؟

(۵) قاضی صاحب نے مولانا عرشی کے اس بیان کی تردید کی ہے کہ زین العابدین عارف مرزا غالب اور امراؤ بیگم کے لے پالک تھے اور اس خیال کو ماننے سے بھی انکار کیا ہے کہ غالب کے گھر میں باقر علی خاں اور حسین علی خاں کی حیثیتیں مختلف تھیں۔

(۶) عرشی نے لکھا تھا کہ مرزا غالب کی خواہش تھی کہ بعد مرگ رام پور میں دفن کیا جاؤں۔ بقول قاضی "اس کی بنیاد یہ ہے کہ مرزا نے حسین مرزا کو لکھا تھا: رام پور زندگی میں میرا مسکن اور بعد مرگ میرا مدفن ہو گیا۔" (اردوئے معلی ۱۰۳) لیکن قاضی صاحب کا خیال ہے کہ "اس کا مطلب محض اتنا ہے کہ اب رام پور کے سوا کہیں ٹھکانا نہیں۔"

(۷) عرشی صاحب نے غالب کے طرز انشا پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا کہ "میرزا صاحب کی جدید طرز انشا بادشاہ تو بادشاہ اس عہد کے کسی ادیب کو پسندیدہ نہ تھی۔"

قاضی صاحب کہتے ہیں کہ "اس دعوے کا کہ بادشاہ غالب کی طرز انشا کو ناپسند کرتے تھے کوئی ثبوت موجود نہیں۔ میرزا نے مہر نیم روز جس طرز میں لکھی ہے وہ ان کے لیے نئی نہ تھی پہلے سے بھی وہ اس طرز میں لکھتے آئے تھے۔ اگر بادشاہ کو یہ طرز ناپسند تھی تو وہ میرزا کو تاریخ لکھنے کا حکم نہ دیتے۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ مرزا کی طرز انشا ان کے معاصر ادیبوں میں کسی کو پسند نہ تھی۔"

(۸) میرزا غالب نے اردو میں خطوط نویسی کا آغاز کب کیا اس موضوع پر بھی قاضی نے عرشی کے نتائج سے اختلاف کیا ہے ان کا خیال ہے کہ مرزا اگست ۱۸۴۸ء سے بھی پہلے سے اردو میں خط لکھتے تھے۔

(۹) جہاں عرشی نے غالب کے اسلوب نثر پر اظہار خیال کیا ہے، بعض نکات سے قاضی نے اختلاف کیا ہے۔ عرشی کا ایک فقرہ مبہم تھا، قاضی نے لکھا ہے "میرزا کی حیات ادبی کی بقا کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا مطلب میری سمجھ میں نہ آیا۔"

(۱۰) جس موضوع پر قاضی صاحب قلم اٹھاتے ہیں اس کے تمام مواد پر ان کی گہری نگاہ رہتی ہے۔ مولانا عرشی نے مکاتیب غالب میں مرزا غالب کے خطوط سے دو اقتباس دیے ہیں (ص ۱۳۵ اور ۱۳۶) (یہ دونوں یادگار غالب سے لیے گئے تھے اور اس کا حوالہ نہیں تھا) ایک خط میں ایک دوست کی لڑکی سے خطاب ہے اور دوسرے میں میرزا کی پھپھی کے انتقال کا ذکر ہے۔ قاضی نے لکھا کہ "اردوئے معلی اور عود ہندی میں یہ اقتباسات نہیں ملتے۔ جناب عرشی کو بتانا چاہیئے تھا کہ ان کا ماخذ کیا ہے؟"

(۱۱) عرشی صاحب نے مقدمہ میں لکھا کہ ڈاکیے نے غالب سے انعام طلب کیا، قاضی نے اس پر بھی گرفت کی اور کہا کہ غالب کے خط میں "ایک لفظ ایسا نہیں جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکے کہ ڈاکیے نے انعام طلب کیا تھا۔"

(۱۲) ایک موقع پر قاضی نے زبان و بیان کی گرفت بھی کی ہے۔ عرشی صاحب نے "بے دغائی" کا لفظ استعمال کیا تھا۔ قاضی نے کہا کہ یہ ٹکسال باہر ہے اور عرشی صاحب کے طرز تحریر کے بارے میں لکھا ہے کہ "کہیں کہیں درباری اثر بھی نمایاں ہے۔"

معاصر حصہ ۹ میں قاضی صاحب نے وقائع عالم شاہی پر تبصرہ کیا ہے (ص ۱۴۵ تا ۱۵۱) قاضی صاحب کو عرشی کے اس قول سے اتفاق نہیں ہے کہ پریم کشور فراقی "شاہ عالم کا خاصا معتقد نظر آتا ہے۔" اپنے قول کی تائید میں انھوں نے مثالیں دی ہیں۔ اور لکھا ہے کہ معاملہ برعکس ہے۔

مقدمہ کے بعض بیانات سے اختلاف کیا ہے اور عبارت کی گرفت بھی کی ہے۔ عرشی نے "من شال کہنہ دارم" کا لفظی ترجمہ کر دیا تھا کہ میرے پاس ایک پرانی شال ہے۔ قاضی نے لکھا یہ محاورہ ہے جس سے عبارت افلاس و تنگدستی مراد ہے۔

(۲) عرشی نے لکھا تھا کہ "فراقی کی تربیت حسب رواج زمانہ اعلیٰ درجے کی ہوئی تھی اس لیے وہ جواں ہوا تو حسین، خلیق نکلا۔"

قاضی صاحب کہتے ہیں کہ اعلیٰ تعلیم و تربیت پانے اور حسین ہونے میں کیا تعلق ہے؟

(۳) عرشی نے فراق کو خوشگو اور بسیار گو لکھا ہے۔ قاضی نے دونوں باتوں سے اختلاف کیا ہے اور دلائل پیش کیے ہیں۔

(۴) روزنامچہ فراقی کے بعض حواشی کے بارے میں قاضی کا کہنا ہے کہ قطعاً غیر ضروری ہیں۔

(۵) محمد علی خاں صاحب تاریخ مظفری نے شاہ عالم سے متعلق ایک کتاب لکھی تھی جس کا ذکر سفینۂ ہندی میں ہے۔ جناب عرشی کا یہ گمان کہ کاتب نے غلام علی خاں کی جگہ محمد علی خاں کر دیا ہے، صحیح نہیں۔

(۶) دارالشکوہ کے بارے میں عرشی نے لکھا کہ "قیود مذہب سے آزاد تھا" قاضی نے اس سے اختلاف کیا ہے۔

یہ کتاب ٹائپ میں چھپی تھی اور اس میں ایک غلط نامہ بھی تھا، مگر قاضی کا کہنا ہے کہ ایسے فاحش اغلاط موجود ہیں جو غلط نامے میں نظر انداز ہو گئے ہیں۔

قاضی نے عرشی کی دوسری کتابوں پر بھی تبصرے کیے ہیں مگر ان کو ہم نے اختصار ملحوظ رکھتے ہوئے نظر انداز کر دیا ہے۔ تبصروں میں قاضی نے کہیں طنز یا تیکھے پن کا مظاہرہ نہیں کیا ہے۔ نہایت سادہ منطقی اور مدلل انداز میں تنقید و تبصرہ کا حق ادا کیا ہے۔ عرشی کے بارے میں قاضی کے کلمات تحسین "تبصرۂ انتخاب غالب" کے ذیل میں بیان ہو چکے ہیں۔ خود عرشی ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے یہ ان کے ایک خط موسومہ کلیم الدین احمد سے معلوم ہو سکتا ہے جو معاصر کے قاضی عبدالودود نمبر میں شامل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> " میں محب کرم قاضی عبدالودود صاحب کو اردو زبان کے تمام تحقیقی کام کرنے والوں کا راہنما جانتا ہوں اور ادب کی تنقید کرنے میں انھیں یکتا مانتا ہوں۔ ان کے بارے میں میری یہ رائے برسوں پہلے کی ہے جس میں آج تک مجھے ترمیم کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی ہے۔" (معاصر اگست ۱۹۷۶)

بقیہ صفحہ ۲۴۔ بچوں کا ادب اور کہانی کی تیکنک

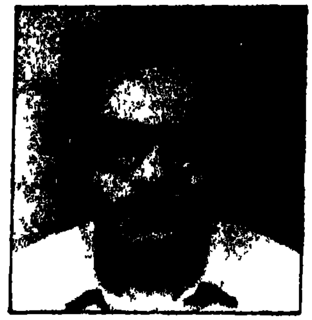
کو نیچے تک پہنچا ماہے۔

(۷) جدید کہانیاں :- جدید کہانیوں کے زمرے میں تمثیلی کہانیاں، جانوروں اور پرندوں کی کہانیاں، جنگلات، سمندروں اور پہاڑوں سے متعلق مہماتی اور سائنسی کہانیاں نیز فنطاسیے آتے ہیں۔ بچے پریوں کی کہانی کے بعد اگر کسی دوسری طرز کی کہانیوں میں دلچسپی لیتے ہیں تو وہ مہماتی اور سائنسی کہانیاں ہیں۔ بچے کا کائنات سے اوّلین رابطہ کہانیوں ہی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ پرندوں کی کہانیاں اسے یقین دلاتی ہیں کہ اس کے گرد کیا کچھ ہے اور یہ سب کتنا پیارا ہے؟ ایسی کہانیاں لکھتے وقت بچے کی نفسیاتی پیچیدگیوں سے پوری طرح واقف ہونا چاہئے۔ بچہ کس حال میں کیا قبول کرتا ہے۔ اس کے تخیل کو کس طرح متحرک کیا جا سکتا ہے اور اس کے اندر بعض چیزیں قبول کرنے اور بعض چیزیں رد کرنے کی صلاحیت کس طرح پیدا کی جا سکتی ہے۔ کہانی لکھنے والوں کو ان باتوں کا علم ہونا ضروری ہے۔

جانوروں کی کہانیاں اور تمثیلی کہانیاں بچوں کو بہت پسند آتی ہیں۔ خصوصاً چھوٹے بچے اپنے آس پاس کے جانوروں اور پرندوں کے بارے میں تمثیلی کہانیاں بڑے شوق اور لگن سے پڑھتے ہیں۔ ایسی کہانیوں سے تفریح کے ساتھ معلومات بھی حاصل ہوتی ہے۔

بچوں کو مہماتی اور سائنسی کہانیوں سے بھی دلچسپی ہوتی ہے۔ سندباد جہازی کی کہانی کی مقبولیت اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ مہماتی کہانیوں کے توسط سے بچوں میں بہادری، جرأت اور مہم جوئی کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے مگر یہ حوصلہ محض بہادری کی کہانیاں سنانے سے نہیں پیدا ہو جاتا۔ ایسی کہانیوں میں سلیقے اور ہنرمندی کے ساتھ اس امر کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے کہ بہادری اور جرأت کے کارناموں کو خوف اور دہشت والے مناظر پر اس طرح حاوی کر دے کہ بچہ لاشعوری طور پر اپنے اندر جرأت مندی کی صلاحیت پیدا کرے اور اسے ترقی بھی دیتا رہے۔

حالیہ کہانیوں میں فنطاسیے (PHANTASY) نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی ہے جس میں حیرت و استعجاب بھی ہے، مہم جوئی بھی اور ہیرو کو بہادری دکھانے کے مواقع بھی موجود ہیں۔ ایسی کہانیاں تفریح کے ساتھ سائنس کے بارے میں مفید معلومات بھی فراہم کرتی ہیں۔ لیکن ہمارے یہاں جو سائنس فکشن لکھے جا رہے ہیں ان میں سے زیادہ تر غیر معیاری ہیں اور فنطاسیے کی ضروریات پورا نہیں کرتے۔ بچے سائنسی استعداد کی کمی کے سبب اس کے منفی اثرات قبول کر رہے ہیں۔ جس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہمارے یہاں سائنسی تجربات تاحال اوّلین مراحل پر ہیں۔ ایسا ماحول بھی دستیاب نہیں کہ سائنس فکشن مجموعی دلچسپی کی چیز بن سکے محض مغربی ادب کی نقالی کرنے سے ہمارا مقصد حل نہیں ہوگا۔ خصوصی مہارت رکھنے والے مصنفین کو اس پہلو پر زیادہ توجہ دینی ہوگی۔



## صبح گریزاں

رفعت سروش

رات کی تاریکیوں نے جاتے جاتے
خواب آلودہ فضا پر ،
کہر کی چادر بچھادی
شکل ہر شے کی بھلادی

کہر میں لپٹی ہوئی صبح گریزاں
بازوؤں میں مہر عالم تاب کی کرنیں سمیٹے
چاہتی ہے روشنی کو قید کرلوں
زندگی کو صید کرلوں

شوخ کرنوں کا تموّج سوچتا ہے
صبح کی فطرت ہے ہنستا
پھول کی مانند کھلنا
اپنی فطرت سے بغاوت !
صبح خود شاید گرفتارِ طلسمِ تیرگی ہے

وقت ہے بے خواب لیکن
اس کی گردش سے بندھے ہیں
سارے لمحے ، سارے موسم
آسمانوں سے اتر کر ،
شبنمی ٹھنڈا اجالا ،
دے رہا ہے دل کے دروازے پہ دستک
جاگتی جاتی ہے دنیا
مہر عالم تاب کو دیکھے گا کوئی

● پی-۷۱، سیکٹر ۔ نوئیڈہ ۲۰۱۳۰۱ (یوپی)



## تعارف

شان بھارتی

جانے یہ کون ہے ؟
ساری مخلوق کی سادہ لوحی کے خون کی مہک میں بسا
ریشم و اطلس و پرنیاں کی لباس
زیب تن
فرق ہر گرمیٔ خون صد کامگاراں سے ڈھالا ہوا
تاج زرّینِ شوق
اور تحقیرِ انساں کی شکنیں جبیں پر لیے
دوش پر ماہ و انجم کی صورت دمکتے ہوئے
تمغہائے صلابت سے آراستہ
دستِ قدرت میں ارواحِ مخلوقِ معصوم کو
قبض کرنے کا فرمان جور و جفا
ساری نقد متاعِ ہنر
سارا سرمایۂ فکر و فن
ساری تہذیب و اخلاق کی ملکیت
ٹھوکروں میں لیے
کون ہے ؟ جانے یہ کون ہے ؟
اپنے انداز و اطوار سے
پچھلی پیڑھی سے تو میل کھاتا نہیں
یہ سکندر نہیں
تے نہیں ، چنگیز نہیں
یہ اتا ترک بھی تو نہیں
نے یہ ہارون رشید
ہاں یہ وکٹوریہ بھی نہیں
یہ اشوک اور موریہ بھی نہیں
اور بابر نہرو تلک سے شکل اسکی کسی سے بھی ملتی نہیں
اس کے اطوار سب سے جدا
اس کی رفتار سب سے جدا
اُس کا معیار سب سے الگ
جانے یہ کون ہے ؟
عقل سے ، علم سے ، عشق سے
فہم و ادراک سے
میں تو ایک اک سے اسکا حسب اور نسب
پوچھ کر تھک گیا
کوئی ان بزدلوں میں بتاتا نہیں
وادرِ جہل باقی بس اب تو ہی اک حوصلہ مند ہے
آج تو ہی بتا
اس تحیر فزا اجنبی کا تعارف ہے کیا ؟

● محلہ خلیل غربی شاہجہان پور، یوپی ۲۴۲۰۰۱



جوگندر پال

۲۴ منداکنی انکلیو، کالکاجی نئی دہلی - ۱۱۰۰۱۹

# خواب رو

قسط نمبر ۳

"ہول نہ اٹھے میری اچھی بہن" حکیم صاحب اپنا کوئی نسخہ بیان کرنے کے لہجے میں گویا ہوتے ہیں۔" تو یہاں پہنچتے ہی بے اختیار میرے سینے سے کیوں آلگو؟"

"امبوا پر بور تو خوب پھوٹ آیا ہوگا!"

"اری بور کو چھوڑو، جاکے دیکھو، امبوا پر امبیوں کے جھنڈ کے جھنڈ چلے آرہے ہیں۔"

"تب تو کالے کوؤں کے مزے ہی مزے ہوں گے!" دیوانے مولوی صاحب اپنے سالے کی بیوی کو چٹکی بھرنے کا کوئی موقع نہیں کھوتے۔

"چلو، ہٹو، دیوانے مولوی صاحب۔ آپ کو دیوانگی کے سوا کچھ اور بھی سوجھتا ہے؟"

"سچ مچ کے دیوانے ہیں بھاوج۔" اچھی بیگم حکیمن کو خبردار کرکے اپنے دائیں رخسار پر شہادت کی انگلی رکھ دیتی ہے۔" پسچ!"

نواب حکیم معزالدین کی حویلی امبیوں کی حویلی کہلاتی ہے۔ پیڑوں کے اوپر یہاں کوّے کائیں کائیں کرتے رہتے ہیں اور نیچے امبیاں ہی امبیاں چین سے پیڑوں پر لٹکنے کی بجائے ریشم کی ڈوری سے بندھے جھولے جھولتی رہتی ہیں۔ خدا بچائے، حکیم صاحب کی پوتیاں —— آفت کی یہ رنگ رنگی پڑیاں شادمانی سے چیخ چیخ کر جھولوں کو اتنا اوپر اڑا لے جاتی ہیں کہ تماشائی کلیجہ تھام کر رہ جاتا ہے —— اب گریں کہ جب گریں! —— کوّے کائیں کائیں کرکرکے سروں پر آسمان اٹھا لیتے ہیں اور حکیمن اپنا پاندان ایک طرف دھکیل کر بے اختیار باہر باغ میں دوڑی آتی ہے —— اری کلموہیو! اتنا اونچا جھولو گی تو حویلی کی دیواروں کے باہر جا گرو گی۔

دو ساون پہلے یہی تو ہوا۔ حکیم صاحب کے سب سے چھوٹے بیٹے ہاشم علی کی سب سے بڑی بیٹی شہزادی ایک صبح منہ اندھیرے باغ میں آنکلی۔ اس پہلے کہ وہ کسی جھولے تک پہنچ پائے، ایک پکا ہوا آم اپنی جان پر کھیل کر اس کے سر پر آگرا —— رک جاؤ بی بی! —— مگر وہ سننے والیوں میں تھوڑا ہی تھی۔ اپنے جھولے پر اس نے تو دم لیا اور ذرا دم سے کر دو چار جھٹکوں ہی میں جھولے کو اتنا اونچا کھینچ لے گئی کہ دھڑام سے حویلی کی دیوار سے باہر جا گری، اور پھر وہاں سے ایک کالے کلوٹے کوّے کے پروں میں چھپ کر جیسے ردوں میں پھر سے اڑ گئی۔ حکیم صاحب نے اپنی پوتی کی تلاش میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا، پھر بھی کامیاب نہ ہوئے، مگر کوّے تو مقامی ہی ہوتے ہیں، چھ آٹھ ماہ میں وہ آپ ہی اپنی دلہن کو لے کر آپہنچا۔ حویلی میں واویلا مچ گیا۔ حکیم صاحب ان کے نکاح کو تسلیم کرنے پر رضامند نہ تھے مگر نکاح تو جہاں بھی ہو رشتے تو جنت ہی میں طے پاتے ہیں ٹیلیفون پر اطلاع پاتے ہی ہاشم علی سعودی عرب سے اڑ کر آگیا اور شہزادی کی سرزنش کرنے کی بجائے اسے حسن انتخاب پر مبارک باد دی —— لڑکا سندھی ہے یا بلوچستانی، فوج میں میجر ہے اور چار پانچ سال میں کرنیل جرنیل بھی ہو جائے گا۔

"مگر ہاشم بیٹے ——!"

"نہیں ابا حضور، اپنی گریجویٹ لڑکی کو کیا میں کسی قلم گھسیٹ چھٹ بھیّے کے گلے مڑھ دوں؟ —— نہیں، جو ہوا، سو ٹھیک ہوگیا!"

حکیم صاحب پہلے تو بہت سٹپٹائے، پھر اپنے آپ کو لاچار پاکر بچوں کی شادی کی خوشی میں شریک ہونے کے لیے ایک بہت بڑی دعوت کا اہتمام کیا جس میں لکھنؤ اور اضلاع کے ان اقارب نے بھی شرکت کی جنہیں اوّلاً پس و پیش تھا۔ دیوانے مولوی صاحب کو سمجھایا بجھایا گیا کہ لڑکے کے والدین اصلاً لکھنؤ کے ایک نوابی خاندان سے وابستہ ہیں لیکن کئی پشتوں سے سندھ میں اپنی جاگیر پر بود و باش اختیار کئے ہوئے ہیں۔

"کوئی مضائقہ نہیں!" دیوانے مولوی صاحب نے جواب دیا۔" لکھنؤ کے نواب تو ہیں، زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ بگڑ چکے ہوں گے۔"

دیوانے مولوی صاحب نے اپنی علمی و ادبی شرکتوں کے باعث بنظ

روایتی القاب تج کر ایک بس لفظ مولوی پر قناعت کر رکھی ہے اس لئے جب انھیں معلوم ہوا کہ دولہا غیر معمولی طور پر پڑھا لکھا ہے تو وہ جامے میں پھولے نہ سمائے۔ دعوت کے موقع پر مشاعرے کے انعقاد کے لئے وہ شاعروں کی کئی گاڑیاں لکھنؤ سے بھر لائے تھے کہ دور افتادہ سندھی اپنی تہذیب کی بازیافت پر اطمینان کا اظہار کریں لیکن جب انھوں نے شہزادی کے سسرال والوں کو اپنے خاندانی ڈھولچی کی قیادت میں بنگڑا ناچتے ہوئے خنجر زنی اور بھالے بازی کے کرتب دکھا دکھا کر پنڈال کی جانب آتے دیکھا تو وہ بھنا کر رہ گئے۔

" دیکھا؟" حکیم صاحب غصّے سے دانت پیس رہے تھے۔

" ارے حکیم بھائی، لکھنؤ سے یہ ڈیڑھ ہاتھ پر ملیح آباد ہے"۔

دیوانے مولوی صاحب اپنی مایوسی پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئے تو انھیں گدگدی محسوس ہونے لگی۔" ذری اپنی صورت بھی دیکھیے، لکھنؤ سے اتنے سے فاصلے پر آپ آدمی سے لنگڑا بھگے ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ بے چارے تو کالے کوسوں کے لوگ ہیں اور ہیں ہی لنگڑا بھگے"۔ حکیم صاحب کو بدستور غصّے میں پا کر وہ ان کی پیٹھ تھپکنے لگے۔" بالکلیہ بھی بگڑ گئے ہیں تو کیا، حکیم بھائی۔ اصلاً تو ہم ہی میں سے ہیں"۔

جو کچھ دیوانے مولوی صاحب نے انجانے میں اپنے سالے کو سمجھایا، وہی تو نواب اسحٰق مرزا جانے بوجھے اپنے خاندان کے ہر فرد کو سمجھاتا رہتا ہے۔ ہر پاکستانی جو بھی اور جیسے بھی ہے اصلاً ہم ہی میں سے ہے۔ حکیم صاحب کی امیبوں کی حویلی میں اپنے چچا نواب اسحٰق کی ڈھیروں بھتیجیاں زرق برق دوپٹوں کو سر پر بٹھاتے ہوئے منہ کھلے چھوڑ کر اپنے محبوب چچا کے آس پاس بیٹھ جاتی ہیں۔ اُسے سنتے ہوئے انھیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ گویا اپنی درسی کتابیں پڑھ رہی ہیں جو راست مطالعہ پر ان کی سمجھ میں قطعی طور پر نہیں آتیں مگر چچا چھوٹے نواب کے ذریعے بخوبی ذہن نشین ہونے لگتی ہیں۔ بعضوں کی تو یہ عادت ہو گئی ہے کہ امتحان میں سوال کوئی بھی ہو جواباً وہ بات کو گھما پھرا کر اپنے چچا کی باتوں کا خلاصہ لکھ آتی ہیں اور بڑے مزے کی بات یہ ہے کہ بڑے اچھے نمبرات پر پاس بھی ہو جاتی ہیں۔

" ہم سب پاکستانی ہیں، لڑکیو، کیونکہ سب کے سب یکساں طور پر پاکستان کے نظریے کے باسی ہیں—"

" چھوٹے نواب چچا، نظریے کے باسی—؟"

"ہاں! جس طرح ہم اپنے ملک میں بسے ہوئے ہیں اس طرح ہمارا ملک بس ہمارے ذہنوں میں بسا ہوا ہے۔ یقین نہ آئے تو اپنے پاکستان کے نظریے کی لکیریں ٹریس کر کے اطمینان کر لو، پاکستان کا عین پورا نقشہ کھنچ آئے گا—"

" ٹھہریے، چچا! مَیں پہلے اپنی نوٹ بک لے آؤں"۔

سیاسیات کی آنرز کی طالبہ بلقیس اپنے چھوٹے نواب چچا کا ایک ایک لفظ ریکارڈ کر لینا چاہتی ہے۔

" نوٹ بک لا کے کیا کرو گی؟" اسی اثنا میں جیکمن وارد ہو جاتی ہے"۔ سسرال والوں کو سینا پرونا دکھاؤ گی اپنی نوٹ بک میں؟ — چلو! — چلو، اٹھو یہاں سے!—" وہ سب لڑکیوں کو مخاطب کر کے کہتی ہے اور ان کے تتر بتر ہونے کے بعد اسحٰق مرزا کی طرف دونوں ہاتھ بجا کر جوڑ لیتی ہے۔" بخشو، چھوٹے نواب! تمھاری چہیتی شہزادی ہی کا کیا دھرا کچھ کم نہیں!"

اسحٰق مرزا ہنسنے لگتا ہے۔

" نہیں ممانی جاں! میں تو آپ کے ہاتھ کا پان کھائے بغیر نہیں بخشوں گا۔"

حکیم صاحب کا پہلا زخم ابھی پوری طرح بھر نہ پایا تھا کہ امیبوں کی حویلی میں ایک اور سانحہ پیش آ گیا۔ حکیم صاحب کو شروع ہی سے چور ڈاکوؤں کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ زمانہ خراب تھا اور راستہ اجاڑ، چوروں کو اور کیا چاہیے تھا، اماوس کی ایک گہری رات کو حویلی کی اونچی اونچی دیواریں پھاند کر اندر گھس آئے۔ چھیوں کے چھیوں، ہاتھوں میں کلہاڑے لئے ہوئے تھے۔

" بھلا ان لکڑہاروں کی اولاد سے کوئی پوچھے"۔ حکیم صاحب اس سانحے کے بیان کو ہمیشہ اسی سوال سے شروع کرتے۔

" آدمیوں کو کیا لکڑیوں کے مانند کاٹا جاتا ہے؟ مرنا آتا ہے، مارنا۔"

" مگر صرف یہی دو کام تو وہ کرتے ہیں!"

" آپ بھی کمال کرتے ہیں صاحب زادے — کیا نام ہے آپ کا؟ اعجاز؟ — اعجاز کیا؟ — تو ایسے کہئے نا، اعجاز حسین — کام کئے جانے ہی سے کام کرنا نہیں آ جاتا اعجاز حسین! ہر کام کا کوئی مخصوص سلیقہ ہوتا ہے۔ ہمارے ابّا مرحوم کہا کرتے تھے، صرف وہی کام بُرا ہوتا ہے جسے سلیقے سے نہ کیا جائے — لیکن آگے کی سنئے۔ اپنا وہ سائیس — مجھے اس کا نام بھول رہا ہے"

" میں نے آپ سے کہا تھا ابّا جان"۔ حکیم صاحب کا سب سے بڑا بیٹا سلامت علی گویا سائیس کا نام بتانے کی بجائے انھیں اپنی تنبیہ یاد دلانے کے لئے بولا" کہ کسی سائیس کو چوکیداری کی ذمّہ داری مت سونپئے"۔

" ہاں! سلامت میاں، آپ کی تنبیہ پر دھیان نہ دے کر میں نے

وافعی خطا کھائی، مگر کیا کرتا، ایک وہی کام کا آدمی معلوم ہوا۔ ایک پٹھان بھی تھا مگر اسے دیکھتے ہی مجھے وحشت ہونے لگی۔ بات کرنے کے لئے منہ کھولتا تھا تو لگتا تھا، لاٹھی چلاتے ہوئے اوپر چڑھ دوڑا ہے۔ اب کے تو میں نے منشی رام دین سے کہہ رکھا ہے، جہاں اتنے دن بیت چکے ہیں، وہاں بیشک دو ماہ اور گزر جانے دو، مگر کوئی نہا جر ڈھونڈو۔ کوئی بھی ذات ہو پر ہو نہاجر ——" اتنے میں ان کی نظر اسحٰق مرزا کے چہرے پر اٹھی جوان سے ہمدردی کے جذبے کے باوجود مسکرانے لگا تھا: "ہمیں معلوم ہے چھوٹے نواب، تم ہنس کیوں رہے ہو، مگر ہماری مراد اپنی طرف سے پرانے پنڈتوں کی ذات پات سے نہیں، ہماری مراد صرف حسب نسب سے ہے!"

"تو پھر مجھے ہی اپنا چوکیدار بنا لیجئے ماموں جان!"

"وہ تو آپ ہیں ہی، وکیل صاحب، اسی لئے مجھے اپنی ترقی کی فکر لگی رہتی ہے" اسحٰق مرزا کے اطوار کو غیر پسندیدہ قرار دینے کے باوجود اُن کے دل میں اُس کے لئے ایک نرم سا گوشہ تھا۔" —— ماچھا —— ہاں اس چوکیدار کا یہی نام تھا"

"مگر یہ تو پنجابی نام ہے ماموں جان" اسحٰق مرزا نے پھر منہ کھولا۔

"ہمیں تو سارا قصّہ معلوم ہی ہے اسحٰق میاں" نواب مرزا نے اپنے چھوٹے بھائی سے کہا "ٹوکو نہیں۔ قبلہ سیّد صاحب کو بھی اطمینان سے سانس لینے دو۔"

"چنداں مضائقہ نہیں، نواب مرزا" سیّد صاحب ابھی تک پان چباتے ہوئے صرف چہرے کی حرکات و سکنات سے حکایت فہمی کے ثبوت فراہم کر رہے تھے۔ اب شاید پان ختم ہو لیا تھا "وضاحتوں سے مسائل کو حل کرنے میں مدد ملتی ہے!"

"مگر ہمارے وکیل صاحب کی وضاحتوں نے تو پولیس کو الجھا الجھا کر ہونق بنا دیا ہے!"

"چہ معنی؟"

"معنی کیا ہونا ہیں قبلہ سیّد صاحب، بس ہمارے بھیا حضرت کی وکالت کا معجزہ کہہ لیجئے، اُنھیں سن سن کر پولیس اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ چوری کی واردات تو ضرور پیش آئی ہے تاہم چور کسی کو قرار نہیں دیا جاسکتا۔ میں نے احتجاج کیا تو انسپکٹر صاحب کہنے لگے، دیکھئے صاحب، آپ کے وکیل صاحب کی جرح سن کر ہمیں تو ایک اپنے آپ ہی پر شک ہونے لگا ہے۔ کہئے تو خود کو حوالات میں بند کرکے چابی آپ کو دے دوں!"

"ماشاءاللہ! ماشاءاللہ!" سیّد صاحب نے تبصرہ کیا "میرے والد مرحوم بھی لکھنؤ کے ایک سینئر وکیل تھے۔ فرمایا کرتے تھے، وہ وکیل کیا، جو پولیس کے دانت کھٹے نہ کر دے!"

مگر قبلہ سیّد صاحب، آگے کی سنیئے۔ ہمارا وہ سائیں ماچھا ان کو حویلی میں لانے سے پہلے اُن کی آؤ بھگت کے لئے ہمارے باغ میں لے گیا۔ آموں اس قدر تیار ہو چکے تھے سیّد صاحب، کہ دور سے اُن کی خوشبو کا ذائقہ منہ میں گھلنے لگتا تھا۔ ایک دفعہ اسی موسم میں حضرت جوش ملیح آبادی مرحوم اور اُن کے ساتھ چند دیگر شعرائے کرام نے بھی میری دعوت پر ہماری کی حویلی میں قدم رنجہ فرمایا تھا۔ پیڑوں سے آم اتار کر ٹوکرا جب اسی دم سامنے رکھ دیا گیا تو ان کے ایک ساتھی نے ہمارے باغبان سے کہا، انھیں دھو کے لاؤ۔ حضرت جوش مرحوم فوراً بولے، یہ تمھارا کلام نہیں، میاں، کہ بار دھوئے بغیر گلے سے نہ اترے، خدا کے پیڑوں سے اترے ملیح آبادی ہیں، دھونے سے میلے ہو جائیں گے"

"ماموں جان!" اسحٰق مرزا نے انھیں یاد دلایا "وہ چوروں کا قصّہ"

"ہاں، پہلے وہ قصّہ سنیئے قبلہ سیّد صاحب۔ چوروں نے سوچا کہ ایک ایک آم کھا کر اپنے کام کی طرف متوجّہ ہو جائیں گے مگر ایک پڑے ہوئے ہندو سادھو نے ہمارے باپ دادا میں سے کسی کو —— ہندو میں وہ کیا کہتے ہیں؟ —— بردان دیا تھا کہ جس کسی کی زبان پر تم لوگوں کا رس گھل رہا ہوگا اُسے رس کے ذائقے کے سوا اور کچھ یاد نہ رہے گا، سو انھوں نے ایک بار آم کھانا شروع کیا تو کھاتے ہی چلے گئے اور عین ممکن ہے کہ نمک کھاتے ہی چلے جاتے مگر ہمارا سائیں ماچھا آموں کے اس جادوئی تاثر سے بے خبر نہ تھا، اس لئے اس نے اُن گدھوں سے زبردستی کلّے کروائے ——"

"بھئی حکیم صاحب!" سید صاحب نے پان کا ایک اور بیڑا منہ میں ڈال کر کہا "جو لوگ اتنی رغبت سے آم کھاتے ہوں، بخدا انھیں گدھا مت کہئے مرزا نوشہ ——"

"ورنہ مرزا نوشہ کی روح کو اذیت پہنچے گی" حکیم صاحب نے ان کے منہ سے اُن کا جملہ چھین لیا، تاکہ مرزا نوشہ کا آموں کا لطیفہ وہ آپ ہی مگر اسحٰق مرزا چپ نہ رہ سکا "ماموں جان، خدا کے لئے مرزا نوشہ کا نہ چھیڑ بیٹھئے۔ وہ لطیفہ ہم ہزارہا بار پڑھ اور سن چکے ہیں۔"

"اچھی باتوں کو ہزارہا بار سن کر بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہم پہلی بار سن رہے ہیں" بہرحال حکیم صاحب بے بس سے نظر آنے لگے "تو پھر آگے کی سنیئے، قبلہ ——

باقی آئندہ

عمران اعظمی



قتل ہو جائے، نہ جانے کوئی قاتل کے سوا
اور پھر دے نہ گواہی بھی کوئی دل کے سوا

آرزوئیں نہیں قائل . کسی پابندی کی
کشتیاں یہ، کہیں لگتی نہیں ساحل کے سوا

ہے اسی واسطے لوگو مجھے تنہائی عزیز
مسئلے ہوتے ہیں خلوت سے بھی محفل کے سوا

پیشۂ عشق ہے وہ راہ، کہ اس رہ میں کہیں
کوئی منزل ہی نہیں، صبر کی منزل کے سوا

سر سے پا تک یہ لگا ہے مجھے اکثر، جیسے
کچھ بھی باقی نہ ہو مجھ میں نگہ و دل کے سوا

پوچھنے والے مہ و مہر کے، یہ یاد رہے
کام آئے گا نہ کچھ روشنیٔ دل کے سوا

اپنی مشکل ہی کو مشکل نہ سمجھ، یار مرے
مشکلیں اور بھی ہیں اک تری مشکل کے سوا

مسئلوں کا یہی اک حل ہے، کہ یہ سوچ کے جی
اس خرابے میں دھرا کیا ہے مسائل کے سوا

میں نہ کہتا تھا نہ جا جانبِ گل زارِ عجم
کیا رہا ہے وہاں بس شورِ عنادل کے سوا

● ۲۰ — امین آباد پارک لکھنو

بشیر [illegible]



میں اپنا گمشدہ ماضی کا چہرہ، کبھی آئینۂ امروز فردا کبھی دشتِ بلا میں ڈھونڈتا ہوں
اندھیرا روشنی کا کرب بن کر، رگوں میں اس طرح سے گھل گیا ہے، کہ سر سے پیر تک دھندلا گیا ہوں

خباثت کے حصاروں، دائروں میں، مقدس چہروں کی نورانی شمعیں، اندھیروں کو شکستیں دے رہی ہیں
مرا یہ خاکی پیکر، نوری، ناری، میں آتش زار کو گلشن بناؤں، سرابِ زیست میں آبِ بقا ہوں

چٹانوں، کوہساروں، مرغزاروں، زمیں سے آسماں کی وسعتوں تک شکستہ خواہشوں کی دھند چھائی
بدن، موسم کی بے رحمی سے لرزاں، ٹھٹھرتی لکڑیاں، بجھتے الاؤ، میں جل کر شعلوں کو بھڑکا رہا ہوں

سلگتے لمحوں کی تپتی فضائیں، کہیں احساس کے شیشے نہ ٹوٹیں، کہیں دل ریزہ ریزہ ہو نہ جائیں
میں پتھر کا جگر شیشے سے کاٹوں، لہو کے پھول صحرا میں کھلاؤں، بکھرتی خوشبو یکجا کر رہا ہوں

یہ الجھے راستے، لمبی مسافت، سمندر وقت کا تھک سا گیا ہے، سفر، پیہم سفر، گرد سفر سے
میں، اک راہی صلیبِ غم اٹھائے، سیاہ جبر سے خود کو بچائے، عصا ہاتھوں میں لیکر چل رہا ہوں

گھٹن اور حبس کی شدت کا عالم، پسِ دیوار بے چینی کا مرکز، ہر اک اپنی ہی تنہائی کا قیدی
گلِ نغمہ، زرِ اخلاص لے کر، کشادہ آنگنوں کی سانس بن کر، دریچے ذہن و دل کے کھولتا ہوں

کتابوں کے درخشاں حاشیوں کو، سلگتے لفظوں کے سیلاب جاں میں جھلس کر مسخ ہے معنی کا چہرہ
لکیروں کی طنابیں کھینچ کر اب، علامت فکر و فن کے شامیانے، سخن زادوں میں ہر سو تانتا ہوں

برہنہ شاخ پر اک برگ تنہا، کہیں میلے میں کھویا کوئی بچہ، شکستہ قبر کا اک ٹوٹا کتبہ
طلسمِ وقت سے سہما پرندہ، تماشائی بھی اور خود ہی تماشا، لبِ گل پہ خزاں کا مرثیا ہوں

● ۷۷۲، ہٹیا بہادر گنج۔ الہ آباد ۳



الیاس احمد گدی
فتح پورہ لین - جھریا - ۸۲۸۳۳۳ (بہار)

# فائیرایریا
## (ناول کا ایک جز)

ایک لمبی اندھیری سرنگ ہے اور اس میں چلنا ہے۔ کہیں کوئی شگاف نہیں، کہیں کوئی دراز نہیں جس سے چھن کر کوئی ننھی سی کرن اندر آجاتی ہو۔ کہیں کوئی روشن دان نہیں جہاں سے تھوڑی سی روشنی اس اتھاہ اندھیرے کو باطل کرتی نظر آئے۔ مٹھی بھر دھوپ، چٹکی بھر اُجالا ... نہیں کچھ نہیں۔۔ بس اندھیرا اور گھٹن اور لمبی مسافت۔۔ چلتے رہو، چلتے رہو.... پاؤں لہولہان ہو جائیں، جسم اپنی تمام جولانی کھو دے، گھٹنے چٹخنے لگیں، پھیپھڑوں میں لمبے گہرے گھاؤ ہو جائیں تب بھی چلتے رہو۔ اسی سرنگ کا کہیں کوئی اختتام نہیں، کہیں کوئی انت نہیں، یہ ہمارا مقدر ہے، یہ ہمارا اس اتنی بڑی رنگ برنگی دنیا میں حصّہ ہے.... بس چلتے رہو، یہاں تک کہ خون تھوک کر یا تنفس کا شکار ہو کر، یا دل کے کسی دورے سے، نہیں تو صرف کمزوری کی بنا پر کہیں بیٹھ جاؤ، آگے چلنے کا یارا نہ رہ جائے، یہ ہمارا انت ہے۔ ہمارا آخر.... تب ہمارے بچّے اس سرنگ میں چلنا شروع کرتے ہیں، پھر ان کے بچّے۔ صدیوں سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس سرنگ کا دوسرا سرا کسی کو نہیں ملتا۔ کیا اس سرنگ کا دوسرا سرا، اس سرنگ سے باہر نکلنے کا دوسرا دروازہ ہے۔ ؟

عرفان کہتا ہے اگر دروازہ نہ بھی ہو تو ہم اس سرنگ کو توڑ کر دروازہ بنا لیں گے۔ اوپر سے ڈھا دیں گے، کھول دیں گے اسے۔ تب پیلی دھوپ اور ایک سہانا خوبصورت دن اس اندھیری سرنگ میں پرویش کرے گا۔

عرفان جوان آدمی ہے۔ وہ تخیّل کی دنیا میں، خوابوں کی وادیوں میں زیادہ رہتا ہے۔ اس نے سچ کو ابھی دیکھا نہیں ہے۔ لمحہ لمحہ بڑھ کر آدمی کو کھانے والے اندھیرے سے اس کا سابقہ ابھی نہیں پڑا ہے۔ اس کو لفیلڈ کی دنیا کو اس نے صرف باہر سے دیکھا ہے۔ اندر سرنگ میں کتنا اندھیرا اور حبس ہے اسکو کچھ معلوم نہیں۔

تب کہاں آدمی ہار مان جائے۔ ؟

جیتنے کی امید کے بغیر لڑائی بھی کیسے لڑی جاسکتی ہے۔ ؟

لڑنا تو بہرحال پڑتا ہے، چاہے جیتنے کی اُمید ہو یا نہ ہو تحفظ ذات کا اصول ہے کہ جب تک تمھارے ہاتھ میں ہتھیار ہے تب تک تمھارے جسم میں لڑنے کی طاقت ہے تب تک تمھیں مغلوب نہیں کیا جاسکتا ہے۔ شاید اسی لئے آدمی چاہے جس سطح پر ہو، جس محاذ پر ہو لڑنا پڑتا ہے۔ اس کے بغیر چارہ کہاں ہے۔ ؟

مگر اس لڑائی کا حاصل۔ ؟

حاصل چاہے کچھ ہو یا نہیں ہو۔

تقریباً یہی بات پرتی بالا بھی بولتی ہے۔ ؟

آپ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گئے ہیں۔ کیا لڑکے کو پڑھانا نہیں چاہتے۔ ؟

تین برس ہو گئے ہیں اس کو۔ یہ ڈھائی سو روپئے ماہانہ کی نوکری کرتے، گو کام کچھ نہیں ہے۔ صرف دستخط کرنا ہے مگر اسی میں آدھا دن چلا جاتا ہے۔ باقی آدھے دن میں وہ ٹیوشن کرتا ہے۔ پھر بھی سب ملا کر نہیں چلتا۔ اوپر سے راجندر کے پرائیویٹ اسکول کی لمبی فیس۔ وہ کہہ چکا ہے کہ اسے اس پرائیویٹ اسکول سے نکال کر کسی سرکاری اسکول میں داخل کرا دو۔ مگر پرتی بالا اس بات کو منظور نہیں کرتی۔ وہ بنگالن ہے پڑھائی کو بہت اہمیت دیتی ہے۔ حالانکہ ایک دن چڑھ کر اس نے کہہ دیا تھا۔

آخر پڑھ لکھ کر ہی کیا ہوتا ہے۔ تمھارے بنگالیوں نے ہی کمال کر دیا ہے۔ وہ ٹھیکیدار اسکولوں کی ماسٹری یا سرکاری اور غیر سرکاری کی کلرکی۔

وہ تڑپ کر بولی تھی ـــ کیا بنگالیوں میں ڈاکٹر نہیں، انجینئر نہیں ہوتے۔ آج جس شعبے میں دیکھو بنگالی ہی بنگالی دکھائی

یہ سب کیا بغیر پڑھے لکھے ہیں....

وہ جز بز ہو گیا تھا اس دلیل پر۔ پرتی بالا غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ مگر وہ نہیں جانتی کہ جب ہاتھ کا ہتھیار کند ہو تو آدمی وار کرنے کی بجائے صرف وار روکتا ہے۔ اور راجندر کو اس اچھے اسکول سے نکال کر سرکاری اسکول میں داخل کرنا دفاع ہی کی ایک صورت تھی۔

پرتی بالا بہت پڑھی لکھی نہیں ہے۔ جیسے سیدیو سوچتا ہے، یا جیسے عرفان سوچ سکتا ہے ویسے پرتی بالا نہیں سوچ سکتی ہے۔ وہ صرف ضد کر سکتی ہے۔ اور پچھلے کئی ہفتوں سے وہ ضد کئے ہوئے تھی۔

اسکول میں لڑکوں کی فیس معاف بھی تو ہوتی ہے۔ ہمارا راجندر پڑھنے میں بہت تیز ہے۔ کیا اس کی فیس معاف نہیں ہو سکتی۔ آپ اس کے اسکول تو جائیے۔ درخواست تو لکھ کر دیجئے۔

وہ بہت چیں بہ جبیں ہو کر تیار ہوا تھا۔ ایک درخواست لکھی اور بادل ناخواستہ راجندر کے اسکول جا پہنچا وہاں ہیڈ ماسٹر نے اس سلسلے میں جو بات بتائی وہ کافی امید افزا تھی۔ اس نے کہا یہ کام ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ اس قسم کی باتوں کا فیصلہ کمیٹی کرتی ہے۔ آپ ایسا کیجئے یہ درخواست لے کر جے پی سنگھ کے پاس چلے جائیے۔ وہ کمیٹی کے بہت اہم ممبر ہیں اگر وہ ریکومنڈ کر دیں گے تو آپ کا کام فوراً ہو جائے گا۔

وہ جھجک کر بولا تھا

وہ مجھے پہچانتے نہیں ہیں۔

اس سے کیا ہوتا ہے۔ ایسے آدمیوں کے گھر جب کوئی پہنچ جاتا ہے تو جلدی وہ انکار نہیں کرتے۔ بس ذرا رونے گانے گا، اپنا دکھڑا سنائیے گا بس آپ کا کام ہو جائے گا۔

عرفان ٹھیک کہتا ہے کہ آدمی کو زندگی کے ان گنت محاذوں پر لڑنا پڑتا ہے۔ یہ جو آج وہ جیب میں عرضی رکھ کر اپنے بیٹے کو ساتھ لے جے پی سنگھ سے ملنے جا رہا ہے تو یہ کیا ہے۔ یہ بھی تو ایک لڑائی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ وہاں کیا ہوگا۔ اس کی انا کو ایک اور گھاؤ لگے گا۔ کہیں اندر سے وہ زخمی ہوتا جائے گا۔ اپنے وجود کے اندر زخموں کی قطاریں سجائے وہ لوٹتا جائے گا۔ صاحب بہت غریب آدمی ہوں۔ ڈھائی سو روپے ماہانہ پر نوکر ہوں۔ پیٹ نہیں چلتا تو لڑکے کو کیسے پڑھاؤں۔ اگر اس کی فیس .. اس کا ہر جملہ ہر لفظ اس پر حملہ آور ہوگا۔ ہر جملہ ہر لفظ ایک گھاؤ لگائے گا۔ اور وہ اسے زخمی وجود کا لہو پونچھتا ہوا چپ چاپ اس آدمی کے سامنے سر جھکائے، دست بستہ کھڑا ہوگا۔ ان جملوں کا گھاؤ کھانے کے لئے جو اس آدمی کے سے

ادا ہوں گے۔

وہ اپنے بیٹے کی طرف دیکھتا ہے جو چلنے سے زیادہ بھاگ رہا ہے اس کے کینوس کے جوتے دھول میں اَٹ گئے ہیں۔ چہرے پر پسینے کی بوندیں دکھائی دے رہی ہیں۔ کیا اس کو معلوم ہے کہ وہ کہاں جا رہا ہے کیا ایک آدھ زخم اس کے حصے میں بھی آئے گا۔ ؟ سات سال کا لڑکا۔ وہ تیسری جماعت میں پڑھتا ہے۔ کیا وہ ان واروں سے اچھوتا رہ جائے گا۔ ؟ بہت چھوٹی عمر ہے اس کی ان زخموں کے لئے۔

مگر لڑکا خوش ہے۔ اپنی گندی بستی سے نکل کر اس فلمی شہر کی وسعت اور خوبصورتی میں مگن ہے۔ اس کو معلوم نہیں کہ اس وسعت اور خوبصورتی میں اس کا کتنا حصہ ہے — کچھ نہیں، ایک ذرہ بھی نہیں، بس وہی گندی بستی اس کا مقدر ہے۔ اور اس کی میراث اس گندی بستی میں واقع وہی ایک ہوا کمرہ ہے جس کے فرش پر، پھٹے پرانے کپڑوں سے سلا ہوا "گیندڑا" ڈال کر اس کی ماں اس کو سلاتی ہے۔ بعد میں بیوی سلائے گی، پھر اس کی بہو۔ اور تب اسی سیاہ اندھیری سرنگ کے کسی گوشے میں اسے چھوڑ کر لوگ آگے چل دیں گے۔ روشنی کی تلاش میں، سرنگ کے دوسرے دروازے کی کھوج میں۔

دروازے کا بٹن دباتے ہوئے وہ ڈرتا ہے۔ تھوڑا سنکوچ کرتا ہے پھر تھوڑی ہمت جمع کر کے بٹن دباتا ہے اندر گھنٹی بجتی ہے تو جھجک کر جلدی انگلیاں ہٹا لیتا ہے چند سیکنڈ بعد ایک بوڑھا آدمی نکل کر پوچھتا ہے۔

کیا بات ہے۔ ؟ کس سے ملنا ہے۔ ؟

جے پی سنگھ صاحب ہیں۔ ؟

کیا کام ہے۔ ؟ اس کا حلیہ دیکھ کر وہ کسی قدر رعب سے پوچھتا ہے

ایک..... وہ بولتے بولتے رک جاتا ہے۔ پھر کچھ سوچ کر کہتا ہے

انھیں سے ملنا ہے۔!

اچھا ٹھیک ہے۔ وہاں اس بنچ پر بیٹھ جاؤ صاحب ابھی بریک فاسٹ لے رہے ہیں۔

وہ نوکر کے لہجے کی حقارت کو محسوس کرتا ہے، کہیں کسی انجانے گھاؤ کی طرح درد ہوتا ہے۔ زخم گہرا نہیں لگتا ہے۔ وہ اپنے بیٹے کی بانہہ پکڑ کر برآمدے میں پڑی بنچ پر بیٹھا دیتا ہے۔

لڑکا ان اندرونی وارداتوں سے بے خبر سارے ماحول کو نہایت دلچسپی سے دیکھتا ہے۔ وہ سامنے چھوٹے سے باغ میں کھلے رنگ رنگ پھولوں کو، گیرج میں کھڑی چمچماتی کار کو، برآمدے کے صاف ستھرے چمکیلے فرش کو دیکھ کر بہت خوش ہے۔ یہ ایک دوسری دنیا ہے۔ اس دنیا جس کو اس سے

پہلے کبھی نہیں دیکھا یا کم از کم اتنے نزدیک سے نہیں دیکھا۔

یہ کس کی دنیا ہے۔؟

یہ سوال سہدیو کے دماغ میں بار بار آتا ہے۔ وہائٹ صاحب کے بنگلے کو دیکھ کر پی این ورما کے گھر کو دیکھ کر شہر کی بڑی بڑی عمارتوں والے حصے سے، خوبصورت چوڑی سڑکوں والے علاقوں سے گزرتے ہوئے یہ کون سے خوش نصیب لوگ ہیں جو یہاں رہتے ہیں . . . اولاد در اولاد . نسل در نسل . . . آخر ان میں ایسی کون سی خصوصیت ہے۔ کیا انہیں، اس جیسے ہزاروں لوگوں کو ایسی زندگی کبھی میسر آئے گی۔؟ کبھی۔؟؟

جواب نہیں ہے اس کے پاس۔ برسوں سے اس کے ذہن میں ٹنگا ہوا یہ سوال جوں کا توں موجود ہے۔ کوئی جواب نہیں۔ انگنو کہتا ہے یہ دولت کی غلط تقسیم کی وجہ سے ہے۔ مارکس اس سلسلے میں کہتا ہے . . .

اس کے بعد وہ مارکس اور اینجلز کی تھیوریاں سناتا ہے۔ مگر جو کتابوں میں لکھا ہے۔ اور جو زندگی ان کے سامنے ہے اس میں کہیں نہ کہیں ایک فرق موجود ہے۔ آنے والے خوش آئند دنوں کا خواب دیکھتے دیکھتے ہم مر جاتے ہیں۔ ہمیشہ سے مرتے آ رہے ہیں۔ ایک نسل کے بعد دوسری نسل، دوسری کے بعد تیسری۔ مگر اس کالی سرنگ سے باہر آنے کا راستہ نہیں ملتا۔

دروازہ کھلتا ہے اور ایک بے حد سفید بے داغ کھدر کے لباس میں ایک بہت صاف ستھرا اور چکنا آدمی باہر آتا ہے۔ اور سہدیو کو دیکھ کر چونک جاتا ہے۔

ارے تم ہو سہدیو۔؟

وہ بھی حیرت زدہ ہو کر کھڑا ہو جاتا ہے، پھر اس کو پہچاننے میں دیر نہیں لگتی۔ وہ جگیشر دسادھ ہے۔ جو اب جگیشر پرشاد سنگھ ہے۔ یعنی جے پی سنگھ

ارے تم یہاں بیٹھے ہو۔؟ اندر کیوں نہیں آئے۔؟ چلو چلو اندر بیٹھتے ہیں۔

اندر کمرے کا منظر اور حیرت زدہ کرنے والا ہے۔ فرش پر موٹا دبیز قالین بچھا ہے۔ ایک طرف قیمتی صوفہ پڑا ہے۔ چھوٹی سی الماری جس کے شیشے لگے ہیں سے انگریزی شراب کی بوتلیں قطار میں سجی صاف دکھلائی دے رہی ہیں۔ اس الماری کے اوپر سانپ اور نیولے کا ایک ماڈل رکھا ہوا ہے۔ سانپ نے نیولے کے جسم کو لپیٹا ہوا ہے اور نیولا سانپ پر اپنے نوکیلے دانت نکالے حملہ آور ہے۔

لڑائی کا ایک اور منظر۔!

ہار کس کی ہوگی۔؟

سہدیو حیرت میں ہے، یہ سب ہوا کیسے۔؟ جو تین آدمی ایک ساتھ اپنے اپنے گاؤں سے اس کالی دھرتی پر اترے تھے۔ ان میں جگیشر بھی تھا۔

مگر یہ سب ہوا کیسے۔؟

جگیشر اس کی حیرت کو دلچسپی سے، اور شاید کسی قدر غرور سے دیکھ رہا ہے۔ وہ مسکراتا ہے۔

تم سہدیو بھائی جہاں کے تہاں رہ گئے۔

اس کے کپڑوں پر لکھی، اس کے چہرے پر بکھری اور اس کی آنکھوں میں جمی غریبی کو وہ دیکھ سکتا ہے۔ کوئی بھی دیکھ سکتا ہے۔ اس لئے حیرت نہیں ہوئی اس کو جگیشر کے اس ریمارک پر۔ جگیشر جان گیا ہے کہ وہ غریب ہے۔ وہ جان گیا ہے وہ کس ابھاؤ میں زندگی گزار رہا ہے۔ سب کچھ تو دکھلائی دے رہا ہے صاف صاف، مگر پھر بھی اندر کہیں کھرونچ لگتی ہے۔ کسی گوشے میں خراش کی ایک لمبی لکیر خون اور تکلیف سے بھرنے لگتی ہے۔

یہ کولفیلڈ ایسی جگہ ہے نا سہدیو بھائی کہ یہاں کچھ کرنے کے لئے، بننے کے لئے بہت سے تگڑم کرنے پڑتے ہیں۔ راستے کے کانٹوں کو ہٹانا پڑتا ہے۔ جو چیز رکاوٹ بنتی ہے اس کو ایک دم سے صاف کر دینا پڑتا ہے۔ اب مجھی کو دیکھو، اگر میں کپل سنگھ کی چاکری میں پڑا رہتا تو ساری زندگی اسی کی جی حضوری میں گزر جاتی، وہ سب سے اونچا آدمی تھا اسی لئے میں نے اسی پر ہاتھ صاف کیا اور خود مالک کا داہنا ہاتھ بن گیا۔ پھر اس کی شراب کی دکانوں پر قبضہ کیا، پھر راشن کی دکانیں ہتھیائیں، پھر نوٹ سے نوٹ نکالتا گیا۔ مگر تم یار پیادہ ہی رہ گئے۔

شطرنج کے کھیل میں جو پیادہ قدم قدم دشمنوں کے وار سے بچتا بچاتا جب بساط کے آخری سرے تک پہنچ جاتا ہے تو وہ جس خانے میں وہ اترتا ہے وہی مہرہ بن جاتا ہے۔ کبھی کشتی، کبھی گھوڑا، کبھی فیل اور کبھی وزیر۔ جگیشر ایک ایسا ہی پیادہ ہے۔

جگیشر نوکر کو بلا کر کہتا ہے۔

دو چائے لے آؤ۔ اور فریج میں قلاقند رکھا ہے، پلیٹ کے لئے وہ لیتے آنا

پھر وہ سہدیو سے پوچھتا ہے۔

کتنے لڑکے ہیں تمہارے۔؟

دو لڑکے اور ایک لڑکی ——— سب سے بڑا یہی ہے؟ —— ہاں؟

ہم نے بہت لیٹ شادی کی۔ میں یہاں آیا تھا تو میری شادی ہو چکی تھی ایک لڑکا بھی تھا۔ آج کل وہ دہرادون میں پڑھ رہا ہے۔ دوسری بیوی سے دو بچے اور ہیں۔!

تم نے دوسری شادی کرلی۔؟

پہلی کا دیہانت ہوگیا تھا۔ کیا کرتا۔

نوکر ٹرے میں دو کپ چائے لاکر رکھتا ہے۔ اسی ٹرے میں فریج سے نکالا ہوا فلا قند بھی ہے۔ جگیشر فلا قند کی پلیٹ راجندر کی طرف بڑھاتا ہے۔

لو بیٹے کھاؤ۔!

پھر وہ نوکر سے مخاطب ہوتا ہے۔

میم صاحب۔ سے کہو صاحب بلا رہے ہیں۔ ان کے ایک پرانے دوست آئے ہیں۔

اس کی جگیشر کی گفتگو پر تعجب نہیں ہوتا۔ پیسہ آدمی کو مہذب بنا دیتا ہے اور آداب گفتگو بھی۔۔۔۔

سلک کی قیمتی ساری میں سجی سنوری خوبصورت شہری عورت آکر اس کو نمستے کرتی ہے۔

یہ میری بیوی رچنا ہے۔ گریجویٹ ہے۔ جتنا لکھا پڑھی اور خط و کتابت کا کام ہوتا ہے سب یہی کرتی ہے۔

عورت کی عمر بہت کم ہے۔ شاید جگیشر کی عمر سے آدھی۔ چہرے پر نہ خوشی ہے نہ آسودگی۔ بلکہ ایک تناؤ ہے۔ یا شاید زخم خوردگی کا غصہ۔۔ یا اہانت کی جھلاہٹ۔۔۔ شاید یہ احساس بھی اس کے اندر کہیں گرہن بن کر موجود ہو کہ وہ بکی گئی ہے، اس کو خریدا گیا ہے۔

راجندر نے کھانے کے لئے ایک فلا قند اٹھایا اور پھر گھبرا کر رکھ دیا

بہت ٹھنڈا ہے۔

کسی نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا مگر سہدیو دھیرے سے پھیکار کر بولا

کھاؤ۔!

جگیشر اب اپنی بیوی سے سہدیو کا تعارف کروا رہا تھا۔

ہم تین آدمی جو گاؤں سے اکٹھے سہرساکو یری میں آئے تھے ان میں سے ایک یہ سہدیو بھی تھا۔ ایک رحمت میاں تھے جو بے چارے ایکسیڈنٹ میں مر گئے میں رچنا سے کہتا ہوں کہ کان کے اندر گھٹنے سے کوئلہ کاٹتا تھا اور ڈھو ڈھو کر کوئلہ بوجھتا بھی تھا تو اس کو میری بات کا یقین نہیں آتا۔ لو اب پوچھ لو اس سے۔

رچنا دھیرے سے مسکراتی ہے۔ جواب نہیں دیتی۔ کسی چیز کا بھی اظہار نہیں کرتی۔ صرف اپنے اندر کا زخم سہلاتی ہے۔

اب سہدیو بڑی مشکل میں پڑ گیا ہے۔ اس کی جیب میں رکھی عرضی جو کانوں تک پہنچی ہے۔ وہ کیا بولے۔؟ وہ عرضی کیسے دے؟ اس سلسلے میں اس کو بہت سی ایسی باتیں بھی بولنی پڑیں گی جو کم از کم رچنا کے سامنے نہیں بولی جائیں گی جب جگیشر اکیلا تھا تب ہی اس کو بات کرنی چاہئے تھی۔ اس سے بڑی بھول ہو گئی۔

رچنا اس کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ جاتی ہے۔

آپ اتنے دنوں بعد آئے ہیں تو کھانا کھا کر ہی جائیے گا

وہ گھبرا جاتا ہے۔ نہیں نہیں کام بہت ہے۔ مجھے ابھی ڈیوٹی بھی جانا ہے۔

کہاں کام کر رہے ہو۔؟

پتھر کھیڑا کولیری میں

اور میں ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۲ء تک ہو

بس سرداری کر رہا ہوں، وہ بھی پارٹ ٹائم۔

مگر یار تم نے بتلایا نہیں کہ کیسے آگئے ادھر کوئی کام تو نہیں ہے۔؟

کام۔؟ وہ چونکتا ہے۔ جیب میں پڑی عرضی جیسے زندہ ہو کر سانس لینے لگی ہے۔ مگر وہ اسے وہیں دبا دیتا ہے۔

نہیں۔ دھنباد آیا تھا سوچا تم سے ملتا چلوں

کچھ غلطی ہو گئی اس سے۔ ایک موقع ملا تھا، ایک سانس۔ وقفہ، وہ عرضی اس کے ہاتھ میں پکڑا سکتا تھا مگر وہ ایسا نہیں کر سکا چوک گیا۔ اس کو اپنی بزدلی پر بہت غصہ آیا۔ وہ کبھی آگے بڑھ کر وار نہیں کر سکتا۔ اس وقت بھی نہیں جب دشمن اس کی زد میں ہو۔ وہ صرف اپنے آپ کو بچانا چاہتا ہے۔ ایک بھی چوٹ کھانا نہیں چاہتا، ایک بھی زخم اٹھانا نہیں چاہتا مگر کسی بھی لڑائی میں کیا یہ ممکن ہے۔؟

وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے

اچھا اب چلوں گا۔

وہ سب کھڑے ہو جاتے ہیں۔ رچنا رسمی طور پر بولتی ہے۔

کبھی اپنی مسز کو لے کر آئیے۔

وہ مسکراتا ہے۔ آف کورس

جگیشر اس کو چھوڑنے باہر گیٹ تک آتا ہے۔ گیٹ پر دونوں ہاتھ ملاتے ہیں۔ جگیشر اس کا ہاتھ چھوڑتا نہیں ہے ویسے ہی ہاتھ پکڑے پکڑے کہتا ہے

اگر کبھی پیسوں کی ضرورت آ پڑے یا کوئی دوسرا کام تو سیدھے میرے پاس چلے آنا۔

یہ گالی تھی جو اس کو دی گئی۔ یا شاید ایک سیدھا وار تھا جو اس کے چہرے پر پڑا۔ وہ تلملا یا، تڑپا، اور گیا دھواں دھواں ہوتے چہرے کو دوسری طرف موڑ کر آگے بڑھ گیا۔۔۔ ۔۔۔ بائی۔

باقی صفحہ ۲۰۵ پر دیکھیے



## سلیم شہزاد

# نفطاشبیہ

### اظہاریہ

کلام خدا سنگ ظلمت گپھاؤں میں نازل ہوا ہے
گپھائیں اوستا و قرآن کی آیتوں کی امیں ہیں
گپھاؤں میں ویدوں کے اشلوک گہرے ہیں
آیات و اشلوک
جو شور و صورت کے ہیں حسن داتا
جو ہیں رقص و تمثیل کی روپ ریکھا

### حمدیہ

وہ دستِ ہنر کس کا ہے
جس نے پتھر عدم کو نمو نقش دے کر
ہمیں رقص و رفتار و پرواز کا حسن بخشا
ہمیں نطق و نور و نظر سے نوازا
ہمیں سنگ دیوار پر آئینوں سا سجایا
ہمارے لیے سنگ ظلمت میں
سورج، ستارے، دیے اور جگنو اتارے
ہمارے لیے سنگ صحرا میں دریا بہائے
ہمارے لیے سنگ دریا میں رستے بچھائے
ہمارے لیے سنگ رستوں پہ اشجار اگائے
ہمارے لیے سنگ اشجار میں گل کھلائے
ہمارے لیے سنگ ساعات کو موسموں کی قبائیں پہنائیں
ہمارے لیے سنگ دھرتی پہ فصلیں اگائیں
وہ دستِ ہنر کس کا ہے
جس نے سورج اگا کر
سمندر بہا کر
ہوائیں چلا کر
کڑی دھوپ رستوں پہ سایے بچھا کر
ہمیں دائرہ دائرہ ساعتوں کے طلسمات میں بھیج کر
پھر ہمیں تا ابد غارِ آگہی کی
سیہ سنگ دیوار پر جڑ دیا ہے
(کلامِ خدا سنگ ظلمت گپھاؤں میں نازل ہوا ہے)

### نعتیہ

ازل تا ابد رات پھیلی ہوئی تھی
کہیں آسمانوں میں گم روشنی تھی
سیہ جنگلوں میں ۔ مہاکال بھیرو
کہ ڈمرو پہ ڈائن کوئی ناچتی تھی
سیہ تن، برہنہ، گلے منڈ، مالا
لہو تر زباں کالی پھنکارتی تھی
بلاؤں، چڑیلوں، پشاچ اور بھوتوں
میں بے انت اماوس کو ہڑبونگ سی تھی
سحر کے سب آثار وہم و گماں تھے
ازل تا ابد رات پھیلی ہوئی تھی
اسی بے نہایت سیہ سمت جنگل
میں پھر یوں ہوا شمع اک جل رہی تھی
منات و ہبل، لات و عزیٰ کے بن میں
ہوائے ھُو الحق لہرنے لگی تھی
سبھی نقش آزر سے اسمِ حق سے
حس و خاک سب اس کی جادوگری تھی
جب اقرا، کی آیات کا نور پھیلا
صنم خانۂ دہر میں کھلبلی تھی
اذا جاءَ نصرُ و فتحٌ من اللہ
محمدؐ کے لب پر ضیارِ حمد کی تھی

### دعائیہ

خدایا ہمیں تا ابد غارِ آگہی کی
سیہ سنگ دیواروں میں قید مت رکھ
ہمیں روشنی دے حرا کی
جو اقرا، کی آیات میں تو نے بھیجی
ہمیں وسعتیں دے بھی فضا کی
جو تیرہ مہرومہ کی طرح دستِ پاکِ رسولِ امیںؐ میں
ہمیں اپنے پتھر عدم میں ملا کر حرارت نمو و نما کی
ہمیں شعلگی دے، دعا کی
جو سنگیں طلسمات کو موم کر دے
خدایا، ہماری ازل تا ابد رات کو بھی سحر دے

### غزلیہ

کوئی رہ گزر پتھروں میں
کہ درپیش ہے پھر سفر پتھروں میں
ندی، پیڑ، گھر، لوگ سب سنگ صورت
ہیں پتھر کے سب بحر و بر پتھروں میں
ہے سنگاب میں چاند کا عکس پتھر
رواں سنگ کشتی، نہ جانے کدھر پتھروں میں
ہمیں سنگ پیکر فقط برگ و بار و گل اس کے
ہوا سنگ سایہ شجر پتھروں میں
وہیں تو مقید ہے شہزادیٔ ہفت گل، شہرِ افسوں کے ظلما،
جو گھر پتھروں میں
نہ جانے کہ ہے کس بددعا کا یہ سنگ آسیب ان پر
کہ پتھر ہوئے لوگ سب سر بسر، پتھروں میں
ہے اپنی ہی آواز کے دائروں کی اسیری
صدائے اثر پتھروں میں

### تمثیلیہ

غار : وہ دستِ ہنر کس کا تھا
جس نے مجھ کو تراشا
دھنگ میں تو پتھر یگوں سے سیاہی میں موجود رنگ
تراشا مجھے اور مرے اپنے پیکر سے مجھ کو چھڑایا
میں اب اپنے پتھر خلار دائرے میں
کسی چشم بے نور سا خود کو ڈھونڈوں
وہ دستِ ہنر اب کہاں ہے
میں خود اب کہاں ہوں
آواز : میں خود اب کہاں ہوں
کہاں ہوں
کہاں ہوں
ظلمت : میں پتھر خلار دائرے کا مقدر
ازل تا ابد رات کا میں سمندر
میں بے لمس، بے نام، بے سمت، بے پر

مگر میں گراں تا گراں پر کشا ہوں
سیہ سنگ آسیب ہوں، بد دعا ہوں

غار : وہ دستِ ہنر کس کا تھا
جس نے انساں کو میرا مقدر کیا
جس نے مجھ کو تراشا
وہی اب سیہ سنگ آسیب میں
اس گراں تا گراں رات میں
چاند، سورج، ستارے سجا دے
مجھے جگمگا دے

(اُجالا)

آواز : وہ دستِ ہنر کس کا ہے
جو اُجالے کو ظلمات کے نقش سے کھینچ لائے
عدم ہی کی خامشی میں جو اثبات کا پیڑ اُگائے
خموشی کو صوت و صدا سے سجائے

کورس : خدایا، ہمیں اپنے پتھر عدم میں
عطا کر حرارت نمود و نما کی
ہمیں شعلگی دے، دعا کی
جو سنگیں طلسمات کو موم کر دے
خدایا، ہماری ازل تا ابد رات کو بھی سحر دے

## نثریہ

میں غار کو تہذیب کا منبع خیال نہیں کرتا کیونکہ انسان
غار کی تہذیب سے قدیم تر ہے۔ چاہے اسے حالات
اور موسموں کے جبر کے تحت غاروں میں سکوت اختیار
کرنی پڑی ہو، وحشی درندوں کی طرح، حادثات سے
عاری، جبلتوں اور احساسات کے تابع ہو کر بے معنی
زندگی گزارنی پڑی ہو اور چاہے اسے کچا گوشت
کھانا، خون پینا اور پتوں اور کھالوں سے تن چھپانا پڑا
ہو (کیا وہ صرف موسموں کی شدت سے بچنے کے لیے کر کے
گرد کھال لپیٹتا تھا؟)
مذاہب اور فنون نے غاروں میں جنم ضرور لیا ہے لیکن ان کی
نمود کے وقت غاروں کے باہر تہذیب کا شور و شغب اپنے
عروج پر تھا
انسان غار کی تہذیب سے قدیم تر ہے

## غنائیہ

پہاڑوں میں جادو جگائیں
پہاڑوں کو، آؤ، سجائیں
سنیں ہم بے دھرتی کے جو گیت
کھیتوں، کھوؤں، جنگلوں اور گاؤں کی گلیوں میں
ممتا کے، نوروں کے جھولوں میں
آتا، ٹراتا، ملن اور برہا میں
سیجوں پہ، آنگن میں
وہ گیت دیپک پہاڑوں کے من میں جلائیں
سے ہم بے دھرتی کے جو گیت
انہیں ضربِ تیشہ پہ ہم مل کے گائیں
پہاڑوں میں جادو جگائیں
کتھائیں ہر ہما گنگ کی
اُمل اور دتل کے اندھیرے ملن کی
رشی لوک، اَلوک، اپسرا لوک
اور دیو، داو کے ساگر منتھن کی
لکھی ہیں جو بوسیدہ پتوں پہ
ہم نے سنی ہیں جو چوپال، گھر اور گلیوں میں
ہم نے پڑھی ہیں جو مٹھ، مندروں میں کتھائیں
انہیں پتھروں پر سجائیں
پہاڑوں میں جادو جگائیں

## خمتیہ

گپھاؤں میں ہر سنگ اساطیری ہے
گپھاؤں میں تمثیل و تصویر و نغمہ کی جادوگری ہے
گپھاؤں میں آیات و اشلوک کی شعلگی ہے
گپھاؤں کے سنگیں اندھیروں میں

الہام کی روشنی ہے
گپھاؤں میں (لگتا ہے)
اب بھی غار دن میں کوئی ہے

۳۲۳ منگلوار وارڈ، مالیگاؤں۔ ۴۲۳۲۰۳ (مہاراشٹر)



شاہین مفتی

# آدھی لڑکی

میرے دھیان میں رہنے والے
چھوڑ یہ پاگل پن کی باتیں
میں تو آدھی لڑکی ہوں
آدھی آگے، آدھی پیچھے
آدھی اوپر، آدھی نیچے
آدھی اندر، آدھی باہر
آدھی موم اور آدھا پتھر
آدھی جنگل آدھا صحرا
آدھی پیاس اور آدھا دریا
آدھی تہمت اور آدھا آنگن
آدھی موت اور آدھا جیون
آدھی آنکھ اور آدھا سپنا
سوچ ذرا کوئی آدھی چادر
اوڑھ کے بھی
سو سکتا ہے؟

شعبہ اردو گورنمنٹ کالج برائے خواتین۔ گجرات (پاکستان)



خوشحال زیدی

۸۰ غفار منزل ایکسٹنشن، جامعہ نگر، نئی دہلی - ۱۱۰۰۲۵

## بچوں کا ادب اور

# کہانی کی تکنیک

کہانی نسلِ انسانی کی سب سے قدیم صنفِ ادب ہے۔ دنیا کا کوئی معاشرہ، ملک یا خطۂ ارض ایسا نہیں ہے، جہاں کہانی کسی نہ کسی شکل میں موجود نہ ہو۔ صرف یہ ہے کہ جو قومیں ترقی کے مدارج اور مراحل سے گزر چکی ہیں، ان کی کہانیاں ان کے ادب کا ایک نمایاں جزو بن گئی ہیں۔ لیکن جو معاشرے نوشت و خواند کی صلاحیتوں سے ابھی تک محروم ہیں ان کی کہانیاں سینہ بہ سینہ سفر کرتی رہتی ہیں اگر یہ کہانیاں ہم تک پہنچتی بھی ہیں تو ان لوگوں کی زبان میں جن کا تعلق ان معاشروں سے نہیں ہے بلکہ سیاحوں، تذکرہ نویسوں اور سفرناموں کے توسط سے۔ ان کہانیوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ کہانیاں سننے سنانے میں ہم سے کس قدر مختلف ہیں اور وہ تہذیبی لوازم جن سے ہماری کہانیاں بہرہ ور ہیں، اُن سے ان کہانیوں کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔

دنیا میں کہانیوں کا رواج قدیم زمانے سے چلا آتا ہے، مصر و بابل کے افسانے، ایسپ کی کہانیاں (حکایاتِ لقمان) کافی مشہور ہیں۔ اپنشد उपनिषद में ایک تمثیل ملتی ہے کہ کتوں نے جمع ہو کر ایک سردار کو چنا اور کھانا مانگنے کے لیے شور کرنا شروع کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ہندوستان کی پہلی لکھی ہوئی کہانی ہے۔ علاوہ ازیں مہابھارت میں بہت سی کہانیاں درج ہیں۔ اس کے بعد جاتک जातक کی کہانیاں ملتی ہیں یہ وہ پالی کہانیاں ہیں جو گوتم بدھ سے منسوب کی جاتی ہیں۔ حیوانی کہانیوں پر جاتک کے بعد سنسکرت کی مشہور کتاب "پنچ تنتر" ملتی ہے۔ "پنچ تنتر" کی کہانیاں بچوں کے عالمی ادب میں جاوداں ہیں۔

اصنافِ ادب میں بچوں کی کہانی سب سے زیادہ پسند ہے جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ کہانی میں کوئی واقعہ ہوتا ہے۔ بچہ یہ معلوم کرنے کی دھن میں رہتا ہے کہ واقعہ کہاں ہوتا ہے؟ کن لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے؟ کہانی کے کردار اور مقام اس لیے اہم ہیں کہ وہ اس واقعہ کا جزو ہوتے ہیں، جس سے بچے کو دلچسپی ہوتی ہے۔ بچے کو اس سے بھی دلچسپی نہیں کہ یہ واقعات کیوں اور کیسے ہوتے ہیں؟ ادب کی خوبی ہے کہ وہ بچے کے ذہن میں یہ سوال پیدا کرے کہ اب کیا ہونے والا ہے؟ اس طرح کہانی میں اچنبھے اور تجسس کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔

کہانی بڑوں کے لیے ہو یا چھوٹوں کے لیے اس کا لازمی اور بنیادی تعلق اپنے معاشرے، اپنے عہد اور اپنے جغرافیائی کوائف سے ہوتا ہے۔ کہانی کے توسط سنجیدہ، علمی، سائنسی اور معلوماتی موضوعات بھی اتنے لطیف اور دلکش بن جاتے ہیں کہ بچہ کا ذہن انھیں بآسانی قبول کر لیتا ہے۔ مجموعی طور پر بچوں کی کہانی میں درج ذیل خصوصیات ہونی چاہئیں:

(۱) کہانی دلچسپ ہونی چاہئے اس میں تجسس و تحیر بہت ضروری ہے۔ "آگے کیا ہوگا؟" یہ سوال بچے کی دلچسپی کو برقرار رکھتا ہے۔

(۲) بچوں کی کہانی کو اصولاً بچوں کی کہانی ہونا چاہئے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ محض زبان سلیس اور آسان ہو بلکہ یہ بھی کہ کہانی میں جو کچھ بیان کیا جا رہا ہے وہ ان بچوں کی ذہنی استعداد سے فطری مطابقت رکھتا ہو، جن کے لیے یہ کہانی لکھی گئی ہے۔ بچوں کی کہانی میں موضوع، خیال اور اسلوب بیان تینوں میں ربط ہو تاکہ بچہ کہانی کی سچائی اور اہمیت کو محسوس کر سکے۔

(۳) کہانی میں ایسے واقعات بیان کیے جائیں جو بچوں کے ذہنوں پر منفی اثر نہ ڈالیں۔ مثلاً یہ نہیں ہونا چاہئے کہ کہانی میں دہشت انگیز عنصر کو اس قدر اہمیت دی جائے کہ بچہ خوفزدہ ہو کر رہ جائے۔

(۴) کہانی میں جو واقعات بیان کیے جاتے ہیں وہ خیالی ضرور ہوتے ہیں لیکن یہ واقعات ہماری روزمرہ کی زندگی میں پیش آتے رہتے ہیں یا آسکتے ہیں۔ اس کہانی کسی حد تک سچی ہوتی ہے۔ کہانی میں روزمرہ کی زندگی کے واقعات پڑھ کر بچوں کو جو تجربہ حاصل ہوتا ہے وہ خود ان میں پڑھنے کی دلچسپی پیدا کرتا ہے۔ اس

میں وسعت پیدا کرتا ہے اور ان کے لیے خیال آرائی کا موقع فراہم کرتا ہے۔ بچوں کو ایسی کہانیاں اچھی لگتی ہیں جن میں حادثات ہوں، مبالغہ ہو، ایسے حادثات اور داستانیں سچی بھی ہو سکتی ہیں۔

(۵) بچوں کے لیے ایسی کہانیاں ہونی چاہیئے جو ان کی تخیل کی نشو و نما میں معاون ہو سکیں آج کے سائنسی دور میں جو بچے سانس لے رہے ہیں وہ ذہنی طور پر گذشتہ نسلوں کے بچوں سے کافی حد تک مختلف ہیں۔ تاہم تخیلاتی کہانیوں کو سرے سے رد نہیں کیا جا سکتا۔ اس دور میں شاید یہ کہا جائے کہ جنوں اور پریوں کی طلسماتی گرفت سے بچوں کو آزاد کرانا لازمی ہے تاکہ ان میں سائنسی ذہن پیدا ہو سکے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ ابھی انسان کا ذہنی ارتقاء اس نقطے پر نہیں پہنچ سکا جہاں وہ قطعاً معروضی ہو کر رہ جائے اس کا بچپن تو خاص طور پر بہت حد تک ہے اور تخیل کی اس دنیا سے نہیں نکل سکا ہے جہاں اب بھی اڑن کھٹولوں اور کل کے گھوڑوں پر پرواز کے واقعات ملتے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر انسان ایسے اس دیکھے سپنے۔ دیکھتا تو وہ نہ کوئی ہوائی جہاز اڑا سکتا تھا نہ دریاؤں پر پل بنا سکتا، اگر وہ ایسے قصے اور کہانیاں نہ سنتا تو اس کے دماغ کو اتنی اچھی طرح سے سوچنے کی عادت بھی نہ پڑتی۔ آخر کار وہ سوچتے سوچتے خواب دیکھتے دیکھتے ایک ایسی دنیا بنانے میں کامیاب ہو گیا جو اس دنیا سے ملتی جلتی ہو۔

بچوں کو مہماتی کہانیوں خصوصاً بحری اور خلائی سفر کے قصوں میں بہت دلچسپی ہوتی ہے کیونکہ خلا اور سمندر دونوں ہی بچوں کو ایک نامعلوم دنیا میں لے جاتے ہیں۔ سمندر کی بے پناہ قوتوں سے بچے مرعوب ہوتے ہیں۔ اس کی اتھاہ گہرائیوں کے متعلق وہ جاننا چاہتے ہیں۔ مصنف کے ساتھ خود خیال آرائی کرنے میں بچوں کو بڑا مزا آتا ہے۔

اسی بات کو واضح کرنے کے لیے باعتبارِ موضوع کہانی کو مختلف حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) **باتصویر کہانیاں** :- بچوں کی دنیا بڑی رنگ برنگی ہوتی ہے۔ اس رنگ برنگی دنیا میں بچے خوبصورت رنگوں اور رنگین تصویروں میں محو ہو جاتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ تصویر کا تعلق براہ راست بچے کے دل اور اس کی نظر سے ہوتا ہے۔ تصویر بچے کی قوتِ متخیلہ کو بڑھاوا دیتی ہے۔ بچہ تصویر کی مدد سے مختلف چیزوں، جانوروں، پیڑ پودوں، پرندوں، مختلف ممالک اور اقوام کی تہذیب و تمدن، وہاں کے رسم و رواج سے واقف ہو سکتا ہے، پریوں کی شہزادی، جن، دیو، بھوت اور سائنسی ایجادات نیز اس قسم کی دوسری چیزوں اور کرداروں سے بچے کی شناسائی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باتصویر کہانیوں کی مقبولیت بچوں کے ادب میں دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ بلکہ ایک اعتبار سے یہ دور باتصویر کہانیوں اور کامکس COMICS کا دور ہے۔

اکثر بچوں کی پسند اور ناپسند کے بارے میں ایک عام خیال یہ ہے کہ بچے کالی اور سفید تصاویر کو کم پسند کرتے ہیں یا وہ بنیادی رنگوں کی تصاویر کو زیادہ پسند کرتے ہیں؛ میرے خیال میں بچے ایسی تصاویر کو زیادہ پسند کرتے ہیں جن میں کوئی کہانی بیان کی گئی ہو، خواہ وہ سادہ تصاویر ہوں یا رنگین؟

دورِ جدید میں پیڑوں کی کہانیاں ہوں یا کوئی سائنس فکشن، بچے انھیں باتصویر پسند کرتے ہیں۔ عام مشاہدہ ہے کہ ریڈیو کے مقابلے بچوں کی کہانیاں اور دیگر پروگرام ٹیلی ویژن پر زیادہ مقبول ہیں خواہ وہ رنگین ٹی وی ہو یا سادہ۔ جائنٹ روبوٹ، فینٹم، اسٹار ٹریک، ہی مین اور اسپائڈر مین کی مقبولیت اس کا ثبوت ہے باتصویر کہانی بچے کے شعور ہی کو نہیں اس کے خیالات اور جذبات کو بھی بے حد متاثر کرتی ہے۔

باتصویر کہانیوں کے ضمن میں کامکس ( COMICS ) کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ جس نے ایک مسئلہ کی شکل اختیار کر لی ہے۔ کامکس کی بے پناہ مقبولیت کے سبب میں بچوں کے ذہنوں پر منفی اثرات بھی مرتسم ہو رہے ہیں۔ ان کامکس کی کہانیاں نہ روایتی ہیں نہ ہی مافوق الفطرت۔ ان میں عام طور پر فکشن کے نام پر عجیب و غریب واقعات پیش کیے جاتے ہیں۔ بچہ ان کہانیوں اور واقعات کو بس پڑھتا ہی نہیں تصویروں میں کھو جاتا ہے تھری ڈی ( 3-D ) کامکس اس سلسلے کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ بچہ ایک مخصوص چشمہ لگا کر ان کامکس کو گھنٹوں دیکھتا ہے اور رفتہ رفتہ پڑھنے سے بیزار ہو جاتا ہے۔ مناسب ہو گا کہ کامکس میں پوری داستان تصویروں کی شکل میں نہ بیان کی جائے بلکہ درمیان درمیان کچھ جگہ چھوڑ کر تحریر کے ذریعہ کہانی کو بڑھایا جائے۔ اس طرح بچہ پڑھنے پر بھی مجبور ہو گا۔

(۲) **اساطیری داستانیں** :- اساطیر ( MYTH ) داستانوں میں ان قومی رہنماؤں اور سورماؤں کے کارناموں کا ذکر ہوتا ہے جن کی زندگی اس قوم کے لیے مشعلِ راہ بھی ان داستانوں سے ہمیں ماضی کے حالات اور واقعات کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے اساطیری داستانوں کو جب بچوں کے لیے از سرِ نو لکھا جائے تو اس کے اسلوب اور مواد کو حتی الامکان باقی رکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور رسم کی پوری روایت، حسن اور تخیل کی برداری کو بھی محفوظ رکھنے کی کوشش کی جانی ہے۔

**روایتی قصے** :- روایتی قصوں کا سلسلہ زبانی کہانیوں کی شکل میں صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ یہ روایتی قصے، کہانیاں؛ آپ بیتی اور جگ بیتی کے ساتھ ساتھ داستانوں کے

مہماتی سفر اور ان کی سوانح عمریوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ روایتی قصوں کا تعلق عام لوگوں سے ہوتا ہے۔ ان کرداروں کی بہادری، شجاعت، وفاداری کے کارنامے ان کی محبت اور نفرت کی داستانیں، نیک انسانوں کی نیک دلی اور بُرے لوگوں کی بدی کے تذکرے کم و بیش یکساں ہوتے ہیں۔ ایسی کہانیوں میں بچوں کو ہیرو کی غیر معمولی بہادری سے دلچسپی ہوتی ہے ان مخصوص حالات میں وہ ہیرو کے ساتھ خود بھی اپنے آپ کو بہادر اور بے خوف تصور کرتے ہیں نیز اپنی قوتِ متخیلہ کو پرواز کا موقع دیتے ہیں۔ روایتی کہانیاں بچوں کے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ اپنے ادبی اور تہذیبی سرمائے میں سے انتخاب کر کے بچوں کو ایسے قصے فراہم کریں جو ان کے دل و دماغ کو روشن کر دیں۔ جو ان میں اچھے کام کرنے کی لگن پیدا کریں۔ ان میں صبر و استقلال کے جذبات کو ابھاریں اور مصیبت میں بہادری او ایمانداری سے کام کرنے کی طرف مائل ہوں۔

(۴) **تاریخی کہانیاں :-** تاریخی کہانیاں۔ اساطیری داستانوں اور روایتی کہانیوں سے مختلف ہیں تاریخی کہانیوں میں تاریخ اور تخیل کا امتزاج ہوتا ہے۔ تاریخی کہانی کا موضوع اور مرکزی خیال تاریخ کے ٹھوس واقعات ہوتے ہیں مصنف اپنے اسلوبِ نگارش اور تخیل کا خوبصورت رنگ چڑھا کر ان تاریخی واقعات کو خوبصورت اور موثر بناتا ہے۔ اکبر اعظم، عدل جہانگیر، رضیہ سلطان، اشوک، مہارانا پرتاپ، نوشیرواں عادل اور ناصر الدین وغیرہ کی کہانیاں اس ضمن میں آتی ہیں تاریخی کہانیوں کو بچے بہت دلچسپی سے پڑھتے ہیں کیوں کہ ان میں پرانے زمانے کے حالات اور واقعات، رسم و رواج، رہن سہن، مذہبی عقاید اور سماجی ماحول کے بارے میں عجیب و غریب باتیں سن کر بچوں کو خاص حیرت ہوتی ہے۔ اکثر وہ بادشاہوں، شہزادوں اور شہزادیوں کے تخیل میں پریوں کی کہانیوں سے کہیں زیادہ لذت محسوس کرتے ہیں۔ تاریخی کہانیوں کو پڑھنے کے بعد بچے کے لیے تاریخ صرف جنگ، تاج پوشی اور عیش و عشرت کا بیان ہی نہیں رہ جاتی بلکہ اس زمانے کے حالات معلوم کرنے کا ایک بہترین ذریعہ بھی بن سکتی ہے۔

(۵) **اخلاقی اور مذہبی کہانیاں :-** اخلاقی کہانیوں کا خاص مقصد بچے کی سیرت کی تعمیر اور اخلاقی اور تعلیمی اقدار کی تلقین ہے۔ بچوں کے ادب میں پنچ تنتر کی کہانیاں اخلاقی اور تعلیمی نقطۂ نظر سے ہی تخلیق کی گئی ہیں۔ یہی حال "بوستاں" اور "گلستاں" کی حکایت کا ہے۔ دونوں کتابوں کے ہر قصے کا مقصد کسی نہ کسی قسم کی پند و نصیحت کرنا ہے۔ بچوں کے لیے اخلاقی کہانیاں لکھنا خاصا مشکل کام ہے۔ اس کے ذریعہ ادیب اخلاقی قدروں کی ترغیب دیتا ہے۔ ادیب میں تخلیقی جوہر اور تخلیقی صلاحیت ہونا چاہئے۔ معمولی لکھنے والے اخلاقی کہانیوں کو پیچیدہ اور خشک بنا دیتے ہیں۔

بچے کو نیک سیرت بنانے اور اس کے اعلیٰ کردار کی تعمیر میں اخلاقی کہانیوں کے ساتھ مذہبی کہانیوں کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ مذہبی کہانیوں میں مذہبی و مذہب کی بنیادی باتیں اور مذہبی بزرگوں کی زندگی کے حادثات اور ان کے کرداروں پر مبنی کہانیاں بچوں کی عام فہم زبان میں پیش کی جاتی ہیں۔ عام طور پر بچوں کی دلچسپی ایسی کہانیوں میں کم ہوتی ہے۔ ایسی کہانیوں کو دلچسپ، پرکشش اور موثر بنانے میں مصنف کے اسلوبِ نگارش اور طرزِ تحریر کی بڑی اہمیت ہے۔

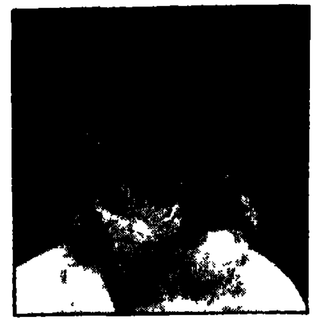
(۶) **پریوں کی کہانیاں :-** پریوں کی کہانیاں بچوں اور بڑوں میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔ اس سائنٹفک دور میں جب انسان چاند پر پہنچ گیا ہے۔ خلا میں کئی کئی دن رہ کر دنیا والوں سے باتیں کر سکتا ہے اور توہمات کی دنیا کو بہت پیچھے چھوڑ آیا ہے، اس وقت بھی پریوں کی کہانیوں کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ چنانچہ ان کہانیوں میں کوئی ایسی بات ضرور ہے جس نے ان کہانیوں کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ پریوں کی کہانیاں صدیوں سے بچوں کی دلچسپی کا مرکز بنی ہوئی ہیں۔

پریوں کی کہانیوں میں عام طور پر عجیب و غریب واقعات کردار اور ایک خوابناک فضا ہوتی ہے۔ یہ عجیب و غریب واقعات سیدھی سادی زبان میں بیان کیے جاتے ہیں۔ بچے کے تخیل کی پرواز اسے ایسی خوبصورت اور دلچسپ دنیا کی سیر کراتی ہے جہاں پہنچ کر وہ خود کو فراموش کر دیتا ہے اور اپنے آپ کو ایک نیا کردار تصور کرنے لگتا ہے جو سبز پری اور لال پری کے ساتھ پرستان کی سیر کرتا ہے۔

پریوں کی کہانیاں بھی روایتی کہانیوں سے قدرے مختلف ہیں۔ روایتی کہانیوں میں تمثیل اور حقیقت دونوں کی آمیزش ہوتی ہے جب کہ پریوں کی کہانیاں تخیلی ہوتی ہیں۔ آج سائنس کا دور ہے، حقیقت پسندی کا دور ہے۔ اسی وجہ سے تخیلی کہانیوں کی افادیت میں کچھ شبہ کیا جانے لگا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہماری روزمرہ کی گفتگو، ماحول، رسم و رواج اور تمثیلوں میں ان پریوں، ان پریوں کی کہانیوں کا تذکرہ آتا ہے۔ چاند پر پہنچنے اور آسمانوں کی سیر کرنے کا عملی تصور پریوں کی کہانی ہی کا ہے۔ ہوائی جہاز، راکٹ اور مصنوعی سیارہ وغیرہ پریوں، جنوں اور دیووں کی تخیلاتی کہانیوں کا ہی عملی نتیجہ ہے۔

پریوں کے قصے بچوں کے ادب کی میراث ہیں جن کا اپنا ایک طرز، اپنی ایک تکنیک ہے۔ کہانی کی طرز جدید یا روایتی جو بھی ہو اس کا مقصد لوک کہانی کا حو

[باقی صفحہ ۱۰ پہ دیکھیے]



## خوشتر کرانوی

ترا ذکر چاروں دشاؤں میں ہے
گر روشنی خوش نواؤں میں ہے

کسی آئینے کی ضرورت نہیں
مرا چہرہ تیری دعاؤں میں ہے

کسی گھر کی لذت نہیں جانتا
ترے تن کی خوشبو ہواؤں میں ہے

دیے کی گواہی کہاں جائے گی
ترا بندہ کتنے خداؤں میں ہے

مری ماں کی عظمت مہکنے لگی
مرا باپ میری کتھاؤں میں ہے

● ور ملی مرل، کرانہ (راجستھان)



## محبوب انور

آئینے میں اک کہانی قید ہے
میں ہوں باہر میرا ثانی قید ہے

لوگ اب دھونے لگے چہروں کے داغ
آئینوں میں جیسے پانی قید ہے

خوف، الجھن، بے یقینی، بے بسی
لگ رہا ہے زندگانی قید ہے

میں بھی پریوں کے نگر میں آ گیا
مجھ کو بھی اب داستانی قید ہے

بخش دوں اپنے خطا کاروں کو میں
یہ روایت تو پرانی قید ہے

روح کو مل جائے گی اک دن نجات
جسم کا پیکر تو فانی قید ہے

بے ہنر لوگوں کا اب آیا ہے دور
اہل فن کی قدر دانی قید ہے

● رسگہ سدھ ہسدی ہائی اسکول مرلی پورہ ۵ ۱۲۳۲

## راز اٹاوی

ستم ہے جانے پہچانوں کی بستی
نظر آتی ہے بیگانوں کی بستی

پہاڑوں کا لہو گرما رہی ہے
دہک کر آئینہ خانوں کی بستی

وہ صحرا میں دعائیں مانگتے تھے
نظر آئے گلستانوں کی بستی

ستم کی آندھیاں لہرا رہی ہیں
اجڑ جائے گی انسانوں کی بستی

خرد مندوں کی سندیں اڑ گئی ہیں
سجی ہے جب سے دیوانوں کی بستی

نشیمن میں مقید ہو گئی ہے
سمٹ کر رنج سامانوں کی بستی

سفینہ راز دریا میں ہے لیکن
کنارے پر ہے طوفانوں کی بستی

● ایس ایس کالج اکٹر پرال حال اٹاوہ ۱۔ ۲ ۲ یوپی



سُلطان سُبحانی

۱۹۳ - ایم - ایچ-بی - کالونی ، مالیگاؤں - ۴۲۳۲۰۳

# برگد پر بسا ہوا گاؤں

اتنا گھنا کہ جیسے ایک پورا جنگل میرے سر پر۔
اتنا بلند کہ جیسے آسمان میرے کاندھوں پر۔
شاخیں ہی شاخیں ـــ پتے ہی پتے ـــ جیسے سبز خزانہ کا جھومتا ڈھیر میرے بدن پر۔

یہ میں ہوں برگد کا ایک جوان درخت کہ برگد صرف بوڑھا ہی نہیں بلکہ جوان بھی ہوتا ہے۔ بہت سارے لوگ اس گاؤں کو میری وجہ سے پہچانتے ہیں کیوں کہ اس گاؤں کا نام سنتے ہی ان کے ذہن میں سب سے پہلا میرا چھتنار وجود سر ابھارتا ہے۔ سبز گھنا، بلند قامت اور دور تک پھیلا ہوا لیکن کچھ دنوں سے میری وجہ سے اس گاؤں میں ایک تنازعہ پیدا ہو گیا ہے بڑا عجیب سا تنازعہ... اتنے خوبصورت گاؤں میں ایسا تنازعہ ؟ تعجب تو ہوتا ہے لیکن خوبصورتی تو بذاتِ خود ایک متنازعہ شئے ہے۔ اس کے بارے میں کوئی وضاحت کرنے سے پہلے ضروری سمجھتا ہوں کہ اس گاؤں کا تعارف کرا دوں۔ بڑا شریف گاؤں ہے یہ۔ یہاں ہندو بھی ہیں، مسلم بھی اور سکھ بھی، اس گاؤں کی سب سے بڑی خوبصورتی یہ ہے کہ اس کے دونوں کناروں کو دو ندیاں چھو کر گزرتی ہیں۔ برسات کے دنوں میں اکثر ان میں سیلاب آجاتا ہے اور کبھی کبھی پانی اتنا بڑھ جاتا ہے کہ میری چھاؤں کو چوم کر واپس ہوتا ہے۔ بے حد حسین گاؤں ہے یہ۔ گھروں کی منڈیروں اور چھپّروں پر سیم، لوکی، ترئی اور کریلے کی بیلیں، آنگنوں میں مرچی اور سبزی ترکاریوں کے پودے۔ تلسی، گیندے کے پھول، دیواروں پر اپلوں کی قطاریں۔ چولھوں سے اٹھتا اور چھت، چھپّروں سے بلند ہوتا ہوا دھواں۔ توے پر باجرے کی روٹیاں، ہانڈیوں میں دال اور ترکاریوں کی خوشبو، اِدھر اُدھر کھلیان، ندیوں پر کپڑے دھوتی ہوئی عورتیں، راہ میں چھلکتی ہوئی گاگروں کی قطاریں۔ پتنگ اڑاتے اور گلی ڈنڈا کھیلتے ہوئے بچے اور اوپر ہواؤں کی گنگناتی موجیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے پورا گاؤں رنگین خوابوں میں کھویا ہوا ہے۔ گاؤں سے کچھ فاصلے پر بڑے شہروں کی طرف جانے والی پکّی سڑک ہے۔ ایک طرف سبز اور کھوری پہاڑیاں، جن کے دامن میں سُرخ کویلو کے کچھ بنگلے، لیکن ان بنگلوں کا گاؤں سے کوئی تعلق نہیں اگر کچھ ہے تو صرف اتنا کہ نظر آجاتے ہیں یا منظر میں شریک ہو جاتے ہیں۔

میں اُگا تو ہوں مانک رام کے گھر کے سامنے لیکن میری شاخیں کئی آنگنوں پر سایہ فگن ہے۔ اگر میری ایک شاخ مہادیو کے آنگن میں جاتی ہے تو دوسری رحیم انصاری کے گھر کی منڈیر پر، تیسری مدن گرو جی کی چھت تک پہنچتی ہے تو چوتھی شمبھو ڈھولکی کے چھپّر تک، اور میرے نیچے گھنی چھاؤں میں ایک چھوٹا سا میدان، جہاں گاؤں کے بچے کھیلتے کودتے ہیں۔ گائے، بھینس اور بکریاں جگالیاں کرتی ہیں۔ کتے اونگھتے ہیں اور مرغیاں ایک طرف کچروں کے ڈھیر کو الٹ پلٹ کرتی ہیں۔ میرے نیچے اگر بہت سے پریوار ہیں تو بہت سے پریوار میری شاخوں پر بھی ہیں چیل، کوّے، بگلے، رنگ برنگی چڑیاں، چیونٹے، مکڑیاں اور سب سے بلند شاخ پر شہد کی مکھیوں کا چھتہ اور پھٹی ہوئی پتنگیں ـــ شاید کوئی نہیں جانتا کہ میری جڑیں اتنی لمبی ہیں کہ زیرِ زمین سفر کر کے دونوں ندیوں کے نیچے سے اس پار تک پہنچ گئی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ پورا گاؤں میری جڑوں کے اوپر ہے لیکن کچھ دنوں سے میں پورے گاؤں میں لوگوں کا معتوب اور موضوعِ بحث ہوں کہ لگتا ہے میری حیثیت شجرِ ممنوعہ کی سی ہو گئی ہے۔ وجہ ؟ وہی تنازعہ ہے جس نے ایک عجیب اور پُر اسرار انداز اختیار کر لیا ہے یا اسے دانستہ ایسا انداز دے دیا گیا ہے۔ میں اس حقیقت اچھی طرح جانتا ہوں کیونکہ تمام مناظر کا چشم دید گواہ ہوں۔ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ خوبصورتی بذاتِ خود ایک متنازعہ شئے ہے۔ بات یہیں سے چلتی ہے۔

یہ متنازعہ شے مہادیو کے گھر میں موجود ہے۔ اس کی لڑکی کلا (چندر کلا) اتنی خوبصورت ہے کہ اسے دیکھ کر... گستاخی معاف خود مجھے اپنے درخت ہونے کا شدید افسوس ہونے لگتا ہے۔ کندن کی طرح چمکتا ہوا رنگ، گلاب کے پھول کی طرح نازک جلد، بے انتہا سڈول اور مرمریں جسم اور چہرے کے نقوش اتنے تیکھے کہ دیکھنے والا مجسم چشم حیرت ہو جائے۔ یہ چندر کلا ہے یا طلسم کدہ؟ اکثر میں سوچتا ہوں کہ اگر اتنی خوبصورت لڑکی شہر میں ہوتی تو یقیناً وہاں خون خرابہ ہو جاتا مگر چونکہ یہ گاؤں ہے اس لیے بات صرف برگد خرابہ تک پہنچی ہے۔ یعنی ساری آفت میرے سر آگئی ہے۔ اس کی وجہ کچھ یوں ہے۔

مانک رام کا لڑکا پرشی کر بہت دنوں سے اس لڑکی کے لیے مجنونانہ اور عجیب و غریب حرکتوں کا مرتکب ہو رہا تھا۔ مونچھوں کو تاؤ دینا، بالوں کو طرح طرح سے آراستہ کرنا، رنگ برنگے کپڑے پہننا، گلے میں رومال اور کمر پر انگوچھا باندھنا۔ انگلیوں میں چار پانچ انگوٹھیاں دکھانا، خوامخواہ ہنسنا، زور زور سے گانا اور اتنا جھوم کے چلنا کہ جیسے بیل نے پورا کھیت چر لیا ہو۔ مانک رام اپنے لڑکے کے اس سوانگ کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا کہ بڑا بانکا اور سجیلا نکلا ہے اس کا بیٹا۔

یہ ساری باتیں تو اس تنازعہ کا "آغاز" ہے۔ اب میں اس اہم واقعہ کی طرف آتا ہوں جس کے باعث اس تنازعہ کی بنیاد پڑی۔ ہوا یہ کہ ایک سنسان دوپہر میں پرشی کر بہت چپکے سے میرے تنے پر چڑھتا ہوا اس موٹی شاخ پر پہنچ کر چھپ گیا جو مہادیو کے آنگن تک جاتی تھی۔ میں حیران ہوا کہ پرشی کر وہاں کیوں چھپا ہوا ہے مگر تھوڑی ہی دیر بعد جب میں نے آنگن میں کلا کو بال کھولتے ہوئے دیکھا تو سارا معاملہ سمجھ میں آگیا کہ وہ ٹاٹ کے پردے کے پیچھے نہانے کی تیاری کر رہی ہے اور اوپر میری شاخ پر پتوں کی اوٹ میں پرشی کر سراپا چشم! — کچھ لمحوں بعد کلا نے ساڑی کا پلو گرا دیا اور بلاوز اتارنے لگی۔ بلاؤز اترا تو آنگن میں بجلی سی چمک اٹھی۔ پرشی کر کی حالت عجیب سی ہو گئی۔ چہرہ لونچکا، آنکھیں پھٹی پھٹی ——— ہاتھ پاؤں کپکپانے لگے اور سینہ ایک دم تیزی سے پھولنے پچکنے لگا۔ کلا کمر تک عریاں۔ خوبصورت، سڈول اور کندن کی طرح جگ مگ کرتا ہوا جسم۔ سمندر کی طرح گرجتا ہوا شباب۔ سارا منظر پرشی کر کی تاب و ضبط سے باہر، لیکن آگے منظر اور زیادہ آتش افشاں تھا۔ بلاوز اتارنے کے بعد وہ ساڑی اتارنے لگی۔ پرشی کر زور زور سے کپکپانے لگا۔ چہرہ لال ہو گیا۔ ہونٹ خشک ہو گئے۔

آنکھیں اور پھٹ گئیں اور ساڑی جونہی اتری وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور آنگن میں "دھم" سے گر پڑا ——— کلا چیخ اٹھی۔ اس کی ماں بھاگی ہوئی آئی۔ پرشی کر خود بھی اٹھ کر بھاگا۔

بظاہر تو بات یہیں ختم ہو گئی۔

لیکن مہادیو کے آنگن میں تغیر آگیا۔ ٹاٹ کے پردے کی جگہ لکڑی کے تختے لگ گئے اور دونوں میاں بیوی میری اس شاخ کو بار بار گھورنے لگے جو ان کے آنگن پر تھی۔ اس واقعہ کا تذکرہ انھوں نے کسی سے بھی نہیں کیا کیونکہ اس طرح انھیں اپنی عزت پر حرف آنے کا ڈر تھا۔ کلا کی شادی پاس کے گاؤں میں کسی بڑے گھرانے میں طے تھی۔ ظاہر ہے کہ اگر چرچا ہوتا تو بات وہاں تک پہنچ جاتی۔ تو یہ تھی تنازعہ کی بنیاد۔ اس کے چند دنوں بعد مہادیو کی بیوی مہادیونی نے پرشی کر کی ماں سے چیخ چیخ کر کہا ———

"تمھارے برگد کے سارے پتے میرے آنگن میں آکر ڈھیر ہوتے ہیں۔ اس درخت کو کاٹ ڈالو، ورنہ ٹھیک نہ ہوگا۔"

پرشی کر کی ماں نے کہا "کسی میں ہمت نہیں جو ہمارے برگد پر آنکھ بھی اٹھا سکے۔ خبردار! آئندہ ایسی کوئی بات نہیں کہنا۔ ورنہ ہاں!"

مہادیونی نے کہا "ورنہ ہاں کیا؟ اپنا برگد اپنے گھر میں سنبھال کے رکھ۔ اس نالائق اور منحوس پیڑ کی چھاؤں بھی ہمارے آنگن میں نہیں آنی چاہیئے۔"

"اری تو اپنا آنگن لے کے جا یہاں سے۔ کل تک تو اس کی چھاؤں میں مہارانی کی طرح بیٹھ کر اپلے تھاپتی تھی اب کیوں جل رہی ہے میرے برگد سے۔ اری منحوس اس کا احسان مان کہ اس نے تیرے بھیلچر آنگن کو دھوپ سے بچایا۔"

"خبردار! جو میرے آنگن کو بھیلچر کہا، ارے میں تو بڑا جھونٹا نوچ لوں گی۔"

"اور میں تو تجھے اپلوں کی طرح تھاپ کر رکھ دوں گی۔ تھپ تھپ تھپا تھپ، ہاں!"

جھگڑا یوں چلا کہ شام ہو گئی۔

پھر چند دنوں بعد اسی جھگڑے کی وجہ سے مہادیو اور مانک رام کے درمیان لاٹھی بازی کی نوبت تک آگئی۔ گاؤں کے لوگوں نے جھگڑا تو خیر رفع دفع کر دیا لیکن کچھ ہی دنوں بعد مہادیو اور اس کی بیوی نے مجھے زمین سے جدا کرنے کا ایک نیا راستہ ڈھونڈ نکالا۔ میں سوچتا ہوں کہ ان تمام واقعات میں آخر میرا قصور کیا ہے لیکن میری بے گناہی کا گواہ کوئی بھی نہیں ہے۔

پرشتی کر بھی خاموش ہے۔ وہ بھلا کیا کہے گا۔ اس کے دماغ پر تو صرف کلا کی دھن سوار ہے۔

اب گاؤں میں مہادیو اور مہادیونی میرا چرچا اس طرح کرنے لگے ہیں

مہادیو کہتا ہے "مدن گروجی کچھ سنا تم نے؟ یہ برگد کا جو پیڑ ہے نا، اس پر بھوتوں کی ایک پوری فوج نے پڑاؤ ڈال دیا ہے۔ کل رات میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"مہادیو تمھیں وہم ہوا ہوگا۔ میں نے تو ایسا کبھی نہیں دیکھا۔"

"گروجی میں سچ کہتا ہوں۔ میں نے ان کے بادشاہ کو بھی دیکھا ہے۔ بہت ہی خطرناک ہے۔ انتہائی ہٹا کٹا۔ کالا کھجنگ۔ اس کے ماتھے پر پانچ آنکھیں ہیں، لال لال۔"

"پانچ آنکھیں؟"

"ہاں، وہ ہر رات ہمارے گاؤں پر حملہ کرنے کا پروگرام بناتے ہیں میں اپنے آنگن میں بیٹھ کر سب کچھ سنتا رہتا ہوں۔"

"اگر سچ ہے تو بہت بری بات ہے۔"

"مہادیونی کہتی ہے۔"

"عائشہ بہن۔ تم نے سنا ہوگا کہ آج کل اس منحوس برگد پر بھوتوں کی فوج رہنے لگی ہے۔ میں نے ان سب کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ان کا جو بادشاہ ہے نا، اس کے ماتھے پر پانچ کان ہیں۔"

"پانچ کان اور وہ بھی ماتھے پر؟"

"عائشہ بہن میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔ کئی بھوتوں کے سر پر تو سینگ بھی ہیں۔ جب ہم سو جاتے ہیں تو وہ پتوں کی آڑ میں سے نکل کر اچھلنا کودنا شروع کر دیتے ہیں۔ تم انصاری بھائی اور اپنے بیٹے خلیل سے بھی کہہ دو کہ ان بھوتوں سے ہوشیار رہیں۔ کل وہ میری روٹیوں کی پوری ٹوکری اٹھا لے گئے۔۔"

"اچھا؟"

ہاں بہن۔ گاؤں میں مصیبت آگئی ہے اس نگوڑے برگد کی وجہ سے۔"

میں بے انتہا اداس ہو گیا ہوں۔ گاؤں کی گلی گلی میں میرا چرچا ہونے لگا ہے جو بھی ادھر سے گذرتا ہے، میری طرف یوں دیکھتا ہے جیسے میں خود کوئی آسیب ہوں۔ میری چھاؤں میں ننھے منے بچے نہیں کھیلتے۔ مویشی تو کیا اگر مرغیاں بھی آتی ہیں تو ان کے مالک انھیں ہشکار کرلے جاتے ہیں۔ چھاؤں ویران ہو گئی ہے۔ شام میں جب پرندے آکر مجھ پر بسیرا کرتے ہیں تو بھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے میں تنہا ہوں۔ صبح سویرے ان تمام پرندوں کی چہچہاہٹ بھی مجھے اچھی نہیں لگتی۔ بادل اور دونوں ندیوں کو دیکھ کر بھی مجھے خوشی نہیں ہوتی نرم اور مست ہواؤں سے بھی میرے اندر کوئی میٹھی لہر نہیں اٹھتی۔ ایسا لگتا ہے کہ سب کچھ بدل گیا ہے۔ لیکن میرا مالک مانک رام بے حد مضبوط آدمی ہے۔ وہ اپنی جگہ چٹان کی طرح اٹل ہے اور دن بھر ان تمام الزامات کی تردید کرتا رہتا ہے۔

"بس کہتا ہوں یہ سب بکواس، اور میرے برگد کے ساتھ سازش ہے ارے یہ درخت تو وہ آکاش ہے جس کے نیچے بڑے بڑے مہاتماؤں کو گیان حاصل ہوا۔ ہمارے رشیوں، منیوں اور سنتوں نے اس درخت کو کتنا بلند درجہ دیا ہے۔ کیا تم سب کچھ بھول گئے؟ ایک قابلِ احترام درخت پر ایسے اوچھے الزامات۔۔۔۔ چھی چھی۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ ہر شام جب سورج نیچے ڈھلکتا ہے تو اس کی شاخوں سے کتنی چھتنار شعاعیں پھوٹتی ہیں۔۔"

مہادیو داگھ حولدار سے کہتا ہے۔

"حولدار جی، تم تو اپنی سائیکل لے کر شہر چلے جاتے ہو اور کئی کئی دن ادھر کا رخ نہیں کرتے۔ تمہیں پتہ ہے آج کل گاؤں میں کیا ہو رہا ہے۔؟"

"ہاں میں نے کچھ سنا تو ہے۔"

"تو میں ایک بہت ہی اہم بات بتلاتا ہوں۔ یہ سوں برگد کے بھوتوں نے تمھاری سائیکل پنکچر کر دی تھی۔"

"نہیں بھئی، دونوں پہیوں کے ٹیوب بہت پرانے ہو چکے تھے۔ انھیں بدلنا پڑا مگر تمھیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟"

میں نے اپنے آنگن میں سے ان کی ساری باتیں سنی تھیں۔ کل رات شمبھو ڈھولکی کے چھپر پر انھوں نے دو تین پتھر بھی پھینکے تھے۔ میں تو کہتا ہوں کہ ان بھوتوں سے چھٹکارا پانے کا ایک ہی راستہ ہے کہ برگد کے پیڑ کو کاٹ دیا جائے ورنہ پورا گاؤں برباد ہو جائے گا۔

ایک طرف شمبھو ڈھولکی کرتار سنگھ سے کہتا ہے۔

"سردار جی، کل شام میں تم کون سا گانا گا رہے تھے؟"

ارے شمبھو تم نے بھی تو سنا تھا۔ میرا کوئی نہیں دنیا میں ست گوردسری اکال۔"

"واہ کیا پاٹ دار آواز ہے مگر سردار جی! کل رات برگد کے بھوت تمھاری آواز کا بہت مذاق اڑا رہے تھے۔"

"کیا کہہ رہے تھے وہ؟"

"کہہ رہے تھے کہ سردار جی کی آواز پھٹے بانس کی طرح ہے۔"

"ارے ان بھوتوں کی ایسی تیسی۔"

"سردار جی ان بھوتوں نے میرے چھپر پہ پتھراؤ کیا۔ میرا ایک مٹکا بھی توڑ دیا۔ ہمیں چاہیے کہ بھوتوں کے اس مسکن کو اکھاڑ پھینکیں۔"

شیر و شاہ رحیم انصاری سے کہتا ہے۔

رحیم بھائی تم اپنے کرگھے پر دن رات کھٹ پٹ کھٹ پٹ کرتے رہتے ہو ذرا گاؤں کا بھی خیال رکھو۔ بہت بڑی آفت آگئی ہے یہاں۔"

"کیسی آفت"؟

مانک رام کے برگد پر بھوتوں کی فوج رہنے لگی ہے۔ وہ ہمارے گاؤں کا صفایا کر دے گی۔"

"ایک دم غلط بات ہے۔ میں نے تو ابھی تک کوئی بھوت نہیں دیکھا۔"

"لیکن میں نے تو دیکھا ہے۔ ایک بھوت کے ماتھے پر سات آنکھیں تھیں اور ان ناکوں سے بھک بھک دھواں نکل رہا تھا۔ یہ ساری آفت برگد کے درخت کی وجہ سے ہے۔"

"تم نے خواب دیکھا ہوگا۔ میں نہیں مانتا۔ برگد کا درخت تو ہمارا ہمسایہ بھی ہے اور محسن بھی۔ اس نے ہمیں چھاؤں دی ہے، اور بھوت لیتے کیسے ہیں؟ یہ سب وہم ہے۔ بکواس! تم لوگ کبھی نہیں سدھرو گے۔"

"رحیم بھائی تم نے میری بات سے انکار کر کے اچھا نہیں۔ لگتا ہے تم گاؤں کا بھلا نہیں دیکھ سکتے۔ میں پنڈت جی اور رانا مکھیا سے تمہاری شکایت کر دوں گا۔"

"جاؤ کر دو۔ میں حق گو ہوں کسی سے ڈرتا نہیں۔"

گاؤں کی عورتیں اور جوان لڑکیاں بھی عجیب عجیب باتیں کرتی ہیں۔

"شوبھا! اُس آسیبی درخت کے پاس سے کبھی نہ گزرنا۔ وہاں اور بھوتوں کی فوج ہے۔ ذرا بچ کے رہنا! گوری عورتوں کو وہ بہت پسند کرتے ہیں۔

"گوری عورتوں کو بھوت ہی تو پسند کرتے ہیں۔ بے چاریوں کے نصیب۔۔۔"

"میں نے سنا ہے شکنتلا کے گھر میں بھوت گھس گیا تھا۔"

"ہاں، اس بھوت کے ماتھے پر بھی مونچھیں تھیں اور اس نے شکنتلا سے کہا تھا کہ میں شکنتلا ناٹک دیکھنے آیا ہوں۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر شکنتلا ڈر کے مارے بے ہوش ہو گئی۔"

تو کیا بھوت نے ناٹک نہیں دیکھا؟"

"دیکھا ہو گا، کسے پتہ۔"

"ہری دیو مرچی والا کہتا ہے۔" برگد کے درخت کو فوراً کاٹ ڈالنا چاہیے ورنہ بہو بیٹیوں کی عزت مٹی میں مل جائے گی۔"

میں شب و روز ساری باتیں سنتا رہتا ہوں۔ پورے گاؤں میں صرف دس بارہ لوگ ہی میری حمایت میں ہیں۔ باقی سب یہ کہتے ہیں کہ مجھے کاٹ دیا جائے۔ میں بہت ہی رنجیدہ اور فکرمند ہوں۔ کیونکہ مہادیو کی حمایت میں رانا مکھیا بھی ہے، وید جی اور پنڈت جی بھی۔ آگے موت کے سوا مجھے اور کچھ بھی نظر نہیں آرہا ہے۔ موت نہیں بلکہ قتل۔ میں دیکھتا ہوں کہ مہادیو اکثر اپنے آنگن میں بیٹھ کر اپنی کلہاڑی کو سان لگاتا رہتا ہے۔ میں اکثر سوچتا رہتا ہوں کہ میں نے زندگی کے لئے جتنی جد و جہد کی تھی سب بے کار ہو گئی۔ اسی زندگی کے لیے تو میں نے اپنی جڑیں کتنی دور دور تک پھیلا دی تھیں تاکہ میں صدیوں زمین پر سایہ فگن رہوں۔ گاؤں کے ننھے منے بچے میری چھاؤں میں کھیلتے رہیں اور یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا رہے لیکن جب میں اپنی سنسان چھاؤں کو دیکھتا ہوں تو مجھے بے حد تکلیف پہنچتی ہے۔ کوئی بھی بچہ میرے قریب نہیں آتا۔ برسات کا موسم آگیا ہے۔ بادل جھوم جھوم کے آرہے ہیں بھیگی بھیگی مست ہوا چلنے لگی ہے۔ لیکن اس بار میری شاخوں پر ایک بھی جھولا نہیں ڈالا گیا۔ ورنہ ہر سال برسات میں مجھ پر کتنی بہار رہتی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس خوبصورت گاؤں کو کیا ہو گیا ہے۔ پرستی کرے جو غلطی کی تھی اس کی سزا مجھے کیوں دی جا رہی ہے۔ کیا مجھے کاٹنے کے بعد مہادیو کی عزت میں چار چاند لگ جائیں گے۔ کیا کلا کو نگاہِ غلط سے پھر کوئی نہیں دیکھے گا؟ ایک دو دن سے سننے میں آرہا ہے کہ گاؤں کی چوپال پر میرے بارے میں پنچایت ہو گی۔ مجھے کاٹنے کا حکم نامہ جاری کیا جائے گا۔ میرا مالک بہت غصے میں ہے۔ وہ پورے گاؤں سے جھگڑا کرنے کیلئے تیار ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ میرے جیتے جی کوئی میرے برگد کو خراش نہیں پہنچا سکتا۔ رحیم انصاری، خلیل، جگناتھ، سنکر پٹیل اور ایکانتھ وغیرہ مانک رام کی حمایت میں ہیں۔ ان سب کا کہنا ہے کہ ہم اس درخت کو گاؤں سے جدا نہیں ہونے دیں گے۔ میں بہت الجھن میں مبتلا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ گاؤں میں خون خرابہ ہو جائے۔ میں بے زبان ہوں، نہ تو کسی کو اپنی بے گناہی کا ثبوت دے سکتا ہوں اور نہ ہی وہ واقعہ بتلا سکتا ہوں جس کے باعث یہ آندھی چلی ہے۔ ابھی ابھی پتہ چلا ہے کہ پنچایت آج رات ہی میں ہو گی۔ گاؤں کے لوگوں میں بڑا جوش و خروش ہے۔ مانک رام بھی بے انتہا طیش میں ہے۔ لاٹھی لے کر پورے گاؤں میں گشت کرنے لگا ہے۔ کئی لوگوں سے حجت بھی کر چکا ہے مگر لوگ بھی مجھے ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ پنچایت ہونے

کے اعلان پر خوشی میں اچھل کود رہے ہیں جیسے پہلے سے جانتے ہیں کہ فیصلہ ان کے حق میں ہوگا۔

لیکن شام میں ہلکی ہلکی بارش ہو جانے کی وجہ سے رات میں پنچایت نہیں ہو سکی۔ رانا مکھیا نے اعلان کر دیا ہے کہ پنچایت اب دو تین دن بعد ہوگی۔ جب آسمان صاف رہے گا۔

شاید میری زندگی کے چند دن اور بڑھ گئے ہیں۔ کاش آسمان پر ہمیشہ گھنگھور گھٹائیں چھائی رہیں اور پنچایت کبھی نہ ہو سکے۔

آج میں صبح سے بہت زیادہ اداس ہوں۔ کیونکہ آسمان بالکل صاف ہے۔ یقیناً آج رات پنچایت ضرور ہوگی۔ رانا مکھیا نے بھی آج کی پنچایت کا اعلان کر دیا ہے۔ شام ڈھل چکی ہے اور بادلوں کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔ میں بار بار آسمان کی طرف دیکھتا ہوں مگر لگتا ہے کہ آسمان بھی مجھ سے خفا ہے۔ ایک ایک لمحہ مجھ پر بہت بھاری گزر رہا ہے۔

چوپال پر روشنی کر دی گئی ہے۔

لوگ رات کا کھانا کھا کر گھروں سے باہر نکلنے لگے ہیں۔

لوگ چوپال کی طرف جانے لگے ہیں۔

لوگ چوپال پر جمع ہونے لگے ہیں۔

لوگ چوپال پر بیٹھ کر کھسر پھسر کرنے لگے ہیں میں اپنی جگہ سے سارا منظر دیکھ رہا ہوں۔

چبوترے پر رانا مکھیا، وید جی، پنڈت جی، مہادیو، شمبھو ڈھولکی، داگھ حولدار اور گاؤں کے بوڑھے براجمان ہو چکے ہیں۔ ایک طرف مانک رام پرستی کر، رحیم انصاری، خلیل، شنکر پٹیل، جگتاب اور ایکناتھ وغیرہ بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک سمت عورتیں ہیں۔

پنڈت جی پنچایت کی کارروائی شروع کرتے ہیں۔

گاؤں کے مہان باسیو! آپ سب کو یہاں اس لیے بلایا گیا ہے کہ ہمارے گاؤں میں کچھ دنوں سے بھوتوں کی ایک فوج نے مانک رام کے برگد پر پڑاؤ ڈال دیا ہے۔ ہمارے گاؤں میں اب تک جتنے بھی نقصانات ہوئے ہیں انھیں بھوتوں کی کارستانیاں ہیں۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ ان بھوتوں نے ہمارے گاؤں کو تباہ کرنے کا پروگرام بنا رکھا ہے۔ یہ بھوت شکنتلا ناٹک بھی دیکھتے ہیں اور برگد کا وہ درخت ان کی کمین گاہ ہے جہاں سے چھپ چھپ کر وہ ہم پر حملہ کرتے ہیں، اس لیے اگر وہ درخت کاٹ دیا جائے تو بھوتوں کا اڈہ ہی ختم ہو جائے گا۔"

مہادیو کہتا ہے "میں ایسا سمجھتا ہوں کہ پنڈت جی کے ارشاد کے بعد اب اور کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں رہتی۔ بہت سے لوگوں نے ان بھوتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا بھی ہے۔ یہاں سب اس بات کی گواہی کیلئے تیار ہیں۔"

ایک ساتھ بہت سی آوازیں اٹھتی ہیں۔ "ہم سب گواہی دیتے ہیں"

پنڈت جی ہاتھ کے اشارے سے سب کو خاموش کراتے ہیں اور رانا مکھیا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ رانا مکھیا مانک رام کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پنڈت جی مانک رام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

مانک رام تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"ہاں"، مانک رام کھڑے ہو کر کہتا ہے "میرے درخت کے بارے میں ابھی جو کچھ بھی کہا گیا ہے اس میں کوئی بھی صداقت نہیں ہے۔ یہ من گھڑت قصے ہیں، اس طرح کی باتیں تو کسی کے بارے میں اڑائی جا سکتی ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ کچھ لوگ مجھ سے اپنی دشمنی نکال رہے ہیں۔ میں صاف کہتا ہوں کہ میرے جیتے جی کوئی میرے درخت کا پتہ بھی نہیں ہلا سکتا۔"

رحیم انصاری کہتے ہیں "اس درخت کے بارے میں خواہ مخواہ افواہیں پھیلا دی گئی ہیں۔ میں خود اس کی چھاؤں میں رہتا ہوں مگر ابھی تک میں نے کوئی بھوت دیکھا نہ میرا کوئی نقصان ہوا۔"

"میں نے بھی کوئی بھوت نہیں دیکھا" خلیل زور سے کہتا ہے "یہ درخت تو اس گاؤں کی شان ہے۔ اتنا عظیم درخت دور دور تک کسی بھی گاؤں میں نہیں ہے۔ ہمیں اس پر فخر کرنا چاہئے کہ اس کی چھاؤں میں ہمارے بہت سارے بچے کھیل کر بڑے ہوئے۔"

جگتاب کہتا ہے "اسے کاٹنا بھاری انیائے ہوگا۔ میں ہرگز کاٹنے کے حق میں نہیں ہوں۔"

مہادیو کہتا ہے "تو کیا تم یہ چاہتے ہو کہ بھوت ہمارے گاؤں کو نیست و نابود کر دے۔"

"بھوت کہیں اور نہیں بلکہ تمھارے دماغ میں گھسے ہوئے ہیں۔" ایکناتھ برہم ہو جاتا ہے۔ "ہمارے گاؤں کی پیار بھری فضا تم ختم کرنے پر تلے ہو۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے کہ یہ ہوا تم نے اڑائی ہے۔"

مہادیو بھی غصہ میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ "ایکناتھ! میں سمجھتا ہوں تم مجھ سے پچھلے سال کا بدلہ لے رہے ہو۔ کرتار سنگھ اور دسپر ٹوسٹ گواہ ہیں کہ تمھارے بیل کو میں نے نہیں لنگڑا کیا تھا۔"

خلیل کہتا ہے "میں نے خود دیکھا تھا کہ تم نے ایکناتھ کے بیل پر لاٹھی سے حملہ کیا تھا"

پنڈت جی کھڑے ہو کر سب کو خاموش کراتے ہیں۔

" بھائیو ! ہم بیل کے بارے میں نہیں بلکہ برگد کے بارے میں فیصلہ دینے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ آج وقت کی سب سے اہم پکار یہ ہے کہ اپنے گاؤں کو بھوتوں کے وجود سے پاک کر دیں۔ اگر ہم بحث کرتے رہے تو کوئی بھی فیصلہ نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے میں بہتر یہی سمجھتا ہوں کہ سب کی رائے لے لی جائے۔ لہذا جو لوگ برگد کو کٹوانے کے حق میں نہیں ہیں وہ اپنے اپنے ہاتھ اوپر کر لیں۔

اور میں یہ منظر دیکھ کر دم بخود رہ جاتا ہوں کہ اتنے بڑے مجمع میں صرف دس بارہ ہی ہاتھ اٹھے ہیں۔ ارے ! ان ہاتھوں میں تو رشی کر کا ہاتھ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ کہاں گیا وہ ؟ میں حیرت سے ادھر اُدھر دیکھتا ہوں اور جب نیچے اپنے تنے کے پاس دیکھتا ہوں تو بھونچکا رہ جاتا ہوں۔ دو سائے ایک دوسرے سے ہم آغوش ― ایک سایہ کلا کا ہے اور دوسرا پرشی کر کا۔ اس کی آواز آتی ہے۔

" کلا ! جس دن سے میں نے تمہیں اس حالت میں دیکھا ہے میں ابھی تک سو نہیں سکا ہوں۔"

" کیا تمہیں زیادہ چوٹ آئی تھی ؟" کلا کی آواز آتی ہے۔

میں حیران و ششدر سوچتا ہوں کہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں بات اور آگے بڑھ گئی ہے۔ اب تو مجھے واقعی کاٹ دیا جائے گا۔ شاید آج میری آخری رات ہے۔ میں مایوس ہو کر چوپال کی طرف دیکھتا ہوں۔ رانا مکھیا فیصلہ سنا رہا ہے۔

" مانک رام ! تمہیں پورے گاؤں کا فیصلہ ماننا پڑے گا۔ لڑائی جھگڑے کی کوشش بالکل مت کرنا۔ ایک درخت کے لیے خون خرابہ کرنا ٹھیک نہیں ہے اگر تم نے ہمارا فیصلہ نہیں مانا تو تمھارا گھر بھی یہاں دکھائی نہیں دے گا۔ پنڈت جی نے ابھی ابھی کہا ہے کہ یہ شبھ کام کل صبح سورج نکلتے ہی ہو جانا چاہئے لہٰذا کل منہ اندھیرے اس درخت کی کٹائی شروع ہو جائے گی۔"

چوپال تالیوں کی آواز سے گونج اٹھتا ہے۔ لوگ خوشی میں اچھلتے کودتے ہیں۔ سیٹیاں بجاتے ہیں اور مانک رام اپنے ساتھیوں کے ساتھ سر جھکائے ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے واپس ہوتا ہے۔ واپسی میں وہ رحیم انصاری سے صرف اتنا کہتا ہے۔

" اگر میرا درخت کاٹا گیا تو میں مہادیو کے ساتھ اور کئی لوگوں کو ختم کر دوں گا۔"

میں اوپر سے نیچے تک پورا درد میں ڈوب گیا ہوں۔ میری تمام شاخوں اور پتوں نے دم سادھ لیا ہے۔ میں نے جو سوچا تھا صحیح ثابت ہوا ہے۔ یہ واقعی میری آخری رات ہے۔ کل مجھے اس زمین سے جدا کر دیا جائے گا۔ میرے بعد ان پرندوں کا کیا ہو گا جو مجھ پر بسیرا کرتے ہیں۔ ایک جہان تو مجھ پر بھی آباد ہے۔ یہ چیل، کوّے، بگلے، چڑیاں، چیونٹے، مکڑیاں، شہد کی مکھیاں، ان سب کا گھر بکھر جائے گا۔ گاؤں والوں کو سوچنا چاہئے کہ وہ صرف مجھے نہیں بلکہ ایک چھوٹے سے معصوم جہان کو بھی قتل کر رہے ہیں۔ ارے ! ہوا میں یہ ٹھنڈک اور سوندھی سوندھی خوشبو کیسی ؟ میں اوپر دیکھتا ہوں۔ اوپر آسمان سیاہ نظر آتا ہے۔ اچانک بجلی چمکتی ہے تو دیکھتا ہوں کہ پورا آسمان کالے کالے بادلوں سے ڈھک گیا ہے۔ اور ان میں بے پناہ ہیجان ہے۔ میں خوشی میں جھوم اٹھتا ہوں۔

ہوا تیز ہو کر سیٹیاں بجانے لگتی ہے۔

اندھیرا اور گہرا ہو جاتا ہے۔

اور اچانک بہت زور کا سنّاٹا آتا ہے۔

بادلوں کی گرج اور بجلیوں کی کڑکتی ہوئی آواز میں دھواں دھار بارش کا شور۔ .....

دیکھتے ہی دیکھتے ندی نالے بھر جاتے ہیں۔ شکریہ اے طوفان بادو باراں۔ اگر تو صبح تک جاری رہا تو ممکن ہے گاؤں خون ناحق کے داغ سے بچ جائے۔ مگر یہ کیا بارش تو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے بلکہ اور بھی طوفانی ہو گئی ہے۔ پورا گاؤں جاگ اٹھا ہے۔ ہوا کے زور سے بہت سے چھپر اڑ گئے ہیں۔ کئی درخت زمین بوس ہو گئے ہیں۔ لوگ مندروں میں جا کر گھنٹیاں بجانے لگے ہیں۔ میں جس طرف بھی دیکھتا ہوں پانی ہی پانی نظر آ رہا ہے۔ اچانک گاؤں میں شور مچتا ہے۔

" بھاگو ! دونوں ندیوں میں بہت بھاری سیلاب آ گیا ہے۔ بھاگو۔ بھاگو . . ."

اور جب بجلی چمکتی ہے تو میں دیکھتا ہوں کہ دونوں ندیوں کا پانی گاؤں میں گھس آیا ہے۔ پانی کمر سے بھی اونچا ہو گیا ہے۔ لوگ گاؤں سے نکل کر شمال کی سمت بھاگ رہے ہیں اور دونوں ندیوں میں بہت گرجدار اور بلند موجیں اٹھ رہی ہیں۔ ہوا بہت جوش میں ہے۔ بارش بے انتہا تیز اور چاروں طرف طوفان ہی طوفان۔ . . .

مانک رام، رحیم انصاری، جگناتھ، شنکر پٹیل، ایکناتھ وغیرہ

[باقی صفحہ ۳۵ پر دیکھئے]



## نظام ہاتف

ہتھیلیاں ہی نہیں نیک فال اور بھی ہیں
حساب عمر میں کچھ ماہ و سال اور بھی ہیں

نہ رنگتوں سے پڑھے جائیں شجرہائے چمن
ابھی تو خون کے اندر ابال اور بھی ہیں

ہے راستوں پہ مری ہجرتوں کو یورا لقیں
یہ مکڑیاں ہیں تو کچھ احتمال اور بھی ہیں

مرا سخن ہی نہیں شرحِ حرفِ دل اے دوست
کہ اس سوال کے پیچھے سوال اور بھی ہیں

ہیں آنے والے کلوں پر گذشتہ کل کے حساب
کہ سابقات کئی حسبِ حال اور بھی ہیں

بغل میں ہاتھ دبائے کھڑی ہوئی ہے ہوا
ہزار زخم پئے اندمال اور بھی ہیں

◆

میں پیدا ہو بھی گیا، اس نے کن کہا بھی نہیں
میں وہ بیان بنا جو دیا گیا بھی نہیں

جو میرے سر پہ لگا سنگ سر میں پھوٹ گیا
وہ خون بہا ہے کہ اب اس کا خوں بہا بھی نہیں

شگفتِ گل پہ رہا دانت خود شجر کا مرے
وہ اپنے خون کو اب خون مانتا بھی نہیں

نوائے کہنہ میں اک گونج کارفو بھی تو ہے
کسی کا نام تھا اس لب پہ اب جو وا بھی نہیں

ہر ایک زخم نہالِ بدن پہ برگ آور
اڑے جو رنگ مخالف کوئی ہوا بھی نہیں

سفر کی سمت کو رفتار سے بھی نسبت ہے
وہ راہ کیا ہے قالین نقشِ پا بھی نہیں

۲۷۶/جی-۱، ردولان، مراد آباد ۲۴۴۰۰۱



## راشد جمال فاروقی

اب تو وحشت کو بیابان عطا کر یا ر
میرا ، خاکم بدہن، قرض ادا کر یا ر

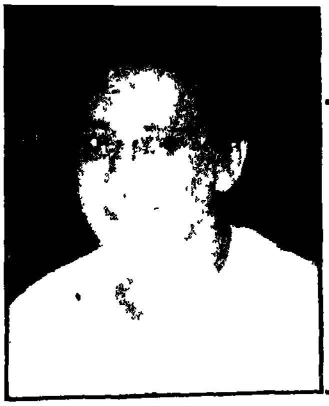
گھومنا ہی جو مقدر ہے زمینوں کا تو
گردشیں اور سوا اور سوا کر یا ر

سر سے نیزے کے تعلق کو کہیں بھول نہ
پھر زمانے میں بپا کرب و بلا کر یا

سانس لینے کا عمل کچھ تو سہل تر ہو
نرم رو ، تازہ و شاداب فضا کر یا ر

ضیاں دیتے ہی رہتے ہیں ہمیشہ ہم
کچھ تو اپنی بھی کبھی ہم سے کہا کر یا

۱۷-۱۵۲۸، آئی ڈی پی ایل ٹاؤن اسٹیشن
ویربھدرا رشی کیش ۲۴۹۲۰۲ (دہرہ دون)




## ندا فاضلی

۱۰۳- امرا پارٹمینٹ، ڈانڈپاڑہ - ۱، کھار (ویسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۵۲


# دیواروں کے بیچ

قسط نمبر ۹

مرتضیٰ حسن اپنے آفس سے نکلتے وقت بے دھیانی میں سیڑھی سے پھسل جاتے ہیں۔ پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ وہ ہوسپٹل کے ایک پرائیویٹ وارڈ میں آرام کر رہے ہیں۔ ان کی دیکھ بھال زینت کر رہی ہیں اس کے دو بھائی اور گھر کے دیگر افراد بھی ساتھ میں ہیں۔ ان کے علاوہ آفس کے کلرک اور چپراسی بھی ہیں جو صبح شام خدمت میں لگے رہتے ہیں۔ ریلوے کے چھوٹے بڑے ٹھیکیدار اور اس شعبہ سے وابستہ دوسرے رشتوں کے ذریعے اپنے مقاصد کی یاد دہانی کراتے ہیں۔ پرسکون بیماری اور مزاج شناسوں کی تیمار داری نے ہسپتال کے کمرے کی رونق بڑھا دی ہے۔ غزل اور موسیقی کا فضا سے سننے والوں میں ہر شام ماسٹر ریاض، نظام الدین اور کبھی کبھی رام نارائن بھی دکھائی دیتے ہیں۔ مرتضیٰ حسن کی نئی غزلیں (جن میں داغ کی شوخیاں زیادہ بے حجاب ہیں) اور زینت بائی کی مترنم آواز، ہر محفل پان اور شراب کے نشے کے ساتھ افسانوی انداز لیے ہوئے ہے۔ جمیل فاطمہ کو اس حادثہ کی اطلاع نہیں ہے۔ تین سال میں تین مہینے میں پلاسٹر کھلتا ہے اور وہ صحت یاب ہو کر پرانے گھر میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ نئے سامان سے پرانے گھر کو آراستہ کیا گیا ہے۔ دیواروں، در محرابوں پر حلوائیوں کے ہاتھوں سے لگے زخموں کو آفس کے معماروں نے بھر دیا ہے۔ زینت اور اس کے گھر والے پوری طرح مرتضیٰ حسن اور گھر پر قبضہ جمائے ہوئے ہیں۔
ندا ابھی انھیں کے ساتھ ہے۔ اسے یہاں زیادہ آزادیاں حاصل ہیں جن کا وہ اپنے طور پر استعمال کرتا ہے۔ بھری ہوئی جیب شہر کے گمنام گوشوں کی تلاش میں مصروف ہے۔ شام کو کسی کلاری میں چھپ کر شراب پینے کی پریکٹس کرنا اور دن بھر جانی انجانی لڑکیوں کا بے مقصد تعاقب روز کے معمولات ہیں۔

بیر کمار اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ہے۔ اس کا منجھلا بھائی باپ کی چھوڑی ہوئی جائداد میں سے اپنا حصہ لے کر الگ رہتا ہے۔ لیکن بیر کمار بڑے بھائی اور بھابی سے زیادہ مانوس ہے۔ دونوں کے سرپرستانہ برتاؤ نے موروثی دولت کو مزید تقسیم سے بچا لیا ہے۔ ندا کی طرح اس پر بھی کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ شراب کے ساتھ جوا اور جوئے کے ساتھ اور بھی بہت کچھ تک رسائی ہو چکی ہے۔ نئی دنیا کے اس سفر میں شہر کی ایک تنگ سی گلی کی نکڑ پر بنا ایک بڑے سے آنگن کا کچا مکان ہے۔ اس مکان میں تین افراد ہیں۔ ایک بڑا بھائی، ایک بیوہ ماں اور درمیان میں کھرے جسم اور کھلتے رنگ کی حاجرہ ہے۔ بڑا بھائی صبح دس بجے اپنے دفتر نکل جاتا ہے اور دس بج کر پانچ منٹ پر یہ دونوں اس کے دروازے پر ہوتے ہیں۔ پہلے ماں دروازہ کھولتی تھی اب لڑکی کنڈی بجانے کی انداز کو پہچان گئی ہے۔ اب وہ ہی دروازہ کھولتی ہے اور مسکراتے ہوئے ڈربے سے چار انڈے نکال کر لے آتی ہے۔ ان انڈوں کے لینے اور پیسے دینے کے وقفے میں ہاتھ سے ہاتھ کی مختصر سی گفتگو ہی ممکن ہو پاتی ہے۔ اس گفتگو کو کبھی ماں کی بے وقت کھانسی درمیان میں ختم کر دیتی ہے، کبھی چولھے پر جلتی روٹی آگ میں جھونک دیتی ہے۔ ہر روز باہر آ کر ان انڈوں کو باہر نالی میں پھینک دیا جاتا ہے اور مختصر سی گفتگو کی تہ داریوں کے معنی تلاش کیے جاتے ہیں۔ ہاتھ سے ہاتھ کی اس بات چیت کو ہونٹوں کی مسکراہٹ بننے تک کئی مہینے گزر جاتے ہیں۔ چھوٹے شہروں میں لڑکے اور لڑکی کی قربتوں کی یہی رفتار ہوتی ہے۔ محبت کی اس سست رفتاری سے طبیعت تو نہیں اوبتی ہاں یہ ضرور ہوتا ہے کہ دوریوں کے قربتیں بننے کی اس مدت میں محبت کرنے والوں کے درمیان محلے کی کئی اور گلیاں حائل ہو جاتی ہیں۔ ہر گلی کا ایک غیر قانونی محافظ ہوتا ہے جسے عام زبان میں دادا کہتے ہیں۔ وہ کوئی کام نہیں کرتا۔ اس کے ساتھ ہر وقت اس کی جیسی عمر کے کچھ لڑکے ہوتے ہیں جو دوسروں پر اس کا رعب جمائے رکھتے ہیں۔

حاجرہ شادی کی عمر میں نئی نئی داخل ہوئی ہے۔ اس کی چال ڈھال کی لچک اور آواز کی کھنک گھر کی دیواروں سے چھن کر گھر سے باہر نکلنے لگی ہے۔ محلے کے دادا کی بھی اس پر نظر ہے۔ لیکن حاجرہ کی تنہائیوں میں پہلے سے ہی انڈوں کی گولائیاں آباد ہو چکی ہیں۔ حاجرہ ایک دن، کئی بار کی وعدہ خلافی کے

بعد پکچر ہاؤس تک آئی ہے۔ وہ اپنے ساتھ برقعہ میں ایک سہیلی کو بھی لاتی ہے۔ ندا اور ہیر کمار کے درمیان دونوں لڑکیاں ہیں اور اسکرین پر پکچر چل رہی ہے۔ ایک ٹاکیز میں دو تصویروں کے ایک ساتھ چلنے سے آگے پیچھے کی کرسیوں میں سرگوشیاں ہوتی ہیں۔ لیکن وہ دونوں اردگرد کے ماحول سے بے خبر سیاسی لیڈروں کی طرح اپنی کرسیوں تک ہی محدود ہیں۔ ہیر کمار کی پہلے کی شناسائی ملاقات کی بے تکلفی تک پہنچ کر جلد ہی سمٹنے سکڑنے کی منزل کو پار کرنے لگتی ہے۔ ندا قریب بیٹھی ہوئی لڑکی کو صرف اپنے بازو اور کندھے ہی سے دیکھ پاتا ہے۔ اس سے آگے بڑھنے کی اس میں ہمت نہیں اور نہ ادھر کی اجازت ہے۔ انٹرول کی روشنی میں ہیر کمار اپنی کرسی پر نظر نہیں آتا اسے محسوس ہوتا ہے۔ تھیٹر کے سارے لوگ اسے گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں۔ وہ مجرم کی طرح سر جھکائے ہوئے ہے.... وہ باہر جانے کے لیے اٹھتا ہے لیکن پاس بیٹھی لڑکی اس کی قمیص پکڑ کر بٹھا دیتی ہے۔ وہ دھیمے سے کہتی ہے حاجرہ رو رہی ہے۔ کیوں کیا ہوا، ندا تعجب سے پوچھتا ہے۔ اس کی شلوار کا ازار بند ٹوٹ گیا ہے۔ وہ سرگوشی میں جواب دیتی ہے۔ پکچر شروع ہونے کے کافی دیر بعد ہیر کمار پھلا نگتا ہوا آتا ہے اور تھوڑی دیر بعد وہ سب پکچر شروع ہونے سے پہلے ہی ہال سے نکل جاتے ہیں۔ لڑکیاں تانگے میں بیٹھ کر چلی جاتی ہیں۔ لیکن ان دونوں کو چار پانچ لڑکے جو پہلے سے ان کے منتظر تھے، گھیر لیتے ہیں۔ ان لڑکوں کا سرغنہ حاجرہ محلے کا دادا ہے۔ اس مارپیٹ کی رپورٹ پولس میں درج کرانے کے بجائے مرافے کے علاقے میں جوے کے اڈے کے مالک منجو کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ اس اڈہ پر ہیر کمار اکثر قسمت آزمانے آتا ہے۔ منجو اور اس کے دوست کا لو بھنگی کا ٹرا لوکا مٹن کی دھاک پورے شہر میں ہے۔ منجو مضبوط جسم کا ایک بارسوخ نوجوان ہے۔ کئی سیاسی اور مذہبی جماعتوں کو اس کے اڈے سے پابندی سے چندہ دیا جاتا ہے۔ منجو اور مٹن ندا اور ہیر کمار کی شکایت کو اپنے علاقے کی بے عزتی سمجھتے ہیں اس بے عزتی کا بدلہ علاقے کی ساکھ کے لیے ضروری ہے۔ حاجرہ کے محلے کی ناکہ بندی ہوتی ہے۔ سوڈا واٹر کی بوتلوں اور لکڑیوں سے دونوں طرف کے کئی لوگ زخمی ہوتے ہیں۔ پولس کے آتے آتے منجو اور مٹن اپنے علاقے میں پہنچ چکے ہوتے ہیں۔ پولس سرکاری خانہ پری کے لیے دو تین لوگوں کو ساتھ لے جاکر، لاک اپ میں بند کر دیتی ہے۔ ان میں حاجرہ کے بھائی کے ساتھ گلی کا دادا رشید بھی ہوتا ہے۔ اخبار میں ہندو مسلم فساد کی خبر چھپتی ہے کئی دنوں تک گلی میں آنا جانا بند رہتا ہے گلی کے باہر گھنٹوں حاجرہ کے باہر نکلنے کا انتظار کیا جاتا ہے۔ کچھ دن کے بعد ایک دن اچانک حاجرہ رشید کے ساتھ گلی سے باہر نکلتی دکھائی دیتی ہے۔ حاجرہ کے بھائی اور رشید کی پولس لاک اپ میں ہوئی شناسائی رسانے بہنوئی کے رشتے میں بدل چکی ہے۔ حاجرہ کے انڈے اب نالی میں نہیں پھینکے جاتے۔ وہ اب ان کا آملیٹ بنا کر رشید کو کھلاتی ہے۔ ندا حاجرہ کی ان دیکھی سہیلی کو اب کسی دوسرے چہرہ میں ڈھونڈنے لگا ہے.... اس کا نام عشرت ہے۔ یہ گھر کے پاس قرآن پڑھانے والی استانی کی بھانجی ہے۔

جمیلہ فاطمہ بھوپال میں اپنے بچوں کے تعلیمی مستقبل کو سنوارنے میں منہمک ہیں۔ ندا کے بارے میں وہ شروع میں ضرور پریشان ہوتی ہیں لیکن جب مرتضیٰ حسن کے خط سے انہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اسکول میں داخلہ کرا دیا گیا ہے تو وہ مطمئن ہو جاتی ہیں۔ انھیں اس بات کی بھی خوشی ہے کہ ندا کے وہاں جانے سے مرتضیٰ حسن کی تنہائیاں بے اعتدالیوں سے کسی حد تک دور رہیں گی۔ ہر دوسرے دن ان کے خط آتے رہتے ہیں۔ ہر خط میں پڑھنے لکھنے پر توجہ دینے اور اچھی طرح رہنے کی تاکید ہوتی ہے۔ مضمون اور انداز ہر خط کا ایک سا ہی ہوتا ہے۔ اوپر ۷۸۶ لکھا ہوتا ہے اور نیچے "تمھاری غم زدہ" تحریر ہوتا ہے۔ "میں نے زندگی میں دکھ اٹھائے ہیں۔ اب تم اللہ کے فضل سے بڑے ہو گئے ہو۔ امید ہے میرے دکھوں میں اور اضافہ نہیں کروگے اور اپنی تعلیم پر دھیان دوگے۔ اسکول سے سیدھے گھر آیا کرو اور اپنے باپ کا خیال رکھا کرو..." یہ خط آڑی ترچھی لکھائی میں ہوتے ہیں۔ جس کاغذ پر وہ لکھتی ہیں اس کا پورا استعمال کرتی ہیں۔ اوپر نیچے، دائیں بائیں جہاں بھی جگہ ملتی ہے اسے نصیحتوں اور دعاؤں سے بھر دیتی ہیں.... لیکن ہر تحریر میں کچھ الفاظ پڑھائی میں نہیں آتے۔ یوں لگتا ہے ان کی قلم کے ساتھ، ان کی آنکھیں بھی اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ لکھتی رہتی ہیں۔ مرتضیٰ حسن کی بیماری کو دانستہ ان سے چھپایا گیا ہے۔ ندا بھی باپ کے کہنے پر بیماری کی کوئی خبر ان تک نہیں پہونچاتا۔ اس رازداری کے صلہ میں اسے مرتضیٰ حسن اور زیبن دونوں سے کچھ نہ کچھ ملتا رہتا ہے۔ اس کے رات دن کا خرچ بھی اسی حساب سے بڑھتا جا رہا ہے۔

زیبن اب سندھیا دربار سے وابستہ نہیں ہیں۔ ریاست کی حکومت بدلتے ہی دربار کے اسٹاف میں جو بھاری کمی آئی ہے۔ اس کمی میں ان کا نام بھی ہے۔ زیبن کی عمر ابھی زیادہ تو نہیں ہے۔ لیکن جب سے اس کی نوخیز بھتیجیوں نے کوٹھے پر گانا شروع کیا ہے انھیں آئینے سے ڈر لگنے لگا ہے۔ خالی دن بہ دن چہرے سے خود اعتمادی کی چمک چھین رہی ہیں۔ وہ وقت سے پہلے اپنے ہی کوٹھے پر نائکہ بننے کے بجائے گرہستن بن کر جینا چاہتی ہیں

وہ اپنے اور مرتضیٰ حسن کے آزاد رشتے کو کوئی قانونی شکل دینے کے لیے کوشاں ہیں۔ مرتضیٰ حسن عجیب کشمکش و پیچ میں ہیں۔ زیبن کی ضد شدت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ برسوں کے تعلقات نے دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت بنا دیا ہے۔ لیکن بڑے ہوتے ہوئے بچوں کا خیال بھی ان کے ذہن میں گھر کر چکا ہے.... وہ زیبن کی ضد کو اپنے سے بہلانے کی کوشش کرتے ہیں اور زیبن اپنی ناری ہٹ سے ہٹنے کو تیار نہیں ہے۔ ہر دن اسی کشمکش میں گزرتا ہے

ان کے کوٹھے کے اچھے دنوں میں آنے والوں میں ایک شخص کا نام شیام لال پانڈوی ہے۔ جن دنوں کی یہ بات ہے ان دنوں وہ ایک معمولی سے سیاسی کارکن تھے۔ برٹش اور ریاستی راج، دونوں سے ان کی لڑائی تھی۔ اچھے خاصے کاروباری خاندان کے فرد ہوتے ہوئے قلندرانہ زندگی کو اپنائے ہوئے تھے ملکی آزادی کی لڑائی اور اس کی پاداش میں جیل خانے سے جو بھی ان کے پاس وقت ہوتا تو وہ دادِ حسن و موسیقی دینے ادھر چلے آتے۔ محفل میں ان کے آنے پر نہ کسی کو کوئی خوشی ہوتی نہ جانے پر کہیں سے دوبارہ آنے کا اشارہ ہوتا۔ یہ دل کا سودا تھا۔ کبھی آگ دونوں طرف لگنے کے بجائے ایک ہی طرف کا رُخ کیے رہتی ہے۔ شیام لال جی بھی اپنی آگ میں خاموشی سے جلتے رہتے ہیں اور دوسروں کی پھبتیوں کا نشانہ بنتے ہیں۔ طوائف کا دل جیتنے کے لیے جن لوازمات کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھارت ماتا کی مورتی پر چڑھائی جا چکی تھیں۔ وقت اکثر راجہ کو رنک اور رنک کو راجہ بنانے کا کھیل کھیلتا رہتا ہے۔

پہلا الیکشن ہوتا ہے۔ سیاسی وفاداروں کی فہرست میں ان کا نام بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ عوام کے نمائندہ بن کر اسمبلی پہونچتے ہیں اور وہاں سے سیدھے کیبنٹ میں لے لیے جاتے ہیں۔ وہ وزیر بن جاتے ہیں۔ ریلوے کا شعبہ، جس سے مرتضیٰ حسن منسلک ہیں، انھیں کی وزارت کے ذیل میں آتا ہے۔ دونوں کے درمیان پہلے سے رقیبانہ کشمکش ہے، جس کے اظہار کا اب مناسب وقت آیا ہے۔ تین مہینے سے وہ مرتضیٰ حسن کی ایک ضروری فائل، جس میں ان کے پروموشن کا ایک کیس ہے، اپنی میز پر رکھے ہوئے ہیں۔ ایک دستخط کے لیے اتنی طویل مدت نئے اندیشوں کو جنم لیتی ہے۔ وہ شیام جی سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ہر بار ناکام ہو کر لوٹتے ہیں۔ زیبن کو جب ان کی پریشانی کی وجہ معلوم ہوتی ہے، تو وہ ایک دن خود ہی وزیر کے وزارت خانے تک پہونچ جاتی ہیں۔ ملنے والوں کی لمبی قطار میں سے پہلے انھیں ہی اندر بلایا جاتا ہے پُرانے دنوں کی آگ، شکوہ شکایت سے گزر کر، فائل پر دستخط میں بدل جاتی ہے۔ مرتضیٰ حسن کی ترقی ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ دستخط اس دن سے ان کے اور زیبن کے رشتے میں حائل ہو کر برسوں کی قربتوں میں دوریاں پیدا کرنے لگتا ہے۔ [باقی آئندہ]

◆ بقیہ صفحہ ۱۴۱ برگد پہ بسا ہوا گاؤں ◆

سب اپنے اپنے گھروں کے افراد کے ساتھ جا چکے ہیں۔ گاؤں تقریباً خالی ہو گیا ہے۔ کچھ لوگ بیچ میں پھنس کر چیخ رہے ہیں..... میں گھبرا کر کہتا ہوں اے طوفانِ باد و باراں، اب رک جا! لیکن کچھ زوردار موجیں آ کر میرے تنے سے ٹکراتی ہیں اور پھر مسلسل ٹکراؤ.... شڑاک شڑاک!!

پتہ نہیں رات کا کون سا پہر ہے۔

سیلاب گاؤں کے سینے پر سے گذر رہا ہے۔

اندھیرا بہت گہرا ہے... پانی کا بہاؤ بہت تیز۔

میں مایوس ہو کر گاؤں کی طرف دیکھتا رہتا ہوں۔ بہت کچھ بہہ گیا ہے۔ جو بچ گیا ہے وہ پانی میں ہے۔ دفعتاً محسوس ہوتا ہے کہ طوفانی ہوا رک گئی ہے۔ بارش بھی بند ہو چکی ہے اور سیلاب کا پانی آہستہ آہستہ میرے تنے سے نیچے اتر رہا ہے۔

صبح ہوتی ہے تو میری شاخوں پر پرندے اپنے پروں کو زور سے جھٹک کر چہچہاتے ہیں۔

ندیاں اپنے پھیلاؤ سمیٹ لیتی ہیں۔ زیر آب گاؤں دوبارہ نمودار ہوتا ہے لیکن کھنڈر کی شکل میں۔ سب کچھ برباد ہو چکا ہے۔ جو لوگ سیلاب میں پھنس گئے تھے اور جن بے شمار لوگوں نے میری شاخوں پر پناہ لے کر اپنی جانیں بچائی ہیں۔ ان میں سے چند نام اس طرح ہیں۔

مہادیو، مہادیونی، کلا، سمبھو ڈھولکی، راتا مکھیا، پنڈت جی اور مدن گرو جی وغیرہ ــــ وہ لوگ جو رات میں کہیں اور چلے گئے تھے، اپنے شکستہ گاؤں میں واپس آ رہے ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ اب سزا کی بجائے میرے قدموں پر سیندور، پھول اور ناریل چڑھائے جائیں گے۔ لوگ میرے تنے کو احترام و عقیدت سے چومیں گے لیکن شاید کسی کو خبر نہیں ہے کہ اس وقت میں صرف اپنے توازن پر کھڑا ہوں اور بس کچھ ہی وقت کا مہمان ہوں، کیونکہ سیلاب نے میرے نیچے سے ساری جڑیں کاٹ دی ہیں۔ ❋

◆ بقیہ صفحہ ۱۶ فائر ایریا ◆

اُن گنت چھوٹے چھوٹے محاذوں پر ہم ہارتے ہیں۔ پھر بھی اپنی شکست تسلیم نہیں کرتے۔ لڑنے کا یارا نہیں ہوتا پھر بھی کھڑے رہتے ہیں۔ کسی ہارے ہوئے، پٹے ہوئے باکسر کی طرح جو رنگ پکڑے کھڑا ہانپتا رہتا ہے اور ریفری کی سیٹی پر پھر مار کھانے کے لئے مقابل آ جاتا ہے۔ ❋

# دھنک رنگ

## عقیل گیاوی

پس منظر وہ کیسا حادثہ تھا
پرندہ پیڑ پہ سہما ہوا تھا
عجب اک بے بسی کا دائرہ تھا
ہمارے سامنے جب آئینہ تھا
رفاقت کے سنہرے زاویے میں
کوئی قربت نہ کوئی فاصلہ تھا
ادھوری زندگی کی داستاں تھی
تلاشِ ذات کا روشن دیا تھا
تفکر کی فضا سے آشنا ہوں
وہ بچہ باپ سے یہ کہہ رہا تھا

● معرفت او۔کے ٹیلرس، پرانا بازار، دھنباد

## خورشید طلب

طے شدہ اختتام تک پہنچی
دوستی، انتقام تک پہنچی
پھر ضرورت کا سر بلند ہوا
شاہزادی غلام تک پہنچی
جو بھی فتنے اُٹھے اُدھر سے اُٹھے
اور بلا میرے نام تک پہنچی
ہوگئے بند در سماعت کے
جب خموشی کلام تک پہنچی
کچھ گھروں میں سمٹ گئی خوشیاں
غم کی دولت عوام تک پہنچی

● معرفت، ایم آئی خان، ای ای آفس، سارگلی (برمو) گریڈیہہ

## مسلم شہزاد

آئینہ ٹوٹا تھا، صورت یاب ہونا تھا مجھے
آنکھ تھی پامال، محوِ خواب ہونا تھا مجھے
ناؤ تھی الفاظ کی سہ بادبان آواز کا
خامشی کی جھیل میں غرقاب ہونا تھا مجھے
پھر گذرنا تھا کوئی جاتی رتوں کا قافلہ
پھر دھنک جیسی کوئی محراب ہونا تھا مجھے
لوگ سب جس کی تلاوت کو ترستے روز و شب
داستانِ وصل کا وہ باب ہونا تھا مجھے
عمر بھر شہزاد بہ کر عکسِ بے پیکر کوئی
خود ہی اپنے واسطے نایاب ہونا تھا مجھے

● بزمِ کہکشاں، نرکٹیا گنج، مغربی چمپارن (بہار)

## اختر جمال

گھر کی دیواروں کا ایک اک رنگ پھیکا ہوگیا
بجھ گئی آنکھیں ہماری عکس دھندلا ہوگیا
اب تعلق کا کوئی سایہ بھی آنکھوں میں نہیں
عمر بھر رشتوں سے اُلجھا اور تنہا ہوگیا
ہم نے بھی سقراط کو اپنا کہا ہے صاحبو
اب ہمارے واسطے بھی زہر میٹھا ہوگیا
آنکھ والو! اپنی آنکھوں کو زمیں پر گاڑ دو
میں نے سورج کی طرف دیکھا تھا اندھا ہوگیا
آگ، پانی، دھوپ، پتھر سب علامت بن گئے
اور اختر زندگی کا استعارہ ہوگیا

● معرفت تاج محمد، کلیان روڈ، بھیونڈی (تھانہ)

## مہیندر انند سوز

غلو تھا طرزِ بیاں میں زباں سیاسی تھی
ہر ایک بات جو اس نے کہی قیاسی تھی
عجیب ڈھنگ کا موسم تھا شہر میں اب کے
دلوں میں خوف تھا چہروں پہ بدحواسی تھی
کھٹک رہا ہے تجھے کیوں سلوکِ یاروں
قصور وار تو تیری بشر شناسی تھی
ہے تشنگی کی کہاں انتہا محبت میں
برس رہی تھی گھٹا اور روح پیاسی تھی
وہ عرضِ حال پہ کیوں اس قدر خفا ہیں سوزؔ
میرے خیال میں وہ بات تو ذرا سی تھی

● ۲۷۱ / ۷ اے۔ فرید آباد (ہ)

## فراق جلال پوری

بارشوں سے لڑیں گی دیواریں
دھوپ نکلے، ہنسیں گی دیواریں
راز کی بات ہے، چھپا اور
تو سُنے گا، کہیں گی دیواریں
اُن کے آنگن میں دھوپ کیا اُترے
جن کے گھر میں اُٹھیں گی دیواریں
آسماں کا جھکاؤ کہتا ہے
سر پہ اک دن گریں گی دیواریں
زندگی! تو ہے دھوپ! یہ قصہ
سایہ سایہ لکھیں گی دیواریں!

● محلہ قاضی پورہ پوسٹ جلالپور ۔ فیض

# مکتوبات

**اچرن رستوگی** ۔ بروبار ی، گوہاٹی ۷۸۱۰۱۹ [ آسام ]

شاعر شمارہ نمبر ۴ جلد ۶۰ اپنی مخصوص روایت در روایت سے پُر شمارہ ہے۔ سیماب اکبرآبادی نے "آگرہ اسکول" کا ذکر کیا ۔ ابھی تک اردو تحقیق و تنقید، دہلی، لکھنؤ، عظیم آباد اور اکبرآباد اردو دبستانوں سے مخاطب نہیں ہو سکی ہے۔

سیماب نے آگرہ اسکول کے بابت جو کچھ بھی فرمایا ہے صدفی صد ست ہے۔ مکتوب پیچر کے تحت مرادم شاد احمد فاروقی کے شادات وقیع بھی ہیں اور ہوشمندانہ بھی، مجھے ان سے اتفاق ہے۔

اتر پردیش نے اردو کو جگہ دے دی مگر مملکت اردو پر عائد ا جانے ہوئے لوگ کتنے مواقع فراہم کر سکیں گے ؟

رئیس امروہوی میرے دوست ہوا کرتے تھے ان کا ایک شعر بہت پسند ہے۔

یہی نظروں سے کرم فرمائیے گا آگیا!
آپ میرے حق میں فرمائیں گے کیا ارشاد بھی

کوثر بھکی کے "شعراء" بڑا اچھا مضمون ہے غزلوں اور وں میں کوئی خاص جدت ، معیاری کر نہیں پیش کیے ۔ اداریہ خصوصی یت کا حامل ہے۔

---

شاعر کا شمارہ نمبر ۵ جلد ۶ کا اداریہ ' اردو، سرکاری ہاں ہم " بہت اہم ہے۔ فی الواقع اردو سیاست معرض وجود میں ئی ہے اور ایسا نظام ESTABLISHMENT بن کر ری ہے جس کا اردو کے معادات کے پیش نظر ختم کیا جانا ضروری ہے۔ ے ایک کرم فرما [ جن کا اسم گرامی بالوجوہ بتانا نہیں چاہتا ] لکھے لکھا کہ جس طرح ہماری ملکی سیاست میں سیاسی اقتدار کے دلال POWER BROKER پیدا ہو گئے ہیں بالکل اسی طرح اردو میں امات کے دلال AWARD BROKERS پیدا ہو گئے ہیں لیس حقیقت ہے جس کا اعتراف کیا جانا چاہیے۔ اردو ادبیات کو ۲۱ ویں ری میں داخل کرنے کو ستے لکھے خوب ہے اس کو حلقہ بگوش اسلام ر کر دیا جائے درود مسعود میں ڈاکٹر گیان چند بہت مسعود ہے۔ یہ دراں درود مسعود میں مسعود ہی حقوق کے تحت آتا ہے۔ خیر یہ تو جملہ ترضہ تھا۔ اداریہ بہت خوب ہے، مبارک ہو۔

**سلیمان اطہر جاوید** ۔ صدر شعبہ اردو، ایس وی یونیورسٹی، تروپتی ۵۱۷۵۰۲

شاعر کا شمارہ نمبر ۴ موصول ہوا۔ ہر شمارے کی طرح یہ شمارہ دلکش اور وقیع ہے۔ ندا فاضلی کی خود نوشت "دیواروں کے بیچ" دلچسپ ہوتی جارہی ہے۔ آپ دونوں کو مبارکباد!

اس شمارے میں رتن سنگھ اور رام لال کے افسانے خاص طور پسند آئے۔ منظومات کا حصہ بھی وقیع ہے اور یہ مستقل سلسلے "بساط" "آثار لطائف" "بازیافت اور عرض مطبوعات" شاعر ہی کا جگہ ماری حیثیت رکھتے ہیں۔

**فاروق شفق** ۔ ۔ ۔ دھان کھیتی ، کلکتہ

شاعر کا شمارہ نمبر ۵ ملا۔ اور تواتر سے کئی شمارے موصول ہوئے۔ حالیہ شمارے بھی عمومی طور پر پسند آئے۔ "بساط سخن" جدید کے تحت سیش سترہ کا تفصیلی تعارف بہت خوب ہے اس مرتبہ مضامین مجھے پسند نہیں آئے۔ نہ جانے کس طرح لوگ سرد ہاتھوں سے سرد اور اکار رفت موضوعات پر دل سجاد دینے والے مضامین لکھتے ہیں منظومات میں بلراج کومل، شہریار اور کشور ناہید کی تخلیقات بطور خاص پسند آئیں۔ نئے لوگوں میں ناصر نعیمی کی غزل کے چند شعر اچھے لگے۔ شان الحق حقی نے مایوس کیا۔ پاکستان سے ایسی غزلوں کی درآمد نہ کیجیے تو بہتر ہے۔ ندا فاضلی کی خود نوشت اگر راوی کی زبان کے بجائے واحد متکلم کے صیغہ میں ہوتی تو اس کا کچھ اور ہی لطف ہوتا۔ پتہ نہیں ندا فاضلی نے یہ طریقہ کیوں استعمال کیا؟ اس طرف شاید شاعر کے کسی اور قاری نے بھی توجہ دلائی ہے۔

**شمس الرحمٰن فاروقی** ۔ اے۔ ۳/۷ ماڈل ٹاؤن، نئی دلی ۱۱

شاعر برابر مل رہا ہے۔ ہر بار اس میں پڑھنے کے قابل چیزیں ہوتی ہیں۔ بس مضامین کا معیار بہت ناہموار ہے۔ بعض دفعہ بہت اچھے مضامین آجاتے ہیں، اکثر بار نہایت ناپختہ بالکل اکثر تو زبان کے اغلاط سے بھی خالی نہیں ہوتے۔ اس سلسلے میں آپ لوگوں کو تھوڑی بہت بے مروتی سے کام لینا ہوگا۔

کتابت اور طباعت بہتر سے بہتر ہوتی جارہی ہے۔ کم سے کم صفحات میں زیادہ سے زیادہ مشمولات کھپانا آپ کا خاص فن ہے۔ اس بار حسینی شیں پر باقر مہدی کا تاثراتی مضمون اپنی کمیوں اور زیادتیوں کے باوجود خوب تھا۔ حسینی صاحب کی تصویر بھی اچھی چھپی ہے۔

**اصغر علی انجینیئر** ۔ ار ۔ ۶ کونج، سیکنڈ فلور، تارتھ روڈ سانتاکروز ممبئی ۵۵

شاعر کے شمارے ملتے رہتے ہیں، میں بے حد شکر گزار ہوں ماشاء اللہ شاعر نے خاصی ترقی کی ہے، مضامین کے اعتبار سے بھی اور اشاعت کے معیار کے اعتبار سے بھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ نے رسالے کا معیار بلند کیا ہے۔

**نامی انصاری** ۔ ۲۱ ۔ اے، نواب حاتم کا احاطہ، سول لائنز کانپور (یوپی)

شاعر کا تازہ شمارہ نمبر ۶ موصول ہوا۔ اداریے میں آپ نے شکوہ کیا ہے کہ اردو زبان کے بارے میں لوگوں نے صرف تنقید کی ہے اور مشورے دیے ہیں اور یہ آسان ترین کام ہر ایک نے کیا ہے۔ اس اداریے میں آپ نے بھی تو صرف مشورے دیے ہیں۔ منصوبہ یا پلان بھی مشورے ہی کے تحت آتا ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ یہ سارے کام کون کرے۔ بازی مسعود کے لیے لوگ تن من کی بازی لگا دیں گے اردو کے لیے کوئی دس پیسے روپیہ بھی خرچ نہیں کرے گا۔ آپ کی اپیل اور مشورے صرف انہیں لوگوں کے کانوں تک پہنچتے ہیں جو اردو کے ادبی رسائل پڑھتے ہیں۔ عوام الناس کو ان سے کوئی سروکار نہیں پھر ان منصوبوں اور مشوروں پر عمل کون کرے۔ ہر حال آپ اپنا کام کرتے رہیے، اداریے لکھتے رہیے، لوگوں کو متوجہ کرتے رہیے، کچھ نہ ہونے سے ہونا بہتر ہے۔

علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم کا لوری نامہ علامہ کی تخلیق معلوم نہیں ہوتی کیونکہ اس میں زبان و بیان کی فاش غلطیاں ہیں مثلاً لوری نمبر ۱۱۔ "سو جا اللہ والے سو جا" بچے کے لیے اللہ والے کہنا غلط ہے اللہ والے تو متقی اور پرہیزگار اور روحانی طور سے بزرگ و برتر لوگوں کو کہا جاتا ہے۔ "وہ تیرا رکھوالی ہے" یہاں رکھوالا ہونا چاہیے کیوں کہ اس کا تعلق اللہ سے ہے۔ لوری نمبر ۹ میں "لو تیرا بھیا آتی ہے میرا" میں بھیا کے بجائے بھیا ہونا چاہیے یہاں املا لازمی طور سے آتا ہے۔ "لو یہ رے بھیا کو آتی ہے نیند" یہ مصرعہ بدات خود کتنا بھونڈا ہو گیا ہے۔ اسی صفحے میں عربی جوش، ہاشمی جون، نسل میں حیاری، مرد میداں اور غازی کے تلازمے کسی رجز کے لیے تو موزوں ہو سکتے ہیں مگر لوری سے بالکل میل نہیں کھاتے۔ میرا خیال ہے کہ اس عکس کے چھاپنے سے پہلے آپ نے اسے غور سے پڑھا ہیں ورنہ آپ خود اس کی اشاعت سے اجتناب کرتے۔

میرا دوسرا شکوہ بہت بڑا ہے۔ ۸۴ صفحات میں ۶۴ صفحات کا مواد بھرنے کے لیے آپ نے آخر کے ۹ صفحات میں اتنی باریک چھپائی کر دی ہے جس کا پڑھنا دشوار ہے۔ بھائی میں تو آپ سے کبھی یہی کہوں گا کہ آپ ایک دو افسانے کم چھاپئے مگر خدا کے لیے ہم جیسے لوگوں کے لیے پڑھنے کا ذریعہ تو باقی رہنے دیجیے اس شمارے میں صفحہ ۴ تک چھپائی کا جو معیار ہے اسی کو آخر تک باقی رہنا چاہیے تاکہ رسالہ دیکھنے میں بھی دیدہ زیب اور معیاری معلوم ہو اور قارئین کے لیے دقت طلب نہ ثابت ہو۔

آپ میرے معروضات کا برا مانیے گا۔ میں نے صاف صاف باتیں اس لیے لکھی ہیں کہ شاعر سے میرا قلبی تعلق ہے اور میں اسے بہتر سے بہتر دیکھنا چاہتا ہوں۔

**احمد کمال پروازی** ۔ ۴/۳۸ مالوہ اسٹیل فیکٹری نوچہ روڈ امین ایم پی

شاعر کا تازہ شمارہ دستیاب ہوا۔ اس بار کا پرچہ کافی آسودگی فراہم کرتا ہے۔ خصوصاً محترم باقر مہدی صاحب کا "یاد رفتگاں" علوی صاحب کی نظمیں، ستر حالقا ہی اور کمار پاشی صاحب کی غزلیات، حامدی کاشمیری صاحب نے عصری آگہی کو بہت محدود معنوں میں رکھا ہے۔ عصری آگہی محض منفی رویوں کے اظہار کا وسیلہ نہیں ہے بلکہ یہ تو ہر دو متضاد، کیفیتوں رویوں، اشیاء، رجحانات اور مظاہر سے کشید کیے جانے والے ادراک کا نام ہے۔ یہ سراسر زیادتی اور یک طرفہ عمل ہوگا اگر ہم عصری آگہی کے توسط سے صرف منفی رویوں کے پروردہ ادب کی تبلیغ کا فرض ادا کریں دیانت داری تو اس امر میں مضمر ہے کہ منفی اور مثبت دونوں رجحانات کی اشاعت کی ذمہ داری قبول کریں۔

منتخبہ اشعار

اس دشت میں ہم جیسا مسافر ہی کہاں تھا
تنہائی سے الجھی ہوئی ہستی کی تو تاب ہے
اے گرمئ شمشیر لیس ونہیں سے گزرنا
کہتے ہیں جسے خوش شدہ انسانی تو تاب ہے
تھک کے رہیں منزل کا امکاں ہی کب تھا
رستے وہ لے پاؤں میں بیسانی تو تاب ہے
تنہائی کی اس حد پہ کھڑا تھا کہ جہاں سے
آروں کی تسکین پار دشوار نہیں تھا

شعر کی آفاقیت کا ماداوب کی چند مخصوص تنقیدی اصطلاحات میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔ بہتر شاعری بہتر شعور کی متقاضی ہوتی ہے۔ اور بہتر شعور انسانی نظریات کی تحت الشعوری، صدیوں کی سبق آموزی اور تاریخی آگہی کا لازمہ ہے۔ ابھی نہیں سالہا سال تک ایک ایسے عمل کے متوازی عمل سے گذرنا ہے جہاں کہ ایک غیر محسوس نوعیت کا فعال عنصر ایک کیمیائی عمل سے گذر کر پھول ایسی نازک تتلی میں ڈھل جاتا ہے۔ یہ پہنچنا ہے اس معراج تک جہاں لفظ، معنیٰ اور اسلوب دونوں کی تجسیم کرتا ہے۔

**معصوم انصاری**۔ ۱/۲۹ بہار واڑہ، جو تھا اسلام پورہ بھیونڈی۔ تھانہ

شمارہ ملا اس وقت میرے ہاتھوں میں ہے۔ اداریہ پڑھ کر یقین نہیں آتا کہ اردو پتہ کے ساتھ منی آرڈر آپ کو موصول ہوا ہوگا۔ یہ بات میرے لیے حیرت انگیز خوشی کا باعث ہے۔ اس سے ایک امید یہ بھی بندھتی ہے کہ ہم اردو والے اگر واقعی اردو کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں ہمت اور صبر سے کام لیتے ہوئے اپنی جد و جہد کو جاری رکھنا چاہیے، کامیابی یقیناً ہمارے قدم چومے گی جس کا ثبوت آپ کے اداریے میں موجود ہے۔

صفحہ ۸ پر کلر اپ تصویر کے ساتھ محمد علوی کی نظمیں عالمانہ معیاری ہیں اسی لیے کچھ سمجھ میں آئیں کچھ نہیں۔ خاص طور پر پہلی اور دوسری نظم پڑھنے کے بعد دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ علوی صاحب ان نظموں کے ساتھ وضاحتی نوٹ بھی لگا دیتے تو ہم جیسے لوگ بھی محظوظ ہو سکتے تھے۔

تیسری نظم "دعا" جو کہ صرف تین مصرعوں پر مشتمل ہے اور جس کا آخری مصرع ہے "آپ کے عید کا دن آئے تو دودھ سویاں کھائے" میں اسے اپنی سہولت کے پیش نظر "دودھ سویاں کھائے کی بجائے، دودھ سویاں لائے" پڑھ گیا ہوں بعد کی دونوں نظمیں "ایک شام باغ میں" اور "وقت جہاں رک جاتا ہے" اچھی لگیں اور سمجھ میں بھی آئیں۔

پروفیسر مجتبیٰ حسین سے متعلق باقر مہدی کے مضمون کے تیسرے پیراگراف میں رسبیل جہاں اور کئی لوگوں کے نام آئے ہیں وہیں خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب کا بھی ذکر آیا ہے لیکن اس انداز میں کہ دل کو ایک سخت دھچکا سا لگا۔ جب بھی پرچہ اٹھاتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ شمارہ ہذا کے مشمولات سے دل و دماغ کو تازہ کروں، باقر مہدی کے احسانوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے خلیل الرحمٰن اعظمی کی یاد میری روح کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ میں یہ شمارہ پڑھ بھی سکوں گا یا نہیں؟ مجھے شک ہے!

**نسیم بن آسی** ــــــ محلہ بھٹ راہ، مغل سرائے (یوپی)

شاعر کا شمارہ نمبر ۶ نظر نواز ہوا۔ محمد علوی کی شاعری پڑھنے میں دل لگتا ہے۔ لیکن تازہ شمارے میں انھیں توقع کے خلاف پایا۔ باقی شعری حصے اچھے ہیں۔ افسانوں میں شوکت حیات کا افسانہ "مکوڑا" پسند آیا۔ سلام بن رزاق کا مراٹھی سے کیا ہوا ترجمہ اچھا ہے ــ لیکن ان سے طبع زاد افسانے کی امید تھی۔

افسانوں کی کتابت باریک تر ہے جسے پڑھنے میں بہت پریشانی ہوتی ہے۔ یہی حال نقد و نظر اور مکتوبات کی کتابت کا ہے۔

**بشیر خاں پٹیل**۔ سرسید ایجوکیشن سوسائٹی، ہیڈ رسمانپل جیلہ بادرس ۵ بنگلے، کیمپ امراوتی [ مہاراشٹر]

اردو کی افادیت کے پیش نظر سرسید احمد ایجوکیشن سوسائٹی نے ایک تحریک بنام سرسید احمد اردو تعلیمی تحریک شروع کی ہے۔ ہم نے اردو داں حضرات سے اس کے پتے طلب کیے ہیں۔ انشاء اللہ ان کو ہر ہفتے ایک پوسٹ کارڈ اردو میں پتہ لکھ کر بھیجا کریں گے۔ ۲۵۰ کے قریب پتے جمع ہو چکے ہیں۔ ایک ایک پوسٹ کارڈ ان سب کو پوسٹ کر دیا گیا ہے۔ دوسرا مرحلہ تمام اردو اسکولوں کو اس تحریک میں شرکت کی دعوت دینا ہے۔ اگر اردو اسکول کے طلبا اس تحریک میں حصہ لیں تو بہت جلد ہم مہاراشٹر میں بھی اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ کر سکتے ہیں [ ماہنامہ شاعر کی اردو تحریک کو مہاراشٹر میں شوالی سطح پر خاطر خواہ پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ وزیر اعلیٰ مہاراشٹر کو اس تحریک سے آگاہ کر دیا گیا ہے۔ اصلی انتخابات ۱۹۹۰ء کے بعد اس تحریک کو مزید تقویت دی جائے گی۔ خطوں پر اردو میں پتہ لکھنے کے عمل کو اسی طرح تیز تر سے تیز تر کرنا چاہیے۔ اس تحریک کو جاری رکھیے ] تمام اردو والوں سے درخواست ہے کہ وہ اپنے مکمل پتے ہمیں ارسال فرمائیں۔ انشاء اللہ ہم انھیں ہر ہفتے ایک پوسٹ کارڈ ارسال کریں گے۔

**آر۔ پی۔ شرما مہرشی**۔ سی۔ ۳۱۲ ررونک اپارٹمنٹ، ویلی ساتی مارگ، ملاڈ بمبئی نمبر ۴۰۰۰۹۷

"دوہا۔ ایک تعارف چند سوال" عنوان کے تحت حضرت شمیم کاف نظام کا قابل صد تحسین و صد آفریں تحقیقی مضمون آپ کے شمارہ نمبر ۵ جلد ۶۰ سنہ ۱۹۸۹ء میں نظر نواز ہوا۔ اس گراں قدر مضمون میں دوہا صنف کے اوزان کو اردو عروض کے ارکان میں ظاہر کیا گیا ہے اور ہر مصرع کے جزو اول اور جزو دوم کی ساخت کو دو مختلف تقطیعوں میں واضح کیا گیا ہے۔ ان اوزان کا بغور مطالعہ کرنے پر پایا گیا کہ عروض و ضرب سے مخصوص زحافات مثلاً فعل [ بہ تحریک ع ]۔ فاع فع۔ فعلان کو صدر و ابتدا اور حشووں میں بھی لایا گیا ہے جو اردو عروض سراسر غلط ہے اور جس طرح جزو اول اور جزو دوم کے وہ تمام اردو اوزان جن میں یہ پابندی نہیں برتی گئی ہے از روئے اردو عروض غلط اور غیر حقیقی ہو کر رہ جاتے ہیں ــــــــ اس کے علاوہ دوہوں کے ان تمام اوزان کی تشکیل کے قبل اردو بحر کا تعین بھی نہیں کیا گیا جو لازمی تھا کیوں کہ بحر کا تعین ہونے پر ہی حقیقی اوزان برآمد کیے جا سکتے ہیں۔ دوہوں کے زیادہ تر اوزان بحر رجز مسدس [ مزاحف ] میں اور کچھ اوزان بحر رجز مرتع [ مزاحف ] میں بآسانی ڈھالے جا سکتے ہیں۔ طوالت کے خوف سے ان حقیقی اوزان کی تفصیل دینا یہاں ممکن نہیں۔ البتہ جزو اول کے اوزان نمبر ۶ - ۷ اور جزو دوم کے اوزان نمبر ۶ - ۷ - ۱۹ کے متوازی حقیقی اوزان کی تشکیل بحر رجز میں ممکن نہیں۔ اس لیے ان اوزان کو اردو دوہوں کے اوزان کی فہرست میں شامل کرنا ہرگز مناسب نہیں کیوں کہ یہ اوزان از روئے اردو عروض قطعی غیر حقیقی ہیں۔

**خلیل الرحمان دہلوی**۔ ۹۰۵ کشن گنج آزاد مارکیٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶

آپ پرچہ بہت اچھا نکال رہے ہیں۔ خوشی ہوتی ہے۔ شمارہ ۳، ۱۹۸۹ء کے مکاتیب کے باب میں جناب نال انصاری سے تعریف و تحسین کے ساتھ جناب تھا۔ انصاری کا قول اس مضمون کا نقل کیا ہے کہ اگر بحر چھوٹی ہو اور ردیف لمبی تو شاعر کا ناطقہ بند ہو جاتا ہے۔ یہ بات درست نہیں۔ قادر الکلام شاعر ان بندشوں کے باوجود عمدہ شعر نکال لیتا ہے۔ چند مثالیں دیکھیے:

ماست کیشوں سے اسے کہاں امرو
کچھ ادائی نہ کر خدا سے ڈر

اس سے جو آشنائے درد نہیں
آشنائی نہ کر خدا سے ڈر

اے دل غیر آشنا یار
جبہ سائی نہ کر خدا سے ڈر

بہار آئی تڑانے بھیجے لگے زنجیر دیوانے
ہوا شور جنوں برپا ہا ہا ہا ہا ہا ہا ہا ہا

حق آنکھوں نے نہ دیکھا تھا کبھی یک اشک کا قطرہ
رواں ہے ان سے اب دریا ہا ہا ہا ہا ہا ہا ہا ہا (میر مہدی)

فارسی میں میر اثر (برادر خواجہ میر درد) کو دیکھیے:

انتظارم ہنوز باقی ماند
با تو کارم ہنوز باقی ماند

آمدی تو و من ز خود رفتم
انتظارم ہنوز باقی ماند

ہمہ گیرد عبرت از من اثر
اعتبارم ہنوز باقی ماند

مومن خاں مومن کو ملاحظہ کیجیے:

اے چارہ گر و قابل درماں نہیں یہ درد
ورنہ مجھے سودا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

کیا غش کے عوض میں چپ ہوں تو تم کہتے ہو بولو
سمجھو تو یہ تھوڑا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

مومن عشق اسرار بیانی کا بھی تک
ہر ایک کو دعویٰ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

واضح رہے کہ کسی فن کا عرفان اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب اس کے اصول قواعد اور ضوابط کا احترام کیا جائے۔ ردیف اور قافیہ غزل کی جمالیات کے بنیادی رکن ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ شاعر نے ان بنیادی ارکان کو کس خوبی سے استعمال کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ کوئی شخص غزل کا قائل نہ ہو اور کہے کہ میں نظم کو پسند کرتا ہوں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہ ہونا چاہیے کہ غزل کے ضوابط کا مذاق اڑایا جائے۔ اپنی نارسائیوں کا الزام غزل کی ہیئت پر دھرنا درست نہیں۔

○ شاعر دن بہ دن خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ مشمولات آپ کی انفرادی مدیرانہ صلاحیتوں کی آئینہ دار ہیں۔ شاعر ایک عظیم ادبی رسالہ ہے۔ سلیم انصاری، ۵۵۹، جبلپور ایم پی۔

○ اردو مسائل کے تعلق سے آپ کے اداریے توجہ طلب ہیں۔ شاعر کا نام اردو تحریک کے ساتھ سالہا سال سے جڑا ہوا ہے۔ مسرت ہے کہ آپ نے اپنا قدم اسی راہ پہ لگائے رکھا ہے۔ عبد ... ای۔ ۲۲۔ ۱۵۳، ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

○ شاعر کے ہر شمارے میں آپ کی کاوشوں کی جھلک رہتی ہے۔ ہر شمارہ معیاری شمارہ۔ جناب ندا فاضلی کی بے حد پسند کی جا رہی ہے۔ غزلوں کا انتخاب معیاری ہے۔ اردو میں پتے لکھنے کی تحریک و تجویز تو بہت خوب ہے۔ کاش سب اس پر عمل کریں۔ المیہ تو یہی ہے کہ ہم اردو کی ترقی کی بات کرتے ہیں لیکن اپنے بچوں کو انگلش میڈیم سے تعلیم ...

لوں پہ پتے انگریزی میں لکھتے ہیں۔ خط وکتابت انگریزی میں کرتے
ں۔ دستخط انگریزی میں کرتے ہیں، انگریزی رسائل واخبارات
ریدتے ہیں۔ بہار اور یوپی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ
ے دیا گیا تو اس کے پس پشت بھی کچھ سیاسی مقاصد تھے۔ **راشد**
**ندراشد** مکان نمبر ۵۱۴-۱-۱۹ انڈرا ماما، حیدرآباد ۲۶۴ ۵

○ شاعر برابر مل رہا ہے۔ ہر شمارہ معیاری، دلچسپ اور قابلِ
طالعہ۔ ندا فاضلی کی خود نوشت "دیواروں کے بیچ" بے حد دلچسپ
وتی جارہی ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ آپ کی کوشش اور محنتوں سے
شاعر ترقی کی منازل طے کرتا رہے۔ **انوار انصاری**، ڈی — ۱۹
، اوانڈین ایکسپلوسیوز، گومیہ، ڈسٹرکٹ گریڈیہ (بہار)

○ شاعر کے کئی شمارے اور دو خاص نمبر میرے زیر مطالعہ
ہے اور میں نے ان سے استفادہ بھی کیا۔ آپ سے شکایت تو نہیں
رسکتا ہاں درخواست ضرور کروں گا کہ مجھے اپنے معیاری رسالے سے
روم نہ رکھیں اور دوحہ میں رہنے والے شاعروں اور ادیبوں کو بھی
پنے شاعر سے استفادہ کا موقع دیں۔ میں شاعر کو اپنانا چاہتا ہوں۔
**بق المنظر**، پوسٹ بکس نمبر ۱۰۸۹۴ دوحہ قطر (اے۔جی)

○ اردو میں پتہ لکھا پوسٹ کارڈ مل گیا تھا۔ اس تحریک کے علاوہ
ب سے بڑا کام اردو کو زندہ رکھنے کے لیے یہ ہو کہ اردو اسکولوں پہ
جہ دی جائے۔ پورے مہاراشٹرا میں پرائمری سے ہائی اسکول تک
ب انتشار ہے۔ اساتذہ اردو سے نابلد ہیں۔ سکنڈ ٹیچل تو جیسے اساتذہ
دچھو کر بھی نہیں گذرے۔ ۱ فی صد لوگ ہی کسی قابل ہیں اور محنت
ررہے ہیں۔ ان اسکولوں سے ہر سال کی ایک بھیڑ نکل رہی ہے مگر
س۔ پچھلے دس پندرہ برسوں سے مسلسل یہی ہو رہا ہے۔ اردو اسکولوں
تعداد غیر معیاری اسکولوں کی وجہ سے گھٹ رہی ہے۔ مسلمان اور اردو
ت تمہ اپنے بچوں کو ہندی، مراٹھی اور انگریزی اسکولوں میں داخل
رواتے ہیں۔ مستقبل میں کیا ہوگا ہمیں اس کی فکر کرنی چاہیئے۔ اردو
اڈمی اپنی کھال میں مست ہے۔ ان مذکورہ خامیوں کو صحیح کام پر لگنے
تحریک چلانی چاہیئے ادھر توجہ دیجئے۔ **منصور اعجاز**، رشید اسٹوڈیو
ت محل ۱ ۵ ۴۴ (مہاراشٹر)

**مغیر احمد**۔ تا ہو نگر، نزد واٹر ٹینک، مالیگاؤں ۱ ۵ ۲ ۴ (مہاراشٹر)
شاعر کا شمارہ نمبر ۴ موصول ہوا۔ اردو سے متعلق آپ کا فکرانگیز
اداریہ پڑھا۔ اردو میں پتے لکھنے کی تحریک شروع کر کے دراصل آپ نے
اردو سے محبت کا عملی ثبوت پیش کیا۔ آپ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے

ادارہ شاہین کی جانب سے مالیگاؤں میں تحریک کا آغاز کیا جا چکا ہے۔
اس سلسلے میں ضلع بھر سے کئی خطوط ہمیں موصول ہوئے جس میں شکایت
کی گئی ہے کہ ڈھیر سارے خطوط اردو میں پتے لکھ کر روانہ پوسٹ
کیے جارہے ہیں مگر جیسے گزرنے کے بعد بھی مل نہیں رہے اس تعلق سے
کیا کیا جائے؟ اس تحریک کے سرد پڑنے کا سب صحیح تجزیہ آپ نے کیا
کہ ہمارے علاوہ دو بڑے بھائی لوگ، بزرگ اردو اکاڈمیاں اور ادارو
کو اس تحریک میں کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آرہا ہے۔ حقیقت میں اس
تحریک کو اردو اکاڈمیوں، بڑے بڑے اداروں اور مصلحت کے سکار ادبا
وشعرا کی ضرورت بھی نہیں اردو کا عام قاری چاہے تو اس تحریک کو
کامیابی سے ہمکنار کرسکتا ہے جس کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ اس تحریک کا
مگر اس اردو کے عام قاری میں گہری ہوتی جارہی ہیں۔ ضرورت اس
بات کی ہے کہ اس تحریک کو مفاد پرست سیاست دانوں اور ادبا و شعرا
سے بچایا جائے اور اردو کے عام قاری کی صحیح رہنمائی کی جائے۔

**اشوک رام دیو**۔ معرفت رام لال امڈسر ۸/۶۶۳ نائی سی ۳ ۱۳۲۱ .
آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ میں آج کل اوپی مرکز پانی پت میں
اردو زبان سیکھ رہا ہوں میرے ساتھ کئی دوسرے ساتھی بھی زبان
سیکھ رہے ہیں۔ ہم بڑے شوق سے زبان پڑھ رہے ہیں امید ہے کہ
ہم جلد ہی زبان خوب اچھی طرح پڑھنے لکھنے لگیں گے۔
اوپی مرکز میں "شاعر" اکثر نظر سے گزرتا رہتا ہے ہم اکثر اسے
پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ استاد محترم ڈاکٹر کمار پانی پتی اکثر آپ
کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ آپ واقعی اردو زبان کی بہت خدمت کر رہے
ہیں۔
آج کل ہم بھی آپ کی چلائی ہوئی مہم پر عمل کرتے ہوئے اپنے
خطوں پر اردو میں پتے لکھ رہے ہیں ہم ہر دور کئی کئی خط لکھتے رہتے
ہیں۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ یہ زبان ہمارے وطن میں پھر عظمت کی
بلندیوں پر پہنچ جائے گی۔

○ شمارہ نمبر ۵ میں شمس مرہ کا افسانہ 'سوال زندگی کا' اور شہریار
کی نظم 'ہونٹوں سے نہیں نکلتی' بے حد پسند آئے اپنی طرف سے ایک
رائے دینے کی جسارت کر رہا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ٹریسنگ کے صفحے پر
جہاں آپ شمارہ نمبر، جلد نمبر اور سنہ لکھتے ہیں، مہینہ بھی لکھ دیا کریں
تو بہتر رہے گا۔

**عمر فاروق** ۱۰۳۱، سدمستور میٹھ اشولاپور

○ شمارہ نمبر ۵ میں عکس "ش" مرحوم کی نام غزلیں پسند آئیں موزنہ ... کا مطالعہ نئی شاعری کے پیچ و خم سے متاثر کرتا ہے منظومات معیاری ہیں
کہانیوں میں انس کے بعد اور مارلن ڈلموری اچھی لگیں۔ مہاراشٹر میں
اردو تحریک کے آغاز پر شاعر کو مبارک باد۔ ہم بھی اس تحریک میں شامل
ہو رہے ہیں۔

**عظمت فاروقی، اطہر علی، کلیم نوری**
معرفت مولانا آزاد کالج اورنگ آباد (مہاراشٹر)

○ شاعر کے حالیہ شمارے، قومی آواز اور دیگر اخبارات و رسائل
میں آپ نے یوپی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کے متعلق اپنے
تاثرات پیش فرماتے ہیں میں آپ سے بالکل اتفاق کرتا ہوں۔ دراصل
زبان تب ہی زندہ رہتی ہے جب وہ عوام کی زبان بن جائے اور یہ
صرف استعمال، رواج، تعلیم، ادب یعنی ہر شعبۂ حیات میں شامل کرنے ہی
سے حاصل ہوسکتا ہے ہماری مختلف تنظیمیں قائم ہیں اور وہ اپنے
اپنے طور پر کچھ نہ کچھ کر بھی رہی ہیں لیکن ان میں ایک ٹکراؤ ہے جس نے
اردو کے فروغ کی راہیں مسدود اور سمتیں منتشر کر دی ہیں۔
میں شاعر سے بہت متاثر ہوں، زبان و ادب کے لئے اس کی
خدمات قابل تحسین ہیں میرٹھ میں آپ کے لیے سب کچھ کر رہا ہوں
**ایس شفیق احمد** مکان نمبر ۸، پورہ الٰہی بخش سارس کمپنی
میرٹھ ۔ ۲ (یوپی)

○ شاعر کا تازہ شمارہ موصول ہوا شاعر کی اپنی ایک روایت رہی ہے کہ
اس کا ہر شمارہ دستاویزی حیثیت کا حامل ہوتا ہے، الحمدللہ وہ روایت آج
بھی برقرار ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بدلتے ہوئے رجحانات کی عکاسی
و ترجمانی سے اس روایت میں توسیع کی ہے مندرجات تمام تر معیاری ہیں۔
**ضیار الانجم** ۶۰ ایکسٹ جبلپور (ایم پی)

○ آپ کا اردو مجلہ شاعر نظر سے گزرتا رہتا ہے۔ اس کے مضامین
نئے نئے موضوعات پر مشتمل ہوتے ہی ہیں اپنی افادیت و
اہمیت میں بھی دوسرے اردو رسائل سے بڑی مسابقت کرتے ہوتے
ہوتے ہیں بلکہ یہ کہا جائے کہ شاعر اردو کا ایک ایسا جریدہ ہے جس کا
ملک بھر میں جواب نہیں تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔
**سراج انور مصطفٰے آبادی** ۔ محلہ کسائی اظہر ۱ ۴ ۵ ۲ ۴ ضلع جلگاؤں

## ذیابیطس کا شافی علاج

اردو میں اپنے موضوع پر ایک اہم ترین کتاب جس میں بہت تفصیل کے ساتھ ذیابیطس کے اسباب و علل اور علاج وغیرہ پر بحث کی گئی ہے یونانی ادویات کا احوال بطور علاج دیا گیا ہے، ساتھ ہی اندرونی تمام اعضاء کے بارے میں تشریح کی گئی ہے۔ جگہ جگہ انگریزی اصطلاحات کے اردو مترادفات دیئے گئے ہیں۔ زبان علمی و طبی ہے۔ کتاب کے مؤلف حکیم شاہ فیصل نے اپنے تمام تجربات و مشاہدات اور تجزیوں کو اس کتاب میں سمو دیا ہے۔ ذیابیطس پر ایک مکمل کتاب ہونے کے علاوہ بھی یہ طبی و سائنسی معلومات کا ایک خزینہ ہے۔

ضخامت ۲۸۰ صفحات۔ قیمت: چھیاسی روپے۔ پتہ: مکتبہ الفیصل، پرانا گنج (جھیاں)، رامپور ۹۳۴۴۲ [یوپی]

## پچھلے موسم کا پھول

زخم تمنا [۱۹۶۳ء] اور رستہ گونگے سفر کا [۱۹۷۴ء] کے بعد مظہر امام کا تیسرا شعری مجموعہ شائع ہو گیا ہے [۱۹۸۸ء] — اس میں ۵۵ غزلیں اور ۳۴ آزاد غزلیں شامل ہیں۔ کشمیر کی یہ غزلیں اپنی لفظیات و تراکیب اور مترنم بحروں میں ایک ایسی خوب سیرت شعری کائنات لیے ہوئے ہیں جہاں فکر و احساس لمحہ بہ لمحہ بدلتے ہوئے منظروں سے گزرتے ہوئے تازگی، طمانیت، اپنا پن اور روح کو سیرابی عطا کرتی ہیں۔

ضخامت ۱۲۸ صفحات۔ قیمت پچاس روپے۔ پتہ: ۷۔ پرتاپ پارک ملینش، ریزیڈنسی روڈ، سری نگر ۱۹ [کشمیر]

## پانی کا رنگ

گجرات کے معروف شاعر معصوم شرقی کا اولین شعری مجموعہ شائع ہو گیا ہے [۱۹۸۸ء] ۸۰ غزلوں پر مشتمل اس شعری مجموعہ کا پیش لفظ مشہور نقاد وارث علوی نے تحریر کیا ہے۔ معصوم کی غزلوں میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو کلاسیکی روایت کے عطیے کے طور پر دور دراز کے شاعروں کے حصے میں بھی آتی ہیں یعنی الفاظ کا دروبست، صحیح زبان کا استعمال، عروض و آہنگ کی نزاکتوں کی نگہداشت لیکن ساتھ ہی ان کے یہاں جدید غزل کے اثرات کے تحت موضوعات میں تنوع اور نکتہ آفرینی اور مضمون آفرینی کا میلان بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس شاعری کا مقدمہ نامور شاعر و نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے۔

ضخامت ۱۴۴ صفحات۔ قیمت ۲۵ روپے۔ پتہ: نیو احمدی ریسٹورنٹ، المقابل نیائے مندر، بڑودہ [گجرات]۔

## ماہنامہ خرام کانپور

کانپور سے ایک نئے ادبی رسالے کا اجراء عمل میں آیا۔ یہ رسالہ ان نئے قلم کاروں کے لیے جو مستقبل کے ادیب و شاعر اور ناقد ہوں گے لیکن جن کی نگارشات قارئین تک نہیں پہنچ پاتیں۔ خرام کے شمارہ اول میں ۵ مضامین، ۷ غزلیں، ۲ نظمیں اور ۴ افسانے شامل ہیں۔ دو کتابوں پر تبصرے اور ایک گفتگو کا ستون — ایک بامقصد تعمیری ادبی رسالہ۔

ضخامت ۴۸ صفحات۔ قیمت فی شمارہ ۳ روپے۔ زر سالانہ چھتیس روپے۔

مدیر اعلیٰ: زبیر احمد فاروقی۔ مدیر: عشرت ظفر۔

پتہ: پیرزادہ نعیم آباد۔ کانپور ۲۰۸۰۰۱ [یوپی]

## تنقید اور جدید اردو تنقید

ڈاکٹر وزیر آغا اردو تنقید میں ایک فکری دبستان بن گئے ہیں — ان کی متعدد تنقیدی کتابوں میں تخلیقی و تحقیقی طرز اسلوب، اجتہاد و اختراعی شعور، وسیع تر موضوعات و مواد اور تنقیدی زبان کی معیار بندی ملتی ہے۔ تنقید اور جدید تنقید [۱۹۸۹] ایک ایسا تحقیقی جائزہ ہے جسے اردو ادب میں تنقید کی جید ترین کتابوں میں شمار کیا جائے گا۔

کتاب کے عنوانات میں تنقید، تنقید کا پس منظر، مغرب میں تنقید کے عہد و مدارج، مطالعہ — اور جدید اردو تنقید کے تحت: جدید اردو تنقید کا پس منظر، جدید اردو تنقید کا آغاز، جدید اردو تنقید کا مجموعی تناظر، جدید اردو تنقید کا عمومی تناظر، جدید اردو تنقید استقرائی اسلوب شامل ہیں۔ لفظ لفظ اور سطر سطر سے نئی بات جہان علم کے در وا کرتی ہے۔ میں اسے طور میں عالمی ادبی تنقید کا سرمایہ بہت گہرائی تک نہیں موضوع میں پیوست ہے۔

ضخامت ۲۴۸ صفحات۔ قیمت پچاس روپیہ۔ مطبوعہ ۱۹۸۹ء۔ پتہ: انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ، کراچی، [پاکستان]

## اردو ناول میں طنز و مزاح

اردو میں اپنے موضوع پر ایک مختلف و منفرد کتاب۔ طاہر تمنا امروہوی کا پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی مقالہ ہے لیکن ایک وسیع تحقیقی کام اپنی ڈگری سے بہت آگے کی چیز ہے۔ اردو ناول میں طنز و مزاح نو ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر ایک باب اپنے موضوع کی تمام جزئیات کا بھرپور احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ناول کی تعریف، طنز و مزاح کیا ہے؟ اردو نثر میں طنز و مزاح کی روایت ناول کے علاوہ اردو نثر میں طنز و مزاح۔ انیسویں صدی کے اردو ناول میں طنز و مزاح ——— اردو کے منفرد طنزیہ و مزاحیہ ناولوں کا تنقیدی جائزہ۔ اردو کے ناقابل فراموش مزاحیہ کردار۔ اہم ناول نگاروں کے یہاں طنز و مزاح کا پہلو۔ کتاب کا آخری باب ماحصل ہے اور سب سے آخر میں کتابیات ہے۔ موضوع وسیع تر، مواد کی فراہمی میں ممکنہ تحقیقی جستجو۔ اسلوب سادہ و عام فہم تحقیقی نصاب بندی معیاری، ترتیب و تہذیب میں خلیق ثابت۔ ایک چراغ روشن ہوا ہے لو سے لو کا سفر، ایک نئی قطار کے امکانات۔ حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد فاروقی اور عبدالقوی دسنوی کی آراء نے اس کتاب کی معنویت کو اپنے طور پر اجاگر کی سعی کی ہے۔

ضخامت ۳۷۰ صفحات۔ قیمت سو روپے۔ مطبوعہ ۱۹۸۸ء۔ تقسیم کار: میسرز صدری پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ، دریا گنج نئی دہلی۔ ۲

## صدف تمنا در

نئی غزل کے نمائندہ شاعر تہمیر رسول کا یہ اولین شعری مجموعہ ہے جس میں سو غزلیں [۶۱۲ اشعار اور ۵ متفرق شعر] شامل ہیں۔ یہ سارا شعری لوازمہ اپنے اسلوب، دلکشی، رویے اور اظہار پیشکش میں شدت احساس سے مملو ہے۔ نئی نسل سے اپنے عصر کی جو بھی کشیدہ تخلیقی سطح پر کی ہے شہیر رسول اس کی کامیابی کے ساتھ نمائندگی کرتے ہیں۔ وہ شعر کی پہلی یا دوسری سطح سے بات نہیں کرتے بلکہ تہوں کو چھو لینے کی خواہش بھی کرتے ہیں اور یہی خواہش ان کے یہاں روشن امکانات کی کلید ہے۔

ضخامت ۱۳۶ صفحات۔ قیمت ۴۰ روپے۔ مطبوعہ
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ

## بھارت میں چند روز

پاکستان کے معروف شاعر اعتبار ساجد [دستک، آمد، پر پیائی، ہم بھی کسی کا خواب تھے] کا یہ سفرنامہ میں شام بہار ٹرسٹ [انبالہ] کے گیارہویں انڈو پاک کے حوالے سے تحریر کیا گیا ایک دلچسپ، متنوع اور خوب ہے بقول اعتبار ساجد:

"یوں میں سیاح نہیں، شاعر تھا، شاعر کی حیثیت سے بلایا گیا تھا۔ جو کچھ میں نے دیکھا، عاشق کی آنکھ سے اور شاعر کی زبان سے بیان کر دیا۔ اسی لیے میری باتیں رواں بحروں میں آسان اور سیدھے سادے مصرعے ہیں۔"

ایک معیاری سفرنامہ، رپورتاژ، آپ بیتی اور ڈائری ہونا چاہیئے۔ اعتبار ساجد نے کوشش کی ہے کہ وہ خود پس منظر اور واقعات از خود سفر کرتے ہوئے معلوم ہوں۔

ضخامت ۱۲۶ صفحات۔ قیمت۔ چالیس روپے۔ جنوری ۱۹۸۹ء۔ رابطہ: مکتبہ عالیہ اردو بازار، لاہور [پاکستان]

## کوکن کے سپوت

کوکن اردو رائٹرس گلڈ نے ۱۹۷۱ء تا ۱۹۹۰ء تک مہاراشٹر کے ادبا و شعراء کو اپنی مطبوعات کے ذریعے اردو دنیا میں جس طرح مشہور کیا ہے وہ ایک قابل قدر شاندار کارنامہ ہے۔ گلڈ کے روح رواں ساحر شیوی خود بھی ایک معروف شاعر ہیں اس کے لیے داد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے مطبوعات کے اس کام کو قطعی غیر تجارتی بنایا ہوا ہے کہ صرف معیاری اور خوبصورت کتابیں شائع ہوتی رہیں۔ گلڈ کی مطبوعات میں سے ایک اہم نثری کتاب کوکن کے سپوت بھی ہے جسے اکرم عباسی اور شیخ اسماعیل نے ترتیب دیا ہے۔ اس کتاب میں خطہ کوکن کے ۲۱ نمائندہ شعراء، ادباء، سماجی، ثقافتی اور تہذیبی لوگوں کے وہ انٹرویو شامل کیے گئے ہیں جو اکرم عباسی نے مختلف وقتوں میں لیے تھے اور جو رسائل و اخبارات میں شائع ہو چکے تھے۔ اپنے موضوع پر یہ ایک اہم کتاب ہے جو کوکن کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔

ضخامت ۱۴۴ صفحات۔ قیمت: چالیس روپے۔ مطبوعہ۔ پتہ: اکرم عباسی، صندوق والا بلڈنگ، بی بلاک روم نمبر ۳۱، تارڑھ

## نقد و نظر

a No MH-BYW 311 — [illegible]

# THE 'SHAIR" (MONTHLY) BOMBAY-400 008.

'ears of Publication ✱ (Publishing Date 27-28) ✱ Issue No 9-10 1989 ✱ Telephone No 359904

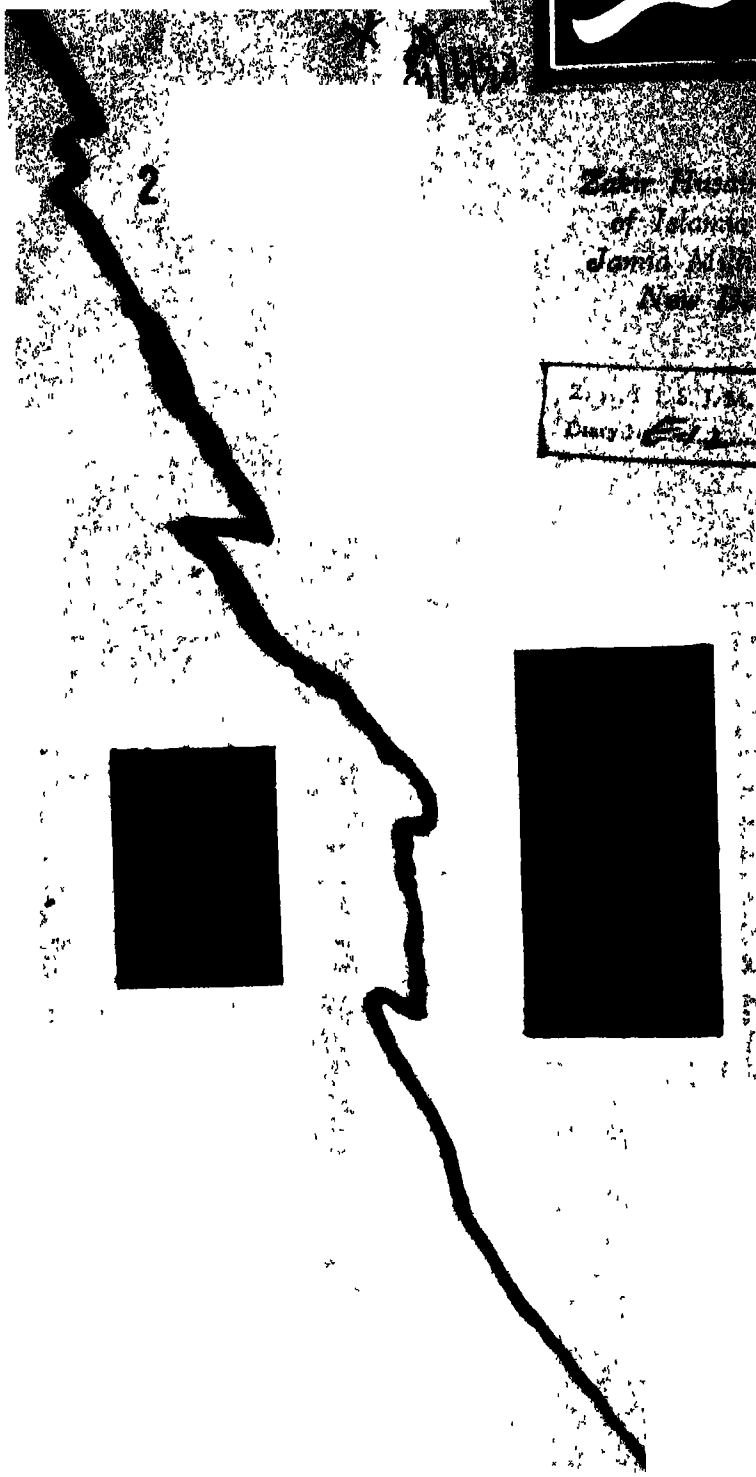
Registered with the Registrar of Newspapers at R N No 1448? 57



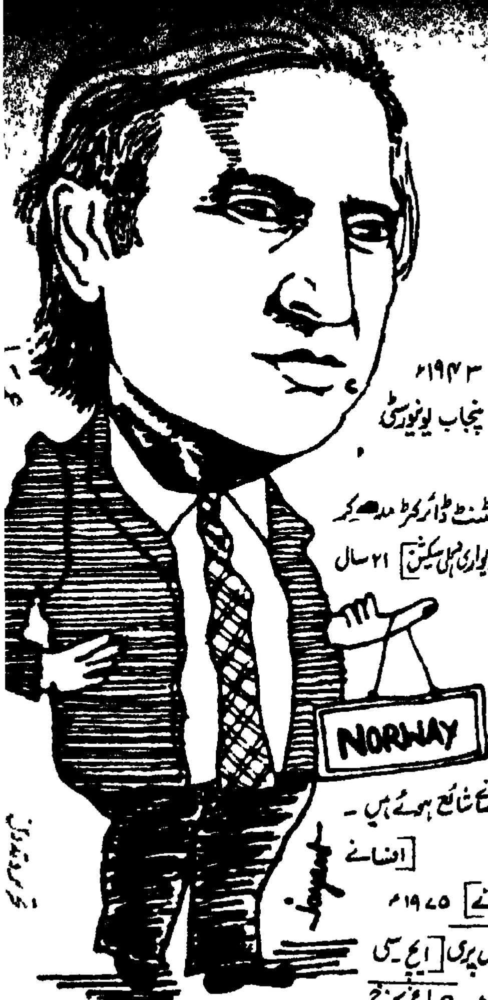
[illegible]

# شاعر

2



# ہرچرن چاؤلہ




○ نام: ہرچرن داس

○ قلمی نام: ہرچرن چاؤلہ

○ پیدائش: ۳ر نومبر ۱۹۲۵ء

○ وطن: داؤد خیل ضلع میانوالی [مغربی پنجاب]

○ تعلیم: میٹرک ۔ کے ۔ آر ۔ اے ۔ ایس ہائی اسکول پھیرہ ۔ ۱۹۴۳ء
انٹر ۔ منروا کالج ۔ راولپنڈی ۱۹۴۵ء ۔ بی ۔ اے ۔ پنجاب یونیورسٹی [حیدلی گڑھ] پی ۔ ٹی کالج دہلی ۱۹۵۶ء

○ ابتدائی ملازمتیں: آر ۔ ایم ۔ ایس سارٹر، کندیاں جنکشن، دہلی ۔ فلم اسسٹنٹ ڈائرکٹر مدھ کر فلم بمبئی ۔ اسٹیشن ماسٹر، نارد رن ریلوے بیکانیر ڈویژن [ریواڑی پھلی سیکشن] ۲۱ سال

○ موجودہ ملازمت: صلاح کار [اردو، ہندی، پنجابی] اوسلو کیون کی ہیڈ لائبریری اوسلو [ناروے]

○ ادبی زندگی کا آغاز: پہلا افسانہ ریاست دہلی ۱۹۴۸ء [ایڈیٹر دیوان سنگھ مفتون]
تاحال ہندوپاک کے تمام ہی اہم ادبی رسائل میں افسانے شائع ہوتے رہے ہیں ۔ اردو کے علاوہ ہندی، پنجابی اور انگریزی زبانوں میں بھی افسانے شائع ہوئے ہیں ۔

○ تصانیف: درندے [ناول] THE BROKEN HORIZON [افسانے انگریزی میں ترجمہ] ۱۹۷۴ء ۔ عکس آئینے کے [افسانے] ۱۹۷۵ء
ریت، سمندر اور جھاگ [افسانے] ۱۹۸۰ء ۔ ننھی جل پری [ایچ ۔ سی اندرسن (ڈنمارک) کی بچوں کی کہانی کا ترجمہ] ۱۹۸۰ء ۔ چراغ کے زخم [ناول] ۱۹۸۲ء ۔ آخری قدم سے پہلے [ہندی میں ترجمہ شدہ افسانے] بھٹکے ہوئے لوگ [ناول] ۱۹۸۴ء ۔ پانرٹی دی [پنجابی (گورمکھی) میں ترجمہ شدہ افسانے] ۱۹۸۵ء ۔ ناروے کے بہترین افسانے ۱۹۸۸ء ۔ آتے جاتے موسموں کا سچ [افسانے] ۱۹

○ زیر طبع: دھوپ ایک چادر [ناول چراغ کے زخم کا ہندی روپ] ننھی جل پری [ایچ ۔ سی ۔ اندرسن کی کہانی کا ہندی روپ] البم یادیں تا ۱۹۸۶ء تک "اوراق" لاہور میں شائع شدہ [افسانے، انگریزی میں ترجمہ شدہ] BETWEEN THE LINES [افسانے]
اردو، ہندی، پنجابی، انگریزی اور نارویجین زبانوں میں افسانے اور تراجم وغیرہ زیر ترتیب و طبع ہیں ۔

● ہجرت در ہجرت سفر سے تشکیل پذیر شخصیت میں اپنی مٹی سے روحانی رابطہ بنائے رکھنے کی شعوری کشمکش، تارکین وطن کے مسائل سے شمالی مغربی یورپ میں حرکت کرتے ہوئے جسم میں روح ہندستانی ۔ خوش خیال، دوستدار، عصر آشنا اور وقت ساز ۔ حرف و لفظ اور کاغذ کی سطح نو، تازہ بہ تازہ ۔ زندگی کو پوری طرح جی لینے کی خواہش میں دنیا ہو جانے کا عمل، سماجی، ثقافتی، سیاسی اور وطنی سطح پر بھی تیز تر، نرم گہ فرحدات قیود سے انتہا پسند ۔ افسانہ، ناول، اور ترجمہ نگار، افسانوں میں ہیئت کے تجربے متنوع ۔ موضوعات و عنوانات میں ندرت، نئے عصری ماحول، نت نئے مناظر ۔ تیز رو تخلیق کار رہے ہیں:

——— ہرچرن چاؤلہ

# فکر امروز



"...حقیقی شاعر وہی ہے جو انسان کی صرف اس حقیقت کی ترجمانی کرے جو ناقابلِ انقلاب ہو، جس پہ دنیا کی ظاہری ہوائیں اثر انداز نہ ہو سکیں اور جو حقیقت سے براہِ راست رابطہ پیدا کر کے اس کے چہرے سے نقاب اٹھا سکے۔ اس کے برعکس جو شعرا اپنے گرد و پیش کے مناظر و مظاہر میں الجھے رہتے ہیں انھیں ہم اس وقت شعرائے کامل کی فہرست میں شریک نہیں کرتے اور نہ اس قسم کا شاعر اس وقت ہمارا موضوعِ نظر ہے۔

شاعر کی اس ہمہ گیر ـــ مگر مخصوص خصوصیت کو ملحوظِ نگاہ رکھتے ہوئے اگر تمام دنیا کے شعراء کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں کسی قسم کا فرق نہ ہوگا اور فرق کیوں کر ہو سکتا ہے جبکہ ہر حقیقی شاعر صرف انھیں خیالات کی ترجمانی کرتا ہے جو انسانیت صحیح سے متعلق ہوتے ہیں۔

قدیم زمانے کے کسی یونانی شاعر کے کلام سے آٹھویں صدی کے کسی چینی شاعر کے کلام کا موازنہ کیجیے اور پھر موجودہ دور کے کسی شاعرِ کامل کا مطالعہ فرمایئے تو آپ یقیناً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ایک حقیقی شاعر زمان و مکاں کی قیود سے بھی مطلق آزاد ہے...."

انسانِ کامل کامل شاعر کے نقطۂ خیال سے۔ مطبوعہ: ماہنامہ "کنول" آگرہ مارچ ۱۹۳۷ء

**سیماب اکبرآبادی**


# شاعر

اشاعت کا ۶۰ واں سال

جلد ـــ ۶۱

شمارہ ـــ ۱۱-۱۲

فون: ۳۵۹۹۰۳

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت :- ۵ روپے

زرِ سالانہ ۵۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۶۰ روپے

تاعمر خریداری ۱۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے ◆ ممالک غیر سے ۳۵۰ روپے

ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب، بمبئی سینٹرل پوسٹ آفس پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶، بمبئی ۴۰۰۰۰۸

# شاعر کے خصوصی شمارے، خاص نمبر اور مکمل فائل

## محدود تعداد میں دستیاب ہیں

شاعر نے ۱۹۷۵ء سے مقتدر ادبا و شعراء پر گوشے شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ یہ خصوصی شمارے کسی خاص نمبر سے کم نہیں۔ آج بھی ان شماروں کی قدر و منزلت برقرار ہے۔ مدتوں سے یہ شمارے دستیاب نہیں تھے۔ شاعر کے خاص نمبروں کی اپنی ایک تاریخی روایت ہے۔ کسی بھی قیمت پر ان نمبروں کی مانگ بدستور رہتی ہے۔ شاعر کے مکمل فائلوں کا مطالبہ و اصرار بھی شدید تر ہے۔ ۱۹۷۵ء تا ۱۹۸۷ء کے بعض خصوصی شمارے خاص نمبر اور مکمل فائل اب محدود تعداد میں دستیاب ہیں۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| گوشۂ غلام ربانی تاباں ۱۹۷۵ء | گوشۂ حسن الدین احمد ۱۹۷۶ء | گوشۂ عبدالعلیم نامی ۱۹۷۸ء | گوشۂ کالی داس گپتا رضا ۱۹۸۳ء |
| " ابراہیم یوسف " | " سید حامد حسین " | " کوثر چاندپوری " | " اختر سعید خاں ۱۹۸۴ء |
| " جوگندر پال " | " صالحہ عابد حسین " | " پریم وار برٹنی " | " عثمان عارف نقشبندی " |
| " راجندر سنگھ بیدی " | " سیماب اکبرآبادی " | " اظہر افسر ۱۹۷۹ء | " حامدی کاشمیری ۱۹۸۶ء |
| " اختر الایمان " | " جیلانی بانو ۱۹۷۷ء | " سلام سندیلوی " | انشائیہ پر خصوصی شمارہ " |
| " شمیم کرہانی " | " رام لعل ۱۹۷۸ء | " میکش اکبرآبادی " | اردو کی نئی بستیاں " |
| " عمیق حنفی ۱۹۷۶ء | " قرۃ العین حیدر " | " گیان چند جین ۱۹۸۱ء | **فی شمارہ صرف ۵ روپے** |
| " عصمت چغتائی " | " جاں نثار اختر " | " بشیر بدر ۱۹۸۳ء | |

## شاعر کے مکمل فائل

| | | |
|---|---|---|
| ۱۹۷۵ء | قیمت | ۵۰ روپے |
| ۱۹۷۶ء | " | ۵۰ روپے |
| ۱۹۷۷ء | " | ۸۰ روپے |
| [مع کرشن چندر نمبر ۲ اور ہم عصر اردو ادب نمبر] | | |
| ۱۹۷۸ء | " | ۵۰ روپے |
| ۱۹۷۹ء | " | ۵۰ روپے |
| ۱۹۸۰ء | " | ۷۰ روپے |
| [مع خلیل الرحمان اعظمی نمبر ۸۰ء] | | |
| ۱۹۸۱ء | " | ۶۰ روپے |
| [مع ایک شمارہ ۱۹۸۰ء کے نام اور افسانہ نمبر ۸۱ء] | | |
| ۱۹۸۲ء | " | ۵۰ روپے |
| ۱۹۸۳ء | " | ۸۰ روپے |
| [مع نثری نظم اور آزاد غزل نمبر ۸۳] | | |
| ۱۹۸۴ء | " | ۵۰ روپے |
| ۱۹۸۵ء | " | ۱۱۰ روپے |
| [مع گوشۂ یاس یگانہ چنگیزی اور آفیسٹ کا افتتاحی شمارہ] | | |
| ۱۹۸۶ء | " | ۵۰ روپے |
| ۱۹۸۷ء | " | ۵۰ روپے |

## شاعر کے کمیاب اور نایاب خاص نمبر

| | |
|---|---|
| خاص نمبر ۱۹۶۳ء | ۱۵ روپے |
| خاص نمبر ۱۹۶۵ء | ۱۰ روپے |
| افسانہ و ڈرامہ نمبر ۱۹۶۸ء | ۱۵ روپے |
| گاندھی نمبر ۱۹۶۹ء | ۱۵ روپے |
| ناولٹ نمبر ۱۹۷۱ء [۱۷ ناولٹ] | ۵۰ روپے |
| سالنامہ ۱۹۷۲ء | ۳۰ روپے |
| قومی یکجہتی نمبر ۱۹۷۴ء | ۲۰ روپے |
| ایک شمارہ ۱۹۸۰ء کے نام | ۱۵ روپے |
| افسانہ نمبر ۱۹۸۱ء | ۱۲ روپے |
| ہم عصر اردو ادب نمبر ۱۹۷۷ء | ۵۰ روپے |
| نثری نظم اور آزاد غزل نمبر ۱۹۸۳ء | ۵۰ روپے |
| آفیسٹ کا افتتاحی شمارہ ۱۹۸۵ء | ۱۲ روپے |
| یاس یگانہ چنگیزی نمبر مع ترانہ | ۱۲ روپے |

نوٹ: گوشہ والے شمارے، خاص نمبر اور مکمل فائل کی تعداد چونکہ محدود ہے اس لئے پہلے آرڈر وصول ہونے پر ان کی تعمیل کردی جائے گی۔ محصول ڈاک رجسٹری خرچ علاحدہ ادا کرنا ہوگا۔ آرڈر آنے پر مطلوبہ شمارے وی پی سے بھیجے جائیں گے گوشہ والے شماروں کیلئے فی شمارہ ۵ روپے کے حساب سے رقم بذریعہ منی آرڈر بھی جاسکتی ہے۔ ایجنٹ حضرات زحمت نہ کریں۔

شمارہ — نمبر ۱۱-۱۲ — جلد - ۶۰
۱۹۸۹ء


سرورق: رشتہ ناطے — عمل: سلطان سبحانی

## محفل اپنی

جلد ۶۰ کے اس آخری شمارے کے ساتھ ۱۹۸۹ء کے دس شمارے مکمل ہو گئے، اسی کے ساتھ شاعر نے اپنی عمر کے "ساٹھ سال" بھی مکمل کر لیے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا تاریخی کارنامہ ہے جس کی کوئی دوسری مثال ہندوستان کی کسی بھی زبان میں نہیں ملے گی۔

اقبال نمبر کی غیر معمولی کامیابی کے بعد عام شماروں کی اشاعت میں تسلسل اور ۱۹۸۹ء کے ۱۲ شماروں کی پیش کش کی خواہش نے دس شماروں ہی کی تکمیل کی اور بہ حالتِ مجبوری یہ دو شمارے چار شماروں پر مشتمل پیش کیے جا رہے ہیں۔

۵۰ روپے زرِ سالانہ میں کم صفحات کے دس شماروں میں مواد کی زیادہ سے زیادہ سمائی کا اعتراف سبھوں نے کیا ہے۔ ایسی اور اتنی متنوع تخلیقات اور معیار صرف اور صرف شاعر کا خاصہ ہے۔

ابھی اقبال نمبر کے گرداب سے آزاد نہیں ہو سکے ہیں لیکن آئندہ شماروں سے شاعر کے صفحات میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔

شاعر کے قارئین لامحدود، اور شاعر نواز بے شمار لیکن اس کو کیا جائے کہ شاعر کو اپنوں سے نقصان بھی پہنچ رہا ہے مثلاً واجبات کی عدم ادائیگی، زرِ سالانہ بروقت ارسال نہ کرنے کی عادت، محض اپنی تخلیقات کی اشاعت کے لیے شاعر کا خریدار بننا، رسالہ موصول نہ ہونے کی اطلاع تاخیر سے دینا اور پھر شکایت کرنا، رسالہ مفت میں پڑھنا اور اعزازی کاپی طلب کرنا۔ یہ اور ایسے ہی بہت سے مسائل ہیں جن کی موجودگی میں ہم دشواریوں کا سامنا کر رہے ہیں۔ ہمارے وسائل یوں بھی محدود ہیں اور مسائل بے شمار ہیں۔

شاعر اردو کا ایک غیر تجارتی ادبی رسالہ ہے جو نہایت ہی غیر جانبداری کے ساتھ اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہا ہے۔ شاعر کو آپ کے ہر ممکنہ تعاون کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے۔ اس کی توسیع اشاعت اور اشتہارات کی فراہمی وغیرہ میں ہمارا ہاتھ مضبوط کیجیے۔ شاعر آپ کا اپنا رسالہ ہے۔ اس کے متعلق آپ جو بھی سوچتے ہوں اس کا بے تکلف اظہار کیجیے کہ شاعر کا معاملہ دوسروں سے مختلف ہے۔ متعاقب شمارہ ۱۹۹۰ء کا شمارہ اولیں ہو گا تاخیر ضرور ہوئی ہے لیکن یقین کیجیے کہ اس سال بھی ہم زیادہ صفحات، بہت زیادہ مواد کچھ تجربوں اور دلچسپی کے ساتھ پیش کریں گے۔ ایک خاص نمبر، گوشے، اقبال نمبر ۔ ۲ کے علاوہ کئی اہم خاص نمبروں پر بھی کام ہو رہا ہے۔

شاعر ایک تاریخی روایت کا نام ہے۔ آپ کا تعاون اس روایت کی روح ہے آپ ہمیں اپنا بھرپور تعاون دیجیے ہم شاعر کے خوب صورت شمارے اور فقید المثال خاص نمبروں کی ایک قطار سجا دیں گے۔ [ادارہ]

شاعر نے اپنی عمر کے ۶۰ سال مکمل کر لیے

۷۸۶

ھو المستعان

میں بہار نرگس و یاسمن کسی کا ہوں ان کا غبار ہوں

کبھی محفلوں کا چراغ ہوں، کبھی گلشنوں کی بہار ہوں
جو بسا ہے عالم رنگ و بو میں اسی کا مست غبار ہوں

کبھی رنگ و بو کے بہار ہوں کبھی میں خزاں سے ہوا آشنا
کبھی آرزوؤں کا ہوں چمن کبھی حسرتوں کا مزار ہوں

مرا عزم عزم بلند ہے جو کسی سے پست نہ ہو سکا
کبھی گردشوں سے ہوں کھیلتا کبھی گردشوں کا شکار ہوں

مرا حال پوچھنا ہو اگر تو اٹھا کے آئینہ دیکھئے
کبھی کھل پڑا تو میں پھول ہوں کبھی ہوں جو اداس تو خار ہوں

یہ معلوم آج ہے ... چلو تو امید کہ پھر آئے گا
مگر اے وقت سے تنگ ہوں کہ میں غفلتوں کا شکار ہوں

۲۹ رمضان المبارک
۱۳۹۰ھ
ثاقب

ثاقب عظیم آبادی کا عکسِ تحریر

ایک کم معروف مجذوب شاعر سید حسن رضا ثاقب عظیم آبادی [پ: ۱۹۰۴ء - م: ۱۹ جنوری ۱۹۷۴ء] کی ایک غزل کا عکس تحریر۔ ثاقب مرحوم کا شعری مجموعہ سرمایۂ نشاط کے نام سے گوہر عظیم آبادی نے مرتب کرکے ۱۹۷۷ء میں شائع کیا۔ اس سے قبل دو نثری کتابیں "عظیم آباد کی گزشتہ ادبی محفلیں" اور "یادگار عشق" [سوانح عمری شاہ رکن الدین عشق دہلوی ثم عظیم آبادی] شائع ہو چکی تھیں۔ [بشکریہ: ڈاکٹر شکیب ایاز، پٹنہ]

[ادارہ]

**ISLAMIA COLLEGE**
**RAILWAY ROAD**
**LAHORE-7**

Dated 12. 5. 1969

۷۸۶

مکرمی و محبی                                   سلام مسنون

گرامی نامہ کا شکریہ ۔ مطالعۂ امیر مجھے نسیم بک ڈپو والوں نے بھیج دیا تھا ۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں آپ کی اس عنایت کا شکریہ ادا کر سکوں ۔
نسخۂ امیر اللغات و نشتر شاعری انجمن ترقی اردو شائع کر رہی ہے ۔ لیکن نسخہ حمیدیہ کے متعلق جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے ۔ ترقی ادب نہیں کیونکہ ہمارے سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی ڈاکٹر حمید احمد خاں مرتب کر کے چھپوا رہے ہیں اور اسے یونیورسٹی چھاپے گی ۔ میں کل پروفیسر سید وزیر الحسن عابدی کے پاس بھی گیا ۔ تاکہ مزید معلومات فراہم کر سکوں ۔ لیکن وہ ایک بزم سلسلے میں شرکت کے لئے کہیں باہر گئے ہوئے تھے ۔ آپ فکر نہیں فرمائیں کتابیں مارکیٹ میں آئیں گی ۔ ارسال خدمت کروں گی ۔
آپ مولانا عبدالحق کے متعلق جو کچھ وہاں ملے بھیج دیں ۔ میرے لئے کفو[illegible] سب یہاں ہیں ۔ جو جو کتاب آپ کو درکار ہوں گی ۔ خدمت میں پیش کروں گا ۔ حافظ کرم علی زندہ ہیں گا غالب نمبر ۔ اردو ادب

اردو معلی ۔ میں دو رسالے عالب نمبر آپ ضرور اپنے پاس محفوظ کریں ۔ ابھی تو مجلس ترقی ڈاکٹر فرمان والے یہاں سے کوئی جنیک رجسٹرڈ کے اشتہار فصل بھیج کر رہے ۔ وہاں بھی غالباً یہی صورت ہوگی ۔ جب ڈاک آنا جانا کھلے گی ۔ تو پھر میں آپ کو لکھوں گا ۔ اپنے علاقہ کا پیغام مجھے ضرور بھجوا دیا کریں ۔ سنا ہے کہ بڑے اچھے مضامین لکھے جا رہے ہیں ۔
میں نے مطالعۂ امیر کو سرسری نظر سے دیکھا ہے ۔ چونکہ میں حضرت امیر مینائی کا معتقد ہوں ۔ اس لئے کہیں کہیں مجھے اختلاف رائے بھی ہو سکتا ہے ۔ لیکن مجموعی طور پر مطالعۂ امیر بہت اچھی کوشش ہے ۔ آپ نے گہرے مطالعہ کے جو نتائج پیش کئے ہیں بڑے قیمتی ہیں ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو تا دیر زندہ رکھے ۔ آمین!
پروفیسر مسعود حسن رضوی کا ذکر بھی آپ نے اپنی کتاب میں تحریر فرمایا ۔ مسعود صاحب مجھے اچھی طرح سے جانتے ہیں ۔ میں نے کتنا جیسا معقول معاوضہ پاس رکھا تھا ۔ تو اکثر ان سے ملاقاتیں ہوتی تھیں ۔ لیکن وہ گفتگو ایک خواب و خیال ہو گئی ہے ۔ میں نے اکثر ان سے ادبی مسائل میں مشورہ لیا ہے ۔ بڑے پائے کے بزرگ ہیں ۔
کاروبار سے ہمیشہ سرفراز فرماتے رہا کریں ۱۲

خادم
کبریٰ منہاس ۔ عمر حسن کرمانی (مکتوب الیہ)

❁ **کبریٰ منہاس بنام ابو محمد سحر:** اردو زبان و ادب کے خاموش خدمت گزار بزرگ شاعر، ادیب، محقق۔ رسالہ نقوش کے کئی تاریخی ضخیم نمبروں کے مرتب و معاون کا ۱۹۸۷ء میں لاہور میں انتقال ہوا تھا۔ کبریٰ منہاس مرحوم شاعر (آگرہ) کے خاص قلم کاروں میں سے تھے۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر کی تحقیقی کاوش مطالعۂ امیر ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ [ادارہ]

[بشکریہ: ابو محمد سحر بھوپال]



## عالم تابؔ تشنہ

عہدِ کم کوشی میں یہ بھی حوصلہ میں نے کیا
شہر کے سب بند دروازوں کو وا میں نے کیا
میں نے صف آرا کیا اک مجمعِ شوریدہ سر
کج کلاہِ شہر کو بے ماجرا میں نے کیا
دے دیئے محرومیوں کے ہاتھ میں جام و سبو
میکدے میں ایک ہنگامہ بپا میں نے کیا
بخش کر خفتہ سروں کو اک ادائے سرکشی
انجمن در انجمن اک رتجگا میں نے کیا
میں نے اس سے کر دیا ترکِ مراسم کا سوال
عشق میں طے یہ بھی مشکل مرحلہ میں نے کیا
میں عدالت میں اٹھا لایا ہوں خود اپنی صلیب
میرے منصف دیکھ یہ بھی فیصلہ میں نے کیا
میں نے مجنوں کو دیا درسِ سلوکِ عاشقی
چاکِ داماں کو محبت کی جزا میں نے کیا
میں نے ایوانوں میں پھینکے سنگِ جرات آفریں
نشۂ طاقت اثر کو بے مزا میں نے کیا
صف بہ صف میں نے کیا اک ہجومِ منتشر
ان پریشاں خاطروں کو کیا سے کیا میں نے کیا
میں نے افشا کر دیے رنگینیٔ چلمن کے راز
پیکرِ سیمیں بدن کو خوش قبا میں نے کیا
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا سلوبِ بندگی
مجھ سے تشنہ اس نے جو کچھ بھی کہا میں نے کیا

مری دسترس میں ہے گر قلم حسنِ فکر و خیال دے
مجھے شہر یارِ سخن بنا اور عنانِ شہرِ کمال دے
مری شاخِ شعر رہے ہری دے مرے سخن کو صنوبری
مری جھیل میں بھی کنول کھلا مری گدڑیوں کو بھی لعل دے
تری بخششوں میں ہے سروری مرے عشق کو دے قلندری
جو اٹھے تو دستِ دعا لگے مجھے ایسا دستِ سوال دے
رگِ جاں میں جینے لگا ہو اسے مشک بننے کی آرزو
ہے اداس دشتِ تتار دل اسے پھر شلنگِ غزال دے
کوئی بات عقرب و شمس کی کوئی ذکر زہرہ و مشتری
تو بڑا ستارہ شناس ہے مجھے کوئی اچھی سی فال دے
ہیں یہ جسم و جاں کی قیود کیا خد و خال کے یہ حدود کیا
میں ہوں عکسِ منظرِ ماورا مجھے آئینوں سے نکال دے
میں چراغِ بامِ خیال کا مری ہر کرن سے تو لو لگا
یہ جو تیرہ روز ہیں تو انہیں مری روشنی سے اجال دے
ترے سارے عقدۂ چشم و لب ہے کلید ان کی مری طلب
یہ نشاطِ کارِ ہوس ہے سب اسے وصل تا بہ ملال دے
ہے یہ رنجِ راحتِ رفتہ کیا جو گزر گیا سو گزر گیا
شب و روزِ رنجِ گذشتہ کیوں مجھے زعمِ شوکتِ حال دے
میں وہی ہوں تشنۂ بادِ فنا مرا آج بھی وہی مدعا
نہ فراق دے مجھے مستقل نہ مجھے ہمیشہ وصال دے

اب بھی ذرّوں پہ ستاروں کا گماں ہے کہ نہیں
زیرِ پا اب بھی ترے کاہکشاں ہے کہ نہیں
اب بھی وہ جشنِ طرب ہے کہ نہیں مقتل میں
اک تماشے کو ہجومِ نگراں ہے کہ نہیں
اب بھی فریادِ بلب ہے کہ نہیں راندۂ عشق
وہ ہی بے چارگیٔ دلزدگاں ہے کہ نہیں
کہیے نم ہے کہ نہیں چشمِ ندامت آشنا
قافلے والوں کو احساسِ زیاں ہے کہ نہیں
ہر گلِ نم کے لئے ہے کہ نہیں گردشِ چاک
یہ جہاں کارگہِ کوزہ گراں ہے کہ نہیں
وہ مرا دشمنِ جاں ہے کہ نہیں سنگ بدست
رائیگاں کوششِ صد شیشہ گراں ہے کہ نہیں
سرفروشی کے لئے ہے کہ نہیں سطوتِ دار
سر بکف کوئی سرِ مقتلِ جاں ہے کہ نہیں
خالی شکموں کے لئے ہے کہ نہیں لقمۂ خشک
مطبخِ خانۂ مفلس میں دھواں ہے کہ نہیں
حال اب ہے کہ نہیں نقش گرِ آئندہ
دستِ امروز میں فردا کی عناں ہے کہ نہیں
زندگی ہے کہ نہیں حرفِ زباں اس کے لیے
دل پہ ہر مسرتِ نظارہ گراں ہے کہ نہیں
تشنہ کچھ سب سے جدا ہے کہ نہیں تیری غزل
منفرد سودا کا اندازِ بیاں ہے کہ نہیں

● ۱۳/۲ محمد علی سوسائٹی، جوہر روڈ، کراچی (پاکستان)




فضیل جعفری

ڈی - ۴۱۴، ورنداون نمبر-۳، راہیجا ٹاؤن شپ، ملاڈ (ایسٹ) بمبئی - ۹۷


# ہرچرن چاولہ کی افسانہ نگاری

یہ ہماری زبان کی خوش قسمتی ہے کہ ہمارے یہاں منشی پریم چند کے زمانے سے لے کر آج تک اچھے اور قابل ذکر افسانہ نگاروں کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا اور گذشتہ پون صدی کے طویل عرصے میں کبھی کوئی ایسا دور نہیں آیا جب ہمیں اپنے افسانوی ادب پر جمود طاری ہو جانے کا اعلان کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہو۔ میں یہاں مختلف دور سے تعلّق رکھنے والے اچھے اور بہت اچھے افسانوں نگاروں کے ناموں کی کوئی جامع فہرست پیش نہیں کرنا چاہتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اس عرصے میں بیدی، منٹو اور کرشن جیسے اساتذۂ فن کے علاوہ قاسمی، ممتاز مفتی، غلام عباس اور عصمت سے لیکر حسن عسکری انتظار حسین، قرۃ العین حیدر، غیاث احمد گدی، رام لعل، جوگندر پال، اور جیلانی بانو وغیرہ تک (عمروں میں فرق کے باوجود) افسانوی قوس قزح کے مختلف رنگ بکھرے نظر آتے ہیں۔ اگر آپ مختلف زبانوں میں لکھی گئی کہانیوں کا براہ راست یا تراجم کے ذریعہ مطالعہ کریں تو خود کو مس حیدر کے اس خیال سے متفق پائیں گے کہ اردو افسانے کا معیار عالمی سطح کے افسانوی معیار سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے بمتذکرہ بالا افسانہ نگاروں کے بعد آنے والوں میں بھی دس پانچ نہیں بلکہ درجنوں ایسے نام نظر آتے ہیں جنھیں ہم اچھا اور کامیاب افسانہ نگار کہہ سکتے ہیں۔

۱۹۶۰ء کے بعد کے اردو افسانے کو دو متوازی دھاروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک کا تعلّق ان افسانہ نگاروں سے ہے جنھوں نے انفرادی تجربات کے باوجود منٹو، بیدی اور کرشن چندر کی قائم کردہ روایات کو آگے بڑھایا دوسرے دھارے کا تعلّق ان افسانہ نگاروں سے ہے جنھوں نے موضوع اور برتاؤ دونوں اعتبار سے جدید افسانوی تکنک (جس کا سلسلہ جوائس اور پروست تک پہنچتا ہے) کو اپنایا اور نام کمایا۔ مجھے قطعیت کے ساتھ یہ بات نہیں معلوم کہ ہرچرن چاولہ نے اپنی افسانہ نگاری کا آغاز کب کیا اور ان کی افسانوی عمر کتنی ہے لیکن میرا اندازہ ہے کہ انہوں نے ۱۹۶۰ء کے آس پاس ہی فکشن کے میدان میں قدم رکھا۔ گذشتہ ۲۸، ۳۰ برسوں میں انہوں نے کئی ناولوں کے علاوہ سو یا اس سے کچھ زیادہ افسانے لکھے ہیں جو میرے نزدیک نہ صرف خاصی بڑی بلکہ معقول تعداد بھی ہے۔ چونکہ اس مختصر سے مضمون میں ان کے تمام افسانوں کی چھان پھٹک کرنا یا ان پر گفتگو کرنا ممکن نہیں ہے اس لیے میں سردست چاولہ کے محض چند افسانوں اور خاص طور پر ان کے بعض حالیہ افسانوں کے حوالے سے اپنے تاثرات کا اظہار کروں گا۔

میری ناچیز رائے میں اگرچہ کہ چاولہ نے کسی بھی بزرگ اور محترم پیشرو کی نقّالی کی بجائے اپنا راستہ آپ بنانے کی کوشش کی ہے لیکن بنیادی طور پر وہ کرشن چندر کی روایت کے فنکار ہیں۔ اس روایت کا مثبت پہلو یہ ہے کہ کرشن کی طرح وہ بھی اپنے ہر چھوٹے بڑے تجربے اور مشاہدے کے تعلّق سے فوری ردّعمل کا اظہار کرنے اور اسے افسانوی شکل عطا کر دینے کے قائل ہیں۔ چنانچہ کرشن کی طرح ان کے یہاں بھی اچھے اور طاقتور افسانوں کے ساتھ خاصی تعداد میں کمزور اور فارمولا ٹائپ افسانے بھی مل جاتے ہیں۔ جہاں تک مثبت پہلو یا پہلوؤں کا معاملہ ہے چاولہ نے بھی زندگی اور شخصیت کے بے حد نجی (PERSONALISED) اور پراسرار حد تک ذاتی تجربات سے گریز کر کے (دو ایک مستثنیات کے علاوہ) خود کو زندگی کے عمومی مظاہر اور روزمرّہ کے اچھے بُرے اسبک اور کھردرے تجربات و مشاہدات سے جوڑے رکھا ہے۔ وہ افسانے میں ہیئتی و لسانی تجربات اور باریکیوں پر، پلاٹ، موضوع، اور کردار کو ترجیح دیتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اپنی کہانیوں میں موڈ اور ماحول کو بھی اہمیت دی ہے۔ عام انسانوں کے مسائل، انسانی دکھ درد، ایک دوسرے کے دکھ سکھ کو سمجھنے اور بانٹنے کی خواہش، قومی اور بین الاقوامی مسائل کے تعلّق سے افسانوی ردّعمل، افراد کی نفسیاتی الجھنیں

[redacted]

جنسی ہوس پرستی، سماجی، تہذیبی اور اخلاقی اقدار سے لگاؤ اور ان کی بے حرمتی پر اظہارِ افسوس، سچائی اور جھوٹ کی آپسی کشمکش، معاشرتی ٹکراؤ، ہوس اور معصومیت کے تصادم سے پیدا ہونے والے مسائل وغیرہ وہ عناصر ہیں جنھوں نے چاولہ کے افسانوی کینوس کو کافی کشادہ بنا دیا ہے۔ افسانوی کینوس کی کشادگی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انھوں نے مختلف ممالک کا سفر کیا ہے۔ وہاں کے لوگوں سے ملے ہیں اور وہاں کی زندگی کو بھگتا ہے۔ یہی وجہ ہے ان کے یہاں پنجاب کے دیہاتوں کی زندگی غریب ہندوستانیوں کے گھریلو اور سماجی مسائل سے لے کر جرمنی، لندن اور ناروے کی بھڑکیلی اور چمکدار ماڈ تہذیب تک کی تصویر کشی ملتی ہے۔ دراصل چاولہ ملکوں کی انفرادی ثقافتی خصوصیات کے تو قائل ہیں لیکن جغرافیائی تقسیم کے قائل نہیں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ:

"دھرتی ماں ہے اور ماں جسم کے ہر حصے سے ماں ہوتی ہے۔ اس بچے کو جو ماں کی چھاتی سے لگ سوتا ہے، اتنا ہی سکھ ملتا ہے جتنا اس کے قدموں میں سونے والے کو...."

میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ چاولہ کے افسانے پلاٹ موضوع اور کردار کے افسانے ہیں۔ ان تینوں بنیادی افسانوی عناصر میں بھی انھوں نے کردار نگاری کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ وہ پلاٹ کی ساخت و بافت اور واقعات کے پیش کش کے مقابلے میں اپنے کرداروں کے ذریعے انسانی شخصیت کے مختلف ظاہری اور باطنی پہلوؤں کی نشاندہی اور ان کے تجزیے کو ترجیح دیتے ہیں۔ چونکہ چاولہ عرصے سے ناروے میں مقیم ہے اس لیے بعض لوگ ان کے افسانوں کو برِصغیر سے مغرب میں جاکر آباد ہونے والوں کی داستان سمجھنے پر اصرار کرتے ہیں۔ مجھے اس نظریے سے صرف جزوی طور پر اتفاق ہے۔ ان کے افسانوں میں ایسے کردار ضرور ملتے ہیں جنھیں معاشی مجبوریوں کے سبب یا پھر کسی اور وجہ سے ترکِ وطن کرنا پڑا، یہ کردار مشرق و مغرب سے وابستہ سب نہیں تو کم از کم کچھ روایات و اقدار کے تعلق سے کبھی نرم اور سرسری تو کبھی گہرے اور شدید ردِّ عمل کا اظہار بھی کرتے ہیں لیکن میری رائے میں ان کرداروں کا بنیادی مسئلہ محض بے زمینی یا جلا وطنی نہیں ہے۔ دراصل ان کے یہ کردار عمومی طور پر زندہ رہنے اور اپنی زندگی کا ثبوت فراہم کرنے کی جدوجہد میں مصروف نظر آتے ہیں۔ یہ کردار خواہ ایماندار ہوں یا دھوکے باز، مخلص ہوں یا منافق، جزوی طور پر مکمل ہوں یا نا بہرحال نہ صرف ایسے عام آدمی رہتے ہیں جن سے آئے دن ہمارا سابقہ پڑتا ہے بلکہ جن میں ہم میں سے بہت سے لوگ خود اپنی جھلک بھی دیکھ سکتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ (عمومی طور پر) ان کرداروں میں ایسی داخلی پیچیدگی کم ہوتی ہے جو کسی گہرے تجزیاتی مطالعے کی متقاضی ہو لیکن وہ ان کے ذریعے جو کہانی بیان کرتے ہیں، اس کی وجہ سے بیانیہ میں قاری کی دلچسپی شروع سے آخر تک نہ صرف برقرار رہتی ہے بلکہ کرداروں کے ساتھ ساتھ ان سے منسلک واقعات اور تجربات بھی اس کی سوچ کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ایسے افسانوں کو اجتماعی حقائق والے افسانوں سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس معنی میں کیا چاولہ بظاہر تو کرداروں کے ذاتی احساسات و جذبات کی عکاسی کرتے ہیں لیکن درحقیقت اس طرح کے افسانوں میں وہ مسائل سے الجھتے ہیں اور انھیں افسانوی شکل عطا کر دیتے ہیں۔

میں نے اوپر چاولہ کے کرداروں کے یہاں زندہ رہنے اور اپنی زندگی کا ثبوت فراہم کرنے کی جس جدوجہد کا ذکر کیا ہے، اس کی ایک ایک مثال ان کے ایک نسبتاً پرانے افسانے 'دوسہ' میں نظر آتی ہے۔ دوست محمد خاں عرف 'دوسہ' پہلے تو اپنی بیمار ماں کے علاج کی خاطر چوری کرنے پر مجبور ہوتا ہے پھر دھیرے دھیرے ایک عادی مجرم اور غنڈہ بن جاتا ہے۔ اس حد تک کہ 'جرم' اس کے لیے زندگی کے معیار اور اس کی قدر کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ جب وہ اپنی زندگی میں آخری بار جیل سے رہا ہو کر لیکن دل میں جلد ہی جیل لوٹنے کی خواہش لیے آتا ہے تو گاؤں کے ایک نوجوان یاسینے سے ہاتھ ملانے کے بعد ہاتھ کو چھاتی پر رکھ کر کہتا ہے:

"اوئے یاسینے، تُو تو بہت بڑا ہو گیا ہے، اوئے کوئی قتل وتل بھی کیا، کوئی عورت بھی نکالی کہ ایسے ہی جوان ہو گیا۔"

دوسہ کی بیمار اور بوڑھی ماں اسے سو بہانوں سے پھر کوئی جرم کرنے اور جیل واپس جانے سے روکتی ہے۔ اسی بیچ ایک عورت کے معاملے میں شباب خاں نامی اپنے ہی جیسے ایک نامی اور طاقتور غنڈے سے دوسہ کی مڈبھیڑ ہو جاتی ہے۔ پہلے تو دونوں تنہا لڑتے ہیں لیکن لڑائی کے دوران شباب خاں کو کمزور پڑتے دیکھ کر اس کے کئی آدمی بیک وقت دوسہ پہ ٹوٹ پڑتے ہیں اور تلوار سے اس کے دونوں بازو قلم کر دیتے ہیں۔

[redacted]

اس روح فرسا واقعے کے بعد دوسہ اپنے آپ کو محض لفظی طور پر ہی نہیں بلکہ اصطلاحی طور پر بھی 'نہتّا' محسوس کرتا ہے جیسا کہ بُرے وقتوں میں عام طور پر ہوتا ہے، دوسہ کی 'قوت بازو' کے ختم ہوتے ہی اس کے پرانے ساتھی بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ کوئی اس سے ملنے تک نہیں آتا۔ لیکن زندہ رہنے اور اس طرح اپنی ماں کی خدمت کرنے کی لگن اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ وہ ایک چھوٹی سی دکان کھول لیتا ہے۔ دوکان پر اس کی ماں بیٹھتی ہے اور وہ اپنے "ٹُنڈوں میں تھیلے لٹکا کر" بازار سے سودا سلف لے آتا ہے۔ اس افسانے میں دوسہ کی جسمانی طاقت سے زیادہ اہم اس کی روحانی طاقت یعنی اس کی ماں ہے۔ چاولہ نے اپنے کئی افسانوں میں ماں کو محض ایک عورت کے طور پر نہیں بلکہ ایک قوت کے طور پر پیش کیا ہے، ان کی یہاں ماں، اپنے بچّوں کو زندہ اور خوش رہنے کی لگن بھی بخشتی ہے اور خود ان سے توانائی بھی اخذ کرتی ہے۔ جہاں کہیں بھی اس توازن میں کمی آجاتی ہے زندگی کا ڈھرّہ یکسر بدل جاتا ہے۔ جہاں تک ماں کا تعلق ہے، چاولہ کا ایقان ہے کہ وہ اپنی طرف سے اس توازن کو بگڑنے نہیں دیتی۔ انھوں نے اپنی کہانی "سوچ نگر آباد رہے گا" میں اسی زاویے کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ ایک ایسی بوڑھی بیوہ کی کہانی ہے جو بے حد سیدھی سادی ہے، جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے، جو اپنے شوہر کے انتقال کے بعد، اسے محض یاد ہی نہیں کرتی بلکہ اس کے لیے اس حد تک فکر رہتی ہے کہ اپنے مذہبی عقیدے کے مطابق گرو گرنتھ صاحب سے یہ جاننے کے لیے فال نکلواتی ہے کہ اس کا شوہر دوسری دنیا میں آرام سے ہے یا نہیں۔ یہ عورت ملک کی تقسیم کے بعد جب ہندوستان پہنچتی ہے تو اسے جائداد، املاک اور مال و اسباب کے لٹ جانے کا کوئی افسوس نہیں ہوتا، اسے تو بس اس کی خوشی ہوتی ہے کہ وہ اور اس کے افراد خاندان خیریت سے پہنچ گئے۔ وہ بچّوں کو پال پوس کر بڑا کرتی ہے۔ لڑکیاں شادی کے بعد اپنے اپنے گھر بار میں مصروف ہو جاتی ہیں، چھوٹا لڑکا جو بظاہر ماں سے زیادہ پیار کرتا ہے، آسودہ خاطری کو آسودہ حالی پر قربان کر کے ملک سے باہر چلا جاتا ہے۔ بڑا لڑکا 'بزنس' کے چکّر میں یوں الجھتا ہے کہ وہ زندگی سے متعلق ہر شے کو، یہاں تک کہ انسانی رشتوں کو بھی مادّی سطح پر پرکھنے لگتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بھرے پُرے گھر میں 'ماں' کی حیثیت پُرانے اور بیکار کباڑ سے زیادہ نہیں رہ جاتی ایسا کباڑ جس کو ایک چھوٹی سی کوٹھری میں ڈال دیا جاتا ہے۔ وہ اس صورتِ حال پر کڑھتی ہے، ناراض بھی ہوتی ہے مگر انتہائی غصّے اور شدید بیزاری کے عالم میں بھی اپنے بیٹے اور اس کے بچّوں کے لئے برکتوں کی ہی دعائیں کرتی ہے۔ کہانی کا آخری جملہ ملاحظہ ہو:

"بڑھیا تو تمھارے لیے جیتے جی مر گئی ہے، تمھاری تو جیسے فیکٹریاں چل رہی ہیں نا، ہائے! کہیں میرے کارن بند نہ ہو جائیں، ہائے میں یہ کیا اشبھ وچن منھ سے نکال رہی ہوں۔ ان سب کے کاموں میں برکتیں ڈال بھگوان!!"

تکنیکی سطح پر، چاولہ نے پوری کہانی کو خود مکالماتی انداز (SOLILOQUY) میں پیش کیا ہے جس کی وجہ سے ایک طرف اس بیوہ عورت کے یہاں محرومی اور تنہائی کا احساس زیادہ شدّت سے ابھر کر سامنے آتا ہے تو دوسری طرف کہانی کے مطالعے کے دوران قاری بغیر کسی دخل اندازی کے اس کے داخلی اور روحانی کرب کو سمجھ سکتا ہے۔ یہ کہانی اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ کس طرح انسان ایک بھری پری زندگی گزارنے کے بعد بڑھاپے میں اکثر، زندگی کے مرکزی دھارے سے کٹ جانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لیکن چاولہ اس صورت حال کو فطری اور حقیقی نہیں سمجھتے۔ ان کا خیال ہے کہ اس کی ذمّہ داری اس جدید اور مادّی تہذیب پر ہے جس نے نہ صرف مشترکہ خاندان کی بیش قیمت ہندوستانی روایات کو بلکہ انسانی رشتوں کے تقدس کو بھی ختم کر دیا ہے۔ چونکہ مضبوط ترین اور مقدس ترین انسانی رشتہ والدین اور اولاد کے درمیان ہوتا ہے، چاولہ نے اس مسئلے کو اپنی کئی کہانیوں میں برتا ہے۔ اور ان کی اس طرح کی کہانیوں میں ایک طرح سے گہرا آپسی ربط پایا جاتا ہے۔

'گنگا کو واپسی' نامی کہانی میں انھوں نے اس مسئلے کو زیادہ تیکھے اور دھاردار انداز میں پیش کیا ہے۔ یہاں مرکزی کردار ماں کے بجائے باپ ہے، جو اپنے بیٹے کی خوشی کی خاطر نہ صرف اپنی زندگی کی اقدار اور عزّت کو بلکہ بالآخر اپنی جان تک کو قربان کر دیتا ہے، یہ ایک ایسے بوڑھے باپ کی کہانی ہے جس کا اکلوتا بیٹا، مادّی آسائشوں کی خاطر اپنا وطن چھوڑ کر کسی مغربی ملک میں جا کر آباد ہو گیا ہے اور وہیں اس نے کسی سفید فام عورت سے شادی بھی کر لی ہے۔ شریف النفس اور سیدھا سادا بوڑھا بیوی کی موت اور اکلوتے بیٹے کی جدائی کے باوجود اپنے چھوٹے سے گاؤں میں خاصی مطمئن زندگی گزارتا ہے۔ اسے نہ پیسوں کی ہوس ہے، نہ ہی مادّی آرام کی تلاش، اس کی ذہنی خوشی اور طمانیت کے لئے گاؤں کے چھوٹے چھوٹے بچّے کافی ہیں وہ ان سب کو اپنا ہی سمجھتا ہے۔ کسی کو اسکول پہنچا آتا ہے تو کسی کی ٹوٹی ہوئی سائیکل مرمّت کر دیتا ہے۔ کوئی بچّہ اگر بیمار ہو جاتا ہے

تو اس کی صحت کے لیے گاؤں کے مندر میں یوں دعائیں مانگتا ہے گویا وہ اس کی اپنی اولاد ہو۔ ادھر اچانک بیٹے کے دل میں باپ کی محبت جاگ اٹھتی ہے، وہ اسے بار بار بلاتا ہے حتیٰ کی آنے جانے کا ٹکٹ بھی بھجوا دیتا ہے۔ بوڑھا گاؤں نہیں چھوڑنا چاہتا، مکھیا حکم سنگھ سمجھاتا ہے:

"ایک بار بہو اور پوتے کو دیکھ آتے"

"زنجیریں مت پہناؤ، موہ بڑھ جائے گا" اس نے فریاد کی

"جب جی چاہے، واپس آجانا، واپسی کا ٹکٹ بھی تو ساتھ ہے" حکم سنگھ نے سمجھایا"

بالآخر بوڑھا رختِ سفر باندھ لیتا ہے، وہاں پہنچ کر اسے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ محض ایک اجنبی ہی نہیں بلکہ بیٹے، بہو اور پوتے کی موجودگی کے باوجود بالکل تنہا ہے۔ کچھ ہی دنوں بعد بیٹا اسے اپنے ساتھ لے کر ایک بلڈنگ میں لے جاتا ہے جہاں پہلے تو وہ ایک الماری سے صابن اور برش وغیرہ نکال کر فرش دھوتا ہے اور پھر اس درمیان باپ سے کہتا ہے:

"پاپا آپ کی پنشن منظور نہیں ہو سکی تا، میں نے سوچا کہ آپ روز ہی راستے میں پارک کی سیر بھی کر لیا کریں اور وقت گذاری کے لیے تھوڑا سا یہ شغل بھی ہو"

اس دن بوڑھے پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ اس غیر ملک میں اس کے بیٹے کا اصل پیشہ کیا تھا اور یہ کہ اسے وہاں کس غرض سے بلایا گیا تھا، لیکن بیٹے کی محبت اور اس کی آمدنی میں اضافے کی خاطر اس نے وہ کام کرنا بھی منظور کر لیا جو اس کے پرکھوں نے بھی نہیں کیا تھا، مگر جب ایک دن اس کے بیٹے نے اس سے کہا کہ اسے شکایت موصول ہوئی ہے کہ وہ اپنا کام ٹھیک سے نہیں کرتا تو اس کا دل ٹوٹ گیا۔ جسمانی طور پر تو وہ پہلے ہی کمزور تھا، ذہنی طور پر بھی بکھر گیا۔ جب وہ ضعف اور تھکن سے چور اس اجنبی شہر کی گلیوں سے گزرتا تو اسے اپنے چھوٹے سے گاؤں سے وابستہ ساری توانیاں یاد آجاتیں، وہ عزت یاد آجاتی جو غربت کے باوجود گاؤں میں اسے حاصل تھی۔ جلد ہی ایک شام وہ پارک کے ایک بنچ پر مردہ پایا گیا۔ بیٹے نے اتنی عنایت فرمائی کہ باپ کا کریاکرم کرنے کے بعد اس کی راکھ گنگا میں بہانے کے لیے ہندوستان بھجوا دی۔

باپ اور بیٹے کے درمیان رشتے کا اخلاقی تجزیہ اس افسانے کی محض ایک سطح ہے۔ دوسری سطح پر یہ دکھانا مقصود ہے کہ کس طرح مغربی ممالک میں جا کر آباد ہو جانے والے ہندوستانی، دراصل ابتر اور بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور اس عمل میں انھیں رشتوں کے تقدس کا بھی پاس نہیں ہوتا مزید یہ کہ جب موت کی قطعیت اور حقیقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو اپنا وطن عزیز تر ہوتا ہے۔ جیسا کہ ظاہر ہے، اس کہانی کے افسانوی عمل اور منظر نامہ کا تعلق ایک غیر ملک سے ہے۔ چاولہ نے اپنے کئی افسانوں میں کرداروں کے علاوہ مختلف مقامات، وہاں کے رہنے والوں کے عادات و اطوار، وہاں کے ماحول، اس ماحول میں ہندوستانیوں کی بود و باش، ان کے مسائل اور ان کے پیدا کیے ہوئے مسائل وغیرہ کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے 'گھوڑے کا کرب' اور 'ریت سمندر' اور 'جھاگ' جیسی بے حد سنجیدہ کہانیاں بھی لکھی ہیں اور 'روپ بہروپ' جیسی مزاحیہ عنصر ( والی کہانیاں بھی۔ اس طرح انھوں نے زندگی کے متضاد اور اضافی پہلوؤں کی عکاسی کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایسا کرتے ہوئے چاولہ محض ایک فرد کی حیثیت سے ہمارے سامنے نہیں آتے بلکہ وہ ان تمام لوگوں کی نمائندگی کرتے ہیں، جن کے تجربات، مشاہدات اور اعمال سے ہم ان کے افسانوں میں دو چار ہوتے ہیں۔

ان کے افسانے 'گھوڑے کا کرب' کو ادبی حلقوں میں کافی اور بجا طور پر سراہا گیا ہے۔ اگرچہ میں فرخندہ لودھی کے اس خیال سے متفق نہیں ہوں کہ یہ ایک علامتی کہانی ہے کیونکہ چاولہ کا بنیادی افسانوی اسلوب اور برتاؤ علامتی نہیں ہے لیکن زیر بحث کہانی میں انھوں نے گھوڑے کو استعارے کے طور پر ضرور برتا ہے۔

یہ افسانہ، تمام انسانی خصوصیات کو یکسر نظر انداز کر کے، رنگ اور نسل کی بنا پر برتے جانے والے تعصب کا پردہ بھی چاک کرتا ہے اور اس کے خلاف احتجاج بھی کرتا ہے ویسے اس افسانے کا بنیادی محرک سیاسی نہیں بلکہ معاشی ہے۔ ف۔ ج۔ گھوڑا دراصل ان تمام مجبوروں اور مزدوروں کی نمائندگی کرتا ہے جن کے مالک خواہ انفرادی سرمایہ دار ہوں یا اجتماعی یعنی ادارے اور حکومتیں ان سے کام تو بہت لیتے ہیں لیکن نہ تو انھیں کام کی واجبی اجرت ملتی ہے اور نہ ہی ان کے ساتھ مناسب سلوک کیا جاتا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی کہ کسی ایک ملک کا دولت

[redacted]

مقتدر طبقہ دوسرے ممالک میں بھی اپنے کمزور اور غریب ہم وطنوں کا استحصال کرنے سے باز نہیں آتا۔ چنانچہ حالات اور مالک سے تنگ آکر ایک گھوڑا نقل مکانی کرکے ایک ایسے ملک میں پہنچ جاتا ہے جہاں خوبصورت ندیاں ہیں، پہاڑ ہیں، ہریاول ہی ہریاول ہے۔" یہ چیزیں گھوڑے کے لئے محض فطری مناظر نہیں بلکہ مادّی سہولتوں اور آسائش کی بھی دلیل ہیں۔

ایک موقعے پر یہ مہاجر گھوڑا، اپنے نئے مالک کے پُرانے گھوڑے کے بیمار ہو جانے پر، اس کے عوض ریس میں حصہ لیتا ہے اور مالک کو جتا دیتا ہے لیکن اس کے 'حقیقی' یعنی 'سیاہ' رنگ کا راز کھلتے ہی اس کی رفتار اور طاقت کو یکسر بھلا دیا جاتا ہے۔ ماحول اچانک بدل جاتا ہے۔

" جج لوگ فیصلہ سنا رہے ہیں، جو سکنڈ آیا ہے اسے فرسٹ کر دیا جائے، جو تھرڈ آیا ہے اسے سکنڈ اور اسی طرح آگے۔
میں سب سے پیچھے دھکیل دیا گیا ہوں۔"

یہاں آگے بڑھنے سے پہلے ضمنی طور پر یہ بھی عرض کردوں کہ زیر بحث افسانہ منقولہ بالا جملے پر ختم نہیں ہوتا بلکہ ان کا آخری جملہ یوں ہے۔

" میں سوچ رہا ہوں، میں دوڑایا گیا ہوں اور میں نے دوڑ کر جیت دکھائی ہے، اس سے رنگ کا کیا تعلق ہے۔
نسل کا کیا واسطہ! مگر میں کس سے کہوں، کیسے کہوں، کون سُنے گا؟"

اور یہ آخری جملہ اپنے غیر معمولی اور غیر ضروری وضاحتی انداز کی وجہ سے افسانوی تاثر کو مجروح کر دیتا ہے۔ یہ کمزوری چاولہ کے کئی اور افسانوں مثلاً 'موروثی کار' وغیرہ میں بھی نظر آتی ہے جہاں وہ افسانے کے مجموعی سیاق وسباق سے ابھرنے اور تشکیل پانے والے مفہوم پر بھروسہ نہ کرسکے، مزید وضاحت کرنے یعنی افسانہ نگار میں چھپے ہوئے 'نقاد' کی نمائش کے لیے بھی بے چین نظر آتے ہیں۔

اس ایک بات سے قطع نظر، جیسا کہ عرض کر چکا ہوں 'گھوڑے کا کرب' ایک کامیاب افسانہ ہے۔ انہوں نے رنگ اور نسل سے وابستہ دردناک نفرت اور تنگ نظری کا تجزیہ ہی نہیں کیا بلکہ افسانے کے مرکزی کردار کو گھوڑے کی شکل میں پیش کرکے 'چہرے' اور 'نام' سے وابستہ انفرادیت کو بھی ختم کر دیا ہے۔ اس طرح پورا مسئلہ ایک اجتماعی انسانی مسئلہ بن کر سامنے آتا ہے۔

چاولہ نے اپنے مختلف افسانوں میں عام انسانی مسائل کے مختلف پہلوؤں کو برتنے اور پیش کرنے کی کہیں کامیاب اور کہیں زیادہ کامیاب کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر 'زمین' نامی افسانے میں ان کا تھیس یہ ہے کہ کسی غیر ملک کو اپنا لینے کے بعد وہاں کے طریقوں رسم و رواج اور لوگوں کو بھی پوری طرح اپنا لینا چاہیئے چنانچہ جب افسانے کے شادی شدہ جوڑے پریم اور سُنیتا کی بیٹی ریٹا ایک نارویجئین لڑکے سے شادی کرلیتی ہے تو ماں کو سخت اعتراض ہوتا ہے حالانکہ میرے خیال میں عورتوں کے مقابلے میں مرد زیادہ روایت پرست اور قدامت پسند ہوتے ہیں۔ ف۔ ج اور وہ طے کرتی ہے کہ اپنے بیٹے آکاش کی شادی تو وہ پورے ٹھاٹھ باٹ سے ہندوستان میں کرے گی لیکن دھیرے دھیرے اسے اندازہ ہوتا ہے کہ ناروے کے سبب اتنے ہی میٹھے ہوتے ہیں جتنے کہ ہندوستانی سبب ہوا کرتے تھے اور اس طرح وہ آکاش اور ایک نارویجئین لڑکی کی شادی کو بخوشی قبول کر لیتی ہے۔

لیکن اس 'کام چلاؤ، سمجھوتے WORKING COMPROMISED کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک فرد اور ایک فنکار کی حیثیت سے چاولہ اپنی ثقافتی شناخت کھو بیٹھے ہیں یا اپنی جڑوں سے ان کا رشتہ کمزور پڑ گیا ہے۔ ایسا نہیں ہے، ایسا ہو بھی نہیں سکتا۔

" اتصالی نقطے کا موڑ" نامی افسانے کا شکستہ اور ٹوٹا ہوا گھر، اس کا اکھڑا ہوا پلستر، پائیں باغ کے سوکھے ہوئے پیڑ، درو دیوار کا اڑتا ہوا رنگ اور پورے مکان میں پھیلی ہوئی سرد و تاریک فضا سب کچھ مل کر اگر ایک طرف سات سال بعد گھر لوٹنے والے مکین اور مکان کے درمیان موجود جذباتی رشتوں کی داستان سناتے ہیں تو دوسری طرف یہ بھی بتاتے ہیں کہ 'حال' اپنی تمام چمک دمک اور فتنہ سامانیوں کے باوجود 'ماضی' کبھی بھی مکمل طور پر شکست نہیں دے سکتا۔

مغرب سے سات سال بعد لوٹنے والا شخص جب جلدی جلدی کسٹم کے معمولات سے فراغت حاصل کرکے اور اپنے ایک قریبی دوست کی طرف سے ایرکنڈیشنڈ آرام کی پیش کش کو ٹھکرا کر رات گئے اپنے گھر پہنچتا ہے اور گھر کا آہنی گیٹ کھولتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے جیسے گیٹ کہہ رہا ہو:

" کہاں چلے گئے تھے تم۔ دیکھو میں زمانوں سے بھوکا پڑا ہوں، گلا بیٹھ گیا ہے، آواز بھی نہیں نکلتی، تم تو جانتے ہو کتنی سُریلی تھی میری آواز، میں کتنی میٹھی آواز سے، باہیں کھول کر تمہیں خوش آمدید کہتا تھا....؟

[redacted]

اور پھر جب یہ جلا وطن شخص مختلف کمروں اور دالانوں سے گزر کر اس کمرے میں پہنچا جسے اس کی ماں استعمال کیا کرتی تھی تو وہ کمرہ :

"پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، اس کو صبر دلانے کے لئے اس نے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا تو خود اس کے بھی آنسو نکل آئے۔

اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا مگر رلاہٹ سے اس کا جسم ہلتا رہا....."

مرکزی کردار کا جسم ہی نہیں ہلتا بلکہ اس کی روح میں بھی زلزلہ سا آجاتا ہے۔ روایتی خاندانی زندگی سے وابستہ اقدار کے بکھر جانے کا احساس اپنی تمام ترشدتوں کے ساتھ اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ اس کہانی میں ماحول کی جس طرح عکاسی کی گئی ہے اسے کردار کی گم شدہ روح سے جس مکمل طریقے سے ہم آہنگ کر دیا گیا ہے اور پوری کہانی میں جس طرح ٹکڑے ٹکڑے ڈرامائی مونولاگ کی تکنیک برتی گئی ہے اس نے کہانی کے تاثر میں خاصا اضافہ کر دیا ہے۔

ماحول اور موڈ سے متعلق افسانوں میں "پھٹے آسمان میں پیوند" بھی ایک اچھا افسانہ ہے۔ اس میں فلمی دنیا کے اتار چڑھاؤ اور اس پیشے سے وابستہ تضادات کو ایک انفرادی کردار رام بلاس کے توسط سے پیش کرتے ہوئے چاولہ نے یہ دکھایا ہے کہ کس طرح کسی فرد کے عادات و اطوار اور اس کے سوچنے کا انداز سب کچھ اس کے اپنے نہ ہو کر ماحول کے تابع ہو کر رہ جاتے ہیں۔ رام بلاس جو پنجاب سے بمبئی ہیرو بننے کے لئے آتا ہے اپنے جیسے بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح 'ایکسٹرا' اور پھر ایکسٹرا سے ایک نہایت ہی معمولی قسم کا نوکر بن کر رہ جاتا ہے لیکن اپنے چہرے سے نمائشی نقاب اتارنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ فلمی ماحول کا اس پر کچھ ایسا اور اتنا اثر ہوتا ہے کہ ایک فرد کی حیثیت سے وہ اپنی حقیقی پہچان بھی بھول جاتا ہے اور عمل پر محرکات کو ترجیح دیتا ہے۔

چاولہ نے محرکات کو عمل میں بدل دینے اور دھرندر قسم کے عقلمندوں کو چکر دے کر رفو چکر ہو جانے والوں کی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ ان کہانیوں میں مجھے 'روپ بہروپ' نہ صرف اپنے نفس مضمون بلکہ (جیسا کہ ذکر کر چکا ہوں) اپنے مزاحیہ عنصر کی وجہ سے بطور خاص پسند ہے۔

یہ ایک ایسے سردار جی کی کہانی ہے جن سے مصنف یا راوی کی ملاقات جرمنی کے شہر فرینکفرٹ میں ہوتی ہے۔ سردار جی پنجابی کے علاوہ کوئی اور زبان نہ جاننے والے بظاہر عقل سے پیدل ایک ایسے شخص ہیں جنھیں خیر سے شاعری کا بھی چسکا ہے۔ کہانی کی ابتدا میں ایک پاکستانی اور سردار جی کے بیچ یہ بات چیت ملاحظہ ہو۔ :

"سردار جی آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

"جی میں کوی ہوں۔"

"میرا مطلب ہے، آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟"

"جی میں پنجابی میں لکھتا ہوں"

"جائے رہائش و پیدائش؟" مخاطب نے بڑے صبر اور سکون کا اظہار کرتے ہوئے کہا :

"اپنا نام چنبیلی ہے۔"

اس عجیب و غریب تعارف کے بعد سردار جی سے قاری کی یکے بعد کئی ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ (اس لیے بھی کہ اس افسانے میں چاولہ نے دوسرے کئی افسانوں کی طرح اپنے مصنفانہ حقوق کا استعمال کم کیا ہے یعنی بیان کرنے پر دکھانے کو ترجیح دی ہے) کبھی مدراس کی مشہور مولانا لنگیاں بیچتے نظر آتے ہیں تو کبھی کباڑی بازار میں بلاوز، کرتے اور مالائیں فروخت کرتے ہیں۔ کبھی اپنے حلیے اور ہیئت کی وجہ سے سیاحوں کا مرکز نگاہ بن کر پوز دیتے ہیں تو کبھی اسی حلیے اور ہیئت کے سبب جیل کی ہوا کھاتے ہیں لیکن بقول خود وہ جرمن افسروں کو بزبان انگریزی ایسا ڈانٹتے ہیں کہ وہ سرکاری کار میں انھیں فوراً ان کے دولت کدے پر چھوڑ آتے ہیں۔

اچھے برے دن گزرتے رہتے ہیں۔ کہانی کے راوی مسمّی شرما کی، سردار جی سے جب بھی ملاقات ہوتی ہے انھیں ایک نئے رنگ میں پاتا ہے۔ آخری ملاقات میں سردار جی شرما کو مطلع کرتے ہیں کہ انھیں فوراً جرمنی چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا ہے، وہ دوسرے دن ہی ہندوستان روانہ ہو رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ کچھ تصویروں کے نیگیٹوز، اپنا دلی کا پتہ اور بیس مارک کا نوٹ شرما کے حوالے اس درخواست کے ساتھ کرتے ہیں کہ وہ تصویریں

[redacted]

دھلوا کر بھجوا دیں۔ جاتے جاتے یہ دھمکی بھی دیتے ہیں کہ وہ اب لوٹیں گے تو جرمنی والوں کے 'داماد' بن کر ہی لوٹیں گے۔ شرما 'داماد' والی بات کو محاورہ سمجھ کر ٹال جاتا ہے لیکن ایک دن جب وہ ایڈریس والا کاغذ اتفاقیہ طور پر پڑھتا ہے تو اس میں پنجابی زبان میں یہ دو فقرے بھی لکھے ہوتے ہیں:

"شرما صاحب، میرا ایڈریس کسی اور کو نہ دیجئے گا۔ فوٹو تو آپ نے دیکھ ہی لیے ہوں گے۔ یہ لڑکی بھی ہمارے ساتھ ہندوستان جا رہی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ واپس آؤں گا تو داماد بن کر ہی آؤں گا۔"

اسی کے ساتھ کہانی ختم ہو جاتی ہے اور تب اچانک قاری کو معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص کو پوری ہندوستانی اور پاکستانی کمیونٹی جرمنی میں بالکل MIS-FIT سمجھتی رہی تھی وہ بڑے بڑے اسمارٹ اور پڑھے لکھے لوگوں سے زیادہ فٹ ثابت ہوا۔ جسے لوگ ایک بدہیئت اور بے ہنگم اور گپ باز شخص سمجھتے تھے اس میں ایک خوش شکل اور نوجوان جرمن حسینہ کو مسحور کرنے کی قدرت بھی تھی۔ سردار جی اتنے زبردست کرتب باز TRICKSTER ہو سکتے تھے، اور اپنا مذاق اڑانے والوں کے ساتھ اتنا زبردست مذاق کر سکتے تھے، یہ راز قاری پر افسانے کے بالکل آخر میں فاش ہوتا ہے اور اسی چیز نے 'روپ بہروپ' کو ایک دلچسپ اور کامیاب افسانہ بنا دیا ہے۔

میں نے شروع ہی میں یہ لکھا ہے کہ چاولہ نے روزمرّہ انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو برتنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے افسانوں کی ایک نمایاں سمت 'جنس' یعنی عورتوں اور مردوں کے درمیان جسمانی تعلقات سے عبارت ہے۔ ان کہا ہوں میں 'پانی کی عورت' جیسی مغربی ماحول والی کہانی بھی ہے اور 'ٹھرکی' جیسی خالص ہندوستانی ماحول میں رچی بسی کہانی بھی۔ 'پوری بات ادھوری کہانی'، 'بیچ کی بات'، 'بےباک بات' جیسے افسانے بھی جنسی افسانوں کے سلسلے کے اہم افسانے ہیں۔ انہوں نے ان سبھی افسانوں میں جنسی فرسٹریشن اور ہوسناکی کے عناصر کو ابھارا ہے۔ میرے نزدیک متذکرہ تمام افسانوں میں 'ٹھرکی' ایک منفرد، متاثر کرنے والا، بار بار پڑھے جانے اور یاد رکھنے کے قابل افسانہ ہے۔

بقول چاولہ پنجابی زبان کے لفظ 'ٹھرکی' "کے ملتے جلتے معنی اُردو تو کیا خود پنجابی میں ملنے مشکل ہیں، مگر ہر پنجابی اس لفظ کو اچھی طرح سمجھتا ہے اور ٹھرکی آدمی کی پوری پہچان رکھتا ہے۔"

جیسا کہ ابھی ابھی عرض کیا ہے، ہوس کاری اور شہوت پرستی کے موضوع کو چاولہ نے کئی افسانوں میں برتا ہے لیکن زیرِ بحث افسانے میں ان کا فنکارانہ برتاؤ ایک بالکل نئے رنگ میں ابھرا ہے۔ اس افسانے کا راوی تو 'میں' یعنی دوسرے لفظوں میں خود مصنّف ہے لیکن اس کا مرکزی کردار روپ چند عرف روپا ہے جو راوی سے عمر میں کئی سال بڑا ہونے کے باوجود، ہر جماعت میں باقاعدگی سے فیل ہونے کے سبب اسکول کے دنوں میں راوی کا ہم جماعت ہوا کرتا تھا۔ افسانے کا بیانیہ زمانی اعتبار سے کم و بیش بیتالیس برسوں پر محیط ہے۔ کہانی تقسیمِ ہند سے پہلے اس وقت شروع ہوتی ہے جب راوی اور روپا دونوں پنجاب کے کسی چھوٹے سے شہر کے ایک اسکول میں پڑھا کرتے تھے۔ شہر میں لڑکیوں کے ایک اسکول کے قریب روپا کے باپ کی کتابوں، رسالوں اور اسٹیشنری کی چھوٹی سی ایک دوکان تھی جس میں فلمی رسائل کو مرکزیت حاصل تھی۔ روپا کم و بیش بچپن ہی سے جنسی پرورژن کا شکار تھا۔ اسے پڑھائی سے زیادہ فلمی رسائل میں شائع ہونے والی 'کانن بالا'، 'خورشید' اور 'نادیا' جیسی ایکٹرسوں کی ہیجان انگیز اور جنس پرور تصاویر سے لگاؤ تھا اور وہ انھیں دیکھ دیکھ کر ہی جنسی تلذذ حاصل کیا کرتا تھا۔ دوپہر میں جب اس کا باپ کھانے کے لیے چلا جاتا اور اسکول کی طالبات اس کی دوکان پر کاپیاں اور فٹ پٹّی وغیرہ خریدنے آتیں تو وہ ان سے ذو معنی جملوں میں مذاق کرتا۔

معاملہ نہ صرف اس حد تک تھا بلکہ نوعمری ہی میں روپا کو طوائفوں کے پاس جانے کی لت بھی پڑ گئی تھی۔ بقول مصنّف:

"کہتے ہیں بہت ہی چھوٹی عمر میں سیکس کے چکّروں میں پڑ جانے والے لوگ پستہ قد رہ جاتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ یہ ڈاکٹری نکتۂ نظر سے ٹھیک ہے یا نہیں مگر روپا کے معاملے میں یہ سَو فیصدی صحیح ثابت ہو رہا تھا۔ وہ بیس سال کی عمر میں ہی پانچ فٹ دو انچ کا ٹھگنا سا جوہا قسم کا جوان نکلا تھا۔ اس کی داڑھی، مونچھ بھی ہزار بار الٹا پھروانے اور روز روز شیو کرنے کے باوجود بس ذرا سی ہونٹوں کے پاس دائرہ بنا کر رک گئی تھی۔"

یہاں روپا کے سلسلے میں داڑھی مونچھ کی تقریباً عدم موجودگی اور لفظ 'جوہا' کا سوچا سمجھا ہوا استعمال عین جوانی میں اس کے جسمانی قوت

کے مکمل نہ سہی تو بھی بڑی حد تک ختم ہو جانے کی پوری تشریح کر دیتے ہیں۔ روپا کے پاس تقسیم سے پہلے بھی پیسوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ آزادی کے بعد جب وہ دلّی آکر بس گیا، بیک وقت کئی کئی دوکانوں کا مالک ہو گیا اور اس کے پاس دولت کی مقدار دوگنی چوگنی نہیں بلکہ آٹھ گنی ہو گئی لیکن وہ جسمانی یعنی جنسی کمزوری + ہوس پرستی کا مرقع جوں کا توں بنا رہا۔ اس درمیان اسکی پہلی بیوی کا انتقال بغیر کسی اولاد کو جنم دئیے، ہو چکا تھا لیکن آج بھی عورت کے جسم کا لمس یا کبھی کبھار کی نسبتاً گہری رگڑ اس کی جنسی تسکین کے لیے کافی تھی۔

اس درمیان کہانی کا راوی جو وطن چھوڑ کر کسی غیر ملک میں آباد ہو گیا تھا کئی بار دلّی آیا لیکن اس کے ذہن میں روپا سے ملنے کا خیال تک نہیں آیا۔ روپا کی دوستی اس کیلئے قصۂ پارینہ ہو چکی تھی لیکن افسانوں کی دنیا میں کبھی کوئی شے واقعتاً پارینہ نہیں ہوتی، چنانچہ ایک مرتبہ راوی کی دلّی میں اچانک اور افسانوی سطح پر آخری بار روپا سے مڈبھیڑ ہو ہی گئی۔ روپا اس وقت ساٹھ کے پیٹے میں تھا۔ وہ ضد کر کے اپنے بچپن کے دوست اسکول کے ساتھی اور ہمراز کو اپنی شاندار کوٹھی پر لے گیا۔ وہاں اس نے راوی کو ایک نہایت ہی خوبصورت اور بھرے پُرے بدن والی عورت کو اپنی دوسری بیوی کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ اس عورت کا نام رانی تھا۔ رانی دراصل کسی زمانے میں روپا کے ملازم خاص راج بہادر کی محبوبہ تھی لیکن اس کے پہاڑی والدین نے اپنی بیٹی کے حسن اور جوانی کی قیمت وصول کرنے کی غرض سے اسے روپا کے ہاتھوں بیچ دیا تھا یعنی روپا سے اس کی شادی کر دی تھی۔

اب رانی اور راجکمار دونوں روپا کے گھر میں اور اس کے اپنے بنائے ہوئے منصوبے کے تحت یکجا رہنے لگے تھے۔ دن بھر اور رات کے پہلے پہر تک رانی روپا کی بیوی رہتی پھر جب روپا بظاہر سو جاتا تو وہ راجکمار کی بیوی بن جاتی۔ سونے کی اداکاری کرنے والا روپا خاموشی سے اور ایک چور دروازے سے ملحقہ کمرے میں ہونے والا سارا ڈراما دیکھتا اور لطف اندوز ہوتا۔ رانی اور راجکمار کا ایک لڑکا بھی تھا جسے روپا اپنا بیٹا کہتا۔

یہ ساری کہانی سن کر راوی کے اندر موجود ایک غیرت مند مرد روپا سے پوچھتا ہے۔

"اپنی بیوی کو دوسرے کے پاس جاتے دیکھ کر تمھیں برا نہیں لگتا؟"

"نہیں کسی دوسرے کی بیوی کے پاس جانے کا جو مزہ ہے وہ میں اسے بھی دیتا ہوں اور خود بھی حاصل کرتا ہوں۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ میری بیوی کے پاس جا رہا ہے مگر کیا یہ سچ نہیں کہ میں اس عمر میں اس کی جوان بیوی کے ساتھ سوتا ہوں۔ اور کبھی کبھی ہمّت پڑتی ہے تو داؤ بھی لگا لیتا ہوں۔"

"دراصل دولت تو اسی کی ہے۔" روپا نے جواب دیا۔

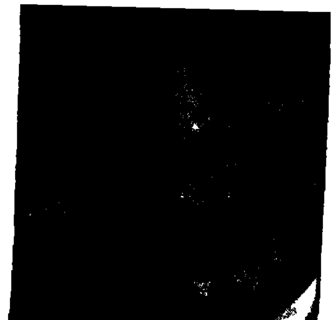
اس افسانے میں اخلاقی سطح پر مفلوج روپا کے ذریعے، چاولہ نے جنسی پرورژن کی جو بد ترین اور رکیک ترین تصویر پیش کی ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ چاولہ نہ صرف انسانی نفسیات بلکہ نفسیاتی بیماریوں کے عجیب و غریب پہلوؤں پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ جنسی پرورژن ان کے یہاں ایک خاص افسانوی فینامینن کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں بھی وہ عام طور پر جنسیت کے تاریک پہلو کو بطور خاص پیش کرتے ہیں۔ اس قسم کے افسانوں کے ذریعے قاری کو اخلاقی درس تو مل جاتا ہے لیکن جنسیت روحانی تجربے میں تبدیل نہیں ہونے پاتی، اس طرح ان کے یہاں محبت کئی بار محض جنسی خواہش کا نعم البدل بن کر رہ جاتی ہے۔

چاولہ کے افسانوں کی ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ وہ افسانے کے دوران اور خاص طور پر اُسے ختم کرتے ہوئے اپنی رائے کے اظہار اور تبصرہ نگاری پر ضرورت سے زیادہ زور دیتے ہیں۔ قاری تو عام طور پر کاہل ہوتا ہی ہے۔ اسے اگر کرداروں کے ساتھ ساتھ حالات کے بارے میں بھی ساری تفصیل سے آگاہ کر دیا جائے تو اس کی عادت بگڑ جاتی ہے۔ دھیرے دھیرے وہ منزل بھی آجاتی ہے جب قاری افسانے کے بارے میں جاننا تو بہت کچھ چاہتا ہے لیکن اسے محسوس کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ افسانہ نگار کو چاہئے کہ وہ قاری کو کبھی بھی اس منزل تک نہ پہنچنے دے۔

ہر چند چاولہ نے اپنی ایک کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے کہ:

"میرے افسانے میرے بچے ہیں۔ میں نے انھیں خونِ جگر سے پروان چڑھایا ہے۔"

[باقی صفحہ ۲۸ پر دیکھئے]

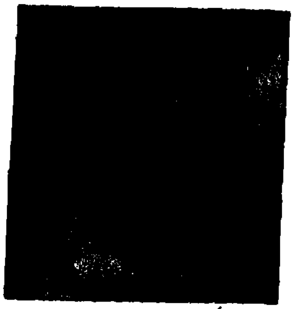


اکبر حیدرآبادی

# ماں

جدا ہوئے تم سے کتنے موسم گذر چکے ہیں
بہاریں مدت سے رنگ و بو کو ترس رہی ہیں
خزاں صفت زندگی کا احساس دے رہا ہے
ہیولے خوابوں کے ——
ناہویدا جراحتوں کے
نظر کے شفاف آئینے پہ
نشانِ خجلت، نشانِ اندوہ بن چکے ہیں!
قریب تھیں تم تو میں رہا کتنی دور تم سے
جو دور ہو اب تو کتنی نزدیک لگ رہی ہو!
محبتوں کے ثمر تمہارے شجر سے
میں ایک شاداب رس بھری شاخ بن چکا ہوں
سبب ہیں سرشاریوں کا میری
گل و ثمر آج بھی تمہارے
کہ ان میں اور مجھ میں مشترک ہے
تمہاری یادوں، تمہاری دل داریوں کا ورثہ
وہی مری عمر کا اثاثہ
مری تسلی
مرا دلاسہ
مسافتیں یوں تو ان کے اور میرے درمیاں ہیں
وہ جادۂ ہجر پہ مگر ہم سفر ہیں میرے
مرا یقیں —— میرے صرف الفاظ کی معنویت
وہ میری پہچان
میری قوت
وہ میری محرومیوں کے جنگل میں نعمتوں کی سبیلِ واحد
کہ قربتوں سے انہی کی اب دوریاں تمہاری
قریب رکھتی ہیں تم سے مجھ کو!

27-ANDERSONS CLOSE KIDLINGTON
OXS 1ST OXFORD (U.K.)



انیس انصاری

# یہ خواب بھی آخر ہار گیا

کچھ زخم تمہیں بھی ملنے تھے، کچھ زخم مجھے بھی کھانے تھے
پتھریلے شہر کی گلیوں میں سب خون خرابا جائز ہے
ہیں ٹکڑے ٹکڑے خواب لیے اس کوشش میں سرگرداں تھا
کچھ ایسی بات بنے بابا، ایک خواب مکمل ہو جائے
یہ خواب بھی آخر ہار گیا، اک بچہ تھا کب تک سہتا
اب میرے سینے کے اندر وہ آنکھیں میچے لیٹا ہے
یہ شوخ طبیعت بچہ ہے رہ رہ کر آنکھیں ملتا ہے
خاموش نگاہوں سے مجھ کو ہنس ہنس کر تکتا رہتا ہے
میں تھپکی دے کر کہتا ہوں اے بچے کافی جاگ چکے
اب کالی رات بلاتی ہے تو گہری نیند میں سو جاؤ
جب صبح کا سورج آ جائے تب اپنے کھیل میں لگ جانا
اس کالے شہر کی گلیوں میں لیکن ہشیار رہو بابا
ہر کھیل یہاں پر جائز ہے گر رسموں کے اندر کھیلو
میدان مقرر ہے سب کا، ہر کھیل ضوابط رکھتا ہے
میدان کے باہر جا نکلے تو چوٹ بہت لگ جاتی ہے
پتھریلے، شہر کی گلیوں میں سب خون خرابا جائز ہے
کیوں ناحق اپنا خون کرو، کیوں ناحق سب پر دوش دھرو
جب کالی رات بلاتی ہے تو گہری نیند میں سو جاؤ

۴۳۔ گلستان کالونی، لکھنو




ہرچرن چاولہ

INNV LIT, DEICHMANSKE BIBLIOTEK,
HENRIK IBSENS GT-1, 0179 OSLO-1 (NORWAY)


# بلا عنوان

کل اُن کے قبیلے میں شادی ہوئی تھی۔ رات دیر گئے تک خوب رونق میلہ رہا تھا۔ صبح سب تھکے ماندے گہری نیند میں غلطاں پڑے تھے۔ بجو رات کو جلدی سو گیا تھا اس لیے صبح اس کی آنکھ جلدی کھل گئی۔

ذخیرے کے درختوں پر چاروں طرف سنّاٹا تھا۔ ترنگ کی لہر میں وہ ذخیرے کے سارے درختوں پر اِدھر اُدھر کودتا پھاندتا پھرا۔ ذخیرے کے بیسیوں درختوں پر سب اپنا ہی راج تھا۔ جہاں چاہو، جاؤ۔ جدھر دل چاہے کھیلو۔ درختوں کے پھل کھاؤ، ٹہنی ٹہنی پتہ پتہ کود د پھاندو۔ کوئی ممانعت نہیں تھی۔ ہاں بڑے باپو نے کہا تھا۔ تین کھونٹ گھومو، موج کرو مگر چوتھے کھونٹ مت جانا۔ اس نے سوچا۔ چوتھی طرف ضرور کوئی خاص بات ہوگی جو بڑے باپو اُدھر جانے کو روکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے خود چھپ چھپ کر اُدھر جاتے ہوں اور صرف ہمیں ہی منع کرتے ہوں۔ اب سب سو رہے ہیں اگر میں چوتھی طرف ایک جھلک دیکھ بھی لوں گا تو کسی کو کیا پتہ چلے گا۔ تین اطراف تو ہزاروں بار دیکھ چکا ہوں۔ ایک طرف تو ہماری ہی شکل کے کسی دیوتا کا پوجا گھر ہے۔ ہم اُدھر جاتے ہیں تو لوگ ہمیں بڑے پیار سے دیکھتے ہیں۔ اس کے صحن میں ہم گھنٹوں کھیلتے رہتے ہیں کوئی کچھ نہیں کہتا۔ الٹا لوگ کھانے کو بھی کچھ نہ کچھ ڈالتے ہی رہتے ہیں۔ دوسری طرف قصبے کا چھوٹا سا بازار ہے۔ جہاں انواع و اقسام کی چیزیں بکتی ہیں۔ پوجا گھر کی قریبی تین چار دکانوں پر مٹھائی اور پھول بکتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی ایک آدھ آدھ مٹھائی کا اٹھا لیتا ہے تو دکاندار اوّل تو نظر انداز کرتے ہیں ورنہ بس ذرا ہاتھ ہلا کر ہمیں بھگا دیتے ہیں ایک بار ایک دکاندار نے ہمارے ایک بھائی کو چھڑی مار دی تھی تو قصبے کے سب لوگ اس سے ناراض ہو گئے تھے اور چاہتے تھے کہ اس کی دکان بند کروا کے اسے قصبہ بدر کر دیں کہ اس نے معافیاں مانگ مانگ کر اور آئندہ ہم پر ہاتھ نہ اٹھانے کا وعدہ کر کے ہی بڑی مشکل سے جان چھڑائی تھی۔ تیسری طرف کچھ لوگوں کے گھر ہیں۔ جدھر ہم کبھی کبھی مٹر گشت کرنے نکل جاتے ہیں تو لوگ ہمیں کچھ بھی نہیں کہتے۔ ہاں ہمارا اُن کا ایک آدھ کپڑا پھاڑ دینا انہیں بالکل نہیں بھاتا۔ باپو نے اس سلسلے میں بھی منع کیا ہے کہ خواہ مخواہ کسی کا نقصان کرنے کا کیا فائدہ؟ اپنی بنی بنائی عزت خراب ہوتی ہے مگر ہم کیا کریں۔ جوانی چڑھتے دانتوں میں کھجلاہٹ ہوتی ہے تو کپڑے کی ملائم سطح دانتوں کو بہت اچھی لگتی ہے۔ خیر باپو کے رعب اور سمجھانے سے یہ غلطی بھی ہم سے کم ہی ہوتی ہے۔

سب سو رہے ہیں۔ چوتھی طرف جھانک لینے میں کیا حرج ہے۔ جب تک سب اٹھیں گے۔ میں واپس آ چکا ہوں گا۔ کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوگی۔

ارے اِدھر بھی کوئی خاص بات نہیں۔ بجو نے دیکھا۔ چند گھر ہیں اور ان کے کوٹھے ہیں۔ جن کی چھتوں پر لوگ صبح کی گہری نیند میں ڈوبے سو رہے ہیں۔ ذخیرے کے درختوں کے ساتھ لگتے چوبارے کی چھت پر ایک نوجوان لڑکا سو رہا ہے۔ اب وہ آنکھیں مَلتا اٹھ بیٹھا ہے۔ میں رکوں یا بھاگ جاؤں۔ میں اس سے کافی دور ہوں۔ بھاگنے کی کیا ضرورت ہے۔ دیکھتا ہوں کہ اِدھر دیکھنے لائق اور کیا ہے۔ لڑکے نے مجھے دیکھ لیا ہے ارے وہ تو میری طرف اشارے بھی کر رہا ہے۔ جیسے مجھے پاس بلانا چاہتا ہو مگر ساتھ ساتھ جانے وہ عجیب و غریب شکلیں بنا بنا کر ہنس کیوں رہا ہے۔ میں کوئی ہنسنے کی چیز ہوں ـــــ اس نے اپنی جیب سے کچھ بھنے ہوئے چنے نکال کر چھت پر بکھیر دیے ہیں۔ یہ سب مجھے پھنسانے کی چالیں ہیں۔ نہ بابا چوہا لنڈورا ہی بھلا۔ باپو نے اِدھر آنے کو منع کر رکھا ہے۔ بس یہی کافی ہے کہ میں اِدھر چلا آیا۔ میں چلا۔

دوسرے دن موقع پا کر بجو پھر اِدھر چلا آیا۔ لڑکے کی عجیب و غریب شکلیں بنانا اسے اچھا لگا تھا۔ یہ محض اتفاق ہی تھا کہ وہ عین اس

وقت ادھر آیا تھا جب لڑکا ابھی ابھی جاگا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ پھر بہت خوش ہوا اور اسے پھر اشاروں اشاروں میں اپنے پاس بلانے لگا۔ بجو اسے دُور دُور سے ہی نظریں گھما گھما کر دیکھتا رہا۔ آج اس نے کوئی سفید سی مٹھائی چوبارے کی دیوار پر رکھ دی، شاید برفی تھی۔ بجو کو برفی بہت پسند تھی۔ وہ ٹھنی ٹھنی پتہ پتہ دیوار کے قریب پہنچا۔ لڑکا اسے موقع دیتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے جھپٹ کر مٹھائی اٹھائی اور واپس اپنی ڈال پر لوٹ آیا اور غڑپ غڑپ ساری مٹھائی پپوٹے میں بھر لی۔ لڑکے نے پھر بہت سے چنے پپوٹے میں بھرے۔ واپس لوٹنے لگا تو دیکھا لڑکا بہت دور کھڑا تھا۔ وہ رک گیا اور دونوں ہاتھوں سے باقی سارے چنے بھی چن چن کر پپوٹا بھرنے لگا۔ لڑکا دور اسے کونے میں کھڑا دیکھتا رہا۔ جب وہ سارے چنے ختم کر چکا تو لڑکے نے برفی نکال کر ہتھیلی پر رکھ دی۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور اس کی ہتھیلی سے برفی اٹھا کر واپس دیوار پر لوٹ آیا۔ لڑکے نے ایک اور ٹکڑا نکالا اور ہتھیلی پر رکھ کر اسکی طرف بڑھا دیا وہ پھر آگے بڑھا۔ مگر ڈر کر واپس آیا لڑکے نے برفی اسکی طرف پھینک دی۔ آہستہ آہستہ ان میں دوستی ہو گئی۔ اب وہ آرام سے اس کی چارپائی پر اس کے پاس جا بیٹھتا۔ اس کے ہاتھ سے چیزیں کھا لیتا۔ لڑکا جو کچھ کھاتا اسے بھی ضرور کھلاتا۔ بجو وقت بے وقت جب چاہتا، بزرگوں کی نظر بچا کر اُدھر پہنچ جاتا اور گھنٹوں لڑکے کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ اب لڑکا اسے کندھے پر بٹھا کر شہر بھی لے جانے لگا تھا۔ جہاں اس کے دوسرے دوست بھی اس کے ساتھ بہت پیار سے پیش آتے تھے اور کھانے کو بھی کچھ نہ کچھ دیتے رہتے تھے۔

ذخیرے کے بزرگوں کو شک ہو گیا تھا کہ بجو اکثر اپنے ذخیرے سے غائب ہو کر علاقہ غیر میں پہنچ جاتا ہے اس لیے بجو نے کچھ دن ادھر جانے کا خیال ترک کر دیا تھا کہ اس کا وشواس پھر سے قائم ہو سکے۔ آخر پانچ چھ دن کے صبر آزما انتظار کے بعد وہ پھر اُدھر پہنچ گیا۔ اسے ڈر تھا کہ لڑکا اس کی اتنی طویل غیر حاضری پر ضرور ناراض ہو گا مگر نہیں لڑکے نے اسے پچھلے ہی دن جیسا پیار دیا اور کندھے پر بٹھا کر پھر گھمانے پھر اسنے لے گیا۔ ہاں اس بار اس نے یہ ضرور کیا کہ بجو کے گلے میں ایک پٹہ اور رسّی ڈال دی۔ بجو بھی اب اس کے ساتھ کا عادی ہو گیا تھا۔ ویسے لڑکا اس کا خیال بھی بہت رکھتا تھا یا شاید اس شہر کی ریت ہی پریت کی تھی کہ بجو نے بڑی خوشی سے تھوڑی سی پابندی برداشت کر کے اس کے ساتھ رہنا قبول کر لیا۔ اسے ذخیرے کے ساتھی یاد تو آتے مگر یہاں کا آرام اور خلوص بھی اچھا لگتا۔ وہ سوچتا، چڑیوں کے بچوں کو بھی پر لگتے ہیں تو ماں باپ کو چھوڑ کر اپنی راہ اڑ جاتے ہیں۔ اگر وہ یہاں چلا آیا تو کیا خاص بات ہوئی اور وہ اب لڑکے کے ساتھ ہی رہنے لگا۔

کچھ دن بعد نجانے لڑکے کو اس شہر کی کیا ادا اکھر گئی کہ اس نے اس شہر کو چھوڑنے کا ارادہ کر لیا۔ اصل میں کچھ لوگوں کو زیادہ آزادی راس نہیں آتی اور یہاں اپنا راج تھا، چاہو تو راجہ کو رکھو، چاہو تو اسے ہٹا کر دوسرے کو تخت پر بٹھا دو۔ دور کے ڈھول سہانے اور نئے تجربے کے خیال سے وہ بجو کو کندھے پر بٹھا کر پردس نگری پہنچ گیا۔ اس نے سوچا۔ وہاں دودھ کی ندیاں بہتی ہوں گی۔ کیونکہ اُدھر سے جو بھی آتا تھا۔ دولت کی ریل پیل کی ہی بات کرتا تھا۔ اس نے سوچا وہ بھی کیوں نہ نئے نگر جا کر بہتی گنگا میں ہاتھ دھولے مگر وہاں جا کر اسے پتہ چلا کہ واقعی وہاں دولت کی ندی تو بہتی تھی مگر وہ گنتی کے چند ہی گھروں کے کنارے کو چھو کر گزرتی تھی یا صرف ان لوگوں پر مہربان ہوتی تھی جو وہاں کے بادشاہ سلامت کی بُرش جیسی مونچھوں اور شاہانہ چمک دمک پر رطب اللسان رہتے تھے۔ لڑکا تھا تو سمجھ دار مگر اس کے ذہن میں اُن خوشامدانہ تعریفی الفاظ کا ذخیرہ بہت کم یا شاید نہ کے برابر تھا جس سے بادشاہ لوگ خوش ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ نئے نگر میں زیادہ دن نہ چل سکا اور بھوکا مرنے لگا۔ ایک دن اس نے بجو سے کہا۔ "بیٹے آؤ کچھ کام کریں ورنہ بھوکے مر جائیں گے اور اب واپس جانے کا بھی تو چارہ نہیں۔ تو نے غلطی کی کہ بزرگوں کا کہا نہ مانا اور چوتھے کھونٹ اتر آیا۔ میں نے غلطی کی کہ دودھ کے کٹورے کو لات مار کر ادھر چلا آیا۔ وہاں بھینس دودھ نہیں دیتی تھی تو ہم اس کی گھاس روک لیتے تھے۔ یہاں تو کوئی شنوائی ہی نہیں۔ آؤ اب اپنی کرنی بل کر بھگتیں۔"

چنانچہ اس نے خود کئی قلابازیاں لگانی سیکھیں۔ بنسری اور ڈگڈگی خریدی۔ بجو کو تماشے کرنے سکھائے۔ اس طرح دونوں کے پیٹ کا دھندا چل نکلا۔ بجو کبھی کبھی ترنگ میں نہ ہوتا تو کرتب تماشے دکھانے سے انکار کر دیتا۔ مجبوراً لڑکے کو اُسے ڈنڈا دکھانا پڑتا۔ اور ڈنڈا تو اچھے اچھوں کو سیدھا کر دیتا ہے۔ نئی جگہ آ کر یہ بات بجو بھی سمجھ گیا تھا اور خود اس کا مالک بھی۔ جسے وقت نے ایک دم لڑکے سے بوڑھے میں تبدیل کر دیا تھا۔ بیچ میں جوانی تو کہیں اسے اڑنچھو ہو گئی تھی جیسے اس راہ پر آئی ہی نہ ہو۔

دے سخی داتا۔ تیرا بھلا ہو گا۔ تماشہ دکھا کر اس نے منگرا

بیچ میدان دھرا ہی تھا کہ اس میں پہلا سکہ جو پڑا وہ دس کا نوٹ تھا۔ اس نے نوٹ ڈالنے والے کی طرف دیکھا اور اس کے منہ دعاؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اتنی بڑی رقم اور یک مُشت دو سال تک الٹی سیدھی پھٹنیاں کھانے اور بجو کو نچانے اور تماشے دکھانے کے بعد اس نے ابھی تک نہیں دیکھی تھی۔

"مداری۔ یہ بندر ہمیں دوگے ؟" اجنبی نے سوال کیا۔

"صاحب یہ تو میری روٹی روزی کا وسیلہ ہے۔" وہ بولا۔

"مہینے میں کتنا بنا لیتے ہو ؟"

"یہی سَو سوا سَو سرکار۔ بس حضور روٹی روزی کا دھندا ہو جاتا ہے۔"

"میں تمھیں سال بھر کا خرچہ دے دوں تو بندر سے جدا ہونا برداشت کر لوگے ؟"

وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ بندر اس کی روزی روٹی کے وسیلے کے ساتھ ساتھ دوست بھی تو تھا۔ وہ اپنے سارے دُکھ درد اسے ہی سنا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کیا کرتا تھا۔ وہ بولا۔ "صاحب بجو میرا ساتھی ہی نہیں، بھائی بھی ہے اور وطن کی نشانی بھی۔"

"دیکھو۔ بھائی بھائی سے جُدا ہوتا آیا ہے۔ کون زندگی بھر ایک ساتھ رہ پایا ہے۔ یہی دنیا کا دستور ہے۔" اجنبی بولا۔ لو یہ ڈبل رقم ہے اب انکار نہ کرنا۔ ہمیں تمھارا بجو پسند آگیا ہے مگر فکر مت کرنا۔ میں اسے بہت آرام سے رکھوں گا۔

اور اس نے نوٹوں کی گڈی زبردستی نہ نہ کرتے مداری کے ہاتھوں میں گھسیڑ دی۔ مداری نے بجو کو اجنبی کے کندھے پر بٹھا کر رسّی اس کے ہاتھوں میں پکڑا دی۔ وہ پہلے بھی تماشہ دکھانے کو بجو کو کسی کے کندھے پر بٹھا دیتا تھا اور بجو کچھ دیر وہاں بیٹھ کر اور اس آدمی کے ہاتھ سے کوئی کھانے کی چیز پا کر منہ میں بھر لیتا تھا یا کوئی اگر اسے نوٹ یا سکّہ پکڑاتا تو وہ اسے لاکر مداری کو دے دیتا تھا یا اس کے مُنگرے میں ڈال دیتا تھا۔

بجو بہت دیر اجنبی کے کندھے پر بیٹھا رہا اور اجنبی لمحہ بہ لمحہ، قدم بہ قدم مداری سے دور ہوتا گیا۔ بجو سمجھا شاید اجنبی اسے کھانے کی کوئی چیز دلوانے کے لیے کسی دکان کی طرف لیے جا رہا ہے مگر جب اجنبی گھنٹہ بھر چلنے کے بعد بھی کہیں نہیں رکا تو بجو پہلے تو اس کے کندھے پر مچلا اور پھر چھلانگ لگا کر نیچے اُتر آیا۔ اس نے مڑ مڑ کر پیچھے دیکھا مگر ہزاروں چہروں میں اس کا شناسا چہرہ کہیں غائب ہو چکا تھا۔ اس نے واپس بھاگ جانا چاہا مگر گلے میں پڑی رسی کے جھٹکے نے اس کے قدم روک لیے۔ اجنبی نے پہلے تو اسے ہلکے سے کھینچا مگر بجو جب کھچا ہوا وہیں رکا رہا اور دانت بھی دکھانے لگا تو اجنبی نے اسے چھڑی دکھائی جو داری کی ساتھ اٹھا لایا تھا۔ مجبوراً بجو رسی کی دوری تک اس کے پیچھے پیچھے گھسٹتا ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اجنبی نے ایک دکان سے اس کے لیے مٹھائی اور چنے خریدے۔ بجو کو دکھائے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ روٹھا سا اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اجنبی ہر دس پندرہ منٹ بعد چنے اس کی طرف بڑھاتا۔ آخر بھوکے پیٹ نے چند چنے اس کی ہتھیلی سے اٹھا کر منہ میں ڈال لیے۔ پیار پیار سے اجنبی نے باقی چنے اور مٹھائی بھی آہستہ آہستہ اسے کھلا دی اور پھر اپنے کندھے پر سوار کر لیا۔

بجو تین چار دن تو بہت اُداس رہا۔ اجنبی کے گھر اس کی چارپائی سے بندھا ہر وقت دروازے کی طرف دیکھتا رہتا۔ مگر آہستہ آہستہ وہ اجنبی کے جھوٹے سچے پیار اور کبھی ڈنڈے کی مار کا عادی ہوتا گیا۔ اس کے بعد اس کی زندگی میں نئے نئے واقعات آنے لگے۔ مداری کے ساتھ وہ زندگی بھر پیدل چلتا رہا تھا۔ اس نے پہلی بار عجیب و غریب گاڑیاں دیکھیں۔ اڑنے والی جادوئی دری دیکھی۔ وہ ایک بالکل نئے ملک آگیا تھا۔

نیا ملک، نئے لوگ، نیا مالک اور نئے نئے تماشے۔ ہاں اُسے یہاں بھی تماشے دکھانے پڑتے۔ مالک کے ڈنڈا دکھاتے ہی اس کے ہاتھ گٹھری اٹھا کر بغل میں دبا لیتے اور وہ ایک طرف کو چل پڑتا جیسے سسرال جا رہا ہو بیوی کو لانے۔ ڈنڈا ہاتھ میں لے کر کمر جھکا کر یوں چلتا جیسے بوڑھا ہو گیا ہو۔ ڈنڈے کی بندوق بنا کر ملٹری کا جنرل بن جاتا۔ پچھلے ملک میں اس کی یہ ادا بہت پسند کی جاتی تھی۔ جب وہ تماش بینوں کو آنکھیں اور دانت دکھاتا، ان پر بندوق تان لیتا تھا۔ اس کی یہ ادا اچھے اچھوں کی جیبوں سے اچھی بھلی رقمیں نکلوا لیتی تھی۔ وہاں رعب کی اداکاری سے لوگ پیسہ پھینکتے تھے شاید جس میں چھپا ان کے دلی دکھ کا اظہار بھی ہوتا تھا۔ یہاں لوگوں کو پیسہ پھینکنے کی عادت تھی۔ بھاری جیبیں یہی کیا کرتی ہیں۔ کوئی نئی بات نہیں۔

نئے ملک میں وہ نئی نئی جگہ تماشے دکھاتے پھرا مگر نئے ملک کے نئے تقاضے تھے جن کا نہ مداری کو علم تھا اور نہ بجو کو۔ اگر مداری کو علم تھا بھی تو وہ جان بوجھ کر لاعلم بنا ہوا تھا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ نئے ملک میں اس نے پندرہ بیس تماشے بھی دکھا لیے تو پچاس بجوؤں کی قیمت وصول ہو جائے گی۔ ملک چھوڑنا پڑا تو وہ بجو کو کسی درخت پر

بٹھا کر اپنی راہ لے گا یا داؤ لگا تو ویسے ہی کسی دوسرے پڑوسی امیر ملک میں داخل ہو جائے گا۔

بجو دیکھتا، نیا ملک، نئے لوگ، نئی آزادیاں اور کھانے پینے کی افراط مگر پھر بھی فکر اور کرب کی آڑی ترچھی لکیریں دل کی تمام دنیا کو کاٹتی اندر ہی اندر چلتی سی محسوس ہوتی رہتیں۔

وہ جگہ بہت بڑی تھی۔ کھلی سڑک، دور جس کے ایک طرف، ایک محل سی بہت بڑی بلڈنگ۔ دوسری جانب بہت بڑا بھرا بھرا بازار، پیچھے ایک بہت بڑا ہوٹل، سینما اور قسم قسم کی دکانوں کی قطار، جہاں وہ کئی دنوں سے شو دے رہا تھا۔ ہاں نیا مالک اب بجو کے کھیل کو تماشہ نہیں، شو ہی کہتا تھا۔ وہاں بہت بھیڑ اکٹھی ہو جاتی تھی اور مالک کی ولایتی ٹوپی میں سکے بارش کی طرح برستے تھے۔ ایسے ہی کسی شو میں کسی گوری چمڑی والے تماشبین نے اعتراض کیا تھا کہ اسے بجو کو ڈنڈا مارنا تو ایک طرف، دکھانے تک کا بھی حق نہیں۔ اعتراض کرنے والے نے اسے اخبار کی دوسری سرخی بھی دکھائی تھی جس میں خود ساختہ بڑے بھائی قسم کے ملک کے صدر نے ایک کتے کے کان کھینچنے پر کچھ لوگوں نے زور اعتراضات کیے تھے۔ یہاں انسانوں پر تو کیا جانوروں پر بھی ظلم برداشت نہیں کیا جاتا حتیٰ کہ انہیں ذبح کرتے وقت بھی ذرا سی بھی تکلیف کا احساس نہیں دیا جاتا۔ اعتراض کنندہ نے اسے بتایا تھا۔ مجبوراً اسے ڈنڈا ایک طرف دھر دینا پڑا مگر اس کے پاس بجو کو نچانے کا دوسرا طریقہ بھی تھا جو ڈنڈا دیکھے بغیر بھی اسے ناچنے اور تماشے دکھانے پر مجبور کر دیتا تھا۔ وہ پرانے مالک کی ٹیپ پر ریکارڈ شدہ آواز تھی جسے نیا مالک بجا کر بجو سے من چاہے کھیل کروا لیتا تھا۔ بجو اب بنا ڈنڈا کے بھی ناچ لیتا تھا بلکہ پہلے سے اچھا ہی ناچتا تھا۔ اب اس کے دل میں ڈنڈے کے لیے نفرت آ گئی تھی اور خوف نکل گیا تھا۔ یہاں کا ماحول ہی کچھ اسی طرح کا تھا۔

اس دن مالک نے اپنی ڈگڈگی بجائی ہی تھی اور لوگ جمع ہونے شروع ہوئے ہی تھے کہ دو باوردی سپاہی بھی مجمع میں آ کھڑے ہوئے وہ دراصل اسے وہاں سے ہٹانے آئے تھے مگر بجو کے کھیل میں ایسے محو ہوئے کہ اپنی ڈیوٹی تک بھول گئے۔ بعد میں جب انھیں ہوش آیا تو ان کی حاکمانہ رگ پھڑکی۔ فرمایا۔ "بھاگ یہاں سے۔ یہاں یہ سب منع ہے۔"

مجبوراً اسے شو بند کرنا پڑا۔ دوسرے دن پھر اس نے مجمع لگایا تو اسے دھر لیا گیا اور تھانے لے جا کر اس شرط پر چھوڑا گیا کہ وہ ہفتے کے اندر اندر بجو کو اپنے وطن واپس بھیج دے گا۔ وہ رویا پیٹا تو بہت، اپنی غریبی، روزگار اور مجبوریوں کا واسطہ دیا۔ کہا کہ حضور یہی تماشے دیکھنے ہزاروں کی رقمیں خرچ کر کے آپ کے شہری ہمارے ملکوں کو جاتے ہیں۔ میں تو خدمت خلق کے جذبے سے آپ کے من بھاتے تماشے کو آپ کے دروازے پر لے آیا ہوں۔ مجھے تو حضور سرکار دربار سے انعامات سے نوازا جانا چاہیے اور آپ الٹا۔ کہتے کہتے اس کا گلا بھر آیا مگر ادھر سے ایک ہی رٹ لگی رہی کہ یہاں دوسرے ملک کے جانور رکھنے کی اجازت نہیں۔ آخری کوشش کے طور پر وہ بولا۔

"جانور؟ بجو جانور نہیں۔ یہ تو میرا بھائی ہے۔ میری روٹی روزی کا وسیلہ ہے۔"

"تو کام کرو۔ خود کام کیوں نہیں کرتے۔" داروغہ نے سوال کیا

"کام کہاں ملتا ہے صاحب۔" اس نے فریاد کی۔

"یہاں کام کی کمی نہیں۔ ہمیں تو مزدوروں کی اشد ضرورت ہے۔ بولو کام کرو گے؟"

اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں ــــ وہ اسی چکر میں تو یہاں آیا تھا۔ سر ہلاتے ہی اسے کام کرنے کا اجازت نامہ مل گیا۔ اب اسے بندر کی کیا ضرورت تھی۔ مرے چاہے جیے۔ کام نہ لگے تک اسے بے کاری بھتہ ملنے لگا جس کی پہلی قسط ہی اس قدر تھی کہ بجو کو آرام سے واپس بھجوایا جا سکتا تھا۔ اس نے بجو کو پرانے مالک کے وہاں واپس بھیج دیا۔ ساتھ میں پہلے سے تین گنا زیادہ رقم بھی۔

پرانے مالک نے کچھ دن اسے آرام سے رکھا مگر پیسہ ختم ہوتے ہی پھر بدستور پرانی ڈگر پر اسے بازار لے آیا۔ نچانے کے لیے ڈنڈا اٹھایا کہ اسے اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ آتا ہی نہیں تھا مگر بجو ٹس سے مس نہ ہوا اور نہ ہی اس نیچ مالک کی پیسے کی زور پر بڑھ گئی بڑی بڑی مونچھوں سے خوف زدہ ہوا۔ وہ بدل چکا تھا۔ اسے دوسری قسم کی ہوا لگ گئی تھی۔

دوسری رات اس نے گلے سے رسی نکالی اور بھاگم بھاگ واپس اپنے درختوں کے ذخیرے میں پہنچ گیا۔ جہاں اس کے پرانے بندر بھائی قیام کرتے تھے۔ اس نے اب نہ صرف خود جوتے کھونٹ جانے سے توبہ کر لی تھی بلکہ ایک تجربہ کار بزرگ کی طرح نئے اٹھتے مالے نوجوان بندروں کو ادھر جانے سے منع بھی کرنے لگا تھا۔ ✺

## یانگ لیو ہانگ

ترجمہ :- ندا فاضلی

یانگ لیو ہانگ چین کی جدید ترین نسل کی نمائندہ شاعرہ ہیں۔ پیدائش ۱۹۶۵ء PEOPLE'S UNIVERSITY سے تعلیم پوری کر کے آج کل اسی یونیورسٹی کے شعبۂ عمرانیات میں استادی کے ساتھ ریسرچ کا کام بھی کر رہی ہیں۔ ایک شعری مجموعہ سفید ریت کا جزیرہ شائع ہو چکا جس کو کئی ادبی انعامات سے نوازا گیا ہے۔ اس مجموعہ میں شامل بیشتر تخلیقات چین کی نئی اور آزاد ادبی فضاؤں سے متعارف کراتی ہیں۔ ان کے موضوع اور اظہار کے پیرایوں میں وہ بے خوفی صاف نمایاں ہے جس سے ان سے پہلے کے ادیب محروم تھے۔

یو ہانگ کا زندگی کو دیکھنے کا زاویۂ نظر تو رومانی ہے لیکن حقیقت اور خواب کی جذباتی کشمکش نے ان کی آواز کو غنائی ساخت کے ساتھ ایک شخصی کردار بھی بخشا ہے۔ یہ شاعری لوک گیتوں کی طرح معصوم اور تصویری ہے۔ جانے پہچانے فطری مناظر کے شعری برتاؤ میں الفاظ کی مانوس مشابہات سے تخلیق گریز ان کے لب و لہجہ کو تہہ داری نہیں بناتا بلکہ ان منظروں میں ان دیکھے ابعاد کی پر اسراریت بھی ابھارتا ہے۔

### ✿ بنا برف کی سردی

میں تمہارے لئے
سارے موسم
برف کی دعا مانگتی رہی
لیکن سوائے کالی مٹی کے
ہلکے گہرے نقوش کے مجھے کچھ نہیں ملا۔
تم نے کہا تھا
میں تمہارا انتظار نہیں کروں
تم شمال کی طرف چلے جاؤ گے
جہاں صنوبروں کی چھاؤں ہے
جہاں کتے برف پر گاڑیاں چلاتے ہیں
جہاں شکاری شکار کر کے کھاتے ہیں
میں نے کہا تھا
تھوڑا رکو
اور میں نے اپنے برش اور رنگوں سے
کانچ کے ایک ٹکڑے پر
ایک برف کا ستارہ بنایا تھا
اس کے نیچے ایک سرخ گھر دکھایا تھا
اور اس کے پاس
سرخ لومڑی کے پیروں کے نشانات کو سجایا تھا
کہر ٹھہری رہی
پانی کی بوندیں
دریا کے دائرہ میں پھیلتی سمٹتی رہیں
لیکن
بادلوں جیسی برف
دور کے سورج کا طواف کرتی ہوئی
شمالی ہوا کے تعاقب میں نکل گئی
تم چلے گئے میں سارے موسم
برف کا انتظار کرتی رہی
لیکن برف نہیں گری ■

### ✿ تم ہمیشہ پوچھتے ہو

تم ہمیشہ پوچھتے ہو
میں عشقیہ نظمیں کیوں نہیں لکھتی ؟
محبت بھی ایک نظم ہے
لیکن وہ کاغذ پر لکھی نظموں کی طرح سیدھی اور آسان نہیں
تم جب بھی مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہو
میں تمہاری نظریں بچا کر
کھڑکی سے باہر جھانکتی ہوں
اور ان دو انگور کی بیلوں کو تاکتی ہوں
جو آپس میں ایسے گندھی ہوئی ہیں کہ
ان کا رنگ
روپ
اور رس
سب کچھ ایک جیسا لگتا ہے
ان دونوں میں
وہ دو ہیں
یا ایک
یہ جاننا مشکل ہوتا ہے ■

### ✿ چاندنی رات

سب کہتے ہیں
سمندر کبھی منجمد نہیں ہوتا
لیکن
وہ کبھی کبھی
بے لہر اور بے رنگ ضرور ہوتا ہے
جب بھی چاندنی فضا میں پر تولتی ہے
تو آنکھوں سے دور
کہیں کوئی پرچھائیں ڈولتی ہے
اور ایک شکستہ خواب
بنجارہ بے تاب
ساحل پر بھٹکتا ہے
بھیگا بھیگا درد مہکتا ہے
اور دیر تک
دہیا گیلی ریت پر
کوئی نام لکھ لکھ کر مٹاتا ہے
اور دیر تک
آسماں پرستاروں کو رلاتا ہوں ■

# چونگ ہیوں جونگ

ترجمہ:- ندا فاضلی

چونگ ہیوں جونگ، پیدائش ۱۹۳۹ء کوریا کے نئے شاعروں میں ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ یونسی یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کرکے آج کل اسی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ پانچ شعری مجموعے اور دو نثر کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ شاعری میں فلسفہ کو تجربہ کی آنچ میں تپاتے ہیں اور الفاظ کو سکہ بند معانی سے الگ کرکے ان میں نت نئی تہیں جگاتے ہیں۔

انسان کی روحانی تنہائی، موت و حیات کی کشمکش اور زندگی میں کسی معنی کی جستجو نے انہیں ہر جا میں جہاں دیگر کا سیاح بنا دیا ہے۔

وہ زندگی کے تعلق سے انہیں بنیادی سوالات سے الجھتے نظر آتے ہیں جو ہر دور میں انسانی شعور کا نصیب رہا ہے لیکن ان سوالات کو جن بدلے ہوئے تناظر میں آج جاننے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ شخصی اور وارداتی ہیں اور اس رویہ نے ان کی شاعری میں وہ دردمندی ابھار دی ہے جو عصری شناخت رکھتے ہوئے بھی زمان و مکاں کے تعینات سے باہر ہے۔

## درد کا پندار

جھلملاتے جگمگ ستارے
برج قوس کے جھوم سے
جلتی ہوئی سگرٹوں جگنوؤں کو دیکھتے ہیں
نعروں کی سیہ رات میں
ہمارے خفیہ الفاظ کی موسیقی سنتے ہیں
میں سارا آکاش پرندوں کے حوالے کرکے
زمیں کی سمت لوٹتا ہوں
مسرت جسموں کو باندھتی ہے
اور درد روح کو
ہم نے وقت کی جڑوں کو اکھاڑنا چاہا
لیکن
وقت کے بجائے ہم خود اکھڑ گئے
اشیاء کا حسن
اشیاء کا دکھ
شراب کی ترنگیں
نفس کی روش مگر عارضی امنگیں
ہماری آنکھوں میں بھرا گیت
گھر کو پکارتا ہے
مسرت جسم کو باندھتی ہے
اور روح درد کو
ہماری زندگی کا جواز

ہماری سوچ کے زاویے
لوک گیتوں کا نیلا آکاش
روتا ہے
غم ستاروں اور بھکاریوں پہ برستا ہے
ہماری سہمی ہوئی آتماؤں کا بھٹکاؤ ہم پر ہنستا ہے
مسرت جسم کو باندھتی ہے
اور درد روح کو
جسم سے جسم کا سایہ بھاری ہوتا ہے
اس لیے
ہم سر جھکا کے چلتے ہیں
اور انسانوں کے بارے میں
سوچ سوچ کر بہلتے ہیں
خون میں ضیاء بھگوتے ہیں
اور آنسوؤں میں شکر بوتے ہیں
آدمی کی محبت..... تنہائیوں کی بے بسی
مسرت جسم کو باندھتی ہے
اور درد روح کو ■

## شاعروں سے

ستارے آسمان کے ستاروں جیسے
ریت! سمندر کے کنارے ریت جیسی
وہ چمکتا ہے۔ چمکیلا ہے
وہ جو تنہا ہے تنہا ہے
انتظار کرو
اس وقت تک
جب تم بھی یہ گا سکو
میں ہی وہ ہوں
جو منوّر ہے
اس روشنی میں
جو روشن ہے
انتظار کرو اس وقت تک
جب تک تمہارا بدن
ریگستان کی ریت پر رات بن کر نہ چھا جائے
اور ریت پر سرسراتی ہوا
نئے گیت سنائے

اس وقت تک !!!
اپنے جھوٹ سے اتنی محبت کرو
کہ تمہارے جھوٹ سے
جھوٹ ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائے ■

۱۰۳- امرا پارٹمنٹس، ڈانڈ پارہ، اکھار او یسٹ، بمبئی ۴۰۰۰۵۲



جوگندر پال

۲۴ - سدا کنی ، انکلیو ، کالکاجی ، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۹

# خواب رو

قسط نمبر-۴

" آپ تھک گئے ہوں گے ماموں جان "! اسحٰق نے پھر ٹانگ اڑائی " آگے کی میں سنا دوں "؟

" بڑوں کے حق پر اس طرح چھاپہ نہیں مارتے ، بیٹے " حکیم صاحب ہنستے ہی رہے مگر اپنی بات آپ ہی پوری کرنے پر اڑ گئے " قصہ تو اب پورا ہو لیا ہے سیّد صاحب ۔ سائیں کی رہبری میں چور عین اس الماری کے پاس آ پہنچے جہاں سارا مال و متاع رکھا تھا ۔ دوسری چیزیں چھوڑ دیئے ، ہمارے ایک خاص صندوقچی بھی یہیں تھی ——— "

" اُس صندوقچی میں آخر ایسی کیا شئے تھی قبلہ حکیم صاحب ؟ سیّد صاحب کے کان کھڑے ہو گئے ۔

حکیم صاحب کے چہرے پر ملیح آبادی بدلی جھلکی آ رہی تھی " اس صندوقچی کو بچانے کے لئے تو میں نے اپنا یہ ہاتھ بڑھایا تھا ۔ انھوں نے دھپ سے میری انگلیاں اُڑا دی تھیں "! انھوں نے اپنا دایاں ہاتھ آگے کر لیا جس کی چاروں انگلیاں کٹی ہوئی تھیں اور جسے اب صرف ان کا انگوٹھا ہی سنبھالے ہوئے تھا ۔

" اسحٰق مرزا کو اس کھلے موسم میں بھی اچانک بوندا باندی کا احساس ہونے لگا اس نے اپنے ماموں کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا " ہماری انگلیاں بھی آپ ہی کی تو ہیں ماموں جان "

" نہ ، چھوٹے نواب بیٹا ، جسم تو اپنا ، اپنا ہی ہوتا ہے ۔ نہ ہوتا تو ہم بھی نہ ہوتے "!

" مگر قبلہ حکیم صاحب "! سیّد صاحب اب فرطِ تجسس سے بے قابو ہو اٹھے تھے " اس صندوقچی میں آخر تھا کیا ؟ "

" وہ سب کچھ لے جاتے سیّد صاحب ، مگر اک وہ صندوقچی چھوڑ جاتے "

" مگر قبلہ ——— "

" ہاں وہی بتانے جا رہا ہوں : آپ کی بھابی کی اس صندوقچی میں ہمارے خاندان کا بیس پشتوں کا شجرہ محفوظ تھا ، جسے ہمارے اجداد نے باری باری اپنے ہاتھوں مکمل کیا ہوا تھا ——— "

اپنے ماموں کے خاندانی شجرے کے کھونے کی کیفیت اسحٰق مرزا کو گدگدانے لگی تو سورج پھر بادل کی ٹکڑی سے باہر آ گیا " سائیں لوگ شجرہ ہی تو اڑا لے گئے ہیں ماموں جان ۔ یوں بھی آپ کے بعد اسے کون سنبھالتے پھرتا "

اسحٰق مرزا کئی ہفتوں کی ذہنی ٹال مٹول کے بعد آج کہیں جا کے اپنے ماموں زاد بھائی ہاشم علی کو چھٹی لکھنے بیٹھا ہے ۔

بعض لوگ ہمیں اتنے عزیز ہوتے ہیں کہ چلتے چلتے اُن سے بات کرنے کو جی نہیں چاہتا ۔ چلتے چلتے تو کاروباری باتیں کی جاتی ہیں ۔ جن کے آگے ہمیں اپنا دل کھولنا ہو اُن سے اگرچہ ہم جی ہی جی میں ہر وقت ہمکلام ہوتے ہیں ، تاہم اُن سے سچ مچ مخاطب ہونے کا اسباب کرنے کے لیے فراغت کا انتظار کرتے رہتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ہاشمی علی کو چھٹی لکھے اسحٰق مرزا کو بعض اوقات مہینوں بیت جاتے ۔

" آخر تمہیں دقت کیا پیش آتی ہے ؟" ملاقات پر ہاشم علی اُس سے پوچھا کرتا ہے " بس کاغذ قلم لو اور لکھ دو "!

" تمھاری عربی میں لکھنا ہو تو بس لکھ دوں " وہ اسے ہنس کر بتاتا ہے " مگر اپنی زبان میں تو ہر جملے میں بیسیوں باتیں ٹھنس آتی ہیں ۔ کیا مجال ، ایک بھی واضح جملہ لکھ پائیں ؟ "

" ہاں بھئی ، شاید اسی لئے میں ہمیشہ اپنی بیگم کو چٹھی لکھنے سے رہ جاتا ہوں اور وہ چڑتی رہتی ہے "!

" ہمارے یہ نوبت نہیں آتی ہاشم ۔ میری بیوی سندھی میں اُردو لکھتی ہے اور میں اُردو میں سندھی ۔ اس لئے اپنی چٹھیوں میں ہم مشکل سے اتنا

ہی لکھ پاتے ہیں جتنی بات ہو۔" اسحٰق مرزا کو یہ بھی ڈر ہے کہ اپنی چٹھیوں میں بے معنی بات چیت کو روانہ رکھ کر وہ دونوں کہیں ترسیل کے ایسے دو چار نہ ہونے لگیں، مگر وہ سر جھٹک کر اپنی دلیل پر قائم رہتا ہے" اسی لئے تھوڑا اور غلط لکھنے کے باعث ہم ایک دوسرے کو پورا اور بالکل صحیح سمجھ جاتے ہیں۔

ہاشم علی کو اسحٰق مرزا کی اول فول بہت پسند ہے۔

" یار سعودی عرب میں عربی سُن سُن کر، اس کی تاب محسوس کر کر کے میرا بلڈ پریشر ہائی ہونے لگتا ہے اور —— جانتے ہو پھر میں کیا کرتا ہوں؟ کوئی گولی وولی کھانے کی بجائے تمھاری اول فول کا کوئی کیسٹ سننے لگتا ہوں۔

لو، ہاشم بھائی، میں نے اپنا کیسٹ آن کر دیا ہے۔

اسحٰق مرزا نے اپنی چٹھی میں ابھی تک بس یہی ایک جملہ لکھ رکھا ہے اور اس دوران یہ ساری باتیں اس کے ذہن میں ٹھنس آئی ہیں۔

اس نے قلم پکڑ کر چٹھی کو آگے بڑھانا چاہا ہے۔

ہمارے دیوانے ابا حضور سنایا کرتے ہیں کہ ان کی جوانی کے دنوں میں گھوڑوں کا ایک عربی سوداگر اُن کے ابا حضور کا بڑا گہرا دوست تھا اور ان سے اکثر ملنے آیا کرتا تھا، اور ہماری ماما کا یہ عالم تھا کہ عربی سوداگر کے منہ سے عربی سن سن کر فرطِ عقیدت سے اپنا سارا کام بھول کے بیٹھ جاتی۔ عربی میں اگر جب پوچھ رہا ہوتا کہ آج کھانے میں کیا پکا ہے تو وہ اپنا سر دُھن دُھن کر سبھوں کو بتا رہی ہوتی، اللہ پاک کی کسم، جے نیک بندہ اکسمانوں سے اتر کر آئے ہیں۔ ابّل تو بولے ہی نا ہیں، پر جو منہ کھولے ہیں تو منہ جانی پھر پھر اربی سُر پیچھ بولے جائے ہے —— ایک تم ہو ہاشم میاں، جس کا بلڈ پریشر اپنے عربی آقاؤں کو سن سن کر بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ انھیں شاید تمھارے کام کے تعلق سے اپنی پسندیدگی کا اظہار مطلوب ہوتا ہے مگر اپنے بڑھے ہوئے پارے میں تمھیں خواہ مخواہ لگتا ہے کہ وہ تمھارے کام میں کیڑے ڈال رہے ہیں —— ہاں، بھئی، ایک وہ اَن پڑھ ماما ہی کیوں، عالموں فاضلوں کو بھی اوروں کی باتیں ویسے ہی سنائی دیتی ہیں جیسے وہ سننا چاہتے ہیں۔ ہمارے ہائی کورٹ میں ایک عیسائی جج ہے۔ وکیلوں کی جرح میں کوئی ڈرامائی پہلو محسوس کر کے نامعلوم کیا کہنے کے لیے وہ پکار اٹھتا ہے —— اونو! —— مگر ہمارے وکلا حضرات کو گویا سنائی دیتا ہے —— اویس! —— اور وہ مسرت سے تمتماتے ہوئے اپنی آواز پر اور دھیان سے کان دھر لیتے ہیں —— تمھاری معیت

بھی دراصل یہی ہے۔ اپنے سوا تم کسی کو بھی سمجھنا ضروری خیال نہیں کرتے۔ نہیں، عربوں کو تو قطعاً نہیں —— میرا مطلب ہے، جب تک وہ تمھاری تنخواہ نہ روک لیں —— سمجھے؟ —— ارے بھئی، اگر تم واقعی مجھے سمجھ جاؤ تو مجھ سے محبت کرنے کی بجائے مجھ سے اپنا پیچھا چھڑاؤ۔ تمھیں معلوم نہیں، میں تمھیں پرلے درجے کا بے وقوف سمجھتا ہوں۔

اسحٰق مرزا مسکرا مسکرا کر سوچنے لگا ہے، بے وقوف ہی تو ہے۔ کہتا پھرتا ہے میں سب سالوں کو خوب سمجھتا ہوں، مگر ہے یہ، کہ اپنی اولاد کو بھی نہیں سمجھتا، اسی لیے تو شہزادی کہا کرتی تھی، نہیں چچا، ابا چچا تو میرے لیے اجنبی ہیں۔ بس دو چار روز کے لئے ہی آتے ہیں —— اسے میں کیسے بتاؤں، —— آگے بڑھ کر مجھے گلے لگانا چاہتے ہیں تو میں —— کیسے بتاؤں —— میں شرم سے لال ہو کر ان کی باہوں سے نکل جاتی ہوں، حالانکہ میں چاہتی ہوں کہ ان کے وجود سے چمٹ جاؤں۔ وہ میرے باپ ضرور ہیں مگر گھر میں ہوتے ہی نہیں، یا ہوتے ہیں تو میرے ساتھ کچھ اس طرح بیٹھتے ہی نہیں کہ مجھے سمجھ پائیں، یا میں اس قابل نہیں ہوں تو اسے آپ ہی سمجھ پائیں، بس رٹے رٹائے انداز میں کہہ دیتے ہیں، خوش رہو شہزادی۔ بولو، آئندہ سعودی عرب سے تمھارے لیے کیا لاؤں؟ —— نہیں چچا، مجھے تو لگتا ہے کہ ابا کوئی اور ہیں، آپ ہی میرے ابا ہیں! ——

اسحٰق مرزا پھر چٹھی کی طرف متوجہ ہو گیا ہے۔

ارے بے وقوف، کم سے کم اپنے بچّوں کے باپ تو بنو۔ صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ تمھارے بچّے بڑے ہو کر اگر اپنی پسند سے شادی کرنا چاہیں تو تمھاری طرف سے بے جا اعتراض نہ ہو۔ بیوی بچّوں کو بھی اپنے ساتھ وہیں لے جاؤ، یا پھر نہ لے جا سکو تو ان سے ملنے کے لئے یہاں بیشک نہ آؤ مگر ان سے ذہنی طور پر حد امت رہا کرو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہاں تم سات کمروں میں اکیلے کیا کرتے رہتے ہو۔ ساتوں میں بیک وقت ویسے ہی لیٹے بار بار پہلو بدلتے رہتے ہو؟ ارے نہیں، ایک نہیں، تم پوری سات تنہائیاں جی رہے ہو۔ بچّوں کو ماموں جان کی نگرانی میں چھوڑ کر تم نے اپنی دانست میں بڑا خاطر خواہ انتظام کر رکھا ہے: یہاں بچّوں کا تو خیال ہے کہ ان کے دادا جان اب ان کی نگرانی کے محتاج ہیں۔ امینوں کی حویلی اگر سچ مچ ملیح آباد میں ہوتی تو اُن جدی اور شناسا مقامات پر ماموں جان کے باپ دادا مرحومین بھی بھیڑیں ہانکنے کا کام بحسن وخوبی انجام دے لیتے اور لطف کا پہلو یہ ہے کہ ان بھیڑوں میں نہ صرف حویلی کے بچّے بلکہ تمھارے بڑے بھائی اور ان سے بھی معصوم ان سب کی بیویاں اور —— اور خود ماموں

جان بھی شامل ہوتے ، مگر ہاشم علی ، ہماری کراچی کا ملیح آباد تو ماموں جان کے گمان کی پتنگ ہی سے دِکھے تو دِکھتا ہے۔ کیا کیجئے ؟ —— ہر وقت کوئی گمان کی پتنگ پر تھوڑا ہی بیٹھا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی تو ہے کہ ماموں جان کا خاندانی شجرہ بھی چور اڑا لے گئے ہیں۔ ستم پر ستم یہ ، کہ چوروں نے ہمارے دیوانے ابّا حضور کی یاد داشت پر بھی ہاتھ صاف کر لیا ہے ، سو حکیم صاحب اور دیوانے مولوی صاحب چیختے رہ جائیں گے اور بھیڑوں نے ترنگ میں جدھر بھی سر اٹھا لیا ، ادھر ہی ہو لیں گی۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں ، چور اگر ماموں جان کے حسب و نسب کا شجرہ چھوڑ بھی جاتے تو مرحومین کراچی کے ان دیکھے جغرافیے میں بھیڑوں کو ہانک کر گھر کیسے لاتے ؟

ہہ ہہ — ہاہہ ہہ ! —— اسحٰق مرزا چٹھی لکھنا روک کر بے اختیار ہنسنے لگا ہے۔ ابھی چند ہی روز پہلے اس نے اخبار میں پڑھا تھا کہ کسی یورپی ملک میں ایک لڑکی نے کراؤن پر عدالتی دعویٰ ٹھونک دیا ہے۔ اسے اعتراض تھا کہ میری نوکری کی درخواست کے فارم میں باپ کا نام لکھنا کیوں لازمی ہے ، مجھ سے یہ توقع کیوں کی جاتی ہے کہ مجھے اپنے باپ کا نام معلوم ہو —— ہاں ، بتائیے ، کیوں ؟ —— اس کے باپ کا محترمہ کے اس کام سے کیا تعلق ، جسے کر کر کے اسے اپنی تنخواہ کمانا ہے ؟ —— ہہ ہہ ہا ! —— اسحٰق مرزا کو خواہش ہوئی ہے کہ وہ ذرا اپنے خاندان کے آگے کے شجرے کو ترتیب دے کر دیکھے —— میرا بڑا بیٹا تعلیم کے سلسلے میں امریکہ جائے گا۔ وہ اتنا کند ذہن تو نہیں کہ ہر وقت کتابوں پر سر جھکائے رکھے۔ شاید اسے اپنی یونیورسٹی کی کسی جونیئر لائبریرین سے عشق ہو جائے ، پھر خواہ ہم وہاں پہنچ پائیں خواہ نہ پہنچ پائیں ، ان کی شادی ہو جائے۔ شادی کے بعد وہ کتنی ہی پلاننگ کیوں نہ کریں ، ایک بچّہ تو ہوگا ہی ، وہ بڑا بھی ہوگا اور بڑا ہو کر شادی بھی کرے گا اور اس کا بچہ بھی پیدا ہو کر بڑا ہوگا اور نامعلوم اس کا کیا نام ہوگا —— کیوں صاحب زادے ، آپ کے دادا کون تھے ، کہاں تھے ، کیا تھے ؟ —— ساری ! — ویری ساری ! اس طرف میرا کبھی دھیان ہی نہیں گیا۔ مجھے تو اپنے باپ کا بھی گرفتہ سرنیم معلوم ہے کیونکہ وہ میرا سرنیم بھی ہے —— ساری ! —— لیجئے ، صاحب ، ہو لی حسب نسب کی پوری کہانی ! —— اصلیت یہ ہے کہ ہمارے رشتے حالیہ ہوتے ہیں ، بلکہ فوری ، مائی ڈیر ہاشم ، اور جیسے بھی بنے ، ہم صرف ابھی کو سنجیدگی سے بنھالتے ہیں —— اپنی سوچ سے گھبرا کر اسحٰق مرزا نے چٹھی کو ہاتھ میں لے لیا ہے۔

تم سے بات کرتے ہوئے مجھے اسی لیے خوشی ہوتی ہے ہاشم ، کہ مجھے اپنی بات کو سلیقے سے پیش نہیں کرنا ہوتا۔ جو کچھ بھی منہ میں آ جاتا ہے ، میں بے جھجک بولتا جاتا ہوں۔ میں بڑا خوش قسمت ہوں کہ مجھے تم جیسا دوست حاصل ہے۔ تم میری الٹی سیدھی باتیں اتنے غور سے سن رہے ہوتے ہو تو مجھے یقین ہونے لگتا ہے کہ میں بڑے کام کی باتیں کر رہا ہوں۔ شاید میں نے اپنی بات یہ کہنے کے لئے شروع کی تھی کہ زمان و مکان بدل جائیں تو قول و فعل کی تبدیلیاں ثانوی نہیں ہو جاتیں ، بدستور اوّلین اور بنیادی ہوتی ہیں اور انھیں قبول کئے بغیر بن نہیں پڑتی۔ مگر اس کا کیا کرو گے کہ لکھنؤ اور ملیح آباد سے چار پانچ دہے پیشتر ہجرت کر لینے کے باوصف ہم ابھی تک وہیں اقامت کئے ہوئے ہیں —— نہیں ، دوستم ، میں استعاراتی ہندسوں میں بات نہیں کر رہا ہوں۔ لو ایک دلچسپ قصّہ سنو۔ گزشتہ دنوں ابّا جان کے پرانے ملاقاتیوں میں سے ایک صاحب لکھنؤ سے تشریف لائے —— ارے نہیں بھئی ، یہاں کا لکھنؤ نہیں — دیکھو ، ہم نے کیا گڑبڑ جھالا پیدا کر رکھا ہے ! — ہندوستان کا لکھنؤ —— قیام کے پہلے ہی روز حضرت نے فرمایا ، سبحان اللہ ! لکھنؤ تو یہاں ہے ، اور ہم لکھنؤ سے چل کر اب کہیں لکھنؤ پہنچے ہیں۔ وہاں ہمیں پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ لکھنؤ سے آخر لکھنؤ کہاں چلا گیا —— میں نے عرض کیا ، مگر حضرت ، یہاں آپ کا گھر کہاں ہے ؟ —— پہلے تو وہ غوطہ کھا گئے مگر پھر سر اٹھا کر گویا ہوئے ، بھائی ، لکھنؤ کا دم تو لکھنؤ کے اہتمام سے ہے۔ ہمارے یہاں تو پنجابیوں اور سندھیوں نے لکھنؤ کو اپنے بھنگڑے ڈھول کی تھاپ پر اتنا بے سُرا کر دیا ہے کہ ذری آ کے دیکھیے اور پہچانیے ، یہ لکھنؤ ہی ہے یا لدھیانہ ؟ — اور اگر لدھیانہ ہی ہے تو ہم کہاں کے لکھنوی ، صاحب زادے ؟ ہمیں اسی نئے دور میں لدھیانوی کہیے۔ لکھنوی تو آپ ہیں جو خاص لکھنؤ میں مقیم ہیں۔

کیوں ، بھائی ہاشم ، اب جائزہ ہوا کہ سندھی حضرات ہمیں دیکھ کر ناک بھوں کیوں چڑھاتے ہیں —— ہاں بھئی ، اور کیا ؟ ہمارے لکھنوی اہتمام کی بدولت اہل لکھنؤ کو تو یہاں پہنچ کر اپنا گمشدہ لکھنؤ مل جاتا ہے ، مگر مقامی لوگ اپنے شہر کا سراغ کہاں سے پائیں ؟ غضب خدا کا ، ان کا شہر تو عین اپنے مقام پر کھڑے کھڑے غائب ہو گیا — کیوں اور کہاں غائب ہو گیا ؟ —— بولو ، تمہاری کرشمہ گری سے انھیں اچنبھا بھی نہ ہو ؟ — اور اچنبھے کی حالت میں وہ غلط اور صحیح کی تمیز کھو بیٹھیں تو اچنبھا کیسا ؟

[باقی آئندہ]



## عشرت دھولپوری

میں کھو گیا تھا اپنی ہی سانسوں کی بن میں
کچھ سانپ پل رہے تھے مری آستین میں

جب لفظ بے زبان تھے موسم بھی خشک تھا
فصلیں اگائیں ہم نے غزل کی زمین میں

یوں تو وہ ساری بارہ دری تھی کھلی ہوئی
پردے لٹک رہے تھے مگر شہ نشین میں

میری سپاہ مجھ سے بھی آگے نکل گئی
بیٹھا رہا میں اپنی شرافت کی زین میں

مٹھی میں لے کے چاند کو پلکوں میں بھر لیا
اب دیکھتا ہوں داغ اسی کی جبین میں

عشرت غزل سنائی ہے جس کی پسند کی
وہ تو نظر نہ آیا کہیں سامعین میں

● ۱۷۱/ک، مالویہ نگر، جے پور (راجستھان)



## اسرار اکبر آبادی

جسم و جاں میں خوشبوئیں مہکیں، چمن دھانی ہوا
دل کا موسم آپ کے آنے سے رومانی ہوا

کھل گئی ہیں ہر طرف ارض و سما کی کھڑکیاں
اُن کی محفل میں کوئی پھر آج عرفانی ہوا

خوب ہے تشنہ دلوں کی حسرتوں کا یہ جمال
ڈوب کر اس جھیل میں سنگِ انا پانی ہوا

عیش و عشرت کے مناظر دل میں ابھرے تھے فزوں
درد لیکن بڑھتے بڑھتے بادِ طوفانی ہوا

نازِ بے جا سے دلوں میں فاصلہ باقی رہا
یہ تمہارا "میں" ہمارا دشمنِ جانی ہوا

رشتۂ آدم تو ہے اسرار ہر سو ضو فشاں
کیا ہوا گر کوئی ہندی کوئی ایرانی ہوا

● ۱۸/۳۲۷ منٹولہ، آگرہ-۳۔۲۸۲۰۰ (یوپی)



## ف س اعجاز

ہر سحر چہرۂ بیمار کی ضمنی سُرخی
کھا گئی ہے مجھے اخبار کی ضمنی سُرخی

اسی دیوار کا اعلان ہے میرا دشمن
اور میں بھی اسی دیوار کی ضمنی سُرخی

شوقِ افکار کی رسوائی کا چڑھتا بھاؤ
عشق افواہ کے بازار کی ضمنی سُرخی

آنے والے کسی طوفاں کا پتہ ہے شاید
قتل کے بعد یہ تلوار کی ضمنی سُرخی

دھوپ اک لمحۂ روشن کی حقیقت کی بھی
میرا سایہ تری دیوار کی ضمنی سُرخی

دل پُرخوں کی گلابی کا چھلکنا توبہ
تہہ ہے چشمِ نشہ بار کی ضمنی سُرخی

● ۶-۱ اے، کنائی سیل اسٹریٹ کلکتہ-۷۳




ندا فاضلی

۱۰۲، امراپارٹمنٹ، ڈانڈپاڑہ - ۱، کھار (ویسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۵۲


# دیواروں کے بیچ

قسط نمبر - ۱۰

ندا نے گوالیار کے دی جی ہائی اسکول سے میٹرک بورڈ کا امتحان دیا ہے۔ رزلٹ آنے میں ابھی دیر ہے۔ کامیابی کی امید اپنی ذات سے کم اللہ کی ذات سے زیادہ ہے۔ امتحان سے چند دن پہلے ہی ماں کی مسلسل ناراضگی کی وجہ سے، کتابوں سے شناسائی پیدا کی گئی تھی لیکن کتابیں کئی مہینوں کی بے توجہی سے خفا، آسانی سے ہم کلام نہیں ہوتیں۔ ہر سال امتحان سے ایک دو مہینے پہلے اسکولوں کے پرانے استاد ہر موضوع پر متوقع سوالات پر مشتمل کئی پرچے تیار کرتے ہیں اور ان کے جوابات تیار کرتے ہیں اور ان کے جوابات کتابچوں کی صورت میں شائع کر کے پیسہ کماتے ہیں ـــ اپنی ناراض کتابوں کو سلیقے سے منانے کے بجائے ندا بھی اسی قسم کی کنجیوں سے امتحان کے تالے کھولنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک پیپر اور دوسرے پیپر کے درمیان دو تین دن کا وقفہ ہوتا ہے۔ رات رات بھر جاگ کر بنا سوچے سمجھے منتخب سوالات کے جوابات حرف بہ حرف رٹ لیے جاتے ہیں۔ اور ویسے ہی اشاعتی غلطیوں کے ساتھ، صحیح صحیح امتحان کی کاپیوں پر اتار دیے جاتے ہیں۔ امتحان کی صبح جمیل فاطمہ ایک کٹوری دہی کھلاتی ہیں اور محلے کے تازیے سے اتارا ہوا کلاوا گلے میں ڈال کر، خدا کی امان میں رخصت کر کے مطمئن ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنی ہر مشکل کو خدا کو سونپنے کی عادی ہیں۔ خدا سے ان کے تعلقات، ان کی رات دن کی نمازوں کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی اچھے ہیں، وہ کہتی ہیں دن کے چوبیس گھنٹوں میں ایک پل ایسا بھی آتا ہے جب خدا دوسرے کاموں سے فرصت پا کر باب دعا کھولتا ہے اور اس وقت مرادیں اور آرزوئیں، اندر داخل ہو کر قرب ربانی سے فیض یاب ہوتی ہیں۔ اس نیک ساعت مانگنے والا جو مانگتا ہے وہ اسے مل جاتا ہے۔ جمیل فاطمہ چوبیس گھنٹوں میں اس ایک پل (جس کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے) کی تلاش میں کئی دنوں سونے اور جاگنے کے فرق کو بھولے رہتی ہیں۔ یہ سلسلہ امتحان کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور رزلٹ کے دن تک لگاتار جاری رہتا ہے۔ بڑی مشکل سے وہ لمحہ آتا ہے اور وہ خدا سے اخبار میں کامیاب طلبا کی فہرست میں ندا کا رول نمبر بھی شامل کروا دیتی ہیں۔ اس فہرست میں نمبر کافی دیر میں شامل ہوتا ہے۔ فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس کے کالم بھر چکے ہوتے ہیں، تھرڈ کلاس میں جہاں جگہ ملتی ہے وہیں ندا کا نمبر لگا دیا جاتا ہے۔

پڑھائی لکھائی سے ندا کی بے توجہی اور باہر کی مسلسل شکایتوں نے انھیں زیادہ فکرمند کر دیا ہے۔ دوسرے بچے سیدھے راستے میں خراماں خراماں طے شدہ کامیابیوں کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں۔ لیکن ندا کا دکھ ان کی ہر خوشی کو بے سکون کیے ہوئے ہے۔ اس بے سکونی نے ان کی عبادت میں شدت پیدا کر دی ہے۔ نتیجہ کا اخبار منہ اندھیرے بڑا بھائی باہر سے لاتا ہے اور ندا کے رول نمبر پر نشان لگا کر جا نماز پر تسبیح پڑھتی ہوئی جمیل فاطمہ کے آگے رکھ دیتا ہے۔ وہ اخبار دیکھتی ہیں وہ فوراً سجدہ میں گر کر رونا شروع کر دیتی ہیں۔ وہ خدا کے ہر احسان کا قرضہ آنسوؤں کی صورت میں چکاتی ہیں وہ ہر خوشی کو آنسوؤں سے پاک صاف کر کے قبول کرتی ہیں۔ سجدہ سے اٹھ کر وہ ندا کو کھینچ کر چپٹا لیتی ہیں اور دیر تک منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر اس پر پھونکتی رہتی ہیں۔ ندا کی بے اعتدالیوں کے لیے وہ اسے موردِ الزام ٹھہرانے کے بجائے خود کو خطاوار سمجھتی ہیں، اور انھیں خدا کے ساتھ اپنی نافرمانی کی سزا مانتی ہیں۔

وکٹوریہ کالج میں سائنس کے شعبہ میں ندا کا داخلہ ہو جاتا ہے ـــ سائنس کا انتخاب جمیل فاطمہ کا ہے وہ ندا کے لیے ڈاکٹری کا خواب محفوظ کیے ہوئے ہیں۔ ان کا ہر کام پہلے سے طے شدہ پلان کے مطابق ہوتا ہے ہر بچے کی تعلیم اور پیسہ کا تعین ہو چکا ہے یہ اور بات ہے کہ ان کے منصوبوں میں خدا مداخلت کر کے ان کی خواہشات کو مجروح کرتا رہتا ہے۔ لیکن یہ دخل اندازی خدا اور ماں کے رشتے کو کمزور نہیں کرتی بلکہ پہلے سے زیادہ مستحکم

کر دیتی ہے۔ دکھ ہو یا سکھ دونوں اس کے وجود کے ثبوت ہیں۔ دکھ دے کر وہ خوشی کے خواب دکھاتا ہے اور خوشی دے کر وہ آنے والے غم سے ڈراتا ہے۔

سائنس میں ندا کا داخلہ اس کی مرضی کے خلاف ہوتا ہے۔ باپ کے شعری جراثیم اس میں نمایاں ہونے لگے ہیں جس کا ثبوت دو سال بعد ایف ایس سی کے نتیجہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ماسٹر ریاض پہلے بھی اصلاح کر رہے ہیں اور ندا نئی ڈائری کے صفحات کالے کر رہی ہے۔ مقامی نشستوں میں شرکت پابندی سے جاری ہے۔ دو سال اسی طرح ضائع کرنے کے بعد مجبوراً شعبہ بدلا جاتا ہے۔ اور پھر سے فرسٹ ایئر آرٹس سے پڑھائی شروع ہوتی ہے۔ کالج کا نام اس دوران وکٹوریہ سے مہارانی لکشمی بائی ہو جاتا ہے۔ پہلے انگریز ملکہ کے نام سے منسوب تھا اور اب جھانسی رانی کے نام سے وابستہ ہے۔ عوام ناموں کی اس تبدیلی کو آزادی کی نعمت سمجھتے ہیں۔ مدھیہ بھارت کے وجود میں آنے کے بعد کالج کا الحاق آگرہ سے ٹوٹ کر وکرم یونیورسٹی اجین سے ہو گیا ہے آزادی نے عمارتوں کے نام اور تعلیمی اداروں کے رشتے ہی نہیں بدلے زبانوں کو بھی نئے مذہب عطا کیے ہیں، فورٹ ولیم کالج میں زبانوں کی تقسیم کی جو سیاست شروع ہوئی تھی، اسے آزاد ہند کی پہلی پارلیمان میں راجندر پرشاد نے اپنے اختیاری ووٹ سے ہمیشہ کے لیے دستور کا حصہ بنا دیا۔ گاندھی کی ہندوستانی کو دو زبانوں میں تقسیم کر کے اردو کو زبردستی مسلمان اور ہندی کو ہندو بنا دیا جاتا ہے۔

مہارانی لکشمی بائی کالج میں اردو ایک مضمون کے طور پر ضرور ہے۔ لیکن پورے اردو شعبہ میں صرف ایک ہی استاد سے کام چلایا جا رہا ہے اور وہ بھی طلباء کی پڑھائی سے زیادہ کالج میں اردو پڑھنے والوں کی تعداد پر توجہ دیتے ہیں۔ اردو پڑھنے والوں کی کمی ہر سال اردو کے استاد کی روٹی روزی کے لیے خطرہ بنی رہتی ہے۔ وہ داخلہ کے وقت خود گھر گھر جا کر اردو اور اسلام کے دیرینہ رشتے کی ضرورت کو دہراتے ہیں اور اس طرح والدین کو راہ راست پر لاتے ہیں اور یوں طالب علموں کی تعداد بڑھاتے ہیں۔ کالج میں نصاب کی کتابیں منگوانے اور انھیں جیسے تیسے پڑھانے کے علاوہ یہ مشقت بھی ان کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ قانوناً ہر کلاس میں پانچ طلباء کا ہونا ضروری ہے۔ اردو کے استاد عام طور سے ادیب یا شاعر ہوتے ہیں۔ رضی صاحب کو بھی شعر گوئی کا شوق ہے اور وہ بھی عام روایت کے مطابق شہر میں کسی دوسرے کو اس فن میں ہم پلہ نہیں سمجھتے۔ نصاب کے شعراء تفہیم میں اپنے شعر بھی اپنا نام لے کر سناتے جاتے ہیں۔ اپنا نام لیتے وقت اپنے مرتبہ اور مقام کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ غالب کا شعر سمجھاتے ہوئے کہتے ہیں غالبؔ کہتا ہے کہ، لیکن جب کسی دلیل کے ثبوت میں اپنا شعر دہراتے ہیں تو شعر سے پہلے جناب رضی فرماتے ہیں ضرور کہتے ہیں۔ میر و غالب کے اشعار خاموشی سے سن لیے جاتے ہیں لیکن جب ان کے شعروں کے ساتھ بھی یہی سنجیدگی برتی جاتی ہے تو وہ اسے غیر سنجیدگی سمجھ کر ڈانٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ تم لوگوں کا پڑھائی میں دھیان ہی نہیں ہے۔ والدین کے پیسے اور اپنا وقت یونہی برباد کر رہے ہو۔ لڑکے جب اس ڈانٹ پھٹکار سے شرمندہ ہو کر متوجہ ہوتے ہیں تو وہ نثر میں کہی ہوئی باتوں کو دوبارہ کسی شعر کی صورت میں بیان کرتے ہیں۔ مثلاً

علم دنیا میں خدا کی دین ہے اسلام کو
علم سے روشن کرو یاد خدا کے نام کو

یہ اور بات ہے یہ شعر بھی انھیں کے کہے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کے اشعار کبھی پرانے نہیں ہوتے۔ وہ بار بار کے سنائے ہوئے اشعار جب بھی پڑھائی کے دوران سناتے ہیں تو ادائیگی میں چہرے کے اتار چڑھاؤ اس طرح شامل کر لیتے ہیں کہ پرانے شعر بھی نئے محسوس ہوتے ہیں۔ وہ جس محنت سے کہتے ہیں اسی طرح سناتے بھی ہیں۔

رضی صاحب جن کا پورا نام رضی الدین ہے بدایوں کے رہنے والے ہیں۔ جامعہ کے اردو امتحانات پاس کر کے لکچرار ہوئے ہیں۔ لباس کو وہ سماجی ضرورت کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ انفرادی طور پر وہ صفائی دھلائی پر وقت ضائع نہیں کرتے۔ ایک شیروانی ہے جس کا اصلی رنگ کئی چڑھتے اترتے موسموں کے پردوں میں مہینوں سے ایک راز ہے — یہ رازدار شیروانی ان کے ہر راز کو آشکار کرتی رہتی ہے۔ اس پر روز بنتے بگڑتے نقش و نگار، ان کے کھانے پینے کی اطلاع دوسروں کو دیتی رہتی ہے۔ کلاس کا ایک لڑکا انھیں نشانات کے ذریعہ، ان سے دو بار شرط جیت چکا ہے۔ اور اس جیت کے عوض پوری کلاس ان سے دہی جلیبی کھا چکی ہے۔ کالج آتے وقت، وہ کس دن کس دوکان سے کیا کھا کے آتے ہیں، اس اطلاع کی فراہمی میں ان کا ملگجا کاٹ پائجامہ بھی شیروانی کا مسلسل ساتھ نبھاتا ہے رضی صاحب گوالیار میں اکیلے ہیں۔ بیوی اللہ کو پیاری ہو گئی ہے۔ یوپی کے کسی شہر میں ایک بیاہتا لڑکی ہے جو کبھی کبھار خط لکھ کر ان کی خیریت معلوم کر لیتی ہے —

یہ خط وہ اپنے کسی بچے کی پیدائش یا کسی بچے کی تقریب پر لکھتی ہے رضی صاحب جواباً چھوٹا بڑا رقم کا منی آرڈر بھیج کر اپنی خیریت سے مطلع کرتے ہیں۔ بیوی کی ایک بڑی سی تصویر اپنے سرہانے لگائے ہوئے ہیں۔ جب لڑکی کا خط آتا ہے، تو خود پڑھ کر اس تصویر کو بھی نفس مضمون سے آگاہ کرتے ہیں۔ ادراسی سے مشورہ کرکے، اپنی محنت کی کمائی میں سے، کچھ خرچ کرنے پر راضی ہوتے ہیں۔ خورجہ والا ان میں ایک کمرہ کرائے پر لیے ہوئے ہیں۔ ماسٹر ریاض بھی یہیں رہتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے۔ اس اختلاف کی وجہ کالج کی لکچررشپ ہے جس پر ماسٹر ریاض کی ۱۹۳۶ کی ایم اے کی ڈگری ہوتے ہوئے بھی رضی صاحب کا تقرر ہوا ہے۔ ماسٹر ریاض اس تقرر کو اپنے حق میں ناانصافی سمجھتے ہیں۔ اور رضی صاحب کو اس کا مجرم ٹھہراتے ہیں۔ ماسٹر ریاض کے ہم نوا اس ناانصافی کو دیس پردیس کا مسئلہ بناکر ریاض صاحب کی شعری اور تعلیمی صلاحیتوں کے گن گاتے ہیں اور رضی صاحب کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ایک نشست میں ماسٹر ریاض کے ایک پرانے شاگرد، رضی صاحب ہی کے سامنے ان کی غزل میں زبان و بیان کی کمزوریوں کی نشان دہی کر بیٹھتے ہیں۔ رضی صاحب اپنے دفاع میں دلیلیں دیتے ہیں لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کوئی نہیں سنتا۔ ماسٹر ریاض نے انھیں نیچا دکھانے کے لیے یہ محفل سجائی تھی۔ رضی صاحب نے اس دن سے، مشاعروں نشستوں میں آنا جانا چھوڑ دیا ہے۔ اس دل شکستگی میں انھوں نے اپنے کمرے کے قریب کی مسجد میں نماز پڑھنا بھی ترک کر دیا ہے۔ بزرگوں کے اختلاف نے کالج کے لڑکوں کو بھی دو گروپ میں بانٹ دیا ہے۔

یہ دونوں کی باتوں کو ادھر سے ادھر پہنچانے اور سرد ہوتی آگ کو بھڑکانے کا رول ادا کرتے ہیں۔ کالج کے نئے سال میں، اسی آپسی اختلاف کی وجہ سے، طلبا کی تعداد پہلے جیسی نہیں ہوتی۔ پہلے رضی صاحب والدین کو سمجھا کر مطلوبہ تعداد کو مکمل کر لیتے تھے مگر اب وہ شہر میں کہیں آنے جانے کے بجائے، درگاہوں میں زیادہ وقت گذارتے ہیں۔ سرکار کی طرف سے انھیں نوٹس ملتا ہے۔ اس نوٹس کے مطابق ان کا ٹرانسفر ایک ہائی اسکول میں کر دیا جاتا ہے۔ جسے یہ قبول نہیں کرتے اور استعفیٰ دے کر ہمیشہ کے لیے کہیں چلے جاتے ہیں ان کی رخصت کے ساتھ ہی کالج میں اردو شعبہ ختم ہو جاتا ہے۔

بی اے کے پہلے سال میں ندا کو مجبوراً اردو کے بدلے ہندی لینی پڑتی ہے۔ اس کا خالی وقت لائبریری میں گذرتا ہے۔ لائبریری میں بھی ان کتابوں کے ساتھ جن کا تعلق شاعری سے ہے۔ یہ شاعری کی کتابیں داغ ان کے معاصرین اور ان کے شاگردوں تک محدود ہیں۔ زبان کے چٹخارے کے ساتھ، سیدھی شوخ باتیں اچھی لگی ہیں۔ اسے ان شاعروں کے بہت سے شعر یاد ہو گئے ہیں جنھیں وہ اکثر کالج کے دوستوں کو سناتا رہتا ہے ان شعروں کی وجہ سے لڑکوں پر اس کا اچھا خاصہ رعب جم چکا ہے۔ ان شعروں کو سن کر، لڑکے اپنی کاپیوں میں نوٹ کر لیتے ہیں اور اپنے کچے پکے معاشقوں میں ان کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ شعر سننے سنانے میں بہت لطف دیتے ہیں، مگر ان کی اجتماعی لے انفرادی جذبوں کا ساتھ نہیں دے پاتی۔ اس کا احساس ندا کو کالج کی ایک لڑکی مس ٹنڈن کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ مس ٹنڈن سے ندا کی واقفیت صرف اتنی ہے کہ وہ انگریزی کے پروفیسر کی بڑی لڑکی ہے۔ وہ روز کالج کے راستے میں ایک مندر کے سامنے آتی ہے سائیکل کھڑی کرکے پہلے وہ مندر کی چوکھٹ چھوتی ہے اور پھر گھنٹی بجا کر ہاتھ جوڑتی ہے۔ خالی پیریڈ میں وہ الگ تھلگ باغ میں پیپل کے نیچے کوئی رسالہ یا کتاب پڑھتی رہتی ہے۔ انگریزی اور ہندی کے پیریڈس میں، وہ اور ندا ایک ہی روم میں ہوتے ہیں۔ وہ ہر پیریڈ میں ندا کی نشست سے مختلف زاویوں میں بیٹھتی ہے۔ ہندی کلاس میں یہ زاویہ ۴۵ کا ہوتا ہے اور انگریزی میں دو کرسیوں پیچھے ٹھیک نوے (۹۰) کا اینگل بنتا ہے۔ اس کی کمر کا ایک حصہ اونچے بلاوز اور ناف سے نیچے بندھی ساڑی کے درمیان آئینے کی طرح چمکتا ہے۔ اس کے ہلنے جلنے سے اس آئینے میں سلوٹیں سی ابھرتی ڈوبتی ہیں۔ وہ جس دن جو ساڑی اور بلاؤز پہن کر آتی ہے، وہی اس دن کے موسم کے مزاج کے مطابق ہوتے ہیں۔ اس کا انتخاب فطرت کے نظام میں مداخلت کرنے کا قائل نہیں ہے۔ اس کی یہی سلیقہ مندی ندا کو متوجہ کیے ہوئے ہے۔ وہ کالج کے باغ میں باغ ہی کا حصہ محسوس ہوتی ہے، سڑک پر چلتے ہوئے، سڑک کی کمی کو پورا کرتی دکھائی دیتی ہے۔ [باقی آئندہ]



## رونق شہری

ہُنر کو لمس معانی سے میں گلاب کروں
ہیں لفظ اپنے سبھی کس کا انتخاب کروں

جو چپ رہوں تو تعلق پہ بوجھ بن جاؤں
کہوں تو جرم کا جیسے میں انتخاب کروں

خراشیں ڈال کے چہرے پہ جا رہا ہے وقت
پلٹ کے دیکھے وہ مجھ کو تو احتساب کروں

عذاب جھیلتے رہنا ہے میرا مستحق
یہ کارِ خیر نہ کیوں صورتِ ثواب کروں

دہکتی آگ سے بچنے کا یہ نہیں مطلب
جدھر بھی جاؤں اُدھر سایۂ سحاب کروں

تو جل کے بجھ گیا کیسے مرے لہو کے چراغ
بیاضِ درد تیرے نام انتساب کروں

عجیب نشۂ سیرت ہے اس کی آنکھوں میں
کبھی وہ مجھ کو دے موقع تو لاجواب کروں

● گولا گھر، جھریا دھنباد (بہار)



## محسن جلگانوی

تمام مرحلۂ فرد و ذات ہونا ہے !
صلیب چڑھنے سے پہلے صلیب ڈھونا ہے

ہزار بار یزیدوں سے سامنا ہوگا
ہزار بار مجھے یونہی قتل ہونا ہے

سلگتی آگ کے جنگل کا اک شجر ہوں میں
مرا وجود یقیناً شراب ہونا ہے

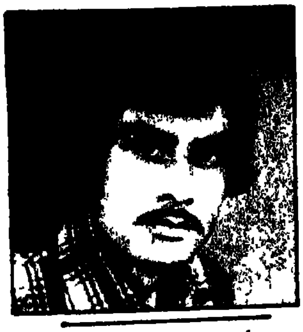
نہ بھیگی پلکوں سے ایسے وداع کر مجھ کو
لہو لہو مجھے تیرا فراق ہونا ہے

مرے مکان کی رونق ترے وجود سے ہے
ترا وجود مری ذات سے سلونا ہے

ہمارے لوگ اسیرانِ شعبدہ بازی
ہمارے شہر میں دانشوری کا رونا ہے

یہ جنسِ جاں کہ ابھی رائیگاں نہیں محسن
کرید پاؤ تو مٹی تمام سونا ہے

● ۱/۲۷۵ ریلوے کوارٹرس، نارتھ لالہ گوڑا، سکندر آباد - ۵۰۰۰۱۷



## رئیس الدین رئیس

دشتِ امکاں ہے شب تابی سب
ظلمت افزا ہے مہرتابی سب

کون ارجن حریف تھا میرا
وار بیکار تھے جوابی سب

دیو مالائی سوچ کے منظر
ذہن بیمار کی خرابی سب

زرد رُت شاخ شاخ سوئی ہوئی
پھول گلدان میں گلابی سب

آگ اُگلے گا ریت کا دریا
پاؤں ہو جائیں گے حبابی سب

خفت و بیدار کائنات خدا
آسماں صرف نیم خوابی سب

مطمئن کیا ہوئیں رئیس آنکھیں
دل سے کافور اضطرابی سب

● ۱۰/۱۲۲۵ دہلی گیٹ، علی گڑھ - ۲۰۰۱ ۲



شیخ سلیم احمد

١٥٠۔ بستی نظام الدین، نئی دہلی - ١١٠٠١٣

# اَدبُ نامَہ

لفظ دانشور ہمیں ہمیشہ ہی سے اپنی طرف کھینچتا رہا ہے۔ اس وقت سے جب ہم اس کے معنی بھی نہیں جانتے تھے۔ معنی جاننے لگے تو مزید دلکشی بڑھ گئی۔ دانشور۔ دانشوری۔ دانش۔ کیا نغمگی ہے! کیا حسن ہے! اور معنی ومفہوم کی کتنی تہوں میں لپٹے ہوئے ہیں یہ الفاظ! قریب کی دوزبانوں میں لفظ دانشور کے جوڑی دار ملاحظہ فرمایئے —— انٹلیکچول۔ بدھی جیوی۔ ان لفظوں میں مولوی مدن کی سی وہ بات کہاں جو دانشور میں ہے۔ ہم ہر حسین شے سے رشتہ جوڑنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں (عورتیں ہی حسین نہیں ہوتیں) اس لفظ سے بھی دوستی قائم کی اور عمر بھر شرمندہ سے رہے (مجرم ضمیری شاید اسی کو کہتے ہیں) کبھی سر اٹھا کر نہ چل سکے کہ دانشوری کے بار امانت سے دبے تھے۔

ایک لڑکی ہمارے پاس آئی جسے یونیورسٹی میں لکچرشپ کا تھا۔ گویا ہوئی (غنچہ کھلا) ہمیں تھیسس لکھا دیجئے، ملازمت مل جائے گی۔ ہم نے حیران ہوکر جواب دیا۔ بی بی یہ کام تو خود ہی کرنا پڑتا ہے، ہاں تمھاری مدد یا ضرور کرسکتا ہوں۔ یہ یہ کتابیں پڑھ لو۔ فلاں فلاں لائبریری چلی جاؤ۔ اس طرح خاکہ بنالو...... ہم ابھی اپنی ہدایات پوری بھی نہیں کرپائے تھے کہ محترمہ بیچ ہی میں اٹھلا کر بولیں۔ یہ کام تو مشکل ہے۔ آج کل تو پروفیسر صاحبان خود ہی تھیسس لکھا دیتے ہیں۔ میں مزید حیران ہوا۔ (حیرانی پریشانی اپنا مقدر ہے) اس نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ہاں! کیا آپ کو معلوم نہیں؟ یہ کاروبار تو بہت دنوں سے چل رہا ہے۔ بس ذرا گھر کا کام کاج کردیا۔ بچوں کو پڑھا دیا۔ ان کو اسکول لے گئے۔ بیوی کو شاپنگ کرادی (اپنے پاس سے) پروفیسر کے ساتھ سیمنار اور کانفرنس میں شرکت کے لیے چلے گئے (ان کا بیگ لے کر) کبھی کبھی موصوف کو مقالہ لکھنے میں مدد کردی یا لکھ دیا۔ پروفیسر پر کوئی حملہ ہو تو اس کا منہ توڑ جواب دینا ہوتا ہے۔ رسائل وجرائد میں دفاع کے لیے خود خطوط لکھنے پڑتے ہیں اور لکھانے پڑتے ہیں۔ کبھی کبھی غنیم پر حفظ ماتقدم کے طور پر خود بھی حملہ آور ہونا پڑتا ہے اس وقت ریسرچ اسکالرس کی سخت ضرورت پڑتی ہے۔ یہ ہلکے پھلکے کام کرنے کے بعد پی ایچ ڈی کی ڈگری مل جاتی ہے اور ہاں اگر مجھ جیسی کوئی لڑکی امیدوار ہو تو کام اور بھی آسان ہوجاتا ہے۔ لڑکی کا تو املا بھی درست نہ ہو تو پروفیسر خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر دے دیتا ہے۔ بعض کے یہاں لین دین بھی چلتا ہے۔ یہ سب سن کر ہماری حیرانی، پریشانی میں تبدیل ہورہی تھی۔ ہم نے کہا۔ محترمہ! اگر آپ کو یہ باتیں معلوم ہیں تو کسی پروفیسر سے معاملہ کرلیا ہوتا۔ میری پاس کیوں آئی ہیں؟ نہایت معصومیت سے جواب دیا۔ میرے استاد محترم ان دنوں ایک بین الاقوامی سیمنار میں مصروف ہیں۔ جس سیمنار میں بھی وہ شرکت کرتے ہیں، وہ بین الاقوامی ہوجاتا ہے۔ بہت اچھے آدمی ہیں، زندہ دل۔ دل پھینک۔ بہت سوں کو پی ایچ ڈی کرا چکے ہیں یعنی عطا کرچکے ہیں۔ ان کے کرائے پی ایچ ڈی بلند مناصب پر فائز ہیں۔ آپ کے پاس تو اس لیے آنا پڑا کہ آپ ذرا فالتو...... میرا مطلب ہے کہ آپ کو شاید فرصت ہو اور پھر آپ دانشور بھی مشہور ہیں.....

دانشوری کی سوغات کا یہ ایک نمونہ تھا۔ ہم نے میڈم سے معذرت کرلی اور وہ مایوس و ناکام واپس بھی چلی گئیں۔ مگر ہمیں مدتوں اپنی اس حرکت پر افسوس رہا کیونکہ لڑکی بلا کی حسین تھی۔

ایک مرتبہ ایک دوست پروفیسر صاحب سے اپنے رسالہ کے لیے ایک مضمون لکھانے کی ضرورت پیش آئی۔ بہت دنوں تک تقاضا کرتا رہا۔ کوئی نہ کوئی بہانہ بناتے رہے۔ میں نے جب بہت تنگ کیا تو بولے: یار دیکھو یونیورسٹی بند ہے اور میرے پاس آج کل کوئی ریسرچ اسکالر بھی نہیں ہے۔ اس کے بعد ہم نے ان سے تقاضا کرنا چھوڑ دیا۔

فقیروں کا بھیس ہو یا دانشوروں کا لبادہ، تماشائے اہل کرم ہزار رنگ میں جلوہ گر نظر آتا ہے اور تماش بینی جس کی خو بن جائے اس کے لطف

کا کیا ٹھکانا۔ ہم اپنے چاروں طرف جلووں کو بکھرا پاتے ہیں۔ ان سے لطف اٹھانا ہماری ہابی ہے۔

ہمارے ایک دیرینہ دوست ہیں۔ ایک دن ہانپتے کانپتے گھر پر تشریف لائے۔ عام طور پر وہ بغیر ہانپے کانپے ہی آیا کرتے ہیں۔ اس مرتبہ سبب یہ تھا کہ ایک درجن کتابیں (زیادہ ہی ہوں گی) ان کے ساتھ بندھی تھیں۔ بھاری بھرکم تو تھے ہی (جسمانی طور پر) ان کتابوں کا غبار بھی ان کے دماغ میں بھرا تھا۔ ہم نے پوچھا ماجرا کیا ہے۔ ذرا دم لے کر بولے۔ آج کل یہ سب کرنا پڑتا ہے۔ ابھی تک تو نہیں کیا تھا۔ اب مجبور ہو گیا ہوں۔ لوگ اپنے یادگاری مجلّے نکال رہے ہیں۔ جشن آراستہ کرا رہے ہیں۔ میں بھی دکھا دوں گا۔ ہم زیر لب مسکرائے اور پوچھا کہ کیا کرنا پڑتا ہے۔ کیا دکھا دو گے۔ بولے۔ میں بھی ادب میں مقام رکھتا ہوں۔ یہ تو آپ جانتے ہیں۔ لیکن یہ تنقید نگار اور دانشور مجھے نظر انداز کر رہے ہیں۔ ادب میں میرا کیا مقام ہے یہ انھیں دکھا دوں گا۔ میں نے ایک ایڈیٹر کو تیار کر لیا ہے (آہ! بیچارے دوست کو کیا کیا کرنا پڑا ہوگا) وہ میرے بارے میں اپنے رسالہ کا خصوصی نمبر شائع کر رہا ہے۔ اس عظیم کارنامے پر میں نے اپنے دوست کو مبارکباد دی۔ وہ بولے۔ اب آپ کی دوستی کا امتحان ہے۔ شاہجہاں نے سنگتراش کے ہاتھ کٹوا دیے تھے۔ جس نے تاج محل تعمیر کیا تھا۔ مجھ پر مضمون لکھ کر بس قلم توڑ دینا۔ تمھاری مضمون نگاری کے بڑے چرچے ہیں۔ یہ کہہ کر جب وہ چلنے لگے تو میں نے کہا، کہاں چلے۔ بولے جب تک یہ کام پورا نہ کر لوں۔ چین کہاں۔ یہ کتابیں اوروں تک بھی پہنچانی ہیں۔ پھر جلسہ کی تیاری بھی کرنی ہے جس میں رسالہ کا اجرا عمل میں آئے گا۔

دوستوں کی باتیں ہو رہی ہیں تو ایک اور دوست کا ماجرا بھی سن لیجیے وہ خوش قسمتی (دوسروں کی بد قسمتی) سے شاعر ہیں۔ یکے بعد دیگرے کئی دیوان شائع کرا چکے ہیں۔ کچھ دن تو بڑی واہ واہ وصول کی۔ اچانک ملبلے کی طرح بیٹھ گئے۔ ایک دن طول طول سے۔ بسورتے چہرے کے ساتھ تشریف لائے۔ پہلے آتے تھے تو چہکتے ہوئے تازہ غزل گنگناتے۔ ہم نے پوچھا۔ یہ ماتمی صورت کیوں بنا رکھی ہے۔ بات کیا ہے؟ نہایت رقت بھری آواز سے بولے۔ میں تو برباد ہو گیا۔ لڑکی کی شادی کرنی ہے اور جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں۔ ہم نے کہا۔ عزیزم! تم ایک شریف آدمی ہو۔ شراب کی لت تم میں نہیں۔ بیڑی سگریٹ تم نہیں پیتے۔ جوا تم نہیں کھیلتے جہاں تک میرے علم میں ہے، عورتوں سے دلچسپی بھی صرف بیوی کی حد تک ہے۔ وہ بھی شاکی رہتی ہے۔ کوٹھوں پر تو کیا ہی جاتے ہوگے اگرچہ اچھا شاعر بننے کے لیے یہ تمام ضروری شرطیں ہیں۔ اچھی تنخواہ پاتے ہو۔ شعر و شاعری سے بھی ہزار پانچ سو کما لیتے ہو گے۔

شعر و شاعری اور کمائی؟ وہ خفگی سے بولے۔ اسی نے تو مجھے برباد کیا ہے۔ وہ کیسے؟ میں نے پوچھا۔

تم دیکھ رہے ہو۔ تین تین دیوان چھپوائے۔ اس کے لیے پیسہ کہاں سے آیا۔ سب پراوڈنٹ فنڈ سے نکلوایا۔ چھپائی کے علاوہ ہزاروں پیٹیز پوسٹیج پر خرچ ہو گیا۔ اب میرے پاس ایک پیسہ نہیں۔ لڑکی کی شادی کے لیے پیسہ کہاں سے لاؤں۔

اور حضرت وہ کتابیں کیا ہوئیں؟ ہم نے پوچھا۔ وہ جھنجھلا کر بولے کتابیں کیا ہوئیں اسارا ڈھیر گھر میں پڑا ہے۔ یوں ہی جگہ کم تھی۔ کچھ کتابوں نے گھیر لی۔ گندگی الگ پیدا ہو گئی جس کی وجہ سے بچے بیمار رہنے لگے۔ بیوی کا الگ جلی بھنی رہتی ہے۔ کچھ دن تک کتابوں سے انگیٹھی سلگانے کا کام لیتی رہی۔ جب مجھے معلوم ہوا تو ڈانٹا اور کہا۔ اللہ کی بندی! شرم نہیں آتی۔ اپنے شوہر کے خونِ جگر سے آگ سلگاتی ہو۔

ہم دوست کے حال زار پر افسوس ہی کر سکتے تھے۔

ادب میں بڑی بوقلمونی ہے۔ طرح طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ طبقہ ہے جو گڑے مردے اکھاڑنے میں مصروف ہے۔ بال کی کھال نکالتا ہے۔ جوں ہی کوئی مرا اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اس کی عیادت کے لیے نہیں جائیں گے۔ لیکن اس کے مرتے ہی ان کی دلچسپی بیدار ہو جاتی ہے۔ قدیم مردوں سے انھیں زیادہ پیار ہوتا ہے۔ مردہ جتنا قدیم ہو، اتنا ہی وہ اس سے پیار کرتے ہیں۔ مردے کے بارے میں طرح طرح سے تحقیق و جستجو کرتے ہیں۔ اس کی تاریخ پیدائش جائے پیدائش۔ تاریخ موت، جائے موت کا پتہ چلاتے ہیں۔ بیوی بچوں عزیز و رشتے داروں کو ڈھونڈتے ہیں۔ متوفی عشق و عاشقی کے قصوں کی کرید کرتے ہیں۔ اگر متوفی نے عشق نہ بھی کیا ہو تو تحقیق میں جان ڈالنے کے لیے ایک آدھ فرضی قصہ اس کے نام کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں۔ پھر اسے جھٹلاتے ہیں۔ اس کے عقائد کو سونگھتے ہیں۔ ایک دوست نے ہمیں خط میں لکھا۔ ایک الجھن میں پھنسا ہوں۔ بہن کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ میری ساری ریسرچ ٹھپ پڑی ہے۔ بہن اگر تھی اور تھی جیسا کہ میری تحقیق بتاتی ہے تو اس کا نام بھی ہوگا۔ جب تک نام معلوم نہیں ہو جاتا کام آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس لیے کہ بہن کا نام معلوم نہ ہوا تو بھائی کی شاعری کی عظمت کیسے قائم ہو گی۔

اس طرح کی اطلاعات و معلومات بہم پہنچانے کے لیے یہ

حضرات دور دراز کا سفر کرتے ہیں۔ جنگل و بیابان کی خاک چھانتے ہیں۔ چلتے چلتے جوتے گھس جاتے ہیں۔ پاؤں میں چھالے پڑ جاتے ہیں۔ کرم خوردہ پیلے کاغذوں کو پڑھتے پڑھتے سفید ہو جاتے ہیں آنکھیں بصارت سے اور دل و دماغ بصیرت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

ہم نے سوچا اس طبقہ کی پریشانیوں میں اضافہ نہیں کریں گے۔ اپنی تاریخ پیدائش وغیرہ کا حساب کتاب صحیح صحیح رکھیں گے بلکہ اپنے حالات زندگی کو رجسٹرڈ کرا دیں گے۔ آخر ہم میں بھی تو عظمت کے کچھ کچھ آثار پیدا ہو رہے تھے۔

ایک مدیر محترم ہمارے بھی دوست ہیں۔ ادب میں مقام پیدا کرنے کے لیے ان مدیران سے دوستی نہایت ضروری ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ذرّہ کو سورج کی ضیا بخش دیں اور سورج کو ذرّہ بنا دیں۔ بڑے کام کے لوگ ہیں۔ ایک دن مدیر صاحب نے ہمیں اپنے یہاں مدعو کیا (اگرچہ عموماً مدیروں کو ہی مدعو کیا جاتا ہے) تقریب بہر ملاقات ان کی پیاری لڑکی کی شادی تھی۔ کہنے لگے میں نے خاص طور پر تمھیں مدعو کیا ہے یہ کہہ کر وہ مجھے ایک طرف کو لے گئے۔ فرمایا دیکھو یہ سب لوگ یہاں جمع ہیں یہ اپنی اپنی جگہ ادب کے آفتاب و مہتاب ہیں۔ کوئی فکشن میں تو کوئی شاعری میں۔ کوئی نظم کا بادشاہ ہے تو کوئی غزل کا شہزادہ۔ کوئی تنقید کا امام ہے تو کوئی تحقیق کا پیش امام۔ کسی نے افسانہ کو نیا موڑ دیا ہے تو کسی نے ناول کو موڑ توڑ کر رکھ دیا ہے اور آج تم اس تقریب کی آن بان دیکھ رہے ہو۔ یہ سب ان ہی کا طفیل ہے۔ یہ لوگ خدمت اور قربانی کا جذبہ رکھتے ہیں۔ جب سے بیٹی کی شادی کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ ہر طرح کا خیال رکھتے ہیں۔ کئی روز سے مصروف ہیں اور انتظامات میں شریک ہیں۔ آپ ان سے سبق سیکھیں۔ آپ رسالہ کا چندہ تک نہیں بھیجتے۔ اس پر تخلیقات کا معاوضہ الگ مانگتے ہیں۔ اشتہار آپ نہیں دلواتے۔ تحفے تحائف آپ نہیں بھیجتے اس پر نخرہ دکھاتے ہیں۔ آپ کی تحریروں میں ذرا کوئی کانٹ چھانٹ کر دے تو ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اس طرح آپ کبھی بڑے آدمی نہیں بن سکتے۔ لاکھ آپ اچھا لکھتے ہوں۔ اس سے کچھ نہیں ہونے والا۔ پھر یہ بھی نہیں کہ آپ کسی بلند و بالا منصب پر فائز ہوں اور چاہتے ہو کہ لوگ آپ کو صرف آپ کے کام سے پہچانیں۔ ناممکن۔ ناممکن اپنے کام میں پیسے لگائیے۔ کام تو آپ کرتے ہیں۔ اس میں پیسے نہیں لگاتے۔ بس یہی خرابی ہے۔ یہاں جو لوگ جمع ہیں وہ سب اپنے کاموں میں پیسے لگانے کا ہنر جانتے ہیں، وہ ادیب و شاعر چاہے جیسے ہوں مگر کامیاب ہیں۔

ہم نے اپنے دوست کی یہ تقریر دل پذیر نہایت اطمینان سے سنی اور پیاری بیٹی کے نکاح میں شرکت کی سعادت حاصل کیے بغیر گھر لوٹ آئے۔

ادبی منظر نامہ کو ہم اپنے دوستوں کے حوالہ ہی سے بیان کر رہے ہیں۔ ایک حوالہ اور دیکھیے۔ ایک پروفیسر دوست ہیں یا دوست پروفیسر ہیں۔ ایک ایسی صنف ادب کے استاد سمجھے جاتے ہیں جس کا نام سن کر ہی لوگ مرعوب ہو جاتے ہیں۔ وہ جو مضامین لکھتے ہیں عام قاری کی فہم سے بالاتر ہوتے ہیں۔ بلکہ اس صنف کے ماہرین بھی اس سے کنارہ کشی اختیار کرنے کی وجہ سے نابلد ہو گئے ہیں۔ اس لیے انھیں کوئی پڑھتا بھی نہیں ہے اور اس طرح ان پروفیسر کی علمیت کا بھرم قائم ہے اور قاری اور مصنف کے بیچ ایک پردہ پڑا ہوا ہے۔ اگر کسی دن کسی نے پردہ اٹھانے کی ہمت کی تو راز کھل جائے گا۔ وہ صوفی سنتوں میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ادب میں ہلکے پن کا احساس انھیں ستاتا رہتا ہے اس لیے خانقاہوں۔ گرودواروں، مٹھوں۔ آشرموں کی خاک چھانتے پھرتے ہیں۔ خود بھی کوئی مزار گھیر رکھا ہے اور صوفیوں کی حمایت بنا کر اس کے پیشوا بن گئے ہیں (تعویز گنڈوں کی کمی ہے وہ بھی ایک دن شروع کر دیں گے۔ مقامات درویشی طے کر کے اپنے ادبی ہلکے پن کو اور تصوّف سے وزن دار بنانا چاہتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کی کوشش میں نہ تصوف میں وزن پیدا ہو پاتا ہے اور نہ ادب میں۔ وہ دو گھوڑوں کے سوار ہیں۔ اور مثال ان پر دھوبی کے کتے کی صادق آتی ہے۔

وہ ایک دن تشریف لائے۔ کہنے لگے آپ کے گھر میں تو بہت کتابیں ہیں۔ میں نے تو کتابوں کا جھنجھٹ ہی ختم کر دیا۔ قینچی اور فائل سے کام چلاتا ہوں۔ ہم نے پوچھا۔ کیسے مسکرا کر بولے۔ یہ استادی کا گر ہے۔ ٹرک آف دی ٹریڈ۔ کتاب ہو یا رسالہ۔ اپنے مطلب کی چیز ہوتی ہے تو قینچی سے کاٹ کر فائل میں رکھ لیتا ہوں۔ کتاب کو ردی میں بیچ دیتا ہوں۔ اور جہاں کوئی فائل ذرا ضخیم ہوئی اسے کتاب کا روپ دے دیتا ہوں۔ کبھی کبھی آپ جیسے صاحب علم کی کہی بات بھی نوٹ کر لیتا ہوں۔ میری تمام تر کتابیں اسی ٹرک کا نتیجہ ہیں۔ بہت خوب۔ ہم نے اپنے دوست کی ہنرمندی کی داد دی۔

ادب میں کتب فروشوں کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے ہم کتابوں کی ایک قدیم دکان پر گئے۔ عرصے کے بعد گئے تھے۔ دکان کا حدود اربعہ بدلا ہوا تھا۔ دکان بھی پہچان نہیں سکے۔ لیکن دکان پر پہلے سے زیادہ رونق تھی۔ ہم نے کہا منٹو ہے۔ جواب ملا۔ ابھی مارکیٹ میں نہیں آیا۔ ہم نے پوچھا۔ فیض ہے۔ جواب تھا۔ ابھی تیار نہیں ہوا۔ ہم نے پھر پوچھا۔

[باقی صفحہ ۲۸ پر دیکھئے]

## مشتاق جاوید

کتنا شیریں تھا ذائقہ پیارے
بے انا ہو گئی انا پیارے

کھول دے بادباں سفینے ... کا
پھر چلی زور کی ہوا پیارے

ایک دن موج بن کے ابھرے گا
سطحِ دریا پہ دائرہ پیارے

منھ چھپانے سے فائدہ کیا ہے
آسمانوں پہ ہے خدا پیارے

ہونٹ رہ رہ کے کپکپاتے ہیں
یہ خموشی کی ہے سزا پیارے

ٹوٹ جانے کا خوف ہے مجھ کو
شاخ کی طرح مت جھکا پیارے

منقسم کر دے جو لہو میرا
ایسی دیوار مت اٹھا پیارے

● چیرمین اردو پروگریسو سوسائٹی
پی ۹/۸، بچیہ پاڑہ، مٹیا برج کلکتہ ۲۴

## ن۔ا۔ ناظر

عہدِ ماضی کے جو رسالے ہیں
اب کہاں ان کے پڑھنے والے ہیں

زرد موسم کی اک نشانی ہے
کھارے پانی کے سو حوالے ہیں

خون میں سرسراتی وحشت ہے
ذہن میں مکڑیوں کے جالے ہیں

تیرگی پرفشاں ہے مرکز میں
چار سو روشنی کے ہالے ہیں

رنگ، خوشبو، کتاب، پیمانے
ہم نے کیا کیا فریب پالے ہیں

غم میں رقصاں، خوشی میں گریاں ہے
دل کے انداز بھی نرالے ہیں

● معرفت اختر جمال، تاج محمد کی چال، نزد آس بی بی مسجد
کلیان روڈ، بھیونڈی، ضلع تھانہ

## شفیق احمد شفیق

معصومیت تری مجھے قاتل کی خو لگے
سرخی ترے لبوں کی مرا ہی لہو لگے

پاگل ہی ہو نہ جاؤں اسے ہنستا دیکھ کر
غصے میں بھی جو شخص مجھے خوبرو لگے

سو آرزو کے بعد سنی تھی جو ایک بار
اب جو سنوں تو زہر وہی گفتگو لگے

شبنم کا اہتمام تراوش وہ صبحدم
ہر شاخِ گل پہ لالہ و گل باوضو لگے

سیراب سا لگے مجھے صحرا سراب سے
اک کربِ تشنگی میں مجھے آب جو لگے

شب کو جو شب پکارے، سحر کو سحر شفیق
سو جان سے عزیز مجھے وہ عدو لگے

● ۱۸-۷۸، ٹی ڈی ہمس آباد الف بی ایریا کراچی۔ ۳۸



خالدہ شفیع

۷۹۔ الحمرا سوسائٹی، میاں محمد رفیع روڈ، کراچی ۔ ۸ پاکستان

# ہائی جیکنگ

شروع سفر تو انتہائی خوشگوار تھا۔ موسم بھی اچھا ملا۔ اجلے نکھرے خواب دیکھنا کسے پسند نہیں؟ فاضل کے بارے میں وہ کچھ نہ جانتی تھی۔ جاننے کے لئے تو عمر پڑی تھی۔ وہ اچھا خاصا انسان تھا۔ اب اگر تنقیدی انداز سے دیکھا جائے تو یہ ہے کہ گو اس کا قد کافی چھوٹا تھا لیکن نپولین بونا پارٹ کون سا لمبا تھا۔ اگر وہ دبلا پتلا تھا تو لڑکے بالے شروع شروع ایسے ہی ہوتے ہیں توند نکلتے کون سی دیر لگتی ہے۔ رنگ سیاہی مائل تھا تو مردوں کے رنگ نہیں ڈھنگ دیکھے جاتے ہیں علاوہ اچھا طالب علم نہیں رہا تھا تو آئن سٹائن اور کارل یونگ کون سے اچھے طالب علم تھے۔ ذہانت کی بات ہے تو آج تک صحیح پیمائش نہ ہو سکی۔ انسان کا معیار اعلیٰ ہو تو اس قدر گنجائش بھی تو ہو کہ کچھ لوگ اس میں سما سکیں۔۔۔ ابتدا خوشگوار ہو جائے تو لمحے بھی سکھ کا سانس لیتے ہیں۔

ان لمحوں میں تازگی اور لطیف خنکی تھی۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی تھی آہستہ آہستہ مٹیالے درختوں کے گرد آلود پتیوں کے کناروں سے میلا پانی ٹپکنے لگا۔ سارے درخت اور پودے دھل کر سرسبز نکل آئے۔ پھولوں کے رنگ اور نکھر گئے۔ بارش کچھ تیز ہونے لگی۔ بادل نیچے جھک آئے اور بجلی خشک شاخوں میں پارہ بھرتی چنگھاڑنے لگی تو کئی خدشے جاگ اٹھے جیسا کہ سفر سے پہلے ہوا کرتا ہے۔ چاچا یونس کہہ رہے تھے فاصل غصہ کا بہت برا ہے ۔۔ اگر چھما چھم بارش ہونے لگی۔ اندھیرا بڑھ گیا اور بجلی ایک چنگھاڑ سمیت گر پڑی تو؟ اسے جھر جھری آ گئی۔ سفر کی اڑان میں احساسِ جوش کے ساتھ خوشی کے بجائے خوف کی آمیزش نے اسے اداس کر دیا۔ وقت چلتا رہتا ہے دبے پیر۔ آہستہ آہستہ اور تیز تیز۔ سانپ کی طرح قدم اٹھائے بغیر۔ سرسراتا اور لہراتا ایک اسرار لئے۔ خبر دیئے بغیر، کہ کیا ہونے والا ہے۔ وقت یہ تو بتاتا ہے کیا ہوا تھا۔ یہ نہیں بتاتا کیا ہوگا۔ اور زندگی کا سفر جاری رہتا ہے۔

وہ اپنی دونوں بچیوں کا ہاتھ تھامے تیز تیز قدم اٹھاتی فاضل کے پیچھے چل رہی تھی۔ بارش رک گئی مطلع صاف ہو گیا سیڑھی جہاز کے ساتھ لگا دی گئی۔ مسافر قطار بنائے بغیر سیڑھیوں پر یوں چڑھنے لگے جیسے طلبا کالج میں گچھوں کی شکل میں چڑھتے اترتے ہیں۔ فضائی میزبان نے مسکراہٹ سجا کر مخصوص نشستوں کی جانب اشارہ کیا۔ اور سب ہی مسافر اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ پرندے کی مانند نیلے آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرنے والا طیارہ اندر سے کس قدر کشادہ ہو جاتا ہے سینکڑوں مسافر سما جاتے ہیں۔ سب سے آگے پرندے کی چونچ میں پائلٹ پھنسا رہتا ہے گردن میں فرسٹ کلاس، مسافر۔ اور پیٹ میں عام مسافر۔ اس کی بچیاں پرندے کی ڈرائنگ بنا کر اس سے پوچھا کرتیں "اور دم میں کیا ہوتا ہے؟" چھوٹی بیٹی پوچھتی سامان؟ دوسری بنا کر طیارہ کی تصویر مکمل کر دیتی۔

سفر، سواریاں اور مسافر جیسے بھی ہوں سب ہی چاہتے ہیں ہنسی خوشی گھر پہنچ جائیں۔ حادثوں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ سارے مسافر کچھ اکیلے کچھ ساتھیوں اور کچھ بیوی بچوں کے ساتھ پرسکون نظر آتے تھے سب ایک جیسے ہو بہو انسان ان میں کوئی فرق نہیں۔ چہروں مہروں سے بھلے مانس! لیکن انہیں میں سے دو چار اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اچانک پستول بندوق یا ہتھیار لئے اور اندھا دھند گولیاں برسانا شروع کر دیتے ہیں۔ ایک دم کیا ہو جاتا ہے؟ ہائی جیکنگ کے واقعات کس تیزی سے بڑھتے جا رہے تھے۔ غم و غصہ سے تشدد تک۔ انتہا تک پہنچنے کے لئے دورانیہ کی ضرورت نہیں ہوتی؟ کم از کم یہ تو ہو کہ غصہ اس پر اتارا جا سکے جس نے توہین کی۔ تشدد اسی کے ساتھ ہو جس نے تشدد کیا ہو ــــــ اس قدر اندھا تشدد؟ اس نے بچیوں کی طرف دیکھا جواب تک چہک رہی تھیں فطری بشاشت لئے۔ کھڑکی کے پاس کھڑی دونوں بادلوں کے دبیز تہوں کی طرف اشارہ کر کے فاضل سے بھی مخاطب ہو جائیں وہ اخبار

پڑھ چکنے کے بعد اب میگزین دیکھ رہے تھے۔ اتنا پڑھا لکھا انٹلکچوئل مرد اور ـــ کوئی بھی اس بات کا یقین نہیں کرے گا ـــ اس نے دوبارہ بچیوں کی طرف دیکھا۔ دونوں بے خبر معصوم مستقبل کے اندیشوں سے پاک پچھلی نشستوں کے بچوں کی جانب متوجہ ہو گئی تھیں۔ جو کھیل ہی کھیل میں ان کی نشست پر گر گر پڑ رہے تھے ـــ سارے مسافر طیارہ کی تیز پرواز کے ساتھ ہی گم ہو گئے تھے۔ وہ سب اپنے اپنے ذہن کے نہاں خانوں میں چھپ گئے تھے۔ آنکھیں کھلی تھیں کان سن رہے تھے لیکن ان کے مناظر اور آوازیں مختلف تھیں۔ وہ ان مناظر اور واقعات میں غرق تھے ساکت اور اپنی دنیاؤں میں مہک پچھلی دفعہ جو ہائی جیکنگ کا حادثہ ہوا تھا اس طیارہ میں اس کی دوست بھی سوار تھی۔ اس کے ذہن کا دریچہ کھل گیا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ آوازیں اور چہرے بدلنے لگے۔

جیسے ہی طیارہ زمین سے قدم اٹھاتا ہوا میں معلق ہوا ـــ تین لڑکے چہرہ چھپائے دوڑتے ہوئے سامنے آ گئے "ہینڈز اپ" ایک کوک پٹ کی جانب دوڑا۔ باقی دو بیچ میں پوزیشن لے کر کھڑے ہو گئے سب نے ہاتھ اٹھا دیئے کچھ مسافروں نے پس و پیش کیا تو ایک ساتھ تین گولیاں سنسنا کر دور جا ٹکرائیں "ہینڈز اپ" اب سب کے ہاتھ اٹھے ہوئے تھے۔ بوڑھے جوان عورتیں بچے آدھا گھنٹہ گذر گیا پورا گھنٹہ ہو گیا۔ بچے رونے لگے عورتیں اور مرد بے دم ہو کر سیٹ کی پشت پر جا لگے۔ ایک پستہ قد لڑکا اب دونوں ہاتھوں میں پستولیں تھامے کھڑا تھا اور دوسرا سب کی تلاشی لیتا رہا۔ بچے اور کچھ بڑے ٹائیلٹ جانا چاہتے تھے۔ لیکن اجازت نہ تھی۔ وقت کہیں جا کر سو گیا تھا ـــ پھر کاک پٹ سے نیا شور برآمد ہوا اور جلد ہی طیارہ لینڈ کر چکا تھا۔ گھٹن، گرمی اور موت کی سی خاموشی چھائی تھی۔ سب دل ہی دل میں اپنے رب سے مخاطب تھے۔ ایک طویل دن کے بعد طویل سیاہ رات بھی گزر گئی تھی۔ بچے، بھوک و پیاس سے بلبلاتے رہنے کے بعد نڈھال تھے۔ بدبو، غلاظت اور تعفن سے دم گھٹنے لگا تھا ـــ طلوع آفتاب تھا یا غروب آفتاب؟ سورج کی زرد شعاعیں کھڑکیوں کے شیشوں پر سسکتی دم توڑتی نظر آتی تھیں ـــ اے میرے رب۔ تو کہاں ہے؟ تیری دنیا میں تیرے بندے اسقدر ظالم اس قدر مظلوم۔ دو حدوں کے درمیان توازن قائم کرنے والے کیا ہوئے؟ اچانک کیا ہو جاتا ہے انھیں؟ ایک جیسی شکلوں والے انسان آدم و حوا کی اولاد میں دو چار حرف چند معدود سارے معصوم و بے گناہ لوگوں پر بندوقیں تان لیتے ہیں۔

"لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمھاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔"

ملک کوئی اور ـــ طیارہ کسی ملک کا ـــ مسافر کئی ملکوں کے بے شمار اپنی اپنی مجبوریاں لئے ـــ بوڑھے ـــ عورتیں ـــ بچے ـــ بیمار۔ انسان دن بہ دن اتنا چھوٹا کیوں ہوتا جا رہا ہے۔ بے ضرر معصوم افراد کو بھسم کر دینے سے تشدد کی آگ کو بجھایا جا سکتا ہے تو ایندھن تو بہت ہے لیکن ـــ کتنی باتیں اس کی سمجھ سے بالاتر تھیں باوجود تعلیم کے زیور سے آراستہ پیراستہ ہونے کے اس کا دماغ چھوٹا تھا اور وزن کم ـــ سفر آخر سفر ہوتا ہے کوئی بھی ہو۔ کچھ اللہ کے بندے بہت با اختیار ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں میں چاہتا ہوں ایسا ہو جائے۔ اس لئے کہ میں کہہ رہا ہوں ـــ اور وہ کر گزرتے ہیں اور ایک ہی لمحہ میں زندگی کا دھارا بدل کر رکھ دیتے ہیں ایسے لمحوں سے بے حد ڈر لگتا ہے۔ با اختیار انسان سے ہمیشہ ڈرتے رہنا چاہیئے وہ جو چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں ـــ ایسے لمحوں سے بہت ڈر لگتا ہے وہ کبھی کبھی فاضل سے بے حد خوفزدہ ہو جایا کرتی تھی۔ یوں تو وہ انٹلکچوئل آدمی تھا اور دنیا کی چند خوبصورت جگہوں پر بھی اسے لیے پھرا ـــ وینس کے جزیرے میں کھڑی مضبوط عمارتوں اور قدیم طرز کے خوبصورت پلوں تلے گنڈولوں پر سوار۔ شیشے کی دیکڑیوں والے حسین دلہن میں نازک کانچ کی بے شمار چیزیں تھیں سوائے چوڑیوں کے

HOPE IS A WALKING DREAM

چودہویں کی چاند رات میں تاج محل کے حسن و جمال دیکھنے کا موقع ملا۔

ARCHITECTURE IS A FROZEN MUSIC

کارلائل نے تاج محل کو دیکھ کر ہی کہا ہو گا۔

زندگی کے خوشگوار سفر کے لئے پائدار اور سچے جذبوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تعصب اور احساس جرم سے پاک۔ ذاتی خواہشوں اور تجربات سے بالاتر سچائی اور پاکیزگی میں تو خدائے بزرگ و برتر بھی اپنی روح اپنے پیارے بندوں کے سینہ اور بطن میں پھونک دیتے ہیں آدمی سے انسان بننے میں کتنی صدیاں درکار ہوں گی آخر؟ فاضل اچھا انسان تھا۔ لیکن اسے کیا ہو جاتا تھا؟ اس نے محنت کر کے پیسہ بھی کمایا ـــ بچیاں پیدا ہوئیں تو کچھ دن اداس رہا پھر ٹھیک ہو گیا اپنی ماں کو سمجھاتا رہا۔ پڑھا لکھا آدمی تھا۔ جانتا تھا۔ بیٹے کی خواہش ہو تو باپ کے حوالے سے ہی پوری ہوتی ہے۔ وہی با اختیار ہے۔ وہی مرد ہے۔ اسے جس قدر شدت سے غصہ آتا تھا اسی شدت سے وہ نرم پڑ جاتا۔ اور وہ اس کے التفات کی تاب بھی نہ لا سکی۔ وہ با اختیار تھا۔ پیار اور غصہ

[ باقی صفحہ ۸۴ پر دیکھئے ]

# دھنک رنگ

## متین

چراغ آفتاب ہے
فلک نہیں رکاب ہے
یہ چیخ جیسی خامشی
صدائے انقلاب ہے
سوال پھول سا مرا
کلی ترا جواب ہے
گھروں میں تربتر ہوئے
سروں پہ کیسا سحاب ہے!
غزل نگار یا ہما
زمین یا سراب ہے

● متین بکڈپو قاصد پورہ۔ اچل پور ضلع امراؤتی

## جبار غنی

نہ میرا ساتھی ہے کوئی نہ ہم سفر میرا
حسین شہر کی سڑکوں سے ہے گذر میرا
میں اِک مسافر ہستی ہوں راہ بھولا ہوں
ستارو! مجھکو بتاؤ کہاں ہے گھر میرا
ہوا کی طرح بھٹکتا ہوں میں فضاؤں میں
سنو سنو کہ فسانہ ہے مختصر میرا
میری وفاؤں کا چرچا ہے دوست دشمن میں
میرے رقیبوں کو معلوم ہے ہنر میرا
غنیؔ میں دل میں شہادت کا شوق رکھتا ہوں
کسی کے کام جو آتا ہو، لے لے سر میرا

● وائس پرنسپل۔ اردو ہائی اسکول راورکیلا۔ ۱ (اڑیسہ)

## حنیف ترین

بھولی بسری بات جو دل کو ڈستی ہے
سوچ کی دنیا اور بھی زہرا لگتی ہے
سرد ہوا کے دامن سے جو اُٹھتی ہے
دھوپ کی تھپکی لوری جیسی لگتی ہے
کتنے ہی لوگوں کو یہ معلوم نہیں
دل کی خرابی، دل سے نظر تک پھیلتی ہے
بچوں جیسے کچے ذہن کے آنگن میں
روز سنہرے خواب کی تتلی اُڑتی ہے
چہرے پر جب روز نئے وقت کی دھول جمی
آئینے کو میری نظر کیوں تکتی ہے

● مستوصف الجدیدہ۔ عرعر۔ شمال سعودی عرب

## مغل اقبال اختر

رنے سے پہلے زخم کو میرے دوا ملی
شاید مرے رقیب کی مجھ کو دعا ملی
ہم مرے نصیب میں ہے دھوپ کا سفر
ن مسافتوں کی مجھے بد دعا ملی
ہنچے جہاں، وہاں کی فضاؤں میں زہر تھا
موم ہر جگہ ہمیں، آب و ہوا ملی
لاکھ بے خطا تھے، عدالت کے سامنے
ب فیصلہ ہوا تو، ہمیں کو سزا ملی
تر بہت ملول رہے ہم جہاں رہے
شہر میں گھٹی ہوئی ہم کو فضا ملی

● مہاراشٹرا ہائی اسکول، چپلون ضلع رتناگیری

## اشفاق عادل

رات کے پچھلے پہر مجھ کو صدا دیتا ہے کون
زندگی ہے اک سفر کہہ کے جگا دیتا ہے کون
میرے سینے میں بھڑکتی احتجاجی آگ کو
مصلحت کی تیز بارش سے بجھا دیتا ہے کون
اب کسی منظر سے بھی میری شناسائی نہیں
بے حسی کی کائی آنکھوں میں جما دیتا ہے کون
جب بھی اٹھتا ہوں میں سرگرم عمل ہو کر کبھی
تھپکیاں دے کر مرے جذبے سلا دیتا ہے کون
دشمنوں کو سرخروئی میں عطا کرتا مگر
میرے گھر کا ماتمی چہرہ دکھا دیتا ہے کون

● بیگم لاج بالمقابل اسٹیٹ بنک مہیندرو، پٹنہ۔ ۶

## شکیل جمالی

ہجر کے کانٹے، رفاقت کے ثمر رکھا کرو
کچھ نہ کچھ تو دل کے خالی طاق پر رکھا کرو
بھول جاؤ پچھلی چوٹوں کی عطا کردہ دکھن
آنے والی اگلی آفت پر نظر رکھا کرو
یہ سراسر اجنبیت بھی ہمیں منظور ہے
کچھ تعلق بھی پس پردہ مگر رکھا کرو
کیا خبر ہے کب غلط ہو جائے ایک اک پیش گوئی
زندگی کی بے ثباتی پر نظر رکھا کرو
اب یہ سکے شہر کے بازار میں رائج نہیں
چاہتوں کے قیمتی یاقوت گھر رکھا کرو

● ڈھالی بازار چاندپور۔ ۲۴۶۷۲۵ (یوپی)

# مکتوبات

**شوکت حیات** ۔ ڈاکٹر بہار جعفری، ہندرو، پٹنہ۔

اسباط شاعر جلد ۴۰، شمارہ ۳، ۱۹۸۹ء میں بہت سارے پرانے دوستوں اور سینئر ساتھیوں کی چیزیں ایک ساتھ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ایک زمانے کے بعد شاعر میں ن۔ ا۔ ناظر کا خط پڑھ کر چونک اٹھا۔ اردو افسانے کی روایت اور تبدیلیوں کے سلسلے میں ناظر کے وسیع مطالعے کا میں قائل ہوں۔ ایک دو مختصر مضامین اور تبصروں سے ہی مجھے اس بات کا اندازہ ہوگیا تھا۔

کہانی اور افسانے کے سلسلے میں مہدی جعفر نے میادی باتیں اٹھائی ہیں۔ اور بعض نئے نکتے سامنے آئے ہیں۔ مثال کے طور پر افسانے کی اہم خصوصیت "وحدت تاثر" کے ساتھ ساتھ "مجموعۂ تاثرات" کے وحدت کی تنقیدی سطح پر دریافت۔ متعدد افسانہ نگار جن کے افسانے میں مجھے یہ خصوصیت دیکھی ہے۔ خود افسانے کی ساخت کے سلسلے میں اس اصطلاح سے تقویت محسوس کریں گے۔

انور عظیم کے افسانے "مردہ گھوڑے کی آنکھیں" کے حوالے سے انھوں نے "مجموعۂ تاثرات" کے نقش اجاگر کیے ہیں۔ کیا اسے "تاثراتی ارتکاز" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے؟ ایک سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ مختلف تاثرات کی یکجائی کیا آپس میں متضاد اور متقاطع ہوگی یا ایک دوسرے کی کیفیت اور شدت میں اضافہ کرے گی۔ میرا خیال ہے "تاثراتی ارتکاز" سے تعبیر کا انحصار اسی فیصلے سے منسلک ہے۔ یہ مسئلہ دراصل ترسیل ابلاغ اور معنویت کے CONVERGENCE اور DIVERGENCE کا ہے۔

افسانوں کی جدیدیت کی جولیں جیسے آفاقیت یا دوامیت بھی کہا جاسکتا ہے کے سلسلے میں ان کی یہ بات صحیح ہے کہ اس کے سوتے نیچے سوئے ہوئے تھے اور اکثر یہاں وہاں پانی نکل آتا تھا۔ افسانے کی بعض بنیادی خوبیاں جو آج صاف نظر آتی ہیں، ان کے بارے میں کوئی ایک خطہ، ایک افسانہ نگار، کوئی ایک نسل یہ دعوی نہیں کرسکتی کہ پوری طور پر اسی کا کارنامہ ہے۔ صحیح افسانہ عصری اور آفاقی خوبیوں کے تال میل سے متناسب ہم آہنگی پیدا کرتا ہوا اپنے ارتقائی سفر کو آگے بڑھاتا رہا ہے۔ اسی آہنگی نے دراصل افسانوں کے قد آور ہونے کی راہیں ہموار کی ہیں۔

کلام حیدری، ندا فاضلی، عتیق اللہ، صادق، شمس کاف نظام، فیروز عابد، شفیع مشہدی، محافظ حیدر، سعد حمید، اظہر نیر وغیرہ کو ایک شمارے میں دیکھ کر حیرت ہوئی۔ عتیق اللہ اور صادق کو ایک زمانے کے بعد پڑھنے کا تجربہ مسرور کن ہے اور امید بندھتی ہے کہ ان لوگوں کی تخلیقات شاید اب اکثر و بیشتر پڑھنے کو ملتی رہیں گی۔ کلام حیدری کی کہانی جس طرح گوتم بدھ سے ہوتے ہوئے مضحک اور پھر اجتہادی رویے کو منتج ہوتی ہے، وہ ان کے افسانوں کے نئے امکانات کا پتا دیتی ہے۔

عظیم افسانہ نگار غیاث احمد گدی کی قلمی تحریر دیکھ کر بہت ساری پرانی یادیں روشن ہوگئیں۔

ندا فاضلی کی "دیواروں کے بیچ" پڑھ رہا ہوں۔ کم شاعر ایسے ہیں جو نثر لکھنے پر اتنی قدرت رکھتے ہیں۔

شاعری میرا میدان نہیں۔ اس کے بارے میں اظہار رائے کا مجھے حق نہیں۔ لیکن قاری کی حیثیت سے لوگوں کو پڑھتا رہتا ہوں۔ خورشید سمیع نے اپنے مضمون میں جن شاعروں (عادل منصوری، کمار پاشی، بلراج کومل، افتخار جالب، باقر مہدی، ندا فاضلی، مظہر امام، شاذ تمکنت، شہریار، عمیق حنفی، وحید اختر، شہاب جعفری، بانی، بشیر بدر، شکیب جلالی، احمد فراز وغیرہ) کے حوالے دیئے ہیں یقیناً اہمیت کے حامل ہیں۔ مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ انھوں نے محنت کی ہے لیکن چھوٹا سا سوال تو کر ہی سکتا ہوں کہ انھوں نے بہت سارے لوگوں کو بالکل فراموش کیوں کر دیا۔ کیا ناصر کاظمی، جاں نثار اختر، پرونیت شاہدی، حسن نعیم، خلیل الرحمن اعظمی، پرکاش فکری، سلیمان اریب، خورشید احمد جامی، زبیر رضوی، محمود سعیدی، محمود ایاز، سلطان اختر، زیب غوری، شمس الرحمان فاروقی، وزیر آغا، معین تبسم، وکیل اختر، صہبا اریب، مصداق نعیمی، محمد علوی، قاضی سلیم، مظفر حنفی، فضیل جعفری، شفیق فاطمہ شعریٰ، حکیم منظور، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، شاہد احمد شعیب، ظفر احمد، نازش پرتاب گڑھی، شاہد میر، کمال احمد صدیقی، اویس احمد دوراں، بشر نواز، احمد ہمیش، منصور سبزواری، نشتر خانقاہی، شجاع خاور، راج نرائن راز، اسرار افضل، علیم اللہ حالی، قمر رئیس، شاہد ماہلی، صدیق مجیبی، چندر بھان خیال، قمر راہی، سید عارف، امام نظر، مشتاق علی شاہد، کرشن موہن، قیصر شمیم، رونق شہری، حامدی کاشمیری، ظہیر صدیقی، مظہر ایرج، فرحت قادری، سلطان سبحانی، افتخار امام صدیقی، نسیم اختر، حمید الماس، مہیں رشید، فاروق شفق، شین کاف نظام، عتیق اللہ، صادق، صلاح الدین پرویز، حمید سہروردی، انیس اشفاق، سید احمد شمیم، شکیب ایاز، ارمان نجمی، عبداللہ کمال، اقبال فرش، شاہد کلیم، اختر یوسف، ن۔ ا۔ ناظر، ابوالکلام قاسمی، حق اعظمی، شہناز مرزا، ممتاز راشد، سلیم شہزاد، سیفی صدیقی، شمیم انور، حسن اختر، نصر قریشی، مریخ حمیری، عبدالحمید، آشفتہ چنگیزی، سالم رضوی، شاہد جمیل، غضنفر، فرحت احساس، وقار ناصری، عین تابش، جاوید ناصر، حفیظ آتش وغیرہ جیسے اہم، قابل ذکر اور قدر سے جانے پہچانے (ظاہر ہے کہ جلدی میں تیار کی گئی اس فہرست میں خورشید سمیع صاحب کی طرح مجھ سے بھی کئی اہم نام چھوٹ گئے ہوں گے اور کچھ غیر اہم نام شامل ہوگئے ہوں گے) شاعروں کو نظر انداز کرکے نئی شاعری کے پیچ و خم کی تفصیل اور مکمل نشاندہی ہوسکتی ہے؟ مشکل یہ بھی ہے کہ ہر عہد میں شاعروں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے اور شاعری پر کوئی بھی بات کہنے کے لیے لمبی قطار کی طرف رجوع ہونا پڑتا ہے۔

ظاہر ہے انہیں اپنے مطلب کے نتائج نکالنے تھے اس لئے انھوں نے اپنے طور پر شاعروں اور پھر ان کے مخصوص کلام کا انتخاب کیا۔ عام طور پر ناقدین یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ لیکن یہ ذہنی کھلے پن اور جمہوریت پسند تنقید کا طریق کار نہیں۔ بہت سے شاعر صرف گزک کے طور پر ذائقہ بدلنے کے لئے اپنے خاص رنگ سے ہٹ کر شاعری کرتے ہیں جو ان کا نمائندہ رنگ نہیں کہلاتا۔ غیر نمائندہ گزک نما شاعروں کو سامنے رکھ کر کسی شاعر کے بارے میں رائے قائم کرنا کوئی مثبت رویہ نہیں۔

**تارا چرن رستوگی** ۔ برہانی، گوالیار ۱۱۔۱۹

۸۔۷ دو شمارے ایک ساتھ موصول ہوئے۔ درحقیقت شاعر کا ہر شمارہ در حد اعتنا خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ سمت کے نام مرام ہمیشہ ادب اور ادبیات کو دل و دماغ دیتے آئے ہیں۔ فکر امروز کے تحت سیماب مرحوم کے ملفوظات و نگارشات نیز شاعر کے تمام تر ادارئیوں کو سمیٹ کر اگر کوئی کتاب شائع کی جائے تو وہ سرل بہ منزل اردو کی تاریخ ہوگی۔ امید کرتا ہوں کہ قارئین میرے ہم خیال ہوں گے۔

مزید برآں، شاعر میں چھپنے والے مکتوبات کی نوعیت بالعموم ادبیاتی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر "سامعیاتی" سے متعلق خطوط میرے رائے میں اس کے لیے "شاز مانی" موزوں ہوگا بالخصوص لیے کہ ایران میں یہی اصطلاح مستعمل ہے۔ کون کہتا ہے اردو کو سمجھتا ہے کہ ہر نئی تنظیم تعصبات و ذہنی تحفظات کا شکار ہو جاتی ہے۔ اگر کسی نے علم سے متعلق کوئی بات اٹھائی جاتی ہے تو وہ بھی مزید بحث کی موجب ہوسکتی ہے۔

"دیواروں کے بیچ" جب کبھی شائع ہوئی تو عظیم تصانیف میں شمار ہوگا۔

شعری منظومات میں دیپک قمر کی غزل، مظفر محمود کچھوچھوی کی غزلیں معیاری ہیں۔ شعیب احمد شعیب کی غزل بھی پسند آئی۔

محمد انصار اللہ صاحب کی تحریر "ضرب الامثال اور روزمرہ" اشاریہ ہے تو انتقادی مگر کچھ تشنہ سی نظر آتی ہے۔ کاش وہ انگریزی کی طرف سے بھی رجوع کرتے۔ اسی موضوع پر لسانیات کی کتب میں بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

**صدیق مجیبی** ۔ شعبۂ اردو رانچی یونیورسٹی، رانچی (بہار)

ان دنوں شاعر کے جو شمارے آرہے ہیں ان کا ادبی معیار بہت بلند اور لائق مطالعہ ہے۔ صحیح معنوں میں شاعر ایک ادبی جریدہ ہے۔ ندا فاضلی کی خود نوشت کا سلسلہ بے حد دلچسپ اور اپنے عہد کی بولتی تصویر ہے۔ ظالم نے نثر میں بھی کیا اسلوب اختیار کیا ہے۔ اس کا دیانت اور اس کی زندہ دلی خود نوشت کو دلکش بھی بناتی ہے اور فکر انگیز بھی۔ ہر ماہ شاعر کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔

**قیصر شمیم** ۔ سول کیشنر ڈپارٹمنٹ۔ این ڈی۔ آئی۔ آر۔ ٹی۔ نئی دہلی

میں گاہے گاہے شاعر پڑھ پاتا ہوں۔ حنفی دہلی میں اردو رسالے ملتے ہی ہیں۔ یہاں دہلی یا پھر کناٹ پیلس سے ادبی رسائل خریدنا پڑتا ہے۔ ویسے بھی ہندوستان میں جو صارف سماج CONSUMARIST SOCIETY اس وقت پروان چڑھ رہا ہے اور جس کی انتہائی شکل دہلی میں دیکھنے میں آتی ہے، اس میں پڑھنے پڑھانے کی چیزیں کمیاب ہو رہی ہیں۔ شاید مجھے خریدار بن جانا چاہیے۔ شاعر کے جتنے بھی شمارے دیکھے وہ اچھے لگے۔ اس وقت تک غیر سرکاری رسالوں میں شاعر ہی واحد رسالہ ہے جو پورے ہندوستان میں پڑھا جاتا ہے۔

**ون کمار ورما۔** ۱۲۳ کوچلیاں، امرتسر [پنجاب]
ستاعر کے دو شمارے [ ۷ اور ۸ ] ایک ساتھ موصول
ے۔ شمارہ نمبر ۷ کی دونوں کہانیاں اچھی ہیں۔ شکیلہ رفیق کی کہانی
یک اقتصادی مجبوریوں میں چھوٹ جاتی ہے تاری کو اور یہی اس کہانی کی خوبی
ہم پنجابی بھی دہشت گردی کا شکار پچھلے دس بارہ برسوں سے ہیں۔
ماما صنلی کی خود کی کہانی بڑے دلچسپ انداز میں آگے بڑھ رہی ہے
قسطوں میں تشنگی رہ جاتی ہے۔ یہی حال جوگندر پال کے ناول
ہے۔ اگر درمیان سے کوئی رسالہ گم ہو جائے تو۔۔۔
شمارہ نمبر ۸ میں شامل میری کہانی کو قارئین شاعر نے پسند کیا ہے
ط ملک کے مختلف مقامات سے مجھے ملے ہیں، اس سے شاعر کی
یت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

**راللہ ندوی۔** ۱ ۔ پلاٹ ہسپتال روڈ انگر ملاوٹ سی ۹۵
شاعر کے شمارے مجھے بار بار مل رہے ہیں۔ مذکورہ دونوں شمارے
۸) بھی مجھے مل گئے تھے۔ آپ دونوں بھائیوں کی ہمت اور لگن
دو دینی چاہیئے کہ اپنے سرد سامانی کے باوجود شاعر کو بہت سے
اسنے اور اسے وقت پر شائع کرنے کے اہتمام میں لگے رہتے ہیں۔
پ کو اپنے ارادوں میں کامیاب کرے۔

**نور سبزواری۔** پوسٹ آفس نوح، ڈسٹرکٹ گڑگاؤں، ۱۲۲۱۰۷ (ہریانہ)
شاعر شمارہ ۷ اور ۸ ملے۔ گذشتہ شماروں کی طرح یہ شمارے
نی خیز ہیں۔ نساط شمس جدید میں برادرم بشیر بدر پر اقبال مسعود کا
ن دلچسپ ہے تاہم بشیر بدر کی "منتخب غزلیں" توقع سے کم ہیں
اید یہ بسیار گوئی کا نتیجہ ہو۔ شمارہ نمبر ۸ میں احمد کمال پردادری
پا فیشن زدہ جدیدیت سے بالکل الگ اور صاف ستھری ہے۔
ہی کی کہانی جو ابتدا میں تری ڈھیلی ڈھیلی لگتی ہے، نقطۂ اختتام

پر اچانک ایک شدید تاثر سے دوچار کراتی ہے۔ ندا ماضلی کے ڈرامہ
کے بیچ یہ سلسلہ خوب ہے۔

**اسعد بدایونی۔** شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ (یوپی)
شاعر کے شمارے اکثر دیکھتا رہتا ہوں۔ اقبال نمبر کے بعد سے
ضخامت میں غیر معمولی کمی آئی ہے جس کا سبب مجھ پہ روشن ہے مگر
آپ کم صفحات میں بھی زیادہ مواد پیش کر رہے ہیں۔

**اسرار اکبر آبادی۔** ۲۲/۱۰۱ منٹولا آگرہ ۲۸۲۰۰۲
شاعر کے دو شمارے (۷ اور ۸) موصول ہو گئے ہیں۔ گاگر میں
ساگر سمونے کا ہنر آپ نے خوب سیکھا ہے۔ مواد کے اعتبار سے یہ دونوں
شمارے سابقہ کی طرح اہم ہیں۔ ندا ماضلی کی خود نوشت کے ساتھ اب
جوگندر پال کے ناولٹ کا سلسلہ اور سریندر پرکاش کے ناول کا اعلان
شاعر کے تمام مستقل عنوانات۔ یہ سب کچھ شاعر کی اپنی انفرادیت ہے
جو ہندوپاک کے ادبی رسائل کو کم کم نصیب ہے

**کیف بلگرامی۔** ۲۲۳، بھیرا سوداگر، ہردوئی [یوپی]
اپنے حلقوں پر اردو میں پتے لکھنے کی سعی کرتے ہوئے اپنے احباب
کو بھی اردو میں پتے لکھنے کی پابندی کرنے کا مشورہ دے رہا ہوں۔
شاعر پابندی کے ساتھ مل رہا ہے۔ آپ کی کاوشوں نے اسے بے حد
معیاری بنا دیا ہے۔ شاعر میں شائع ہونے والی تخلیقات کے
انتخاب پر مجھے محترم اعجاز صدیقی مرحوم کی یاد آتی ہے۔

**شہپر رسول۔** ۵۰ - اے، کچہری روڈ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱
شاعر کے دو شمارے ۷، ۸ دیکھنے کو ملے، ضخیم نہیں ہیں مگر
اپنے اندر بھرپور مواد اور حسن رکھتے ہیں اور اپنی روایتی انفرادیت کے
حامل ہیں۔ اس رکھ رکھاؤ کے لیے اب واقعی مبارکباد کے مستحق ہیں۔
یہ بات رسمی نہیں ہے بلکہ صداقت پر مبنی ہے۔

**ایم۔ کے۔ اثر۔** بی۔ ۱، اگاروڈن ریم روڈ، کلکتہ ۲۴ ۷۰۰۰
شاعر کے تازہ شمارے دیکھے۔ بشیر بدر کی منتخب غزلیں
اچھی لگیں۔ کچھ معروف اور غیر معروف پاکستانی شعرا کی غزلیں بھی پڑھنے
کو ملیں۔ جوگندر پال اور وزیر آغا بھی نظر آتے اور خوب رہے۔ ندا فاضلی
کی خود نوشت دلچسپ ہے۔ آپ کی تحریر نے ان کی شخصیت کو
اور بھی دو آتشہ بنا دیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ شاعر کی یہ ادا کس کس کی
جان لیتی ہے۔
نئی سمتوں کی تلاش کا قائل شاعر کی پیروی نئی نسلوں کے لیے
مشعل راہ کا کام دے گی۔

**سرور ساجد۔** ۱۲۵۷، حویلی حسام الدین، بلیماراں، دہلی ۶
شاعر کے حالیہ شمارے میں جوگندر پال کے ناولٹ کا سلسلہ
خوب ہے خدا کرے کہ آپ اعلان کے مطابق سریندر پرکاش کا
ناول بھی شائع کرنے میں کامیاب ہوں۔ ندا فاضلی کی خود نوشت
دیواروں کے بیچ اپنے کٹیلے اسلوب اور دھار دار زبان کی وجہ سے
پڑھنے میں لطف دیتی ہے۔

**ایوب جوہر۔** ۲۶ لال چند مقیم لین (رتھ کھولہ) ڈھاکہ (بنگلہ دیش)
ادھر چند شماروں سے یہ اندازہ ہوا کہ آپ شاعر کا معیار مسلسل
اونچا کرنے کی جستجو میں مصروف ہیں۔ شاعر کا منظومہ حصہ تو ماشاءاللہ پہلے
ہی کافی معیاری ہے مگر ادھر نثری حصے کی جانب بھی آپ کی توجہ کم دکھائی
نہیں دیتی۔ خصوصاً افسانوں کا انتخاب کافی معیاری جا رہا ہے، جس سے
ہم جیسے معمولی لکھنے والوں کے لیے یہ خطرہ پیدا ہو چلا ہے کہ شاید اب ہمارے
افسانوں کو شاعر میں جگہ مل سکے۔

بقیہ صفحہ ۱۴ ہرچرن چاؤلہ کی افسانہ نگاری

اور یہ کہ:
"اپنے بچوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانا ہر ماں باپ کو آتا ہے اور اچھا بھی لگتا ہے۔۔۔" وغیرہ وغیرہ۔
میں آخر میں چاؤلہ صاحب کی خدمت میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ اپنے بچوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے والے لوگ کبھی بھی مثالی اور کامیاب ماں باپ نہیں بن سکتے، ماں باپ وہی اچھے ہوتے ہیں جو (ایک پرانی کہاوت کے مطابق) "بچوں کو کھلائیں تو سونے کا نوالہ لیکن دیکھیں شیر کی نظر سے۔"

بقیہ صفحہ ۲۰ ادب نامہ

سرسٹ ام ہے۔ جواب ملا۔ یہ ہمارے یہاں نہیں۔ ہم ابھی اسی طرح سوال و جواب میں الجھے تھے کہ دکاندار کے اسسٹنٹ نے مالک کو باخبر کیا۔ سر یہ کتابوں کی باتیں کر رہے ہیں جو کاروبار ہم ختم کر چکے۔ دکاندار نے ایک زوردار قہقہہ فضا میں بلند کیا اور بولا۔ اخو! آپ کتابوں کے خریدار ہیں ہم تو اب ویڈیو کیسٹ بیچتے ہیں۔ آپ نیچے گودام میں چلے جائیے۔ کتابیں ہم نے وہاں محفوظ کر دی ہیں۔
چونکہ اس طرح کے واقعات آئے دن ہمارے ساتھ پیش آتے رہتے ہیں اس لیے اب ہم سوچ رہے ہیں کہ کیا دانشوری سے اپنا رشتہ قائم رکھیں یا توڑ دیں۔

# نقد و نظر

## لہو لہو آرزو

نوجوان فکشن نگار عارف خورشید کا اولین ناولٹ۔ اس سے قبل عارف خورشید کے چار افسانوی مجموعے اور دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ مختلف انتخابات میں بھی افسانے اور مختصر افسانے شائع ہو چکے ہیں۔

عارف خورشید کا یہ ناولٹ ایک ناکام عشق کی جذباتی داستان ہے لیکن یہ ایک روایتی اور عام سی داستاں ان کے یہاں تخلیقی سطح پر ایک سی تجربہ بن گئی ہے۔ اس میں صرف دو کردار ہیں جن سے ایک داستان خوبصورتی کے ساتھ ابھرتی بھی جاتی ہے۔ یہ کوئی بیانیہ بھی نہیں ہے کہ کسی منظم کہانی کی بُنت ہو سکے۔ یہی اس ناولٹ کی خصوصیت ہے کہ روایتی ڈگر سے اعراض کیا گیا ہے۔

یہ کوئی علامتی یا تجریدی ناولٹ بھی نہیں ہے۔ ڈرامائی خود کلامی کی تکنیک کے ذریعے شدت جذبات کے جھنور واقعات کا منظر نامہ سامنے ہیں۔ ناولٹ کی تخلیقی فضا مندی عارف خورشید کے شاعرانہ مزاج کی غمازی کرتی ہے۔ ایک کاوش ہے جو کسی اچھے ناولٹ یا ناول کے امکانات کا پتہ دیتی ہے۔

ضخامت ۶۴ صفحات۔ قیمت: ۲۵ روپے۔ پتہ: دیلکن انٹرپرائزز، ایف ۲/۱۔ ایم آئی ڈی سی انڈسٹریل ایریا چکل ٹھانہ اورنگ آباد ۴۳۱۲۱۰ (مہاراشٹرا)

## ذائقہ میرے لہو کا

نئی نسل کے شعرا میں شمیم فاروقی کا نام خاصہ معروف ہے۔ یہ اور بات ہے کہ تازہ کار شاعر ہونے کے باوجود اپنی سادہ مزاجی، کم گوئی اور گوشہ نشینی کے سبب نقاد اپنی شعر و ادب کے ذکر و فکر میں وہ کم کم ہی ہیں۔ "ذائقہ میرے لہو کا" ان کا اولین شعری مجموعہ ہے جو اچھی اور سچی شاعری سے مملو ہے اور جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جب کہ ایسا ہوا ہے۔

۷۶ غزلوں [۴۳۶ اشعار اور ۶۵ متفرق شعر] پر مشتمل مجموعہ "ذائقہ میرے لہو کا" سکۂ جدید جدید شاعری کے دل میں نہیں سماتا یہ خالص شاعری ہے عصری کربناکیوں کا شخصی اظہار اپنے تجربات اور مشاہدوں کے ذریعہ۔ اس شاعری کی تہوں میں احتجاج بھی ہے، انقلاب بھی، ایک اپنا دست ہے جو مختلف ہو جانے کی کوششوں میں ہے۔ حرف و لفظ میں گوندھی ہوئی سانسیں شمیم فاروقی کا زندگی نامہ ہیں۔

ضخامت: ۱۴۴ صفحات۔ قیمت: تیس روپے مطبوعہ ۱۹۸۷ء۔ پتہ: سید مجیب الرب فاروقی، ٹھاکر روڈ، گوملا ۸۳۵۲۰۷ (بہار) بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ۴ ۸ [بہار]

## عقب کا دروازہ

ہیت لفظ لفظ [مطبوعہ ۱۹۸۵ء] کے بعد حمید سہروردی کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ عقب کا دروازہ جس میں ۲ افسانے شامل ہیں۔ پیش لفظ، ڈاکٹر ارتکاز افضل نے تحریر کیا ہے اور حمید سہروردی کے افسانوں کا فن" کے عنوان سے ڈاکٹر ذکاء الدین شایاں کا ایک مختصر سا مضمون شامل کتاب ہے۔

اردو افسانہ اپنے روایتی بیانیہ سے نئے تخلیقی بیانیہ تک رد و قبول کی ایک طویل داستان لیے ہوئے ہے۔ جدید افسانے سے ماجرائی عناصر کی گمشدگی اور استعارہ، علامت، تجرید، تمثیل، اساطیر و تلمیحات کی سمائی کے طور تجربہ کہیں تخلیقی تو کہیں مصنوعی انداز میں ابھر کر آئی کہ شاعری اور نثر کا فرق نثری نظموں کی سرحدیں شانے لگا۔ نثر لطیف، انشائے لطیف، شعر منثور، انشائیہ وغیرہ نثری تجربے، جدید تر افسانے میں ضم ہو گئے یہ ایک ناگزیر فطری عمل تھا وقت نے جن رجحانوں کا محاسبہ کیا۔ فیشن زدہ اور مصنوعی افسانہ نگار خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ لیکن حقیقی فن کار نہ صرف یہ کہ تجربے کا حصہ رہے بلکہ اس تخلیقی بیانیہ کے خد و خال ابھارنے میں کامیاب بھی ہوئے جو آج اردو افسانے کا معیار و مزاج ہے۔

حمید سہروردی کا تخلیقی سفر جدید افسانے کے خد و خال ابھارنے میں معاون ہوا ہے۔ علامتوں اور استعاروں میں انھوں نے کہانی در کہانی تہہ داریوں کا آہنگ اور سچی تخلیقی شاعری کی طرح سجایا ہے۔ اردو کے چند ایک نئے افسانہ نگاروں کی فہرست میں ان کا نام بھی شامل کیا جائے گا۔ ابھی ان کا سفر نئے تخلیقی بیانیہ کی طرف جاری ہے۔

ضخامت ۱۲۸ صفحات۔ قیمت ۳۰ روپے۔ مطبوعہ ۱۹۸۷ء تقسیم کار، نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ، امین آباد، لکھنؤ۔ ۳

## ادیب (اقبال نمبر)

جامعہ اردو علی گڑھ کے تدریسی مجلے ادیب کا اقبال نمبر کئی اعتبار سے مفید مطالعہ ہے۔ اس کی ترتیب اور مضامین کی شمولیت طلبا اور اقبال پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے معاون ہوگی۔ حیات و شخصیت کے تحت نورالحسن ہاشمی اور جگن ناتھ آزاد کے دو مقالے شامل ہیں، فکر و فن کے باب میں خلیل الرحمان اعظمی، جگن ناتھ آزاد، سید طلعت حسین نقوی اور صاحب علی خان کے مضامین اور تجزیے کے ذیل میں عمارت بریلوی، آر۔ اے۔ نکلسن اور ابوالکلام قاسمی نے بالترتیب ساقی نامہ، اسرار خودی اور اقبال کی ایک نظم "شعاع امید" کا تجزیاتی جائزہ پیش کیا ہے۔

رسالہ ادیب کے مدیر مرزا خلیل احمد بیگ نے پاکستان میں اقبال پر ہوئے کام کا مختصر جائزہ پیش کیا ہے۔ اس طرح یہ مختصر شمارہ اپنی کیفیت کے اعتبار اور نئے پرانے مضامین کی یکجائی سے ایک حوالہ جاتی شمارہ بن گیا ہے۔

جلد ۱۳۔ شمارہ نمبر ۱-۳، مطبوعہ ۱۹۸۹ء۔ ضخامت ۱۴۲ صفحات قیمت ۵ روپے۔ پتہ دفتر رسالہ ادیب، جامعہ اردو، علی گڑھ۔

## خلیل کا مکان

آدم نصرت، ہندوستاں میں اردو کے خلیل جبران ہیں۔ ان کی ذہنی ساخت، اسلوب اور طرز فکر، تمام تر بہت مختلف اور متنوع ہے۔ زیر تبصرہ کتاب سے قبل "ریت سمندر کھاگ" چھوٹے چھوٹے مگر بلیغ فلسفیانہ جملوں سے ہی ایک اہم کتاب تھی جسے خاطر خواہ پذیرائی تو حاصل نہیں ہوئی تھی لیکن ادبی حلقوں نے عادت ذہنی کے تحت سرگوشیوں میں اس کتاب کا ذکر کا ن و کان ضرور کیا تھا۔ "خلیل کا مکان" اسی نہج کی دوسری کتاب ہے جس میں ۲۲ تنقیدی و تعمیری مضامین شامل ہیں۔ رتناگیری (مہاراشٹر) کے ماحول میں لکھے گئے یہ مضامین جس میں "خلیل" ایک کردار ہے۔ "مکان" ایک مقام ہے جہاں مختلف الخیال اور نظریات کے لوگ آتے ہیں اور گوناگوں مسائل پر گفتگو کرتے ہیں۔

یہ مقالے چھوٹی چھوٹی کہانیاں بھی ہیں اور زندگی نامہ بھی۔ فنتاسی میں معانی کے جہاں آباد ہیں۔ یہ مضامین صرف فلسفہ نہیں۔ یہ نثری نقاطی بھی نہیں۔ یہ تخلیقی فن پارے ہیں۔ جنھیں خواب و دل کے کاغذ پہ رقم کیا ہے۔

ضخامت: ۱۰۴ صفحات۔ قیمت: چالیس روپے۔ مطبوعہ ۱۹۸۸ء۔ تقسیم کار۔ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ ۹۔ گولا مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی۔

## نقش بر نقش

بزرگ شاعر شارق جمال کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ اس سے قبل "عکس بر عکس" کے نام سے اولین شعری مجموعہ شائع ہو چکا ہے جس میں ۵۴ غزلیں اور ۱۵ ہائیکو شامل تھے۔

شارق جمال ناگپوری، حضرت طرفہ قریشی مرحوم کے شاگرد رشید ہیں اس طرح ان کا تعلق آگرہ اسکول اور علامہ سیماب اکبر آبادی سے ملتا ہے، یہی وجہ ہے کہ شارق جمال محض استادی و شاگردی کے دائرے میں نہیں رہے بلکہ فکری اور فنی دونوں سطح پر انحراف و اختراع کو مزاج و معیار بنا کر اپنا تخلیقی سفر کرتے رہے۔ "نقش بر نقش" اسی کا عملی ثبوت ہے۔ انھوں نے غزل کو اپنا وسیلۂ اظہار تو بنایا تاہم دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی چنانچہ ہائیکو اور آزاد غزل تک ان کے یہاں تقلید کے بجائے تخلیقی اپج کے عکس ملتے ہیں "نقش بر نقش" میں ۴۹ پابند غزلیں۔ عروضی تجربے کے تحت ۸ غزلیں اور ۱۵ آزاد غزلیں شامل ہیں۔ پوری کتاب کا لحاظ نہ شعری و معنی دونوں اعتبار سے قابل مطالعہ ہے کہ اس میں تازہ کار ذہن تلاش و تعمیر کے عمل میں تخلیقیت کے نئے جہاں آباد کرنے کا خوگر ہے۔ حرف و لفظ کی میناکاری اور بحروں میں ان کی سمائی محض غزل مکمل کرنے کا شعوری احساس نہیں بلکہ عصری حسیت کو اپنے تجربوں میں جذب کرنے اور پھر تخلیقی اظہار کرنے کی سعی کار فرما ہے۔

عروضی تجربے والی غزلیں محض عروضی تجربہ نہیں کہ عموماً ایسی شاعری نہایت بے رس، بوجھل اور گنجلک ہو کر رہ جاتی ہے ویسے بھی آورد والی شاعری کو جھیلی کھاتے دیر نہیں لگتی۔ شارق جمال نے کوشش کی ہے کہ تجربہ محض تجربہ ہی بن کر نہ رہ جائے بلکہ وہ فن پارہ بن سکے حالاں کہ ان غزلوں [۴۹ شعر] میں بعض شعر برائے شعر ہو کر رہ گئے ہیں مگر یہ توان کی دیگر غزلوں میں بھی ہوا ہے مگر یہ کوئی خاص بات نہیں ویسے غزل کا داخلی آہنگ، اس کی لفظیات اور غزل کے تمام شعر کسی ترتیب و اکائی میں مکمل طور پر موسیقی آمیز ہونے چاہئے۔ اچھی اور سچی غزل کا معیار یہی ہے۔

تیں اور میری شاعری" از شارق جمال اور قابلِ توجہ ایک شعری مجموعہ از علامہ نادم بلخی میں بعض کام کی باتیں کہی گئی ہیں۔

ضخامت: ۱۴۴ صفحات۔ قیمت: ۱۵ روپے۔ مطبوعہ جون ۱۹۸۸ء
پتہ: ادارۂ غالب، تکیہ معصوم شاہ، مومن پورہ، ناگپور ۔۴۴۰۰۰۸۔

## سید حرمت الاکرام
[ حیات اور کارنامے ]

حرمت الاکرام (مرحوم) اردو شاعری کا ایک نمایاں نام ہے۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ غزل کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا بلکہ شاعری کی دیگر اصناف پر بھی توجہ دی۔ جدید اردو شاعری کو فکری و فنی ہر دو اعتبار سے معقد و معتبر بنانا ان کا مقصد تھا۔ وہ شعر و ادب کے خاموش خدمت گزار تھے۔ اپنی تخلیقات کے علاوہ انہوں نے بہت سے شاگردوں کی ذہنی تربیت بھی کی اور اس میں بھی کامیاب رہے۔

مگر بدقسمتی یہ ہے کہ ایسے قلم کاروں کو محض اس لیے فراموش کر دیا جاتا ہے کہ وہ ادبی سیاست کے رموز و نکات سے واقف نہیں ہوتے۔ انھیں گٹھ جوڑ نہیں آتا۔ کسی کے حاشیہ بردار نہیں ہوتے صرف اور صرف تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ حرمت الاکرام ایسے ہی لوگوں میں سے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ حرمت صاحب کو علامت بنا کر دیکھا جائے تو اس قبیل کے قلم کار ہی دراصل ہر عہد میں شعر و ادب کے معتبر نمائندے ٹھہرتے ہیں یہ اور بات ہے کہ ان پر توجہ نہیں دی جاتی۔

زیرِ تبصرہ کتاب کے مرتب ایس۔ جی۔ آئی۔ حیدر قابلِ مبارکباد ہیں کہ انھوں نے کسی بھی سطح پر صحیح ایک قابلِ قدر کام کیا ہے اور حرمت صاحب پر بعض مضامین جمع کر کے انھیں شائع کر دیا ہے۔ کتاب میں پیش لفظ اور عرضِ ناشر کے علاوہ ۱۵ مضامین اور تین منظومات شامل ہیں۔ دو، تین مضامین اہم ہیں اور باقی غنیمت ہیں۔ ترتیب، کتابت اور طباعت گوارہ ہے۔

حرمت الاکرام [پ: ۱۹۲۰ء۔ م: ۱۹۸۳ء] کے شعری مجموعوں میں "اجالوں کے گیت" [۱۹۵۷ء] "کلکتہ ایک رباب" [۱۹۶۶ء] "شہپر" [۱۹۶۳ء] "جلوۂ نور" [۱۹۷۷ء] قابلِ ذکر ہیں۔

کتاب کے آخر میں "چند باتیں" کے تحت شمس الرحمان فاروقی کی رائے شامل کی گئی ہے جو بہت اہم ہے۔

ضخامت: ۱۲۰ صفحات۔ قیمت: تیس روپے۔ مطبوعہ: ۱۹۸۹ء پتہ۔ ۶/۷ ڈی، محمڈن بریئل ہگر گراؤنڈ لین، خضر پور۔ کلکتہ ۶۳۔

## یادِ ماضی

شخصیات پر لکھے گئے قیصر سرمست کے ۱۱ مضامین کا یہ مجموعہ کئی اعتبار سے قابلِ مطالعہ ہے۔ تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی رنگ سے سجی ہوئی شخصیتوں میں، تمکین سرمست، نیاز فتح پوری، مولانا ابوالکلام آزاد، امجد حیدرآبادی، اقبال متین، خورشید احمد جامی، سالک دہلوی، واسو دیو گوند آپٹے، ظریف لکھنوی، حیدر دہلوی اور اورنگ زیب عالمگیر کے نام شامل ہیں۔ تحریر میں بے ساختگی، رواں دواں نثر اور اس کی تہہ داریاں قاری کو متوجہ کرتی ہیں۔ سرورق پر شخصیات کے خوبصورت اسکیچ اور ان کے نام متاثر کرتے ہیں کیوں کہ قیصر سرمست ادیب ہی نہیں ایک آرٹسٹ بھی ہیں۔

ضخامت: ۱۰۵ صفحات۔ قیمت: ۰ روپے۔ مطبوعہ ۱۹۸۸ء۔ پتہ: قیصر سرمست، شوکت مینشن، یاقوت پورہ حیدرآباد ۔۲۳۔

## تناظر
[ ادبی انتھالوجی ]

تخلیقی ادب کی دستاویز۔ ادب، آرٹ اور کلچر کا باشعور اپنی نوعیت کا واحد میگزین۔ اس کے تازہ ضخیم شمارے میں پانچ پیش کیے گئے ہیں۔ پہلا منظر فکشن ہے جس میں ایک منظوم اور مشاہیر افسانہ نگاروں کی ۱۳ بہت معیاری کہانیاں شامل ہیں۔ دوسرا منظر شعر و نغمہ کا ہے جس میں ۱۹ شعراء کی تخلیقات شامل ہیں۔ تراجم میں ۱۴ قلم کاروں نے مختلف ملکی اور غیر ملکی زبانوں کے پاروں کا ترجمہ کیا ہے۔ تیسرا منظر نقد و نظر ہے جس کے تحت "تماشا زیست" [گوشہ امرتا پریتم] پیش کیا گیا ہے۔ چوتھا منظر اور تقریروں کا ہے جس میں تہذیب و تمدن، علم و ادب، تنقید اور سیاست کے زیرِ عنوان ۱۴ ادباء کے مقالے شامل ہیں۔ اور آخری منظر کتابوں کی دنیا حلقۂ اربابِ ذوق و بصیرت اور دنیا کا خبرنامہ کو محیط ہے۔

مدیر: مدیرۂ المراج ورما۔ ضخامت: ۴۴۹ صفحات۔ قیمت: اسی روپے [چار شماروں پر مشتمل] مطبوعہ: مئی ۱۹۸۸ء اپریل ۱۹۸۹ء۔ پتہ: ۲۴ ڈی، پاکٹ ۳ فیز ۲، میور وہار۔ ۰۰۹۱۔

## بقیہ صفحہ ۳۵ ہائی جیکنگ

کے دونوں ہتھیار اس کے قبضہ میں تھے ۔ ایک دن کیا ہوا ۔ وہی جس کا ڈر تھا۔ وہ دونوں بچیوں کو سیٹ پر بٹھا کر بیلٹ باندھ رہی تھی۔ جہاز اترنے کو تھا ۔ اچانک شور اور بھگدڑ میں اس نے دیکھا۔ سیاہ جرسی اور جین پہنے ہائی جیکر ہوزلی لئے کھڑا تھا "ہینڈز اپ"! اس نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے طلاق۔ طلاق۔ طلاق کی تین گولیاں سنسنا کر نکلیں اور اس کی ہتھیلیوں کو چیرتی ہال اڑاتی پرسے نکل گئیں۔ پرندہ پھڑپھڑانے لگا ۔ عرش کے کنگورے کرچی کرچی ہو کر نرم بادلوں کی تہوں میں دھنس گئے ۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا ہو گیا تھا ۔ جہاز کی بتیاں بجھ گئی تھیں ۔ کمانڈو نے باہر سے حملہ کر دیا تھا ۔ طلاق ۔ طلاق ۔

ایک ہی لمحہ میں انقلاب آجاتا ہے ۔ دو بندوں کا بندھن پل بھر میں ٹوٹ جاتا ہے ایک ہی لمحے میں دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن جاتے ہیں۔ کتنی حیرت ناک اور اذیت ناک بات ہے ۔ وہ کہاں جائے گی۔ بچیوں کو چھوڑ جائے یا لے جائے۔ چھوڑ جائے تو جدائی کی جان لیوا تڑپ۔ اور لے جائے تو آگ کے سمندر سے گزرنا ہوگا ۔ ٹھائیں ۔ ٹھائیں ٹھائیں ۔ وہ آگ کے سمندر میں اتر آئی۔ اس کی دونوں ہتھیلیوں سے خون بہہ رہا تھا قمیص کے دامن کو سیراب کرتا ایڑیوں تک۔ اور وہ ننگے سر بھاگ رہی تھی۔ ❋